
سب رس


ادارۂ ادبیات اُردو

ادارۂ ادبیات اُردو حیدرآباد دکن کا ماہ نامہ

سب رس

نشان ٹپہ آصفیہ ۱۵۳
نشان ٹپہ برطانیہ M3950
ٹیلی فون نمبر ۲۲۰۹
چندہ سالانہ چار روپے آٹھ آنے
بچوں کا سب رس ایک روپیہ آٹھ آنے

زیر نگرانی
ڈاکٹر سید محی الدین قادری زورؔ
مجلس ادارت
خواجہ حمید الدین شاہدؔ بی اے
سکینہ بیگم
عبدالحفیظ صدیقی بی، ایس، سی

جلد (۶) بابت ماہ مارچ ۱۹۴۳ء شمارہ (۳)

غزل

ملا غواصی آج سے سوا تین سو سال قبل حیدرآباد میں گذرا۔ قطب شاہی کا استاد الاساتذہ تھا۔ انہیں نے سلطان محمد قطب شاہ (۱۰۲۰ھ تا ۱۰۳۵ھ) اور سلطان عبداللہ قطب شاہ (۱۰۳۵ھ تا ۱۰۸۳ھ) کے درباروں میں ملک الشعرا کا عہدہ حاصل کیا تھا اور ۱۰۴۹ھ میں بیجاپور کو بحیثیت سفیر تزک و احتشام کے ساتھ روانہ ہوا اور شاہانہ انعام و اکرام کی معیت میں حیدرآباد واپس ہوا تھا۔ اس کی دو کتابیں سیف الملوک و بدیع الجمال (۱۰۳۵ھ) اور طوطی نامہ (۱۰۴۹ھ) مجلس اشاعت دکنی مخطوطات کی طرف سے شائع ہو چکی ہیں جن کو پروفیسر عبدالقادر سروری نے خاص اہتمام سے تحقیقی مقدموں کے ساتھ مرتب کیا ہے۔

ملا غواصی صاحبِ دیوان بھی تھا لیکن افسوس ہے کہ اس کا مکمل دیوان اب تک دستیاب نہ ہو سکا۔ چند غزلیں ملی ہیں۔ جن میں سے ایک درج ذیل ہے جس کے مقطع میں بھی اس نے اپنے دیوان کا ذکر کیا ہے۔

یہ غزل نواب نصیر الدین خاں صاحب ناظم دفتر دیوانی و مال کی ایک خاندانی بیاض کے صفحہ ۳ سے یہاں نقل کی جا رہی ہے یہ بیاض غالباً ۱۰۹۳ھ میں (یعنی زوال سلطنت قطب شاہیہ سے پانچ سال قبل) لکھی گئی تھی۔

اسی زمین میں ولی اورنگ آبادی نے تقریباً نصف صدی بعد ایک غزل لکھی تھی جو اس کے مطبوعہ دیوان میں موجود ہے اور جس کا مطلع و مقطع درج ذیل ہے۔ اس سے یہ ظاہر ہوتا ہے کہ ولی نے متقدمین شعرائے دکن کی تقلید میں شاعرانہ کمال حاصل کیا تھا اور چونکہ متقدمین کے دیوان دستیاب نہ ہوئے تھے اس لئے ولی ہی کو اردو کا پہلا صاحبِ دیوان سمجھا جانے لگا ہے

(مطلع) وہ صنم جب سوں (سے) بسا دیدۂ حیران میں آ — آتشِ عشق پڑی عقل کے سامان میں آ

(مقطع) غم سوں (سے) تیرے ہے ترحم کا محل حال ولی — ظلم کو چھوڑ سجن شیوۂ احسان میں آ

سید محی الدین قادری زور

جب ترا عشق سٹیا دست گریبان میں آ — صبر ٹکڑے ہو پڑیا عقل کے میدان میں آ

بات نا بول مجھے دل سوں بھلاؤ کیوں اتال (؟) — کہ ایکایک پڑیا جیب کے میدان میں آ

بہت دیساں (دن) تھیں میں آ چاند ہوں مشتاق ترا — کر مقام آج مری زمین کے اسمان میں آ

کان سوں (سے) یوں جو لگا زلف ترا کہتا (ہٹتا) ہے — کیا کہتا ہے کہ نہ جانوں وو ترے کان میں آ

میں تو فرمان میں پھرتا ہوں ترے دل سوں ولے — ایک دن تو بھی دیا کر مرے فرمان میں آ

آئیا سورۂ یوسف سو ترا حسن نکل — دیکھیا فال ترے موں کی جو قرآن میں آ

شعر سوں (سے) جو توں منگے اپ سیتی یو سیر کرن (کرنے) — سیر کر ذوق سوں (سے) غواصی کے دیوان میں آ

غواصی

فردوس محل

(منظوم افسانہ)

چاندنی رات تھی سرما کی، ہوا تھی مرطوب
جا رہا تھا میں کسی فکر میں ڈوبا خاموش
ــــــ ایک موٹر مرے پیچھے سے مچلتا آیا
ــــــ شور کرتا ہوا، گاتا ہوا، چونکاتا ہوا
مڑ کے دیکھا تو وہیں ششدر و حیراں ہو کر!
چند لمحوں کے لئے راہ میں میں ٹھیر گیا
ریشمی پردے کو ہلکی سی ہوئی اک جنبش !!
پھر کسی نور کے پیکر پہ نظر گڑ سی گئی !!

اُف، وہ موٹر کہ ہواؤں میں اڑا جاتا تھا!
دل کی رفتار بھی سینے میں مرے بڑھنے لگی
نرم، اور پھولوں کی خوش بو میں بسایا ہوا جسم
جذب سا ہونے لگا پہلو میں میرے گویا
تھرتھراتے ہوئے ہونٹوں میں وہ گرمی تھی نہاں
سرد اور ٹھنڈا ہوا جسم مرا تپنے لگا ــــــ
ایک بجلی تھی مری روح میں لہرائی ہوئی!
زندگی مجھ کو نظر آنے لگی خوابِ لطیف!

ایک بہکی ہوئی آواز سے پوچھا اس نے
"کیا اِسی راہ میں "فردوس محل" آتا ہے"
ہاں، اسی راہ میں ــــــ میں بھی تو وہیں جاتا ہوں
اتنا کہتے ہی قدم آگے بڑھائے میں نے!
اس نے تنبیک بلا کر یہ کہا پھر مجھ سے ــــــ
"دیکھئے! آپ کو تکلیف تو ہوگی تھوڑی"!
"یہ جو شوفر ہے نیا ہے، اِسے معلوم نہیں"!!
"آپ کو جانا وہیں تو ہے ــــــ ذرا ساتھ سہی"

پھر جو محسوس کیا اک کسی جنگل کے قریب
ایک ٹھیرے ہوئے موٹر میں چھپا بیٹھا ہوں!
اک کسی اجنبی دوشیزۂ نوخیز کے ساتھ!
جو پچھیاں سی نظر آتی تھی جانے کیوں وہ!
سر جو باہر کو نکالا تو وہی سردی تھی۔
اور، وہی چاند، مگر پھیکا، اداس، اور نڈھال
خیر، اک لانبی سڑک ہونے لگی طے پھر سے
دیکھتے دیکھتے "فردوس محل" آ ہی گیا ــــــ!!

تحسین سروری

ہرمس

ہرمس۔ فیوہرر! مجھے افسوس ہے کہ میں آپ کی اس تجویز کا ساتھ نہیں دے سکتا۔ اس میں نازک خطرات ہیں۔

ہٹلر۔ وہ کون سے خطرات ہیں؟

ہرمس۔ بات یہ ہے کہ ہماری نیشنل سوشلسٹ جماعت اب لڑائی سے روز بروز ناراض ہوتی جارہی ہے آپ نے یقین دلایا تھا کہ جنگ ۱۹۴۱ء کے ابتدائی زمانے میں ختم ہوجائے گی۔ یہ وعدہ پورا نہ ہوا۔ آپ نے اس کا بھی یقین دلایا تھا کہ ہمارا ملک دشمن کے ہوائی حملوں سے بالکل محفوظ رہے گا۔ یہ خیال بھی غلط ثابت ہوا۔ پھر انگریزوں نے آج کل اس بری طرح سے ناطقہ بند کررکھا ہے کہ ہم سب کا حال پتلا پڑگیا ہے۔ اب آپ ہی بتائیے کہ ہم کیا کھا کر جئیں اور کس امید پر زندہ رہیں۔

ہٹلر۔ ہرمس! میں دیکھ رہا ہوں کہ روز بروز تمہارا اعتقاد کمزور ہوتا جارہا ہے نائب ہٹلر اور ایسی کمزوری!

ہرمس۔ نہیں فیوہرر یہ بات نہیں۔ بات یہ ہے کہ اس اسکیم میں بہت بڑے خطرات ہیں اور مجھے اندیشہ ہے کہ ہم سب اپنی اسکیم کا شکار ہوجائیں گے۔

ہٹلر۔ یہی یہ تو خیالی ہوا ہے۔ اس میں ڈرنے کی کوئی بات ہی نہیں، جب ہم تمام محاذوں پر یک دم ہلہ بول دیں گے تو دشمن کے چھکے چھوٹ جائیں گے۔ ایک طرف بحر اوقیانوس کی سمندری لڑائی سخت ترین کردیں گے اور دوسری طرف انگلستان پر زمین، سمندر اور ہوا سے حملہ بول کر گھس جائیں گے۔

ہرمس۔ معاف فرمائیے اٹلانٹک کی لڑائی کے متعلق کچھ یقین سے نہیں کہا جاسکتا۔ آپ کو ماننا پڑے گا کہ سمندر پر اب تک برطانیہ کی حکومت ہے۔ پھر اس لڑائی میں فاصلہ، وقت اور دیکھ بھال کی تمام سہولتیں انگریزوں کے ساتھ ہیں۔۔۔۔ انگلستان پر چڑھائی کا خیال ہی فضول ہے۔ وہاں تیس لاکھ فوجی اور تیس لاکھ محفوظ سپاہی ہیں جو سمندر میں واپس ڈھکیل دینے کے لئے بے تاب کھڑے ہیں۔

ہٹلر۔ (غصے سے) روڈلف ہرمس! میں دیکھ رہا ہوں کہ روز بروز تم کم ہمت، بزدل اور ڈرپوک ہوتے جارہے ہو۔ تمہیں ایسی بات چیت سے شرم آنی چاہئے۔

ہرمس۔ میں نے زندگی کے پینتالیس سال گزارے ہیں۔۔۔ نازی پارٹی کے قیام سے آج بیس سال تک میں تمہارے ساتھ مثل سائے کے رہا ہوں۔۔۔۔ لیکن دنیا کے کسی شخص نے اب تک مجھے ان ناموں سے یاد کرنے کی جرأت نہیں کی۔ (دھمکی سے) ہرہٹلر آج تم پہلے اور شاید آخری آدمی ہو (غصے میں) لیکن میں بہت جلد تمہیں بتادوں گا کہ اس قسم کی بدزبانی۔۔۔۔

(ہٹلر بلند آواز سے) بس بس بس۔

ہٹلر۔ مجھے ایسے بے وقوفوں اور ڈرپوک، بانونی لوگوں کی ہرگز ضرورت نہیں، میرے سامنے سے نکل جاؤ دور ہوجاؤ، جاؤ (بڑی آواز میں)۔ (ہرمس واپس جاتا ہے)۔

دوسرا اسین

ہٹلر۔ (گھنٹی بجاتا ہے) ہرہملر کو بلاؤ۔

دربان۔ ہرہملر! چیف آف گسٹاپو تشریف لارہے ہیں!

ہٹلر۔ آنے دو!

ہملر۔ ہیل ہٹلر! ہملر حکم کا منتظر ہے۔

ہٹلر۔ ہملر! تم جانتے ہو کہ مجھے تم پر کتنا بھروسہ ہے۔

ہملر۔ حضور میں جانتا ہوں۔

ہٹلر۔ آج ایک نہایت نازک اور خطرناک کام آن پڑا ہے۔ اس پر ہم سب کی زندگی کا انحصار ہے۔

ہملر۔ ہملر کی جان حاضر ہے! حکم میں دیر نہ ہو۔

ہٹلر۔ شاباش! مجھے تم سے یہی امید تھی۔ سنو! تمہارے آنے سے پہلے جنگ کی شائد سب سے اہم اسکیم کے متعلق میں ہرہس سے بات چیت کر رہا تھا۔ لیکن اس نے مخالفت کی۔

ہملر۔ (حیرت سے) مخالفت کی!

ہٹلر۔ ہاں نہ صرف اسکیم کی مخالفت کی بلکہ میری مخالفت کی۔

ہملر۔ (تعجب سے) آپ کی مخالفت کی!

ہٹلر۔ نہ صرف میری مخالفت کی بلکہ پوری نازی پارٹی کی مخالفت کی!

ہملر۔ یہ تو بغاوت ہے!

ہٹلر۔ ہاں غداری ہے! مجھے معلوم نہ تھا کہ میں اپنی آستین میں سانپ پال رہا ہوں۔

ہملر۔ افسوس! ہزار افسوس!

ہٹلر۔ ہملر تمہیں معلوم ہے کہ میں نے نازی جرمنی کی خاطر کتنی بڑی قربانیاں کی ہیں۔ گہرے سے گہرے دوست جو ہمارے راستے میں کانٹوں کی طرح کھٹک رہے تھے انہیں نکال باہر کیا۔ ۳۰ جون ۱۹۳۴ء کا واقعہ تمہیں یاد ہوگا جب کہ بہت سے عزیز دوستوں اور پرانے ساتھیوں کو ہم نے اختلافات کی وجہ سے موت کے گھاٹ اتارا ——
یہ سب جرمنی کی خاطر تھا۔ اب وقت آگیا ہے کہ آج ۱۰ مئی ۱۹۴۱ء کو رائش کی بھلائی کی خاطر ہرہس کا خاتمہ کردیا جائے۔ جاؤ اور رات تک حکم کی تعمیل کرو۔

ہملر۔ فیوہرر کا حکم سر آنکھوں پر۔ لیکن ——

ہٹلر۔ اب میں کچھ نہیں سننا چاہتا۔ (بڑی آواز میں) جاؤ حکم بجا لاؤ۔

(وحشت ناک ساز)

—— تیسرا سین ——

معلن۔ ہملر جرمن خفیہ پولیس کا صدر واپس ہوتا ہے۔ وہ کئی بڑے بڑے نازی عہدہ داروں اور ذی اثر لوگوں کو ہٹلر کے اشارے پر موت کے گھاٹ اتار چکا تھا لیکن ہرہس اس کا جانی دوست تھا۔ ایک زمانے سے محبت تھی۔ پھر ہس نے کئی مرتبہ ہملر کی آڑے وقت میں مدد کی تھی۔ وہ سخت دل تھا، ظالم تھا لیکن محسن کش نہ تھا۔ سوچنے لگا کہ کس طرح اپنے محسن کی جان بچانی چاہئے، اس کے دل میں یک دم ایک خیال آیا اور چہرہ پر خوشی کی ایک لہر دوڑ گئی۔ اس نے فوراً ہوائی جہاز لیا روڈلف ہس کے گھر کا رخ کیا اور اس کے راز کے کمرے میں جا پہنچا۔ وہاں ہس کرسی پر بیٹھا ہوا ہٹلر کی تصویر کو جو سامنے لٹک رہی تھی غصہ سے گھور رہا تھا اب ہملر اپنے دوست ہرہس سے مخاطب ہوتا ہے۔

ہملر۔ ہلو ہس! کیا کر رہے ہو؟

ہرہس۔ ہلو ہملر! کیسے آنا ہوا؟

ہملر۔ تمہیں قید کرنے۔

ہرہس۔ کس کے حکم سے؟

ہملر۔ ہر ہٹلر کے حکم سے۔

ہرہس۔ خوب! میں نے اس کا کیا بگاڑا ہے۔ بدمعاش کہیں کا۔ کیا میری برسوں کی خدمات کا یہی صلا ہے؟ کیا (Landsberg) کے قلعہ میں اس کے ساتھ قیدی بنے رہنے کا یہی معاوضہ ہے؟ کیا اس کی (Mein Kampf) لکھنے کا یہی بدلہ ہے؟

ہملر۔ گھبراؤ نہیں ہس! میں تمہیں ہٹلر کے خونی ارادے سے آگاہ کرنے آیا ہوں تم!... چھپ جاؤ۔ نہیں نہیں۔

تم کہیں بھاگ نکلو ——— اسپین، پرتگال، امریکہ، انگلستان کہیں بھی جاؤ۔ یہاں موت کا سایہ تمہاری طرف بڑھ رہا ہے جاؤ۔ جلدی کرو۔

ہرہس۔ مہربان دوست! میں کس طرح تمہارا شکریہ ادا کرسکتا ہوں۔ لیکن ہٹلر کو اگر یہ معلوم ہوگیا کہ تمہاری وجہ سے میری جان ....

ہملر۔ تم میری فکر نہ کرو۔ ہٹلر مجھے مار کر خود بھی زندہ نہیں رہ سکتا۔ تم کسی تیز رفتار ہوائی جہاز سے روانہ ہو جاؤ جاؤ، جلدی کرو۔ اچھا خدا حافظ۔

(غمگین ساز)

——— چوتھا سین ———

معلن۔ کچھ دیر بعد ہرہس ——— نائب ہٹلر ———

مسرشمٹ ۱۱۰ میں سوار ہوکر ہوا میں اڑتا ہے۔ اس طرح کہ اس کے دل میں ہٹلر سے انتقام کا جذبہ ٹھاٹھیں مار رہا ہے۔ وہ اسکاٹلینڈ کا رخ کرتا ہے اور ۱۰ مئی ۱۹۴۱ء کی رات کو گلاسگو کے قریب مسلسل چار گھنٹوں کی پرواز کے بعد ایک گاؤں میں ہوائی چھتری کے ذریعے اتر جاتا ہے۔ لیکن ٹخنہ ٹوٹ جاتا ہے۔ ایک کسان (David Maclean) اسے اپنے گھر لے جاتا ہے۔ وہاں پولیس کے عہدہ دار پہنچ جاتے ہیں اور اسے گلاسگو کے ایک دواخانے میں لے جاتے ہیں۔ پہلے تو وہ اپنا نام (Horn) بتاتا ہے لیکن پھر ہرہس نازی نمبر ۳ ہونے کا اقرار کرتا ہے۔ اس کی باقاعدہ شناخت ہوتی ہے اور جب اطمینان ہو جاتا ہے تو اسے گلاسگو سے لندن کے ایک نامعلوم مقام کو لے جایا جاتا ہے۔ ادھر جرمنی میں ہملر مصنوعی طور پر حیران اور پریشان ہٹلر کے ہاں پہنچتا ہے۔ اب ہملر اور ہٹلر کی بات چیت سنئے ۔ ——

ہملر۔ چلا گیا، بھاگ گیا، اڑ گیا۔

ہٹلر۔ کون بھاگ گیا؟ کون اڑ گیا؟ آخر بولو تو سہی۔ اتنے بدحواس کیوں نظر آتے ہو۔

ہملر۔ جان کی معافی ہو تو عرض کروں۔

ہٹلر۔ بولو!

ہملر۔ ہرہس آج شام کے چھ بجے ہی Augsburg سے ہوائی جہاز کے ذریعہ بھاگ نکلا۔ چاروں طرف اس کا پیچھا کیا گیا لیکن ہاتھ نہیں آیا۔ یہاں تک کہ اس کا جہاز اسکاٹلینڈ میں اتر گیا۔

ہٹلر۔ اسکاٹ لینڈ میں! دشمن کے ملک میں۔

ہملر۔ جی ہاں۔

ہٹلر۔ افسوس بہت برا ہوا۔ اگر بالٹک اور بلقان میرے ہاتھ سے نکل جاتے تو اتنا رنج نہ ہوتا۔ اب یہ کم بخت ہمارے خلاف ہی زہر اگلے گا ——— اچھا تو تم جاؤ اور گوئبلز کو فوراً بھیج دو۔

(مایوسی کا ساز)

——— پانچواں سین ———

ڈاکٹر گوئبلز۔ ہیل ہٹلر!

ہٹلر۔ گوئبلز! ہرہس جرمنی سے فرار ہو چکا ہے۔

گوئبلز۔ میں جانتا ہوں فیوہرر! مجھے اس سے یہی توقع تھی۔

ہٹلر۔ میرے پاس اب تک جو اطلاعات آئی ہیں ان سے پتہ چلتا ہے کہ وہ اسکاٹ لینڈ میں گلاسگو کے قریب اتر چکا ہے۔

گوئبلز۔ جی ہاں اپنے پرانے دوست (Duke of Hamilton) سے ملنے اور ہمارے خلاف سازباز کرنے۔

ہٹلر۔ گوئبلز! اس وقت فوری کام کی ضرورت ہے۔

گوئبلز۔ بالکل درست۔

ہٹلر۔ سنو! جرمن قوم کو اس کی بالکل خبر نہ ہونی چاہئیے۔ ورنہ سارا کھیل بگڑ جائے گا۔ باہر کے ملکوں کی نشریات نہ سننے کے احکامات سخت سے سخت کردئے جائیں۔ عبرت کے واسطے دس بارہ یہودیوں کو اس الزام میں گرفتار کرکے گولی ماردو ۔

گوئبلز۔ لیکن ہس کے بارے میں یہ بات چھپنے کی نہیں ۔ بعض لوگوں کو ضرور معلوم ہو جائے گا ۔ ان کا منہ کس طرح بند کیا جائے ۔

ہٹلر۔ دشمن کی جانب سے اطلاع آنے سے پہلے ہماری حکومت کی جانب سے اعلان کردو کہ ہرہس ہوائی جہاز سے گر کر مر گیا۔

گوئبلز۔ لیکن وہ تو اسکاٹ لینڈ پہنچ چکا ہے۔

ہٹلر۔ تو پھر بیرونی پریس کو اس بات کا یقین دلادو کہ وہ ہرہس نہیں بلکہ ہرہس کا کوئی ہم صورت ہے۔

گوئبلز۔ لیکن اس کو کیا کیا جائے کہ (Kirk patrick) جو برلن کے برطانوی سفارت خانے میں ۱۹۳۳ء سے ۱۹۳۶ء تک موجود تھا، اسے پہچان چکا ہے۔ برطانیہ کے وزیر معلومات نے بھی اس کا اعلان کردیا ہے۔

ہٹلر۔ تو پھر تشہیر کردو کہ ہرہس خود اپنی مرضی سے دشمن کو فوری صلح پر راضی کرنے چلا گیا ہے۔

گوئبلز۔ ترکیب تو ٹھیک ہے۔ لیکن اس سے کوئی اثر پیدا نہ ہوگا کیونکہ دنیا جانتی ہے کہ خود ہماری حالت خراب ہو رہی ہے اور پھر جب ہس کی گلاسگو میں تلاشی لی گئی تو اس کے پاس سے سوائے بچپن کی تصویروں کے کوئی تجویز صلح برآمد نہ ہوئی اور خود اس نے بھی اس مہم سے انکار کردیا ہے۔

ہٹلر۔ تو بھائی تم ہی کوئی ترکیب سوچو۔ میں تو بیزار ہو چکا ہوں۔ آخر اس کم بخت کو ہو کیا گیا۔ ایک زمانے تک میرا پرائیوٹ سکریٹری رہا۔ برسوں نازی نیشنل سوشلسٹ پارٹی کا صدر بنا رہا اور پھر میں نے گوئرنگ کے بعد اسے جرمنی کا ڈکٹیٹر بھی نامزد کردیا۔ افسوس کہ ایسا بڑا نازی بے وفا اور غدار ثابت ہوا۔ ہاہا! دنیا کا کیا بھروسہ ہے ۔

گوئبلز۔ ہیل ہٹلر!

ہٹلر۔ ہاں گوئبلز! کہو!

گوئبلز۔ میرے ذہن میں ایک ترکیب آئی ہے ۔

ہٹلر۔ وہ کیا ہے ۔

گوئبلز۔ تمام دنیا کے پریس کو نازی پارٹی کی جانب سے اس کی اطلاع دے دینی چاہئیے کہ ہرہس پاگل ہو چکا تھا ——

ہٹلر۔ پاگل !

گوئبلز۔ جی ہاں بالکل پاگل ہو چکا تھا ۔

ہٹلر۔ لیکن ایک پاگل —— نقشہ کے مطابق (Augsburg) سے گلاسگو تک سات سو میل کا لمبا سفر ہوائی جہاز کے ذریعے کس طرح طے کر سکتا ہے۔ پھر ہزاروں فٹ کی بلندی سے ہوائی چھتری کے ذریعے کس طرح صحیح اور سالم نیچے اتر سکتا ہے ۔

گوئبلز ۔ پاگل آدمی بعض وقت سمجھ کی باتیں بھی کر بیٹھتا ہے۔ ہم یہی خیال اخبارات، نشریات اور خبر پہنچانے والی ایجنسیوں کے ذریعے رات دن تمام دنیا میں پھیلاتے رہیں گے —— (Mein Kampf) کے صفحہ ایک سو چالیس کے مطابق تمام لوگوں کو آخر یقین آہی جائے گا۔

ہٹلر۔ مگر وہ بدبخت تو ہمارے خلاف بیانات بھی تیار کر چکا ہے۔

گوئبلز۔ جی پاگل آدمی ایسا ہی کرتے ہیں۔ اس کا جرمنی چھوڑنا ہی پاگل پن کا ثبوت ہے اور پھر اس کی دماغی خرابی کے متعلق ہمارے اسی پروپگنڈہ سے اس کے تمام بیانات کی اہمیت خاک میں مل جائے گی۔

ہٹلر۔ بھائی ترکیب تو بہت مناسب معلوم ہوتی ہے ۔ پیارے گوئبلز تم تو واقعی بہت بڑے (Genius) ہو۔

گوئبلز۔ یہ فیوہرر کی عنایت ہے !

ہٹلر۔ اور ہاں اس بارے میں کچھ ثبوت بھی فراہم کرلو۔

گوئبلز۔ کس طرح ؟

ہٹلر۔ ہس کے مکان پر اس کے ہاتھ سے لکھے ہوئے چند ایسے جعلی کاغذات چھوڑ دو جن سے یہ معلوم ہو کہ اس کی دماغی حالت خراب ہو چکی تھی۔ جن لوگوں کے متعلق ذرّہ برابر بھی شبہہ ہو کہ وہ ہس کے ہم خیال ہیں انہیں اس الزام میں فوراً گرفتار کرلو کہ انھوں نے اس کی فراری کی اطلاع نہیں دی۔ نازی جماعت کی جانب سے بھی ایک اعلان ابھی تیار کرو جس میں اس کی دیوانگی کا حال ہو اور یہ اعلان دنیا کے کونے کونے میں پھیلا دو ۔ اس طرح سب کچھ ٹھیک ہو جائے گا ۔

(خوشی کا ساز)

گوئبلز۔ فیوہرر! اعلان تیار ہے ۔

ہٹلر۔ پڑھ دو۔

گوئبلز۔ "نیشنل سوشلسٹ پارٹی کو اس بات کا اعلان کرتے ہوئے افسوس ہوتا ہے کہ ہرہس جن کی جسمانی اور ذہنی حالت کچھ برسوں سے مسلسل خراب ہو رہی تھی اور جنھیں آہستہ آہستہ نازک اور اہم ذمہ داریوں سے سبک دوش کیا جا رہا تھا یکایک ۱۰ مئی ۱۹۴۱ء کی رات کو دماغی بیماری کے ایک سخت دورے کی حالت میں جرمنی سے اسکاٹ لینڈ پہنچ گئے ۔ اپنے پیچھے جو کاغذات چھوڑے ہیں ان سے بھی یہی معلوم ہوتا ہے کہ ان کا دماغی توازن بری طرح سے بگڑ چکا ہے اور انہیں اس کا یقین ہو چکا تھا کہ دنیا ختم ہو رہی ہے ۔ انگلستان میں بھی وہ اس قسم کے دیوانے حرکات کر رہے ہیں۔ لوگوں سے مل رہے ہیں اور ہمارے خلاف دستاویزات تیار کر رہے ہیں۔ اس لئے جرمنی یا ہرہس کے متعلق جو بھی اطلاعات انگلستان سے آئیں انہیں بالکل غلط سمجھنا چاہئے۔

——— وہ لوگ جو ہرہس کی خاموشی سے نکل جانے کے ذمہ دار ہیں ان کا سخت تدارک کیا جائے گا ۔

(اختتامی ساز)

محمد بن عمر

تاریخ گولکنڈہ حیدرآباد کے مشہور مورخ اور جامعہ عثمانیہ کے معلم تاریخ پروفیسر عبدالمجید صاحب صدیقی ایم اے۔ ایل ایل بی نے سلاطین قطب شاہیہ کی نہایت مستند اور مبسوط تاریخ قلمبند کی ہے جس میں گولکنڈہ اور اس کے آس پاس کی سلطنتوں کے تعلقات، دکن کا تمدنی ارتقاء، بادشاہوں اور امیروں کے حالات، لڑائیاں، علم و فضل کی سرپرستی غرض ہر پہلو پر قدیم نادر اور قلمی تاریخوں کی مدد سے روشنی ڈالی ہے۔ تاریخ گولکنڈہ باتصویر ہے بڑی سائز قیمت [illegible]

مقدمہ تاریخ دکن یہ کتاب بھی پروفیسر عبدالمجید صاحب صدیقی نے نہایت تحقیق اور محنت سے مرتب کی ہے اس میں انھوں نے سرزمین دکن کے پچیس حکمراں خاندانوں کے آغاز، ارتقاء، عروج اور زوال کے متعلق تعارفی معلومات کے علاوہ حکمرانوں کا پورا شجرۂ نسب اور حکمرانوں کی تاریخیں بھی قلمبند کردی ہیں۔ اس کتاب کے آخر میں ایک مبسوط اشاریہ بھی ہے ۔ متوسط تقطیع ۴۴ صفحات قیمت عـم ۔

غزل

پیا باج پیالہ پیا جائے نا — پیا باج یک تل جیا جائے نا
قطب شہ نہ دے مجھ دوانے کو پند — دوانے کو کچھ پند دیا جائے نا

ان اشعار کے ترنم اور جذبے سے میرے دل پر جو کیفیت گزرتی ہے وہ بیان کرنے کی چیز نہیں ہے۔ ہر ذوق سلیم اس کا اندازہ کر سکتا ہے۔ میں ان لوگوں میں سے نہیں ہوں جو بغیر تاثر، خواہی نخواہی تعریف کو اپنا شعار سمجھتے ہیں۔ قطب شہ بہ حیثیت شاعر کے ایک اعلیٰ جمالیاتی ذوق رکھتا ہے۔ اس کا احساس رنگ و بو، میرے لئے تو وجد آفریں ہے۔ عام طور پر "بو" یعنی قوتِ شامّہ کے احساس کو پست تر احساسات میں شمار کیا جاتا ہے، لیکن جس طرح جاپانیوں نے "خوشبو" سے ایک بلند آرٹ پیدا کیا ہے اسی طرح قطب شاہ میں "بو" کا احساس بھی بڑا حسن کارانہ احساس ہے۔ علاوہ ازیں قدیم دکھنی شاعری میں آزاد اور حکمراں قوم کا جو دل و دماغ نظر آتا ہے، وہ قطب شاہ کی اس خوبصورت زمین میں نمایاں ہے۔ میں نے اسی احساس کے ساتھ اپنی غزل لکھی ہے۔ دلی اور لکھنو کے خوش مذاقوں نے "نا" کی ردیف، اور اس کے ترنم کی جو داد دی وہ حیرت انگیز ہے۔ کیا اچھا ہو کہ، سرزمین دکن کی بعض تخلیقی قوتوں سے ہم لوگ کچھ کام لینا سیکھیں۔

باقی

غمِ دل کسی سے کہا جائے نا — کہا جائے بھی تو سنا جائے نا
یہ مے کی لطافت، یہ نازک سے ہاتھ — پیالہ بھی اُن سے دیا جائے نا
دو عالم کے پردے چھپا لیں مجھے — نگاہوں سے اُن کی چھپا جائے نا
وہی سر ہے سجدے کے قابل ندیم — زمیں پر جو رکھے، اٹھا جائے نا
نہ کر عشق میں ذکرِ ہجر و وصال — دو راہے پہ اس سے ملا جائے نا
یہی ہے محبت کہ اس سے کبھی — بنا دل دکھائے رہا جائے نا
یہ کیا راز ہے شمع روشن ترا؟ — پتنگے نہ ہوں تو جلا جائے نا؟
پس مرگ آئے تو کہنے لگے — گھڑی بھر کسی سے جیا جائے نا
چمکتے ہیں آنسو مرے دم بدم — ستاروں کو جیسے گنا جائے نا
یہ کہنے لگی عقل سُن اے جنوں — یہ خنگل تو مجھ سے چلا جائے نا
نہ کر چارہ گر فکرِ بخیہ گری — یہ چاکِ جگر ہے سیا جائے نا
گلوں سے تو نکلی سنبھل اے نسیم — وہ نازک بدن ہے چھوا جائے نا
یہ مشکل ہے باقی کہ پہلو میں بھی — شبِ وصل اُن سے جگا جائے نا

کلام وجد

اک نام وردِ شام وسحر بن کے رہ گیا
خونابہ بار دیدۂ تر بن کے رہ گیا

تکمیلِ حسن قطرۂ نیساں نہ ہو سکی
عزلت نشیں صدف میں گہر بن کے رہ گیا

آنکھوں کو خوابِ حسرتِ تعمیر چاہئے
وہ خوابِ دلنواز جو گھر بن کے رہ گیا

لے کامیاب ہیں تیری بے اعتنائیاں
نالہ مرا گدائے اثر بن کے رہ گیا

سینے میں جیسے پھانس کھٹکتی ہے دم بہ دم
تیرا خیال دردِ جگر بن کے رہ گیا

شاید سوادِ منزلِ جاناں قریب ہے!
راہی غبارِ راہ گزر بن کے رہ گیا

شعلہ مزاج وجد میں اب سرکشی کہاں
وہ خاک پائے اہلِ نظر بن کے رہ گیا

وجد

نگاہیں

اربابِ سیاست کے چلن دیکھ رہا ہوں
بٹتے ہوئے لاشوں کے کفن دیکھ رہا ہوں

پھُنکتے ہوئے مردوں کے بدن دیکھ رہا ہوں
خورشیدِ تمدن کی کرن دیکھ رہا ہوں

شعلوں کا تو کیا ذکر کہ بدنام ہیں شعلے
شبنم میں شراروں کی جلن دیکھ رہا ہوں

بیدار ہے اک زلزلہ بر دوشِ تباہی!
گرتا ہوا ہر قصرِ کہن دیکھ رہا ہوں

ہر برق ہے تفسیر کتابِ گل و لالہ
بدلی ہوئی تحریرِ چمن دیکھ رہا ہوں

سنسان ہوئی جاتی ہے ہر بزمِ طرب ناک
غربت کو ہم آغوشِ وطن دیکھ رہا ہوں

غداریٔ اربابِ چمن دیکھ رہا ہوں!
لٹتے ہیں گل و سرو سمن .... دیکھ رہا ہوں

شیشوں میں لہو بر لبِ طاؤس میں شعلے
مریخ کے ماتھے کی شکن دیکھ رہا ہوں

جو سیل نگل جاتا ہے ہر مصر و یمن کو!!
وہ سیل لب گنگ و جمن دیکھ رہا ہوں

ہر گام پہ اک قبر ہے اخلاص و وفا کی
حسرت سے سوئے خاکِ وطن دیکھ رہا ہوں

ہے دوشِ امارت پہ قیادت کا جنازہ!!
کس لاش کو بے گور و کفن دیکھ رہا ہوں

شورؔ

پیام رسانی کے مختلف ذرائع

ٹیلیفون کے ذریعہ سے ایک مقام پر رہنے والا دوسرے مقام پر رہنے والے سے آسانی سے بات کرسکتا ہے۔ ٹیلیفون کے دو جز و ہوتے ہیں۔ ایک تو مائکروفون جسے منہ کے سامنے رکھکر بات کرتے ہیں اور دوسرا موصولی آلہ یعنی رسیور جسے کان کے پاس رکھا جائے تو بات سنائی دیتی ہے۔ اگر ایک مقام سے دوسرے مقام کو ٹیلیفون کے ذریعہ سے بات کرنا ہو تو دونوں مقاموں پر ٹیلیفون کا ایک ایک آلہ لگایا جانا ضروری ہے۔ ہر شہر میں تقریباً ایک ٹیلیفون اکسچنج ہوتا ہے، اور اس شہر کے تمام ٹیلیفونوں کو اکسچنج سے دو دو تاروں کے ذریعہ سے جوڑ دیا جاتا ہے۔ کسی جگہ بات کرنے کے لئے جب ٹیلیفون کو اٹھایا جائے تو اس کی خبر اکسچنج کو پہنچ جاتی ہے۔ چنانچہ اکسچنج میں اس وقت ایک برقی لمپ روشن ہوجاتا ہے، جسکی بنا پر ٹیلیفون آپریٹر آپسے پوچھکر جہاں آپ چاہیں وہاں کے ٹیلیفون کو آپکے ٹیلیفون سے ملا دیتا ہے۔ ابتداء میں اس قسم کا انتظام تھا۔ لیکن اب یہ صرف اُن مقامات میں رائج ہے جہاں ٹیلیفون کے آلے کم ہیں اور بات چیت کم ہوا کرتی ہو۔

آجکل تقریباً ہر شہر میں خودکار ٹیلیفون یعنے .. (Automatic Telephones) استعمال کئے جارہے ہیں۔ ایسے ٹیلیفون کے ساتھ ایک ڈائیل ہوتا ہے جس پر نمبر لکھے ہوئے ہوتے ہیں۔ اس ڈائیل کو گھمانے سے آپ کا ٹیلیفون خود بخود جہاں آپ چاہیں وہاں کے ٹیلیفون سے مل جاتا ہے۔ اس خودکار ٹیلیفون کے ذریعہ سے آپ اپنا ٹیلیفون شہر کے دوسرے ٹیلیفون سے ملا سکتے ہیں۔ چنانچہ حیدرآباد میں جتنے بھی ٹیلیفون ہیں ماسوائے چند خاص ٹیلیفونوں کے آپ جس ٹیلیفون سے چاہیں، اپنا ٹیلیفون اکسچنج کی مدد کے بغیر ملا سکتے ہیں لیکن حیدرآباد کے باہر مثلاً بمبئی یا مدراس وغیرہ سے آپ بطور خود نمبر ملا کر بات نہیں کرسکتے۔ ہندوستان میں ایک شہر سے دوسرے شہر کے آدمی سے بات کرنا ہو تو "ٹرنک ٹیلیفون" استعمال کرنا پڑتا ہے۔ مثلاً مدراس کے ایک مکان کے ٹیلیفون کو بمبئی کے ایک مکان کے ٹیلیفون سے ملانا ہو تو مدراس میں اپنے ٹیلیفون کو پہلے مدراس کے اکسچنج سے ملا کر یہ کہنا پڑتا ہے کہ بمبئی کے فلاں مکان کے ٹیلیفون سے ملا دو۔ اس کے بعد آپ اپنا ٹیلیفون اس کی جگہ پر رکھ دیتے ہیں۔ اب فرض کیجئے کہ مدراس اور بمبئی کے درمیان رائچور واقع ہے تو ایسی صورت میں مدراس کا ٹیلیفون اکسچنج رائچور کے ٹیلیفون اکسچنج سے دو تاروں کے ذریعہ سے جڑا ہوا ہوتا ہے۔ اس کے علاوہ رائچور کا اکسچنج بمبئی کے ٹیلیفون اکسچنج سے بھی دو تاروں کے ذریعہ سے ملا ہوا ہوتا ہے۔ اس لئے پہلے مدراس کے اکسچنج کو رائچور کے اکسچنج سے ملا کر پھر رائچور کے اکسچنج کو بمبئی کے اکسچنج سے ملا دیا جاتا ہے۔

اس کے بعد بمبئی کے اکسچینج سے اُس کے مکان کے ٹیلیفون کو ملا دیا جاتا ہے جس سے آپ بات کرنا چاہتے ہیں اور آخر میں مدراس کے اکسچینج کو آپ کے مکان کے ٹیلیفون سے ملا دیتے ہیں۔ اس طرح سے آپ ٹرنک ٹیلیفون کے ذریعہ سے مدراس میں اپنے گھر بیٹھے بمبئی کے کسی مکان سے بات کر لے سکتے ہیں۔ اگر مدراس اور بمبئی کے درمیان ناگپور کے اکسچینج کے علاوہ اور بھی کئی ٹیلیفون اکسچینج ہوں تو اس صورت میں بھی ان سب کو ایک دوسرے سے سلسلہ وار ملانا پڑے گا۔ اور مدراس اور بمبئی کے درمیان اس وقت تک بات نہیں ہو سکتی جب تک بیچ میں کے تمام ٹیلیفون اکسچینج کو باہم ایک دوسرے سے نہ ملا دیں۔ لیکن عموماً بڑے بڑے شہروں کے اکسچینج کو ایک دوسرے سے ٹیلیفون کے تاروں سے راست ملا دیتے ہیں۔ ورنہ بیچ کے مقاموں کے اکسچینج کو ملانے میں خواہ مخواہ زیادہ وقت صرف ہو جاتا ہے۔ ٹرنک ٹیلیفون کے ذریعہ سے اپنے شہر سے کسی دوسرے شہر سے بات کرنی ہو تو مزید اخراجات دینے پڑتے ہیں اور یہ اخراجات دوران گفتگو اور فاصلے کے لحاظ سے لگائے جاتے ہیں۔

اگر دور دور کے شہروں کے درمیان بات ہو رہی ہو تو بات بالکل دھیمی سنائی دیتی ہے۔ اگر فاصلہ زیادہ ہو تو ممکن ہے کہ الفاظ بالکل سنائی بھی نہ دیں۔ اس خامی کو دور کرنے کے لئے ٹیلیفون لائن کے ساتھ ساتھ ہر دو سو چار سو میل کی دوری پر ایک آلہ لگا دیا جاتا ہے۔ اس آلہ کو ٹیلیفون ریپیٹر کہتے ہیں اس کی وجہ سے الفاظ کمزور ہونے نہیں پاتے بلکہ دور دراز کے مقاموں پر بھی بالکل صاف طور پر سنائی دیتے ہیں۔

پیام رسانی کا ایک دوسرا ذریعہ ٹیلیگراف ہے۔ ٹیلیگراف اور ٹیلیفون میں یہ فرق ہے کہ ٹیلیفون کے ذریعہ سے ہر شخص کو انسان کی آواز سنائی دیتی ہے۔ لیکن ٹیلیگراف کے ذریعہ سے انسان کی بات نہیں سنائی دیتی بلکہ انگریزی حروف کے مطابق مختلف ٹک ٹکوں کی آوازیں سنائی دیتی ہیں۔ ریلوے اسٹیشنوں میں اس قسم کی آوازیں آپ نے ضرور سنی ہونگی۔ ہر اسٹیشن میں ایک ٹیلیگراف کنجی اور ایک (Sounder) یعنی کھٹکا ہوتا ہے۔ ایک اسٹیشن کے آلے کو دوسرے اسٹیشن کے آلے سے دو تاروں کے ذریعہ سے جوڑ دیا جاتا ہے۔ اس وجہ سے ایک اسٹیشن کی ٹیلیگراف کنجی کو دبانے سے دوسرے اسٹیشن کا کھٹکا بجنے لگتا ہے اور اس میں سے ڈاٹ (.) اور ڈیش (-) کی آوازیں سنائی دیتی ہیں۔ اس عمل کو "مورس سگنلنگ" کہتے ہیں۔ اس طریقہ پیام رسانی میں انگریزی حروف کے مطابق (.) اور (-) مقرر کر دئے گئے ہیں۔ چنانچہ (.) سے مراد (E) اور (..) سے مراد (I) اور (-) سے مراد (T) وغیرہ۔ اس میں ایک دلچسپی کی بات یہ ہے کہ وہ انگریزی حروف جو اکثر و بیشتر استعمال ہوتے ہیں مثلاً E ۔ I وغیرہ اُن کے لئے آسان اور چھوٹے اشارے مقرر کر دئے گئے ہیں۔ تا کہ کسی پیام کو روانہ کرنے میں زیادہ وقت صرف نہ ہو۔ ریلوے اسٹیشنوں کے لحاظ سے ٹیلیگراف لائن بھی ڈالی جاتی ہے۔ فرض کیجئے کہ ہز اکزالٹڈ ہائنس

دی نظامس اسٹیٹ ریلوے کی مختلف شاخیں سکندرآباد سے منماڑ، واڑی اور بیجواڑہ وغیرہ میں ہیں اسی لحاظ سے ٹیلیگراف لائن کی بھی مختلف شاخیں کردی جاتی ہیں۔ چنانچہ سکندرآباد تا واڑی کے درمیان جتنے بھی اسٹیشن ہوں، ان کا ایک دوسرے سے الحاق کردیا جاتا ہے۔ اگر سکندرآباد تا واڑی لائن کے ایک اسٹیشن سے اسی لائن کے دوسرے اسٹیشن کے درمیان پیام رسانی ہورہی ہو تو یہ پیام اس لائن کے تمام اسٹیشنوں کو سنائی دیگا۔ ایک اسٹیشن دوسرے اسٹیشن کو مخاطب کرنے کے لئے اپنا پورا نام نہیں بتاتا بلکہ صرف (Code) والا نام بتاتا ہے (Code میں مختلف اسٹیشنوں کے ناموں کے مطابق الفاظ مقرر کردئے جاتے ہیں۔ فرض کیجئے کہ سکندرآباد کے لئے Code) والا نام (SC) ہے۔

ریلوے کی ٹیلیگراف لائن عموماً ریلوے لائن کے ساتھ ساتھ ہوتی ہے اور اسے عموماً کھمبوں کے ذریعہ سے سنبھالا جاتا ہے۔ ریلوے کی ٹیلیگراف لائن صرف ریلوے کے پیامات کی حد تک محدود رہتی ہے۔ اور پبلک کے پیامات اس کے ذریعہ سے نہیں پہنچائے جاتے۔ پبلک کے ٹیلیگراف والے پیامات کے لئے بالکل ایک جدا لائن ڈالدی جاتی ہے۔ اور ہر شہر میں ایک ایک ٹیلیگراف آفس ہوتا ہے۔ مختلف شہروں کے آفس کو باہم ایک دوسرے سے دو دو تاروں کے ذریعہ سے جوڑ دیا جاتا ہے۔ اس طرح سے آپ ہندوستان کے کسی شہر سے دوسرے شہر کو ٹیلیگراف کے ذریعہ سے اپنا پیام روانہ کرسکتے ہیں۔ لیکن اس پیام کو اپنی منزل مقصود تک پہنچنے تک کئی ایک منزلیں طے کرنی پڑتی ہیں۔ فرض کیجئے کہ حیدرآباد سے کلکتہ کو ایک پیام جارہا ہے حیدرآباد اور کلکتہ کے درمیان والٹیر میں ایک ٹیلیگراف آفس اور بنارس میں ایک ٹیلیگراف آفس واقع ہے۔ ایسی صورت میں پہلے حیدرآباد، والٹیر کو مخاطب کرکے یہ پیام والٹیر روانہ کرے گا۔ اور آخر میں یہ پیام بنارس سے کلکتہ جائے گا۔ یہی وجہ ہے کہ ٹیلیگرافی پیامات کے پہنچنے میں چند گھنٹے درکار ہوتے ہیں۔ ورنہ جونہی ٹیلیگراف کی کنجی دبائی جاتی ہے دوسرے مقام پر خواہ وہ ہزارہا میل دور کیوں نہ ہو فوراً ٹک ٹک کی آواز سنائی دیتی ہے۔ عموماً بڑے بڑے شہروں کو راست طور پر ایک ٹیلیگراف لائن کے ذریعہ سے جوڑ دیا جاتا ہے۔ جس کی وجہ سے پیامات فوراً ایک شہر سے دوسرے شہر کو بغیر کسی دوسرے شہر کے توسط کے پہنچ جاتے ہیں۔ دو شہروں کے قریب ہونے کے باوجود بھی اُن کے درمیان ایک راست ٹیلیگراف لائن نہ ہو تو ایسی صورت میں ان شہروں کے مابین پیام رسانی دوسرے شہر کے توسط سے ہوتی ہے۔ ہم جانتے ہیں کہ حیدرآباد سے اورنگ آباد بہ نسبت بمبئی کے قریب ہے۔ فرض کیجئے کہ حیدرآباد اور اورنگ آباد کے درمیان راست ٹیلیگراف لائن نہیں ہے بلکہ حیدرآباد اور بمبئی کے درمیان ایک لائن اور پھر بمبئی اور اورنگ آباد کے درمیان دوسری ایک اور لائن ہے تو ایسی صورت میں حیدرآباد سے اورنگ آباد کو جانے والا پیام پہلے بمبئی جائیگا اور پھر بمبئی سے اورنگ آباد روانہ کیا جائے گا۔ جن مقامات پر پبلک کے لئے ٹیلیگراف لائن نہ ہو تو وہاں پر ریلوے کی

ٹیلیگراف لائن سے مدد لیجاتی ہے۔ دو ٹیلیگراف آفس کو ایک دوسرے سے دو تاروں کے ذریعہ سے جوڑا جاتا ہے۔ ان تاروں کو لوہے کے کھمبوں یا لکڑی کے کھمبوں کے ذریعہ سنبھالا جاتا ہے۔ اس قسم کی لائن کو بالائی لائن یعنی over head لائن کہتے ہیں۔ لیکن بعض مقامات پر ان تاروں کو زمین کے اندر بھی رکھا جاتا ہے اور زمین سے محفوظ رکھنے کے لئے بڑی احتیاط برتنی پڑتی ہے۔ اس کو زیر زمین یعنی (under ground) لائن کہتے ہیں۔ جب دو شہروں کے درمیان سمندر یا دریا آجائے تو ان کے درمیان کی تہہ میں ایک نہایت مضبوط تار بچھا دیتے ہیں اور ایسے آبدوز تار (Submarine) کیبل کہتے ہیں۔ ہم اپنے ملک سے سمندر پار صرف ایسے ملکوں کو پیام روانہ کر سکتے ہیں جو کہ ہمارے شہر سے آبدوز تار کے ذریعہ سے جوڑے گئے ہوں۔ لیکن لاسلکی کی وجہ سے یہ تمام دشواریاں دور ہو گئی ہیں۔ اور اس کے ذریعہ سے جس جگہ چاہیں اپنا پیام روانہ کر سکتے ہیں سمندر پار ملکوں کے درمیان ریڈیو کے ذریعہ سے پیام رسانی کرنا ہو تو ہر ملک میں ایک ایک ترسیل گاہ یعنی (Tranmitting station) اور ایک ایک موصولی مرکز یعنی (Receiving station) اور ایک ایک ٹیلیفون یا ٹیلیگراف آفس قائم کرنا پڑتا ہے۔ عموماً یہ تینوں ایک دوسرے سے دور دور واقع ہوتے ہیں۔ چنانچہ پبلک کی سہولت کی خاطر ٹیلیگراف آفس کو بیچ شہر میں بنایا جاتا ہے لیکن ترسیل گاہ اور موصولی مرکز کو شہر سے دور رکھا جاتا ہے۔ اس طرح سے کوئی پیام پہلے ٹیلیگراف آفس سے ٹیلیگراف لائن کے ذریعہ سے ترسیل گاہ کو جا کر وہاں سے نشر ہوگا۔

اور دوسرے ملک میں اس پیام کو وہاں کے موصولی مرکز میں حاصل کرکے پھر ٹیلیگراف لائن کے ذریعہ سے وہاں کے ٹیلیگراف آفس کو روانہ کیا جائے گا۔ اور بالکل اسی طرح سے وہاں سے آنے والا پیام پہلے تو وہاں کے ٹیلیگراف سے وہاں کی نشر گاہ کو جائے گا اور پھر وہاں سے نشر ہونے کے بعد اسے ہمارے ملک کے موصولی مرکز میں حاصل کرکے پھر ٹیلیگراف لائن کے ذریعہ سے ہمارے ٹیلیگراف آفس کو روانہ کر دیا جاتا ہے۔ جب ریڈیو کے ذریعہ سے ٹیلیگراف روانہ کیا جاتا ہے تو آپ کے موصولی آلہ میں ڈٹ ڈھا (dad-dah) کی آوازیں سنائی دیتی ہیں۔

فرض کیجئے کہ لفظ حیدرآباد دکن روانہ کیا جا رہا ہے تو اس وقت آپ کے موصولی آلہ میں آپ کو حیدرآباد دکن کے مطابق مختلف اشارے سنائی دیں گے۔ بحری اغراض کے لئے ریڈیو بہت اہم ہے۔ چنانچہ ہر بندرگاہ کے لئے ایک وائرلس اسٹیشن مقرر کر دیا جاتا ہے۔ جہاں سے کہ جہازوں کو پیام روانہ کئے جاتے ہیں۔ اس کے علاوہ یہ قانون بھی ہے کہ ہر جہاز میں ایک لاسلکی آلہ موجود ہو تاکہ ایک جہاز دوسرے جہاز یا بندرگاہ سے بات چیت کر سکے۔ آپ واقف ہیں کہ ہندوستان میں مختلف نشر گاہوں کے مختلف طول موج ہوا کرتے ہیں۔ چنانچہ نشر گاہ حیدرآباد کا طول موج ۴۱۱ میٹر ہے اور اورنگ آباد کی نشر گاہ کا طول موج (۳۱۹) میٹر ہے۔ لیکن جہازوں کا یہ حال ہے کہ تقریباً سب کے سب ایک ہی طول موج استعمال کرتے ہیں۔ اس کے چند فائدوں میں سے ایک فائدہ یہ بھی ہے کہ جب ایک جہاز کوئی پیام روانہ کرتا ہے تو اس کی اطلاع سب کو حاصل ہو جاتی ہے چنانچہ جب کوئی جہاز خطرہ میں ہو یا ڈوبنے کے قریب ہو

اور اس وقت خطرہ کا پیام یعنی (SOS) روانہ کرے
تو اس پیام کو سنکر دوسرے جہاز اس کی مدد کے لئے فوراً
آجاتے ہیں۔

سمندر کے بیچ میں اور چھوٹے چھوٹے جزیروں پر
بھی نشر گاہیں قائم کردی جاتی ہیں۔ جن کے ذریعہ سے دوسرے
جہازوں کو موسم کی حالت سے وقتاً فوقتاً آگاہ کیا جاتا
ہے۔ آج کل جنگ کی وجہ سے جہازوں کو تاکید کی جاتی ہے کہ
جبتک انہیں سخت ضرورت محسوس نہ ہو، اپنا ترسیلی آلہ
چالو نہ کریں۔ خصوصاً جبکہ جہاز بیچ سمندر میں نکل گیا ہو
کیونکہ دشمن کے علاقہ کے قریب پہنچکر ترسیلی آلہ کے ذریعہ
پیام روانہ کریں تو دشمن کے جہاز اس جہاز کا فوراً پتہ
لگالیتے ہیں۔ یہ پتہ کیسے لگایا جاتا ہے، ہم آئندہ کبھی بیان
کرینگے۔ بندرگاہ والی نشر گاہوں سے جہازوں کو پیام
بڑی احتیاط سے اور راز میں روانہ کئے جاتے ہیں۔ ایک
آسان طریقہ تو یہ ہے کہ (Code) بدل دیا جاتا
ہے۔ مثلاً فرض کیجئے کہ انگریزی حرف A کے لئے جو اشارہ
ڈاٹ ڈیش مقرر کیا گیا ہے، اس کے بجائے ۵ کا ہندسہ
یا ۲ کا ہندسہ یا ۴ کا ہندسہ بہر حال باہمی سمجھوتہ سے
جو چاہیں روانہ کرسکتے ہیں۔ ان اشاروں کو ہر کوئی
شخص اپنے موصولی آلہ کے ذریعہ سے سن تو سکتا ہے لیکن
دراصل کیا پیام ہے، اس کا علم صرف اُن اشخاص کو ہوتا
ہے جنھیں پیشتر ہی سے آگاہ کردیا جاتا ہے۔ اس طریقہ
پر بھروسہ نہیں کیا جاسکتا۔ چنانچہ ایک دفعہ بھی راز افشا
ہوجائے تو دشمن ہر پیام کو آسانی سے سمجھ جاتے ہیں۔
لیکن آج کل ایک اور طریقہ پر مخفی طور سے ریڈیو کے
ذریعہ سے بات چیت ہوا کرتی ہے۔ مثلاً ہندوستان اور
انگلستان کے درمیان دو شخص ایک دوسرے سے بات
کر رہے ہوں تو ان کی بات چیت سوائے ان دونوں کے
دنیا میں کسی کو بھی نہیں سنائی دیتی۔ اس کا اصول آئندہ
کبھی بیان کرینگے۔ ریڈیو کے ذریعہ سے آپ دریا میں بھی
ہوں تو اپنے مکان کا ٹیلیفون ملا کر بات کرسکتے ہیں۔
لیکن اس قسم کا انتظام خاص خاص جہازوں میں ہوا کرتا ہے۔

جہازوں اور بندرگاہوں کے علاوہ ہر طیارہ میں
ایک لاسلکی آلہ ہوتا ہے جسکے ذریعہ سے ایک طیارہ دوسرے
طیارہ سے یا ہوائی اڈے سے بات کرسکتا ہے اور اپنا
مقام بھی معلوم کرسکتا ہے۔ جب طیارہ پہاڑی مقام
میں سے اُڑ رہا ہو اور چوطرف کہر پھیلی ہوئی ہو تو ہوا
باز کو کچھ بھی دکھائی نہیں دیتا۔ اور اس وقت طیارہ
کو خطرہ لگا رہتا ہے۔ لیکن اس خطرہ کو دور کرنے کیلئے
ایک دلچسپ انتظام استعمال کیا جاتا ہے۔ ہوائی اڈے
کے وائرلس اسٹیشن میں اس بات کا انتظام کیا جاتا ہے کہ
اگر طیارہ ایک ہوائی اڈے سے دوسرے ہوائی اڈے
کو اپنے ٹھیک راستہ سے جارہا ہو تو اس وقت ہوا
باز کو اس کے (Head Phone) کے ذریعہ سے
جو کہ اس کے کانوں پر لگا ہوا ہوتا ہے ایک مسلسل آواز
سنائی دیگی۔ لیکن اگر ہوا کے زور سے طیارہ بائیں طرف
نکل گیا ہو تو ہوا باز کو اس قسم کی آواز (— .) سنائی
دے گی۔ اور اگر طیارہ دائیں طرف نکل گیا ہو تو اس
(. —) کی آواز سنائی دے گی۔ اس قسم کی آواز کو
سنکر ہوا باز طیارہ کو اتنا موڑتا ہے کہ پھر اپنے وہی

مسلسل آواز سنائی دے۔

آج کل جتنی بھی جنگی چیزیں ہیں مثلاً جنگی موٹر آبدوز، دبابے وغیرہ، سب میں لاسلکی آلے موجود ہوتے ہیں۔ حتیٰ کہ سپاہیوں کے ساتھ بھی چھوٹے چھوٹے آلے ہوتے ہیں۔ جن کے ذریعہ سے یہ پانچ یا دس میل دور کے لوگوں سے بات کرسکتے ہیں۔ فوج کے کمانڈروں کے ساتھ نہایت اعلیٰ قسم کے لاسلکی آلے ہوتے ہیں۔ جن کے ذریعہ سے وہ اپنی فوجوں، بمبار طیاروں، جنگی موٹروں اور جہازوں کو وقتاً فوقتاً ہدایتیں دیا کرتے ہیں۔ فوج کے علاوہ پولس میں بھی ریڈیو کا استعمال نہایت کارآمد ہے۔

پولس کے لئے ایک تو مرکزی لاسلکی اسٹیشن ہوتا ہے جہاں سے پولس کی چوکیوں کو پیامات روانہ کئے جاتے ہیں اس کے علاوہ پولس کے لاریوں میں بھی لاسلکی آلے لگا دئے جاتے ہیں۔ اور یہ لاریاں ملک کے اطراف چکر لگاتی ہیں اور وقتاً فوقتاً مرکزی اسٹیشنوں کو پولس کی رپورٹ دیا کرتی ہیں۔

بہر حال دنیا میں جنگ اور صلح دونوں زمانوں میں ریڈیو نہایت کارآمد ہے۔

سید محمد محمود جعفری

چند مشرقی ممالک کی حالیہ تاریخ

(بہ سلسلۂ گزشتہ)

فلسطین انگریزوں کے فلسطین پر قبضہ کے بعد یہودیوں نے ایک سوال اٹھایا کہ جو یہودی فلسطین میں بود و باش کرنا چاہتے ہیں انہیں وہاں قیام کی اجازت دی جائے کیونکہ یہ ان کا مقدس مقام ہے۔ ۱۹۱۷ء میں لارڈ بالفور نے انہیں قومی سکونت گاہ کی اجازت دے دی لیکن اس شرط کے ساتھ کہ وہاں کی آبادی کے حقوق کا لحاظ کیا جائے گا۔ ۱۹۲۰ء میں سر ہربرٹ سیموئل نے یہودیوں کو ملک میں آنے کا موقعہ دیا کیونکہ وہ خود یہودی تھا۔ ۱۹۲۱ء میں یہودیوں کی آمد کے خلاف جافا میں شورش پھیلی۔ تصفیہ کیا گیا کہ ایک مختصر پارلیمنٹ جس کے اراکین منتخب (۱۲) ہوں گے، ملک کا انتظام کرے گی۔ لیکن جب اس پر عمل نہ ہو سکا تو حکومت نے خود اپنی نگرانی قائم کرلی۔ باہمی مناقشات کا کوئی تصفیہ نہ ہو سکا۔ یہودی یہ کہتے تھے کہ عرب غیر متمدن ہیں۔ عرب یہ کہتے تھے کہ یہودیوں کو برطانوی حکومت کی حمایت میں ایسے ملک میں زبردستی بلایا گیا جو صدیوں سے عربوں کے قبضے میں تھا۔ لطف تو یہ ہے کہ ان دونوں قوموں میں بھی مختلف پارٹیاں تھیں۔ نہ تو عربوں کے تمام قبائل متحد الرائے تھے اور نہ یہودیوں میں اتفاق آرا تھا۔ عربوں کی قومی تحریک کے صدر الحاج امین الحسینی تھے۔ یہ ترکی فوج کا ایک سپاہی تھے۔ ان کی امداد کے لئے اونی بے ایک وکیل تھے جو پیرس کی کانفرنس میں شریک رہ چکے تھے۔ سر ہربرٹ سیموئل نے اول الذکر کو ۱۹۲۰ء کی شورش میں رہائی دلادی اور انہیں مفتی اعظم کی حیثیت سے منتخب کردیا۔ اونی بے نے آزادی حاصل کرنے کے لئے ایک پارٹی قائم کردی جس کا نام "استقلال" رکھا گیا۔ ان کا یہ ادعا تھا کہ یہودیوں کو باہر نکالنے کے پہلے ہی برطانوی حکومت سے نجات حاصل کرنی چاہئے۔

اس کے برخلاف یہودیوں نے از ابتدا تا انتہا برطانوی حکومت کے ساتھ تعاون عمل کیا۔ برطانوی حکومت نے نئی سڑکیں بنائیں، نئے مدارس قائم کئے اور عراق عرب سے پٹرول لانے کے لئے پائپ لائین دوڑادی۔ یہودیوں نے ہزاروں ایکڑ بنجر زمین کو زرخیز کرکے برطانوی حکومت کی رقمی امداد کی جس کی وجہ سے برطانوی حکومت کو اصلاحات کے نفاذ میں سہولت ہوئی۔ یہودیوں نے سرکاری رقومات کے ماسوا اپنے ذاتی صرفہ سے مدارس اور صحت گاہ تعمیر کرادی اور تل ابیب کی بندرگاہ بھی قائم کردی۔

پہلا حملہ ۱۹۲۹ء میں ہوا جب کہ عربوں کی بغاوت کو فرو کردیا گیا اور (۱۳۰) یہودی مارے گئے۔ دوسرے سال یہودیوں کی رسد روک دی گئی۔ بیت المقدس میں یہودی ایک دیوار کو مقدس مانتے ہیں جسے (Wailing wall) کہا جاتا ہے شہر کے وسطی مسجد کے معاملہ کو اور سنجیدہ بنادیا۔ ۱۹۳۶ء میں کہیں کہیں مناقشے ہوتے رہے۔ لیکن اب تو جافا سے بغاوت شروع ہو کر سخت ترین صورت حال پیدا ہوگئی۔ انگریزوں کو تقریباً (۳۰) ہزار سپاہیوں کی مدد سے امن قائم کرنا پڑا۔ ان جھگڑوں میں عورتیں اور بچے بھی مارے گئے اور کئی مکانات کو آگ بھی لگائی گئی۔

۱۹۳۶ء میں مسٹر پیل کے تحت ایک کمیشن مقرر کیا گیا جس نے تحقیقات کے بعد فلسطین کو تین حصوں میں تقسیم کرنے کی سفارش کی۔

(۱) جنوب مشرق میں عربوں کی نوآبادی (۲) شمال مغرب میں یہودی آبادی (۳) یروشلم کے اطراف غیر جانب دار منطقہ جس میں بیت المقدس، بیت لحم و نازرتھ کے مقدس مقامات شامل ہوگئے اور یہ منطقہ بین الاقوامی قیادت میں آگئے۔

فلسطین کے ساتھ جارڈن کا ضلع بھی برطانوی قیادت میں دیا گیا تھا۔ عربوں کو بادشاہ کے انتخاب کا موقعہ دیا گیا اور انھوں نے حجاز کے شاہ حسین کے دوسرے لڑکے عبداللہ کو ۱۹۲۳ء میں حکومت کرنے کی اجازت دی۔ ۱۹۲۵ء میں معان اور عقابا کے علاقوں کو اس میں شامل کر کے

جاردون کے حدود کو بحر قلزم تک وسعت دی گئی۔

۱۹۳۶ء میں جب عراق و مصر برطانوی قیادت سے علٰحدہ ہوگئے تو فلسطین میں برطانوی حکومت کا قیام امر محال ہوگیا۔ اگر پیل کمیشن کی سفارشات پر عمل کیا جاتا تو یہودیوں کے قتل عام کا خوف تھا اس لئے برطانوی حکومت نے اس تقسیم کو نامناسب خیال کیا۔

عرب جنگ عظیم کے قبل عرب دو سیاسی حلقوں پر منقسم تھا: (۱) جزیرہ نمائے عرب کا ریگستانی علاقہ:- یہاں خود مختار قبائل کی حکومت تھی۔ (ب) عرب کا ساحلی علاقہ:- یہ زیادہ زرخیز علاقہ ہے اس پر مملکت عثمانی (ترکی) کی حکومت تھی۔ جنگ عظیم سے کچھ عرصہ پہلے صوبہ الحسا پر نجد کے قاسم ابن سعود کی حکومت قائم ہوچکی تھی لیکن عراق، شام، فلسطین اور بحیرۂ قلزم کا ساحل ترکوں کے ہاتھ میں تھا۔ برطانوی قبضہ صرف عدن باب المندب اور جزیرہ پیرم پر تھا۔

جنگ کے زمانے میں عربوں نے اتحادیوں کا ساتھ دیا۔ وجہ یہ تھی کہ وہ ترکوں کے انقیاد سے علٰحدہ ہونے کے خواہاں تھے۔ ایک انگریز افسر میجر لارنس نے عربوں میں اپنا اچھا خاصہ اثر جما لیا تھا عربوں کو امید تھی کہ اگر وہ انگریزوں کا ساتھ دیں تو جنگ عظیم کے بعد انہیں مکمل آزادی نصیب ہوگی۔ فرانس کو شام کے علاقے میں اپنا اثر قائم رکھنا ضروری تھا اور انگریزوں کو عراق کے تیل کے چشموں کو حاصل کرنے کی خواہش تھی اس لئے صلح نامۂ وارسائی کے بموجب جب شام میں فرانسیسی حکومت قائم کردی گئی اور عربوں کے منتخب کردہ شاہ فیصل کو علٰحدہ کردیا گیا اور اس کے ساتھ ہی برطانوی قیادت شام، عراق، فلسطین و جاردون پر قائم ہوگئی تو عربوں کو بے حد مایوسی ہوئی۔ عربوں کی یہ خواہش نہ تھی کہ صرف جزیرہ نمائے عرب خود مختار رہے بلکہ وہ تمام حلقہ جہاں عرب آبادی موجود ہے اپنے حق خود ارادیت کو قائم رکھے۔ ولسن کے چودہ نکات میں اس حق کو تسلیم کرلیا گیا تھا لیکن صلح نامۂ وارسائی نے عرب آزادی کی تمام امیدوں پر پانی پھیر دیا۔

عرب کے اندرونی علاقوں میں ابن سعود نے نجدی قبائل کے ساتھ تقریباً تمام عرب پر رفتہ رفتہ اپنی حکومت قائم کرلی۔ ۱۹۲۱ء میں اس نے جبل شامر کے قبائل کو فتح کرلیا۔ ۱۹۲۳ء میں اس نے چند حاجیوں کو قتل کردیا اور ۱۹۲۹ء میں اس نے حجاز کے بادشاہ حسین کو بھی اپنی مملکت سے باہر کردیا۔ حسین کا تعلق آنحضرتؐ کے خانوادہ سے تھا۔ یہ ترکوں کی حکومت کے زمانے میں والیٔ مکہ تھے۔ جب ترکی میں خلافت قائم نہ رہی تو یہ خلیفہ تسلیم کیا گیا۔ ۱۹۲۵ء میں اس کی افواج نجد کے وہابی قبائل کا مقابلہ نہ کرسکیں۔ اس طرح ابن سعود کو مکمل کامیابی نصیب ہوئی اور اس نے جدہ کو اپنا جدید صدر مقام بنایا۔ برطانیہ حسین سے بھی صلح نامہ کرنا چاہتا تھا۔ لیکن جب ابن سعود نے انکار کیا تو انگریزوں نے ۱۹۲۶ء کے صلح نامۂ جدہ کے لحاظ سے حجاز پر ابن سعود کی خود مختارانہ حکومت کو تسلیم کرلیا۔ متعدد قبائل نے ابن سعود کی خود مختاری کو تسلیم کرلیا۔ جنوب مغرب میں امیر شناہ اس کے خاص حلیفوں میں سے تھا۔ لیکن جب یحییٰ نے (یہ امیر شناہ کا نام تھا) عدن کے انگریزوں سے چھیڑ چھاڑ کی تو ابن سعود کے ذریعے یحییٰ کو اطاعت پر مجبور کیا گیا۔ اس کے بعد "سعودی عرب" کے حاکم ابن سعود کے خلاف بھی سازشیں ہونے لگیں اور اب بھی اس کی حیثیت مختلف قبائل کے مقتدر سردار سے زیادہ بہتر نہیں ہے۔ حتیٰ کہ اس کے بعض مخالفین نے ۱۹۳۵ء میں اس کو قتل کرنے کی کوشش بھی کی تھی۔

عراقِ عرب صلح نامۂ وارسائی کے لحاظ سے جب انگریزی افواج نے جنرل ماڈ کے تحت عراق میں اپنا قدم جمایا تو عراقیوں کو بے حد مایوسی ہوئی۔ کیونکہ یہ خود مختاری کا خواب دیکھ رہے تھے۔ برطانوی فوج کو سماوا میں محصور کرلیا گیا۔ (۴۰۰) انگریز قتل ہوئے اس کے بعد برطانوی افواج نے بہ مشکل تمام اس بغاوت کو فرو کیا۔ اس کے بعد انگریزوں نے اعلان کیا کہ وہ عرب بادشاہ اور عربوں کی ایک مجلس کو

حکومت کا موقع دینا چاہتے ہیں۔ عربوں نے شاہ فیصل کو اپنا سردار منتخب کیا اور انگریزوں نے اس سے یہ معاہدہ کرلیا کہ انگریزوں کی نگرانی میں وہ اپنی حکومت قائم کرے گا۔

شاہ فیصل کے انتخاب کی وجہ سے تمام ہمسایہ علاقے انگریزوں سے ناراض ہوگئے۔ ایک طرف ایرانیوں نے اس کی مخالفت کی تو دوسری طرف فرانسیسیوں نے کیونکہ شاہ فیصل پہلے شام کا والی تھا جسے انھوں نے اپنی حکومت قائم ہونے کے بعد علٰحدہ کردیا تھا۔ چونکہ شاہ فیصل ابن سعود کے قدیم دشمن حسین کا لڑکا تھا۔ اس لئے اس نے بھی اس انتخاب کی مخالفت کی۔ لیکن سب سے قوی مخالفت ترکوں کے جانب سے تھی۔ ترک موصل کو اپنے تحت لینا چاہتے تھے کیونکہ وہاں کی بیشتر آبادی نہ ترکوں کی تھی نہ عربوں کی بلکہ کردوں کی۔ کردی قوم ترکوں کی حمایت کر رہی تھی اس لئے ۱۹۲۴ء میں ترکوں نے موصل فتح کرنے کے لئے فوج روانہ کردی لیکن جب ترکوں نے اس مسئلہ کو بین قومی تصفیہ پر حصہ کردیا تو اس مجلس نے موصل کا زیادہ علاقہ عراقی حکومت کے تحت کردیا اور تھوڑا سا حصہ ترکوں کو مل گیا۔

نیز ۱۹۲۵ء کے مذکورہ تصفیہ کے بموجب یہ بھی قرار دیا گیا کہ برطانوی حکومت ربع صدی تک عراقیوں پر نگرانی رکھے تاوقتیکہ کسی قبل کی تاریخ میں مجلس بین قومی خود اس کی خود مختاری کا اعلان کردے۔

اس تصفیہ کے بعد عراق میں دو جماعتیں قائم ہوگئیں۔ بعض انتہا پسندوں نے شورش پیدا کرنے کا خیال کیا لیکن چونکہ شاہ فیصل اعتدال پسند حکمران تھا اس لئے عراقیوں کو تفہیم کردی کہ برطانوی حکومت اس قدر قوی ہے کہ اسے جلد ترہٹایا نہیں جاسکتا۔

۱۹۲۱ء سے ۱۹۲۵ء تک برطانوی حکومت نے پارلیمانی اصول پر حکومت قائم کرنے کی کوشش کی لیکن انہیں دو وجوہ کی بنا پر ناکامیابی رہی۔ ایک تو یہ کہ برطانوی طرز حکومت کو عراقیوں نے ٹھیک سے نہ سمجھا دوسرے یہ کہ شیعہ وسنی اختلافات کی وجہ سے کابینہ میں نشستوں کے مناسب کا تصفیہ نہ ہوسکا۔ خود برطانوی حکومت نے تقریباً (½ ۱) کروڑ پونڈ فوجی اخراجات کے لئے صرف کردئے تھے چنانچہ برطانوی پارلیمنٹ کی جانب سے اس پر اعتراضات ہو رہے تھے۔ اخراجات کی زیادتی کے باوجود انگریز عراق کے تخلیہ کے لئے آمادہ نہ تھے کیونکہ انھوں نے عراق کی پٹرول کی کان پر کام شروع کردیا تھا۔ بالآخر ۱۹۲۹ء میں برطانوی حکومت نے تین سال بعد عراق کی خود مختاری کو تسلیم کرنے کا مشورہ دیا اور بین قومی مجلس نے ۱۹۳۲ء میں عراق کی خود مختاری حسب ذیل شرائط کے ساتھ تسلیم کرلی۔ (۱) عراق برطانیہ کا حلیف رہے گا۔ بہ زمانۂ جنگ اس کی امداد کرے گا اور برطانوی طیاروں کے قیام کی اجازت دے گا۔ (۲) عراق کا والی اپنی اقلیتوں کے حقوق کی محافظت کرے گا۔

عراق سے برطانوی اقتدار ہٹ جانے کے بعد کردیوں کی بغاوت ہوئی۔ ترکی نے بین قومی مجلس کے تصفیہ کو قبول کرلیا تھا کیونکہ اٹلی اور فرانس دونوں اس کے مخالف تھے۔ ابن سعود کے وہابیوں کی نگاہیں بھی کردوں پر جمی ہوئی تھیں۔ کردوں نے متعدد بغاوتیں کیں، اور ترکوں کی حکومت کو انھیں فراہم کرنے میں دقتیں پیش آئیں۔

موصل کی عیسائی آبادی کا مسئلہ بھی پیچیدہ ہوگیا۔ ۱۹۳۳ء میں وہ عراق چھوڑ کر شام میں بسنا چاہتے تھے۔ لیکن فرانسیسیوں نے انہیں جگہ نہ دی۔ جب یہ دوبارہ عراق واپس آنے لگے تو عراقی حکومت نے اس شرط پر واپس لینا پسند کیا کہ وہ اپنے ہتیار حکومت کے حوالے کردیں لیکن جب انھوں نے انکار کیا تو ان عیسائیوں سے مقابلہ رہا۔ شاہ فیصل اس زمانے میں یورپ کی سیر کر رہے تھے۔ جب انھیں ان واقعات کا علم ہوا تو وہ فوراً عراق واپس ہوئے لیکن ان کی واپسی کے قبل ہی کئی عیسائی قتل کردئے گئے تھے۔ اتفاق کی بات ہے کہ شاہ فیصل کا بھی انتقال ہوگیا

۱۹۳۵ء کے بعد شاہ فیصل کے لڑکے غازی کی حکومت قائم ہوئی۔ ان کی عمر (۲۰) سال کی تھی۔ انھوں نے انگلستان میں تعلیم پائی تھی۔
۱۹۳۶ء کے انتخابات کے بعد جب پارلیمنٹ نے جبری فوجی بھرتی کا اعلان کیا تو ملک میں بدامنی پھیلی۔ سپہ سالار بکر صدقی نے آمرانہ حکومت شروع کردی۔ سابقہ پارلیمنٹ مستعفی ہوگئی۔ ۱۹۳۶ء میں بکر صدقی کو قتل کردیا گیا۔
۱۹۳۹ء تک عراق میں شاہ غازی کی حکومت تھی۔ اس وقت ان کے کم سن لڑکے ایک مجلس نیابت کے تحت حکمران ہیں۔ ایک پارٹی جو بکر صدقی کے مخالف تھی مصر میں سکونت اختیار کرلی ہے اور موقع کی منتظر ہے کہ وہ عراق واپس آکر اپنی قوت قائم کرے۔
اندرونی مناقشات کے باوجود عراق رفتہ رفتہ ترقی کر رہا ہے۔ ۱۹۳۱ء میں موصل کے پٹرول کو بحر متوسط تک لے جانے کے لئے پائپ اندازی کی گئی تھی وہ تقریباً تکمیل کو پہونچ گئی ہے۔ اس طرح عراق کی تجارتی ترقی کے امکانات میں اضافہ ہو رہا ہے۔

ایران

جنگ عظیم کے وقت ایران میں شاہ احمد کی حکومت تھی لیکن مختلف قبائل خود مختار تھے۔ ۱۹۰۷ء میں برطانیہ نے جنوب مشرق میں اور روس نے شمال میں اپنا حلقۂ اثر قائم کرلیا تھا اور تصفیہ یہ ہوا کہ ان دونوں حلقوں کے درمیان کا علاقہ دونوں یوروپی اقوام کے مشترکہ حلقۂ اثر میں ہوگا۔ روس کی بدامنی کے زمانے میں برطانیہ نے شاہ احمد کو اپنا حلیف بناکر ۱۹۱۶ء میں تمام ایران پر اپنا اثر قائم کرلیا تھا۔
۱۹۲۱ء میں ایرانی قومیت کو ترقی دینے اور بیرونی اثرات سے ملک کو بے نیاز کرنے کے لئے ایک نوجوان فوجی افسر رضا خاں کے تحت چند نوجوان ایرانی اکٹھے ہوئے اور انھوں نے بادشاہ کو مجبور کیا کہ وہ رضا خاں کو اپنی کابینہ میں بحیثیت وزیر فوج شریک کرے۔ ۱۹۲۳ء میں رضا خاں وزیر اعظم ہوگیا اور اس نے امریکہ سے ڈاکٹر ملسپاؤ وغیرہ کو طلب کرکے ایران کے مالیہ کو مستحکم کرلیا۔ اسی سال شاہ احمد ایران چھوڑ کر فرانس میں رہنے بسنے لگا۔ اس نے انگریزوں کے معاہدہ کو منسوخ کردیا اور جو سردار امریکی مشیروں کی رائے کے خلاف ٹیکس ادا کرنے سے انکار کرنے لگے انہیں اطاعت پر مجبور کردیا۔ ۱۹۲۴ء میں شیخ محمرہ جو ان مخالفین کا سرگروہ تھا ٹیکس دینے کے لئے آمادہ ہوگیا۔ اس کے بعد ۱۹۲۸ء میں ان یوروپین عدالتوں کو اٹھادیا گیا جہاں یوروپین ججوں کی نگرانی میں اجنبیوں کے مقدمات کا فیصلہ کیا جاتا تھا۔ ۱۹۲۷ء میں امریکی مشیر مالیہ ڈاکٹر ملسپاؤ کو علحدہ کردیا گیا اور ان کی بجائے جرمنی سے ڈاکٹر لنڈن بلاٹ کو مشیر مقرر کیا گیا۔ ایران میں "اینگلو پرشین آئل کمپنی" انگریزوں کی نگرانی میں قائم کی گئی تھی۔ اس کی مدت کو ختم ہونے تیس سال درکار تھے لیکن رضا خاں نے ۱۹۳۲ء میں انگریزی کمپنی کو برخاست کردیا۔ جب انگریزوں نے یہ مسئلہ بین قومی مجلس میں پیش کیا تو اس نے یہ تصفیہ کیا کہ یہ کمپنی ۱۹۹۳ء تک ایران میں قائم رہے گی۔ اس نے ۱۹۳۳ء میں ایک اور حکم یہ نافذ کیا کہ سرکاری عہدہ داروں کو اجنبیوں کا استقبال کرنے کی ضرورت نہیں۔ رضا خاں کے خلاف شیراز، سرباز، اصفہان اور دوسرے مقامات پر بغاوتیں ہوتی رہیں ان میں سب سے اہم ۱۹۳۴ء میں بختیاریوں کی بغاوت تھی لیکن ان کو آسانی سے فرو کردیا گیا۔ کیونکہ اجنبیوں کے خلاف جو قوانین اس نے نافذ کئے تھے ان کی وجہ سے وہ ملک میں ہردل عزیز ہوگیا تھا۔ نیز یہ کہ یہ بغاوتیں انفرادی حیثیت رکھتی تھیں نہ کہ اجتماعی۔
رضا خاں نے ملک کی معاشی حالت بھی درست کی۔ روس سے مشین خرید کر روئی کے کارخانے قائم کردئے۔ طہران و عراق کے درمیان موٹروں کی آمد و رفت کے لئے نئی سڑک بھی بنوائی۔ بحیرۂ خزر سے خلیج فارس تک ریل بھی تعمیر کردی گئی۔ افیون

کی پیداوار کو روکنے کی کوشش کی ۔ فرانسیسی ماہرین کی نگرانی میں تعلیم کو بھی ترقی دی ۔ ۱۹۳۷ء میں ترکی، ایران، عراق اور افغانستان کے مابین معاہدہ سعدآباد ہوا جس کے لحاظ سے تصفیہ ہوا کہ یہ چاروں دول ایک دوسرے کی باہمی امداد کریں گی ۔

مصطفےٰ کمال کی ترقی ترکوں کے تعلیم یافتہ حلقے میں ہوئی جہاں اس نے جلد تر آمر کا مرتبہ حاصل کر لیا ۔ اس کے جانشین کے زمانے میں ترکوں کی ترقی یقینی ہے لیکن رضا شاہ کی حکومت ایسے ماحول میں ہوئی جہاں نہ تو تعلیم زیادہ ہے اور نہ لوگوں کے دماغ سے شاہی اقتدار کے اثرات ناپید ہوئے ہیں ۔ اس لئے رضا شاہ کے بعد بھی جمہوری حکومت کے قیام میں دقتیں پیش آرہی ہیں ۔

گنیش چند

غزل

امیدیں ہنسیں زندگی مسکرا دی
یہ کس کی نگاہوں نے بجلی گرا دی

غم اپنا دیا لذتِ غم بڑھا دی
کس عنوان سے اس نے دادِ وفا دی

خوشا اشکِ غم یہ گماں ہو رہا ہے
حدیثِ وفا آج میں نے سنا دی

یہ جلووں کی رعنائیاں اللہ اللہ
نہ جانے مجھے آپ نے کیوں سزا دی

جنوں ایک مرکز پہ آنے لگا تھا
نقاب اس ستمگر نے رخ سے ہٹا دی

اسی کی نظر پر کھلا رازِ ہستی !
تیری راہ میں جس نے ہستی مٹا دی

ترے اک تبسم پہ او ناوک افگن
مرے دل کے زخموں نے کیا کیا دعا دی

دو عالم ہیں رقصاں مری مستیوں پر
مجھے آج ساقی نے وہ مئے پلا دی

میں اس وحشتِ دل پہ قربان عرشیؔ
رہِ منزلِ شوق جس نے دکھا دی

عرشی

عورت کا ایک پیکر

وہ سوچتے سوچتے تھک گئی مگر خیالات تھے کہ طوفانی لہروں کی طرح امڈے چلے آتے تھے۔ مطلع ابر آلود تھا اور برسات کی ٹھنڈی ٹھنڈی ہوائیں اس کے بالوں کی لہروں سے کھیل رہی تھیں۔ برسات کی راتیں یوں ہی اداس سی ہوتی ہیں اس پر گھٹاؤں کا ہجوم اور ثریا کے ننھے دماغ پر خیالات کا چھایا ہوا طوفان، معلوم ہوتا تھا کہ دماغ پھٹ کے آسمانی ابر کی طرح فضا میں بکھر جائے گا۔ کھانے کی گھنٹی بھی ہوگئی۔ اچھلتی کودتی لڑکیاں رنگین ہواؤں کی طرح برآمدے سے ہوتی ہوئیں کھانے کے کمرے میں غائب ہوگئیں۔ ثریا کوئی نئی لڑکی نہ تھی مگر اسکول کے لڑکے اور لڑکیاں عام طور پر ان ساتھیوں کو بالکل نکّو بنا لیتے ہیں جن کے خیالات، جن کی وضع قطع ان سے مختلف ہو اور اگر سچ پوچھئے تو یہ صرف اسکول کے بچوں ہی پر منحصر نہیں بلکہ عام طور پر دنیا والے کچھ فطرتاً اس قسم کے واقع ہوئے ہیں۔ نئے خیالات پر نئی بنیادیں ڈالنے والے اور نئے راستے پر چلنے والوں پر اس انوکھی دنیا نے ہمیشہ انگلیاں اٹھائی ہیں — ثریا کو بھی اپنے خیالات، ماحول اور واقعات کے اختلافات کی وجہ سے اکثر لڑکیوں کی شوخ نگاہوں اور تیز زبانوں کا نشانہ بننا پڑتا تھا۔

وہ فطرتاً جیسی بھی ہو مگر اس کے حالات نے اس کو سنجیدہ اور متین بنا دیا تھا وہ مجبور تھی کہ جب اور لڑکیاں خوش گپیوں میں معروف ہوں تو وہ کچھ سوچے۔ دیکھا گیا ہے کہ جب دماغی کاوشیں بہت بڑھ جاتی ہیں تو وہ اکثر روشنی میں آنے کے لئے جسمانی نشو و نما کا استعمال کرتی ہیں۔ مشہور مصنف طامس ہارڈی کہتا ہے "روشنی طبع کی چمک کے لئے زندگی کے تیل کی ضرورت پڑتی ہے"۔ اسی لئے اکثر ذہنی طور پر مکمل انسان جسمانی طور پر ناقص سے ہوتے ہیں مگر ثریا کچھ ایسی کشش و جاذبیت لے کے آئی تھی جس کو اس کی ذہنی کاوشیں کچھ زیادہ متاثر نہ کرسکیں۔ اس کی صبیح پیشانی وبنیس جیسا دہانہ سیاہ چمکدار آنکھوں میں ذہانت ہر وقت موجزن رہتی تھی وہ ایشیا کی ان تجلیوں میں سے تھی جو زندگی کے افق پر چمکیں اور کسی کی نگاہوں کو خیرہ کئے بغیر گمنامی میں غائب ہوگئیں۔

آخری مرتبہ جب اس نے اپنے والد کے خشک اور درشت چہرے پر نظر ڈالی تھی تو اس کو وہم و گمان بھی نہ تھا کہ پھر وہ برسوں اسے نہ دیکھ سکے گی۔ اس کو وہ دن یاد آرہا تھا جب اس کا باپ اسے اس اسکول میں داخل کرانے کے لئے لایا تھا۔ ثریا نے معصوم دماغ پر اپنے باپ کے چہرے کے نقوش ٹٹولنے کی کوشش کی پھر اسے اپنے والد کی آنکھیں یاد آئیں۔ وہ آنکھیں جو اکثر جھکی رہتی تھیں اور جن میں بارہا اس نے اپنی محبت ڈھونڈی تھی۔ مگر وہ کچھ نہ پاسکی اس کی آنسوؤں سے ڈبڈبائی آنکھوں نے وہ منظر پردۂ ماضی پر دھندلا دھندلا پیش کر دیا جسے وہ اکثر خواب میں بھی دیکھا کرتی تھی۔ شام کی بڑھتی ہوئی سیاہی میں سفید کفن لپٹا ہوا جسم، اس کی ماں کی پرنور پیشانی پر چمکتا ہوا کافور۔ اف اس کی آنکھوں میں ٹھہرے ہوئے آنسو بے اختیار ڈھلک پڑے پھر اس کو اپنے بچپن کے ساتھی اور پڑوسی خوبصورت لمعان کا ننھا چہرہ یاد آیا۔ معمولی وہ واقعہ جب وہ دونوں ایک بوتل دودھ اور کچھ بسکٹ لے کے گھر سے تن تنہا ایک جزیرہ کی تلاش میں گئے تھے لمعان نے اس چھوٹی کشتی کو جو غالباً کسی ماہی گیر کی تھی اپنا جہاز بنا کر دریا کی طوفانی لہروں کے سپرد کر دیا تھا۔

ثریا کیسے ڈری مگر وہ محض اس خیال سے کہ کچھ نہ بولی تھی کہ لمعان اسے چھوڑ کے تنہا چلا جائے گا۔ کیونکہ دریا میں جزیرہ تلاش کرنا اس کا محبوب ترین

لمان تھا۔ اف! پتوار اس کے ہاتھ سے چھوٹ گئے تھے اور بڑی مشکل سے ایک ملاح نے اس کی کشتی کنارے پر پہونچائی تھی۔ اس کی نظروں میں چھوٹے لمعان کا خوبصورت اور بہادر چہرہ پھر گیا اور وہ سوچنے لگی کہ کیا بچھڑے ہوئے ایام کبھی واپس نہ آئیں گے۔ واقعات اس کو اپنے شانوں پر لئے ہوئے ماضی کی دھندلی گلیوں سے گزرتے رہے یہاں تک کہ وہ سو گئی۔

زندگی کے تیز رفتار قدم بڑھتے رہے۔ ثریا اسکول کے ماحول سے ایک حد تک مانوس ہو چکی تھی اور ماحول بھی اسے اپنے میں جذب کرنے پر مجبور ہو گیا تھا کہ یکایک واقعات نے کروٹ لی اس کو اپنے والد کے خط سے معلوم ہوا کہ اس سال کے اختتام پر اسکول کے آخری امتحان سے سبکدوش ہونے کے بعد وہ اپنے گھر جائے گی اب اسے اس گوشۂ عافیت کو الوداع کہنا تھا۔ یہ عورت کی نزاکت کہئے یا سادگی کہ وہ اپنے ماحول سے اپنے ساتھیوں سے خواہ وہ کیسے ہی ہوں کچھ مانوس سی ہو جاتی ہے اور ہر اس چیز سے جس سے اسے کچھ انس سا ہو گیا ہو جدائی اسے گوارا نہیں ہوتی۔ مردوں کی طرح "تازہ بہ تازہ نو بہ نو" کے انقلاب پسند راستے پر چلنا اسے پسند نہیں۔ ایک ہی گھر میں پیدا ہونا، بڑھنا، بسنا اور وہیں مرجانا اس کے لئے کوئی نئی بات نہیں۔ ثریا کے دل و دماغ پر اس آنے والے واقعہ نے ضرور اثر کیا مگر امید کی اک ہلکی سی شعاع میں اسے نظر آیا کہ وہ گھر جا رہی ہے۔ "گھر" جو ہر شخص کے لئے کچھ نہ کچھ جاذبیت رکھتا ہے۔ اس کو اپنی بوڑھی پھوپی، بوڑھے باپ اور چھوٹے لمعان کا چہرہ بیک وقت نظر آیا اور وہ مطمئن سی ہو گئی۔ گھڑگھڑاتی ہوئی گاڑی کسی تھکے ہوئے مسافر کی طرح ٹھیر گئی۔ ثریا نے سر باہر نکال کر اسٹیشن پر اچٹتی ہوئی نگاہ دوڑائی ...... اف! وہی لوہے کا پل وہی کھیت وہی پرانے در و دیوار یکایک اس کی نظر ایک جگہ رک گئی۔ دور کھمبے کے پاس اس نے اپنے باپ کا مخصوص چغہ اور سفید سر کسی خوبصورت سیاہ بالوں والے سر کے مقابل جھکا ہوا دیکھا اس کے باپ کا مخاطب جہاز کا کوئی نوخیز افسر معلوم ہوتا تھا۔ نیلے کوٹ پر چمکدار سنہری بٹن گہری نارنجی آنکھیں، چمکتی ہوئی کشادہ پیشانی، دراز قد۔ کوئی سامان اتارنے آیا اور ثریا نے بہ مشکل اپنی نظریں ہٹالیں۔

"ثریا کیپٹن لمعان سے ملو۔ تم کو یہ یاد تو ہوں گے"۔ اس نے اپنے والد کو کہتے سنا۔ حیرت و استعجاب سے اس کی خوب صورت آنکھیں کھلی کی کھلی رہ گئیں۔ "اچھا آپ ہیں"۔ اس نے بہ مشکل کہا۔ "جی ہاں۔ کچھ ایسا ہی معلوم ہوتا ہے" اس کی آواز اس کے باوقار ہونے کا ثبوت تھی۔ "بے شک" دونوں مسکرانے لگے۔ "کہئے آپ نے یہ تو بتایا ہی نہیں کہ آپ اتنے دنوں تک کہاں رہیں"۔ "آپ نے پوچھا ہی کب تھا" ثریا نے حاضر دماغی سے کہا۔ "اچھا تو اب پوچھ رہا ہوں مجھے ابھی ابھی معلوم ہوا کہ آپ عرصۂ دراز کے بعد یہاں واپس آئی ہیں چونکہ میں بھی اس زمانے میں باہر ہی رہا اس لئے یہ نہ معلوم ہو سکا کہ آپ کہاں تھیں"۔

"میں اب تک کانونٹ میں تھی چھٹیاں بھی وہیں گزارنی پڑتی تھیں اس لئے گھر والوں سے کبھی آپ لوگوں کے متعلق کچھ معلوم بھی نہ ہو سکا۔ اب تو گھر پر ہی رہوں گی۔ کہئے آپ کی والدہ تو اچھی ہیں"۔ "ہاں اچھی ہیں اور تمہیں یاد کرتی ہیں۔ یقیناً دیکھ کے خوش ہوں گی کہ ان کی ثریا اب اتنی لمبی اور خوب صورت ہو گئی ہے۔ اور ہاں یہ تو بتاؤ کہ اب تم گھر پر کیا کرو گی۔ گڑیاں کھیلنے کا ارادہ نہ ہو تو چلو تمہیں بحر منجمد جنوبی کی سیر کرالائیں۔ حال میں میں جس جہاز کا کپتان مقرر ہوا ہوں وہ مختلف مقامات کی سیر کرتا ہوا بحر منجمد جنوبی جا رہا ہے۔ ہم تقریباً سال بھر بعد لوٹ آئیں گے۔ مگر کون کہہ سکتا ہے کہ کب لوٹیں گے! کبھی آئیں گے بھی کہ نہیں۔

ایک مرتبہ جب لنگر اٹھا دیا جہاز کو پانی کی خونخوار موجوں سے کش مکش کرنے کے لئے چھوڑ دیا۔ سر پر نیلا آسمان نیچے نیلا سمندر تو حد نگاہ تک

صرف قدرت کے یہی دو عنصر۔ سچ ثریا! اگر انسان زندگی کو ایک سفر فرض کرلے تو وہ بہترین سفر بذریعہ جہاز ہوگا۔ اف! کیا زندگی ہے ملاحوں کی ایک اپنی دنیا ہوتی ہے جو اس تعمیر و تخریب کی دنیا سے دور۔ تمام کثافتوں سے پاک، سادگی کی لطافتوں سے معمور"۔

وہ خدا معلوم ابھی اور کیا کیا کہتا مگر اسٹیشن کی سرحد ختم ہوچکی تھی۔ ثریا نے دیکھا کہ والد کو صرف اسی کا انتظار ہے۔ کچھ تکلف اور کچھ جلدی میں وہ یہ سوچ نہ سکی کہ لمعان کو خدا حافظ کیسے کہے "خدا حافظ ثریا" الفاظ فضا میں ڈوب گئے۔ گاڑی کے پہیئے گھومنے اور ثریا کے سامنے وہی پرانی سڑک اور دو رویہ درختوں کی قطاریں تھیں۔ اُف! بھولا بسرا ماضی پھر اس کے حواس پر چھایا جاتا تھا۔ وہی سرسبز کھیت، شاداب کیاریاں، سرخ چھتوں والی پیلی جھونپڑیاں چاندنی کی طرح شفاف چشمہ اور فاختہ کی اداس آوازیں۔ الہٰی جب زمانہ نہیں بدلا تو اس میں یہ انقلاب کیوں ہے وہ محسوس کررہی تھی کہ اب وہ اتنی چھوٹی نہیں رہی جب وہ بے تکلف ان کیاریوں کی روشوں پر دوڑا کرتی تھی اور کھیتوں کی منڈیر پر سیر کرتی تھی۔

شکسپیر کا قول ہے کہ زندگی ایک اسٹیج ہے اور مرد، عورتیں محض اداکار، جو ہر طرح خوش و ناخوش اپنا مقررہ کردار ادا کرتے ہیں اور چلے جاتے ہیں۔ اگر بعض ہستیاں آسمان شہرت و کامرانی پر درخشاں ستاروں کی طرح چمکتی ہیں تو بعض گم نامی و ناکامی کے تنگ و تاریک غار میں ناکام زندگی کے آخری لمحات گزار کے ہمیشہ کے لئے روپوش ہوجاتی ہیں۔ ثریا کا باپ پروفیسر زیدی خشک دل و دماغ لے کے آیا تھا جس نے زندگی کی لطافتوں سے کبھی محبت ہی نہیں کی بعض لوگوں کا خیال تھا کہ اس کے سینے میں وہ دھڑکتا ہوا دل ہی نہیں ہے، جہاں سے محبت کے نغمے بیدار ہوتے ہیں اور جن کی مدہوشی دماغ کے خشک سوتوں کو جاری کردیتی ہے۔ اس نے کبھی اپنے فرایض کی ادائیگی کے علاوہ محبت و یگانگت کو نہیں پہچانا۔ وہ اپنے عقاید میں "کانٹ" کا پیرو تھا جس کے نزدیک دلی مفروضہ جذبات محض اصطلاحات کا دوسرا نام تھا۔ وہ اپنی اس خشک زندگی کا اس درجہ عادی بن چکا تھا کہ ثریا بے چاری ماں کی محبت سے محروم ہوجانے کے بعد تمام عمر یہ نہ جان سکی کہ شفقت پدری کسے کہتے ہیں۔

دوپہر ڈھل رہی تھی۔ ماہ مئی کا گستاخ آفتاب شفاف آسمان پر پیتل کی تھالی کی طرح چمک رہا تھا درختوں کے سائے میں چڑیاں لو کی زد سے بچنے کے لئے سہمی ہوئی بیٹھی تھیں انگور اور عشق پیچاں کی بیلیں مرجھائی جاتی تھیں۔ غسل خانے میں ثریا اپنی نیلی آنکھوں والی بلی کو نہلا رہی تھی اور آہستہ آہستہ کچھ گنگناتی بھی جارہی تھی کہ یکایک باہر اطلاعی گھنٹی بجی۔ "اس وقت بھلا کون آسکتا ہے۔ شاید ڈاکیہ ہوگا"۔ نیلم کو آخری بار ٹب میں غوطہ دے کر جلدی جلدی ہاتھ خشک کرتی ہوئی وہ ملاقاتی کمرے کی طرف چلی۔ پردہ ہٹاکر اس نے دیکھا کوئی اجنبی سفری لباس میں باہر کھڑا ہے وہ الٹے پیروں واپس آئی اور اپنی پھوپی کو اطلاع دینے کے بعد بلی کے بالوں کا برش لے کر نیلم کی تلاش میں پچھلے برآمدے میں چلی گئی۔ جب وہ واپس آئی تو اس نے سنا کہ اجنبی اس کی پھوپی سے کہہ رہا ہے۔

"کل شام جب میں اس راستے سے گزرا تو خیال آیا کہ پروفیسر صاحب سے ملتا چلوں"۔ "بڑا اچھا کیا تمہارا گھر ہے میں نے تو تم کو بالکل بچہ سا دیکھا تھا تمہاری والدہ مرحومہ خدا انھیں کروٹ کروٹ جنت نصیب کرے زیدی کو ہمیشہ حقیقی بھائی کی طرح سمجھتی رہیں"۔ "پروفیسر صاحب شہر سے کب تک واپس آئیں گے" اجنبی نے پوچھا۔ "یہی کل شام تک اور ہاں آج کل ثریا بھی تو یہیں ہے"۔ "کون ثریا......؟"

"زیدی کی لڑکی۔ سچ ہے۔ تم نے اسے کہاں دیکھا ہوگا۔ بالکل اپنی ماں کی چھوٹی تصویر ہے وہی شہابی رنگ سیاہ آنکھیں بھولا بھالا چہرہ۔۔"

ثریا کو اپنی پھوپی کی اس بے تکلفی پر غصہ آنے لگا اور وہ دبے پیر وہاں سے چلی آئی۔

اس واقعہ کو کئی ہفتے گزر گئے موسم میں بھی کچھ تبدیلی آچکی تھی دوپہر گزر چکی تھی شام ہونے میں ابھی دیر تھی اور سورج کی ترچھی شعاعیں درختوں کے

درمیان آنکھ مچولی کھیل رہی تھیں۔ چاندنی کا سا پانی کوئیں کی نالیوں میں سے ہوتا ہوا کیاریوں میں بہہ رہا تھا ننھی ننھی چڑیاں کروندے کی جھاڑیوں میں چہچہا رہی تھیں۔ ثریا موگرے کے جھنڈ کے نیچے ایک چھوٹی سی بنچ پر بیٹھی فرانسیسی شاعر مصنف وکٹر ہیوگو کا مشہور و معروف المیہ "لے مزرابل" پڑھنے میں اس قدر محو تھی کہ اسے یہ معلوم ہی نہ ہو سکا کہ کب کوئی باغ میں آیا اور کب سے وہ بنچ کے سامنے کھڑا ہوا ہے۔ اسے خبر بھی نہ ہوتی گر نیلم اس کی گود سے نکل کر چھوٹی چڑیوں پر جو لڑتے لڑتے گر پڑی تھیں جھپٹی' سفید ریشمی سوٹ اور سن ہیٹ ہاتھ میں لئے وہی اجنبی سامنے کھڑا تھا جسے ایک مرتبہ وہ جلتی تپتی دوپہر میں برآمدے میں دیکھ چکی تھی۔ ثریا گھبرا کے کھڑی ہو گئی اس کا بس چلتا تو بغیر کچھ کہے سنے چپ چاپ وہاں سے ہٹ جاتی۔ گر اب جائے بھی تو کیسے وہاں راستہ بھی ہو۔

"معاف کیجئے گا خاتون۔ میں پروفیسر زیدی سے ملنا چاہتا ہوں معلوم ہوتا ہے گھر میں کوئی بھی نہیں۔ لہٰذا میں ادھر چلا آیا" اس غیر متوقع صورت حال سے وہ کچھ گھبرا سی گئی۔ ناول کا وہ باب جس میں وہ اس قدر محو تھی یہ تھا کہ درختوں کے ایک تاریک جھنڈ کے پیچھے (Marius) میریس کی محبوبہ (cousit) کوزٹ اپنے خیالات میں محو بیٹھی ہے اور میریس زندگی میں پہلی مرتبہ درختوں کے پیچھے سے نکل کر اس کے بنچ کے بالکل قریب کھڑا ہو جاتا ہے۔ خیالات کو حقیقت میں اتنی جلدی ڈھلتے ہوئے شائد ہی کسی نے کبھی دیکھا ہو۔ وہ اجنبی سہی مگر اس وقت وہ آیا۔ میریس کی طرح شائد وہ اپنی گھبراہٹ چھپا نہ سکی بڑی مشکل سے اس نے کہا "اوہ! آپ پپا سے ملنا چاہتے ہیں"۔ "تو کیا مجھے خاتون ثریا سے شرف نیاز حاصل ہے۔ آداب خاتون۔ کہئے پروفیسر صاحب کہاں ہیں۔" "اوپر کے کمروں میں ہوں گے آپ ڈرائنگ روم میں تشریف رکھئے وہ یہیں آجائیں گے"۔

وقت کے سبک رفتار قدم شاہراہ زندگی سے گزرتے چلے جا رہے تھے۔ گرمی کے بعد برسات کی پرکیف گھٹائیں چھائیں اور کھل گئیں۔ اب جاڑے کی آمد آمد تھی حالانکہ موسم بے حد خوش گوار تھا مگر ثریا کے دل پر گھٹا سی چھائی ہے' کھلتی ہے نہ برستی ہے" فرانسیسی طرز کی کھلی ہوئی کھڑکی کے سامنے کھڑے کھڑے وہ پھٹی پھٹی آنکھوں سے باہر خلا میں گھور رہی تھی۔ دور کسی خزاں رسیدہ شاخ پر بلبل اپنے پروں میں لپٹی لپٹائی بیٹھی زندگی کے خاموش نوحے میں مصروف تھی۔ کبھی کبھی فضاؤں میں' ویرانی میں بسنے والے فلاسفر کی دلدوز چیخ بلند ہوتی اور پھر غائب ہو جاتی۔ اکتوبر کا نیا چاند دور کھجور کی شاخوں کے پیچھے چھپ رہا تھا۔ ثریا نے روشنی گل کر دی"۔ "وہ آخر ہیں کون — کم سے کم مجھے یہ تو معلوم ہونا چاہئے۔ کیا پپا یہ سمجھتے ہیں کہ میں ان کی مخالفت کروں گی' یا مجھے ان کے انتخاب میں چون وچرا کرنے کی جرأت ہوگی۔ کس قدر ناانصافی ہے باوجود تعلیم یافتہ و تجربہ کار انسان ہونے کے وہ یہ غیر ضروری سمجھتے ہیں کہ زندگی کے اس طویل راستے پر مجھے بھی اپنے راہبر کے متعلق کچھ سوچنا سمجھنا چاہئے۔ خیر یوں ہی سہی"۔ "میں نے کب کہا کہ میں اسے بہت ہی ضروری سمجھتی ہوں کہ اس شخص کے متعلق مجھے کچھ ضرور بتایا جائے"۔ ان کے حکم کے سامنے میرا سر نیاز ہمیشہ سے خم ہے۔ مانا کہ ان کو میری خوشی کا پاس نہیں ہے "نہ سہی" مگر میرا شعار ہے کہ ان کے حکم کے سامنے سر جھکاؤں اور اسی لئے میں نے ان کی خوشنودی ہمیشہ مدنظر رکھی .... مگر یہ معاملہ کس قدر اہم ہے' میری زندگی سے کس قدر گہرا تعلق رکھتا ہے کیا گزرا ہوا وقت' منھ سے نکلی ہوئی بات اور کمان سے نکلا ہوا تیر کبھی واپس آسکتا ہے۔ پھوپی لمعان کی ماں سے یہ کہہ رہی تھیں کہ رئیسوں کی اولاد ہیں سب کچھ ہے ثریا آرام کی زندگی بسر کر سکے گی۔ ...... ہوگا" یکایک ثریا کو لمعان کا خیال آیا۔ وہ ہوتا تو ان سے سب کچھ معلوم ہو جاتا۔ ممکن تھا کہ وہ دیکھ بھی لیتی۔ مگر لمعان کہاں۔ وہ تو دور کسی بحر ناپید اکنار میں موجوں کی کشمکش میں مصروف ہوگا۔ ثریا کا

دل بیٹھ گیا "خیر جو کچھ بھی ہوگا دیکھا جائے گا۔ میں کوئی مزاحمت نہ کروں گی ورنہ لوگوں کو سب سے پہلے میری تعلیم کو بدنام کرنے کا موقعہ ملے گا ... پھوپی کو ہمیشہ سے میرے تعلیم یافتہ ہونے کا فدشہ ہے۔ وہ تو یہ کبھی نہیں سمجھتیں کہ تعلیم ہی آدمی کی بہیمیت پر انسانیت وتہذیب کا خول چڑھاتی ہے وہی اس کو اعتدال صبر و برداشت اور مستقل مزاجی کے زرین اصولوں سے آگاہ کرتی ہے۔ اور وہی انسان میں قربانی اور حقیقی ایثار کا جذبہ پیدا کرکے اس میں ماحول سے مانوس ہوجانے کی صلاحیت پیدا کرتی ہے"۔

کہتے ہیں کہ آنے والے واقعات اپنا عکس پہلے سے ڈال دیتے ہیں۔ ثریا کے خیالات بھی اس کی زندگی کی ان حقیقتوں کا پیش خیمہ ثابت ہوئے جن سے وہ آئندہ دوچار ہونے والی تھی۔ بوڑھے پروفیسر نے اپنی پونجی خرچ کرکے اس آخری فرض سے سبکدوشی حاصل کرلی۔ غمگین و فکرمند ثریا کا ہاتھ ایک دولتمند جاگیردار کے ہاتھ میں دے دیا۔ قصبہ کی بوڑھی عورتوں اور جوان لڑکیوں نے اس کی قسمت پر رشک کیا اور شہر کے معزز طبقے میں کامران کو خوش نصیب سمجھا گیا۔

شادی کی ضیافت کے سلسلے میں جو شاندار ڈنر دیا گیا تھا وہ بارہ بجے ختم ہوا۔ تھکے ماندے کامران نے بھاری قدموں سے اپنی دلہن کے کمرے کا رخ کیا۔ دروازے میں کھڑے کھڑے اس نے پردہ ہٹا کے دیکھا۔ ثریا سامنے کونے میں ایک نیچی کرسی پر بیٹھی ہوئی اپنے زانو پر رکھی ہوئی کتاب پڑھنے میں مصروف تھی۔ اس کا خوب صورت چہرہ لیمپ کی سبز شعاعوں میں چمک رہا تھا روشنی چھن چھن کے اس کے سنہری اور جڑاوی زیورات کی نازک زنجیروں کو جھنکار رہی تھی۔

"ہلو ثریا" وہ چونک پڑی، اس کی متحیر نظروں نے دیکھا کہ اس کا شوہر وہی اجنبی انسان ہے جسے اس نے اس دن باغ میں دیکھا تھا وہ گھبرا کے کھڑی ہوگئی اور کتاب اس کے زانوؤں سے لڑھکتی ہوئی فرش پر اوندھی گر پڑی۔ سامنے قد آدم آئینے میں اس کی جھکی ہوئی نگاہوں نے دیکھا کہ کامران آگے بڑھا۔ "تشریف رکھیے" اس نے ثریا کو بٹھاتے ہوئے کہا اور خود سامنے آرام کرسی پر بیٹھ گیا۔

"مجھے دیکھ کر شائد آپ کو تعجب ہوا۔ لیکن یقین جانئے کہ میں آپ کو یہاں دیکھ کے بے حد خوش ہوں۔ آج سے چند مہینے پیشتر میری آپ سے جب باغ میں اتفاقی ملاقات ہوئی تو آپ کی معصومیت نے مجھ سے یہ کہا کہ صرف آپ ہی وہ ہستی ہوسکتی ہیں جس کے ہاتھ میں اپنی زندگی سونپ دینے کے بعد مطمئن رہ سکوں گا۔ آپ ہی میری رفیق حیات ہوسکتی ہیں اور آپ ہی کے ساتھ میں انتہائی سکون و اطمینان کی زندگی گزار سکتا ہوں۔ والدہ مرحومہ کے بعد آپ پہلی مبارک ہستی ہیں جس نے یہ گھر بسانے کا اقدام کیا ہے مجھے امید ہے کہ آپ اسے رونق بخشیں گی یہ گھر آپ کا ہے اور آپ اس کی بلا شرکت غیرے مالکہ ہیں۔ میں خوب جانتا ہوں کہ "عورت" کے پیکر میں ضروری نہیں کہ ہمیشہ عورت ہی ہو لیکن اگر خوش نصیبی سے کسی کو عورت کی غمگساری کا شرف حاصل ہوجائے تو یقین کیجئے کہ وہ خوش نصیب ہے عورت جو دراصل عورت ہے وہ انسان کی زندگی کو جنت بنا دیتی ہے اس میں وہ قوتیں پوشیدہ ہیں جو اسے عورت کی سرحد سے گزر کر فرشتوں کی دنیا میں لے جاتی ہیں اس کا ارادہ چٹان سے زیادہ مضبوط اور اس کی محبت سمندر سے زیادہ وسیع اور گہری ہوتی ہے اس کا صبر و استقلال، اس کی قربانیاں اور اس کا ایثار خود اپنا جواب ہیں۔ مجھے آپ سے امید ہے کہ آپ میری بہترین مونس وغمخوار ثابت ہوں گی کیونکہ میری دوربین نظروں نے دیکھ لیا تھا کہ آپ عورتوں کی سب سے اول صف میں کھڑی کی جاسکتی ہیں۔ مجھے امید ہے کہ آپ میری عیب پوشی کریں گی اور میں آپ کو خوش رکھ سکوں گا۔

وہ کہتا چلا جارہا تھا اور شاید کچھ اور کہتا۔ ایک دم اس کا چہرہ سرخ ہوگیا شراب کے بخارات اس کے دماغ تک پہونچ چکے تھے۔
اس نے آرام کرسی پر لیٹ کر اپنی آنکھیں بند کرلیں تھوڑی دیر میں وہ بے خبر سوگیا۔ ثریا اس کے خراٹوں کی آواز سن کر ایک دم چونک پڑی اس نے پہلی مرتبہ کامران کے چہرے کو بغور دیکھا۔ پہلی مرتبہ اس نے محسوس کیا کہ کمرے میں عجیب قسم کی بوسی پھیلی ہوئی ہے۔ "کیا وہ اک شرابی کے ساتھ بالکل اکیلی ہے" اس کا دل عجیب طرح دھڑکا اور اس کی بڑی بڑی آنکھیں اور بھی کشادہ ہوگئیں۔ وہ کسی گہری سوچ میں ڈوب گئی۔ گھڑی' منٹ سکنڈ اور گھنٹے بجاتی رہی مگر ثریا کی آنکھیں بغیر جھپکے ہوئے بدستور کھلی رہیں۔
کہتے ہیں کہ نیند پھانسی کے تختے پر بھی آجاتی ہے۔ صبح کی ٹھنڈی ہواؤں نے اسے بھی چند لمحوں کے لئے دنیائے فکر و آلام سے بے خبر کردیا مگر فوراً ہی وہ پھر سے چونک پڑی۔ اس نے خمار آلود نگاہوں سے گردوپیش نظر ڈالی ایک دم اس کی آنکھیں کھل گئیں۔
کامران ہنوز سو رہا تھا کتاب اسی طرح اوندھی پڑی تھی۔ لیمپ اب بھی جل رہا تھا۔ ثریا نے لیمپ گل کرکے کرسی کے ہتھے پر خاموشی سے اپنا سر رکھ دیا۔ کچھ دیر بعد جب اس نے اپنا سر اٹھایا تو سامنے آئینے میں دو خوب صورت لیکن سرخ سرخ آنکھیں اسے گھور رہی تھیں۔
زندگی وقت کے شانوں پر بڑی تیزی سے مصروف سفر تھی دنیا کی بہت سی گردشیں ختم ہوگئیں مگر ثریا کی زندگی میں کوئی انقلاب نہ آیا۔ سوسائٹی میں مسٹر و مسز کامران دنیا کے خوش نصیب ترین انسان سمجھے جاتے تھے۔ ثریا کی زبان' انداز' نگاہیں سب وفاداری سے اس کی غم گسار و رازدار ہیں۔ اس نے اپنے دل کو مختلف طریقوں سے بہلایا اور وہ ایک حد تک کامیاب بھی رہی۔ آج کل اس کا زیادہ وقت موٹی موٹی کتابوں کی ورق گردانی میں صرف ہوتا تھا اور اکثر وہ ان مردہ مصنفین کے ساتھ دفن رہتی تھی۔ کامران اکثر گھر سے باہر رہتا تھا اور عام طور سے اس کی راتیں "ڈیویکوز" (DEVICOS) یا ہوٹلوں میں گزرتی تھیں۔ لیکن وہ گھر پر ہو یا نہ ہو' ثریا سونے سے پہلے بہت احتیاط سے اپنا کمرہ بند کرلیتی تھی کیونکہ اس کو شرابیوں سے ڈر لگتا تھا اور نفرت بھی بہت تھی۔ دوسری طرف کامران نے اسے غنیمت سمجھتے ہوئے کبھی مزاحمت نہ کی۔ اس کا صاف ستھرا گھر ایک سلیقہ مند خاتون سے آباد تھا۔ کیا یہ کافی نہیں پھر اس کو اپنے راز کی حفاظت بھی تو کرنا تھی۔ ثریا سمجھ دار سہی مگر وہ اس سے آنکھیں چار کرنا نہ چاہتا تھا۔
ثریا کو اپنے والد کے خط سے معلوم ہوا تھا کہ لمعان اپنی شاندار سیاحت سے واپس آچکا ہے مگر اس کو یہ خیال بھی نہ آیا کہ وہ اس کو دیکھنے آسکتا ہے۔ اک خوش گوار صبح جب موسم بہار اپنی پوری جولانی پر تھا ثریا انار اور نارنگیوں کی کلیوں کے سائے میں بیٹھی کیٹس کی مشہور نظم "بلبل" پڑھ رہی تھی کہ آیا نے طشتری میں ایک کارڈ پیش کیا۔ "کیپٹن لمعان"
غیر ارادی طور پر اس کے ہاتھ کانپ سے گئے۔ مگر وہ فوراً سنبھل گئی "صاحب کو اطلاع دو"۔ "بیگم صاحب وہ گھر پر موجود نہیں"
"اچھا ڈرائنگ روم میں بٹھاؤ۔ میں خود آتی ہوں"۔
ڈرائنگ روم میں وہ اتنی خاموشی سے داخل ہوئی کہ لمعان کو جو دروازے کی طرف پیٹھ کئے ہوئے ثریا و کامران کی شادی والی تصویر دیکھنے میں منہمک تھا اس کے آنے کی خبر بھی نہ ہوئی یہاں تک کہ ثریا نے خود ہی کہا۔ "صبح بخیر لمعان"۔
"آہاہ آپ ہیں۔ مزاج شریف! آپ تو بالکل بدل گئیں' کچھ مزاج تو خراب نہیں ہے"۔ "میں بالکل اچھی ہوں۔ مگر ماشاء اللہ آپ پر تو سمندری آب و ہوا نے بہت اچھا اثر کیا ہے" اور واقعی لمعان صحت و تندرستی کا حسین مجسمہ معلوم ہو رہا تھا۔

"ارے ہٹائیے! کچھ اپنی کہئے"۔ "کیا کہوں بالکل اچھی ہوں' ادہر دو ایک سال سے ذرا ہلکی ہلکی کھانسی کی شکایت ہوگئی ہے اور تو کچھ نہیں"۔ "یعنی یہ بذات خود کچھ کم ہے۔ آپ کے شوہر نے آپ کا علاج شروع نہیں کیا؟"۔ "میں نے ان سے ذکر بھی نہیں کیا بھلا اس میں بھی کوئی علاج کی ضرورت ہے۔ اپنی سیر و سیاحت کا کچھ حال سنائیے"۔ لمعان کسی سوچ میں پڑ گیا۔ پھر وہ یکایک چونک کے کہنے لگا۔ "اچھا تو آپ کچھ نہیں بتائیں گی۔ نہ بتائیے میں سب سن چکا ہوں۔ معلوم نہیں کیوں آپ یہ خودکشی گوارا کر رہی ہیں۔ تعلیم یافتہ اور روشن خیال ہوتے ہوئے آپ نے اپنی زندگی برباد کرلی آخر میں پوچھتا ہوں دنیا آپ کو اس کا بدلہ کیا دے گی؟۔ خود وہ حضرت آپ کی کیا قدر کر رہے ہیں؟ کیا مذہب قانون اور سوسائٹی کے دروازے آپ کے لئے بند ہوگئے ہیں جو آپ نے اس کنج قفس میں گھٹ گھٹ کے مرجانے کا فیصلہ کرلیا ہے؟"۔ "آپ کا مطلب کیا ہے؟" ثریا نے کچھ حیرت سے استفسار کیا۔ "میرا مطلب کچھ نہیں سوائے اس کے کہ مجھ سے نہیں دیکھا جاتا کہ آپ اس طرح آہستہ آہستہ گھل گھل کے ختم ہو جائیں سرمایہ داری آپ کو کچل ڈالے اور قبر کے اندھیرے گھر کے علاوہ آپ کا کوئی ٹھکانہ نہ رہے۔ اف میرا دماغ پھٹنے لگتا ہے جب میں اس وقت کا خیال کرتا ہوں جس وقت زمانے نے اپنی معصوم ترین ہستی کو ایک اندھے بے حس دیوتا کی بھینٹ چڑھا دیا۔ ثریا ہم بچپن سے ساتھ پڑھے' ساتھ کھیلے اور ساتھ رہے کون جانتا تھا کہ ہمارا انجام یہ ہوگا۔ میں نے جب سنا کہ آپ کی شادی ہوگئی ہے اور آپ خوش ہیں تو یقین کیجئے میں خوش تھا۔ مگر اتفاق سے چند دن بیشتر بوڑھے نذیر نے مجھے آپ کی تمام داستان سنائی وہ کہتا تھا کہ برسوں وہ آپ کے شوہر کا رازدار ملازم رہا ہے میں کہتا ہوں اس احمق نے شادی ہی کیوں کی۔ کیا محض سوسائٹی کی مشتبہ نظروں سے بچنے کے لئے۔

ثریا کا چہرہ فق ہوگیا۔ اف وہ راز جسے وہ اپنے سینے میں چھپا کے مرجانا چاہتی تھی' جس کو وہ اپنے ساتھ قبر میں دفن کرنا چاہتی تھی کسی اور تک پہنچ چکا ہے۔ لمعان کہتا رہا "میں آپ کی بےکسی پر تڑپ کے رہ گیا۔ میرا دل خون ہوگیا۔ بتائیے اب بھی کچھ ہوسکتا ہے؟"۔ "ہاں ہوسکتا ہے لیکن وعدہ کیجئے کہ آپ سب کچھ کریں گے"۔ ثریا نے گھٹی آواز میں بہ مشکل کہا۔ "خدا کی قسم میں وہ سب کچھ کروں گا جو آپ چاہیں"۔ "تو سنئے آپ میرے لئے صرف یہ کرسکتے ہیں کہ اس راز کو اپنے سینے میں دفن کرلیں۔ میری بےبسی کا خیال چھوڑ دیں۔ وہ میرے مجازی خدا ہیں مجھے ان کی ہستی پر اپنا سب کچھ قربان کرنا ہے۔ خدا اور بندے کے درمیان لین دین کا سوال نہیں ہوتا وہاں قربانی و ایثار کی قدر ہوتی ہے پھر مجھے شکایت کیوں ہو' پھر مجھے احساس بےبسی کیوں ہو۔ ان کی عزت میری ہستی سے وابستہ ہے۔ آپ میرے لئے صرف یہ کرسکتے ہیں کہ میرے راز کی حفاظت کیجئے۔ نذیر سے کہہ دیجئے اسے غلط فہمی ہوئی ہے۔

نئے سال کا مبارک دن تھا۔ سمندر کے کنارے عجیب چہل پہل تھی لوگ اپنے بہترین لباسوں میں سجے سجائے ادہر ادہر پھر رہے تھے کچھ رنگین شیڈز کے نیچے چائے نوشی میں مصروف تھے۔ کچھ شوقین مزاج چھوٹی چھوٹی کشتیوں کی دوڑ میں حصہ لے رہے تھے۔ حسین لڑکیاں بالوں میں رنگ برنگ کے پھول سنوارے ریت پر بیٹھی تھیں۔ خوب صورت بچے ساحل پر رنگین سیپیاں جمع کرنے میں مشغول تھے۔ لمعان پانچ سال بعد اس ساحل پر پھر اترا۔ پہلی چیز جو اسے یاد آئی وہ ثریا تھی۔ ان رنگین فضاؤں سے جلدی جلدی گزرتا ہوا وہ ایک سنسان سڑک پر ہولیا۔ ایک اونچی چار دیواری کے سیاہ پھاٹک کو دھکا دے کر لمعان اندر چلا گیا۔ باغ کی روشیں خشک پڑی تھیں۔ کیاریوں میں پھولوں کی مرجھائی ہوئی پتیاں خاک میں مل رہی تھیں۔ گھر کا کونہ کونہ کس مپرسی کی حالت میں پکار پکار کر کہہ رہا تھا کہ "وہ جو ہمیں آباد کرنے آیا تھا اب نہیں رہا"۔

لمعان کا دل ایک مرتبہ زور سے دھڑکا اس نے متجسس نگاہوں سے چاروں طرف دیکھا مگر زندگی کی کوئی علامت اسے نظر نہ آئی۔ وہ کھویا ہوا مایوس انداز میں کھڑا تھا کہ بلبل کی دردناک آواز نے اسے متوجہ کرلیا بے اختیار اس کے قدم اس طرف اٹھ گئے جہاں سے آواز آرہی تھی۔ سامنے مغربی کونے میں ایک اداس بھوری قبر تھی جس کے اوپر گلاب کے درخت کی پتیاں پھیلی پڑی تھیں۔ ایک تنہا شاخ پر غمگین بلبل اپنا درد انگیز راگ الاپ رہا تھا۔ لمعان بے اختیار قبر پر سر رکھ دیا ——— تھوڑی دیر بعد جب اس نے اپنی آنسوؤں سے بھیگی ہوئی آنکھیں اٹھائیں تو اس کی نظریں لوح مزار کے ان لفظوں پر جم کر رہ گئیں ؎

"مجھ کو اب ڈر رہا نہیں کوئی — ہو گئے مردہ میرے احساسات
ایسی اک شئے میں کھو گئی جس کو — چھو نہیں سکتیں وقت کی آفات
میری محرومیٔ حیات کا راز — دفن ہے میری زندگی کے ساتھ"

"ثریا" مورخہ ... —

عائشہ حسین

تجلیات

مسکراتا ہی رہا غم سے پریشاں نہ ہوا
میرے چہرے سے غمِ عشق نمایاں نہ ہوا

میں نے پی کیفِ محبت کی شراب آنکھوں سے
میں کسی حال میں آلودۂ عصیاں نہ ہوا

دیکھ احساسِ محبت کی بلندی اے دل!
شکوۂ دوست کبھی لب پہ نمایاں نہ ہوا

شوق وہ شوق ہے جس کو نہ ملا صبر و سکوں
درد وہ درد ہے جو طالبِ درماں نہ ہوا

دل کے زخموں نے کبھی تیرگی ہونے ہی نہ دی
کون سی رات مرے گھر میں چراغاں نہ ہوا!

میں تو موجوں کے تلاطم ہی سے گھبرا جاتا
وہ تو یہ کہئے کہ اندازۂ طوفاں نہ ہوا

عظیم (حیدرآبادی)

بھائی

جب کارل کھیت کا کام کرکے ناشتہ کے لئے آیا تو ایک پوسٹ کارڈ اس کی میز پر دھرا تھا۔ اس کے چھوٹے بھائی سِیل نے لکھا تھا۔ وہ اپنی خالہ کے ساتھ انسبرگ میں بچپن سے رہتا تھا۔ عرصے سے وہ نہیں ملے تھے۔ اس کا بڑا بھائی والٹر اور ڈاکیہ کافی پی رہے تھے۔ کارل نے بڑی بہن میریا کو آواز دی۔ وہ ہانپتی ہوئی آئی۔ اس کی عمر ۳۵ کے لگ بھگ ہوگی۔ مگر ۴۰ سے متجاوز معلوم ہوتی تھی۔ "سِیل گرما گزارنے آرہا ہے"۔ کارل نے مسکراتے ہوئے کہا۔ سچ! کیا مزا آئے گا۔ پیارا سِیل۔ آنکھیں اسے دیکھنے ترستی ہیں اور دل تڑپتا ہے۔ کیسا بانکا ہوگا وہ!" "مبارک" ڈاکیہ نے کافی کا آخری گھونٹ پیتے ہوئے کہا۔ کارل خوشی میں سیٹی بجا رہا تھا اور میریا پھولے نہیں سماتی تھی۔

اتوار کو گرجا کے گھنٹے بج رہے تھے۔ لیکن کارل نہیں گیا۔ وہ روبی کے باغ میں اس کے حسن کی گل چینی کرنے چلا گیا۔ روبی کپڑے سکھا رہی تھی۔ ٹہنیوں میں سے سورج کی روشنی چھن کر روبی کے حسین چہرہ کو دمکا رہی تھی۔ وہ دبے پاؤں اس کے قریب آکر چند منٹ تک لطف اٹھاتا رہا۔ "روبی" اس نے ترنم میں کہا۔ جیسے وہ اچھل گئی۔ "آؤ پیارے"! اس نے سر اس کی جانب گھماتے ہوئے کہا۔ گھنی پلکوں کا ننھا سایہ اس کے سرخ گالوں پر ناچ رہا تھا اور چمکیلی لٹیں چہرہ کو چوم رہی تھیں۔ کارل تڑپ کر اس کے پاس بیٹھ گیا۔ "کپڑے ہوا سے تتر بتر ہو رہے تھے، اٹھاتے ہوئے میری کمر دکھنے لگی" کارل نے اس کی کمر پر ہاتھ پھیرا۔ وہ گدگدی سے مچلنے لگی اور اس کے قہقہوں سے پھول بھی مسکرانے لگے۔ "سِیل آرہا ہے"۔ "کون سِیل" "چھوٹا بھائی' جس کا میں دو تین بار ذکر کرچکا ہوں۔ بھول گئیں۔" "یاد آیا۔ وہی خوب صورت شائستہ سِیل جس کے تذکرے کے وقت تمہاری آنکھیں چمکنے لگتی ہیں"۔ "ہاں ابا کے مرنے کے بعد وہ پیدا ہوا۔ چند ماہ بعد اماں اسے انسبرگ لے گئیں ان کا بھی انتقال ہوگیا۔ خالہ نے پالا پوسا"۔ "کیا عمر ہوگی"۔ "سترہ یا اٹھارہ"۔ کارل نے بلوز میں لگے ہوئے پھول کو چھوڑ اور اسے چمٹا لیا۔ وہ اس کا منہ چومنا چاہا مگر روبی ڈالی کی طرح بل کھا رہی تھی۔ جب وہ نتھنوں کی حرارت اور لبوں کی لمس محسوس کرتی تو الگ ہو جاتی۔ وہ یکبارگی تڑپی اور جدا ہوکر بھاگتی ہوئی بجلیاں گراتی ہوئی مکان میں غائب ہوگئی۔

کارل اسٹیشن پر گاڑی کا انتظار کر رہا تھا۔ والٹر اور میریا کے ساتھ رہتے رہتے وہ اکتا کر بھاگا وہ نیا ساتھی چاہتا تھا۔ سِیل کتنا ہوشیار ہوگا۔ نئی نئی باتیں سنائے گا۔ کتابیں بھی ساتھ ہوں گی "گرما بڑے مزے میں گزرے گا۔ گاڑی آئی اور رک گئی۔ دو نوجوان اپنا اپنا سامان ڈبے میں سے نکال کر پلیٹ فارم پر رکھ رہے تھے۔ کارل حیران تھا ان میں کون سِیل۔ یا شاید وہ ان کے ڈبے سے اترا ان میں ایک دبلا پتلا لڑکا تھا دو بھاری سوٹ کیس اٹھائے ہوئے ہانپ رہا تھا۔ چند قدم بعد اس نے بکس رکھ دئے اور سگریٹ پینے لگا۔ "شاید یہی سِیل ہو"۔ کارل اس کی جانب آیا۔ مگر وہ آگے بڑھ گیا۔ اس نے پھر بکس رکھ دئے اور مدد کے لئے ادھر ادھر دیکھنے لگا۔ چھوٹے اسٹیشن پر بھلا قلی کہاں۔ پسینے کے قطرے اس کی پیشانی پر چمکنے لگے۔ انھیں وہ رومال سے پاک کر رہا تھا کہ کارل اس کے پاس آیا۔ "کیا آپ مدد کرسکتے ہیں"۔ "ضرور" "ایک سو کتابوں سے بھرا ہوا ہے۔ میں ان کا دیوانہ ہوں۔ دیہات میں اچھی کتابیں نہیں ملتیں"۔ "کیا تم پہلی بار یہاں آئے ہو"۔ "ہاں' والٹر ڈریچ کا گھر معلوم ہے"۔ کارل نے بکس اٹھاتے اٹھاتے رکھ دیا۔ "میں۔ میں" اس نے اسے لپٹا لیا۔ کارل ڈریچ" "بھیا" سِیل چلایا۔ پہلی نظر میں سمجھ گیا کہ تم ہی سِیل ہو"۔ "اور جب مدد کے لئے نظر دوڑائی تو تمہیں دیکھ کر دل کھنچنے لگا۔

بھائی کی مدد بھائی ہی اچھی طرح کرسکتا ہے" کارل نے چٹا سلگایا۔ سیل کو بھائی بہن سے مل کر کمال مسرت ہوئی۔ میریا تو بس نچھاور ہوئی جاتی تھی اس کو عمدہ عمدہ دیہاتی کھانے کھلاتے اور والٹر روز پھل لاتا۔ سیل کا زیادہ تر وقت کارل کی صحبت میں کٹتا تھا۔ دن میں وہ زراعتی کاروبار دیکھتا۔ کارل اسے مضبوط بنانا چاہتا تھا۔ اس نے اسے پیڑ کاٹنا، ہل چلانا سکھا دیا تھا۔

شہر میں دلچسپیوں، رنگ رلیوں، تماشوں میں وقت کٹتا ہوگا" بڑا مزا آتا ہے۔ کام کاج یا اسکول کے بعد وہاں بہتیری دلچسپیاں ہیں"۔ "اب کے تمہارے سنگ ضرور چلوں گا۔ روبی کو بھی لے چلیں گے"۔ "کون روبی" "وہی حسین لڑکی جس سے تم گزشتہ پیر کو مل چکے ہو" "روبی کتنا دلکش نام ہے بھیا" اس کے ہونٹ کانپ رہے تھے۔ اس اتوار کو کارل گرجا نہیں گیا۔ وہ چاہتا تھا کہ یہ اتوار بھی روبی کی صحبت میں گزار دے اور جھیل پر جا کر دل بہلائے۔ اسی لئے اس نے سیل سے پچھلی شب کہہ دیا تھا کہ والٹر کے ساتھ جنگل کی سیر کر آئے اور وہ خاص کام پر جا رہا ہے۔ وہ بن ٹھن کر روبی کے گھر گیا۔ ایک بوڑھی عورت گیہوں چن رہی تھی۔ "روبی کہاں ہے"۔ "وہ تڑکے ہی شہتوت چننے چلی گئی"۔ "کدھر گئی ہوگی"۔ "نہ معلوم آتی ہی ہوگی۔ آؤ بیٹھ جاؤ۔ باتیں کریں" بوڑھی ادھر ادھر کی باتیں کرنے لگی وہ سیل کے بارے میں کھیت باڑی سے متعلق پوچھتی رہی۔ کارل مختصر جوابات دیتا رہا۔ پھر بے چین ہو کر ٹہلنے لگا۔ کبھی درختوں کے جھنڈ کی جانب دیکھتا کہ کہیں ادھر نہ آ رہی ہو، کبھی باغ میں جا کر آہستہ سے آواز دیتا کہ شاید شرارت سے چھپ نہ گئی ہو۔ دور سے چند عورتیں آتی دکھائی دیں۔ "ضرور ان میں ہوگی" اور وہ چند قدم آگے بڑھا۔ مگر وہ دوسری سمت کو چلی گئیں۔ وہ رک گیا اور ذرا زمین کو لات مار دی۔ پھر تھک کر پیڑ تلے بیٹھ گیا۔

دن ڈھلے وہ پہاڑی پگ ڈنڈی سے اترتی ہوئی نظر آئی۔ وہ اس کا محبوب نیلا فراک دیکھ کر فوراً پہچان گیا اور وہ بے تابانہ اس کی طرف بڑھا۔ چند لمحوں قبل وہ اسے سخت سست کہنے والا تھا۔ مگر اس کے رخ زیبا کو دیکھ کر جیسے اس کی زبان اینٹھ گئی۔ روبی کا چہرہ اترا ہوا تھا۔ دونوں گالوں میں رنگ سمٹ آیا تھا۔ دیدے پھٹے پھٹے، بال پریشان، پیروں میں لڑکھڑاہٹ جیسے میلوں کا سفر کر کے آئی ہے۔

"تھک گئی ہو شاید پیاری" اس نے شہتوت سے بھرا ٹوکرا اس کے ہاتھ سے لے لیا۔ "پہلے ہی اطلاع کر دیں تو ساتھ ہو لیتا" دونوں باغ میں گئے۔ روبی بیٹھے بیٹھے گر پڑی۔ کیا صبح سے کچھ کھایا نہیں — "نہیں صرف شراب چاہئے" اور وہ سبزے پر لیٹ گئی۔ وہ شراب لے آیا۔ "ہماری مسرت بخش زندگی کے لئے" کارل نے گلاس کو ہونٹوں سے لگاتے ہوئے کہا۔ روبی ایک ہی سانس میں پی لی۔ وہ ہانپنے لگی۔ "کیا جسم ٹوٹ رہا ہے" اس نے اس کے عریاں باہوں کو پکڑتے ہوئے کہا۔ "نہیں" اور وہ خاموش ہو گئی۔ کارل نے اس کو خوش کرنے کی خاطر بیاہ کا ذکر چھیڑ دیا "کافی رقم جمع ہو چکی ہے۔ اگلے مہینے میں بیاہ ہو جائے تو بہتر ہے۔ سیل بھی آیا ہوا ہے" فرط محبت میں وہ اس کی طرف جھکا۔ روبی نے کروٹ لی۔ "بیاہ! کس سے"۔ "تم سے" "میں نے تو تم سے وعدہ نہیں کیا"۔ "کیوں ستاتی ہو۔ بھول گئیں۔ پچھلے ہفتے ہی تو کہا تھا"۔ "جھوٹ" کارل نے جھنجلا کر اسے اپنی طرف کھینچا۔ خیر میں جھوٹا۔ مگر میری مراد پوری کر دو"۔ وہ اٹھ کھڑی ہوئی۔ "تم چلے جاؤ۔ میں کسی سے بیاہ نہ کروں گی۔ مجھے آرام لینے دو" اور وہ مکان کی سیڑھیوں پر چڑھ رہی تھی۔ کارل دل شکستہ چلا گیا۔ اس کی بے رخی سوہان روح ہو رہی تھی۔ یک لخت اس کی چتون کیوں بدل گئی۔ شاید میری کوئی بات ناگوار گزری ہو — خیر کل منا لوں گا"۔ وہ ان ہی خیالات میں غلطاں چلا جا رہا تھا کہ "کارل" کسی نے پکارا۔ اس نے خوش ہو کر پیچھے دیکھا کہ شاید روبی آ رہی ہو۔ مگر وہ ٹیلے پر سے اتر رہا تھا۔ "کہاں تھے بھیا ہر طرف ڈھونڈا۔ کہیں پتہ نہیں چلا۔

دونوں قریب آگئے۔ تمہارے لئے عمدہ شہتوت لایا ہوں"۔ شہتوت کا نام سن کر سپل کے دل کی حرکت ایک ثانیہ کے لئے رک گئی اس نے سپل کو گھور کر دیکھا۔

دوسرے دن کارل اور سپل برفانی پہاڑی پر چڑھ رہے تھے۔ وہ سپل کو چڑھنا سکھا رہا تھا اس نے اس کی کمر میں رسی کا مضبوط پھندا لگا دیا تھا اور بڑی احتیاط سے اسے لے جا رہا تھا۔ سپل حسین مناظر کو دیکھ کر گاہے گاہے رک جاتا۔ کئی بار وہ ہانپ کر بیٹھ گیا لیکن کارل کو تو اسے مضبوط بنانا تھا۔ وہ برابر اسے چلاتا رہا۔ دونوں چوٹی پر پہنچ گئے۔ کارل نے بسکٹ وغیرہ نکال کر رکھے اور دونوں گرم دھوپ میں پڑے کھانے لگے "مجھے حیرت ہے کہ تم لوگ کیسے زندگی گزارتے ہو" سپل نے کہا نہ تو گھر میں باجہ ہے اور نہ رقص و سرود کا سامان"۔ ایک پرانا پیانو تھا وہ میں نے روبی کو پچھلی کرسمس میں دے دیا"۔

"روبی خوب گاتی بجاتی ہوگی"۔ "ہاں بڑی رسیلی آواز ہے" "سنو گے اس کا گانا" "ضرور" جنگلی پھولوں کی خوشبو سے دونوں مست ہو رہے تھے۔ سپل وہ ایک توڑ لایا۔ "افسوس کہ تمہاری محبوبہ نہیں" کارل نے مسکراتے ہوئے کہا۔ "ہے کیوں نہیں رہی رسیلی آواز والی روبی۔ یہ پھول" "روبی" کارل کے منہ سے چیخ نکل گئی جو پہاڑ کی چوٹی سے ٹکرا کر فضا میں تیرنے لگی۔ سپل کا منہ فق پڑ گیا۔ "بھیا" جیسے کسی نے اس کا گلا دبا دیا "مجھے معلوم نہیں کہ" وہ بمشکل کہہ سکا۔

کارل نے طیش میں اس کو لات رسید کی۔ سپل لڑھک کر ڈھال پر گر پڑا اور دوسرے لمحے وہ وادی کی جانب گر رہا تھا۔ بھیا ــ کارل ــ بھیا" چیخوں سے سنسان وادی گونج رہی تھی۔ سپل کے چنے ہوئے پھول کارل کے قدموں پر مرجھا رہے تھے

(ترجمہ)

سید شبیر حسین قیس

غزل

دوست جو غمگسار ہوتے ہیں
ہر مصیبت میں یار ہوتے ہیں

ہم کو تقدیر آزمانا ہے
طالبِ وصل یار ہوتے ہیں

آسماں پر دماغ ہے اُن کا
ہم جو اُن پر نثار ہوتے ہیں

میرے مرنے کی تھی خوشی جن کو
آج وہ اشکبار ہوتے ہیں

بعد مرنے کے ایک حالت میں
مفلس و تاجدار ہوتے ہیں

حد ہمارے گناہ کی ہے کوئی
رات دن بے شمار ہوتے ہیں

ہم جو کرتے ہیں غور اپنے پر
انتہا شرمسار ہوتے ہیں

جن میں صبر و قرار ہو طالع
دل وہی پائیدار ہوتے ہیں

سید مراد علی طالع

منقبت فارسی اور اردو میں

اچھی چیز کی تعریف کرنا انسان کی فطرت میں داخل ہے۔ چنانچہ جب کسی حسین شئے پر اس کی نظر پڑتی ہے، تو بے ساختہ اس کی زبان سے سبحان اللہ نکل جاتا ہے، اس کے دل پر مسرت کی ایک کیفیت طاری ہو جاتی ہے اور پھر دل و زبان یک زبان ہو کر اس مسرت و انبساط کا اظہار الفاظ کے ذریعہ سے کرتے ہیں اور انہی جذبات مسرت کے اظہار کا نام تعریف و توصیف ہے۔ اگر ہم کائناتِ عالم کا غائر نظر سے مطالعہ کریں تو ہر چیز کا ایک جمالیاتی پہلو ہمارے پیش نظر ہو جائے گا۔ حسن پر جب ہماری نظر پڑتی ہے تو وہ ہماری نظروں کے راستے سے دل کی گہرائیوں میں اتر جاتا ہے۔ خوشنما رنگ اور خوشبودار پھولوں کو دیکھکر ہماری آنکھوں کو طراوت حاصل ہوتی ہے اور ان کی خوشبو ہمارے مشامِ جان کو معطر کئے دیتی ہے۔

اسی طرح جب ہم کسی خوبیوں کے انسان سے ملتے ہیں یا اس کی پاکیزہ زندگی کے حالات سننے یا پڑھنے کا اتفاق ہوتا ہے تو غیر شعوری طور پر ان بزرگوں سے عقیدت سی پیدا ہو جاتی ہے اور ہم ان کی مدح کرنے پر اپنے آپ کو مجبور پاتے ہیں۔ بہر حال عمدہ اوصاف کا اعتراف کرنا فطرت انسانی کا اقتضاء ہے۔ شاعر چونکہ اوروں سے زیادہ حساس ہوتا ہے اس لئے وہ بہت جلد ایسی چیزوں سے متاثر ہو جاتا ہے۔ اور اس کا اظہار اپنے اشعار میں کرتا ہے۔ شاعر اپنے محبوبوں کی مدح سرائی میں کیا کیا نہیں لکھتے" عادل اور نیک سیرت بادشاہوں کی تعریف میں قصائد لکھکر صفحے کے صفحے پر کر دیتے ہیں۔ حسن و عشق کی داستان بیان کرنے کے لئے طولانی مثنویاں لکھی جاتی ہیں اسی طرح بزرگ ہستیوں کی پاکیزہ حیات اور ان کے لافانی کارناموں سے متاثر ہونا اور ان کا اعتراف کرنا ذوقِ سخنوری کا اقتضاء ہے، اور ان بزرگ ہستیوں کی ارواحِ مقدسہ کی بارگاہ میں منقبت کی نذرِ عقیدت کا گلدستہ پیش کرکے اپنے اس مقدس فرض سے سبکدوشی حاصل کرنا سعادت مندی کی دلیل ہے۔ منقبت عربی زبان کا لفظ ہے اور یہ عربی کے مصدر نقب سے نکلا ہے، جو کھودنے کے معنی دیتا ہے۔

جس چیز پر انسان فخر کرے یا جو اسے ممتاز بنائے اسے بھی منقبت کہتے ہیں لیکن عام طور پر یہ لفظ تعریف و توصیف، حمد و ثنا اور بالخصوص صحابہ کرام، اہل بیت اطہار اور ائمہ کی مدح کے لئے مختص ہو گیا ہے۔ شاعروں کی اصطلاح میں ہر اس نظم کو منقبت کہتے ہیں جس میں اصحابِ رسول، اہل بیت اور ائمہ کی مدح و ثنا بیان کی گئی ہو۔ یہ معنی اس لفظ کے ساتھ اس قدر پیوست ہو گئے ہیں کہ جب کبھی منقبت کا لفظ سننے میں آتا ہے تو فوراً ایک ایسی نظم کا تصور پیش نظر ہو جاتا ہے جس میں صحابہ و ائمہ کی تعریف بیان کی گئی ہے گویا اس لفظ کے معنی نہ صرف تعریف و توصیف کے لئے جانے لگے بلکہ ایک خاص قسم کی مدحیہ نظم یا اشعار کا نام بھی منقبت قرار دیا گیا اور یہ اردو فارسی شاعری کا ایک جز بن گئی بلکہ بادی النظر میں تو یہ دھوکا ہو جاتا ہے کہ یہ بھی

شائد دیگر اصنافِ سخن مثلاً غزل، قصیدہ، مرثیہ، رباعی، مخمس اور مسدس جیسی ایک صنف ہوگی۔ اگرچہ اس کا شمار اصنافِ شاعری میں نہیں ہے لیکن فارسی اور اردو کے قدیم شاعروں نے اس عنوان کے تحت کچھ نہ کچھ لکھنا اپنے پر فرض کرلیا تھا۔ اور یہاں تک اس کا التزام کیا گیا کہ اپنے کلام کے مجموعہ یا طویل مثنوی کے آغاز میں حمد و نعت کے بعد منقبت کو جگہ دی گئی اور ایسا معلوم ہوتا ہے کہ ان کے اشعار کے دیوان حمد و نعت اور منقبت کے بغیر شروع ہی نہیں ہوسکتے تھے۔ چنانچہ فارسی کے قدیم شاعروں میں نظامی نے سکندر نامہ اور خمسۂ نظامی میں منقبت لکھی ہے۔ اسی طرح ہلالی استر آبادی اور عرفی نے بھی اپنے قصائد کا آغاز حمد و نعت اور منقبت ہی سے کیا ہے۔ فارسی کی دو طویل مثنویاں نل دمن اور نیرنگِ عشق کا آغاز بھی منقبت ہی سے ہوا ہے۔

چونکہ اردو شاعری پر فارسی شاعری کا گہرا اثر پڑا ہے اس لئے اردو کے قدیم شاعروں نے بھی فارسی کے شعراء کی تقلید میں منقبت نگاری کو ضروری سمجھا۔ فارسی اور اردو میں منقبت نگاری کا سبب اس کے سوا اور کیا ہوسکتا ہے کہ جسطرح ہماری معاشرت میں مذہب کا عنصر موجود ہے اسی طرح ہماری شاعری میں بھی اس کی کارفرمائی رہی ہے اور قدیم شعراء نے اپنے کلام کے مجموعوں اور طولانی مثنویوں کے آغاز میں حمد و نعت کے بعد منقبت کو تبرکاً جگہ دی ہے۔ چنانچہ ملک الشعراء خاقانی ہند شیخ ابراہیم ذوقؔ نے اپنے دیوان کی پہلی غزل میں منقبت کے یہ اشعار لکھے ہیں ؎

محبت اہلِ بیت مصطفےٰ کی نورِ بر حق ہے
کہ روشن ہوگیا دل مثلِ قندیلِ حرم میرا
دکھائی مجھ کو راہِ شرعِ اصحابِ پیمبر نے
چراغِ راہ ہے اکرامِ اصحابِ کرم میرا

اسی طرح خواجہ حیدر علی آتشؔ نے اپنے دیوان دوم کی پہلی غزل میں جو آج سے ٹھیک سو سال پہلے ۱۲۶۱ھ میں مطبع حاجی ولی محمد میں طبع ہوا ہے، یہ اشعار قلمبند کئے ہیں۔

عاشق شیدا علی مرتضیٰ کا ہوگیا
دل مرا بندہ نصیری کے خدا کا ہوگیا
قربِ حق حاصل ہے اس کو مردِ عارف ہے وہی
یا علی پیرو جو تجھ سے پیشوا کا ہوگیا
وقتِ مشکل میں کہا جس وقت یا مشکل کشا
سہل چھٹکارا گرفتارِ بلا کا ہوگیا
کون تجھ سا ہے ولی اللہ اے مولا مرے
کعبہ پیدائش سے تیری گھر خدا کا ہوگیا

مرزا اسد اللہ خاں غالبؔ نے اپنے فارسی کلیات میں منقبت کے عنوان سے کئی نظمیں، مثنوی اور قصیدہ کی بحر میں لکھی ہیں مثنوی کی بحر کے چند شعر نمونۃً پیش کئے جاتے ہیں ؎

زہے قبلۂ اہلِ ایماں علی بہ برتن گشتہ ہمسایۂ جانِ علی
علی راست بعد از نبی جائے او بہ ہماں حکم کل وار دا حمر آمد
نژاد علی با محمد یکیست با محمد ہماں تا محمد یکیست
بہ رد و قبول کسانم چہ کار بہ علی بایدم با جہانم چہ کار

قصیدے کی بحر میں بھی کئی نظمیں لکھی ہیں ہر ایک میں سے چند شعر بطورِ نمونہ لئے گئے ہیں۔

چوں برگِ گل زبادِ سحر گاہیم زبان
رقصد بنامِ حیدرِ کرار در دہن
شاہِ نجف وصیٔ نبی مرتضیٰ علی
آں از ائمہ اول و ثانی ز پنجتن
نفسِ نبی خدائے نصیری امامِ خلق
آن منتِ عظیم کہ حق بر جہاں نہاد
یزداں کہ رازِ خویش نبی را بلب سپرد
یزداں کہ سوزِ خویش علی را بجان نہاد

اردو زبان کے ایک بہت بڑے شاعر حکیم میر مومن خاں مومن نے کہ جن کے اس ایک شعر ؎

تم مرے پاس ہوتے ہو گویا ۔ جب کوئی دوسرا نہیں ہوتا

کے بدلے غالب جیسا خوددار اور کسی دوسرے شاعر کو خاطر میں نہ لانے والا شاعر بھی اپنا پورا دیوان دینے کو تیار ہو گیا' اپنے کلیات میں منقبت پر دل کھول کر طبع آزمائی کی ہے۔

چنانچہ "خطبہ خوانیٔ دل و زبان بامید ثواب و اثبات خلافت امیر المومنین عمر ابن الخطاب" کے عنوان سے حضرت عمرؓ کی منقبت میں کئی اشعار لکھے ہیں جن میں سے بعض یہ ہیں ؎

امام اہل یقین شہریارِ کشورِ عدل ۔ امیرِ لشکرِ دین و مبارزِ مقتل
بلند پایہ عمر جس کے قصرِ رفعت کا ۔ گدائے خاک نشین شاہِ آسماں منزل

اس کے بعد ایک دوسرے عنوان "نامہ راحیہ چوں مہر و ماہ نور افگنست ہمانا بہ فیض مدح ذوالنورین در افشانی است" کے تحت حضرت عثمانؓ کی منقبت میں متعدد اشعار لکھے ہیں۔ ان میں سے چند یہاں پیش کئے جاتے ہیں ؎

کرۂ آب ہو گر قطرۂ عثمان ہمم
صدف چرخ کرے شکوۂ طغیانِ بحار
اس کے تمکیں کو اگر کوہ سے دیجئے تشبیہ
ہے یقیں شعلۂ جوالہ کو آجائے قرار
شرط ایمان ہے پیمانِ خلافت اس کا
وہ مسلمان ہے کیا جس کو ہو اس میں انکار

اس کلیات میں تیزیٔ زبان کلک گوہر نثار بیان ساطع حقیقت امامت خداوند ذوالفقار" کے عنوان سے ایک طویل منقبت لکھی ہے نمونے کے چند شعر یہ ہیں ؎

آئی ہے لب پہ مدحِ خداوند ذوالفقار
لے جاؤ منکروں کے لئے ارمغانِ تیغ
شیرِ خدا علیؑ کہ شجاعت سے جس کی ہے
سرپنجۂ اسد پہ زنخ زن بتانِ تیغ
گرم دعائے شاہ ہو مومن کہ کب سے ہے
آمین سرزبانِ اجابت نشانِ تیغ

میر محمدی بیدار دہلوی جو میر اور سودا کے ہم عصر ہیں اور اردو فارسی شاعری میں استادی کا درجہ رکھتے ہیں' منقبت سرائی میں اس طرح گویا ہوتے ہیں ؎

تشریف شرف صدق نے صدیقؓ سے پایا
مشہور جہاں اس سے ہوا نام کرم کا
لے ہاتھ میں شمشیر عدالت کی عمرؓ نے
قبضہ میں کیا ملک عرب اور عجم کا
عثمانؓ کہ ثنا اس کی ہے تقریر سے افزوں
تحریر کرے کیا نہیں مقدور قلم کا
سلطان ولایت اسداللہ کہ جس کی
ہیبت سے جگر آب ہو شیرانِ ارجم کا

اردو زبان کے مشہور اور بلند پایہ مثنوی نگار شاعر میر حسن نے اپنی مثنوی سحر البیان کے آغاز میں جو منقبت لکھی ہے اس کے بعض اشعار یہ ہیں۔

نہیں ہمسر اس کا کوئی جز علیؑ
کہ بھائی کا بھائی وصی کا وصی
ہوئی جو نبوت نبی پر تمام
ہوئی نعمت اس کے وصی پر تمام
علیؑ کا عدو دوزخی دوزخی
علی کا محب جنتی جنتی
نبیؐ و علیؑ فاطمہؓ اور حسنؑ
حسین ابن حیدر یہ ہیں پنجتن
ہوئی ان پہ دو جگ کی خوبی تمام
انہوں پر درود اور انہوں پر سلام
سلام ان پہ جو اس کے اصحاب ہیں
وہ اصحاب کیسے کہ احباب ہیں
خدا ان سے راضی رسول ان سے خوش
علیؑ ان سے راضی بتول ان سے خوش
ہوئی فرض ان کی ہمیں دوستی
کہ ہیں دل سے وہ جاں نثار نبی

یہ تقریر نامکمل رہے گی اگر سریر آرائے بزم علم و حکمت خسرو شیریں سخن سلطان الشعراء خلد اللہ ملکہ و سلطنتہ کی منقبتوں کا تذکرہ نہ کیا جائے جو بارگاہ معارف نواز سے مقامی اخبارات کو سرفراز ہوتی ہیں اور ہم کو ان کے پڑھنے کی سعادت حاصل ہوتی ہے۔ نمونہ کے طور پر چند اشعار پیش کرنے کی عزت حاصل کیجاتی ہے

نگر ثبت نبی زہرا بتول است
علی حسنین ہم جزو رسول است
ہر آنکس کرد اغماضے ز مدحش
ہم او لاریب از قسم جہول است
بہار سے ناز رفتار صبا را در چمن گوید
بہ شاخ سدرہ بلبل مدح در شان حسنؑ گوید
در شہوار کردہ وصف اشکم در صف ماتم
جگر ہم رنگ گشتہ خوبی لعل یمن گوید
شمیم غنچہ و گل در لباس ارغواں بشنو
عجب قصہ بہ گلشن در حق بوئے سمن گوید

(لاسلکی نشرگاہ حیدرآباد سے پڑھا گیا)

خواجہ حمید الدین

شاد اقبال اقبال اور شاد دونوں کی ہستیاں محتاج تعارف نہیں۔ البتہ اس خبر سے اردو دنیا میں مسرت کی ایک لہر دوڑ جائے گی کہ علامہ اقبال مرحوم اور مہاراجہ سر کشن پرشاد یمین السلطنتہ کے درمیان پچیس تیس سال تک مسلسل مراسلت ہوتی رہی ہے اور اس سے بڑھ کر مسرت انگیز بات یہ ہے کہ یہ پوری مراسلت ادارۂ ادبیات اردو کی طرف سے شائع ہو چکی ہے۔ اس کے مطالعہ سے اقبال کی زندگی اور کردار کے ایسے پہلوؤں پر روشنی پڑتی ہے جن کے متعلق دوسرے ذرائع سے کوئی علم حاصل نہیں ہو سکتا۔ ان گراں مایہ خطوط کو جناب ڈاکٹر زور صاحب نے اپنے بسیط مقدمہ کے ساتھ مرتب کرکے شائع کیا ہے۔ شاد و اقبال کی نایاب تصاویر بھی شامل ہیں۔ صفحات (۲۱۶) قیمت عا

چیانگ کائی شیک

چیانگ کائی شیک صدر جمہوریہ چین دنیا کے ان ممتاز ترین افراد میں سے ایک ہیں جنھوں نے اپنی مساعی اور قابلیت سے ایک زوال پذیر ملک و قوم کو دوبارہ باعظمت و ممتاز بنایا ہے۔ جدید چین کی تعمیر میں ڈاکٹر سن یات سین نے جو ابتدا کی تھی اس کو کامیاب اختتام تک پہنچانے میں اسی قائد کا عظیم ترین حصہ ہے۔ کہا یہ جاتا ہے کہ تاریخ چین میں کنفوشیس، لیوزی، وانگ سینگ، سن یات سین اور چیانگ کائی شیک کی شخصیتوں کو اگر نظر انداز کردیا جائے تو تاریخ چین میں کوئی غیر معمولی واقعہ باقی نہیں رہتا۔

چیانگ کائی شیک ۱۸۸۷ء میں صوبہ چیکیانگ کے ایک دیہات چیکاؤ میں پیدا ہوئے۔ ان کے والدین متوسط طبقے سے تعلق رکھتے تھے، یہ ابھی نو سال ہی کے تھے کہ ان کے والد نے انتقال کیا اور تعلیم و تربیت کی ساری ذمہ داریاں ماں کے سر پڑیں۔ ان کی والدہ نے انتہائی تنگدستی اور مصیبت کے عالم میں انھیں اسکول میں شریک کرادیا۔ مگر ان کا فطری رجحان کھیل کود اور ورزشی مشاغل کی طرف زیادہ تھا اور اسی لئے یہ زیادہ تعلیم نہ پاسکے اور بچپن ہی سے وہ اپنے گروہ اور اپنی جماعت میں خود کو ممتاز اور قائد دیکھنا چاہتے تھے، چنانچہ ابتدا ہی سے قیادت اور رہنمائی کا جذبہ انھیں پیدا ہو چکا تھا۔

انیسویں سال میں چیانگ فوجی تعلیم حاصل کرنے کی غرض سے جاپان گئے لیکن انھیں جاپانی فوجی اسکول میں شرکت کی اجازت نہیں ملی چونکہ ان کے پاس مانچو حکومت چین کا اجازت نامہ نہ تھا اس لئے وہ پھر چین واپس آگئے اور وہیں پیکنگ کے فوجی اسکول میں داخل ہوئے۔ اس تعلیم کے اختتام پر حکومت سے اجازت نامہ لیکر وہ پھر جاپان گئے اور اشاف کے فوجی کالج میں داخل ہوئے۔ اس داخلہ کے وقت انھیں جاپان سے وفاداری اور اطاعت کا حلف اٹھانا پڑا۔ جاپان میں چیانگ کائی شیک کی ملاقات چینی انقلابیوں سے ہوئی جو جاپان میں جلاوطنی کی زندگی گذار رہے تھے۔ اس ملاقات نے انھیں اتنا متاثر کیا کہ وہ خود اس جماعت میں شریک ہوگئے اور وطن کی خیرسگالی کے لئے باوجود امتناعات اور پابندیوں کے عملی حصہ لینا شروع کیا۔ اسی اثنا میں ان کے ارادوں کو اور شہ ملی جب اُن کی ملاقات ۱۹۰۹ء میں پہلی مرتبہ ڈاکٹر سن یات سین سے ہوئی۔ اس ملاقات کے بعد وہ وطن پرست چینیوں کی ترقی پسند خفیہ جماعت تنگ منگھائی (Tungmenghui) میں شریک ہوگئے۔

اس اثنا میں چین میں فرمانروایان وقت کے خلاف عوام ایک محاذ پر جمع ہو رہے تھے اور یہ چاہتے تھے کہ کسی طرح اس شاہی کا خاتمہ کردیا جائے اور جمہوریت کی بنیاد رکھی جائے بالآخر جب ۱۹۱۱ء میں انقلاب چین کا آغاز ہوا اور حکومت و عوام متصادم ہوگئے تو چیانگ کائی شیک کا جذبۂ حب الوطنی نچلا نہ بیٹھ سکا اور وہ باوجود اپنے وعدوں اور حلف کے چین لوٹے اور انقلاب میں حصہ لیتے رہے۔ انقلاب کے اختتام پر وہ مخالفین جمہوریت سے نبرد آزما رہے جنھوں نے ملک میں خانہ جنگیاں بپا کردی تھیں

سنہ ۱۹۱۱ء سے سنہ ۱۹۱۶ء تک چیانگ کائی شیک اپنی خانہ جنگیوں کے فرو کرنے میں منہمک رہے۔ اس موقعہ پر انہوں نے اسقدر دلیری سے ملک کو بچایا ہے کہ اس وقت کے چینی قائد ڈاکٹر سن یات سین کو کہنا پڑا "میرا جانشین صرف چیانگ کائی شیک ہی ہو سکتا ہے"۔

سنہ ۱۹۱۷ء میں چیانگ کائی شیک یکایک اپنی زندگی سے بالکلیہ علحدہ ہوگئے اور اپنی ساری توجہ تجارت پر مرکوز کردی۔ چیانگ کی اس تبدیلی پر سارے ملک میں تعجب کیا جانے لگا۔ لیکن چیانگ کی یہ تبدیلی بھی سیاسی زندگی کا ایک جزو تھی۔ وہ یہ جانتے تھے کہ انقلاب کو کامیاب بنانے کے لئے جہاں تک ہوسکے مالیہ کی شدید ضرورت ہے چنانچہ انھوں نے خانگی ملازمت اور تجارت کے ذریعہ سے دو سال میں کافی سرمایہ پس انداز کیا اور پھر سیاسی امور میں حصہ لینے لگے۔

سن نے چیانگ کی انہی قابلیتوں کی وجہ سے انھیں اپنا رفیق اور شریک کار بنایا تھا۔ مگر کچھ دنوں بعد سن کو خود اپنی قیادت سنبھالنا دشوار ہوگیا تھا جبکہ چین کے قدامت پسند فوجی عہدہ دار سن کے خلاف بغاوت کر بیٹھے تھے۔ اس کو فرو کرنے کے لئے سن نے روس سے مدد طلب کی اور اس مقصد کے حصول کے لئے چیانگ کائی شک کو سنہ ۱۹۲۲ء میں روس بھیجا۔ روس نے چیانگ کی خواہش کو قبول کر لیا اور سن کی مالی اور فوجی مدد کی گئی۔ اس وقت سے چین میں اشتمالی اثرات پھیلنا شروع ہوئے۔ چیانگ کائی شک، چین واپس آنے پر کینٹن Canton کی فوجی اکاڈیمی کے صدر بنائے گئے اور سنہ ۱۹۲۵ء میں کیومنٹنگ (Kumintang) کی مجلس قائمہ کا صدر بنایا گیا۔ پھر سن یات سین کے انتقال پر وہ چین افواج کے کمانڈر ان چیف اور صدر جمہوریہ منتخب ہوئے۔

چیانگ کائی شیک نے عنان اقتدار سنبھالنے پر سب سے پہلے ایک تربیت یافتہ فوج تیار کی۔ فوج کی اس تنظیم سے مالیہ پر بہت بار پڑا لیکن اس کے نتائج بعد میں بہت مفید نکلے۔ ملک کی معاشی فلاح کے لئے انجمن اقوام کے ماہرین کی مدد لی گئی اور خود ملک میں ایک قومی معاشی کونسل (National Economic council) بنائی گئی۔ ریلوے سڑکیں اور فضائی سرویس کو جہاں تک ہوسکا عام کیا گیا۔

کائی شک کا یہ ایقان تھا کہ جبتک کہ متحدہ چین وجود میں نہ آجائے اس وقت تک چین ممتاز نہیں ہوسکتا۔ خود ملک میں کئی سرمایہ دار اپنے مفاد اور اغراض کے لئے حکومت کی مخالفت میں ملک کو اپنی بغاوتوں اور خانہ جنگیوں سے تباہ و برباد کر رہے تھے۔ چیانگ نے رفتہ رفتہ ان تمام بغاوتوں کو فرو کیا مگر چیانگ کائی شک کے سامنے ایک اور نئی مشکل پیدا ہوگئی تھی جب سن یات سین نے اشتمالی مدد مانگی اور روس سے بہت سارے اشتمالی بُرودون (Brodonn) جافہ (Joffe.) وغیرہ چین چلے آئے تو انہوں نے اپنے واعیات و تعلیمات کو بھی عوام کے سامنے پیش کیا اور اشتمالیت پھیلنے لگی۔ اب چیانگ کائی شیک یہ چاہتے تھے کہ اس اثر کو روکدیں جنوبی چین میں اس تحریک کا بڑا اثر تھا اور جب چیانگ اس تحریک کے مخالف ہوگئے تو اس حصہ میں

ان کا اثر بھی متزلزل ہونے لگا۔ اسی اثنا میں ایک ممتاز اشتمالی ینگ مارشل (Young Marshall) نے چیانگ کے خلاف بغاوت کردی۔ اس بغاوت کو فرو کرنے کے لئے خود چیانگ کائی شیک مقام سیان پر آئے۔ ۱۰ر ڈسمبر کو چیانگ سیان پہنچے اور ینگ مارشل سے ملے۔ ینگ مارشل نے اطاعت سے انکار کردیا اور بالآخر ۱۲ر ڈسمبر کو کائی شیک نے اپنی رہائش گاہ میں گولیوں کے چلنے کی آوازیں سنیں اور اسی لمحے ان کا باڈی گارڈ گرفتار کرلیا گیا۔ کائی شیک اپنے مکان کی دیوار پھاندکر فرار ہونا چاہتے تھے کہ ایک خندق میں گر پڑے جس سے ان کے شدید زخم آئے اور وہ وہیں گرفتار کرلئے گئے کائی شیک اشتمالیوں کے مطالبات تسلیم کرنے تیار نہیں تھے اور نہ ان کے ساتھ کسی قسم کی مراعات کے لئے تیار تھے مگر کائی شیک کو مجبور ہوجانا پڑا۔ بالآخر کائی شیک نے ان کے مطالبات کو منظور کرلیا اور ان پر سے پابندیاں ہٹالی گئیں۔ ۲۵ر ڈسمبر ۱۹۳۶ء کو یعنی ۱۳ دن کے بعد کائی شیک رہا کردئے گئے۔ اس رہائی پر تمام ملک میں خوشیاں منائی گئیں اور اس طرح سے دو مختلف جماعتیں آپس میں ایک ہوگئیں اور اسی اتحاد کی بدولت چین، جاپان کی جارحانہ کارروائیوں کے خلاف آج پوری طاقت اور قوت سے برسرپیکار ہے۔ اس واقعہ کے بعد سے کائی شیک نے اپنی تمام تر توجہ ملک کی فلاح و بہبود کے لئے وقف کردی۔ فلاح و امن کے کچھ ہی دن گذرنے پائے تھے کہ چین کے دشمن کے حریصانہ عزائم میں اضافہ ہوا اور اب وہ منچوریا کے بعد خود چین پر قبضہ پانا چاہتا ہے۔ توسیع و تسخیر نو آبادی کے اپنی مقاصد کے تحت ۷ر جولائی ۱۹۳۷ء کو چین پر حملہ کردیا گیا۔ اس جنگ کو شروع ہوئے اب پانچ سال ختم ہوچکے ہیں مگر چینیوں کو شکست دینی جاپانیوں کے لئے سخت مشکل ہوگیا ہے۔ اس میں کوئی شک نہیں کہ جاپان اپنی حربی طاقت کی بدولت چین کے ایک بڑے حصے پر قابض ہوچکا ہے اور چین اپنی طویل خانہ جنگیوں اور طوائف الملوکی کے دور کے بعد ابھی امن امان کے دور سے گذر رہا تھا کہ اس حادثہ کا شکار بنا۔

مگر ان تمام دشواریوں کے باوجود چینی اپنے قائد کی رہنمائی میں ایک ایک انچ کے لئے لڑ رہے ہیں۔ اس جنگ میں مرد، عورت، بچے، بوڑھے سب ہی وطن کی حفاظت میں، دانہ وار شہید ہورہے ہیں لیکن ان کے عزائم میں ذرا بھی تزلزل نہیں ہوا۔ وہ دشمن کے لئے اپنی قوت مدافعت کی وجہ سے ایک مسلسل عذاب بنے ہوئے ہیں۔ کائی شیک اس جنگ کو کامیاب اختتام تک پہنچانے کے لئے اتحادیوں کی ہر طرح کی مدد حاصل کرنے میں ہمہ تن کوشاں ہیں۔ اور یہ توقع کی جاسکتی ہے کہ فاشسٹ سیاست کی تباہی کے ساتھ ہی جدید چین کی مزید تعمیر ہوگی۔

کائی شیک نے ان فوجی امور کے ساتھ ساتھ ملک کی اندرونی ترقیوں کے لئے بھی نمایاں امور انجام دئے۔ باوجود مالیہ کی ابتری کے انھوں نے ملک میں کئی ابتدائی مدرسے اور جامعات قائم کیں۔ شفاخانے تعمیر کئے۔ عدالتیں بنائی گئیں اور متعدد صنعتی کارخانے قائم کئے گئے۔

کائی شیک کی سیاسی اور فوجی زندگی کی کامیابیوں میں مدام چیانگ کائی شیک کا بڑا دخل ہے۔ کائی شیک کی ملاقات مس مے لنگ سونگ سے جب ہوئی تو پہلی ہی ملاقات

میں کائی شیک نے محسوس کیا کہ وہ مس سُونگ کی رفاقت میں سکون اور آرام پا سکینگے۔ یکم ڈسمبر ۱۹۲۷ء کو شادی کے مراسم ادا ہوئے اس موقعہ پر کائی شیک نے کہا کہ "آج میں دعوی سے کہہ سکتا ہوں کہ میں ہر شکل میں کامیاب ہوجاؤنگا چونکہ میں آج بہت مسرور اور مطمئن ہوں اور میرے دل کی الجھنیں جاتی رہیں"۔ ان دونوں کا تعاون اور اشتراک تاریخ چین کی تعمیر میں اپنا ایک مقام پیدا کرچکا ہے۔

شادی سے پہلے کائی شیک کے مذہبی عقائد صنفی تھے مگر شادی کے بعد انھوں نے عیسائیت کو قبول کرلیا لیکن چیانگ کائی شیک آج بھی چینی عقائد کی طرح اپنے بزرگوں کی پوجا اور عبادت کرتے ہیں۔

کائی شیک اپنی قوم کے محبوب اور ہردلعزیز قائد ہیں عوام ان کی اتنی قدر و منزلت کرتے ہیں کہ اکثر مقامات پر ان کی پوجا تک کیجاتی ہے۔ کائی شیک نے تمام ملک چین کا اپنی خاتون کے ساتھ دورہ کیا ہے۔ مدام چیانگ کائی شیک بھی اپنے شوہر کا اسقدر ساتھ دیتی ہیں کہ جب موجودہ جنگ جاری رکھنے کے لئے فراہمی رسد کا کوئی راستہ نہ تھا تو مدام نے ہندوستان سے فراہمی رسد کیلئے برما روڈ کی تعمیر میں خود نگرانی کی اور تین چار مہینے میں برما روڈ کی تعمیر انجام پاگئی۔

اپریل سال گزشتہ ہی میں اس ہردلعزیز قائد نے ہندوستان آکر دونوں ہمسایہ ممالک کے قدیم تعلقات کو استوار کردیا ہے ہندوستان میں بھی چیانگ نے ہمہ گیر مقبولیت اور ہردلعزیزی حاصل کرلی۔

جنرل لیسمو چیانگ کائی شیک صدر مجلس اعلیٰ برائے جنگ و صدر قومی مجلس معتمد ہوائیہ و صدر کومنتانگ کی عظیم شخصیت میں جو فکر و عمل کی بے پناہ قابلیتیں موجود ہیں وہ اس کا ثبوت ہیں کہ جدید چین کی تعمیر میں چیانگ کائی شیک کامیاب ہوئے ہیں اور موجودہ دشواریوں سے نبرد آزما ہوکر مستقبل کو اور کامیاب و روشن بنائیں گے اور اس طرح سے وہ قوم جو ایشیا کی قدیم ترین متمدن قوموں میں سے ہے نہ صرف زندہ رہے گی بلکہ اپنا نام اور مقام بھی پیدا کرے گی

(بہ اجازت نشرگاہ حیدرآباد)

میر عابد علیخاں

اُردو مثنوی کا ارتقاء بڑی عالمانہ و محققانہ کتاب ہے جس کے افادہ اور معیار کے اظہار کے لئے صرف اس کے مصنف پروفیسر عبدالقادر سروری کا نام ہی کافی ہے۔ سروری صاحب کی نظر اردو شاعری کی تاریخ پر اتنی وسیع اور باریک بیں ہے کہ اس خصوص میں عہد حاضر کے کسی محقق و ادیب کو ان کی ہمسری نصیب نہیں ہے۔ اردو شاعری کی تاریخ سے دلچسپی رکھنے والوں کے لئے یہ کتاب ایک نعمت غیر مترقبہ ہے جو اپنے موضوع اور اہمیت کے لحاظ سے سب سے پہلی کامیاب ترین کوشش ہے۔ یہ کتاب ۱۰ ابواب پر مشتمل ہے جن سے اس کی اہمیت اور تلاش و جستجو کا اندازہ ہوسکے گا۔ بڑی سائز (۱۴۳) صفحات۔ قیمت ۱۲؎

رات کا بھولا اور دیگر افسانے پروفیسر عبدالقادر صاحب سروری ایم اے ایل ایل بی صدر شعبۂ اردو، فارسی و عربی، مہاراجہ کالج میسور کے گیارہ بلند پایہ افسانوں کا دلچسپ مجموعہ ہے جو نہایت اہتمام کے ساتھ بہت ہی دیدہ زیب شائع ہوا ہے۔ پروفیسر سروری صاحب نے اس سے قبل فن افسانہ پر مستند کتابیں مثلاً دنیائے افسانہ اور کردار اور افسانہ وغیرہ شائع کی ہیں اس لحاظ سے ان کے افسانے فنی نقطۂ نظر سے قابل مطالعہ ہیں۔ اس کتاب کا ٹائیٹل ملک کے بلند پایہ حسن کار مسٹر عبدالقیوم نے بنایا ہے۔ طباعت و کتابت پاکیزہ اور دیدہ زیب ہے۔ صفحات ۱۶۸ قیمت عہ

(۱۳) ہدایات ہندی [۵۹]

اوراق ۱۵۱۔ سطور ۱۱۔ تقطیع ۵½ × ۹½
خونستعلیق۔ مصنف شیخ داؤد ضعیفی۔
سنہ تصنیف ۱۱۰۰ھ۔ کاتب محمد امیرالدین۔
سنہ کتابت ۱۲۶۲ھ۔ بمقام اورنگ آباد۔

مخطوطہ نمبر ۱۱ کا دوسرا نسخہ ہے جس میں فتح شریف کا لکھا ہوا اضافہ نہیں ہے بلکہ یہ صرف ضعیفی کی اصل کتاب کی نقل ہے۔ اس کی بعض ابیات مذکورہ نسخے سے مختلف ہیں مثلاً

نسخۂ نمبر ۱۱	نسخۂ نمبر ۱۳
لقب اس ہوا شیخ داؤد ناؤں	سچ دال الف واو ہور دال ناؤں
ضعیفی ہے اس کے تخلص کا ٹھاؤں	ضعیفی سو اس کے تخلص کا ٹھاؤں
دیا حق تعالیٰ نے یوں جس کوں عجب	دیا یوں اسے حق تعالیٰ نے عجب
جو دشمن ہوا اس انگے خار و خس	جو دشمن ہوی اوس انگے خار و خس
دھریا سر پو چو پن شہی کا وو تاج	دھریا سر پو پاؤں شہی کا وو تاج
دِلی ہور دکھن کا ہوا ایک راج	دلی ہور دکھن کا ہوا ایک راج
ولیکن شہنشاہ کے دہر میں	دلی کے شہنشاہ کے دہر میں
مبارک او ذوالحجہ کے شہر میں	مبارک وو ذی الحجہ کے شہر میں

مصنف کا نام نسخہ ۱۳ میں جس طرح لکھا گیا ہے اصل میں اسی طرح مصنف نے لکھا ہوگا تب ہی تو فتح شریف نے بھی پندنامہ میں اسی طرح اپنا نام لکھا۔ یہ نسخہ زیادہ صحیح معلوم ہوتا ہے لیکن ناقص الاول ہے۔ ابتدائی چھ ابیات نہیں ہیں۔

آغاز :-

توللّٰہ او دین کی بات کوں سنے کان دھر دل سکے اخلاص سیں
یہ بولوں بیان دین ایمان کا کہ جس سوں شرف ہے مسلمان کا

اختتام :-

اتمی ساۃ تاریخ دن مشتری یو نسخہ مرتب ہوا خوشتری
مرتب یو نسخہ اچھو بردوام بحقِّ محمد علیہ السلام

ترقیمہ

بتاریخ ہفتم ماہ جمادی الثانی ۱۲۶۲ ہجری روز جمعہ بعد از نماز مغرب تمت تمام شد۔ کاتب الحروف محمد امیرالدین ساکن اطراف اورنگ آباد، برائے لعل ڈی صاحب سوداگر زبروی دام اقبالہٗ

تحریریافت بیدت

امیرالدین ندارد توشۂ راہ بجز لا تقنطوا من رحمۃ اللہ
یادگاری را نوشتہ این کتب کمترین عاجز امیرالدین تباب

---

(۱۴) شمائل النبی [۱۰۹]

اوراق ۱۲۔ سطور ۸۔ تقطیع ۲½ × ۴"
خط ثلث۔ مصنف عبدالمجد ترین۔ کتابت اوائل بارہویں صدی ہجری۔

یہ ۷۰ ابیات کی مثنوی ہے جس کو ایک دکھنی شاعر عبدالمجد ترین نے پشتو زبان کے ایک مصنف اخوند رویزانی کے رسالہ سے ترجمہ کیا ہے اس میں حضرت رسول مقبولؐ کے شمائل (جس میں سراپا اور اخلاق وعادات شامل ہیں) نہایت خوبی سے قلمبند کئے گئے ہیں۔

اسی موضوع پر ایک اور رسالہ جامعہ عثمانیہ کے کتب خانہ میں موجود ہے جس کا نام شمائل محمدی اور جس کا

مصنف عثمان ہے اور جس کی ابتدائی اور آخری ابیات یہ ہیں :-

الٰہی گلشن دیدار میں توں | نبی کے نور سوں کر تو جہاں گُل
لکھا عثمان عاشق ہو شمائل | ہمیشہ کر رکھو گل میں حمائل

فہرست اردو مخطوطات صفحہ

عبدالحمد ترین کی شمائل نبوی زبان کے لحاظ سے اس رسالہ سے بہت قدیم ہے۔ اس میں مصنف نے سبب تالیف یوں بیان کیا ہے :-

کیا قصد عبدالحمد ترین | شمائل نبی کا کہوں بہترین
اخوند درویزانی جو ہشتو سخن | کیا ہے سو منگتا ہوں میں بولنے
شمائل نبی کا منگوں بولنے | کریا کرم کر زباں کھولنے
قریب الفہم نظم دکھنی اچھو | ہر یک کس کا دل اسکوں سیکھنی اچھے

اختتامی ابیات میں شاعر نے اپنا نام عبدل ترین لکھا ہے۔

آغاز :-

الٰہی سچا توں ہے پروردگار | دو نو جگ میں قدرت ترا آشکار
سچا توں ہے قادر سچا توں حکیم | سچا توں ہے صانع سچا توں رحیم

اختتام :-

شمائل نبی کا سبھی بہترین | کیا نظم دکھنی میں عبدل ترین
اگر کوئی پڑے یاد کر کوئی سنے | دعا نیک سوں یاد کرنا اُونے
خدایا گنہ بخش ہور سنچ خطا | دئے کر توں ایمان کی سنچ عطا
بحق محمد ہے تیرا رسول | مناجات کر سنچ بندی کی قبول

ترقیمہ

الٰہی گنہ کو پڑھنہار کے | بخش تو گنہ کو لکھنہار کے

(۱۵) وفات نامۂ سرور کائنات [۹۸ ب]

اوراق ۳۶ - سطور ۷ - تقطیع ۲¾ × ۴¾
خط ثلث - مصنف دریا - سنہ تصنیف ۱۱۱۱ھ
سنہ کتابت ۱۱۶۵ھ

یہ ۲۲۵ ابیات کی مثنوی ہے جس میں ایک شاعر دریا نے حضور سرور کائنات کی وفات کے حالات قلمبند کئے ہیں۔ شاعر کہتا ہے کہ عربی اور فارسی میں تو اس موضوع پر کتابیں لکھی گئی ہیں لیکن ضرورت ہے کہ دکنی میں بھی لکھا جائے تا کہ لوگ خود پڑھ کر سمجھ سکیں ۔

ہر یک دکھنی زبان سوں پڑ کو بوجے
نہ رہے محتاج کس سوں آپ سوجے

اس کتاب کا ایک نسخہ جامعہ عثمانیہ کے کتب خانے میں بھی موجود ہے جس میں کتابت کی بے حد غلطیاں ہیں اور جس کو بہلول خاں نے ۱۲۲۴ھ میں (یعنے ادارے کے نسخے سے ۵۹ سال بعد) نقل کیا ہے۔ (فہرست مخطوطات صفحہ) ادارے کے نسخے میں آخری ورق محفوظ نہیں رہا۔ سنہ تصنیف جامعہ کے نسخے میں موجود ہے :-

ہوا نسخہ یو ہجرت بعد سارا | ہوا برس گیارہ پر گیارہ

آغاز :-

بنا اول کردں حمد خدا میں | زباں اوپر اپس کی ابتدا میں
کیا قدرت سوں ظاہر اپنی قدرت | بنا کر جگ دکھایا اپنی حکمت

اختتام :-

محب چار یاراں ہر دو عالم | ہمیشہ سرفرازی تاجدار م
کیا دریا رسالہ نظم سوں سانچہ | یو بیتاں ہیں دو صد دو پر پانچہ

بقا نہیں ہے کسی کو آج دایم   بجز ذات خدا نہیں کوئی قائم
بقا متی کر ہیچ یو عمر فانی   فنا ہوگا جہاں لگ ہے جوانی

جامعہ کے نسخے میں ابیات کی تعداد کی بیت غلط نقل کی گئی ہے۔ یوں لکھا ہے :-

یہ بیتاں ہیں دو صد بست دو پر

یہ مصرع بحر میں بھی نہیں آتا۔ ادارے کی بیاض میں صحیح مصرع درج ہے جو اوپر نقل کیا جا چکا ہے۔

وفات نامہ کا یہ نسخہ معراج نامۂ بلاقی (نمبر ۱۰) کے ساتھ مسلسل ایک ہی قلم میں اور اسی کاغذ پر نقل کیا گیا ہے۔

اسی موضوع پر ایک اور شاعر امامی کی کتاب (دیکھو فہرست ہذا سلسلہ نشان ۳) کا تذکرہ گزر چکا ہے۔ اس کا نام بھی وفات نامۂ سرور کائنات ہے۔

زیر نظر نسخے کے مصنف کے حالات معلوم نہ ہو سکے اس کا تخلص دریا ہے۔ اور یہ لفظ دکن کے دو بزرگوں کا لقب تھا۔ (۱) شاہ محمد قادری نور دریا (۲) بحرالدین قاضی دریا

۱- شاہ محمد قادری خلیفہ تھے شاہ امین الدین اعلیٰ کے اور ۱۱۰۴ھ میں فوت ہوئے۔ ایک کرامت کی وجہ سے نور دریا لقب پایا۔ رائچور میں مدفون ہیں (واقعات مملکت بیجاپور حصہ سوم ص ۳۰۲) تاریخ تصنیف کے لحاظ سے یہ رسالہ ان کی تصنیف نہیں ہو سکتا ممکن ہے کہ ان کے کسی معتقد یا مرید کا ہو۔

۲- بحرالدین گوگی کے قاضی اور محمود بحری مصنف من لگن (متوفی ۱۱۳۰ھ) کے والد تھے ان کا لقب قاضی دریا تھا۔ (دیکھو فہرست اردو مخطوطات جامعہ عثمانیہ ص ۳۸) یہ وفات نامہ غالباً ان کی تصنیف بھی نہیں ہے کیونکہ وہ ۱۱۰۰ھ سے قبل فوت ہو چکے تھے۔ ممکن ہے کہ اس رسالہ کی تاریخ تصنیف جامعہ عثمانیہ کے نسخے میں غلط مندرج ہو کیونکہ وہ نسخہ بہت غلط لکھا گیا ہے۔ ادارے کے اس نسخہ میں آخری ورق محفوظ نہیں ہے جس میں سنہ تصنیف کی بیت شامل تھی۔ اگر سنہ تصنیف واقعی غلط ہو تو یہ رسالہ ان دونوں بزرگوں میں سے کسی ایک کی تصنیف سمجھا جا سکتا ہے۔

---

(۱۶) تحفۃ النصائح (۱۵۷)

اوراق ۴۴ - سطور ۱۳ - تقطیع ۴½ × ۵½"
خط نستعلیق - مصنف قطب رازی - سنہ تصنیف
۱۰۴۵ھ

یہ ۷۸۶ اشعار کا قصیدہ ہے جو اصل میں اسی نام کی ایک فارسی کتاب کا ترجمہ ہے۔ فارسی تحفہ کے مصنف سید یوسف راجو حسینی تھے جنھوں نے ۷۹۵ھ ہجری میں یہ رسالہ قلمبند کیا تھا۔ انھوں نے حمد و نعت کے بعد اپنے مرشد شیخ نصیرالدین محمود کی مدح کی ہے اور اس کے بعد سبب تالیف کتاب بیان کیا ہے۔ ترجمہ میں رازی نے اصل کی پوری پابندی کی ہے اور ابتدائی حصہ میں اپنا کوئی ذکر نہیں کیا۔ بلکہ آخر میں بیتالیسویں باب میں بہ عنوان "مناجات و خاتمہ" اصل کتاب اور ترجمہ دونوں کی تاریخ اور تعداد ابیات و ابواب اور سبب تالیف وغیرہ بیان کر دئے ہیں۔ اس امر کی بھی وضاحت کی ہے کہ بالعموم مثنوی لکھنے کا رواج ہے لیکن میں نے تحفہ قصیدے کے طور پر لکھا ہے۔ (ورق ۴۳ ب) اور اس قصیدے کو ۴۵ ابواب میں تقسیم کیا ہے جن میں مذہب و اخلاق

وتمدن کے متعلق مسائل کے بارے میں نصیحتیں کی گئی ہیں۔

مترجم نے وجہ ترجمہ یوں بیان کیا ہے :۔

تحفہ اصل اسے فارسی سب ترجمہ دکھنی کیا
صاحب سودیا دین کے شہ بوالحسن فرمائے پر
بندیاں میں سب کترا ہے رازی تخلص قطب کا
تحفہ کیا دکھنی زبان شہ کی معانے سیس پر
بندہ توسب پر عیب ہے جوں شاہ بخشے عیب توں
بندہ نوازی شاہ سوں او عیب ہوئے سب ہنر
ہجرت تھے دس سو سال ہور چالیس پر بھی پانچ تھو
تب اسے مرتب سب ہوا تحفہ سو دکھنی نامور

(ورق ۶۳ ب)

جس سے پتہ چلتا ہے کہ رازی کا نام قطب یا قطب الدین تھا اور اس نے اپنے مرشد شاہ ابوالحسن کی فرمائش پر ۱۰۴۵ھ میں فارسی سے دکھنی میں یہ رسالہ منتقل کیا ۔ بعض کتابوں میں اس کا تخلص راضی (بہ ض) سے لکھا گیا ہو جو صحیح نہیں معلوم ہوتا (دکن میں اُردو ص ۳۲) کیونکہ اس نسخے میں ہر جگہ رازی لکھا ہے ۔ ایک غلط فہمی یہ بھی ہوئی ہے کہ رازی اور قطبی دونوں کو ایک ہی مصنف مان لیا گیا ہے ۔ حالانکہ دونوں جدا جدا شخص تھے اور اس نسخے میں یہ کہیں معلوم نہ ہوسکا کہ رازی کا تخلص قطبی بھی تھا ۔ (اُردو شہ پارے ص ۱۰۶)

رازی کو قطب شاہی شاعر بھی نہیں کہا جا سکتا۔ کیونکہ اس نے جن بزرگ کی فرمائش پر یہ رسالہ لکھا ہے وہ بیجاپور کے تھے گولکنڈہ یا حیدرآباد میں اس عہد میں اس نام کے کوئی مشہور بزرگ نہیں گزرے ۔ البتہ بیجاپور میں اس نام کے دو بزرگ موجود تھے ۔ شاہ ابوالحسن قرآبادی اور شاہ ابوالحسن قادری ۔

رازی جن کا معتقد تھا وہ شاہ ابوالحسن قادری بیلدی ہیں جن کا سلسلۂ نسب حضرت محبوب سبحانی تک پہنچتا ہے وہ ابراہیم عادل شاہ ثانی کے عہد میں بیجاپور گئے اور بڑی قدر و منزلت حاصل ہوئی ۔ بادشاہ اور عوام بے حد معتقد ہو گئے ۔ کئی کرامتیں مشہور اور منقول ہیں ۔ بادشاہ نے معقول وظیفہ مقرر کر دیا تھا ۱۴ ربیع الثانی ۱۰۴۶ھ میں رحلت پائی اور اللہ پور دروازے کے باہر مدفون ہوئے ۔ تاریخ اولیائے دکن میں عبدالجبار خاں نے شاہ ابوالحسن قرآبادی کے علاوہ شاہ ابوالحسن قادری کا تذکرہ دو جگہ (ص ۱۱۲ اور ص ۱۶۹) اس غلط فہمی میں کیا ہو کہ یہ دو علیحدہ بزرگ ہیں ۔

رازی کے بیان سے معلوم ہوتا ہے کہ لوگ اُن کے کتنے معتقد تھے اور کیسا صاحب اقتدار سمجھتے تھے ۔ یہ کتاب تحفہ ان کی وفات سے کچھ دنوں پیشتر ہی لکھی گئی تھی ۔

آغاز :۔

بولوں صفت میں بے گنت اُس خالقِ جن و بشر
نو دھار کر آسمان رکھیا چندان سورج تارو قمر
دسے یوں بزرگی عرش کوں نکلی اُٹھے ایک پاتے
جیوں پنچ برساں چار سو انپڑ سے بنالیا دگر

اختتام :۔

ہجرت تھے دس سو سال ہور چالیس پر بھی پانچ تھو
تب اسے مرتب سب ہوا تحفہ سو دکھنی نامور

ترقیمہ نہیں ہے ۔ بارھویں صدی ہجری کی کتابت معلوم ہوتی ہے ۔

اس کے نسخے دفتر دیوانی و مال اور کتب خانہ نواب

سالار جنگ بہادر و جامعۂ عثمانیہ میں بھی موجود ہیں۔ نواب سالار جنگ بہادر کے چار نسخوں میں سب سے قدیم سنہ ۱۱۲۳ھ کا مکتوبہ ہے۔

اس کتاب کا سنہ تصنیف بالعموم سنہ ۱۰۴۴ھ بیان کیا گیا لیکن ادارے کے نسخے میں صاف طور پر سنہ ۱۰۴۵ھ درج ہے۔

---

(۱۷) چندر بدن و مہیار [۸۷]

اوراق ۱۴- سطور ۱۳- تقطیع ۴½ × ۷"

خط نستعلیق- عنوانات سرخی میں- مصنف مقیمی

سنہ تصنیف قبل ۱۰۴۸ھ- سنہ کتابت ۱۱۲۸ھ

یہ ایک مختصر سی مثنوی ہے جس میں شاعر نے اپنے زمانے کے ایک مشہور واقعہ کو منظوم کیا ہے یعنے عہد ابراہیم عادل شاہ ثانی میں ایک ہندو شہزادی چندر بدن اور مسلمان تاجر زادہ مہیار (محی الدین) کے آپس میں محبت ہوگئی اور دونوں نے ایک دوسرے کے لئے جان دے دی۔ یہ واقعہ بہت مشہور ہوا اور کئی شاعروں نے فسانہ کے پیرایہ میں اس کو بیان کیا اس کی تاریخی صداقت کا ذکر توزک آصفیہ (ص ۱۲۱) میں بھی کیا گیا ہے۔ اسی موضوع پر ایک اور شاعر کی مثنوی ادارے میں موجود ہے جس کا ذکر آئندہ درج ہوگا۔

مقیمی کا نام مرزا محمد مقیم تھا جو استرآباد (ایران) کے ایک سید خاندان کا فرد تھا۔ باپ کے ساتھ مقامات مقدسہ کی زیارت کے لئے وطن سے نکلا۔ واپسی پر شیراز میں مقیم ہوگیا اور سرپرستی کی خاطر بیجاپور چلا آیا۔ جہاں اس کا ہم وطن فضونی استرآبادی موجود تھا اور تاریخ نگاری کا کام انجام دے رہا تھا۔ چنانچہ اس تاریخ (فتوحات عادل شاہی) میں اُس نے اپنے اس نو وارد ہم وطن کا شاعری کی حیثیت سے ذکر کیا ہے اور اس کے بعد ایک اور مورخ میر ابراہیم بن میر حسن نے بھی "احوال بادشاہان بیجاپور" میں اس کے فارسی دیوان اور اُردو کلام کا تذکرہ کیا ہے۔ (دیکھو نسخہ برٹش میوزیم ورق ۳۰ ب)۔ تفصیلی حالات کے لئے دیکھو اُردو شہ پارے ص ۳۴ تا ص ۳۹

شاعر نے اپنا تخلص مثنوی میں کئی جگہ استعمال کیا ہے مثلاً :-

دنیا تو فنا ہے مقیمی سبھی رہے گی بچن کی نشانی یہی (ورق ۱۰ا)

مُہر دے مقیمی زباں پر صفا زنعتِ محمد نبی مصطفیٰ (ورق ۱ا)

مقیمی پرت بیچ انپڑیا ہوں میں
پرت کے کند بیچ سنپڑیا ہوں میں (ورق ۲ب)

مقیمی بچن کا ترنگ ساز توں بسرکاں چلیا ہے توں مہیار کوں
(ورق ۱۱ ب)

شرع سٹ مقیمی پرت پیار کا قصہ کہہ توں پورا سو مہیار کا
(ورق ۱۲ ب)

شاعر اس مثنوی کا سببِ تالیف یہ بیان کرتا ہے کہ "میں بندۂ محبت ہوں اور چاہتا تھا کہ محبت و وفاداری کا انتہائی ثبوت دوں۔ اس اثنا میں ایک دوست سے اتنا تعلق خاطر پیدا ہوا کہ میں اس کی محبت میں مدہوش ہوگیا اس نے مجھے گہری محبت کا ایک ایسا قصہ بیان کیا جس کو سُن کر ہر کوئی مجنوں اور لیلیٰ کی داستان بھول سکتا ہے۔ اس کا میرے دل پر ایسا اثر ہوا کہ اشعار موتی کی طرح ڈھل ڈھل کر نکلنے لگے اور چونکہ میں زبان کا سچا جوہری ہوں اس لئے اپنی زبان سے گوہر گستری کر رہا ہوں اور اس قصۂ چندر بدن و مہیار میں خواصی کا تتبع کر کے اختصار سے بیان کر رہا ہوں

لیکن اس کے باوجود نہ میں اپنی تعریف کرتا اور نہ دوسرے کے شعروں کو مضمون بدل کر لکھتا ہوں۔ کیونکہ یہ خام شاعروں کا کام ہے"۔ اس میں کوئی شک نہیں کہ مقیمی نے اس قصہ میں بہت اختصار سے کام لیا ہے اور گولکنڈہ کے ملک الشعرا غواصی پر چوٹ بھی کی ہے کہ اس نے مثنوی سیف الملوک و بدیع الجمال میں بہت خود سرائی کی ہے۔ اس حصہ کی چند ابیات یہ ہیں۔

قصہ منج پرت کا کہا ایک اُن — جو سب سرے تو لیلیٰ و مجنوں کو سُن
ہوا دل پہ یوں کر تفکر قریب — کہوں شعر موزوں حکایت عجیب
بچن موز ہو دل تے اُبلنے لگی — نوی حرز خوش تب نکلنے لگی
زباں کا اتا ہوں سچا جوہری — کروں نت زباں سو گوہر گستری
قصہ یک کہوں میں گہر بار کا — سو چندر بدن ہور مہیار کا
سُنے کوئی منج کو دعا یاد کر — رہیں گے تعجب سوں دل شاد کر
تتبع غواصی کا باندیا ہوں میں — سخن مختصر کیا کے ساندیا ہوں میں
ولے میں اپس کوں سراہا نہیں — شعر میں کسی کا بھرایا نہیں
سراہا بھرانا نہٹ کام ہے — کرے اُن عمل یو کہ جو خام ہے

(ورق ۲ ب – ۳ و)

عجیب بات یہ ہے کہ مقیمی نے غواصی کی طرح نہ بادشاہ کی مدح لکھی اور نہ سنہ تالیف ہی قلمبند کیا جس کے باعث یہ یقین سے نہیں کہا جاسکتا کہ اس نے یہ کتاب کس سنہ میں لکھی ہے۔ البتہ غواصی کی تصنیف سیف الملوک (۱۰۳۵ھ) اور امین کی بہرام و بانو حسن (۱۰۴۹ھ) کے درمیانی زمانہ میں یہ کتاب لکھی گئی ہو کیونکہ اس موخرالذکر کتاب میں مقیمی کے اُردو کلام کا تذکرہ ہے۔

اس مثنوی کے نسخے انڈیا آفس (بلوم ہارٹ ۱۰۰) اور ایڈنبرا یونیورسٹی (۴۷۸) کے علاوہ نواب سالار جنگ بہادر کے کتب خانے میں بھی موجود ہیں۔ موخرالذکر کا نسخہ ۱۱۵۵ھ کا مکتوبہ ہے۔

ادارے کے نسخے میں جملہ ۳۲۵ ابیات ہیں آخری صفحہ غائب تھا تو مولوی نصیرالدین ہاشمی صاحب کے نسخے سے تکمیل کرائی گئی ہے ابتدائی ورق کی عبارت اور کاغذ اور خط سے ۱۱۲۸ھ کی کتابت معلوم ہوتی ہے۔

آغاز :-

مجھے فیض کچھ بخش تجہ دھیان کا
الٰہی تو حافظ ہے ایمان کا
مرا دین و ایماں سارا سو توں
مرے جیو میں کیتا ہے ٹھارا سو توں

اختتام :-

دنیا تو فنا ہے مقیمی سہی — رہے گی بچن کی نشانی یہی
تو ہر جا کہ بینی بہ سہو و خطا — مرا بد بجوید ز بہر خدا

ترقیمہ :-

منقول از مخطوطہ نصیرالدین ہاشمی۔۔ ۱۴ مئی ۱۹۳۷ء

اس کے نیچے نواب عنایت جنگ بہادر کے دستخط ہیں جنھوں نے ادارے کو یہ کتاب بطور عطیہ عنایت کی ہے

مخطوطہ جس ورق سے شروع ہوتا ہے اس پر کسی مثنوی کا یہ آخری شعر اور ترقیمہ درج ہے :-

توں مقبول کر جگ میں میرا کلام — بحق محمد علیہ السلام

تمت بالخیر۔ تحریر فی التاریخ چہاردہم ماہ ذیحجہ سنہ ۲۸

اس کے نیچے سرخ روشنائی سے نصرتی کی یہ رباعی لکھی ہے :-

رباعی نصرتی :-

فرصت کی گھڑی کوئی بی ترے ہاتھ نہیں
پھیتا نہیں گردن کوں تو کیا رات نہیں
یک بوسہ نہ دے تلخ ہو چپ لڑکہ پری
گوڑ نیں ہے تو گوڑ سار کی کیا بات نہیں

---

۱۸ چندر بدن و مہیار (۸۴)

اوراق ۴۳ - سطور ۱۳ - تقطیع ۳/۴ ۴ × ۳/۴ ۶
خط نستعلیق - مصنف مُبتلا -

یہ مثنوی مقیمی کی اسی موضوع کی مثنوی سے بڑی اور کچھ عرصہ بعد لکھی گئی ہے یہ دراصل آتشی کی فارسی مثنوی کا ترجمہ ہے جو شاعرانہ تخیل اور لطافت زبان کے لحاظ سے مقیمی کی مثنوی سے بہتر ہے - شاعر نے اپنا تخلص کئی جگہ استعمال کیا ہے :-

کرے کیا وصفِ گل مُبتلا فدائی	محمد ہور خدا میں نیں جدائی (ورق ۵ ا)
چمن آرا جیا اے سرو رفتار	ہوا قمری کے تیوں مُبتلا گرفتار (ورق ۵ ب)
توں مُبتلا خاص گلزار سخن ہے	سخن تیرا چمن اندر چمن ہے (ورق ۹ ا)
او گل ہو طبع مُبتلا سوں ہو راضی	کرے شیریں سخن سوں سرفرازی (ورق ۹ ب)
وہ بشن بہر مبارک یا د آواز	کیا مُبتلا اوچوں پروانہ پرواز
ہوا مُبتلا او پر اس تے مروت	دکھانا فرس کی ہندی میں مروت (ورق ۱۲ ب)

چونکہ اس نسخے میں آخری اوراق محفوظ نہیں ہیں اور نہ کسی اور کتب خانے میں اس کا نسخہ موجود ہے اس لئے کتاب کا سنہ تالیف وغیرہ معلوم نہ ہو سکا - البتہ زبان اور اندازِ بیان سے پتہ چلتا ہے کہ یہ کتاب مقیمی کے بہت بعد لکھی گئی ہے -

تقدیم و تاخیر اور دیگر امور کے اندازے کے لئے ایک ہی مقام سے متعلق دونوں کی ابیات بطور مقابلہ ذیل میں درج کی جاتی ہیں - جب مہیار، چندر بدن سے مل کر اظہار محبت کرتا ہے تو وہ اپنے ہندو ہونے اور مسلمان کے ساتھ محبت نہ کر سکنے کی مجبوری ظاہر کرتی ہے اس طعن و تشنیع کی گفتگو کو دونوں نے بیان کیا ہے جو یہ ہے :-

مقیمی	بُلبُل
ترک جاکے بولیا کہ سن ای پری	قدم پر جا کیا آداب سجدہ
مجھے تجھ لطافت دوانہ کری	بجا لایا او سر سیں داب سجدہ
دیوانہ ہوں تیرا دیوانے کے تیں	جنوں بیتاب ہو گل دعا میں
ایس تے نہ کر دور جانے کے تیں	نیاز عرض کیتا مدعا میں
دھریا آس تیری نراسی نہ کر	تو ہیں سلطان خوباں شہپری ہے
جفا پر مجے توں کہ اسی نہ کر	یو صورت تجھ دیوانہ مجھ کری ہے
سو تج بن مجے کوئی ہونا نہیں	چھڑائی مجکوں میرے خاناں سوں
کہ بن جل مچھی کا سو جینا نہیں	کری تاراج مجکو دل و جاں سوں
سو یوں کہہ ادب سوں نوز کرا دنے	نثار تجھ قدم اب نیم جاں ہے
دھریا سیس اوس کے چرن پر اونے	یہی ہے آرزو فرماں رواں ہے
لگد مار اوس کو اوٹھی بول یوں	اے سر میرا نثار خاک راہ ہے
سمج کچھ اپس کوں رہے ٹھول تل	دل پر خوں شہید جلوہ گاہ ہے
ہندو میں کہاں ہور ترک تو کہاں	تری اے زلفِ مشکین غرہ گیسو
	ہوے ہیں دام دل زنار و زنجیر
کہاں رام سیتا، مورکہ تو کہاں	ترے بت کا صنم خانہ دل ہے
کہاں میں چندرماں کہاں تو دیا	ترے مہتاب کا دیوانہ دل ہے
کتا کیا موسے توں دیوانہ ہوا	دیا سب آگ میں سامان تقویٰ
جھڑک بول اسکوں وہیں پھر چلی	فغاں ہر دل اُپر شور قیامت
اٹھی دل میں عاشق کے دیں تلملی	تھوڑے نیں ناز با ستانہ ہی
(ورق ۵۱ ب)	کرے عاشق سوں ظاہر بے نیازی

یہ سنکر آ غصے میں ہوئی غضب ریز
کری شب دیز کوں غمزی کے مہمیز
قدم سوں اُس کے سرکوں مار ٹھوکر
کہی بکتا ہے کیا دیوانہ ہو کر
کہاں میں چاند ہوں، ہور توں دِلگیا ہے
موے دیوانہ بے ہودہ ہوا ہے
نہیں ہے تاب ذرہ وصل خورشید
کرے کیا قطرہ با دریاے امید
سجودِ بت مسلمانی میں دشوار
نہووے رشتۂ تسبیح زنار
نہ کر دیوانہ سودا بوالہوس خام
کہاں پروانہ ہوتا ہے مگس خام
یہ کہکر اُس کے سر کو مار ٹھوکر
کرشمہ ناز ہور غمزے سیں ہو کر
رواں ہوئی نونہال سرو بابال
کرے قمری نمن فریاد غلغال
پری پیکر رخ نیکو شمائل
کری ہمیار کوں غمزے سوں گھائل
یو سن دلبر ستے یک آہ مارا
جگر سوں نعرۂ جانکاہ مارا
(ورق ۱۴ ب، ۱۵ الف)

اس سے ظاہر ہوا کہ مقیمی نے جس واقعہ کو ۹ ابیات میں بیان کیا تھا اُس کے لئے تبل نے ۲۰ بیتیں لکھی ہیں۔ ساتھ ہی بعض بیتیں بیت یکساں ہیں مثلاً مقیمی کی بیت نمبر ۸ اور طبل کی بیت نمبر ۲۳ مقیمی لکھتا ہے:۔

کہاں میں چندر ساں کہاں تو دیوا ~~~ کتا کیا موسے توں دیوانہ ہوا

طبل کی بیت ہے:۔

کہاں میں چاند ہوں ہور تو دیا ہے ~~~ موے دیوانہ بے ہودہ ہوا ہے

یہی ایک بیت ظاہر کرتی ہے کہ تبل نے یا تو مقیمی کی کتاب دیکھی ہے یا پھر یہ سمجھنا پڑے گا کہ مقیمی کی اُردو مثنوی کا آتشی نے فارسی میں ترجمہ کیا اور اُس فارسی سے تبل نے دوبارہ اُردو میں منتقل کیا۔ تبل قصے کے آغاز میں صاف طور پر کہتا ہے کہ ع

کیا یوں آتشی قصے کی بنیاد (ورق ۹۷)

یعنی آتشی نے اس قصہ کا آغاز یوں کیا ہے۔ فارسی سے اُردو میں ترجمہ کرنے کی طرف مصنف نے کئی ابیات میں اشارہ کیا ہے مثلاً

لباس پارسی ہے بیاز نجیر (ورق ۶) ~~~ حریر ہندوی پر کر توں تصویر
ستار ہندوی دو دم نواساز (۸ ب) ~~~ تو ہو مجہ باغ میں تک نغمہ پرداز
پیا نیں فارسی کا ہے دو پیالہ (۹) ~~~ پڑا تھا عشق کا ہندی رسالہ
دکھانا فرس کی ہندی میں صورت (۹) ~~~ ہوا تبل او پر استے ضرورت

اس نے سبب تالیف یوں بیان کیا ہے :۔

ایک رات میں باغ میں گیا جہاں گل جلوہ دکھا رہا تھا اور میں قمری کی طرح اس کا گرفتار ہو گیا۔ نسیم صبح نے غنچۂ لب کھول کر کہا کہ تو نے شعر کہنا کیوں چھوڑ دیا ہے۔ سوسن نے بھی اپنی دس زبانوں سے میری تعریف کی اور کہا کہ بارے اب تو زبان کھول اور حریر ہندوی پر مصوری کر۔ کیونکہ تو گلزار سخن کا خاص بلبل ہے۔ اس کے بعد عقل نے مجھے مبارک باد دے کر کہا کہ فارسی قصہ اچھا ہے اس کا تو ترجمہ کر۔ اس نے اگرچہ عشق کا ہندی کا رسالہ پڑھا تھا لیکن فارسی کی مے دو سالہ سے واقف نہ تھا۔ اس لئے تبل کے لئے ضروری ہوا کہ فارسی کو ہندی میں منتقل کرے۔

شاعر نے جس فارسی کتاب کا اُردو ترجمہ کیا تھا وہ آتشی کی تھی۔ آتشی اس قصے کے اصل مصنف مقیمی کا ہم عصر ایرانی شاعر اور طبیب تھا۔ فتوحات عادل شاہی اور احوال سلاطین بیجاپور دونوں تاریخوں میں اس کا ذکر ہے یہ شیراز کا سید زادہ تھا اور آتشی اُس کے خاندان کا لقب تھا۔ کیونکہ اُس کے

اجداد میں سے کوئی اپنی سیادت کو ثابت کرنے کے لیے آگ میں کود گیا تھا۔ بیجاپور آیا تھا اور وہاں آتشی کے بعض علاج بہت مشہور اور زبان زد خلائق تھے۔ بیجاپور میں اس کی فارسی شاعری کا بھی بڑا چرچا تھا اور اُردو میں بھی اس نے شعر کہے ہیں۔ ممکن ہے کہ مقیمی کی اُردو مثنوی چندر بدن و مہیار کو پسند کرکے اس قصہ کو اس نے فارسی میں لکھ دیا ہو اور بعد میں فارسی قصہ کو مقبولیت حاصل ہوئی اور بتیل نے اسی وجہ سے اس کا ترجمہ کیا۔

آغاز :-

بنام نقشبند نقش ایجاد — کیا قدرت کے نقشے کا وو بنیاد
بنا نقشہ زمین و آسماں کا — بہار گلشن و جان جہاں کا

اختتام :-

وو مل تن کا ہوا تن سات ہم دوش
وصل جاں کا ہوا جان سیں ہم آغوش
رواں ہوئی نعش تب مہیار بے تاب
پریرو گود میں تھی دو شکر خواب

آخری ورق غائب ہیں۔ ابتدائی ورق پر نواب عنایت جنگ بہادر کی مہر اور دستخط ہیں۔ یہ نسخہ انہی کا عطیہ ہے۔

---

۴۹ نجات نامہ ۵۰۷

اوراق ۸۔ سطور ۱۳ متن میں۔ ۱۲ حاشیہ پر۔
تقطیع ۶×۸۔ خط نستعلیق۔ مصنف محمد امین ایاغی
تصنیف درمیان ۱۰۶۷ھ و ۱۰۸۳ھ۔ کتابت ۱۲۱۱ھ

یہ ایک چھوٹی سی مثنوی ہے جس میں شریعت کی پابندی سے متعلق پند و نصائح بیان کئے گئے ہیں۔ مصنف خاص مذہبی قسم کا آدمی ہے اور طریقۂ نقشبندیہ یا قادریہ میں منسلک معلوم ہوتا ہے اور وہ راگ سننے، گیت گانے، شطرنج کھیلنے، بھنگ پینے نظر بازی کرنے، مال گاڑ کر رکھنے، کافروں سے دوستی رکھنے اور راگ کے ذریعہ سے ذکر کرنے کو گناہ اور دوزخ میں جانے کے اسباب قرار دیتا ہے۔ اسی طرح پوری کتاب میں عذابِ الٰہی سے ڈرایا گیا ہے اور گناہوں کی مختلف سزائیں بیان کی گئی ہیں۔

حسب ذیل بیتوں میں مصنف نے اپنا نام محمد امین اور تخلص ایاغی ظاہر کر دیا ہے۔

ایاغی کدھر تو چلیا باٹ چھوڑ — سرشتے کو پنداں کے تو یوں نہ توڑ
(ورق ۵ ب)
محمد امین وایاغی اوپر — الٰہی کرم کی نظر کر نظر
(ورق ۸ ۵)

مصنف کا ذکر "احوال سلاطین بیجاپور" میں نصرتی کے ہم عصر شعرا میں کیا گیا ہے جس سے معلوم ہوتا ہے کہ وہ معروف شاعر تھا اور اس مثنوی کے علاوہ اور بھی کلام لکھا ہے۔ اردو میں اس کا ذکر پہلی بار کتاب اُردو شہ پارے (ص ۴۳) میں کیا گیا ہے۔

نصرتی علی عادل شاہ ثانی کے دربار کا ملک الشعرا تھا اور اس بادشاہ کا ذکر خود ایاغی نے بھی نجات نامہ میں پند و نصائح کے درمیان کر دیا ہے جس سے پتہ چلتا ہے کہ وہ اتنا سخت مذہبی آدمی تھا کہ مدح بادشاہ کے عنوان سے کچھ لکھنا بھی پسند نہ کیا۔ بلکہ دوسری نصیحتوں کے سلسلے میں جب اس موضوع پر آتا ہے کہ اگر کوئی بادشاہ دنیا میں خوبی اور راستبازی سے عدل کرے تو دین میں اس کو دنیا سے بڑھ کر بادشاہی دی جائے گی تو اسی سلسلے میں لکھتا ہے کہ مجھے ہر گھڑی شکر پروردگار کرنا چاہئے کہ اس دور میں علی عادل شاہ

جیسا بادشاہ حکمران ہے جو نمازی، حق پرست، سنت کا پیرو اور دیندار ہے۔ اتنا لکھ کر فوراً اپنے راستہ بھٹک کر مدح پر اُتر آنے پر ٹوکتا ہے اور کہتا ہے کہ تونے نصائح کا سلسلہ کیوں توڑ دیا۔ اس کی بیتیں ہیں :-

اگر راستی سو کیا عدل بیاں ۔۔۔ تجہ اس تے بڑی بادشاہی ہو دہاں
کروں ہر گھڑی شکر پروردگار ۔۔۔ کہ اس دور میں ہیں علی شہر یار
رہے شاہ عادل زہے بادشاہ ۔۔۔ کہ سنت کو جوں فرض کرتا ادا
کدہیں ترک ہرگز کیا نیں نماز ۔۔۔ کہ حق سات دھرتا ہے راز و نیاز
شب و روز ہے دین پر استوار ۔۔۔ تو خوشنود ہے اوس پہ پروردگار
الٰہی اچھے جب تلک آسمان ۔۔۔ شہنشاہ عادل کوں رکھ دو جہاں
ایاغی کدہر تو چلیا بات چھوڑ ۔۔۔ سر رشتے کو پنداں کے تو یوں نہ توڑ

(ورق ۵ ب)

آخر کتاب میں مناجات لکھی ہے اور توفیق نیک کے لئے دعا مانگی ہے اس سلسلہ میں ایک بیت سے یہ بھی معلوم ہوتا ہے کہ "نجات نامہ" لکھتے وقت ایاغی بوڑھا ہو چکا تھا وہ کہتا ہے "میں اپنی حالت پر کتنا روؤں کہ اگرچہ بال سفید ہو گئے لیکن دل اب بھی سیاہ ہے"۔ اس کی بیت ہے :-

کتا روؤں میرے پہ افسوس آہ ۔۔۔ ہوے بال اجلے ولے دل سیاہ

(ورق ۷ ب)

اس مثنوی کا ایک نسخہ (جس میں ۲۷۰ ابیات تھیں) شاہانِ اودھ کے توپ خانے کے کتب خانے میں موجود تھا۔ جس کا ذکر اسپرنگر نے اپنے کیٹلاگ میں کیا ہے۔ ایک اور نسخہ مبارز الدین احمد صاحب کو راجمندری میں ملا تھا جس کو انھوں نے "رسالۂ ہندستانی (الہ آباد) بابتہ اپریل ۱۹۳۰ء" میں چھپوا دیا ہے۔ اس میں ۲۶۳ ابیات ہیں۔ ادارے کے نسخے میں جو ۲۵۴ ابیات ہیں۔ ان دونوں کی اکثر ابیات میں الفاظ اور مصرعوں میں ایسا فرق ہے جس سے اندازہ ہوتا ہے کہ ادارہ کا نسخہ کسی قدیم اور صحیح نسخے کی نقل ہوگا

آغاز :-

اول کچھ نہ تھا اور نرنکار تھا ۔۔۔ دو نو جگ کا پیدا کرنہار تھا
او قدرت تے پیدا کیا یک رتن ۔۔۔ کہ جس تے دیا روپ او تربھن

اختتام :-

بصدیق و فاروق ذی احتشام ۔۔۔ بعثمان و حیدر دوازدہ امام
دراں دم کہ باشم بہ زیر زمیں ۔۔۔ رفیقم تو باشی جہاں آفریں

ترقیمہ :-

"تمت تمام شد نجات نامہ بتاریخ بست و ششم
جمادی الآخر بوقت عصر سنہ ۱۲۴۱ھ"

یہ نسخہ کرم خوردہ ہے۔ ہندستانی میں جو نسخہ شایع ہوا ہے اس کے آخر میں حسب ذیل دو بیتیں زیادہ ہیں جو بعد کی الحاقی معلوم ہوتی ہیں :-

الٰہی ہراں کس کہ این خط نوشت
عفو کن گناہش عطا در بہشت

نجات نامہ یہاں سو ہوا ہے تمام
بحق محمد علیہ السلام۔

---

(۲۰) نور نامہ [۵۰۸]

اوراق ۱۸ ۔ سطور ۱۵ ۔ تقطیع ۶×۸
خط نستعلیق ۔ عنوانات سرخی میں ۔ مصنف
شاہ عنایت ۔ سنہ تصنیف ۱۱۱۱ھ ۔
کاتب سید محمد ۔ سنہ کتابت ۱۲۱۳ھ ۔
مقام قلعہ مدگل ۔

یہ فارسی نثر کے ایک رسالہ کا منظوم ترجمہ ہے جس کو ایک صوفی شاہ عنایت نے مثنوی کی شکل میں دکنی زبان میں قلمبند کیا ۔ تذکرۂ اولیائے دکن (جلد اول صفحہ ۹۱۳) اور گلزار آصفیہ (صفحہ ۳۵۳) میں شاہ عنایت نام ایک بزرگ کا تذکرہ درج ہے جو ۱۱۵۵ھ میں فوت ہوئے اور حیدرآباد میں دفن ہوئے ۔ چونکہ ٹاٹ کا جبہ پہنتے تھے اس لئے ٹاٹ شاہ مشہور ہوئے ۔ اگر یہ کتاب انہی بزرگ کی ہے تو انھوں نے اپنی وفات سے چوالیس سال قبل لکھی ہوگی ۔

مصنف نے خود اپنی نسبت اس رسالہ میں جو معلومات ضمناً لکھ دی ہیں وہ یہ ہیں کہ وہ حضرت محبوب سبحانی کی اولاد سے تھے اور حضرت حسین شاہ ان کے مرشد یا والد تھے ۔ نور نامہ، فارسی نثر میں تھا جس کو انھوں نے دکنی میں ۱۱۱۱ھ میں لکھا ۔ وہ کوئی بڑے شاعر نہ تھے تاہم بطور یادگار یہ مثنوی لکھی ہے ۔ یہ باتیں آخری ۱۵ ابیات سے ظاہر ہوتی ہیں ۔

اس کا جو نسخہ جامعہ عثمانیہ کے کتب خانے میں ہے وہ اصل نور نامہ کے ترجمہ سے شروع ہوتا ہے ادارے کے نسخہ میں ۶۵ ابیات ابتداء میں زائد ہیں جن میں شاعر نے سبب تالیف اور نور نامہ کے فضائل تفصیل سے بیان کئے ہیں ۔ اسی طرح آخری ابیات بھی اس نسخے میں بہت زیادہ ہیں ۔ ان امور سے پتہ چلتا ہے کہ یہ نسخہ مکمل ہے اور جامعہ کا نسخہ ناقص ۔
(فہرست مخطوطات صفحہ ۶۲)

سبب تالیف میں شاعر حمد کے سلسلہ میں لکھتا ہے کہ "اے خدا میں نور نامے کو دکھنی میں لکھنا چاہتا ہوں اس لئے تو مجھے اس کام کی سکت دے تاکہ میں ایسا لکھوں کہ عام لوگ اس کے معنے کو سمجھ سکیں کیونکہ ان کی سمجھ بھی میری ہی طرح معمولی ہے ۔ پہلے میں نور نامہ کے فضائل بیان کرتا ہوں"

اس کے بعد علحدہ علحدہ عنوانوں کے تحت اس رسالہ کے سات شرف بیان کئے ہیں اور آخر میں امام محمد غزالی سے متعلق ایک روایت لکھی ہے ۔

سبب تالیف کی چند ابیات یہ ہیں :-

الٰہی سکوں لکھنے دکھنی سوں میں	ترے نور کے نور نامے کوں میں
جو دکھنی سوں میں اس کو سارا لکھو	سکت دے مجے او سکت کار توں
کریں اس کے معنی کوں سب عام لوگ	کہ مج سارکے ہیں سو سب عام لوگ
کرم ہوے ترا مج یہ روز حساب	میں عاصی طفیل ان کے پاؤں توں

(ورق ۲ ب و ۳ و)

اس تمہید کو ان ابیات پر ختم کرتا ہے :-

گناہاں یہ میرے نکو کر نظر	کرم کر الٰہی گنہ گار پر
نکو پوچھ مجہ سے حساب اے حبیب	شفاعت نبی کی مجے کر نصیب

اصل نور نامہ ان ابیات سے شروع ہوتا ہے :-

سنواریا ہو قدرت سوں سینسار تو	الٰہی کرنہار کرتار توں
رنگ آمیز کرتس کو گلشن کیا	زمیں کوں بھی ایسی توں خلعت دیا

(ورق ۴ ب)

کتاب اصل میں حضور سرورِ کائنات کی نعت پر مبنی ہے اور اس میں حضور کی افضلیت اور سراپا کے محاسن شرح وبسط سے بیان کئے گئے ہیں۔ لیکن شاعر چونکہ مشاق اور اعلیٰ پایہ کا نہیں ہے اس لئے اکثر بیتیں معمولی ہیں اور موضوع کے شایانِ شان نہیں۔

آخر میں خود شاعر نے اپنی خامی طبع اور کلام کی روانی وغیرہ کا ذکر ان ابیات میں کیا ہے :-

شکستہ یو بیتاں کیا ہوں کتیک — جواہر رولیا ہوں زباں سوں کتیک
طبع دیکھتا ہوں تو لے خام ہے — نہ اس بات کا کچھ سرانجام ہے
پڑے کچھ دنیا میں مری یادگار — رہے کر کیا ہوں نا امیدوار
اتھا فارسی نور نامہ نثر — سو دکھنی کیا شعر میں سربسر
طبیعت نہ تھا کچھ مجے شعر کا — شعر کر کو بولوں گوراں نظم کا

اس کے بعد اپنا تخلص اور خاندان بیان کیا ہے :-

تخلص مرا ہے عنایت شاہ — مراجد ہے مجھ کو محمد پناہ
دنیا بیچ حضرت حسین شاہ ہے — محی الدین کا خاص اولاد ہے

سنہ تالیف اس بیت میں لکھا ہے :-

کہ ہجرت نبی تھے ہزار ایک صد — ایگیارا اتے سال ہوا ہے یو تد

اس نسخے میں ۵۴۰ ابیات ہیں :-

آغاز :-

الٰہی تہیں نور ہور تج تے نور — کیا نور تیرا نبی میں ظہور
تیرے نور کا کوئی صفت کیا کرے — ازل تے ابد کے تلک نا سرے

اختتام :-

مرتب کیا مختصر یو کلام — کہ عاجز ہوں بندا نبی کا غلام
ختم کر کہا فاتحہ نت مدام
بحق محمد علیہ السلام

ترقیمہ :-

بعون اللہ ہو المستعان کہ نور نامہ حضرت رسالت پناہ صلی اللہ علیہ وسلم، حسب الفرمایش حضرت بی بی صاحبہ قبلہ حضرت ماں صاحبہ نقلِ آن تعجلت ترقیم رفت۔ ہنوز صحت نیافتہ۔ اگر سہوے وخطاے رفتہ باشد خوردہ نگیرید ... . این کمترین راقم الحروف احقر العباد سید محمد تراب القدمین نویسندگان از اقتضائے قلبی وبسیار رغبت ہائے دلی کتاب مسطورا بتاریخ بست ہفتم ربیع الاول سنہ ۱۲۱۳ ہجریہ مقدسہ نبویہ بروز دوشنبہ بوقت سہپری قلمی نمودہ شد یعنے بوقت بےکاری در قلعہ مدگل ہیچ کارے نبود بجز نوشت وخواند۔ بقول شخصے کہ:

نوشتہ بماند سیہ بر سپید — نویسندہ را نیست فردا امید ۔۔

---

(۲۱) نور نامہ [۸۰]

اوراق ۲۳ - سطور ۹ - تقطیع ۶ × ۸ ۳/۴
خط نستعلیق۔ مصنف شاہ عنایت
سنہ تصنیف ۱۱۱۱ھ

یہ ۳۱۰ ابیات کی مثنوی ہے جو اصل میں کتاب نمبر ۲۰ ہی کا دوسرا نسخہ ہے۔ لیکن اس میں تقریباً ۲۲۵ بیتیں کم ہیں۔ جامعہ عثمانیہ کے کتب خانے میں نور نامہ کا جو نسخہ ہے وہ اور ادارے کا یہ نسخہ ابیات اور خصوصیات کے لحاظ سے یکساں ہیں (فہرست اُردو مخطوطات جامعہ صفحہ ۹۲)

آغاز :-

الٰہی کرنہار کرتار توں — سنوارا ہے قدرت سوں سنسار توں

تو قادر ہے قدرت سوں روشن کیا
زمیں آسماں کوں توں گلشن کیا

اختتام :-

کہ اے تین سو دس رہے بیت یو
کیا نظم نامہ سو ایسا کہو
مرتب کیا نور نامہ تمام   بحق محمد علیہ السلام

ترقیمہ نہیں ہے البتہ اس صفحہ ہی سے کردار علی شاہ قادری نے مختلف بلاؤں اور امراض کے لئے متعدد دعائیں اور عملیات قلمبند کی ہیں جن میں سے اکثر دکنی میں ہیں۔ مثال کے طور پر ابتدائی صفحات کے اقتباس درج ذیل ہیں :-

بو حنیفہ نے یہ سند میں لکھا   ایک دن فرماتے تھے خیر الورا
چڑھتے ہیں جس وقت شیاطین چرخ پہ   مارتا ہے ان کو تارا دوڑ کر
بھاگتے ہیں اس سے سب شیطاں ہوا   ہوتا ہے پیچھے وہ اون کے تیز پا
جو شیاطین متصل اس کے ہوا   سر سے پاؤں تک وہ دیتا ہے جلا
راکھ اس کی گر پڑے صحرا میں جا   اس سے پیدا ہوئے ہیں بت و بلا
اور دریا میں گرے گر اس کی خاک   ہوتا ہے پیدا نہنگ ہولناک
اور گرے گر خاک اس کی شہر میں   وفتنہ آوے وبا اس شہر میں

فائدہ

حق بلا سے اوس کو رکھتا ہے بچا   جو کرے ترتیب ایسی بر ملا
شہر کے چاروں طرف بکری حلال   وہ کرے دل سے نیاز ذوالجلال
صاف کر پھر اس کی ہونے بوٹیاں
کھاویں تکہ اوس کا اک اک مومناں
بعد اس کے لیویں پھر قرآن کو   جمع ہو کر مومنانِ نیک خو
نیچے سے اوس کے وہ نکلیں سات بار   منہ طرف کعبے کے رکھیں آشکار
پھر پڑیں بعد اوس کے دو رکعت نماز   اور اذاں دیں سات با عجز و نیاز
کہتے ہیں دیویں اذاں سب سات روز   سات بار ہر روز آئے فیروز
ہے یہ تاثیر اذاں اے مومناں   اس سے ہوتے ہیں گریزاں جنیاں

(۲۲) پند دل بند [۵۰۹ھ]

اوراق ۶۔ سطور ۱۸۔ (متن میں ۱۳ حاشیہ پر ۵)
تقطیع ۵½ × ۸½۔ خط نستعلیق شکستہ۔
مصنف علی (؟)۔ سنہ تصنیف درمیان
۱۰۲۰ھ و ۱۰۶۷ھ۔
سنہ کتابت ۱۱۵۰ھ۔

یہ قدیم دکنی مثنوی چار فارسی مثنویوں کے آخر میں قلمبند کی گئی ہے جو ایک ہی جلد میں ہیں اور جن میں خلاصہ کیدانی مولفہ قاضی سید نعمت اللہ حسینی کے علاوہ بیجاپور کے ایک فارسی شاعر کی مثنوی "احکام فقہ" خاص کر قابل ذکر ہیں۔ ان سب کا تذکرہ ادارے کے فارسی مخطوطات کی فہرست میں درج رہے گا۔

زیر نظر اردو مثنوی ۱۹۵ ابیات پر مشتمل ہے ابتدا میں عام رواج کے مطابق حمد و نعت نہیں ہے بلکہ اصل نصیحت شروع کر دی گئی ہے۔ کتاب کا نام حسب ذیل بیت میں درج ہے :-

دنیا کا جتنا مال دھن ہور گھر   بلا دور اس پند دل بند اثر

کتاب کا موضوع یہ ہے کہ خدا کو حاصل کرنے کے لئے تین چیزوں کا خیال رکھنا ضروری ہے۔ ایک راستی دوسرا علم اور تیسرا عمل۔ راستی اور راستبازی کا بیان

مصنف نے چند ابیات ہی میں ختم کر دیا ہے۔ البتہ علم کی فضیلت وضاحت سے بیان کی ہے اور اس سلسلہ میں ایک بہت دلچسپ اور سبق آموز قصہ لکھا ہے جو یہ ہے :۔

" ایک روز شیطان کے جملہ چیلے اس کی بارگاہ میں حاضر ہو کر اپنے اپنے کارنامے نمایاں بیان کرنے لگے۔ کسی نے کہا میں نے دو ولی دوستوں کو جدا کر دیا ہے۔ ایک نے کہا میں نے میاں بیوی میں جھگڑا ڈال دیا ہے۔ دوسرے نے کہا میں نے ایک شخص کو شراب کی عادت ڈال کر تباہ و برباد کیا۔ کسی نے بیٹے کو باپ سے منحرف کر دیا۔ غرض ہر چیلے نے اپنی اپنی کارگزاری بیان کی لیکن شیطان اپنے اُس چیلے سے بہت خوش ہوا اور اُس کو سب سے زیادہ انعام دیا جس نے ایک طالب علم کو مدرسہ جانے سے بھٹکایا تھا۔

شیطان کے دوسرے چیلوں کو رنج ہوا کہ ہم نے ایسے بڑے بڑے کام کئے تھے لیکن ان کی کوئی قدر نہیں کی گئی۔ ان سبھوں نے بگڑ کر شیطان سے شکایت کی کہ یہ انعام و سرفرازی عدل و انصاف کے خلاف ہے آخر اس نے ایسا کونسا بڑا کام کیا ؟

شیطان نے جواب دیا کہ تم لوگوں میں سمجھ کی کمی ہے۔ اگر یہ شخص اُس ہونہار کو مدرسہ جانے سے نہ روکتا تو وہ پڑھ لکھ کر اس قابل ہو جاتا کہ پھر ہمارے مکر اور دھوکے میں نہ آسکتا۔ جو علم سے باخبر ہوگا وہ جان بوجھ کر دھوکے میں کیوں آنے گا۔ جاہل کو آسانی سے دغا دی جا سکتی ہے۔ اگر تم کو اس پر یقین نہ ہو تو میرے ساتھ چلو اور ثبوت دیکھ لو۔

شیطان اپنے تمام چیلوں کو ساتھ لے کر نکلا اور ایک ایسے پرہیزگار مرشد کی طرف گیا جس نے عرصہ سے حرص و ہوس اور تعلقات دنیا کو چھوڑ کر پہاڑ کے ایک غار میں قیام کیا تھا اور دور دور کی مخلوق اس کی نیکی اریاضت اور پرہیزگاری کی شہرت سن کر اس کی خدمت میں حاضر ہوتی تھی۔ وہ دن بھر روزہ رکھتا اور رات بھر عبادت کرتا۔ ان تمام خوبیوں کے باوجود اس میں علم کی کمی تھی۔ شیطان نے اپنے چیلوں سے کہا کہ دیکھو اس کم علم زاہد کو میں کس طرح دھوکہ دے دیتا ہوں۔ جبہ و عمامہ پہنکر ایک بلند مرتبہ شیخ جیسا بھیس بنا کر بڑے تزک و احتشام اور جاہ و حشم کے ساتھ مرصع تخت پر بیٹھ کر زاہد کے قریب پہنچا اور تمام غار اور پہاڑ کو روشن کر دیا۔

زاہد نے جو اس نور اور پیرو مرشد کو دیکھا فوراً تعظیم کے لئے کھڑا ہوا اور بعد سلام علیک پوچھا کہ حضرت کون ہیں اور اس غریب کے یہاں کیوں تشریف لائے ہیں ؟
شیطان نے جواب دیا کہ میں جبرئیل ہوں اور خدا نے تمھارے یہاں مجھے بھیجا ہے تاکہ اس کی خوشنودی کا پیام پہنچاؤں۔ کیونکہ تمھاری عبادت و ریاضت بارگاہ ایزدی میں قبول ہوئی اور خدا نے تم کو اپنے محبوب ولی کا مرتبہ بخشا۔
زاہد مرتاض بہت خوش ہوا اور سجدۂ شکرانہ بجالایا کہ میری عمر بھر کی مشقت بیکار نہیں گئی اور خدا نے میرے حال پر رحم کیا۔

شیطان نے کہا جلدی تیار ہو جاؤ اور میرے ساتھ چلو۔ آج تمھیں معراج نصیب ہوگی خدا نے ارشاد فرمایا ہے کہ تمھیں جلدی لے آؤں۔ زاہد نے جلد جلد کپڑے پہنے اور شیطان نے اس کی آنکھوں پر پٹی باندھی اور گدھے پر

سوار کیا اور اس کے چہرے کو رنگ کر شہر کے عین وسط میں چھوڑ دیا جہاں کے سب امیر و غریب اس زاہد مرتاض کے معتقد و مرید تھے۔

اس کے بعد شیطان شہر کے ایک بازار میں پہنچا جہاں قاضی کا لڑکا شراب پی کر دو روز سے مست و خوار پڑا ہوا تھا اور لوگ اس کا مضحکہ اُڑا رہے تھے۔ شیطان نے قریب پہنچ کر غصہ میں کہا کہ تو نے کیوں شراب پی۔ خدا نے اس کو حرام قرار دیا ہے۔ خیر اب اس دفعہ خدا نے تجھے بخش دیا اگر آئندہ ایسا جرم کرے گا تو اپنے کئے کی سزا پائے گا۔

قاضی کے فرزند نے جواب دیا کہ بغیر توبہ کے بخشش کیسی؟ ابھی میں گناہ سے دور نہیں ہوا اور توبہ نہیں کی اور تو کہتا ہے کہ خدا نے بخش دیا ہے۔ تو کون ہے جو ایسے بڑے بول بولتا ہے؟

شیطان نے جواب دیا میں جبرئیل ہوں۔ قاضی کے فرزند نے کہا کہ تو جھوٹا ہے۔ جبرئیل سوائے نبی کے کسی کے پاس نہیں آتے۔ تیرا مکر مجھ پر نہیں چل سکتا تو یقیناً شیطان لعنتی ہے۔ یہ کہہ کر لاحول پڑھی۔ شیطان گدھا بن کر وہاں سے بھاگ گیا اور اپنے چیلوں سے کہا کہ دیکھا وہ پرہیزگار جو پیر و مرشد بنا بیٹھا تھا جاہل تھا اس لئے میں اس کو تمام شہر میں ذلیل و خوار کر سکا اور قاضی کا یہ لڑکا چونکہ پڑھا لکھا ہے اس لئے میرا مکر اس پر نہ چل سکا:

نصیحتوں کے اختتام پر مناجات لکھی ہے جو بہت پُر اثر معلوم ہوتی ہے۔

مصنف کا نام معلوم نہ ہو سکا۔ غالباً اس کا تخلص علی تھا جیسا کہ اس بیت سے ظاہر ہوتا ہے:-

اگر علم دھرتا ہے کچھ ای علی　　　تو اس پر عمل کر خفی ہور جلی

(ورق ۵۸ ب)

اس بیت سے مصنف نے تیسری نصیحت شروع کی کہ علم حاصل ہونے کے بعد اس پر عمل ضروری ہے۔ سنہ تصنیف کا پتہ نہیں چلتا۔ البتہ آخری ابیات میں مصنف نے سلطان محمد کا ذکر کیا ہے کہ:-

بدوراں سلطان محمد جہاں　　　بعون الٰہی اتم البیاں

معلوم نہیں اس سے مراد سلطان محمد قطب شاہ (۱۰۲۰ھ تا ۱۰۳۵ھ) ہے یا سلطان محمد عادل شاہ (۱۰۲۵ھ تا ۱۰۶۷ھ) ہے۔ بہرحال کتاب کی زبان بہت پُرانی ہے اس لئے یہ لازمی طور پر ۱۰۵۰ھ سے قبل لکھی گئی ہے اس کا کوئی اور نسخہ کسی کتب خانے میں نظر سے نہیں گزرا۔ اس نام کے ایک شاعر کی مناجات کا تذکرہ اسی فہرست میں نشان (۷) پر کیا گیا ہے اور ایک اور علی کی کتاب کا ذکر اس کے بعد ہی درج ہے۔

آغاز:-

کہوں یک نصیحت عجب خوب تر　　　بھلی پند سُن جیو کے کان دھر
بھلے کوں بھلی پند بھاتی اہے　　　بھلائی منیں دل بھلاتی اہے

اختتام:-

ایا خالق عالم خیر و شر　　　تو اس مرد کی عاقبت خیر کر
جو دیکھے خبر اس کے اشعار کوں　　　منگے ہیں دعا سنجہ گنہ گار کوں

ترقیمہ:-

العافیت بالعافیہ۔
تمت بالخیر ۱۱۵۰ ہجری

(۲۲۳) نامۂ علی [۶۸]

اوراق ۱۰ - سطور ۱۱ فی صفحہ۔
تقطیع ۵½ x ۸ ۔ خط نستعلیق معمولی
مصنف شاہ عبد العلی۔ سنہ تصنیف
۱۱۱۰ھ۔

یہ ۲۰۲ ابیات کی مثنوی ہے جس میں شاہ عبد العلی نے حضرت علی کا ایک دلچسپ معجزہ منظوم کیا ہے جو پہلے فارسی میں قلمبند ہو چکا تھا۔ کتاب کے آخر میں مصنف نے اپنا نام اور سبب و سنہ تالیف وغیرہ ان ابیات میں بیان کیا ہے:۔

بندا شاہ عبد العلی ہے ترا	گنہ بخش صاحب نبیؐ تو مرا
اول فارسی تھا سو دکھنی کیا	کرم کی نظر کر جو تیرا میا
یو بیتاں مرتب جو دو سو پہ دو	اتھا روز پنجشنبہ کا سعداد
سنہ ایک ہزار ایک سو دس برس	مرتب یو نامہ ہوا ہی ترس
الٰہی امیدوار ہوں رحم کا	عنایت تو سنجہ کر عقل فہم کا
صفائی مرے دل کوں دے یا اللہ	پریشان خاطر کو راحت دلا
ترے عشق لذت سوں مجہ پور کر	کرم کی نظر سوں نکو دور کر
ہوا حرص پر مجہ کو اٹکا نکو	عبث یاں وہاں مجکوں بھٹکا نکر

چونکہ اس کتاب کا کوئی اور نسخہ کسی کتب خانے میں دریافت نہیں ہوا اس لئے اس کا خلاصہ درج ذیل کیا جاتا ہے:۔

"ایک دن رسول خدا اور ان کے اصحاب جمع تھے کہ ایک فقیر آنحضرت کی خدمت میں حاضر ہوا اور عرض کیا کہ میں سات ہزار کا قرضدار ہوں اور محنت مزدوری کر کے بھی اپنا قرض ادا نہیں کر سکتا قرض خواہ تکلیف دے رہا ہے اس لئے آپ میری مدد فرمایئے۔ رسول خدا اور اصحاب اس معاملہ میں سوچنے لگے تو حضرت علی نے فرمایا کہ مجھے اجازت ہو تو میں اس شخص کی مدد کروں اور قرض ادا کر دوں۔

غرض اجازت لے کر اس پریشان حال کو ساتھ لیا اور کہا کہ آنکھیں بند کر لے اور میری پیٹھ پر سوار ہو جا۔ جب فقیر نے آنکھیں کھولیں تو خود کو ایک دور دراز کے ملک میں پایا اور حضرت علیؑ کی ولایت پر ایمان لایا۔ حضرت نے فرمایا اس شہر کا نام بربر ہے اور مدینہ یہاں سے ہزاروں کوس دور ہے۔ یہاں کا حکمراں بے دین ہے اور میری ہیبت یہاں کے لوگوں پر چھائی ہوئی ہے تو راجہ کے یہاں جا اور کہہ کہ میں ایک غلام مسمی قنبر کو فروخت کے لئے لایا ہوں جس میں بڑی بڑی خوبیاں ہیں اور میرا اصلی نام ظاہر نہ کر۔ میں خدا کی راہ میں تیرا غلام بن جاتا ہوں اور تو مجھے فروخت کر کے اپنے قرض کی رقم حاصل کر لے درویش حضرت کا اور بھی معتقد ہو گیا اور راجہ کے ہاتھ فروخت کر کے اپنی رقم حاصل کر لی اور مدینہ واپس ہوا

راجہ نے حضرت علی کو اپنے بڑے سے بڑے دشمنوں کے مقابلے میں روانہ کیا اور فتح پائی۔ جب انھوں نے مشکل سے مشکل مہم فتح کر لی تو راجہ نے کہا کہ میرا ایک دشمن علی باقی رہ گیا تو اس کو بھی مار کر یا پکڑ کر لے آ۔ حضرت نے فرمایا میرا ہی نام علی ہے۔ یہ سنتے ہی سب ڈر کر بھاگنے لگے آخر کار راجہ کو حضرت نے اسلام کی دعوت دی اور وہ مسلمان ہو گیا"

آغاز:۔

کہ یک دن محمد علیہ السلام	جو بیٹھے تھے اصحاب یاراں تمام
ابابکر ہور عمر عثمان تھے	علی مرتضیٰ شاہ مردان تھے

اختتام:۔

ہوا حرص پر مجکو اٹکا نکو	عبث یاں وہاں مجکو بھٹکا نکو

ترقیمہ نہیں ہے۔ البتہ پہلے ورق پر ایک عربی دعا کے نیچے لکھا ہے۔
"این نامہ علی علیہ السلام"
عنوان کے برابر عنایت حسین سنہ لکھا ہے۔ یہ نواب عنایت جنگ بہادر کے دستخط ہیں جنھوں نے ادارے کو یہ نسخہ عطا فرمایا ہے۔

نشان ٹپہ آصفیہ ۱۵۳ Reg. M 3950 رجسٹرڈ ایم ۳۹۵۰

ادارۂ ادبیات اُردو کی کتابیں

نام کتاب	صفحات	قیمت روپے	آنے	پائی
من کی بپتا ...	۸۰	۰	۸	۰
سرگزشت غالب ..	۹۴	۰	۸	۰
نظام الملک ...	۴۰	۰	۴	۰
تاریخ گولکنڈہ ...	۳۳۰	۳	۸	۰
ریڈیو نمبر (۸ تصاویر)	۱۶۰	۱	۰	۰
ارمغان جذب ...	۱۲۰	۰	۱۲	۰
سوتیلی ماں ...	۴۸	۰	۴	۰
سر سید احمد خاں ...	۱۶	۰	۲	۰
سر سالار جنگ ...	۴۸	۰	۶	۰
مغربی تصانیف کے اردو تراجم	۱۴۵	۱	۴	۰
محبت کی چھاؤں ...	۱۳۲	۱	۴	۰
اقبال نمبر ...	۱۶۸	۱	۴	۰
سائنس کے کرشمے ...	۱۱۲	۱	۰	۰
شعرائے عثمانیہ ...	۲۳۰	۲	۱۲	۰
مکتوبات شاد عظیم آبادی	۳۰۰	۲	۸	۰
دادا بھائی ...	۱۶	۰	۲	۰
اردو نامہ ...	۲۰۰	۲	۰	۰
ارسطو جاہ ...	۶۵	۰	۶	۰
عماد الملک ...	۴۰	۰	۶	۰
اردو دانی کی پہلی کتاب	۵۶	۰	۲	۶
" دوسری کتاب	۵۶	۰	۴	۶
محمد حسین آزاد ...	۲۰۰	۲	۰	۰
کاغذ کی ناؤ ...	۱۲۰	۱	۴	۰
فن تقریر ...	۹۶	۰	۸	۰
مقدمہ تاریخ دکن ...	۱۴۴	۱	۰	۰
پانی کی کہانی ...	۴۸	۰	۶	۰
رسایل طیبہ ...	۳۱۲	۲	۸	۰
سلک گوہریں ...	۴۰	۰	۴	۰
تاریخ ادب اردو ...	۱۷۶	۱	۴	۰
ورڈس ورتھ اور اسکی شاعری	۱۸۴	۱	۴	۰
ہوش کے ناخن ...	۹۴	۱	۰	۰
یوسف ہندی قید فرنگ میں	۸۹	۱	۰	۰
شاد اقبال ...	۱۷۶	۲	۸	۰
آریائی زبانیں ...	۱۰۴	۱	۰	۰
نظام علی خاں ...	۳۲	۰	۴	۰
عرب اور عربستان ...	۵۶	۰	۱۰	۰
ٹیگور اور ان کی شاعری	۱۲۸	۱	۴	۰
متاع سخن ...	۱۲۴	۰	۱۲	۰
کیف سخن ...	۱۲۲	۰	۱۲	۰
بادہ سخن ...	۱۲۷	۰	۱۲	۰
سراج سخن ...	۱۵۲	۰	۱۲	۰
ایمان سخن ...	۱۲۰	۰	۱۲	۰
فیض سخن ..	۱۴۴	۰	۱۲	۰
مرقع سخن جلد اول (۵۵) تصاویر	۵۰۰	۵	۰	۰
" دوم (۵۰) "	۴۳۲	۵	۰	۰
نقد سخن ...	۱۷۵	۱	۰	۰
نذر ولی ...	۲۴۸	۲	۸	۰
گریہ و تبسم ...	۱۹۲	۲	۰	۰
مشاہیر قندھار دکن	۱۸۴	۱	۰	۰
من کی دنیا ...	۱۴۵	۱	۰	۰
مدراس میں اردو	۱۹۶	۱	۸	۰
محرم نامہ ...	۱۱۲	۱	۰	۰
نذر دکن ...	۱۰۴	۱	۴	۰
روح غالب ...	۲۴۰	۲	۸	۰
عاصمہ ...	۲۰۰	۱	۴	۰
دفتری معلومات ...	۵۶	۰	۶	۰
آبدوز کشتیاں اور سرنگ	۴۸	۰	۶	۰
اردو مثنوی کا ارتقاء	۱۴۳	۱	۱۲	۰
نمود زندگی ...	۲۱۲	۱	۸	۰
سرگذشت ادارہ ...	۳۰۴	۰	۱۲	۰
میر محمد مومن (۳۴) تصاویر	۳۱۲	۲	۸	۰
بلقان ...	۳۲	۰	۳	۰
خطابیات ...	۱۱۲	۰	۱۲	۰
علم خانہ داری ...	۱۵۰	۱	۰	۰
چیونٹی (۱۶) تصاویر	۱۱۸	۱	۸	۰
انوار ...	۱۶۸	۱	۸	۰
کشمش نانی (۴) تصاویر	۸۰	۰	۱۰	۰
گارساں دتاسی ...	۱۲۸	۱	۴	۰
رات کا بھولا ...	۱۶۸	۱	۰	۰
سکندر جاہ ...	۲۴	۰	۴	۰
بلاغت ...	۵۶	۰	۸	۰
ادارہ سنہ ۱۹۴۲ع میں	۴۰۰	۰	۸	۰

مطبوعہ اعظم اسٹیم پریس حیدرآباد دکن

مئی ۴۳ء





ادارہ ادبیات اردو حیدرآباد دکن کا ماہنامہ

نشان ٹپہ آصفیہ ۱۵۳
نشان ٹپہ برطانیہ M 3950
ٹیلی فون نمبر ۲۲۰۹
چندہ سالانہ چار روپے آٹھ آنے
بچوں کا سب رس ایک روپیہ آٹھ آنے

سب رس

زیر نگرانی
ڈاکٹر سید محی الدین قادری زور
مجلس ادارت
خواجہ حمید الدین بی اے
سکینہ بیگم
عبدالحفیظ صدیقی بی۔ ایس۔ سی

جلد ۶	بابتہ ماہ مئی ۱۹۴۳ء	شمارہ ۵

کی تصویر سے

تیرا حسن کتنا پاکیزہ ہے اور کتنا دلآویز! کاش! یہ معصوم بھی ہوتا۔ ارے توبہ! ع چڑھتی شباب کی آندھی تمہیں مبارک ہو! کوئی ان تین حروف "ح۔ س۔ ن" کی فسوں کاری تو دیکھئے۔ یہ تینوں ایک ساتھ جس چیز سے بھی چسپاں ہوں گے اس میں دل کشی اور جاں فریبی کی شان پیدا کر دیں گے۔

حسین!

وہ حسن جو جذبات کو آرزو کے آنچل سے ہوا دیتا ہے۔ وہ حسن جسے دیکھ کر خوابیدہ آرزوئیں بیدار ہو جاتی ہیں۔ پھر تیرا حسن! ارے توبہ! ع چلے دو قدم اور بجلی گرا دی!

تیری تصویر دیکھ کر تیری کمزوریوں کے خیال نے مجھے تیری لغزشوں سے چشم پوشی کرنے کی تعلیم دی۔ کیوں؟

تو حسین ہے اور دنیا عیار۔

تو ہاں تو حسین ہے! میری آنکھ تیرے حسن کی جمال آرائیوں اور شباب کی فتنہ سامانیوں سے ابھی آشنا نہیں لیکن دل کی پیاس اور تسکین تو تیری چشم مست سے بھی نہ ہو سکی میں تشنۂ دیدار ہی سہی لیکن تیرا ابھی سینے پر ہاتھ رکھ کر تصویر کھنچوانا جذبات کی زبان سے ایک داستان ہی تو کہہ رہا ہے یعنی ؎ سوزِ غم کی شکایتیں ہے ہے درد دل کی دہائیاں توبہ! توبہ ہے توبہ

حکیموں کا قول ہے کہ تصویر آدھی ملاقات ہوتی ہے۔ تیری تصویر میرے سامنے ہے۔ تیری مست آنکھیں شاید ان مست آنکھوں میں صبح کاذب کی روشنائی تھی۔ تیرا سینہ! ارے توبہ ؎

....

....

اور

سرے پہ جن کے عیاں ہیں گلاب کی کلیاں

بس! اب اجازت دے ع حکایت بود بے پایاں بہ خاموشی ادا کردم۔ لیکن یہ حسرت تو دل میں ہی رہی۔ برا ہو دل کا جس نے اتنا لکھنے پر بھی مجبور کر دیا۔ ورنہ! میں اور لب فریاد وا کروں.........

تیرا حسن تجھے مبارک ہو۔ اور میرے لئے ایک تصویر! اب بات تو تب ہے کہ ؎

تخیل سے دامن بچاؤ تو جانیں

تصور میں بھی تم نہ آؤ تو جانیں

ایم اسلم

غزل

جھمک جھمک کے مری سمت چشمِ مستانہ
ٹھہر ٹھہر کے عطا ہو رہا ہے پیمانہ

ہزار عیب لگائے گی عقلِ فرزانہ
متاعِ ہوش نہیں درخورِ صنم خانہ

خودی کو نہ بہہ ہے عکسِ شبابِ پیمانہ
خدا کسی کو نہ لے جائے سوئے میخانہ

جنابِ شیخ کی حجت خلافِ میخانہ
"جو سعیٔ خام میں الجھا رہے وہ دیوانہ"

کسی حسین تبسم کو چومتی ہے نظر
مرے لبوں کی طرف بڑھ رہا ہے پیمانہ

یہ مانتا ہوں کہ ساقی نہیں حسیں مگر
مجھے یہ کہہ نہیں جچتا ادھر بھی پیمانہ

اس احتیاطِ محبت کو آفریں کہیے
نظر شناس ادائیں۔ نگاہ بیگانہ

مآلِ عشق میں جلنے کے سو طریقے ہیں
کوئی ضرور نہیں اتباعِ پروانہ

جمالِ روئے حقیقت پہ آنکھ پڑنے دو
قدم قدم پہ نظر آئے گا پری خانہ

شفق میں، گلبنِ شاداب میں، شباب میں
کہاں کہاں ہے مقامِ شرابِ مے خانہ

یہی ہے عشقِ مجازی کی انتہا شاید
مری نظر میں کھُبا جا رہا ہے بت خانہ

بہت وہ ہیں جنھیں فرزانگی نصیب نہیں
بہت وہ ہیں جو سمجھتے ہیں مجھ کو دیوانہ

وہاں گزر کہ جہاں بندگی کی قید نہیں
وہاں پہنچ کہ نہ کعبہ رہے نہ بت خانہ

یہ کیوں سنوں کہ نہ کہیے "کہی ہوئی باتیں"
بدل نہ دوں روشِ التماسِ افسانہ

کمی نہیں ہے خیالاتِ نو بہ نو کی مجھے
شرابِ ناب سے خالی نہیں ہے میخانہ

مرے کلام کو اے شادؔ وہ نہ سمجھیں گے
جنھیں شراب پلاتے رہو تو فرزانہ

شادؔ عارفی

اکبری دور کی بیگمات

ہر متمدن ملک میں عورت کو ایک خاص امتیاز اور مرتبہ حاصل ہوتا ہے۔ یہی ایک بڑی حد تک اپنے زمانے کی تہذیب و معاشرت کی بنانے اور بگاڑنے والیاں ہوتی ہیں دستِ قدرت انہی کے نازک ہاتھوں سے قوموں کی زندگی اور انحطاط، ترقی اور تنزل کی منزلیں طے کراتی ہے۔ لیکن سمجھنے والے ہی سمجھیں تو سمجھیں انگریزی میں مثل مشہور ہے "THE HAND THAT ROCKS THE CRADLE-RULESTHE WORLD" یعنی جو ہاتھ گہوارہ جنبانی کرتا ہے وہی دنیا پر حکمرانی کرتا ہے۔ بہ الفاظ دیگر مولانا حالی فرماتے ہیں ؎

تشکر سے مالک کی جتنے پاک بندے ہیں بڑھے
"وہ ماؤں کی گودوں کے زینے سے ہیں سب اوپر چڑھے"

اکبر کا دور جہاں علم پروری، سطوت و جبروت، مذہبی رواداری اور خوش حالی کے سبب سے اپنے زمانے کا متمدن ترین کہلانے کا مستحق ہے وہاں اکبری دور کی بیگمات بھی اپنی عالی دماغی، خوش مذاقی، بیدار مغزی اور بلند ہمتی سے اس عہد میں چار چاند لگانے والیاں کہی جائیں تو بے جا نہیں۔

یہ خواتین حسین و جمیل ہونے کے علاوہ علم و فضل، عقل و دانش، فہم و فراست، حوصلہ مندی، بلند نظری اور تدبر میں یکتائے زمانہ اور ممتاز روزگار رہیں۔ وہ صرف پڑھی لکھی ہی نہ تھیں بلکہ فنونِ سپہ گری میں بھی پوری مہارت رکھتی تھیں اور ضرورت کے وقت اسلحۂ جنگ سے آراستہ ہو کر میدانِ جنگ میں مردوں کے شانہ بہ شانہ لڑتیں سیر و سفر میں کبھی محافہ میں ہوتیں تو کبھی گھوڑے پر سوار۔

علم و ادب کا انہیں شوق تھا تو موسیقی کا بھی ذوق رکھتی تھیں۔ سازوں پر بجاتی تھیں اور گاتی بھی تھیں لیکن ان کے دلنواز نغمے نامحرموں کے کانوں کے لئے نہ ہوتے۔ پردے کی پابند ضرور تھیں لیکن صرف مقنع و چادر کی حد تک ورنہ پوری آزادی کے ساتھ پرتکلف محفلوں میں جاتیں، جلوس میں شریک ہوتیں اور تفریح گاہوں کی سیر کرتیں ان کی زندگی مہذب اور ان کی طرز معاشرت شائستہ اور سادہ تھی۔

اکبر کے زمانے میں ہر مہینے مینا بازار ہوتا تیسرے دن قلعہ میں خاص اہتمام سے زنانے کے لئے انتظام کیا جاتا۔ بیگمات شاہی کے علاوہ امرا و اعیان کی بیبیاں بھی شریک ہوتیں۔ اس موقعہ پر بادشاہ خود بہ نفس نفیس بازار میں آ پہنچتے۔ امرا کی بہو بیٹیوں کو بادشاہ کی خدمت میں باریاب ہونے کا شرف حاصل ہوتا کبھی بادشاہ وہیں نسبتیں بھی کر بیٹھتے دیکھنے میں تو مینا بازار دل بہلانے کا ساماں ہوتا لیکن در پردہ اکبر اس موقعہ پر باہمی اختلافات کی بیخ کنی اور محبت و اتحاد کی داغ بیل ڈالتا۔ بسا اوقات اس دانشمند بادشاہ نے دو امیروں کی کشیدگی اور عداوت کا خاتمہ یوں کیا کہ ان کی اولاد کی آپس میں شادیاں کروا دیں۔ چنانچہ بیرم خاں کے بیٹے عبدالرحیم خاں کی شادی اسی مصلحت کی تحت خان اعظم مرزا عزیز کوکلتاش کی بہن ماہ بانو بیگم سے کر دی گئی تھی۔

اسی طرح ہندوستان کے راجاؤں سے شادی بیاہ کی راہ ڈال کر اکبر نے محبت، اتفاق اور اتحاد کی کڑیوں کو محکم و استوار کر لیا۔ راجہ بھارا مل کی بیٹی بھگوان داس کی بہن خود شاہی محل میں تھی اکبر نے بھگوان داس کی بیٹی سے سلیم کی شادی بھی اسی رشتۂ محبت کو مضبوط سے مضبوط تر بنانے کی خاطر رچائی۔

اس زمانے کی شادی کا خاکہ شاعر نے یوں کھینچا ہے۔

قرابت راجگانِ ہند سے اکبر نے جب چاہی
کہ یہ رشتہ عروسی کشور آرائی کا زیور تھا
تو خود فرمانروا بنے پورا نے شادی کی خواہش کی
گو وہ بھی ایک اچھا صاحبِ دیہیم و افسر تھا
ولی عہدِ مبارک اور خود شاہنشہِ اکبر
گئے امبیر تک جو پایہ تخت ملک و کشور تھا
دلہن کو گھر سے منزل گاہ تک اس شان سے لائے
کہ کوسوں تک زمیں پر فرش دیبائے مشجر تھا
دلہن کی پالکی خود اپنے کندھوں پر جو لائے تھے
وہ شاہنشاہِ اکبر اور جہانگیر ابن اکبر تھا
ابھی ہیں وہ شمیم انگیزیاں عطرِ محبت کی!
کہ جن سے بوستانِ ہند برسوں تک معطر تھا

اکبر کی صلح کن پالیسی نے شاہی حرم سرا میں بھی محبت و یگانگت اور میل ملاپ کے خوشگوار تعلقات پیدا کر دیئے تھے چنانچہ یہ راجپوت رانیاں بھی اکبر کے گھرانے میں آکر اپنی ولایتی بہنوں سے ایسی شیر و شکر ہو گئیں کہ آپس میں مذہب و ملت کا اختلاف بھی باقی نہ رکھا۔

اکبری دور کی بیگمات میں سب سے زیادہ مشہور گلبدن بیگم ہیں جن کا ذکر یہاں خالی از دلچسپی نہ ہوگا۔ گلبدن بیگم بابر کی بیٹی ہمایوں کی بہن اور اکبر کی پھوپی تھیں۔ بڑی عالی دماغ قابل اور ہوشمند خاتون گزری ہیں۔ اکبر کی فرمائش پر انھوں نے ہمایوں نامہ لکھا تھا جس کو اس زمانے کی مستند تاریخ کہا جائے تو بجا ہے۔ اس میں بابر، ہمایوں اور اکبر کے حالات اور تسخیر ہندوستان کے تذکرے بہت ہی سادہ، دل نشین اور شگفتہ پیرائے میں لکھے ہیں۔ ادبی اور تاریخی نقطۂ نظر سے یہ کتاب بہت بلند مرتبہ رکھتی ہے LADY ANNETTE BEVERIDGE نے اس کا انگریزی میں ترجمہ کیا ہے۔

دوسرے مورخوں کے برخلاف گلبدن بیگم نے ہمایوں نامے میں اس عہد کی تہذیب و تمدن، معاشرت، خانگی زندگی، شادی بیاہ کے رسوم عیش و نشاط کی محفلوں لباس اور طرز رہائش وغیرہ پر بڑی عمدگی سے روشنی ڈالی ہے۔ عبارت سادہ اور شستہ اور طرز تحریر میں غضب کی بے ساختگی لوچ اور روانی ہے۔

اس کتاب کے متعلق مولانا شبلی جیسے نقاد اور ادیب یوں مدح سرا ہیں "فارسی زبان میں سادہ اور صاف واقعہ نگاری کا عمدہ سے عمدہ نمونہ تزک جہانگیری اور رقعات عالمگیری ہیں اور اس میں شبہہ نہیں کہ یہ کتابیں سادگی اور لطافت کے لحاظ سے اس قابل ہیں کہ ہزاروں ظہوری اور وقائع نعمت خاں ان پر سے نثار کر دیے جائیں لیکن انصاف تو یہ ہے کہ ہمایوں نامہ کچھ ان سے بھی آگے بڑھا ہوا ہے" شبلی (مقالات)

گلبدن بیگم کے بعد حمیدہ بانو بیگم کا نمبر آتا ہے جو بعد کو مریم مکانی کے خطاب سے مشہور ہوئیں یہ ہمایوں کی چہیتی بیوی اور اکبر کی خوش نصیب ماں تھیں۔ بڑی صاحب الرائے مدبّر اور حوصلہ مند بی بی تھیں حسن ظاہری کے ساتھ حسن باطنی سے بھی آراستہ تھیں شوہر پرستی ان کی سرشت میں تھی بڑی مستقل مزاج اور بات کی پکی تھیں۔

یہ وہ خاتون ہے جس کو اکبر کی ماں ہونے کا فخر ہے۔ جس نے وفا شعاری اور شوہر پرستی میں سیتا جی کی طرح جنگل جنگل کی خاک چھانی لیکن شوہر کا ساتھ نہ چھوڑا۔ سفر اور حضر میں برابر ہمایوں کی رفاقت اور دلجوئی کرتی رہی جس نے ملک گیری

اور ملک داری میں ہمایوں کا ہاتھ بٹایا اور اس کو دوبارہ
ہندوستان کے تخت پر لا بٹھایا جس کے فہم و ادراک نے اکبر کو
بیرم خاں کے ہاتھوں کٹھ پتلی بن کر حکومت کرنے سے بچا لیا
اور جس نے اپنی صائب رائے سے جملہ امور مملکت میں اکبر کی رہبری کی۔

گلبدن بیگم نے ہمایوں نامے میں حمیدہ بانو بیگم کی
شادی کا ایک دلچسپ واقعہ بیان کیا ہے جس سے ظاہر ہوتا ہے
کہ اس زمانے کی عورتوں کو اپنی شادی بیاہ کے معاملے میں
کس حد تک آزادی حاصل تھی۔

ہمایوں نے حمیدہ بانو بیگم کو اپنی والدہ کے گھر کسی تقریب
کے موقعہ پر دیکھ لیا تھا اور ان کے حسن و ادا پر دل ہار بیٹھے۔
جب ان کے لئے شادی کا پیام بھجوایا گیا تو حمیدہ بانو نے یہ
کہہ کر صاف انکار کر دیا کہ کمخواب میں ٹاٹ کا پیوند نہیں لگ سکتا
بادشاہ اور مجھ جیسی غریب کا جوڑ کیسے ہو سکتا ہے۔ میں اسی
سے شادی کروں گی جو برابر کا ہو۔ انکار نے ہمایوں
کی آتش شوق کو اور بھڑکا دیا۔ لیکن ادھر سے جوں جوں اصرار
بڑھتا گیا حمیدہ بانو کی ضد بھی بڑھتی گئی مہینے ڈیڑھ مہینے تک
بھی گفت و شنید کا سلسلہ رہا لیکن حمیدہ بانو برابر مستقل مزاجی
کے ساتھ اپنی بات پر قائم رہیں۔ آخر گلبدن بیگم کی والدہ نے
جا کر سمجھایا منایا اور یقین دلایا کہ ہمایوں اس کا پرستار ہے
جس پر بالآخر وہ شادی کرنے آمادہ ہوگئیں۔

حمیدہ بانو بیگم کے بعد سلیمہ سلطان بیگم قابل ذکر ہیں۔
سلیمہ سلطان بیگم گلرنگ بیگم کی بیٹی اور اکبر کی پھوپی زاد بہن
تھیں۔ پانچ سال کی عمر میں ان کی شادی بیرم خاں خان
خاناں سے کر دی گئی تھی اور پھر بیرم خاں کی وفات پر اکبر کے
محل میں داخل ہوئیں۔ شہزادہ مراد انہیں کے فرزند تھے۔
بڑی نیک طبیعت نیک بخت اور باسلیقہ بی بی تھیں صاحب تدبیر
اور معاملہ شناس اس غضب کی تھیں کہ امور سلطنت میں جب
کوئی معاملہ الجھتا تو انہیں دانشمند خاتون کے مشوروں سے
سلجھتا۔ بڑی لکھی قابل خاتون تھیں۔ کتب بینی کا از حد شوق
تھا سخن فہم اور سخن گو بھی تھیں۔ ان کا یہ شعر بہت مشہور ہے

کاکلت را اگر دست پریشاں گفتہ ام
مست بودم ایں سبب حرف پریشاں گفتہ ام

اکبری دور کی بیگمات میں بخت النساء بیگم بھی
کافی شہرت رکھتی ہیں۔ یہ اکبر کی بہن تھیں نہایت خوش اخلاق
فیاض اور مہمان نواز تھیں۔ ان کی طرز معاشرت سادہ اور
بے تکلف تھی۔ خانہ داری کے انتظام میں کمال مہارت
رکھتی تھیں۔ سادگی پسند تھیں اس لئے ہر چیز مثلاً لباس
رہائش وغیرہ میں سادگی برتتیں۔ فضول شان و شوکت سے
انہیں نفرت تھی اور نخوت و گھمنڈ سے دور کا بھی لگاؤ نہ تھا
ہمایوں اپنی اس بیٹی کا شیدا تھا اور ہمیشہ اس کی دلجوئی میں
لگا رہتا۔ علمی مجلسوں میں ہمیشہ شریک ہوتی اور مردانہ محفلوں
میں بھی جاتی لیکن بڑی سنجیدگی و متانت کے ساتھ۔ ہمایوں
اور اکبر دونوں اکثر بڑی بڑی مہموں اور مشکلوں میں اس سے
مشورہ کیا کرتے۔

شاہی محل کی بیگمات میں جاناں بیگم کو بلحاظ ان کی
لیاقت اور قابلیت کے ایک نمایاں مرتبہ حاصل تھا۔
جاناں بیگم ماہ بانو بیگم اور عبدالرحیم خان خاناں کی بیٹی اور
شہزادہ دانیال کی بیوی تھیں۔ نہایت پارسا حسین اور
قابل خاتون گزری ہیں۔ فطرتاً دینی علوم کی طرف زیادہ مائل
تھیں۔ قرآن مجید کی تفسیر لکھی تھی جو مقبول خاص و عام
ہوئی اور جسے جہانگیر نے بڑی قدردانی کے ساتھ قبول کر کے
اپنے کتب خانے میں جگہ دی اور جاناں بیگم کو پچاس ہزار دینار

عطا کئے۔ دانیال سے ان کی شادی بڑے تزک و احتشام سے ہوئی تھی۔

نہایت قابل اور لائق خاتون تھیں۔ شاعری میں بھی بلند مرتبہ رکھتی تھیں۔ ان کا کلام دلوں پر گہرا اثر کرتا تھا۔ ان کی ایک غزل کا مطلع یہ ہے ؎

عاشق بو غلق عشق تو پنہاں چساں کند
پیداست از دو چشم ترش خوں گریستن

زمانے نے کروٹ لی تخت و تاج الٹ گئے۔ مغلیہ سلطنت کا شیرازہ بکھر گیا۔ یہ گراں قدر ہستیاں خاک کا پیوند ہو گئیں۔ لیکن ان کے کارنامے باقی اور ان کے نام زندہ ہیں۔ ایسی ہی خواتین کی شان میں مولنا حالی نے فرمایا ہو گا کہ ع

زیبا ہے گر کہیں تمہیں فخر بنی نوع بشر

سکینہ بیگم

بادل

ایک شاعر کے پراگندہ خیالوں کا ہجوم !
اپنے ہی رنگ کی گہرائی میں اڑتے اڑتے
قصر ذی شان و پر ہیبت کی سیہ دیواریں
یا سمندر کی اک الھڑ سی حسیں دوشیزہ
سرد موسم میں سر چرخ کوئی دوشیزہ
آسماں والوں کی رنگیں شرارت کے سبب
ایک آوارہ نے جنگل کے ادھر بستی میں
یا اڑاتے ہیں بہر سمت ہزاروں سے خوار
سادے سادے سے حسیں پھول ہوائیں پاکر
اور سورج کی شعاعوں کے حسیں جھرمٹ میں
آرٹسٹ اک نئی تصویر بنانے کے لئے !
اور پھر تختۂ تصویر کو برہم ہو کر !
دور مغرور ارادوں سے پرے دور سلام
جس طرح میری حسیں اور نئی نظم کے گرد

اجڑے اجڑے سے گلستانوں میں ہے سیر کناں
جیسے رک جائے فضا میں مرے پائپ کا دھواں
جیسے ہر اک جگہ چھوڑ دیں اپنی صیقل !!
بس یوں ہی بھولے سے کپڑوں میں لگالے کاجل
رات کی سیر کو نیلی سی دلائی میں آئے !
جیسے ہر ایک جگہ نرم دلائی پھٹ جائے
ابھی کچھ دیر ہوئی جیسے لگائی تھی آگ
ساغر چرخ میں صہبائے تر و تازہ کی جھاگ
گلشن بحر میں ہر چار طرف لہرائیں
آسمانوں کے سمندر کے کنول کھل جائیں
جائزہ جیسے ہر اک سمت نظاروں کا لے
مختلف رنگ کو اک ساتھ ملا کر بھر دے
بکھرے بکھرے سے یہ موضوع یہ آوارہ خیال !
چاند تاروں نے کہیں چھپ کے لگائے ہیں جال

سلام (مچھلی شہری)

تبصرہ

شمع انجمن ۔ قیمت عمر ۸ ملنے کا پتہ کتب خانہ علم و ادب دہلی ۹۸ صفحات ۔ جناب صادق الخیری صاحب ایم اے دہلوی کی لکھی ہوئی ۱۲ اخلاقی، نفسیاتی، سماجی و اصلاحی کہانیوں کا ایک دلچسپ روح پرور مجموعہ ہے۔ ہر افسانہ بذات خود ایک سچی کہانی ہے۔ پلاٹ حقائق کا جزو لئے ہوئے۔ رومان ۔ مگر تحفظ نفس و عصمت و عفت سے وابستہ۔ افسانے الیہ ہوں تو زیادہ جی کو لگتے ہیں "شمع انجمن" کی صداقت اس سے ظاہر ہے کہ اس کا ہر افسانہ ایک پُر الم زندگی جیتی جاگتی تصویر اور گزری ہوئی زندگی کی تفسیر ہے۔ جیون ایک ٹھٹھا ہے۔ زندگی ایک مذاق سے ہٹ کر کوئی چیز نہیں۔ صادق صاحب نے زندگی کو بہت ہی قریب سے دیکھا ہے۔ اس کی خامیوں کو اُجاگر کیا ہے۔ ساتھ ہی ساتھ زبان کی گھلاوٹ اور فقروں کی برمحل و چرچستہ بندش نے ہر افسانے کو حقیقت سے قریب تر کر دیا ہے۔ یوں تو ہر افسانہ اپنی نوعیت کے لحاظ سے ایک ادبی شہ پارہ ہے۔ لیکن "سوز حیات" کی سوزشیں" "نیش ہوس" کی تیر نیم کشی ۔ جہاں ضمیر کی آواز چین لینے نہیں دیتی ۔ اور "حبش کی رقاصہ" کا غارتگر انجام یہ آخری تین افسانے شہ کار کی حیثیت رکھتے ہیں ۔

صادق صاحب نے نسوانی زندگی کی بدنصیبیوں کو بڑی رقت سے محسوس کیا ہے۔ ورنہ عام طور پر عورت ہی موردِ الزام ہے۔ دھندلکا میں ایک فقرہ بڑا ہی دلگداز ہے " قدرت بھی تو سماج کی طرح عورت کی لغزشیں طشت از بام کر دیتی ہے " عورت کی معصومیت اور اس کی سادہ لوحی سے مرد ناجائز فائدے اٹھاتا ہے ۔ وہ غرض اور ہوس کا بندہ ہے۔ تاہم اسی قسم کی وارداتوں کو "شمع انجمن" کی روشنی میں دیکھئے تو شاید پانچ فی صد دماغ جو جہالت کی تاریکی اور غرض و ہوس کے دھندلکے میں گم ہو گئے ہیں ۔ منور ہو جائیں ۔

امیر و داغ ۔ امیر و داغ کے کلام کا انتخاب ۔ مرتبہ نواب عزیز یار جنگ بہادر عزیزؔ مطبوعہ اعظم اسٹیم پریس حیدرآباد دکن قیمت ۱۲ ار ۱۱۶ صفحے ۔ یہ امیر اور داغ کے کلام کا ایک اچھا، چھنا ہوا عکس ہے جس میں اچھے اچھے اشعار زیادہ ہیں۔ داغ کا زیادہ تر وہ کلام ہے جو آج کل زبان زد خاص و عام ہے۔ ان کی بیشتر غزلیں ایسی ہیں جن میں ایک آدھ شعر ہی چوٹی کا نکل آتا ہے۔

داغ کا یہ شعر ؎

یہ کس کی لَو ہے اے دل مضطر لگی ہوئی
اک آگ سی ہے سینے کے اندر لگی ہوئی

شیفتہ کے پاس یوں موجود تھا ؎

شاید اسی کا نام محبت ہے شیفتہ
اک آگ سی ہے سینے کے اندر لگی ہوئی

اب ہم کلام کی اہمیت کا ان دو مصرعوں سے ہی اندازہ لگا سکتے ہیں۔ شیفتہ کے پاس یہ تخیل کتنا بلند ہو گیا ہے اور داغ کو تو صرف لو ہی لگی ہے جس سے وہ آگ لگنے کی محسوسات کا اندازہ لگاتے ہیں۔ شیفتہ اس کو محبت کی آگ سمجھتے ہیں تاہم نواب صاحب کی اس کاوش پر ہم انھیں مبارکباد دیتے ہیں ۔

جہاں بانو بیگم

جانے کون!

کائناتِ دل میں یہ گاتا ہوا کون آگیا ! — ہر طرف تارے سے برساتا ہوا کون آگیا !
آس کی کلیوں کو چٹکاتا ہوا کون آگیا ! — میرے صحراؤں کو مہکاتا ہوا کون آگیا !
یہ مجھے نیندوں سے چونکاتا ہوا کون آگیا!

میٹھی میٹھی آگ احساسات میں جلنے لگی، — روح پر لپٹی ہوئی زنجیرِ غم گلنے لگی
زندگی کی شاخِ مردہ پھولنے پھلنے لگی، — اور خوشبو سے لدی ٹھنڈی ہوا چلنے لگی
دہر کو مستی میں نہلاتا ہوا کون آگیا !

ذرے اڑ کر آسمانوں کی خبر لانے لگے — اور خلاؤں میں دھنک کے رنگ لہرانے لگے
پھول اپنی شانِ رعنائی پہ اترانے لگے — سرِ جو تکے جھاڑیوں کی آڑ میں گانے لگے
قلبِ عالم کو یہ تڑپاتا ہوا کون آگیا !

زندگی کی تلخیاں اک خواب ہو کر رہ گئیں — روح کی گہرائیاں پایاب ہو کر رہ گئیں
کالی راتیں روکشِ مہتاب ہو کر رہ گئیں — شست نبضیں رعشۂ سیماب ہو کر رہ گئیں
برق کی مانند لہراتا ہوا کون آگیا !

چن لئے کس نے مری پلکوں سے اشکوں کے شرار — کس نے اپنے قلب سے بھینچا ہے میرا قلبِ زار
کیا ہوئے جذبات پر چھائے ہوئے گہرے غبار — کیا ہوئی افکار میں چبھتی ہوئی اک نوکِ خار
بیتی گھڑیوں کو یہ لوٹاتا ہوا کون آگیا !

جو کبھی تاروں میں جا کر جھلملایا وہ نہ ہو، — جو کبھی پھولوں میں چھپ کر مسکرایا۔ وہ نہ ہو
دور رہ کر بھی جو رگ رگ میں سمایا وہ نہ ہو، — جو مرے اب تک بلانے پر نہ آیا۔ وہ نہ ہو
اف۔ یہ شرماتا۔ یہ بل کھاتا ہوا کون آگیا !

یہ تو خود میرے تصور کا ہے اک عکسِ جمیل! — یہ تو دل کی دھڑکنوں میں ہو رہی ہے قال و قیل!
اور لیکن یہ رخِ پرنور یہ چشمِ کحیل! — لڑکھڑاتی چال میں پنہاں خرامِ رودِ نیل!
آئینہ سا مجھ کو دکھلاتا ہوا کون آگیا !

احمد ندیم قاسمی

اندھی مشیت

اخبار بیچنے والے لڑکے زور زور سے آواز لگا رہے تھے۔

" شوہر کا خون! ایک تعلیم یافتہ بیوی کے ہاتھوں اپنے شوہر کا خون" یہ چلاتے ہوئے ہر ایک کے چہرے پر اطمینان کی لہر دوڑ رہی تھی۔ رستے سے آنے جانے والا آدمی اس خبر کے سنتے ہی رکتا۔ رکتے ہی اس کا ہاتھ اپنی جیب پر جا پڑتا اور وہ دو پیسے دے کر اخبار قریب قریب چھین ہی لیتا۔

اس وقت لڑکوں کے دماغ میں یہی خیال تھا —— کیا ہی اچھا ہو اگر ہر روز ایسی ہی خبریں آئیں —— مسولینی، ہٹلر، مہاتما گاندھی، امریکہ میں بھونچال، اسپین کی جنگ، خون کی بارش، یہ سب ہوتے ہوئے بھی اخبار اس طرح ہاتھوں ہاتھ نہیں بکتا۔ زور زور سے آواز دینے پر بھی لوگ اچٹتی نظروں سے دیکھ کر آگے بڑھ جاتے ہیں۔ لیکن آج ——

آج اخبار بیچنے والا ہر ایک لڑکا بڑا آدمی بن گیا تھا۔ اس کی آواز سنتے ہی لوگ رک جاتے۔ متعجب ہو کر ایک لمحہ اس کی طرف دیکھتے اور جھٹ سے اخبار خرید لیتے۔

ہر انسان کی کچھ خواہشات ہوتی ہیں اور وہ انہیں کسی طرح حاصل کرنے کی کوشش کرتا ہے۔ اخبار والے بھی آج کچھ زیادہ پیسہ پانے کی امید پر ہی خوش تھے۔ اور اسی لئے انھوں نے آج صبح ہی سے بمبئی شہر سر پر اٹھا لیا تھا۔

دوکانوں میں، کچہریوں میں اور اسکولوں میں اسی ایک ہی خبر پر دن بھر بحث مباحثے ہوتے رہے۔ بوڑھے سیانے کہتے۔

—— "یہ ہے بڑھتی ہوئی تعلیم نسواں کا انجام" نوجوان دل ہی دل میں کہتے —— اسی لئے تو طلاق کی بڑی ضرورت ہے۔

میاں بیوی میں ان بن ہونے پر انہیں ایک ہی گھر میں بند رکھنا دو پاگلوں کو ایک زنجیر میں ایک ساتھ باندھنے کے برابر ہے۔ ان دو پاگلوں میں نہ جانے کب کون پاگل پن کے نشہ میں دوسرے کا گلا گھونٹ دے۔"

شام کے اخباروں میں اس خبر کا پورا پورا حال چھپا تو شام کے اخبار صبح سے کہیں زیادہ بکے۔

یہ خبر ایک ضلع کے صدر مقام کی تھی۔ اس عورت کا نام تھا کملا دیش پانڈے۔ تعلیم یافتہ معلمہ تھی وہ۔ اس کا شوہر وشوناتھ دیش پانڈے پچھلے دو سال سے بیمار تھا۔ وہ گھر سے نکلتا بھی نہ تھا۔ ان کے کوئی اولاد نہیں تھی۔ لیکن اس عورت نے "بچے کی بیماری" کا بہانہ کر کے تھوڑی سی افیون خرید لی۔ تعلیم یافتہ بیوی اپنے بچے کو افیون دے! اس پر کسی کا یقین کرنا ناممکن ہے۔ پھر بچہ نہ ہوتے ہوئے بھی "ہے" کہہ کر اس نے افیون کیوں خریدی۔

اخبار کے نمائندے نے لکھا تھا —— وجہ ایک ہی تھی۔ اسے اپنے رستے کے کانٹے کو دور کرنا تھا۔ شوہر کو افیون دیکر اس عورت نے رونے کا پارٹ کس خوبی سے نبایا۔ اسے ہسپتال پہنچاتے ہی ایک دیہاتی بیوی کی طرح ڈاکٹر کا پیر چھو کر اس نے کہا "انھیں بچا لیجئے ڈاکٹر صاحب" اس التجا میں کتنی ہی عاجزی ہو لیکن شوہر کے باہر نہ نکل سکنے پر بھی اس کی کھائی ہوئی افیون

گھر میں کس طرح آگئی ــــ یہ سوال تھا ہی. کسی طرح وہ اس کا جواب نہ دے سکی.

خون کے واقعات کی تفصیل نے صبح والی آگ پر گویا تیل کا کام کیا. سارے لوگ یہی کہتے کہ ایسی عورت کے بغیر تحقیقات ہی پھانسی لگا دینا چاہیے مگر ان لوگوں کی رائے میں بہت سے اختلافات تھے. مشہور ادیبہ اور معلمہ کماری اوشا دیوی کے گھر پر تو بحث مباحثہ کا بازار ہی گرم تھا.

اوشا دیوی کے دیوانخانے میں ایک تیس سال کا ان بیاہا نوجوان ایک چھتیس سالہ بدصورت عورت کا شوہر ایک چالیس سالہ خاتون کے ذات شریف خاوند بیٹھے تھے. سب ہی زور شور سے اسی خبر کے بارے میں باتیں کر رہے تھے. ان بیاہے نوجوان نے ــــ "شادی بیاہ" کی انجمن کیوں نہیں چاہیے. اس کا یہ زندہ ثبوت ہے. یہ زور دے کر بتایا. شادی شدہ مہاشہ نے ــــ "کچھ بھی ہو، خون تو خون ہی ہے." اس بات پر مختلف حیثیت سے روشنی ڈالی. ان کا بہت دیر تک اوشا دیوی کے یہاں رہنا ان کی بیوی کو پسند نہیں تھا یہ وہ اچھی طرح جانتے تھے. انھوں نے خیال کیا ــــ "تعلیم یافتہ بیویاں بھی پاگل پن میں ایسا خوفناک خون کر بیٹھتی ہیں تو پھر اپنی بیوی تو اجڈ گنوار ہی ہے. سبزی کاٹنا چھوڑ چھرا سنبھال کر پل پڑے تو........" تیسرے صاحب کو اس بحث مباحثے میں کوئی دلچسپ بات نہ معلوم ہوئی. وہ دل ہی دل میں سوچ رہے تھے ــــ " دیوی کے مندر میں آنے کے بعد اسی کا خیال کرنا اسی کی پوجا کر کے اسے خوش رکھنا ــــ وغیرہ" بےچارا حسن کا پرستار تھا.

اوشا دیوی بھی اس مباحثہ میں شریک تھیں. روز روز کی دل لگی، مذاق، ہنسی، خوشی، چائے، سینما کا ارادہ ــــ سب کچھ بھول گئیں تھیں وہ.

اخبار کی سرخی پر نظر ڈالتے ہوئے اپنے پرستاروں کو حیرت زدہ کر کے وہ بول اٹھیں ــــ "ارے!"

اوشا دیوی کو مچھر نے کاٹا یا ان کی زلفوں میں گتھا ہوا کانٹا چبھ گیا یا پھر کچھ اور ہی ہو گیا. کوئی نہیں جان سکا. اوشا دیوی آگے نہ بولتیں تو برہمچاری ڈاکٹر کو لینے کے لئے دوڑ پڑتا. شادی شدہ مہاشہ "ہومیو پیتھک علاج اچھا ہے" کہتے رہتے. اور تیسرے بزرگوار نے پیاز پیس کر سنگھانے کی ترکیب بتائی ہوتی.

لیکن اپنے پرستاروں کو اتنی تکلیف پہنچے، ایسی دیوی کی مرضی نہیں تھی. وہ ہنستے ہوئے کہنے لگیں ــــ "یہ کملا میرے ہی ساتھ پڑھی ہے!"

"کملا کون" ــــ برہمچاری مہاشہ پوچھ بیٹھے.

"اس خبر کی"

تینوں حضرات کے چہرے تصویر کھینچے جانے کے لائق ہو گئے. اوشا دیوی ہنستی ہوئی کہہ رہی تھیں ــــ کالج میں کیسی متین بنتی تھی یہ کملا. کوئی کچھ تحفہ دیتا تو یہ کبھی نہیں لیتی. تفریح کے لئے بھی اکیلی چلی جاتی تھی؛ اوروں کو حقارت کی نظروں سے دیکھ کر شاستروں کی کتابیں ہی پڑھا کرتی!

" افیون دے کر شوہر کی جان لیجا سکتی ہے ـــــ آخر ہی شاستروں کا علم پایا ہوگا اس نے "ـــــ شادی شدہ مہاشے نے کہا۔ اوشا دیوی نے صرف مسکرا دیا۔

برہمچاری مہاشہ نے سوال کیا " ایسی عورت نہ جانے کیوں شادی کے پھندے میں پھنسی "

" اور شادی بھی کی ' تو ایک شاعر کے ساتھ "

" شاعر کے ساتھ " تینوں دوست ایک دم چونک پڑے۔

" ہاں وشوناتھ کے نام سے کئی نظمیں اس کے شوہر کی ہی ہیں۔ اس سے میری ملاقات ایک ماہوار رسالہ کے دفتر میں ہوئی تھی ـــــ بالکل دبلا پتلا خاموش آدمی تھا "

" ایسا ہے ! " ان بیاہے نوجوان بول اٹھے۔

" اب لی اس خون کی وجہ " اس کا باعث ہے کوئی چھپی ہوئی محبت۔ عدالت میں بڑا مزا آئے گا۔

اوشا دیوی پھر مسکرائیں۔

تیسرے بزرگوار سر کھجا رہے تھے ایک دم سے چونک کر بولے " ہاں یاد آیا "

" تم بھی اس کے شوہر سے واقف تھے " شادی شدہ مہاشہ نے پوچھا۔

" نہ نہ ! میں تو دوسری ہی بات سوچ رہا تھا " کیا اسے ملاقات ہے کیا " برہمچاری نے پوچھا۔ تم اور کیا سوچ سکتے ہو۔ اجی جناب ! اس کی نظم ابھی ابھی پڑھی تھی۔ کہاں تھی ٹھیک سے یاد نہیں آتا ...... " " کہاں چھپی ہے اس کی نظم "

تیسرے صاحب نے تہہ کیا ہوا ایک رسالہ کھولا۔ اس رسالہ کے پہلے ہی صفحہ پر نیچے وشوناتھ کی لکھی ہوئی ایک نظم تھی۔

اوشا دیوی نظم پر نظریں جمائے اسی میں محو ہوگئیں۔

برہمچاری نے پوچھا " پریم گیت ہے "

بھنویں سکیڑ کر اوشا دیوی نے جواب دیا ـــــ " نظم کا عنوان ہے " فطرت "

برہمچاری مہاشے زور سے ہنس پڑے۔ شادی شدہ بزرگوار نے بھی ان کا ساتھ دیا۔ برہمچاری بولے ـــــ " پھول وول کا ذکر ہوگا۔ اور کیا ' یہ شاعر کیا جانیں ـــــ پھول چڑھانے کے لئے دیوی نہ ہو تو ہاتھ میں رکھے ہوئے پھول انگار ہو جاتے ہیں۔ زمین کی کسی چندر کرن کے پیچھے پھر کر پولیس کے استقبال کا مزہ نہ چکھیں تب ..... " وہ مہاشے کچھ اور بھی کہتے لیکن اوشا دیوی نے نظم پڑھنی شروع کر دی جس سے آپ کو چپ ہو جانا پڑا۔ شاعر نے کہا تھا ـــــ

" نہیں ! مجھے موت نہیں چاہیے

اب تک اندھیرے میں تارے چمکتے تھے ـــــ جیسے موت کے دروازہ پر پہنچنے والی زندگی کی ان گنت روشنیاں ہوں۔

اور اب ـــــ

اب افق پر سرخی چھائی ہوئی ہے۔ بوسے سے پہلے محبوب کے روشن چہرے پر حجاب کی ایسی ہی رنگینیاں دکھا کرتی ہیں۔
پر نعوں کا من موہ لینے والا گیت سنائی دے رہا ہے۔
گویا دو محبت بھرے دلوں کا ایک جگہ ملاپ ہو۔
صبح کی ٹھنڈی ٹھنڈی ہوا کی لہریں اپنے مہکتے ہوئے جھونکوں سے تن بدن میں گدگدی پیدا کر رہی ہیں۔ محبت کے بندھنوں میں جکڑے ہوئے پریمی ایسا ہی روح پرور سکون محسوس کرتے ہیں۔
کنجوں میں کلیاں پلکیں کھول رہی ہیں۔ میرا من بھی انہیں کے ساتھ پھول رہا ہے۔
نہیں! مجھے موت نہیں چاہیے۔"
نظم کے ختم ہوتے ہی چاروں طرف سکوت پھیل گیا وہ سبھی نہ جانے کیا سوچ رہے تھے۔ شادی شدہ مہاشے نے اس خاموشی کو توڑتے ہوئے کہا ـــــ "بے چارا اگر اکیلا ہوتا تو نہ مرتا۔ لیکن یہ بیوی ـــــ"
چالیس سالہ بیوی کے شوہر بولے "یہ سیدھی سادھی معلمہ راکشس کس طرح بن گئی"
برہمچاری اوشا کو اپنی طرف متوجہ دیکھ کر بولے "اس الجھن کا سلجھاؤ تو اوشا دیوی ہی بتا سکیں گی۔ یہ تو مانی ہوئی بات ہے کہ انسان کا دل سمندر سے بھی گہرا ہوتا ہے اس پر عورت کا تو ......"
سوال کرنے والے کی خوش فہمی سے متاثر ہو کر یا انسان کے دل کی اصل حالت سے صرف ادیب ہی اچھی طرح واقف رہتے ہیں ـــــ اسی قسم کے غرور سے اوشا دیوی نے کہا۔
" یہ کوئی اہم مسئلہ نہیں ہے "
تینوں پرستار متعجب ہو کر دیکھنے لگے۔
ہنستے ہوئے اوشا دیوی نے کہا ـــــ "اس نظم میں ہی تو ہے اس مسئلہ کا حل" ان تینوں بزرگواروں کے تعجب کی اب کوئی حد نہ رہی۔
ایک لمبا سانس چھوڑ کر اوشا دیوی نے کہا ـــــ "فطرت"
"یعنی"
" مرد کتنے پاگل ہوتے ہیں۔ اجی جناب! شوہر کی بیماری ہی میں کملا کسی دوسرے نوجوان سے محبت کرنے لگ گئی۔ اس محبت کی راہ میں شوہر حائل ہوا تب ......" تینوں نے سر ہلا دیا۔

اوشا دیوی نے ایک کہانی لکھ کر اسے دل ہی دل میں پڑھ ڈالا۔ ابھی تک اپنی لکھی ہوئی کسی کہانی پر وہ کبھی اس قدر خوش نہیں ہوئی تھیں۔
کہانی کی ہیروئن کا نام تھا کسم۔ اسے انھوں نے معلمہ نہ بنا کر نرس بنایا تھا۔ اور اس کے شوہر کو شاعر کی بجائے مصور کی

حیثیت دے دی تھی۔ نرس ایک بیمار نوجوان سے محبت کرنے لگتی ہے۔ اور محبت کی خاطر ——— اپنے شوہر ——— کو دور کرنے کے لئے ——— اسے زہر دیتی ہے ——— یہ تھا اس کا پلاٹ۔ یہ کہانی ایک تہلکہ مچا دے گی ——— اس امید پر اوشا دیوی اسے کسی رسالے میں بھیجنے کی تیاری کرنے لگیں۔

لیکن انسانوں کے بنائے ہوئے ہوائی قلعے ڈھانے کے لئے قسمت گویا پیچھے ہی پڑی رہتی ہے اوشا دیوی کی امید زیادہ دنوں تک نہ ٹک سکی۔

ایک دن اخباروں نے کملا کے بے گناہ ہونے کی خبر شایع کی۔ شاعر کے خودکشی کرنے کے سامان مل گئے تھے۔

اوشا دیوی کو "فطرت" کے عنوان والی نظم یاد آئی۔ وہ سوچنے لگیں ——— اونھ ہوں! ایسی پرامید زندگی خودکشی کرے گی! صبح کا حسین منظر دیکھ کر جس کا دل پھولوں نہ سماتا ——— وہ افیون کھا کر خودکشی کرے گا! کوئی بھید ضرور ہے اس میں۔ جس سے کملا محبت کرتی تھی ——— اس نے کسی ترکیب سے بچایا ہوگا لیکن کس ترکیب سے وشوناتھ نے خودکشی کی یہ کہانی تک سچ ہے۔ شاید اس کی نظم "فطرت" عدالت نے نہیں پڑھی۔ ان انصاف کے ٹھیکہ داروں کے لئے نظم انسانی فطرت یہ سب بیکار سی چیزیں ہیں۔ انھیں تو "پنیل کوڈ") رٹنے سے کام ہے"۔

اوشا دیوی اور ان کے تینوں ساتھیوں میں کملا کے بے گناہ ہونے پر اس طرح کئی بار بحث مباحثے ہوتے رہے مگر اس کا نتیجہ ہوتا کسی کو بھی نہیں بھایا۔

ندی کی خاموش سطح پر پتھر گرتے ہی ایک بڑی آواز ہوتی ہے۔ کئی کئی دائرے ابھرتے ہیں ——— بعد میں پانی اسی سکون سے بہنے لگتا ہے۔ کملا کے ساتھ سماج میں بھی ایسا ہی ہوا۔ جس طرح سماج نے کملا کے خونی ہونے پر یقین کر لیا تھا اسی طرح اس نے وشوناتھ کی خودکشی کو بھی سچ مان لیا ——— وہ یہ سب بھول بھی گیا۔

اس بات کی یاد آتی تھی تو صرف اوشا دیوی اور ان کے دوستوں کو ——— ان سب کا گمان تھا کہ انسانیت کی نظر میں یہ خون ہی ہے۔ "فطرت" میں وشوناتھ نے زندہ رہنے کی خواہش کو کس خوبصورتی سے پیش کیا تھا وہ شخص ایسی نظم لکھ کر ایک مہینہ میں خودکشی کرلے گا۔ نا! دودھ پیتا بچہ بھی اس خودکشی والی بناوٹی بات پر یقین نہ کرے گا۔

کملا کے متعلق اوشا دیوی کے دل ہی دل میں ایسے تصفیہ پر پہنچنے کے بعد ایک دن شام کو جب کملا یکایک خود آدھمکی تو وہ چکرا سی گئی۔ تھوڑی دیر بعد انھوں نے پوچھا ——— "بیٹی اکیلی ہی آئی ہو؟"

"اس دنیا میں میں اب اکیلی ہوں۔"

اوشا دیوی کو اپنی کہانی کا نرس سے محبت کرنے والا تپ دق کا بیمار ہیرو یاد آرہا تھا لیکن انھوں نے سوال دوسرا ہی کیا ——— "تمھارا بڑا بھائی تم سے ناراض ———

"ہے تو لیکن اس کی مرضی کے خلاف میں نے شادی کی تھی۔"

"ایسا" مگر وشوناتھ تو اچھے شاعر تھے۔"

"شاعری غریب کو دولت مند نہیں بناتی۔ شادی کے دن بھائی نے مجھ سے کہا ——

"کملا! آج سے بس تیرا کوئی نہیں اور تو بھی میری کوئی نہیں۔"

اوشا دیوی نے اطمینان کا سانس لے کر کہا —— "انسان کتنا ظالم ہوتا ہے۔" کملا ہنس کر بولی —— "اوشا! انسان کا ظلم کسی حد تک صحیح مانا جا سکتا ہے۔ مگر......"

"مگر"

"سبھی بتلاتی ہوں تمھیں۔ تمھاری جان پہچان کے بل پر نوکری کی کھوج میں بمبئی آئی ہوں۔ ایک مشہور ادیبہ ہونے کی وجہ سے تمھیں سب جانتے ہیں۔ اسی لئے تمھارے مکان کا پتہ پا سکی ہوں۔

ذرا سنبھل کر کملا کہنے لگی —— سگے بھائی کے "میں تمھارا کوئی نہیں" کہنے پر میری آنکھوں میں آنسو نہیں آئے۔ میں وشوناتھ سے محبت کرتی تھی وہ بھی مجھے چاہتے تھے۔ غریب ہونے پر بھی ان کی نظمیں کتنی اچھی ہوتی تھیں۔ میں سوچتی۔ ساری دنیا سے الگ ہو کر بھی وشوناتھ کی دھرم پتنی ہونے کے فخر پر ہی میں اطمینان سے جی سکوں گی۔ باسی روٹیاں ان کے ساتھ مجھے امرت سے بھی میٹھی لگیں گی۔ ہم دونوں ایک نئی دنیا بسائیں گے۔ وہاں ہمیں کوئی بھی تکلیف نہ پہونچا سکے گا۔ لیکن ......دو سال پہلے:

کملا کی آنکھیں ڈبڈبا آئیں۔

اوشا دیوی نے کہا —— "تم دونوں کی محبت کا سمندر سوکھ گیا۔"

بپھری ہوئی ناگن کی طرح گردن اونچی کر کے کملا نے کہا "آخری لمحہ تک وہ مجھے چاہتے تھے لیکن اوشا! انسان کا سچا دشمن انسان نہیں ہے اس کی دشمن ہے" فطرت "۔"

"یعنی"

"دو سال پہلے وشوناتھ کو تپ دق ہوا۔"

"یوں!"

"ہاتھ پر ہاتھ دھرے بیٹھنے کا وقت نہیں تھا۔ میں زیادہ کام کرنے لگی۔ انھیں آرام ملے۔ ڈاکٹروں کے بتلائے ہوئے علاج پورے ہوں۔ اس لئے میں اسکول میں معلمہ بنی۔ اس کے علاوہ رات میں انھیں کچھ پڑھ کر سنانا اطمینان دلا سا دینا۔ یہ سب مجھے ہی کرنا پڑتا تھا۔ ایک لمحہ کے لئے کملا رک گئی پھر اوشا دیوی کو ہمہ تن گوش دیکھ کر بولی —— "فطرت ایک اندھی راکشس ہے بھونچال میں ہزاروں عمارتیں بیٹھ جاتی ہیں ان میں سے ایک ایک عمارت بنانے میں انسان کو کس قدر تکلیف ہوتی ہے۔ یہ......اونہہ جانے دو! فطرت نے مجھ سے دشمنی ٹھان لی میرا بچہ پورے دو مہینے بھی نہ جی سکا۔ اس کے لئے میں جان تک دے دیتی مگر ڈاکٹر صاحب نے کہا۔

"فطرت کا دل فولاد کا ہے۔ کسی طرح سے بھی وہ تندرست نہیں ہو سکتا۔"

"کیا ہوتا" وشوناتھ کی ماں بھی تپ دق کا ہی شکار بنی تھیں۔ وشوناتھ کی بیماری کے ڈیڑھ سال بعد بچہ ہوا۔ اس بے چاری ننھی سی زندگی کا کیا قصور تھا۔ اس وقت مجھے وشوناتھ پر غصہ آگیا گر وہ چھوٹا سا کمرہ ہی ان کی دنیا بن گیا۔ جب وہ لکھنے پڑھنے لگتے تب میں ہی ان کے ہاتھ سے قلم یا کتاب چھین لیتی۔ اور کہتی "جلد اچھا ہونا ہے تو چپ چاپ پڑے رہیے۔ ان کے پاس بیٹھ کر میں اطمینان دلاتی۔ نہ جانے کیوں کبھی کبھی وہ ہنس پڑتے۔ میرا کہنا شائد وہ جھوٹ سمجھتے تھے۔ بیماری کے سبب سے ان کے دل و دماغ کو پوری پوری خوراک نہیں مل سکتی تھی۔ ان کی اس عجیب بھوک کو دیکھ کر میں خاموش رہ جاتی۔ خیال کرتی ایک پل کے لئے ہی کیوں نہ ہو انہیں سکھ ملے۔ بچے کے مرجانے کے بعد ڈاکٹر صاحب نے مجھے سب صاف صاف بتلا دیا۔ ان کے خون میں تپ دق تھا۔ ان کی طبیعت بھی روز بروز بگڑتی جا رہی تھی۔ ایسی حالت میں پھر بچہ ہو تو...... اور شائد ڈاکٹر صاحب کے وہ الفاظ ات کے وقت میرے کانوں میں گونج اٹھتے تھے —— دیوی! ماں باپ بھی کبھی کبھی بچے کے دشمن ہو جاتے ہیں۔"

"اوشا! جب میں دوا لانے ہسپتال جاتی اور وہاں بوتلوں میں رکھے ہوئے اپنے ماں باپ کی بیماریوں کے شکار خوفناک شکل وصورت کے بچوں کو دیکھتی تو میرا دل دھڑکنے لگتا۔"

- ایک کتاب میں "تپ دق متعدی مرض نہیں ہے" ایسا لکھا ہوا دیکھ کر مجھے اطمینان ہوا مگر اسی وقت یاد آیا۔ وشوناتھ کی ماں کو بھی تپ دق تھا۔ انھیں بھی ہوا۔

میں ان سے دور دور رہنے لگی لیکن میرے دل میں ان کی محبت ذرا بھی کم نہیں ہوئی میں ان کے لئے سب کچھ کرتی لیکن - ان کی آنکھوں کی سرخی کا مطلب میں پہچانتی تھی۔ ان کا دل ٹوٹ رہا ہے۔ یہ بھی مجھ سے چھپا ہوا نہ تھا مگر فطرت کب بدلہ لے گی اس کا کوئی پتہ تھوڑی ہے۔"

"میرے ایسا کرنے سے انھیں اور بھی زیادہ دکھ ہونے لگا۔ مزاج میں چڑچڑا پن پیدا ہو گیا وہ اپنے ہی بستر پر چپ چاپ کروٹیں بدلتے رہتے۔"

" ایک دن رات کے تین بجے تھے۔ ایک بجے سونے کی وجہ سے میں خوب نیند میں تھی۔ میں یکایک جاگ پڑی۔ وہ میرے پاس آکر میرے بالوں پر ہاتھ پھیر رہے تھے۔ ان کی وہ لاچار حالت —— کچھ بھی ہو وہ میرے ہی تھے......."

" اس دن سے میں تھوڑی تھوڑی افیون لانے لگی اس وقت جب مجھے معلوم ہوتا کہ ایک ننھی اور معصوم زندگی کی پیدائش اور موت کے سامان ساتھ ساتھ ہی کرتے ہیں۔ تب...... مجھے کچھ بھی نہ سوجھتا تھا۔ میں نہیں جانتی تھی کہ میں کیا کر رہی ہوں۔"

" پھر ایک دن ویسا ہی اتفاق ہوا۔ اس دن ہماری ہیڈ مسٹرس نے مجھے خواہ مخواہ ہی ڈانٹ دیا تھا۔ ایک تو ویسے ہی میرا دل جھنجھلایا تھا پھر کسی کام کے لئے میں نے اپنا پرانا ٹرنک کھولا۔ اس میں میرے بچے کا کرتا نظر آگیا۔ اسے دیکھ کر میں اور بھی غمگین ہو گئی۔ شاید لیٹنے سے سکون پا سکوں گی۔ یہ سوچ کر میں لیٹ گئی۔ وہ قریب آئے۔ اور ——

"انھیں میں نے کبھی بے ادبی سے جواب نہیں دیئے تھے۔ لیکن مجھے بچہ کی یاد آگئی۔ اور میں انھیں نہ جانے کیا کیا کہہ گئی" یہ پھر سے دوسرے بچہ کی ماں اور دشمن بننے کی میری خواہش نہیں"۔ یہ بھی میرے منہ سے نکلا" ایسے وقت میں افیون کھاکر مر جاؤں گی اسی لئے میں نے ٹیبل کے خانہ میں افیون لارکھی ہے" یہ بھی بک گئی۔

"وہ چپ چاپ چلے گئے"

"اس رات مجھے کیسی اچھی نیند آئی تھی۔ صبح سویرے اٹھ کر دیکھا تو بے ہوش پڑے تھے۔ ان کے منہ سے ایک عجیب آواز آرہی تھی۔ میری لائی ہوئی افیون انھوں نے کھالی تھی۔

اس موت کا خوفناک منظر گویا کملا کی آنکھوں میں جھول رہا تھا۔ اس نے پاگل کی طرح اوشا دیوی کی طرف دیکھا۔ اوشا دیوی نے کانپتی ہوئی آواز میں کہا ــــــ

"تم پر کیسا خوفناک الزام لگایا گیا تھا"

"ان کی ڈائری سے میں بچ گئی"

"ڈائری"

"ہاں پہلے تو میں بالکل گھبرا گئی تھی پھر ایک دم یاد آگیا کہ وہ ہر روز ڈائری لکھا کرتے تھے۔ ان کا لکھا ہوا وہ آخری صفحہ"

"کیا لکھا تھا اس میں"

"ایک جگہ پڑے رہنے کی وجہ سے اور میری خدمت سے ان کے دل میں خوش رہنے کی کتنی خواہش ہوتی تھی۔ یہ سب گویا خون ہی سے لکھا ہے"

"اور"

"اور انھیں کے الفاظ میں سناتی ہوں تمھیں ــــــ میں نے شاعر کی حیثیت سے کئی بار فطرت کے حسین مناظر کا مطالعہ کیا۔ لیکن بیمار پڑے رہنے کے بعد میں جان گیا کہ فطرت جتنی حسین اور خوبصورت ہے اتنی ہی ظالم بھی۔ اس کے مظالم کا مجھے پورا پورا احساس ہے۔ کملا تک بھی اس کی آنچ پہنچ چکی ہے۔ اس کے ظلم اور میرے دل کی کمزوری کی کھینچ تان میں کملا کے دل کا پھٹ جانا ممکن ہے۔ یہ نہ ہو۔ اس لئے میں نے افیون کھاکر......"

کملا کی آنکھوں سے آنسو جھڑنے لگے۔ لیکن اس نے اوشا کو میز پر رکھے ہوئے کچھ کاغذ پھاڑتے ہوئے دیکھ ہی لیا۔

وشنو سکھا رام کھانڈیکر
مترجمہ افضل عابدی

بہار

کچھ عرصہ ہوا میں ایک مقام پر سے گزر رہا تھا۔ اتفاق سے وہ ایک ایسا دن تھا جو ہمارے ملک کے بہترین موسم کے بہترین دنوں میں شمار ہو سکتا تھا۔ چھوٹی چھوٹی پہاڑیاں سبزے سے بھری ہوئی تھیں اور جا بجا مختلف قسم کے رنگین پھول اپنی گوناگونی کی بہار دکھلا رہے تھے۔ سارا سماں اس قدر سہانا اور خیرہ کن تھا کہ اس کیفیت سے آنکھ میں مسرت کے آنسو چھلکنے کو تھے۔ ایک طرف پھولوں کی بہار، شفاف نیلگوں آسمان کا کیف آور منظر، اور دکن کی ایک پر امن بستی کی قربت، دوسری طرف بہت دور سیکڑوں، ہزاروں میل دور کی قتل و غارت گری چیخنے والے بموں اور موت برسانے والے طیاروں کی آواز کا تصور موجودہ جنگ کی تمام ہولناکیوں کے ساتھ آنکھوں کے سامنے پھر گیا۔ میرے سامنے ایک درخت کی شاخ پر ایک چنڈول سورج کی مدح میں بے اختیاری سے نغمہ خواں تھا معلوم ہوتا تھا کہ شاید اس کا دل سینہ سے باہر نکل پڑے گا۔ فضا فطرت کی دل نواز، موسیقی سے معمور معلوم ہوتی تھی یعنی زندگی کی پرمسرت مصروفیت کے زمزمہ کی گونج چوطرف سے کانوں میں آ رہی تھی۔ اور اس مقام پر جنگ، اس کی تکلیف، دہشت اور مصیبت سب ایک خواب سے معلوم ہو رہے تھے۔ بلکہ اس مقام پر اس امر کا احساس کرنا ایک مشکل معلوم ہو رہا تھا کہ انسان، وہ انسان جو خدا کی پیاری مخلوق میں ایک ایسی نوع سے ہے جو چاہے تو پر امن زندگی بسر کر سکتی ہے، اپنی بنی نوع کے قتل و غارت میں مصروف ہے اور یہ سب کچھ ایسے جھگڑوں کے سلسلے میں ہو رہا ہے جس کی حقیقت کی بعض اوقات کوئی فریق بھی صحیح طور سے تعریف نہیں کر سکتا۔ اور یہ انسان اپنے ساتھیوں کو ان تمام شیطانی ساز و سامان کے ذریعہ تباہ کر رہا ہے جو اس کا دماغ سوچ سکتا اور ایجاد کر سکتا ہے۔ یہی وہ دماغ ہے جو انسان کے حق میں خدا کا بہترین عطیہ ہے!

میرے اطراف فضا میں امن، روشنی اور خوش الحان پرندوں کے پرمسرت نغمے بکھرے ہوئے تھے۔ اس فضا میں جنگ، مصیبت اور گناہ کا کوئی شائبہ تک نہ تھا۔ معلوم ہوتا تھا میں اس وقت جنت کے ایک چھوٹے سے ٹکڑے پر کھڑا ہوا ہوں۔ خوش گوار موسم، نرم دھوپ، پھولوں کی بہار، پرندوں کے نغمے اور اس کے ساتھ امن سکون اور موسم بہار کا احساس تھا۔ اس وقت میں نے کوشش کی کہ اپنے حافظہ سے دنیا کی تلخ حقیقتوں کو کچھ دیر کے لئے نکال پھینکوں اور بے پناہ انسانی مصائب کا خیال تک بھی میرے حاشیۂ ذہن میں نہ رہنے پائے۔ ان مصائب اور المناک واقعات کو بھی بھلانے کی کوشش کی جو میں نے دنیا میں دیکھے تھے۔ تھوڑی دیر کے لئے میں اس طرح جینا چاہتا تھا جس طرح فطرت جیتی ہے یعنی صرف وقت کے موجودہ لمحوں کے لئے۔ میں ماضی کو بالکل بھلا دینا چاہتا تھا۔ اور تھوڑی دیر کے لئے اپنے کو یہ غلط باور کرانے میں کامیاب بھی ہو گیا کہ دنیا ایسی ہی ہے جیسی کہ اس کو ہونا چاہیئے نہ ایسی جیسی کہ وہ واقعتاً ہے۔ اور اس طرح کچھ عرصے کے لئے میں نے حقیقتوں کو ان کے درد سے محروم کر دیا۔

پھر جو سامنے دیکھا تو ایک شخص پر نظر پڑی جو نوجوان اور ہونہار دکھائی دیتا تھا مگر وہ اپنا راستہ ایک لکڑی کے سہارے ٹٹول رہا تھا۔ وہ ہر قدم پر اپنی لکڑی اس طرح چلاتا تھا کہ اس سے اطراف کے خوشنما پھولوں پر کچھ زد سی پڑ جاتی تھی۔ مجھ پر فوراً اس کا حال کھل گیا۔ اس بیچارے کے لئے اس بہار کی صبح میں کوئی رونق نہ تھی۔ وہ اس کو دیکھ نہ سکتا تھا۔ اس کو صرف اس قدر معلوم تھا کہ سورج چمک رہا تھا۔ ہوا پھولوں کی خوشبو سے لدی ہوئی تھی لیکن اب اس کے لئے زندگی بھر دنیا ایک ایسا تاریکی، خاموشی اور تنہائی کا عالم ہو کر رہ گئی تھی جہاں کبھی کبھی کوئی آواز کان پڑ جاتی ہو۔ وہ اندھا تھا۔ یہ نوجوان جنگ کا ایک سپاہی تھا۔

لطیف احمد فاروقی

جنوبی ہند کا پہلا اردو اخبار

اخبار دراصل دنیا کا روزنامچہ ہے جس میں سیاسی، معاشی، سماجی، علمی غرض ہر قسم کے حالات اور معلومات شائع ہوتے رہتے ہیں۔ بیدار بخت اقوام میں اخبار بینی کا شوق انتہا درجہ پر پہنچا ہوا ہے۔ وہاں لاتعداد روزانہ، ہفتہ وار اخبار نکلتے ہیں۔ اکثر اخبارات کی اشاعت لاکھوں کی تعداد میں ہوتی ہے۔ وہاں کا ایک معمولی آدمی بھی ہر روز جب تک اخبار نہیں دیکھتا چین سے سانس نہیں لیتا۔

موجودہ تحقیقات کی رو سے مولوی محمد باقر نے جو شمس العلماء مولانا محمد حسین آزاد کے والد تھے ۱۸۳۶ء میں ہماری زبان کا پہلا اخبار دہلی سے جاری کیا جس کا نام "اردو اخبار" ہے بعدازاں ۱۸۳۷ء میں "سید الاخبار" اور پھر ۱۸۴۳ء میں "مظہر الحق" شائع ہونے لگا۔ اس سے صاف ظاہر ہے کہ اردو کا پہلا اخبار "اردو اخبار" ہے۔ لیکن مولوی نصیر الدین صاحب ہاشمی نے اپنی کتاب "مدراس میں اردو" کے صفحہ ۱۴۲، ۱۴۳ پر اردو کے پہلے اخبار کے متعلق مندرجہ ذیل سطور تحریر فرمائے ہیں۔

"ہمارا خیال ہے۔ اردو کا پہلا اخبار غالباً "عمدۃ الاخبار" ہوگا۔ جو مدراس سے شائع ہوا ہے۔ اگرچہ اس کی اجرائی کا صحیح سنہ ہنوز تحقیق کے ساتھ یقین نہیں کیا جا سکتا۔ لیکن گمان غالب ہے کہ اس کی اجرائی عمدۃ الامراء کے زمانہ میں ہوئی ہے۔ اور ان کے نام پر ہی "عمدۃ الاخبار" رکھا گیا ہے۔

عمدۃ الامراء والاجاہ محمد علی خاں ناظم ارکاٹ کے دوسرے لڑکے تھے اور والاجاہ کے انتقال پر ۱۲۱۰ھ (۱۷۹۶ء) مسند ارکاٹ پر متمکن ہوئے اور ۱۲۱۶ھ (۱۸۰۱ء) میں ان کا انتقال ہوا۔

اگرچہ گارساں دتاسی نے "عمدۃ الاخبار" کا ذکر اپنے سولہویں خطبہ میں کیا ہے۔ (۱۸۶۹ء) مگر اس کے ساتھ ہی اس نے اس امر کی بھی وضاحت کر دی ہے۔ کہ یہ اخبار بہت پہلے شائع ہوتا تھا چنانچہ وہ لکھتا ہے۔

"عمدۃ الاخبار" اس نام کا ایک اخبار پیشتر بریلی سے نکلتا ہے۔ لیکن یہ اخبار مدراس میں بہت عرصہ سے جاری ہے۔ یہ بھی مہینہ میں تین بار نکلتا ہے۔ کبھی کبھی تصاویر بھی ہوتی ہیں"۔

ممکن ہے ہمارا خیال صحیح ہو اور ممکن ہے غلط ہو۔ اس میں شک نہیں کہ "عمدۃ الاخبار" مدراس کا پہلا اخبار تھا"۔

اس عبارت سے بخوبی ظاہر ہے کہ مولوی ہاشمی صاحب نے متذکرہ اخبار کے عمدۃ الامراء کے نام سے معنون ہونے کی بناء پر قیاس فرمایا ہے کہ شاید وہ عمدۃ الامراء کے زمانہ میں جاری ہوا ہو۔ لہٰذا صاحب موصوف نے اس کو اردو کا پہلا اخبار قرار دیا ہے۔ لیکن ان کے پاس اس کا کوئی ثبوت نہیں جیسا کہ انہوں نے خود اعتراف فرمایا ہے تاہم اس اخبار کو جنوبی ہند یعنی مدراس کا پہلا اردو اخبار حق الیقین کے ساتھ تحریر فرمایا ہے۔

افضل العلماء ڈاکٹر عبدالحق صاحب پرنسپل محمڈن کالج نے رسالہ اردو بابتہ اپریل ۱۹۳۵ء میں "اعظم الاخبار" کو جنوبی ہند کا پہلا اردو اخبار تحریر فرمایا ہے جو ۱۸۴۸ء میں شہر مدراس سے جاری ہوا۔

راقم الحروف نے گزشتہ تعطیلات میں میسوری اردو کی تحقیق کے غرض سے بنگلور کا سفر اختیار کیا تھا۔ وہاں مسلم لائبریری (معسکر بنگلور) میں "جامع الاخبار" کی ایک قدیم جلد پائی جس کو مولوی عبدالرحمن صاحب فیضی مالک فیض عام الکٹرک پریس نے لائبریری کو تحفہ دیا تھا۔

"جامع الاخبار" کو دیکھنے سے پتہ چلتا ہے کہ اس کی اجرائی ۱۸۴۱ء میں شہر مدراس سے ہوئی جو جنوبی ہند کا پہلا اردو اخبار اور دنیائے اردو کا تیسرا اردو اخبار ہے۔ اس اخبار کی تیسری مکمل جلد (بابتہ ۱۸۴۳ء) متذکرہ لائبریری میں موجود ہے۔ اس اخبار کے ایڈیٹر کا نام سید رحمت اللہ تھا۔ ہفتہ میں ایک بار پیر کے روز بہرام جنگ کے باغ کی پہلی گلی مونٹ روڈ مدراس سے شائع ہوتا تھا۔ بڑی تختی کے

رسالہ اردو بابتہ اپریل ۱۹۳۵ء مضمون راشد صاحب۔

آٹھ صفحات پر مشتمل تھا۔ ہر صفحہ پر دو کالم ہوتے تھے۔ کاغذ کتابت اور طباعت قابل تعریف ہے۔

اس اخبار کا ابتدائی صفحہ حکومت ہند کے احکامات اور سرکاری فوج کی نقل و حرکت کے لئے مخصوص تھا۔ بعد ازاں مقامی خبروں کے علاوہ ہندستان کے مختلف مقامات اور مختلف ممالک کی تازہ خبریں شائع ہوتی تھیں۔ تازہ خبروں کے بہت ہی اہتمام کے ساتھ جلد از جلد وصول ہونے کا معقول انتظام کیا گیا تھا۔ انگریزی خبروں کا آزاد ترجمہ اردو میں کیا جاتا تھا۔ غیر ممالک کی خبروں میں ممالک اسلامیہ کی خبریں زیادہ شائع ہوتی تھیں۔ کبھی کبھی دنیا کے مختلف ممالک کے جغرافی اور تاریخی حالات بھی درج ہوتے تھے۔ خبروں کی اشاعت کا طریقہ تقریباً ایسا ہی ہے جیسا کہ آج کل عام اخبارات میں پایا جاتا ہے۔

راقم الحروف نے "جامع الاخبار" کی پوری جلد کا مطالعہ کیا۔ لیکن کہیں کوئی اشتہار نظر سے نہ گذرا۔ جو آمدنی کا ایک ذریعہ ہوتا ہے۔ اس سے پتہ چلتا ہے۔ کہ "جامع الاخبار" کے خریدار ہندستان کے ہر حصہ میں پھیلے ہوئے تھے۔ اس کی اشاعت کافی تھی جس سے اس کی آمدنی معقول تھی جو اس کی اشاعت کے سارے اخراجات کو پورا کر سکتی تھی۔

اب ہم ناظرین کی دلچسپی کے لئے اس اخبار سے چند اقتباسات درج کرتے ہیں تاکہ اس زمانہ کی اردو اور حالات کا کچھ اندازہ ہو۔

خبر مدراس | ۲۴ ہر ڈسمبر کی شب کو ۲۷ پیدل بازار کے جھوپڑیوں کو آگ لگی۔ چودہ جھوپڑیاں جل گئے۔ اور بھی آتش زور کئی تھی۔ یہ کپتان منلاند صاحب کے حسن اعانت سے آلہ آب کو وہاں لائے۔ اور اس سے پانی کی ایسی بارش کئے۔ ان کا رنج گئی۔ والا خانہ خرابی بہت بڑی تھی۔

غرہ جنوری ۱۸۴۲ء

خبر دہلی | برسات ابھی تو ہورہا ہے۔ بالوہ وارک نادشاکر وہاں آئے۔ بادشاہ ظل اللہ دہلی اپنے خالہ صاحبہ کی ملاقات کو گئے اس وقت تو بہت سر ہوئے۔ نذر و نیاز کا ذکر در بار شاہی سے مطلق موقوف ہوا ہے۔ اور بادشاہ کے قصر کے روبرو ایک بڑا چشمہ کھود رہا ہے۔ راجہ دوک سنگھ مارواڑ سے مجبور کو گیا ہے۔

غرہ جنوری ۱۸۴۲ء

خبر شادی | اس سال شہر مدراس میں دو شادیاں بڑے تکلف سے ہوئے ایک تو سوپریم کورٹ کے فارسی مترجم سید غلام دستگیر صاحب کے فرزند کی گئے ہفتہ میں ادا ہوئی۔ اور دوسری نواب عظیم الدولہ بہادر مرحوم کے فرزند نواب رشید الدولہ بہادر کی نہایت تکلف اور تجمل کے ساتھ اہتمام سے شرف الدین عرف فقیر صاحب کے بہت نظم آراستگی و سلیقے کے ساتھ ۲۲ ویں شب کو رسم شب گشت ادا کیے گیا۔ انشاءاللہ باقی کے رسوم بھی اسی طرح ادا کریں گے۔

۱۵ جنوری ۱۸۴۲ء

خبر ریاست برما | راجہ وہاں کا دار اودی نام لکڑیوں کی تجارت خود آپ کرتا تھا۔ پر اب اس نے باز آیا ہے۔ اور اس سبب لکڑیوں کی تجارت اب بہت سے سوداگران کرتے ہیں۔

۱۹ فروری ۱۸۴۲ء

خبر چین از کنٹان پرس | ۲۰ ویں نومبر تک وہاں سے اخبار آئے۔ وہاں نیا نرخ مقرر ہوا ہے۔ کچھ محصول بھی اجناس پر بڑھا ہے۔ جنرل سلتون صاحب نیلا کو جانے کا ارادہ رکھتے ہیں۔ سب قسم کا اجناس وہاں کم قسم سے بکتے ہیں۔ بہت سے انگریزی جہاز اور دخانی کشتیاں تجار کے وہاں جمع ہوئے ہیں۔ خانگی کے مقام میں انگریزی کپتان بل فرد ڈ صاحب ایلچی ہوئے ہیں۔ جزیرۂ کانگ کانگ میں زمیناں تجار خرید کرتے ہیں۔ چین کی سرحد میں پادشاہی کورٹ قائم ہونے کو ہے۔

۱۹ فروری ۱۸۴۲ء

خبر تربیت اطفال در شہر لنڈن | اس شہر میں جلاوہ لاکھ آدمیاں رہتے ہیں۔ غربا کے بچوں کو تربیت کے واسطے دو تو اسی خیرات کے مدرسے ہیں۔ خاص مکتب خانے ایک ہزار ایک سو چوہن۔

خیراتی مدرسوں میں اٹھاون ہزار تین سو کیشٹ اور خاص مدرسوں میں بائیس ہزار نو سو تیس طالب العلم ہیں۔ بہت سے لوگ اپنے بچوں کو استادوں کے تحویل کر دئے ہیں۔

وہاں استادی کا کام وے لوگ کرتے ہیں جن کو کسی نوع کی خدمت نہیں مل سکتی ہے۔ اور عورت بھی جو کہ بیوہ ہیں، خاص مدرسوں میں دس ہزار کیشٹ چھوکرے پڑھتے ہیں۔ اور بارہ ہزار تین سو چھوکریاں، عورتاں کے کتب خانے ہفتہ کو آٹھ پنس اور مردوں کے کتب خانے گیارہ پنس فی آسامی دیتا ہے۔

۱۸ اپریل ۱۸۴۳ء

خبر مدراس | منگل کے دن صبح کے وقت دو ہندو کے چھوکرے اپنے مذہب کو چھوڑ کر پادری انڈرسن صاحب کے ترغیب سے کرسٹان ہوئے اس وقت یہ خبر سن کر دیول کے جا۔ دلیاری میں بڑی اژدحام جمع ہوئی۔ لیکن پولس کے چپراسیوں نے ان سب کو نکال دیے۔ اور اس تمام امر پولیس کے جوانوں کو یہی کام تھا۔ کہ لوگوں کو وہاں سے نکالتے تھے۔

۱۸ اپریل ۱۸۴۳ء

خبر مصر | کہتے ہیں کہ محمد علی مصر کے والی اور اُنوں کے فرزند ابراہیم ایک مجلس میں جمع ہو کے بہت دیر تک مہم مملکت میں مشورت کیئے۔ عباس کی شادی اسکندریہ کی دیار میں ہوگی۔ فوزان لوبہ کے تمامی رعیت دشمنان وا و باشان کو بغاوت کی ترغیب دئیے ہیں۔ اور خراج واجب نہیں دیے۔ اس سبب سے ترکوں کو بہت سا نقصان ہوا ہے۔ سنبار کا حاکم ترکوں کا لشکر لیکے اس طرف روانہ ہوا ہے۔ خردمندوں کو یہ یقین ہوا ہے کہ باغیوں کو گوشمالی بواجبی ہووے گی۔ کس واسطے کہ ترکاں ہمت و قوت آثار رکھتے ہیں جو لکھنے میں نہیں سکتا ہے۔ ایک لحظہ میں تمام شہروں کو غارت کریں گے۔ کہ انگریز لوگ یہ ارادہ ہے کہ سویس سے دیار میدی تک ایک نالہ کھود کے پانی لاویں تا اس میں جہازاں روانہ کرے گر مصر کے والی راضی نہیں ہوئے ہیں۔ شاید انگلستان کے حضور سے بہتر تحائف والی مصر کے واسطے بھیجا جاویں گے۔ ایک قافلہ سوریا ودی نس کی طرف روانہ ہوا ہے اس کے حفاظت کے واسطے ترکاں مامور ہوئے ہیں اور ارتن بی اسی قافلے کا میر ہیں کہ سرف افندی کو عالی منصب کو پہنچائے۔

۱۵ اپریل ۱۸۴۳ء

خبر حیدرآباد | سننے میں آیا کہ لشکر کے چودہ مہینوں کی تنخواہ سے چار مہینوں کا درمہ بندگان عالی کی سرکار سے دینے کے لئے حکم صادر ہوا۔ مارچ کی ۱۲ ویں تاریخ کو سرج الدولہ بہادر ۵ لاکھ روپے خزانے سے راجہ رام بخش کو دیئے۔ تمام شہر میں افواہ ہے کہ راجہ چندو لعل دیوانی کی خلعت اپنے فرزند راجہ بالا پرشاد یا ان کے بیٹے راجہ نارائن پرشاد کو ہونا چاہتے ہیں ——— بالا پرشاد کا بیٹا پندرہ برس کی عمر کا ہے۔ لیکن بہت زیرک اور ہوشیار اور بالا پرشاد کی عمر چالیس برس کی ہے۔ مگر بہت متحمل اور زر و جواہر و دولت میں کروڑوں روپے کے موجود۔ ۲۲ ویں مارچ کو جشن نوروز ہوا۔ اہل قلم اور شمشیر دستور کے موافق سرخ لباس پہنے ہوئے تھے۔ راجہ رام بخش کو خلعت فاخرہ اور چند رقم جواہرا اور بازوبند مرصع کے انعام دے کے سرفراز فرمائے۔

۲۲ اپریل ۱۸۴۳ء

جواب میں مصرعۂ شاد دہلی کے سید قطب الدین المتخلص لطیف مدراسی آٹھ مصرعۂ رنگین کہ ہر مصرع اس کا کالبسوت حدیقہ ثانیہ ہے واسطے نظارہ گلزار معانی کے بیچ جلوہ ظہور کے لائے نامراخان جواہر سخن اس کلام مدن۔

لطیف کو پرکین

قلم تراش سے مت استخواں تراش کے پھینک

رواں نہ ہو تو قلم کی زباں تراش کے پھینک

اگر بہار کی رکھتا ہے آرزو دل میں
تو گل کے واسطے شاخ خزاں تراش کے پھینک
یہ تیر عشق نہ پہنچے اگر نشانے تک
تو توڑ تاڑ کے تیر و کماں تراش کے پھینک
تجھے قسم ہے مرے عشق کی ارے آذر
تو مت صنم کے مقابل بتاں تراش کے پھینک
لکھا لطیف کو شاہ ظفر یہی مصرع
قلم تراش سے مت استخواں تراش کے پھینک
۱۱ مارچ ۱۸۴۳ء

جہاں تک راقم الحروف نے تحقیق کی ہے اس سے پتہ چلتا ہے کہ دہلی کا "اردو اخبار" جو سب سے پہلا اردو اخبار ہے۔ اس کی کوئی جلد ۱۸۴۳ء کے پہلے کی محفوظ نہیں۔ شاید ۱۸۴۴ء کے بعد کے چند پرچے مختلف مقامات پر محفوظ ہیں۔ اس بنا پر اگر ہم "جامع الاخبار" کو "اردو اخبار" پر ترجیح دیں تو مناسب ہے۔

احمد عبدالخالق

ساون

جوش انگوری سے ہے تقدیر میخانہ جواں　　تابش یاقوت سے ہے رنگ پیمانہ جواں
ابر باراں کی زمیں افروز فیاضی سے آج　　تارک دنیا کا بھی ہے صحن ویرانہ جواں
اس طرح ہے صبح صحرا میں جواہر کی دمک　　جیسے شبنم خانے میں حسن پریخانہ جواں
سنبل و ریحاں میں شاخ یاسمن ہے عطر ریز　　اس کی خوشبو سے ہے ذوق وجد مستانہ جواں
ہے کنول کا سینۂ شاداب وہ تابش لئے　　جس کی ہر لرزش میں ہے الفت کا افسانہ جواں
وادیٔ گلرنگ اور ابر زمرد فام سے　　مدیہ ہے خضر کا ہے علم پیرانہ جواں
لرزش سیماب ہے دوشیزگی کے دل میں آج　　حسن کی یعنی ہوئی ہے عمر دیوانہ جواں
طلعت ناہید کی قیمت ہوا اس کی، جس کے ہاں　　زلف عنبر ریز کے صدقے سے ہے شانہ جواں
جنگلوں کی ہر فضا میں ہے یہ موج حسن اور　　ہو رہا ہے شہر میں اک حسن فرزانہ جواں

ملا رموزی

نئی کتابیں

۱۔ اسباق حیاتیات۔ از پروفیسر شاہ محمود و پروفیسر محشر عابدی قیمت عا۔ کتب خانہ انجمن ترقی اردو۔ عابد روڈ۔ حیدرآباد دکن

۲۔ تعلیمی خطبات۔ از ڈاکٹر ذاکر حسین قیمت عہ۔ مکتبہ جامعہ۔ دہلی۔

۳۔ ہم کیسے پڑھائیں ؟ از سلامت اللہ ایم اے۔ بی۔ ٹی قیمت عہ۔ مکتبہ جامعہ دہلی

۴۔ بیان حضور (منظوم سیرت) از بہزاد لکھنوی ۱۹۲ صفحے قیمت عہ۔ ساقی بکڈپو۔ دہلی۔

۵۔ موج نور (گیتوں کا مجموعہ) از بہزاد لکھنوی ۱۱۲ " " ۱۲ " "

۶۔ فاسزم (ہیرلڈ لاسکی کی کتاب کا ترجمہ) از باری ۹۲ صفحے۔ مکتبہ اردو لاہور۔

۷۔ نظام آباد (نظام آباد کے تاریخی حالات) از غلام احمد نائیطی وکیل ۲۶۰ صفحے۔ مکتبۂ ابراہیمیہ عابد روڈ حیدرآباد دکن۔

۸۔ خلافت مبشرہ از صدیق دیندار چن بسویشور۔ ۴۸ صفحے۔ خانقاہ سرور عالم آصف نگر۔ حیدرآباد دکن۔

۹۔ نقاریر جناح مترجمہ عثمان صحرائی قیمت عا۔ دارالاشاعت سیاسیہ اشاعت منزل۔ اردو گلی۔ حیدرآباد دکن۔

۱۰۔ مسائل انقلاب ہند از ایم۔ این رائے قیمت ۸ر۔ آندھرا پبلشنگ کمپنی۔ سلطان بازار۔ " "

۱۱۔ ناکام (ادبی افسانہ) از خواجہ محمد شفیع بی اے از مصنف۔ ٹیا محل۔ دہلی۔

۱۲۔ نئے ادبی رجحانات۔ از پروفیسر سید اعجاز حسین قیمت ۳ے۔ سید انصار حسین "نشیمن"، منٹو روڈ۔ الہ آباد۔

۱۳۔ جمال کشمیر (نظم) از منشی بابو رام ایڈوکیٹ قیمت ۱۲ر از مصنف۔ فرخ آباد۔ یو۔ پی۔

۱۴۔ واردات (مجموعہ کلام) از پنڈت دتاتریہ کیفی۔ دہلوی ۱۱۵ صفحے قیمت ۱ے۔ رام لال سوری اینڈ سنز۔ انارکلی۔ لاہور۔

۱۵۔ کامیاب زندگی مترجمہ محمد اقبال سلمانی ۱۰۵ صفحے قیمت عہ۔ دفتر امت مسلمہ۔ توحید باغ۔ امرتسر۔

۱۶۔ لالہ زار (ادبی مضامین) از محمودہ رضویہ قیمت عہ۔ انجمن ترقی اردو۔ کراچی۔

۱۷۔ چراغ لالہ۔ (مجموعۂ کلام) از صائب عاصمی قیمت عہ۔ عطر چند کپور چند۔ میکلوڈ روڈ۔ لاہور

۱۸۔ ثروت آرا بیگم (اخلاقی ناول) از حمیدہ سلطان قیمت عا۔ مکتبۂ ساغر۔ ادبی مرکز۔ میرٹھ۔

۱۹۔ چوٹیں (مجموعہ مضامین) از عصمت چغتائی قیمت عا۔ ساقی بکڈپو۔ دہلی

۲۰۔ گزرگاہ خیال (افسانے) از ظفر قریشی دہلوی قیمت عہ۔ " "

۲۱۔ دیہاتی دنیا (نظمیں) از امرناتھ موہن بی اے۔ ایل۔ ایل۔ بی۔ قیمت ۱۲ر از مصنف دفتر کمشنر صاحب لاہور۔

۲۲۔ اصلاح تلفظ (عربی۔ فارسی اور ہندی الفاظ کے تلفظ کے طریقے) از ابوالخیر صدیقی۔ ۱۶ صفحے قیمت۔ ا۔ مکتبۂ شرقیہ۔ سیالکوٹ۔

۲۳۔ آخری فیصلہ۔ (اخلاقی ناول) از کیسی رام پوری قیمت عہ۔ کتابستان نمبر ۲۱۹۴۳۔ بمبئی نمبر ۳۔

۲۴۔ کرنیں (افسانے) از ڈاکٹر شفیق الرحمٰن قیمت عا۔ مکتبۂ اردو۔ لاہور۔

۲۵۔ پبلسٹی مشاعرہ (گورکھپور کے مشاعرہ کی اردو ہندی نظمیں) مرتبہ حبیب احمد صدیقی سول ڈیفنس مجسٹریٹ گورکھپور۔ ۲۰۰ صفحے انتخاب مرتب۔

۲۶۔ دل کی آواز (اخلاقی ناول) از کیسی رام پوری قیمت عہ کتابستان نمبر ۲۱۹۴۳۔ بمبئی نمبر ۳۔

۲۷۔ سوز و ساز (افسانے) از محمودہ رضویہ قیمت عہ۔ اردو کتب خانہ۔ انجمن ترقی اردو کراچی۔

مرزا سیف علیخاں

ساقی!

مرے ساقی! میں جینا چاہتا ہوں!
مٹا کر یہ غم و آلامِ عشرت
بجھا کر آتشِ فکرِ معیشت
تمنا ہے، خوشی کے گیت گاؤں
گزشتہ زندگی کو بھول جاؤں
خمار و کیفِ مینا چاہتا ہوں
اٹھا ساغر کہ پینا چاہتا ہوں

سناؤں کیا تجھے اپنا فسانہ؟
شکستہ حال ہوں، برباد ہوں میں
ملول و غمزدہ، ناشاد ہوں میں
مسلسل چوٹ دل پر کھا رہا ہوں
ہجومِ یاس میں گھبرا رہا ہوں!
سنبھلنے ہی نہیں دیتا زمانہ
اٹھا ساغر کہ پینا چاہتا ہوں

مری حسرت کو پھلنے پھولنے دے
یہ قومیت، تمدن کے یہ پرچم
یہ اہلِ زر کی زرداری کا عالم
یہ ویرانی غلاموں کی نظر کی
یہ خستہ حالیاں نوعِ بشر کی
گھڑی بھر کے لئے تو بھولنے دے
اٹھا ساغر کہ پینا چاہتا ہوں

یہ خوں روتے ہوئے منظر جہاں کے
رلا کے ہیں مجھے بھی، رو رہا ہوں
اسیرِ درد و وحشت ہو رہا ہوں
گنہگاروں نے اک محفل سجائی
ابھی محوِ تجاہل ہے خدائی
نہ دیکھے جائیں گے تیور جہاں کے
اٹھا ساغر کہ پینا چاہتا ہوں

تحسین سروری

پرینڈہ

پرینڈہ ضلع عثمان آباد کا ایک تعلقہ ہے جو علاقہ شاہی سے ملحق ہے۔ یہاں سے بیس میل کے فاصلے پر بارسی علاقہ عظمت مدار واقع ہے جہاں کی تجارتی منڈی مشہور ہے۔ علاقہ عالی کا شہر ہونے کے باوجود یہاں سکہ کلدار کا چلن ہے۔ جس سے ملازمین کو سخت تکلیف ہوتی ہے۔

یہ شہر ازمنۂ قدیم سے تعلق رکھتا ہے۔ یہاں ایک قلعہ بھی ہے جس کو ایک ہندو راجہ نے بنایا تھا۔ قلعہ کے گرد ایک بڑی فصیل ہے جو مضبوط ہے اور اس میں چھوٹے بڑے تقریباً ۳۶ برج ہیں جن کے اطراف ایک چوڑی اور گہری خندق ہے لیکن اب یہ جا بجا سے ٹوٹ گئی ہے اس خندق میں پانی آنے کی دو نالیاں بنی ہوئی ہیں لیکن اب پانی بند ہے۔ اس میں دو باولیاں بھی ہیں۔ اندرون قلعہ سولہ برج ہیں جن میں سے چار برج مشہور ہیں اور ان پر توپیں بھی رکھی ہوئی ہیں جو یہ ہیں۔

(۱) شمال و مشرق کے بلند برج پر ایک توپ ہے جس کو "ملک میدان توپ" کہتے ہیں۔ اس توپ کا طول تقریباً ۱۵ فٹ کان کے پاس کا دور تقریباً ۸½ فٹ درمیانی دور ۷ فٹ اور دہانے کا قطر تقریباً ۲ فٹ ۱۰ انچ ہے توپ کے بیچ میں دو شیر بنے ہوئے ہیں۔ اس توپ پر ایک نشان بھی ہے جس سے معلوم ہوتا ہے کہ جنگ میں اس پر گولہ بھی لگا تھا۔ توپ کے دہانے کے گرد یہ اشعار لکھے ہوئے ہیں ؎

تا مراجی خند تعلیم از لبِ دلبر گرفت
آتشے جست از جہان وا و بہ مجلس در گرفت

زبسکہ اخگر غم پہ بود درونِ تنم !!
چہ کوزہ می زند آتش زبانہ از دہنم !

دہانے کے سامنے گرداگرد یہ اور ایک شعر لکھا ہوا ہے۔

بہر میداں بیک گولہ دو صد صف در شکن دارم
حذر کن اے غنیم از من کہ آتش در دہن دارم

توپ پر شہنشاہ عالم گیر کا نام کندہ ہے۔

محمد

ابوالظفر الدین محی
اورنگ زیب بہادر عالمگیر
بادشاہ غازی
خمسہ و سبعین (یعنی ۱۰۷۵ھ)

جلوس ۷ سنہ

ملک میدان توپ عمل عرب محمد حسین

گولہ یک من و دار و سیزہ آثار دیک پاؤ بوزن شاہ جہانی۔ جب ۱۶۳۲ء محمد عادل شاہ نے آقا رضوان[1] قلعہ دار سے قلعہ فتح کرلیا تو بادشاہ نے اس فتح کی یادگار میں مرار راؤ کو حکم دیا کہ توپ بیجاپور پہنچادی جائے۔ چنانچہ اسی حکم کے موجب یہ توپ بیجاپور لے جائی گئی اور ۵ اصفر ۱۰۴۱ھ شرزہ برج پر چڑھائی گئی۔ یہ توپ احمد نگر سے پرینڈہ اور پرینڈہ سے بیجاپور اور بیجاپور سے تالیکوٹہ (۱۵۶۵ء) میں دیئے

---

[1] آقا رضوان برہان نظام شاہ کی طرف سے قلعہ دار تھا اور اسی نے قلعہ پرینڈہ کو عادل شاہیوں کے سپرد کر دیا (تاریخ بیجاپور)

بیجاو کرشنا عبور کرکے لے جائی گئی اور پھر اپنے مرگز پر لائی گئی۔ تعجب تو یہ ہے کہ اس زمانے میں آمد و رفت کے ذرائع وسیع نہیں تھے لیکن جنگی کام عجلت سے کئے جاتے تھے۔

(۲) دوسرا برج نوسیدوں کا کہلاتا ہے۔ یہاں ایک چبوترہ ہے جس پر نو مزاریں ہیں اور یہی نوسید کہلاتے ہیں۔ یہ برج "ملک میدان توپ" کے جنوب مغرب میں واقع ہے۔ اس برج پر بھی توپ ہے جو "اژدہا پیکر" کے نام سے مشہور ہے۔ اس توپ پر حسب ذیل عبارت کندہ ہے۔

۱۰۷۲ھ

توپ اژدہا پیکر عالمگیر بادشاہ غازی اورنگ زیب بہادر۔ جلوس میمنت مانوس سنہ ۴ عمل محمد حسین عرب۔ گولہ بست آثار و دارو شش و سی دام بوزن شاہ جہانی۔

اس توپ کی لمبائی ۱۷ فٹ ۶ انچ ہے اور اس کے کان کے پاس کا دور ۷ فٹ ۱ انچ اور درمیانی دور ۵ فٹ ۹ انچ اور دہانے کا دور ۴ فٹ ۳ انچ ہے۔

(۳) تیسرا برج چینجل برج کہلاتا ہے جو مشرقی و جنوبی رخ پر واقع ہے یہاں بھی ایک توپ ہے جس پر بہ خط انگریزی حسب ذیل الفاظ کندہ ہیں۔



EVER HARD V·S. LINTER RME. ENCHV.

اس توپ کا طول ۱۰ فٹ ۸ انچ ہے اور کان کے پاس کا دور ۵ فٹ اور دہانہ کا دور ۴ فٹ ۷ انچ ہے۔

(۴) چوتھا برج مغرب و شمالی رخ پر ہے۔ یہاں بھی ایک ایک توپ ہے جس کو "لانڈے قصاب کی توپ" کہتے ہیں۔ اس توپ پر کوئی عبارت کندہ نہیں ہے۔ اس توپ کا طول ۸ ا فٹ ۲ انچ ہے اور کان کے پاس کا دور ۷ فٹ ۷ انچ اور دہانے کا دور ۶ فٹ ۱۱ انچ ہے۔

(الف) اندرون قلعہ ایک پختہ مسجد ہے۔ اس مسجد میں دو دروازے ہیں صحن میں حوض ہے جس میں ایک چشمے سے پانی آتا ہے جو مسجد کے قریب ہی جانب جنوب واقع ہے۔ مسجد کے نیچے تہہ خانہ ہے جس میں توپوں کے گولے رکھے ہوئے نظر آتے ہیں۔ مسجد کے سامنے قلعہ کی فصیل میں دو کمانیں ہیں ایک کمان میں پیر فولادی اور دوسری میں باولے پیر کی مزاریں ہیں اور اس کے جانب جنوب قلعہ کی فصیل میں چھوٹی سی بارہ دری ہے جو "قلمدان" کے نام سے مشہور ہے۔ حقیقت ہے کہ یہ بارہ دری قلمدان جیسی بنائی گئی ہے۔ اس کے جانب شمال دو منزلہ مسجد ہے جس کو "شمشیر مسجد" کہتے ہیں۔

(ب) اندرون قلعہ نرسنہواں دیو کا دیول بھی ہے۔ اس کے سامنے ایک گری ہوئی عمارت ہے سنا جاتا ہے کہ یہاں "منڈپ" تھا۔ اس دیول کے متصل جانب جنوب ایک مکان ہے لیکن شکستہ۔ مکان میں ایک کمان جانب مشرق ہے جس میں سنا گیا کہ بارود بھری ہوئی ہے۔ یہیں ایک باولی ہے جس کو "رام تیرتھ" کی باولی کہتے ہیں۔ اس باولی کے اندر ۱۰ کمانیں ہیں۔ باولی کی سیڑھیاں جا بجا سے ٹوٹ گئی ہیں۔ باولی کے نزدیک ہی ایک مکان پختہ ہے۔ اس مکان کے سامنے ایک عمارت چار کمانوں کی بنی ہوئی ہے۔ پائیں میں ایک باغ ہے جس کی روشیں اور کیاریاں اور حوض موجود ہیں لیکن یہ سب کے سب ویران حالت میں ہیں۔ اس مکان کے نیچے تہہ خانہ ہے جہاں معلوم ہوا کہ گندھک بھری ہوئی ہے۔ اسی کے متصل ایک کتبہ ہے جس کے پڑھنے سے پتہ چلتا ہے کہ خان علی نے سنہ ۱۱۱۱ھ میں بنوایا تھا۔

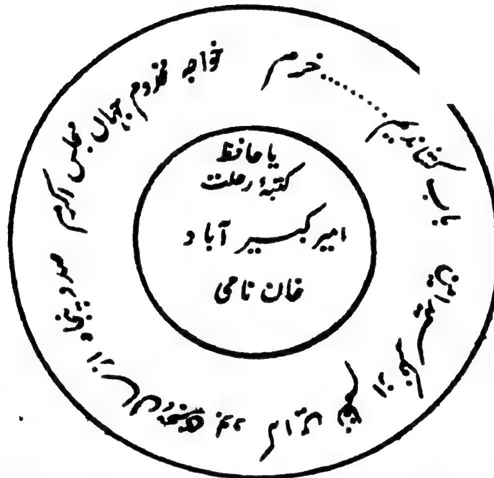
خان عالی مکان عزت خاں | کردہ احداث گلشن رنگین | وہ جو گلشن خورنق ثانی! | ہر گلشن خار دیدۂ جنت

قمری و عندلیب می خوانند | وہ چو گلشن نشان خلد بریں | سنبلش رشک زلف حورالعین | حبذا فرخا مکان و مکیں

گفت بالفظ نیک تاریخش | فکر فاتح بہشت روئے زمین ۱۱۱۱ھ

اس مکان کے مشرق کی جانب ۱۲۸۹ف میں کچہری تیار کی گئی تھی جو شکستہ ہوگئی ہے۔ اس کے جانب مغرب ایک مکان ہے جو ۱۲۸۰ف میں تیار ہوا کچہری کے سامنے ایک قدیم دروازہ ہے جو شکستہ ہے۔ سنا جاتا ہے کہ دروازے کے سامنے ایک گھی کا حوض بھی تھا۔

(ج) کچہری کے جانب شمال دو بلند تہہ خانے ہیں۔ اس کے مشرق میں ایک چھوٹی سی کمان میں حضرت محبوب سبحانیؒ کا چلہ ہے۔ اس کے قریب ایک بلند دروازہ ہے جس پر یہ کتبہ ہے۔



شہر پرینڈہ کا قلعہ تاریخی لحاظ سے اہم ہے۔ مغلوں کو رسد اسی قلعہ سے جاتی تھی۔ چنانچہ جب دلیر خاں نے سیواجی پر بمقام بھوپال گڑھ مقابلہ کیا اور صبح سے دوپہر تک قلعہ فتح کرلیا۔ اس عرصے میں باجی راؤ اور ایرج خاں مغلوں کے لئے رسد اسی قلعہ (پرینڈہ) سے لئے چلے جارہے تھے کہ راستے میں سیواجی کی فوج نے چاروں طرف سے گھیر لیا۔ دلیر خاں نے اخلاص خاں کو پندرہ سو سوار دے کر ایرج خاں کی مدد کو روانہ کیا اور اس قلعہ سے بارہ میل کے فاصلے پر دونوں میں لڑائی ہوئی اور اس لڑائی میں سیواجی کے ایک ہزار آدمی کام آئے۔ دلیر خاں نے سرفراز خاں اور لطیف خاں کو امداد کے لئے بھیجا۔ آخرش سیواجی کے لشکر کو شکست کا سامنا کرنا پڑا اور دلیر خاں نے کچھ میل تک ہزیمت خوردہ لشکر کا تعاقب کیا اور واپسی میں بھوپال گڑھ آیا اور قلعہ کو زمین کے برابر مسمار کردیا۔

(۱) شاہ جہاں اور عادل شاہ کے عہد نامہ ماہ ذیحجہ ۱۰۴۵ھ میں اس قلعہ کا بھی تذکرہ ہے چنانچہ اس قلعہ کو معاہدہ کی رو سے عادل شاہ کے قبضے ہی میں رکھا گیا۔

(۲) اسی قلعہ میں ملک عنبر[1] نے مرتضیٰ نظام شاہ دوم کی تاج پوشی کا اعلان ۱۰۰۹ھ میں کیا۔

[1] سب رس دکن نمبر

(۳) یہاں کے محال کے متعلق مولف گلزار آصفیہ نے صفحہ ۵۱۶ میں تحریر کیا کہ۔

"نوزدہ محال کاملش چہار دہ لک و بست و ہشت ہزار و دو صد و شانزدہ روپیہ پاؤ کم سیزدہ آنہ"

بیرون آبادی حضرت شاہ بدھ الدین چشتیؒ کی مزار پوسہ گاہ عالم ہے۔ آپ حضرت نظام الدین اولیاؒ بدایونی کے مرید و خلیفہ ہیں آپ حضرت خواجہ منتجب الدینؒ یا حضرت خواجہ برہان الدین غریبؒ کے ہمراہ دہلی سے دولت آباد تشریف لائے۔ آپ نے بعد حکم مرشد تبلیغ اسلام کے لئے کافروں کے ساتھ سخت لڑائی کی جس میں آپ شہید ہوئے اور سر مبارک قصبہ مین ضلع کوکن میں جسم اطہر سے علحدہ ہوا لیکن آپ اتنے نشۂ بے خودی میں مست تھے کہ تن آپ کا مقابلہ کرتا ہوا اور ہزاروں کافروں کو تہ تیغ کرتا ہوا پرینڈہ کے نزدیک ہی پہنچا تھا کہ ایک عورت نے آپ کے تن مبارک کو دیکھ کر یہ کہا کہ "عجیب مرد ہے کہ بے سر لڑتا چلا آتا ہے" اسی وقت آپ کی لاش مبارک کو زمین نے اپنی گود میں لے لیا۔

آپ بقول مصنف سیر الاولیا ۷۳۵ھ میں شہید ہوئے۔

قاضی سراج الدین احمد نیر (کیجی)

وہ نو بہارِ ناز

جھونکا نسیمِ صبح کا بن کر گزر گئی !　　وہ نو بہارِ ناز اِدھر سے اُدھر گئی

اک فتنہ باغ کی روشوں سے گزر گیا　　اک رودِ نور صحن چمن سے گزر گئی

آنکھوں نے اس کی راہ میں سجدے بچھا دیے　　حیراں نگاہ ساتھ گئی وہ جدھر گئی

گستاخ ڈالیاں ہوئیں جب اس کی شاخ گیر　　ہر بلبل اس کا پھول سا منہ چوم کر گئی

اک شرمگیں ادا تھی کہ آنکھوں میں بس گئی !　　اک سرمگیں نگہ تھی کہ دل میں اتر گئی

چھائی تھی سرو قد پہ جوانی کی وہ بہار　　قمری اک اس کے ساتھ گئی وہ جدھر گئی

اللہ رے اس کے حسن کی رعب آفرینیاں　　ہر آرزوئے شوخ قریب آ کے ڈر گئی

دیوانہ وار اس کی محبت کے جوش میں
ساتھ اس کے عاشقی بھی گئی وہ جدھر گئی

راجہ مہدی علی خاں

سراج کا تغزّل

سراج نے اورنگ آباد کے مردم خیز خطہ میں جنم لیا اور اردو زبان کی خوش قسمتی ہے کہ اسکو اپنے ایام طفولیت ہی میں بلند پایہ اہل سخن کی سرپرستی حاصل رہی ولی اور سراج اردو کے مقبول ترین شاعروں میں گنے جاتے ہیں ولی کی شاعری سے قطع نظر سراج کی شاعری نے واقعتاً اُردو زبان کی صحیح معنوں میں آبیاری کی ہے، تعجب ہوتا ہے کہ آج سے تین سو سال قبل سراج نے اتنی منجھی ہوئی زبان لکھی ہے کہ آج بھی ان کے اشعار اردو زبان کے بلند پایہ اشعار میں شمار کئے جاتے ہیں، سراج کی شاعری میں نہ صرف زبان کی چاشنی ہے بلکہ تغزل کی وہ رنگ رلیاں ہیں جو دل کو موہ لیتی ہیں۔

سراج کے کلام نے اردو شاعری کے دھارے کو اس جانب موڑ دیا جہاں تصوف، تغزل اور تخیل کی جدت طرازیاں ہیں، سراج کی شاعری سے سمجھنا چاہئے کہ اردو نے یہیں سے ترقی کی طرف قدم اٹھانا شروع کر دیئے اور آج وہ اس منزل پر ہے کہ ہندوستان کی قدیم زبانیں بھی مثلاً سنسکرت اور بھاشا وغیرہ پس منظر میں آگئی ہیں۔

سراج نے باوجود زبان کی کوتاہ دامنی کے زبان و بیان میں ایسی رنگینی پیدا کر دی ہے جو صرف استادوں ہی کے حصے میں آئی ہے، فرماتے ہیں ؎

تیلی ہماری نین جھروکے میں بیٹھ کر!! بے کل ہو جھانکتی ہے پیارا کب آئے گا

سراج کی غزلیات میں زبان کی مٹھاس اور طرز بیان کی دلاویزی کے ساتھ ساتھ عمدہ تغزل کی جھلکیاں ہر جگہ نمایاں ہیں اور دقیق مطالعہ سے پتہ چلتا ہے کہ ہمارے اکثر و بیشتر شاعروں نے یہیں سے خوشہ چینی کی ہے۔ سراج فرماتے ہیں ؎

مت کرو شمع کو بدنام جلاتی وہ نہیں آپ سیں شوق پتنگوں کو ہے جل جانے کا

ذوق نے اسی خیال کو یوں ادا کیا ہے ؎

شمع نے آگ رکھی سر پہ قسم کھانے کو بخدا میں نے جلایا نہیں پروانے کو

سراج اور غالب کے کلام کا اگر یکجا مطالعہ کیا جائے تو نہ صرف کئی خوبیاں مشترک نظر آتی ہیں، بلکہ کئی مضامین ہیں جو انداز بیان کی تبدیلی کے ساتھ دونوں کے پاس موجود ہیں۔ سراج کہتے ہیں ؎ آیا ہے سیرِ باغ کو دونوں بہارِ حسن ہر پھول داغِ دل کو دکھاوے تو کیا عجب

غالب کے ایک شعر کی بنیادیں بھی اسی مطلب پر رکھی گئی ہیں ؎ انہیں منظور اپنے زخمیوں کو دیکھ آنا تھا اٹھے سیرِ چمن کو دیکھنا شوخی بہانے کی

معشوق کے قد و قامت کو غالب اور سراج نے ایک ہی زاویۂ نگاہ سے دیکھا اسی لئے تو دونوں کا رنگ بھی ایک ہو گیا۔ غالب کہتے ہیں ؎

ترے سرو قامت سے اک قدِ آدم قیامت کے فتنے کو کم دیکھتے ہیں

سراج فرماتے ہیں ؎ اے سروِ گلستاں لوا راست ہے یہ بات ہے پست ترے قدستی بالائے قیامت

محبوب کا گھر بھی عاشق کے لئے جنت سے کم نہیں اور اس نظریہ کو ہمارے دونوں استاد اپنے اپنے رنگ میں یوں ادا کرتے ہیں ؎

ہر ایک نقشِ قدم کو پوجتا ہے پھول کی پنکھڑی گزر تیری گلی میں جو کیا باغِ ارم بھولا

غالب نے اس خیال کو ملتی جلتی ہے کہیں سے کہیں پہنچا دیا ؎ کیا ہی رضوان سے لڑائی ہوگی خلد میں گر ترا گھر یاد آیا

کہ شاعرانہ غزل کی خوبی ہے اور اگر غالب نے اس کو یوں نباہا ہے کہ ؎

بہرا ہوں میں تو چاہئے دونا ہو التفات — سنتا نہیں ہوں بات مکرّر کہے بغیر

تو سراج کے پاس یہ خوبی اس طرح جلوہ گر ہے کہ ؎ مجھے نگاہِ تغافل رقیب پر الطاف — ادائے مصلحت آمیز نے غلام کیا

غالب نے ایک جگہ کہا ہے مرگیا صدمۂ یک جنبشِ لب سے غالب — ناتوانی سے حریفِ دمِ عیسیٰ نہ ہوا

اس شعر کو پڑھنے میں سراج کا یہ شعر ذہن میں گھومنے لگتا ہے ؎ کیا ہوا اگر روح بخشی کا عیسیٰ تھا سراج — عشق کے خنجر کے مارے کوں جلانا کیا سکت

فلسفۂ زندگی دونوں کا ایک ہے۔ غالب کہتے ہیں ؎ قیدِ حیات و بندِ غم اصل میں دونوں ایک ہیں — موت سے پہلے آدمی غم سے نجات پائے کیوں

سراج یوں گویا ہوتے ہیں ؎ زندگی اے سراج ! ماتم ہے — مجکوں شمعِ مزار کی سوگند

تکرار بھی شعر کا حسن ہے مثلاً غالب کا یہ شعر ؎ کہا تم نے کہ کیوں ہو غیر کے ملنے میں رسوائی — بجا کہتے ہو سچ کہتے ہو پھر کہیو کہ ہاں کیوں ہو

سراج کے پاس "حسن تکرار" کا انداز ملاحظہ ہو ؎ آشنائی سے وگرنہ مجلسِ عشاق میں — ظلم ہے غم ہے، قیامت ہے اے صنم

سلف شور قیامت کیوں نہ ہوئے بھولو گر — لب بلا ابرو بلا بالا بلا سین کم نہیں — ہم شہیدوں پر ستم جتنے رہے — خوب کرتے ہو بجا کرتے ہو تم !!

مضمون آفرینی میں سراج، غالب سے کسی طرح کم نہیں اور ان دونوں کے خیالات بسا اوقات ایک ہی مرکز پر پہنچ کر ٹکراتے نظر آتے ہیں ۔

سراج کا ایک شعر ؎ جس کوں راہِ چشم سے خونِ جگر جاری نہیں — یوں ہوا معلوم اس کوں زخمِ غم کاری نہیں

غالب نے بالکل یہی خیال دوسرے انداز میں باندھا ہے ؎

رگوں میں دوڑتے پھرنے کے ہم نہیں قائل — جو آنکھ ہی سے نہ ٹپکے تو وہ لہو کیا ہے

سراج کے پاس بھی "ہر رنگ میں بہار کا اثبات" موجود ہے، فرماتے ہیں ؎

گلشنِ شوق میں ہوں مست مئے یک رنگی — پھول کوں ساغرِ مئے — کو ضیا سمجھوں

مضامین کے اس تصادم کا بھی لطف اٹھائیے، غالب کہتے ہیں ؎

نہیں کچھ سبحہ و زنار کے پھندے میں گیرائی — وفاداری میں شیخ و برہمن کی آزمائش ہے

اور سراج کہتے ہیں ؎ مشربِ عشق میں ہیں شیخ و برہمن یکساں — رشتۂ سبحہ و زنار کو کوئی کیا جانے

جذبۂ عشق انسان کے ضمیر میں گندھا ہوا ہے اور عشق کا یہ خونیں رنگ اردو شاعری میں رچ گیا ہے، غم و اندوہ عشق کا لازمہ ہے، اور غم کی بجلیاں ہمارے شعراء کے کلام میں ہر جگہ تڑپتی نظر آتی ہیں، بالخصوص میر کا کلام واردات قلبی کی سچی داستان ہے۔ سراج کے کلام میں بھی رنج و غم کی یہ لہریں رقص کناں نہیں اور بروگ کی یہ دھیمی آگ عاشق کے دل کو جھلس نہیں دیتی، نور بخشتی رہتی ہے، عشق کا کمال یہی ہے کہ عاشق اس مقام سے بات کرے جس کے لئے غالب نے کہا ہے ؎

ہم وہاں ہیں جہاں سے ہم کو بھی — کچھ ہماری خبر نہیں آتی

یہی بے خودی سراج کے شعروں میں موجود ہے ؎

خبر تحیرِ عشق سن نہ جنوں رہا نہ پری رہی ! — نہ تو تو رہا نہ تو میں رہا جو رہی سو بے خبری رہی

شعر لے خودی نے عطا کیا مجھے وہ لباس برہنگی ! ۔ نہ خرد کی بخیہ گری رہی نہ جنوں کی پردہ دری رہی

سراج دل اور غم کو لازم و ملزوم نہیں ایک ہی سمجھتے ہیں ان کے نزدیک غم ہی کا دوسرا نام دل ہے، فرماتے ہیں ؎

چلی سمتِ غیب سے کیا ہوا کہ چمن سرور کا جل گیا! ۔ مگر ایک شاخِ نہالِ غم جسے دل کہیں سو ہری رہی

غزل کی خوبی یہی ہے کہ کوئی ایسی بات کہی جائے جو باوجود مبالغہ کے دل کو بھا جائے سراج کی غزلوں میں ہر جگہ یہ لہر موجود ہے، فرماتے ہیں ؎

آہِ سوزاں سے مری دامنِ صحرا میں سراج ۔ قبرِ مجنوں پہ چراغاں نہ ہوا تھا سو ہوا

سراج کے کلام پر نظرِ غائر ڈالی جائے تو پتہ چلتا ہے کہ سراج نے غالب کی طرح ہر زمین میں اپنے خیالات کو ادا کیا ہے، انھوں نے سخت سے سخت زمین میں شعر کہہ کر اپنی قادر الکلامی کا لوہا منوایا ہے اور ساتھ ہی ساتھ ان کے پاس نہایت ہی لطیف بحریں ہیں۔ جن میں الفاظ کچھ اس خوبی سے جڑ دئے گئے ہیں کہ شعر مترنم ساز کی طرح بولنے لگتا ہے فرماتے ہیں ؎

تری چشم حیراں کے دہن میں ظالم ۔ توجہ تری بے نیازی کا کیا ہے ۔ اگر دیکھنا ہے تو دیکھ آئنے میں ۔ خدائی و پیغمبری کا تماشا !

نہ جنگل میں تسکین دل ہے میسر ! ۔ نہ دریا کے دیکھے خوشی جی کو حاصل ۔ مری آہِ سوزاں و اشک رواں میں ۔ ہے خشکی کا سیر اور تری کا تماشا !

سراج کی جولانیٔ طبع نے غزل کو نت نئے خیالوں سے سنوارا ہے ان کے خیال کا انوکھا پن شعر کو کہیں سے کہیں پہنچا دیتا ہے، فرماتے ہیں ؎

ترے لعلِ لب میں ہے آبِ حیات ۔ ہوا جستجو میں سکندر عبث

(Viscount grey) نے لکھا ہے کہ (Tennyson) کے پاس الفاظ اتنے سادہ اور معمولی ہوتے ہیں کہ بلند سے بلند خیال بھی ان میں چھپ جاتا ہے یہی شاعری کا کمال ہے، سراج کی قادر الکلامی دیکھئے کہ انھوں نے کتنے سادہ الفاظ میں رفعتِ خیال کو بند کر دیا ہے، یہی وہ سہلِ ممتنع ہے جس کا نام لیتے ہی غالب کا نام ذہن میں آجاتا ہے کہا جا سکتا ہے کہ سراج ہی کی تخم پاشی نے اردو میں یہ گلشن کھلائے ہیں۔

استعارات اور تشبیہات کے استعمال میں سراج نے اپنی قادر الکلامی کے جوہر خوب دکھلائے ہیں۔ دہنِ معشوق کی تعریف میں ہمارے شاعروں نے کیا کیا شعر نہیں نکالے ہیں، لیکن سراج نے اپنے معشوق کے دہن کو جس طرح سراہا ہے وہ انہیں کا حصہ ہے۔ شعر کہنے کا لطف یہی ہے کہ وہ پڑھنے والے کے دل میں اتر جائے اور سراج کا یہ شعر واقعتاً داد و ستائش سے مستغنی ہے، فرماتے ہیں ؎

ترے دہن کی مسی سیں مجھے ہوا معلوم ۔ نمازِ شام کا ہے وقت نہایت تنگ

ایک جگہ اور کنایتہً دہن کی تنگی کا ذکر کرتے ہیں کہ لفظی رعایت کی صنعت بھی پھڑک اٹھتی ہے ؎

اے باغِ حیا دل کی گرہ کھول، سخن بول ! ۔ تنگی ہے مرے حال پہ اے غنچہ دہن بول

حسنِ تخیل تغزل کا اصلی زیور ہے اور سراج کے اشعار میں ہر جگہ یہ خوبی جھلکتی نظر آتی ہے ؎

جب سیں دیا ہے شوخ نے کاکل کو پیچ و تاب ۔ آیا ہے اس کے اشک سے سنبل کو پیچ و تاب

سودا کا ایک شعر ہے ؎ زیرِ زمیں سے آتا ہے جو گل ہے زر بہ کف ۔ قارون نے راستے میں لٹایا خزانہ کیا !

سراج کا یہ شعر سودا کے اس شعر سے کہیں بلند ہے فرماتے ہیں ؎

ہمارا خونِ ناحق نئیں ہوا ضائع اَرے قاتل ۔ زمیں سیں گل ہو نکلا آسماں پر ہو شفق پھولا

شعر کی ایک خوبی یہ بھی ہے کہ پہلے مصرعے میں دعویٰ کیا جائے اور دوسرے میں ثبوت پیش کیا جائے یا اس کے برعکس سراج کے کلام میں یہ خوبی بھی موجود ہے فرماتے ہیں ؎ تجھ حسن کے سبب ستی روشن ہوا ہے دل خورشید کے قدم کے سبب ہے ضیائے صبح

تلمیح شعر کی جان ہے، سراج نے ایک جگہ کیا ہی خوبی سے ہیر اور رانجھا کے تعلق کو ظاہر کیا ہے ؎

مشتاق ہوں تجھ لب کی فصاحت کا ولیکن رانجھا کے نصیبوں میں کہاں ہیر کی آواز

عشق کی اصلی شان ہجر ہے، وصال عشق کی موت ہے، جیسے کہ نیاز نے لکھا ہے کہ آرزو کا حصول آرزو کی موت ہے، اسی لئے ہجر کی بے قراری ہی عاشق کے اس جذبۂ محبت کو زندہ رکھتی ہے، سراج نے اس خیال کو یوں ادا کیا ہے،

وصل میں راحت ہے لیکن ہجر کی لذت کہاں انتہا میں چاہتا ہوں ابتدا کا اشتیاق

صوتی الفاظ کو شعر کے حسن میں بڑا دخل ہے اور سچ تو یہ ہے کہ صوتی الفاظ سے کلام میں حسن پیدا کرنے کا یہ فن کوئی نظیر اکبرآبادی ہی سے سیکھے لیکن سراج کے کلام میں بھی اس فن کی جھلکیاں نظر آجاتی ہیں فرماتے ہیں ؎ گھٹا غم کی مری آنکھوں میں چھائی برستی ہے پھوار آنسو کی جھم جھم

آب و آتش کو بہم دست و گریباں دیکھنا ہو تو سراج کا یہ شعر پڑھئے ؎

شعلے اٹھتے ہیں آگ کے اشک سراج سیں آبِ رواں میں سیر چراغاں کو دیکھ لو

عشق کی لذتوں میں تصور کا بڑا ہاتھ ہے اور یہی تصور کی کلفتوں میں بھی لذت پیدا کر دیتا ہے، عاشق کا تصور، محبوب کی رعنائیوں کا چور ہے اور یہ چوری اردو شاعری میں عام ہے، جگر کہتے ہیں ؎

وہ کب کے آئے بھی اور گئے بھی نظر میں اب تک سما رہے ہیں یہ چل رہے ہیں وہ پھر رہے ہیں یہ آ رہے ہیں وہ جا رہے ہیں

سراج کے تصور کا بھی لطف اٹھائیے، فرماتے ہیں ؎

مری آنکھوں کے دونوں پٹ کھلے تھے انتظاری میں سو ویسے میں یکایک دیکھتا کیا ہوں کہ آتا ہے

سراج کے ان اشعار سے واضح ہو گیا ہوگا کہ سراج نے آج سے تین سو سال قبل زبان و بیان کی سلاست اور دلاویزی کے حسین امتزاج سے تغزل کی جو شراب لنڈھائی ہے وہ اب تک نئے نئے ساغروں میں بھر کر ہمارے سامنے لائی جاتی رہی ہے، ان کے کلام میں میر کا درد و اثر، سودا کی رفعت خیال اور غالب کا سا تغزل نمایاں ہے باوجود اپنے متصوفانہ رجحانِ طبع کے انھوں نے اپنی غزلوں کو زبان و تخیل کی تمام تر خوبیوں سے سنوارا ہے اور اس وقت جب کہ زبان کو تنگیٔ داماں کی شکایت تھی، سراج نے بڑے سے بڑے خیال کو بھی نہایت خوبی کے ساتھ الفاظ کا جامہ پہنا دیا ہے اور یہی وہ قادر الکلامی ہے جو برسہا برس کی مشقِ مسلسل کے بعد بھی ہاتھ نہیں آتی، یہ جوہر خداداد ہے جو شاذ ہی کو نصیب ہوتا ہے، سراج اپنی چند خوش نصیبوں میں سے ایک ہیں۔

سید محمد یوسف ناظم

دہائی

کس قدر بے کار ہیں قدرت کی یہ سب رحمتیں ! ہائے انگوروں میں وہ اٹھتی ہوئی موج شراب
ہائے چاندنی راتوں کی حسین راتوں کی دلکش چاندنی ہائے مفلس کی جوانی ہائے بیوہ کا شباب

سلیمان اریب

سو سال قبل کے حیدرآباد کی خبریں

(بسلسلۂ گزشتہ)

شیخ کلو سلمدار، تہی خاں سلمدار، یہ آٹھ آدمی سرگروہ مفسدوں کے ہیں اور دس آدمی اور ان کی ذریات ہیں جو کہ سب اٹھارہ آدمی تھے۔ رائے جرنیل فریزر صاحب بہادر رزیڈنٹ حیدرآباد دکن۔

چونکہ جرنیل فریزر صاحب بہادر رزیڈنٹ حیدرآباد دکن تمام رسالوں، سواروں اور رجمنٹوں پیادگان نظام سرکس پر حکمراں اور فرماں روا ہیں اس لئے صاحب ممدوح نے بعد ملاحظہ کیفیت صاحبان کورٹ کے اس مقدمہ میں جو کچھ رائے اپنی لگائی ہے تفصیل اس کی یہ ہے۔

بعد ملاحظہ کاغذات مقدمہ اور کیفیت مرسلہ صاحبانِ کورٹ مارشل کی رائے میری بھی شریک رائے صاحبان کورٹ ہوئی اور بخوبی ثابت ہوا کہ ان اٹھارہ آدمیوں نے از راہ خبث طینت کے ناحق بےگناہوں کو متہم کیا ہے اور جرم تہمت اور بد اندیشی بےگناہوں کا ان مفسدوں پر ثابت ہوا لیکن اس میں شک نہیں کہ ان اٹھارہ آدمیوں سے بعضوں پر جرم خفیف اور بعضوں پر جرم خفیف تر اور بعضوں پر جرم سنگین اور بعض پر جرم سنگین تر ہوگا پس مناسب یہ تھا کہ سزا موافق جرم کے دیجائے مگر چونکہ رکھنا ایک آدمی کا بھی ان اٹھارہ آدمیوں میں سے موجب ہتک اور بدنامی رسالہ کا ہے اس لئے مناسب یہ ہے کہ یہ سب اٹھارہ آدمی رسالہ نظام سرکس حیدرآباد سے موقوف اور معزول ہوں چنانچہ حکم موقوفی ان کا جاری ہوا اور چونکہ اب رسالہ پانچواں نظام سروس کا وجود فتنہ آمود سے ایسی مفسدوں کے پاک اور صاف ہوگیا اور اس طرح کے لوگوں میں سے ایک شخص بھی رسالہ مذکور میں نہیں رہا کہ اس کے ہونے سے رسالہ مذکور کو بدنامی ہو اور اس کی عزت و توقیر میں تفاوت آئے اس لئے میری رائے میں قدر و منزلت اس کی ویسی ہے جیسی کہ پہلے یعنی قبل از ظہور ان مفسدوں کے تھی اور یہ بدنامی چندروزہ کہ سبب تہمتوں ان فتنہ انگیزوں کے رسالہ مسطور کو نصیب ہوئی تھی سب رفع ہوگئی بعد اس کے ہمیشہ ترقی عہدوں کی جس طرح قدیم الایام سے اس رسالہ میں چلی آتی تھی اسی طرح ہمیشہ جاری رہیں گی اور ایام تحقیقات مقدمہ میں جو کچھ حکم عدم ترقی عہدوں کا صادر ہوا تھا اب وہ حکم رد و منسوخ ہوگیا۔ صاحبان کورٹ کی جو اس مقدمہ میں رائے ہے کہ سلوک اور طریق کپتان میں کچھ حرف گیری کی نہیں رہی ہے اس باب میں میری رائے سے متفق ہے۔ بعض افسر اور سپاہی کہ واسطے فیصلہ اس مقدمہ کے مقام بلارم سے آئے تھے اور محکمہ تجویز میں شریک رہے انہیں چاہئے کہ اب فی الفور اپنے مقاموں کو چلے جائیں اور قاعدہ حکم گورنمنٹ ہندوستان کے مسٹر ہیٹن صاحب کمان افسر رسالہ مذکور امور مفوضہ فوج میں دخل نہ دیں اور بعد پہنچنے حکم گورنمنٹ کے کمان افسر مسطور کو اختیار حاصل ہے کہ ملک نظام الملک میں جس جگہ چاہیں قیام پذیر رہیں اور یہ کورٹ مارشل کہ اس میں میجر فٹز جرالڈ صاحب حاکم اول تھے برخاست ہوئی اور صاحبانِ کورٹ نے جس طرح کہ تحقیق و تنقیح مقدمہ مذکور میں کوشش کی ہے ان کی سعی اور جانفشانی مجھے بہت پسند ہے کیونکہ اس مقدمہ کی تجویز میں انہوں نے کمال عقل و ہوشیاری کو بے رو و رعایت کام فرمایا ہے اگر صاحبان کورٹ دانش و آگاہی اور عزم و بیدار مغزی کو کام نہ فرماتے تو اس حالت میں فیصلہ اس مقدمہ کا اس اسلوب سے نہ ہوتا جیسے کہ اب ہوا ہے۔ دستخط جی ایس فریزر صاحب رزیڈنٹ

۱۱ جولائی ۱۸۵۲ء

یہاں کے گزٹ مرقومہ ۱۲ ماہ حال سے واضح ہے کہ سپاہ کنٹنجنٹ نظام کو اب تک وہی آتش در کاسہ ہے۔ دسویں تاریخ جولائی تک تنخواہ ماہ دسمبر ۱۸۵۲ء کی سپاہ کو نہیں ملی تھی کہتے ہیں کہ دو مہاجنوں سے ہنڈیاں بھی بھیجے گئے ہیں۔ بسبب شورش عربوں اور روہیلوں کے ایک حصہ ملک کا نہایت خرابی میں ہے

یہ لوگ جہاں کہیں جاتے ہیں طرح طرح کے ظلم اور شور محشر برپا کرتے ہیں۔ راقم چٹھی لکھتے ہیں کہ جب تک زمین ملک کی بے ترد و خراب پڑی ہوئی ہے ادائی قرض ناممکن ہے عمال وغیرہ کے ظلم و ستم گیری سے زمیندار اور مزارع بھاگ گئے ہیں علاوہ اس کے اور حالات بھی اس نواح کے سنے گئے ہیں کہ ان کا نہ لکھنا ہی بہتر ہے۔

۲۵ر جولائی سنہ ۱۸۵۲ء

صاحب دہلی گزٹ بموجب تحریر کسی کارسپانڈنٹ کے حال سپاہ مرقوم الصدر کا اس طرح رقم فرماتے ہیں کہ اب کے سال کنٹنجنٹ نظام کی سات آٹھ مہینے کی تنخواہ چڑھ گئی ہے اور اس سبب سے افسران سپاہ فوج مذکور اٹھارہ روپیہ فیصد سالانہ اور سپاہی ۲۴ روپیہ فیصد بلکہ کچھ زیادہ سود بھر کر گزر اوقات کرتے ہیں اور علاوہ اس کے لوگوں نے بہ مجبوری بیویوں کا زیور رہن و فروخت کرکے کام چلایا مگر اب ان کا افلاس اس درجہ کو پہونچا ہے کہ وہ اپنی عورتوں کو باغات افسروں کے صاف کرنے کے لئے ایک آنہ روز کی مزدوری پر بھیجنے کو راضی ہیں جو بات کہ ان کی عادات اور مرضی کے برخلاف ہے کیونکہ اکثر سپاہی اس کنٹنجنٹ کے ہندوستان کی اونچی ذاتوں میں سے ہیں مگر باوجود اس حالت کے ان لوگوں سے کچھ شکایت نہیں سنی جاتی اور اب ان کا یہ حال ہو گیا ہے کہ ان کی کل تنخواہ بھی بغایت حال مل جائے تو بھی ان کا قرضہ ادا نہ ہو۔

۱۰ر اکتوبر سنہ ۱۸۵۲ء

اخبار انگلش مین سے واضح ہوتا ہے کہ جناب جنرل فریزر صاحب ریذیڈنٹ حیدرآباد ۱۲ تاریخ ماہ حال کو منصب ریذیڈنسی مقام مذکور سے مستعفی ہو رہے ہیں بعض صاحبوں کی یہ رائے ہے کہ حال مخفی ان باعثوں کا جو کہ موجب اس بات کی ہوئی ہیں غالباً بہت برسوں تک ظاہر نہ ہوگا لیکن اس کی ضرورت مدت سے عیاں تھی مگر جنرل فریزر صاحب کے جانشین کو دیکھنا چاہئے کہ تعمیل احکام میں جو کہ دربابِ شامل کرنے ملک نظام کے ہیں کیا آسانی یا دقت پیش آئے گی۔ صاحب موصوف کا کارسپانڈنٹ لکھتا ہے کہ حیدرآباد میں یہ امید ہے کہ کرنل لو صاحب ایجنٹ راجپوتانہ ریذیڈنسی حیدرآباد پر معمور ہوں گے اور بعض لوگ میجر مالکم صاحب کا تقرر ہونا بیان کرتے ہیں اور ان دونوں صاحبوں کا وہاں بہت شہرہ نیک نامی کا ہے۔

۲۱ر ڈسمبر سنہ ۱۸۵۲ء

سکندرآباد کی ایک چٹھی مورخہ ۱۴ر ڈسمبر سنہ ۱۸۵۲ء سے واضح ہوتا ہے کہ مقام مذکور میں قحط غلہ سے لوگوں کو نہایت تکلیف ہے اور گورنمنٹ نے حکم دیا ہے کہ بے چارے بھوکوں محتاجوں سے سڑکیں بنوائی جائیں تاکہ وہ لوگ بھی جان سے بچ جاویں اور سرکار کا بھی کام ہو۔ ایک روز ایک عورت ایک کھیت میں کھانا کھا رہی تھی ایک شخص بھوکے نے آکر اس کے سر میں ایسا لٹھ مارا کہ وہ مر گئی اور اس کا کھانا کھا لیا۔ کرنل برمز صاحب رجمنٹ ۴۱ کی مع اپنے زوجہ اور بیٹی کے کامیٹی کو جاتے تھے قریب عادل آباد پچاس عربوں نے ان پر تاخت کی اور انھیں بعد زد و ضرب لوٹ لیا۔ وزیر نواب سالار جنگ بہادر خزانہ بھرتے جاتے ہیں اور بہت خوب انتظام کیا ہے۔ بالفعل اس مقام میں بیماری بھی نہیں ہے اور موسم بہت اچھا ہے۔

۲۲ر جنوری سنہ ۱۸۵۳ء

واضح ہوتا ہے کہ فوج نظام آئندہ سے کنٹنجنٹ حیدرآباد کہلائی جائے گی اور بطور ایک جزو افواج ایسٹ انڈیا کمپنی کے شمار کئے جائے گی اور اس صورت میں یقین ہے کہ سپاہ مذکور ماہ بماہ تنخواہ پایا کرے گی۔ بظاہر کنٹنجنٹ مذکور کو ایک مہم عظیم درپیش ہے کیونکہ اخبارات تازہ سے ایسا معلوم ہوتا ہے کہ عرب اورنگ آباد کے قصد عوض لینے اس بے عزتی کا رکھتے ہیں جو کہ

میجر بین صاحب اور ان کی بہادر سپاہ سے شکست پاکر انھیں حاصل ہوئی ہے کہتے ہیں کہ یہ لوگ بہ قصد مقابلہ سپاہ صاحب موصوف بہ کثرت اورنگ آباد میں جمع ہوئے ہیں آیندہ جو حال تازہ درباب مفسدان مقام مذکور دریافت ہوگا واسطے ملاحظہ ناظرین اخبار کے لکھا جائے گا۔

۱۲ر فروری سنہ ۱۸۵۵ء

سکندرآباد میں بالفعل سب طرح امن و امان ہے لیکن غلہ بہت کم اور اسی سبب نہایت مہنگا ہے حتی کہ باشندے وہاں کے روٹی بہم پہنچانے اپنے بال بچوں کو بیچ ڈالتے ہیں سو نظر بہ تکلیف غربا و مساکین مقام مذکور میں ان کی پرورش کے لئے ایک چندہ پڑا ہے اور جو لوگ طاقتور اور توانا مگر محتاج ہیں ان کے لئے کام درستی سڑک کی تجویز ہوئی ہے۔

۱۲ر مارچ سنہ ۱۸۵۵ء

اخبار انگلشمین سے واضح ہوتا ہے کہ بہ سبب اس کے کہ امورات حیدرآباد بالکل خاص تحت حکم گورنمنٹ انڈیا کے ہیں نواب گورنر جنرل بہادر نے حکم دیا ہے کہ تمام مقدمات متعلقہ محاصل و اخراجات کنٹینجنٹ اور اضلاع مفوضہ کے حکام احاطہ بنگال سے متعلق رہیں۔ سنا جاتا ہے کہ رزیڈنٹ حیدرآباد نے اس مضمون کی درخواست بھیجی تھی کہ بہ سبب ملنے علاقہ جدید کے کام بہت بڑھ گیا ہے ایک اسسٹنٹ اور مقرر کیا جاوے۔

گورنمنٹ نے کپتان ایچ آر تھارنٹن صاحب کپتان رجمنٹ پانچویں پیادگان لائٹ منذر اکر کو بشاہرہ چھ سو ماہانہ کے مقرر فرمایا۔ بموجب استدعائے کپتان ٹیلر صاحب ڈپٹی کمشنر اضلاع غربی مفوضہ گورنمنٹ انگریزی کی حسب سفارش صاحب رزیڈنٹ بہادر حیدرآباد گورنمنٹ نے سرحد بندی اضلاع مذکور متصل سرحد بھام گڑھ مقرر فرمائی ہے اور اس سرحد بندی کے سبب سے جو نقصان سرکار حیدرآباد کا ہوگا عوض اس کا تعلقہ بالاگھاٹ کے دینے سے کر دیا جائے گا۔

۱۹ر مارچ سنہ ۱۸۵۵ء

وہاں کی ایک چٹھی مرقومہ ۲۰ر مارچ سے واضح ہوتا ہے کہ وہاں موسم بہت گرم ہو گیا ہے اور امید بارش باران رحمت کی ہے اور اس کی احتیاج بھی بہت ہے کیونکہ تالاب کلاں میں پانی بہت کم ہو گیا ہے اور اگر مینہ نہ برسا تو آخر موسم گرما تک بالکل خشک ہو جاوے گا اور نتائج اس کے اچھے نہ ہوں۔ نواح مقام مذکور میں چوری اب تک ہوتی رہتی ہے۔ رجمنٹ ۴۶ پیادگان ہندوستانی کی چند آدمیوں پر جو کہ بحصول رضا و رخصت جاتی تھی روہیلوں نے حملہ کیا اور انھیں مجروح کر کے لوٹ لے گئے لیکن ایک راجپوت سپاہی نے ان میں سے ایک کو پکڑ لیا کہ اس شدت سے زخمی کیا کہ وہ بھاگ نہ سکا اور اب قید ہے۔

۱۶ر اپریل سنہ ۱۸۵۴ء

اخبار انگلشمین سے واضح ہوتا ہے کہ بہ سبب شدت ظلم عربوں کے جناب نواب گورنر جنرل بہادر نے جو نواب نظام الملک بہادر کو خریطہ معرفت صاحب رزیڈنٹ بھیجا ہے خلاصہ اس کے مضمون کا یہ ہے کہ سرکار انگریزی نہیں چاہتی کہ ایسے ظلموں کی سزا نہ ہو سرکار موصوف پر بہ سبب اس کے رتبہ عالی اور دوستی اور اتحاد سرکارین کے غرض ہے کہ آپ سے تمام ظالموں کے سزا کی درخواست کریں گورنمنٹ نہیں چاہتی کہ تعمیل سزا مرضی پر عربوں یا افسران سرکار نظام کے رہے کیونکہ ظاہر ہے کہ انھیں سزا موافق ان کی خطا کے ملتی ہے اور نہ یہ تحقیق ہوتا ہے کہ انھیں سزا ملتی ہے یا نہیں اس لئے مناسب ہے کہ سرکار نظام واسطے جلاوطن کرنے کے ان لوگوں کو گورنمنٹ کے حوالہ کرے اور احیاناً اگر کوئی مجرم ان میں سے پھر ہندوستان میں آجائے گا تو سرکار انگریزی اسے گرفتار کر کے سزائے معقول دے گی۔ نواب نظام الملک بہادر کو واجب ہے کہ وہ نواب گورنر جنرل بہادر کے رائے پر جس سے کہ دو برس پہلے انھیں اطلاع دی گئی ہے غور و تامل کریں اور جو خرابی کہ

ان ظالم و بے رحم عربوں سے ان کی ریاست میں عائد ہوتے ہیں انھیں سوچیں۔ عربوں کی گستاخی اس درجہ کو پہنچی ہے کہ انھوں نے سپاہ گورنمنٹ پر جب کہ وہ آپ کی نوکری میں مصروف تھے فیر کئے۔ آپ بخوبی آگاہ ہیں کہ تمام ان لوگوں پر جو کہ ظالموں کی پرداخت کرتے ہیں گورنمنٹ اپنی تمام قوت و قدرت و حکومت کو کام میں لاتے ہیں۔ دوستی میں جو کہ فی مابین سرکارین ہے یہ امر موجب نقض عہد و پیمان متصور ہے کیونکہ باوجود اظہار اس امر کے نواب نظام الملک بہادر نے گورنمنٹ انگریزی کی یہ خواہش منظور نہ کی اور ان لوگوں کا موقوف یا کم کر دینا قبول نہ کیا۔ لہٰذا نواب گورنر جنرل بہادر اس امر کی اطلاع کو مناسب متصور کرتے ہیں اور اگر پھر اس قسم کے جرایم ان سے صادر ہوں گے تو نواب ممدوح بذات خود ان کی تنبیہ و تادیب کی تدبیر میں مصروف ہوں گی۔ نواب نظام الملک بہادر کو لازم ہے کہ اپنے ملک کے عربوں کو ارادے نواب گورنر جنرل بہادر سے بذریعہ اشتہارات وغیرہ آگاہ اور مطلع کر دیں۔

۳۰ اپریل سنہ ۱۸۵۴ء

وہاں کی تحریرات تازہ سے واضح ہوتا ہے کہ کپتان ڈورن صاحب کپتان سپاہ کنٹیجنٹ حیدرآباد نے ۱۸۲ روہیلوں کو گرفتار کیا اور انھیں حکم ہوا کہ اسیران مذکورین کو سپرد قلعہ دار بھگتیال کے کر دیں چنانچہ ۹ تاریخ ماہ گزشتہ کو کپتان موصوف قلعہ مذکور میں پہنچے اگرچہ قلعہ دار مذکور نے پہلے انھیں قلعہ میں داخل کرنے اور اسیران مذکورین کے حراست سے انکار کیا مگر آخر کار دروازہ کھول دیئے اور قیدیوں کو رکھ لیا اور بعد از اں فوج کپتان موصوف روانہ ہو گئی لیکن طرفہ تر یہ بات ہے کہ اسیران مذکور بھی صاف نکل گئے باوجودیکہ قلعہ مذکور بہت مستحکم اور خندق اس کی ۴۰ فٹ عریض ہے اور ساڑھے تین سو بندوق قلعہ میں مع اور سامان کے موجود تھی۔ اکثر اور ڈکیت اس نواح کے بھی جو کہ انواع و اقسام کے ظلم و ستم کرتے ہیں بھاگ گئے ہیں اور بعض قید ہیں لیکن ان میں سے کسی کو پھانسی نہیں ملی ہے اور جب تک ان لوگوں کو قرار واقعی سزا نہیں ملے گی اور ادنیٰ ادنیٰ جرم پر یہ لوگ پھانسی نہ پائیں گے انتظام واردات ناممکن متصور ہے۔

۱ مئی سنہ ۱۸۵۴ء

ایک کارسپانڈنٹ دہلی گزٹ کے حال جنگ کرنل مین صاحب اور روہیلوں سرکش ریاست حیدرآباد دکن کا جو کہ ملک مذکور کو لوٹتی پھرتی ہیں اس طرح مفصل لکھتے ہیں کہ اورنگ آباد سے پچاس میل کے فاصلہ پر ایک مقام میں قریب ایک ہزار روہیلوں کے جمع تھے کرنل موصوف یہ حال سن کر ان پر چڑھ گئے اور ۱۱ تاریخ ماہ گزشتہ کو مع سواروں اور توپ خانہ لائٹ اور پیادوں کے ان کا محاصرہ کر لیا لیکن چونکہ بھاری توپیں ہنوز ان کے پاس نہیں پہنچی تھیں انھوں نے اپنے تئیں حملہ کرنے کے ادا پر مقدور نہیں کیا۔ بالجملہ سرکشان مذکورین اپنی دیواروں کے پناہ میں دن خوب لڑے مگر رات کو قصد بھاگ جانے کا کیا یعنی تاریخ مذکور کو بعد دس بجے کے اپنے مقام سے باہر نکل آئے اور بہ ہیئت مجموعی پکٹ سپاہ کنٹیجنٹ مذکور پر بہ کمال دلیری و سختی حملہ کیا لیکن سواران کنٹیجنٹ حیدرآباد نے باوجود تاریکی شب اور نشیب و فراز زمین کے استقلال کو کام فرمایا برگیڈیر مین صاحب نے مع کپتان میین ٹائر صاحب کمانیر رجمنٹ دوم سواران اور ایبٹ صاحب برگیڈ میجر اور دو سو سواران اور توڑی سنگی ہوئی سپاہ روہیلہ کے ان کا تعاقب کیا اور ان پر حملہ آور ہو کر تلواروں سے ان کے ٹکڑے ٹکڑے کر دیے اور ایسے کارہائے نمایاں کئے کہ فوج ہندوستان کا نام کارنامہ دنیا پر یادگار رہے گا فوج اعدا میں سے بہت لوگ مارے گئے صرف چند آدمی بچ گئے

وہ بھی مجروح خلاف اس کے فوج کرنل موصوف میں سے صرف قریب تیس آدمیوں کے مقتول و مجروح ہوئے کپتان ایبٹ صاحب برگیڈ میجر کے بازو پر زخم شمشیر آیا اور کپتان میسن ٹائر صاحب کے سر میں زخم شدید بھالہ کا لگا اور گھوڑی ان دونوں صاحبوں اور برگیڈیر مین صاحب اور لفٹنٹ ہیریس صاحب لفٹنٹ رجمنٹ دوم سواروں کے گولیوں اور تلواروں سے مارے گئے۔

واضح ہو کہ ۲۲ تاریخ ستمبر سنہ ۱۸۵۲ء کو برگیڈیر مین صاحب نے عرب کو سرکش کو ایسی تنبیہ دی تھی کہ وہ اب تک نہیں بھولے ہیں اور اب کے سال ۲۲ ستمبر کو جو روہیلوں کو تنبیہ دی گئی ہے تو یقین ہے کہ یہ قوم بھی ہمیشہ اسے یاد رکھے گی اور کبھی ایذا رسانی اور مقابلہ کے مرتکب نہ ہوں گے۔ ۱۵ اکتوبر سنہ ۱۸۵۳ء

صاحب انگلش مین کو حیدرآباد کا کارسپانڈنٹ خبر دیتا ہے کہ مقام اودائو میں روہیلوں نے بار دوم سرکشی و فساد برپا کیا کہتے ہیں کہ ان مفسدوں کا اس بار ایک بڑا گروہ ہے اور فوج کنٹنجنٹ ان پر مختلف مقاموں سے حملہ کرنے کو تھی اور افواہ ہے کہ پچاس لاکھ روپے کمپنی کے سکہ کی یہاں واسطے اجرائی کاروبار روزمرہ کے بنگالہ احاطہ سے مرسل ہوئے ہیں اور یہ سکہ ان اضلاع میں رائج ہوگا جو والی اس مقام سے لیکر ممالک محروسہ سرکار میں شامل کئے گئے ہیں باعث اس کا یہ ہے کہ ان کی اجراء سے وہ روپے جو بالفعل یہاں رائج الوقت ہے خارج کیا جائے گا اگرچہ اس سے نفع کثیر تمام باشندگان ان دیار کو متصور ہے مگر صراف بیچاروں کی روزی گئی۔

۱۱ نومبر سنہ ۱۸۵۳ء

مقام سکندرآباد میں دو بدمعاشوں نے ایک آیہ سے سازش کر کے ایک میم قوم انگریزی کو جس کا خاوند ایک بار گیا ہے

بھولے سے لوٹنا چاہا اور آیہ مذکور کے ذریعہ سے میم مسطور کی خوابگاہ میں داخل پاکر جو کچھ ہاتھ آیا لے گئے اور کافور ہو گئے مگر آیہ گرفتار اور مقید ہو گئی۔ ۱۳ دسمبر سنہ ۱۸۵۳ء

اخبار فوائد الناظرین دہلی سنہ ۱۸۵۲ء

سنتے ہیں کہ نواب نظام الملک بہادر نے صاحب رزیڈنٹ کو ایک الماس دیا ہے کہ وزن اس کا کوہ نور سے بھی زیادہ ہے۔ معلوم نہیں کہ بطور تحفہ کے دیا ہے یا بعوض زر قرضہ سرکار کے فقط

۱۱ فروری سنہ ۱۸۵۲ء

وہاں کے چٹھیات تازہ وارد سے واضح ہوتا ہے کہ ایک گروہ عربوں اور روہیلوں کا آپس میں لڑ رہا ہے اور انھوں نے نواحِ موہن آباد میں دست غارت بھی دراز کر رکھا ہے۔ ابھی حال مفصل باعث فساد انگیزی اقوام مذکورین کا معلوم نہیں ہوا ہے لیکن یہ موجب تعجب ہے کہ سپاہ کنٹنجنٹ جناب نواب نظام الملک بہادر کیوں اس فساد کے روکنے کے لئے نامزد نہیں ہوئی۔ کیونکہ چٹھیات مذکور میں کچھ حال مداخلت سپاہ مذکور کا نہیں لکھا ہے۔ ۱۱ مارچ سنہ ۱۸۵۲ء

مہتمم صاحب اخبار آگرہ بموجب خط مقام مذکور کے رقم فرماتے ہیں کہ نواب عالیجناب معلی القاب وزیر اعظم نواب سراج الملک بہادر نے واسطے ادا کرنے باقی زر قرضہ سرکار دولت مدار کمپنی بہادر کے یہ تدبیر کی ہے کہ زمینداران مال گزاری اور تعلقداران والا اقتدار اور امرائے نامدار اور بزرگان والا اعتبار سے کہ قدیم ایام سے نمک پروردہ سرکار عالی مقدار حیدرآباد ہیں موافق وسعت و مقدور ہر ایک کے ندر خطیر بطریق توجیہ جمع کر کے داخل خزانہ کریں تاکہ تقاضائے شدید سے نجات حاصل ہو

چنانچہ اسی قرار داد پر پندرہ لاکھ روپے جناب نواب مستطاب امیر کبیر نواب شمس الامراء بہادر سے بھی طلب کئے ہیں اور نواب ممدوح اسی قدر زر طلب کے دینے میں عذرات درمیان لائے ہیں اور نہایت درہم برہم ہو کر آمد و رفت دربار حضرت بندگان عالی سے پہلو تہی کیا ہے۔ اس سبب بات خاطر مبارک حضرت بندگان عالی پر بہت دشوار اور ناگوار ہے۔ ۲۲ مئی ۱۸۵۲ء

اخبار قران السعدین دہلی ۱۸۴۷ء

اندوئے اخبار انگلش مین کے دریافت ہوتا ہے کہ انتظام حیدرآباد کا خوب نہیں اور کوٹ آف ڈائرکٹرز بھی اس امر سے مطلع ہیں۔ افواہ میں ہے کہ جنرل فریزر صاحب کونسل میں عہدہ جلیلہ حاصل کریں گے اور صدر لنڈ یا سل من ان کی جگہ پر مامور ہوں گے۔ ایک اور اخبار سے معلوم ہوا کہ جناب نواب نظام الملک بہادر سے سرکار کمپنی نے اپنا روپیہ جو پیشگی دیا گیا تھا طلب کیا ہے اور حساب کتاب اس معاملہ کا در پیش ہے۔ ۱۹ اگست ۱۸۴۷ء

صاحب بمبئی سپکٹر لکھتے ہیں کہ نواب نظام الملک کی عملداری میں چوریاں اور خون اکثر ہوتے ہیں اور خود حیدرآباد میں بھی ایسا ہی حال ہے۔ ایک عرب کچہری میں محمد فیض اللہ کی کسی جرم میں ماخوذ ہوا تھا بوقت تحقیقات مقدمہ کی اس نے جج صاحب کے روبرو پیش قبض نیام سے نکالا لیکن حسن اتفاق سے ایک شخص حاضرین دربار سے عرب مذکور کو ضرب کے پہنچانے سے باز رکھا۔ ایک اور صاحب اخبار بموجب ایک خط کے لکھتے ہیں کہ عنقریب جنرل فریزر صاحب رزیڈنٹی حیدرآباد سے دست بردار ہوں۔ ۱۳ ستمبر ۱۸۴۷ء

ایک اہل عرب نے فوج میں سے ایک قصاب پر کچھ روپے کا دعویٰ کیا جس کے باعث سے ان دونوں میں جھگڑا ہوا عرب نے قصاب کو مار ڈالا اور کسی نے اس سے اس امر کی باز پرس نہیں کی۔ صاحب بمبئی سپکٹر لکھتے ہیں کہ وہاں مدام ایسی واردتیں ہوتی ہیں۔ جناب سراج الملک بہادر دام اقبالہٗ نے میجر کارسٹن صاحب کی بہت دھوم سے ضیافت کی اور یہ صاحب حیدرآباد سے کرناٹک کی طرف تشریف لے جائیں گے۔ چوتھی تاریخ ماہ گذشتہ کو صاحب نظام الملک والی ریاست حیدرآباد واسطے تبدیل آب و ہوا کے حیدرآباد سرونگر کی طرف تشریف فرما ہوئے۔ ۱۹ اکتوبر ۱۸۴۷ء

انگریزی اخبار اطلاع دیتا ہے کہ آج کل میں کچھ انقلاب عہدوں کا حیدرآباد میں ہونے والا ہے اگر یہ بات وقوع میں آئے تو ہمارے نزدیک جناب نواب نظام الملک کو کوئی بہانہ واسطے درست کرنے کاروبار ملکی میں باقی نہ رہے گا اور اس صورت میں صاحب رزیڈنٹ وغیرہ جواب دہی سے چند امور کے چھوٹ جائیں گے اور سب چیز کی ذمہ داری بعد انقلاب عہدہ کے نظام الملک بہادر کی ذات سے متعلق ہو جائیں گے۔

۱۵ نومبر ۱۸۴۷ء

اخبار مندرجہ دہلی گزٹ سے دریافت ہوتا ہے کہ کسی لمخاندان...... میں سے اپنی بی بی پر شک ایک جرم کا کر کے حجرہ میں بند کر دیا اور چاروں طرف سے ہر روزن کو بند کر ڈالا اور اسی طور سے ایک اور حجرہ میں سات لونڈیوں کو بھی گویا زندہ قبر میں ڈالا۔ اس باب میں انہیں کہا گیا کہ اس حرکت سے باز آؤ اور بی بی کو طعمہ موت سے بچاؤ لیکن انھوں نے کچھ نہ سنا اہالیان کے عمل پر فوج کشی ہوئی اور بی بی مذکور اس حجرہ سے

نیم مردہ پائی گئی گاؤ رنڈیوں کا کچھ حال نہ معلوم ہوا۔ ۲۹ر نومبر سنہ ۱۸۴۸ء

سنہ ۱۸۴۹ء

صاحب زبدۃ الاخبار بحوالہ ایک خط آمدہ حیدرآباد کے یوں ارقام فرماتے ہیں کہ جو ۱۰ر ڈسمبر کو والی ریاست حیدرآباد نے نواب سیف جنگ بہادر کو بخطاب عمدۃ الملک مخاطب فرمایا۔ اور سولھویں تاریخ کو جناب صاحب رزیڈنٹ بہادر کو خلوت میں طلب فرما کر درباب عطائے خلعت دیوانی نواب موصوف کے کچھ مشورہ کیا لیکن معلوم نہ ہوا کہ صاحب بہادر نے در جواب اس کے ایسا ارشاد کیا کہ جس کے بعد برخاست صاحب ممدوح کی مزاج بندگان عالی نواب صاحب کا خیلی مکدر اور ملول رہا۔ صاحب رزیڈنٹ بہادر حال معزولی نواب والا جناب نواب سراج الملک بہادر اور مقرری نواب سیف جنگ بہادر کا بحضور جناب نواب معلی القاب گورنر جنرل بہادر کے لکھ چکے ہیں اور مستوجب صدور حکم کے ہیں اور سوا اس کے سرداران اور اعیان اس ریاست کے گوش بر آواز ہیں کہ دیکھیے حضور نواب معظم الیہ سے کیا جواب باصواب صادر ہوتا ہے۔

۹ر جنوری سنہ ۱۸۴۹ء

صاحب زبدۃ الاخبار بحوالہ ایک خط حیدرآباد کے یوں ارقام فرماتے ہیں کہ جس دن سے نواب عالیجناب معلی القاب سراج الملک بہادر دام اقبالہٗ مہمات وزارت سے دست بردار ہوئے ہیں اس ملک میں اطراف و جوانب سے اکثر فتنہ و فساد برپا ہوتے ہیں چنانچہ از روئے خط مذکور مرقومہ ۲۵ر محرم کے ظاہر ہوتا ہے کہ نواب اعتضاد جنگ بہادر کے تعلقہ میں افغانوں کی ایک جماعت یورش کر کے قلعہ موضع سرور اتیت پال پر قابض و متصرف ہوئی اور مال و متاع قریب دو لاکھ روپے جو قلعہ میں ذخیرہ تھا اپنے تصرف میں لائی اور قلعہ دار کو مقید اور محبوس کیا۔ نواب اعتضاد جنگ بہادر نے باستماع اس خبر وحشت اثر کے ایک جماعت بندوقچیوں اور سواروں اور رسالہ آتش خانہ کو تنبیہ افغانان مذکورین کی مامور کیا جوانان شیر دل نے بڑی بڑی توپوں کے گولوں سے قلعہ کو توڑ ڈالا اور ابھی قلعہ کے اندر تاخت نہ لائی تھی کہ پٹھانوں نے بلاخطہ ٹوٹ جانے قلعہ کے بید سرعت قلعہ سے باہر آ کے ہنگامہ کارزار کا گرم کیا آخر الامر تاب مقاومت کی نہ لا کے اور راہ فرار کی اختیار کی اور قریب پچیس آدمیوں کے مقتول ہوئے اور مجروحین کا کچھ حساب نہیں سپاہ نواب صاحب میں سے دو سوار اور دس راس اسپ کشتہ اور دس سوار اور بیس گھوڑے مجروح ہوئے الغرض قلعہ مذکور خس و خاشاک وجود مفسدین سے پاک و صاف ہو کر پھر قبضہ اختیار نواب اعتضاد الملک بہادر میں آیا۔

۲۳ر جنوری سنہ ۱۸۴۹ء

از روئے زبدۃ الاخبار کے ظاہر ہوتا ہے کہ اطراف و جوانب اس ریاست عالیہ میں جس دن سے کہ نواب سراج الملک بہادر نے نظم و نسق اس ملک سے ہاتھ اٹھایا ہے بدانتظامی اور بے بندوبست روز بروز زیادہ ہوتی جاتی ہے اور اعیان ریاست اور کارپردازان دولت سے اب تک بندوبست قرار واقعی اور حسب دلخواہ ظہور میں نہیں آیا بعد مرنے گھانسی خاں کے علاقہ اکوٹ و امراوتی کا غلام نقی خاں کے سپرد ہوا۔ محمد وزیر کوتوال نے صلاح و تدبیر از راہ خودسری اور خودپسندی کے ایک جماعت کو جوانان عرب سے شہر کے دروازوں پر تعین کیا تھا اس واسطے کہ ان انگریزوں کو جو فوج کنٹنجنٹ میں اسعد ہیں آنے جانے نہ دیں۔ صاحب رزیڈنٹ بہادر نے یہ خبر سن کر بحضور بندگان عالی فرمان فرمائے اس ریاست کے اطلاع کی حضور اعلیٰ اس بات سے بہت خفا اور حد سے برہم ہوئے اور کوتوال کو روبرو طلب

فرما کر بامدآ آمادیب و تنبیہ اور زجر و توبیخ کے چار ہزار روپے جرمانہ لیا اور عرب دروانوں سے برخاست کئے گئے انگریز بدستور شہر میں آمد و رفت کرنے لگے۔

سنا جاتا ہے کہ بندگان عالی معزز نے نواب سراج الملک بہادر سے پشیمان ہیں اس واسطے کہ کوئی اور مدبر اور منتظم کہ لائق سرانجام مہمات اس ریاست کے ہو مثل نواب صاحب ممدوح کے دستیاب نہیں ہوتا۔

۲۹ر جنوری سنہ ۱۸۴۹ء

ناظرین اخبار کو معلوم ہو کہ نواب نظام نے نواب سراج الملک بہادر سے خیلی منغض ہو کر درخواست تقرر وزیر دیگر جنرل فریزر صاحب رزیڈنٹ سے کی صاحب نے اس امر کی رپورٹ نواب گورنر بہادر کی خدمت میں کی وہاں سے جواب آیا کہ نظام کو منتظم امور ریاست کے مقرر کرنے میں اختیار ہے مگر اس کو اس امر کی احتیاط چاہیے کہ کارکن خانہ برانداز رعایا اور تباہ کنندہ ملک نہ ہو اگر ایسا ہوگا تو نظام سے جواب طلب کیا جائے گا بعد منظوری تقرر عہدہ باختیار نظام نے سیف جنگ نامی ایک شخص کو جو ہر کہ دمہ کی زبان سے بدنام تھا خلعت وزارت عطا کرنا چاہا مگر رزیڈنٹ صاحب نے فرمایا کہ جو تم اس کو وزیر بناؤ گے تو ہم وقت ہونے خلعت کے مراسم مقررہ اپنی طرف سے ادا نہ کریں گے۔

الغرض نواب نے اس شخص کے مقرر کرنے میں اختلاف رائے رزیڈنٹ دیکھ کر نواب شمس الامراء بہادر کو منصب وزارت دیا اور نواب شمس الامراء بہادر کے مقرر کرنے میں رزیڈنٹ صاحب کی بھی رائے متفق ہوئی۔

۱۴ر فروری سنہ ۱۸۴۹ء

ا۔ ازروئے زبدۃ الاخبار کے واضح ہے کہ ان گذشتہ میں نامہ نواب معلی القاب گورنر جنرل بہادر کا بوسیلہ جناب جنرل فریزر صاحب بہادر رزیڈنٹ کے نظر بندگان عالی سے گزرا خلاصہ مضمون اس کا یہ ہے کہ سرکار عظمت مدار بہ حال دوست و خیراندیش اور ترقی خواہ اس سرکار دولت مدار کی ہے۔ بدریافت ارادہ معزولی دیوان سراج الملک کے بہت تعجب ہوا اس واسطے کہ سراج الملک جس دن سے منصب دیوانی پر مامور ہوا امورات مفوضہ اپنے کو ازروئے عقلمندی اور دانش اور دولت خواہی اور خیراندیشی کے سرانجام دیتا رہا اور در باب دفع بدنظمی اور آسایش رعیت کے کوشش بلیغ عمل میں لایا۔ اور یہ کہ مرکوز خاطر دولت مدار ہے کہ بعد عزل نواب سراج الملک بہادر کے راجہ رام بخش کو مقرر فرماویں اور پچاس لاکھ روپے برسم نذر داخل خزانہ عامرہ کریں یہ بات قرین صلاح دولت نہیں کس واسطے کہ نادانی راجہ رام بخش کی پہلے اس سے ظاہر ہو چکی ہے۔ دیوان کو چاہیئے کہ دانا اور بیدار مغز ہو تا مہمات ریاست اچھی طرح سے انجام و انصرام پائے۔ چونکہ آمدنی کم اور خرچ زیادہ ہے اس صورت میں ضرور ہے کہ مصارف زائد میں تخفیف کی جائے تاکہ خرچ موافق دخل کے ہو اور کار بآئین نیک سرانجام پکڑیں سرکار دولت مدار کو بیچ معاملات ملک اور آسودگی اور خوشحالی رعایا کے توجہ ضرور ہے اور چونکہ ممالک محروسہ سرکار عظمت مدار ساتھ ریاست سرکار دولت مدار کے متصل اور ملحق ہے احتمال ہے کہ مبادا اگر ہی ہنگامہ فتنہ و فساد اس ریاست کے بیچ ممالک محروسہ سرکار عظمت مدار کے پہنچے اور اس وقت ضرور اور ناگزیر ہو کہ واسطے دفع فساد اور آسایش رعیت کے سرکار انگریزی بیچ ریاست اس سرکار دولت مدار کے داخلت کرے پس اس صورت میں صلاح وقت اس میں ہے کہ بیچ اس چیز کے کہ جس میں رونق ملک و مال اور افزونی دولت و اقبال اور اختیار و اقتدار اس سرکار کا بدستور قدیم بحال و برقرار رہے ہمت والا نہمت مصروف و مبذول ہو۔ ۲۰ر فروری سنہ ۱۸۴۹ء

ادارہ کی خبریں

چیتاپور میں نمائش مطبوعات ادارہ ۱۱ مارچ ۱۹۴۳ء کو شام کے ۴ بجے مولوی عبدالحمید صاحب بی اے۔ ڈویژنل افسر صدر ادارۂ ادبیات اردو شاخ چیتاپور نے مطبوعات ادارہ کی نمائش کا افتتاح فرمایا۔ مطبوعات کو مختلف مضامین مثلاً ادب، تاریخ، ادب اطفال، ادب نسواں، مجموعۂ کلام، سائنس وغیرہ میں تقسیم کر کے علیحدہ علیحدہ میزوں پر قرینہ سے سجایا گیا تھا۔ علم دوست حضرات نے کافی دیر تک مطبوعات کا ملاحظہ فرمایا۔ ادارۂ ادبیات اردو کی خاموش علمی و ادبی خدمات سے سب متاثر نظر آ رہے تھے۔

تقریری مقابلہ پونے سات بجے ڈویژنل افسر صاحب کی صدارت میں تقریری مقابلہ منعقد ہوا۔ گلپوشی کے بعد مولوی محبوب خاں صاحب یوسف زئی بی اے ڈپٹی معتمد ادارہ نے تقریر کی اہمیت و افادیت پر روشنی ڈالی بعد ازاں "تجارت بہتر ہے یا زراعت" کے عنوان پر چھ منتخب طلبائے مدرسہ وسطانیہ نے تقریری مقابلہ میں حصہ لیا۔ مولوی خواجہ معین الدین صاحب بی اے ایل ایل بی صدر ادارہ ادبیات اردو شاخ روضتین گلبرگہ مولوی عبدالقادر خاں صاحب ناصر تحصیلدار علاقہ پائیگاہ اور ڈاکٹر مرزا غوث بیگ صاحب میڈیکل افسر دواخانہ جاگیر نے علی الترتیب زبان، مواد اور طرز بیان کی جانچ فرمائی۔ کمسن مقررین کی تقاریر بہت پسند کی گئیں۔ چنانچہ عبدالستار خاں یوسف زئی متعلم پنجم اول اور مرزا ابراہیم بیگ (متعلم چہارم) دوم آئے۔ اول آنے والے مقرر کو معتمد ادارہ نے اپنی جانب سے ایک نقرئی تمغہ اور دوم آنے والے مقرر کو عارف صاحب نے بصورت نقد انعام دوم مرحمت کیا۔ معزز مہمان مولوی خواجہ معین الدین صاحب نے بھی ایک مزید نقرئی تمغہ عبدالستار خان یوسف زئی کو عطا فرمایا۔ سر مغرب یہ دلچسپ تقریری مقابلہ اختتام کو پہنچا۔

مشاعرہ شب میں ساڑھے گیارہ بجے زیر صدارت مولوی عبدالقادر خاں صاحب ناصر تحصیلدار علاقہ پائیگاہ بزم مشاعرہ منعقد ہوئی۔ پردہ نشین خواتین کے لئے معقول انتظام تھا۔ معتمد ادارہ نے گلپوشی کے بعد مشاعروں کی افادیت پر مختصر سی تقریر کی۔ ہر دو طرحی مصرعوں پر (۱) آپ میرے نہ زندگی میری (۲) ذرہ ذرہ اک جہاں ہے فکر انسان کے لئے) مقامی شعرا میں سے آذر، بانو، تیغ، رشید، اعلا، عتیق، عاجز، عارف، محروم، محجوب، احمد ولی نے اپنا کلام سنا کر سامعین کو محظوظ فرمایا۔ بعد ازاں احمد، جمال (دوالی آشٹی کلیانی) حمد صوفی، تعینی، عطا کلیانوی، منصف اور نذیر کا مرسلہ کلام پڑھوایا گیا۔ تقریباً ہر مصرع پر حاضرین نے داد دی۔ سب سے آخر میں صدر محترم جناب ناصر نے اپنا کلام سنایا تو اہل محفل نے بار بار خراج تحسین ادا کیا۔ معتمد کے شکریہ کے بعد یہ دلچسپ محفل ڈھائی بجے برخاست ہوئی۔

جلسۂ تقسیم اسناد ۱۲ مارچ ۱۹۴۳ء کو بوقت ۶ ساعت شام زیر صدارت مولوی عبدالحمید صاحب بی اے۔ ڈویژنل افسر جلسۂ تقسیم اسناد و انعامات منعقد ہوا۔ گلپوشی کے بعد مولوی عبدالرحمن صاحب عطا نے بعنوان "ادارہ ادبیات اردو شاخ چیتاپور کی کہانی عطا کی زبانی" ایک نظم سنائی۔

پیامات عارف صاحب نے نواب مہدی یار جنگ بہادر صدر المہام تعلیمات، ڈاکٹر سید محی الدین صاحب قادری زور، نواب بہادر یار جنگ بہادر اور پنڈت راگھوندر راؤ صاحب جذب وکیل عالمپور کے پیامات پڑھ کر سنائے جو ہیم اردو کے لئے اصحاب معززنے معتمد کے نام روانہ کئے تھے۔ محمد اسمٰعیل صاحب نے ہماری زبان نامی نظم سنائی جس کے بعد سید فرید علی صاحب سیف دار نے پنڈت راگھوندر راؤ صاحب جذب کی

ایک رباعی اور ایک نظم سنائی جو خاص طور سے یوم اردو کے لئے زبان اردو کی توصیف میں لکھی گئی تھی۔ معتمد نے ادارہ کی ہمہ گیری پر روشنی ڈالتے ہوئے مقامی اصحاب سے تعاون کی درخواست کی۔ اور امتحانات ادارہ بابتہ ۱۹۴۲ء میں کامیابی حاصل کرنے والوں کو اسناد و تمغے مرحمت کرنے کی جناب صدر سے استدعا کی۔ چنانچہ حسب تفصیل ذیل انعامات و اسناد تقسیم کئے گئے۔

اسناد و انعامات امتحان اردو عالم، شریک ۶ کامیاب

علاء الدین صاحب ریاست میں اول۔ طلائی تمغہ معطیہ آنریبل سر عبدالعزیز صاحب صدر المہام عدالت۔

ضیاء الدین صاحب مرکز میں اول۔ نقرئی تمغہ معطیہ مولوی عبدالحمید صاحب بی اے۔ ڈویژن افسر۔

محمد عمر صاحب ریاست میں دوم۔ نقرئی تمغہ معطیہ مولوی عبدالقادر خاں صاحب ناصر تحصیلدار۔

اردو زبان دانی، شریک ۵ کامیاب۔ اللہ بخش مرکز میں اول نقرئی تمغہ معطیہ ڈاکٹر میرزا غوث بیگ صاحب۔

اردو دانی ۱۰ شریک ۹ کامیاب۔ ذکور مرکز میں اول۔ عبدالستار خاں یوسف زئی نقرئی تمغہ معطیہ مولوی عزیز الدین صاحب وکیل۔

اردو دانی ۵ شریک ۵ کامیاب اناث۔ عزیز بانو اختر پاشا ریاست میں اول نقرئی تمغہ معطیہ سکینہ بیگم صاحبہ معتمد شعبۂ نسواں صدر ادارہ۔

عزیز بانو مرکز میں اول نقرئی تمغہ معطیہ میر صدیق علی صاحب

تقسیم اسناد و انعامات کے بعد حمید الدین صاحب نے ایک نظم اردو کی تعریف میں پڑھی۔ آخر میں صدر جلسہ نے یوم اردو کی اہمیت کو بتاتے ہوئے رباعیات اور نظموں کے حوالہ سے حاضرین جلسہ کو اردو کی خدمت کرنے اور ادارہ کی امداد کرنے کی طرف متوجہ فرمایا۔

سلطان العلوم کو دعائے سلامتی کے بعد معتمد نے حاضرین کا شکریہ ادا کیا اور سر مغرب یہ جلسہ برخاست ہوا۔

اردو انسائیکلوپیڈیا کا کام

اردو انسائیکلوپیڈیا کی مجلس انتظامی کا ایک جلسہ بتاریخ ۱۱ مارچ ۱۹۴۳ء ساڑھے پانچ بجے دن ادارہ کے دفتر میں منعقد ہوا جس میں حسب ذیل ارکان نے شرکت فرمائی۔

۱۔ ڈاکٹر سید محی الدین قادری صاحب زور ..... صدر
۲۔ ڈاکٹر رضی الدین صاحب صدیقی ایم اے پی ایچ ڈی۔ ڈی ایس سی۔
۳۔ ڈاکٹر محمد راحت اللہ خاں صاحب ایم اے۔ ڈی فل۔ (آکسن)
۴۔ مولوی سید شاہ محمد صاحب ایم ایس سی۔
۵۔ مولوی سید بادشاہ حسین صاحب۔
۶۔ مولوی فیض محمد صاحب بی اے۔ ایم ایڈ ..... معتمد

سب سے پہلے معتمدین نے طباعت کے مسئلہ کو حل کرنے کی کارروائی پیش کی جس پر تبادلۂ خیال ہوا اور دار الطبع۔ الہ آباد پریس۔ اعظم اسٹیم پریس کے نمونوں اور بنیادی ٹائپ کے مطبوعہ نمونے پر وضاحت اور کفایت کے اعتبار سے غور کیا گیا۔ اور اس مسئلہ کو مزید غور کی خاطر آیندہ کے لیے اٹھا رکھا گیا۔

الف ممدودہ کے الفاظ کے آخری بار انتخاب کا کام شروع کیا گیا۔ اور ایک کثیر تعداد میں غیر ضروری الفاظ خارج کئے گئے۔

انتخاب کے بعد طے پایا کہ خارج شدہ الفاظ کی فہرست تیار کرکے متعلقہ مضامین کے حضرات کے پاس روانہ کی جائے تاکہ خارج شدہ الفاظ میں سے جو ان کی رائے میں ضروری سمجھے جائیں ان پر مجلس میں مکرر غور کیا جائے۔

طے پایا کہ ہر مضمون کی فہرست مکمل ہونے کے بعد مضمون سے متعلق شعبے کے حضرات کو مجلس انتظامی کے ساتھ تبادلۂ خیال

کرنے کی دعوت دی جائے اور ماہرین کی موجودگی میں ان کی رائے حاصل کر کے حذف و اضافہ کیا جائے۔

دوسرا اجلاس

اردو انسائیکلوپیڈیا کی مجلس انتظامی کا ایک دوسرا اجلاس بتاریخ ۲۸ مارچ ۱۹۴۳ء ادارے کے دفتر میں شام کے ساڑھے پانچ بجے منعقد ہوا جس میں ذیل حضرات نے شرکت فرمائی۔

۱. ڈاکٹر سید محی الدین صاحب قادری زور ——— صدر۔
۲. پروفیسر وحید الرحمن صاحب صدر شعبۂ طبعیات جامعہ عثمانیہ۔
۳. ڈاکٹر سید حسین صاحب ایم اے پی ایچ ڈی (لندن) ممبر ۔ ۔
۴. ڈاکٹر رضی الدین صاحب صدیقی ایم اے پی ایچ ڈی۔ ڈی ایس سی۔
۵. مولوی نعیم احمد صاحب عثمانی ایم ایس سی۔
۶. پروفیسر محمد علی خاں صاحب اے آر سی ایس۔ بی ایس سی (لندن)،
۷. ڈاکٹر محمد راحت اللہ خاں صاحب ایم اے۔ ڈی فل (آکسن)
۸. مولوی عبد المجید صاحب صدیقی ایم اے۔ ایل ایل بی۔
۹. مولوی عبد القادر صاحب صدیقی ایم اے۔
۱۰. مسٹر گنیش چند۔ بی اے۔ ڈپ ایڈ۔
۱۱. مولوی سید بادشاہ حسین صاحب ——— معتمد
۱۲. فیض محمد صدیقی بی اے۔ ایم ایڈ ——— معتمد

اس جلسہ میں ادارہ کی مرتب کردہ فہرست طبعیات جو ڈاکٹر رضی الدین صاحب صدیقی کے یہاں نظر ثانی کی غرض سے روانہ کی گئی تھی پیش کی گئی۔ اور کام کے نقطۂ نظر کے لحاظ سے الفاظ کا انتخاب کیا گیا۔ وقت کی کمی کے باعث کام ختم نہ ہو سکا۔ اور بقیہ حصہ مع فہرست کے ساتھ پروفیسر وحید الرحمن صاحب صدر شعبۂ طبعیات جامعہ عثمانیہ کو نظر ثانی اور مشورہ کے لیے دیا گیا تاکہ آئندہ اجلاس میں الفاظ کے انتخاب میں مزید سہولت ہو سکے۔

ڈاکٹر رضی الدین صاحب صدیقی نے یہ رائے دی کہ سائنس و ریاضیات کی مصطلحات کی فہرست علیحدہ تیار کی جائے اور سائنس دانوں اور ریاضی دانوں کی فہرست علیحدہ تیار کی جائے۔ نیز آپ کی یہ تحریک بھی منظور ہوئی کہ علوم میں بھی جہاں ایسی تقسیم مفید ثابت ہو وہیں عمل کیا جائے۔

وقت کی کمی کے باعث اس جلسہ میں تعلیمیات اور جغرافیہ کے الفاظ کے انتخاب کا کام نہ ہو سکا۔

بیڑ میں اردو کی نمائش

۲۹ و ۳۰ مارچ ۱۹۴۳ء کو بیڑ میں ضلع کانفرنس بصدارت مولوی سید علی اصغر صاحب بلگرامی صوبہ دار اورنگ آباد منعقد ہوئی۔ اور اس سلسلے میں مصنوعات ملکی و نمائش جانوران کی گئی تھی۔ مسٹر چکرپانی صاحب مہتمم مارکٹ پرلی صدر شعبۂ طلبہ کو ادارہ سے خاص دلچسپی ہے چنانچہ موصوف خود اپنے اخراجات سے محمد سعید الدین صاحب صدیقی منتظم کتب خانہ شعبۂ طلبہ کو اپنے ساتھ بیڑ لے گئے تاکہ بیڑ میں ادارہ کی طرف سے اردو کے کاموں کی نمائش کی جائے۔ ہزارہا لوگوں نے اس نمائش کو دیکھکر اظہار خوشنودی فرمایا۔ عالیجناب صوبہ دار صاحب نے ۳۰ مارچ کو تمام عہدہ داروں کے ساتھ نمائش اردو ادبیات کا معائنہ فرمایا۔ اور اظہار پسندیدگی فرمایا۔ یہ شعبۂ طلبہ کی تیسری ادبی نمائش تھی۔

مجلس ادبیات اطفال

۱۰ اپریل ۱۹۴۳ء چھ بجے کلیۂ نسوان میں مجلس ادبیات اطفال کا اجلاس منعقد ہوا جس میں حسب ذیل خواتین و اصحاب نے شرکت کی۔

۱. محترمہ رفیعہ بیگم صاحبہ (مسز زین یار جنگ بہادر) صدر
۲. ڈاکٹر سید محی الدین صاحب قادری زور

۳۔ محترمہ جہاں بانو بیگم صاحبہ ایم اے۔

۴۔ ہادی حسن صاحب بگرامی بی اے (آنرز)

۵۔ سعیدہ مظہر صاحبہ۔

۶۔ رفیعہ سلطانیہ صاحبہ۔

۷۔ سلطانہ عزیز صاحبہ

۸۔ سیدہ جعفری صاحبہ

۹۔ رضیہ بیگم صاحبہ

۱۰۔ رابعہ بیگم صاحبہ

۱۱۔ میر حسن ایم اے ——— معتمد

ڈاکٹر زور صاحب نے چار نئے مسودے پیش فرمائے۔

(۱) حیدرآباد از رفیعہ سلطانہ (۲) غالب از سعیدہ مظہر (۳) نظیر اکبرآبادی از سیدہ جعفری۔ (۴) اشوک از سلطانہ عزیز

طے پایا کہ یہ چاروں مسودے شایع کرادئے جائیں۔

یہ بھی طے پایا کہ ہماری مجلسوں کی کتابیں دو قسم کی ہوں گی۔ ایک وہ جو چار تا آٹھ سال کے بچوں کے لئے لکھی جائیں گی اور دوسری وہ جن کے پڑھنے والوں کی عمر آٹھ تا چودہ سال ہوگی۔ چار سے آٹھ سال تک کے بچوں کے لئے نمبر (۶ تا ۱۱) طالبات چھٹیوں میں ایک ایک کتاب تیار کریں گی۔ ہادی حسن صاحب "چاند" پر ایک کتاب اپنی اولین فرصت میں تیار فرمادیں گے۔

طے پایا کہ مجتبیٰ حسین صاحب نقوی کو بھی مجلس ہٰذا کا رکن بنایا جائے۔ یہ تصفیہ بھی ہوا کہ "اشوک" کا مسودہ ہادی حسن صاحب کو اور نظیر اکبرآبادی کا مسودہ معتمد صاحب مجلس کو نظرثانی کے لئے دیا جائے۔

آخر میں یہ بھی طے پایا کہ خواجہ حمید الدین صاحب شاہد نائب معتمد کی واپسی کے بعد شایع شدنی مسودات کے لئے ادارۂ ادبیات اردو کے فراہم کردہ کاغذ میں سے حسب ضرورت

کاغذ حاصل کرلیا جائے۔

صدر صاحب کی یہ تحریک منظور ہوئی کہ ابرنگ کی کتاب "بہشتہ کی کھوج" کا ترجمہ کرایا جائے۔

ادارے کی عمارت

ادارۂ ادبیات اردو کی مجلس عمارت (بلڈنگ کمیٹی) کا اجلاس دفتر ادارہ میں چہارشنبہ ۱۴ اپریل ۱۹۴۳ء شام کے سات بجے منعقد ہوا جس میں حسب ذیل اصحاب نے شرکت فرمائی۔

آنریبل ڈاکٹر نواب مہدی یار جنگ بہادر صدر ادارہ ——— صدر

نواب زین یار جنگ بہادر چیف آرکیٹکٹ سرکار عالی۔

مولوی خواجہ معین الدین صاحب انصاری معتمد سیاسیات۔

مولوی سید محمد اعظم صاحب ناظم تعلیمات۔

پروفیسر حسین علی خاں صاحب پرووسٹ جامعہ عثمانیہ۔

مولوی انوار اللہ صاحب ناظم تعمیرات جامعہ عثمانیہ۔

ڈاکٹر سید محی الدین قادری زور معتمد اعزازی ادارہ ——— معتمد

مولوی محمد لیاقت اللہ خاں صاحب معتمد فینانس و نائب صدر ادارہ نے بذریعہ ٹیلیفون اطلاع دی کہ وہ اس وقت ایک سرکاری کمیٹی میں مصروف رہنے کے باعث شرکت سے معذور ہیں۔

معتمد نے ادارہ کی عمارت سے متعلق گزشتہ چار پانچ سالوں میں جو کارروائی ہوتی رہی اس کی تفصیل مختصراً بیان کی۔ اور سرکاری محکموں سے جو مراسلتیں ہوئیں اُن کا خلاصہ پیش کیا ادارہ کے لئے کسی موزوں سرکاری عمارت کی فراہمی سے متعلق مختلف متبادل تجاویز پر غور کرنے کے بعد مجلس نے بالاتفاق دو تحریکیں منظور کیں جن کے کام کا آغاز ہو چکا ہے۔

خانہ پور میں اردو اساتذہ

جب یہ اطلاع خانہ پور پہنچی کہ ادارہ ادبیات اردو کا وفد بہ سرکردگی مولوی خواجہ حمید الدین صاحب شا

خانہ پور تشریف فرما ہونے والا ہے تو کارکنان شاخ نے انعقاد جلسہ تقسیم اسناد کا انتظام شروع کر دیا۔ مولوی محمد لائق علی صاحب تحصیلدار خانہ پور نے اپنی گہری دلچسپی کا اظہار فرما کر ایک یوم قبل آبادی میں منادی کا انتظام فرما دیا۔ مولوی ابو سعد سید اسمٰعیل صاحب صدر ادارہ کی جانب سے روانہ فرمائے گئے تھے۔

مولوی عبد الرشید خاں صاحب معتمد خانگی مصروفیات کی وجہ سے شریک انتظام ہونے سے قاصر تھے، اس لئے رضا حسین صاحب صدر مدرس مدرسہ تحتانیہ نے معتمدی کے فرائض انجام دیئے۔

۱۲ اپریل ۱۹۴۳ء بوقت ۵ بجے شام مدرسہ خانہ پور میں عوام و سرکاری ملازمین اور طلبہ مدرسہ کا ایک کثیر اجتماع ہوا، جن میں قابل ذکر جناب تحصیلدار، جناب ڈاکٹر صاحب، جناب منتظم صاحب پولس، مولوی غلام احمد صاحب محرر پولس، مولوی عبد الباسط خاں صاحب سوداگر، مولوی اکرام الدین صاحب صیغہ دار مولوی محمد مولنا صاحب چیچک برار، مسٹر گنڈا رے راؤ صاحب مددگار، مولوی سید محی الدین صاحب اول مددگار مدرس تھے۔

تحریک صدارت کے بعد مولوی محمد لائق علی صاحب تحصیلدار نے کرسی صدارت کو زینت بخشی، رضا حسین صاحب صدر مدرس نے رپورٹ سنائی جس میں کامیاب امیدواروں کا تناسب سال گزشتہ کے ساتھ بیان فرمایا۔ صدر جلسہ نے مسرت کی فضا میں کامیاب امیدواروں کو اسناد تقسیم فرمانے کے بعد خطبہ صدارت ارشاد فرمایا اور آئندہ ادارہ کے کاموں میں کافی دلچسپی اور امداد کا وعدہ فرمایا۔ مولوی لائق علی صاحب صدر جلسہ ایک روشن خیال اور علم دوست معزز عہدہ دار ہیں، آپ کی شرکت و صدارت سے جلسہ بخوبی کامیاب رہا۔

خطبہ صدارت کے بعد مولوی ابو سعد سید اسمٰعیل صاحب نے اپنی تقریر میں ادارۂ ادبیات اردو کے اغراض و مقاصد پر وضاحت سے روشنی ڈالی اور یہ واضح فرمایا کہ ادارہ کی توسیع اور اشاعت وقت کی ایک اہم ترین ضرورت ہے۔

بردا پور میں جلسہ تقسیم اسناد اردو

بتاریخ ۱۰ اپریل ۱۹۴۳ء بوقت شب ادارۂ ادبیات اردو کے تقسیم اسناد کا جلسہ بمقام مدرسہ تحتانیہ بردا پور بہ تحریک قاضی سید غیاث الدین صاحب معتمد و بتائید مسٹر کرشنا جی صاحب رکن شاخ ہذا مولوی سید حسن الدین صاحب بی اے بی ٹی ناظر تعلیمات حلقہ اول ضلع بیڑ کی صدارت میں منعقد کیا گیا جس میں اراکین مجلس انتظامی و امیدواران کے علاوہ دیگر حضرات مثلاً مولوی شیخ حسین صاحب محرر پولس و مولوی محمد نصیر الدین صاحب جمعدار پولس و مولوی غلام احمد صاحب قاضی بردا پور نے بھی شرکت کی۔ جلسہ کا آغاز مولوی سید فخر الدین صاحب رکن شاخ کے قرأت و نظم سے ہوا۔

من بعد قاضی سید غیاث الدین صاحب معتمد شاخ نے گزشتہ سال کی روئداد پڑھ کر سنائی۔ مسٹر نرسنگا تمہ راؤ صاحب صدر شاخ نے زبان اردو و علم کے بارے میں تفصیل سے تقریر فرمائی۔

آخر میں عالیجناب صدر صاحب جلسہ نے مجلس انتظامی کا شکریہ ادا کرتے ہوئے دلی مسرت کا اظہار فرمایا اور نہایت موثر و مدلل تقریر فرما کر ثابت فرمایا کہ ہر ملک ہر قوم میں علم اردو ازبس ضروری ہے۔ ہر شخص کو سیکھنے کی ترغیب دلوائی اور ادارے کی اردو سندیں اپنے دست مبارک سے تقسیم کیں۔

آخر میں حاضرین کی تواضع چائے اور پان وغیرہ سے کی گئی۔

ادارہ کی نئی مطبوعات

ادارۂ ادبیات اردو کی طرف سے شروع سال یعنی جنوری ۱۹۴۳ء سے اب تک چار کتابیں شائع ہوئی ہیں جن کی

خصوصیات درج ذیل ہیں۔

ادارۂ ادبیات اردو ۱۹۴۲ء میں

تقطیع بڑی سب رس کی ضخامت ۲۰۰ سے زیادہ صفحات با تصویر قیمت ۱ روپیہ

اس کتاب میں خواجہ حمید الدین شاہد بی اے مدیر سب رس و مہتمم ادارہ نے اردو زبان اور ادب کی ان تمام خدمات کا مجمل تذکرہ قلم بند کیا ہے جو ادارے نے اپنی مختلف مجلسوں، شعبوں اور شاخوں کے ذریعہ سے انجام دیں۔ کتاب چار حصوں میں تقسیم کی گئی ہے (۱) ادارے سے متعلق عام معلومات جس میں اغراض و مقاصد۔ قواعد رکنیت، مجلس انتظامی، مختصر تاریخ ادارہ ادارے کی شاخیں اور اس کے سالانہ اجلاسوں سے متعلق ضروری باتیں درج ہیں۔

(۲) ادارے کے شعبے۔ اس عنوان کے تحت ادارے کے جملہ شعبوں مثلاً اردو امتحانات، اردو انسائیکلوپیڈیا، ادب اطفال، نسوان، طلبہ، تاریخ دکن، شعرا و مصنفین دکن اور کتب خانہ وغیرہ کا تفصیلی کام بیان کیا گیا ہے۔

تیسرا حصہ ادارے کی شاخوں کے لئے وقف کیا گیا ہے جس میں ادارے کی جملہ شاخوں نے ۱۹۴۲ء میں اردو کی خدمت کے سلسلہ میں جو سرگرمیاں دکھائی ہیں ان کو وضاحت سے قلمبند کیا گیا ہے۔

اس کتاب کا چوتھا حصہ ان علمی صحبتوں کے لئے وقف ہے جو اس سال ادارہ میں منعقد ہوئیں اور اسی سلسلہ میں مشاہیر اردو کے ادارے کے معائنے اور تاثرات بھی درج کر دیئے گئے ہیں۔

یہ کتاب اس قابل ہے کہ ہر وہ انجمن، ادارہ یا کتب خانہ جو اردو کی علمی خدمت کرنا چاہتا ہے اس کو اپنے پاس محفوظ رکھے اور اس کے مطالعہ سے کام کرنے کے طریقے معلوم کرے۔

نواب ناصر الدولہ آصفجاہ چہارم

ادارے کی طرف سے اب تک پہلے تین سلاطین آصفی کے سوانح چھپ چکے ہیں اب اس سلسلہ کے چوتھے بادشاہ کے حالات زندگی مولوی سید مراد علی صاحب طالع فاضل نے مرتب کر کے شایع کئے ہیں۔ اس کتاب میں حسب ذیل عنوانوں کے تحت حضرت آصفجاہ چہارم کے ۲۹ سالہ دور حکمرانی کے حالات نہایت سادہ اور سلیس زبان میں بیان کئے گئے ہیں۔

۱۔ ولادت و تخت نشینی ۲۔ مہاراجہ چندو لال کی مدار المہامی ۳۔ صوبہ برار کا فیصلہ ۴۔ وہابیوں کا زور ۵۔ انتظام مملکت ۶۔ سیرت ۷۔ انتقال اور وصیت ۸۔ دیگر واقعات ۹۔ خاتمہ۔

کتاب با تصویر ہے اور ۳۲ صفحات میں شایع ہوئی ہے قیمت صرف چار آنے۔

ماہ لقا اور دوسری نظمیں

صفحات ۱۰۰ طباعت و کتابت پاکیزہ قیمت ایک روپیہ۔

یہ پروفیسر عزیز احمد صاحب بی اے آنرز (لندن) کے کلام کا مجموعہ ہے اس کی ابتدا میں مصنف نے اردو شاعری پر ایک نہایت دلچسپ تنقیدی نظر ڈالی ہے اور یورپ کے جدید ترین ادب سے شاعری اور رمز نگاری پر مباحث پیش کئے ہیں۔ اس مجموعہ کی نظمیں اسی جدید نقطۂ نظر کے تحت لکھی گئی ہیں۔ یہ مجموعہ اردو شاعری میں عہد آفریں ثابت ہوگا کیونکہ اس میں خیال اور طرز ادا دونوں کے لحاظ سے خاص جدت کو پیش نظر رکھا گیا ہے۔

پودوں کی کہانی خود ان کی زبانی

یہ سلسلۂ مطبوعات ادارہ کی سینتالیسویں کتاب ہے۔ اس کے مرتب شعبۂ نباتیات جامعہ عثمانیہ

کے فاضل صدر پروفیسر محمد سعید الدین بی ایس سی۔ ایم اے۔ (اڈنبرا) ایف آر ایم ایس۔ ایف ایف ایس سی۔ ایف ایل ایس (لندن) ہیں یہ ایک باتصویر کتاب ہے جس کے ہر صفحہ پر پودوں اور ان کے اجزاء کی نہایت دیدہ زیب تصویریں شریک ہیں۔ مصنف اپنے فن کے خاص ماہر ہیں اور انھوں نے اس کتاب کو پانچ ابواب میں تقسیم کیا ہے جن کی تفصیل یہ ہے۔

۱۔ ہماری عام خصوصیت۔

۲۔ ہم کس طرح توانائی اور غذا حاصل کرتے ہیں۔

۳۔ نائیٹروجن کا مبداء اور اس کی رسد۔

۴۔ ہمارے دوسرے ساتھی۔

۵۔ ہمارے پھلوں اور بیجوں کا انتشار۔

کتاب خود پودوں کی زبان سے لکھوائی گئی ہے اور طلبا اور عوام اس کو بہت شوق سے پڑھیں گے۔ اردو میں باتصویر اور پر از معلومات کتابوں کی جو کمی ہے وہ ایسی ہی کتابوں کی اشاعت سے رفع ہو سکتی ہے۔

ادارے کی زیر طبع کتابیں اس وقت حسب ذیل تین کتابیں چھپ رہی ہیں جو آئندہ مہینے شائع ہو کر منظر عام پر آجائیں گی۔

ہندستانی تمدن از پروفیسر ڈاکٹر ایشور ٹوپا ایم اے پی ایچ ڈی ریڈر تاریخ تمدن ہند جامعۂ عثمانیہ۔

یہ تقریباً پانچ سو صفحات کی ایک ضخیم کتاب ہے جس میں فاضل پروفیسر صاحب نے ہندستان کے قدیم تمدن کو دس ابواب میں شرح و بسط اور تحقیق کے ساتھ بیان کیا ہے۔ اس موضوع پر اردو تو کجا کسی اور زبان میں بھی ایسی عالمانہ

کتاب اب تک نہیں لکھی گئی تھی۔ اس کی مزید تفصیلات اور قیمت وغیرہ کے متعلق آئندہ اطلاع دی جائے گی۔

سچ کا جادو یہ بچوں کے لئے ایک سبق آموز ڈرامہ ہے جس کے مصنف مولوی علی بن عبد الحبیب الحضرمی مددگار مدرسہ فوقانیہ نرمل ہیں۔ اس کو بارہا اسٹیج پر کامیابی سے پیش کیا جا چکا ہے۔ مجلس ادب اطفال نے اضلاع کے بچوں کے لئے اسی غرض سے اشاعت کے لئے منتخب کیا ہے۔

باتیں از مولوی شجاع احمد صاحب قائد۔ اس کتاب میں بھی بچوں کے لئے سلیس اور سادہ زبان میں دلچسپ اور مفید مکالمے اور باتیں قلمبند کی گئی ہیں۔ اس کے مصنف مولوی شجاع احمد صاحب کو بچوں کے لئے کتابیں اور مضامین لکھنے کی خاص مہارت ہے توقع ہے کہ یہ کتاب چھوٹے بچوں کے ادب کی کمی کو پورا کرے گی جس کی طرف ادارہ خاص طور پر متوجہ ہے۔

ان تین کتابوں کے علاوہ اور بھی کتابیں زیر طبع ہیں جن کا تذکرہ آئندہ مطبوعات کے سلسلہ میں درج رہے گا۔ کیونکہ ان کی اشاعت کے لئے کئی ہفتے درکار ہیں۔

ادارے کے وفد کا دورۂ اضلاع

ادارے کی بعض شاخوں کی یہ خواہش تھی کہ ان کی طرف سے اضلاع اور دیہات میں اردو کی جو مخلصانہ خدمات انجام دی جا رہی ہیں ان کے معائنے اور تبادلۂ خیال کے لئے مرکزی ادارے کی جانب سے موقع بموقع ذمہ دار اصحاب کو روانہ کیا جائے۔ چنانچہ اسی کے پیش نظر ایک وفد ۳ خورداد مطابق ۱۰ اپریل سنہ ۱۹۴۳ء کی صبح میں خواجہ حمید الدین شاہد بی اے مدیر سب رس و مہتمم ادارہ کی قیادت میں سمت اورنگ آباد کے دورے کے لئے روانہ ہوا۔ اس وفد میں مہتمم ادارہ کے علاوہ

مولوی شیخ رحیم الدین صاحب کمال ظہیر آبادی سابق نائب صدر شعبۂ طلبہ اور مولوی تحسین سروری صاحب شریک ہیں۔ وفد کی روانگی سے قبل نظام العمل مقامی اخبارات میں شائع کیا گیا اور جملہ شاخوں کے ارباب کار کو بھی بذریعہ مراسلہ جات اطلاع دیدی گئی اور ہدایت کی گئی کہ شاخ کے کاروبار۔ طلبا و طالبات اردو کی تعلیم و ترویج کے انتظامات کے معائنے کے علاوہ مقامی دشواریوں اور ضرورتوں سے بھی وفد کو واقف کرائیں۔ اور اگر ممکن ہو سکے تو اطراف و اکناف کے مقامات کے طلبہ و بہی خواہان اردو کو بھی وفد کی آمد کے روز اپنے مستقر پر جمع کریں تاکہ زیادہ سے زیادہ لوگوں سے ملنے اور تبادلۂ خیال کا موقع ملے۔ ساتھ ہی چند ضروری معلومات کی فراہمی کے لئے بھی ہدایت کی گئی جن کی تفصیل آئندہ درج کی جائے گی۔ یہ وفد حسب ذیل مقامات کا دورہ کر رہا ہے۔

کاماریڈی، نظام آباد، خانہ پور، نرمل، بھینسہ، بلولی، نرسی، پربھنی، ہنگولی، بسمت نگر، بیڑ، اورنگ آباد، بھلمری، داور واڑی، پیٹن، گنگا پور، خلد آباد، پرلی، مومن آباد، ریناپور اور برداپور وغیرہ

توقع ہے کہ وفد ادارہ اور اضلاع اور دیہات کے ہمدردان اردو کے اس طرح کے میل جول اور تبادلۂ خیال کے ذریعہ سے ہم سب زیادہ قوت اور وسعت کے ساتھ اردو کی خدمت کر سکیں گے۔

وفد غالباً ختم اپریل تک واپس ہوگا اور اگر فرصت ملے تو مئی میں دوسرے مقامات کا دورہ بھی کیا جائے گا۔

اورنگ آباد میں اول تعلقدار صاحب کی صدارت میں وفد کے تعارف کے لئے جو جلسۂ عام منعقد ہوا اس کے لئے حسب ذیل اشتہارات طبع کر کے تقسیم کئے گئے۔

ادارہ ادبیات اردو

مسرت کا مقام ہے کہ ادارہ ادبیات اردو حیدرآباد کا وفد بہ قیادت خواجہ حمید الدین صاحب شاہد بی اے فائز اورنگ آباد ہوا ہے۔ بمقام بارہ دری باغ آٹولہ شاہ گنج بتاریخ ۱۳ خورداد ۱۳۵۲ف (۹) ساعت شب تعارفی جلسہ بصدارت عالیجناب نواب سید شہاب الدین خاں صاحب اول تعلقدار و سرپرست ادارہ اور ساتھ ہی غیر طرحی مشاعرہ بھی منعقد ہوگا۔ توقع کی جاتی ہے کہ شرکت جلسہ و مشاعرہ سے ممنون کیا جائے گا۔

غازی معین الدین وکیل معتمد ادارہ
ادبیات اردو شاخ اورنگ آباد

میسور میں ادارۂ ادبیات اردو

۱۲ مارچ کو شام میں پانچ بجے محلہ ونی کپل

میسور میں ایک جلسہ منعقد ہوا تاکہ ادارۂ ادبیات اردو میسور کا قیام عمل میں آئے۔ مولوی عبد الوہاب صاحب ایم اے بار ایٹ لا مولوی عبد القادر صاحب بی اے۔ مولوی محمد احمد صاحب مددگار ناظم مال۔ ڈاکٹر خضر علی خاں ایم اے پی ایچ ڈی۔ مولوی عبد الغفور صاحب پرنسپل ٹرننگ کالج۔ پروفیسر عبد القادر صاحب سروری صدر شعبہ اردو جامعہ میسور۔ ڈاکٹر عبد الخالق شریف بی اے ایم بی بی ایس۔ افسر سینی ٹوریم میسور جیسے معززین نے شرکت کی۔ اور تبادلۂ خیال کے بعد طے پایا کہ پروفیسر سروری اس مجلس کے معتمد کی حیثیت سے ادارۂ میسور کے ابتدائی انتظامات کی تکمیل کریں۔

برار میں ادارے کی شاخیں

ایوت محل اور کھام گاؤں میں ادارے کی شاخیں قائم ہو چکی ہیں جن کے کام کی تفصیلات آئندہ درج ہوں گی۔

(۳۰) [۶۶]

جنگ نامہ محمد حنیف

اوراق ۸۳ - سطور ۱۰ فی صفحہ -
تقطیع ۵" x ۹" - خط نستعلیق -
عنوانات سرخی ہیں۔ مصنف سیوک
سنہ تصنیف ۱۰۹۲ھ - سنہ کتابت
۱۲۷۰ھ -

یہ ڈھائی ہزار ابیات کی مثنوی ہے جس میں ایک غیر معروف شاعر سیوک نے ۱۰۹۲ھ میں محمد ابن حنفیہ کے یزید سے محاربات اور آخرکار ان کی شہادت بیان کی ہے۔ کتاب کسی فارسی قصہ کا ترجمہ ہے اور تاریخ سے زیادہ خیالی اور فرضی قصوں پر مشتمل ہے۔ سیوک دکنی تھا لیکن یہ پتہ نہ چل سکا کہ گولکنڈہ سے اس کا تعلق تھا یا بیجاپور سے، بہرحال یہ کتاب زوال دکن کے پانچ سات سال قبل قلمبند کی گئی ہے۔ مقام تصنیف کی طرح مصنف کے مذہب کا بھی پتہ نہیں چلتا ممکن ہے کہ وہ غیر مسلم ہو۔ ادارے کے اِس نسخے کے علاوہ اس کتاب کے دو اور نسخے اس وقت موجود ہیں :-

۱- نسخہ انڈیا آفس (بلوم ہارٹ نمبر ۱۰۸)۔
۲- نسخہ جامعہ عثمانیہ (سرسری فہرست مخطوطات صفحہ ۹۶)۔

لیکن ان تینوں نسخوں میں حمد و نعت و منقبت کے اشعار موجود نہیں ہیں۔ تینوں نسخے اِسی بیت سے شروع ہوتے ہیں ؎

کہوں یک جنگ شاہ شیر زماں　　حسین شاہ ابن علی جوانان

مصنف کا تخلص ہر نسخے میں واضح طور پر بار بار آیا ہے۔ اس لئے اس میں شبہ نہیں۔

جنگ نامہ کے قصہ کا خلاصہ کتاب "یورپ میں دکنی مخطوطات" کے صفحات ۱۴۲ و ۱۴۳ پر شایع ہوچکا ہے۔ زبان و اسلوب دونوں سے ظاہر ہوتا ہے کہ مصنف معمولی درجہ کا شاعر تھا۔

آغاز :-

کہوں یک جنگ شاہ شیر زماں　　حسین شاہ ابن علی جوانان
سو اس شاہ کا او عزب علائی تھا　　ابا ایک جور بھائی دو مائی تھا

اختتام :-

نپٹ تلملیا آہ مارن لگیا　　اخی یا اخی کر پکارن لگیا
مرتب ہوا جنگ نامہ تمام　　درود بر محمد ہزاراں سلام
ہوا جنگ یو مختصر سب تمام　　کہ دکنی کرے لفظ حسن الکلام

ترقیمہ :-

"تحریر فی التاریخ نوزدہم شہر شوال المکرم ۱۲۷۰ھ۔"
"مجی ڈاکٹر زور کی خدمت میں تحفہ۔ ہاشمی"

اس نسخہ کو مولوی نصیر الدین صاحب ہاشمی نے ۱۹۳۵ء میں راقم الحروف کو بطور تحفہ عطا کیا تھا اور اب یہ ادارے کے کتب خانے میں داخل ہے۔

اِس نسخہ کے آخری حصہ میں جامعہ عثمانیہ کے نسخہ کی طرح چند ابیات نہیں ہیں۔ کیونکہ انڈیا آفس میں جو نسخہ ہے اس کا اختتام ان ابیات پر ہوتا ہے جن میں تاریخ تالیف وغیرہ بھی درج ہے۔

یہ جنگ علیا کیا سر بسر　　تھی تاریخ تدان جان خیر البشر

یو سیوک تو ہجری کیرے سال تھے — ہزار یک نود دو کے اپرال تھے
اسے سیوک بنام رسول عجم — محمد حنیف شہ کا کر جنگ ختم
ہے سیوک غلام نبی کا سچا — شفا کر شفا کر شفا کر شفا
اتھا یو قصہ فارسی سوں اول — کیا دکھنی میں ترجمہ منج بدل
ختم کرتوں سیوک دعا پر کلام — بحق محمد علیہ السلام

ادارے کے نسخے میں شاعر کا تخلص اوراق ۹۸ الف اور ۹۲ ب کی ابیات میں درج ہے۔

(۳۱) روضۃ الشہداء [۱۴۰]

اوراق ۲۰۳ - سطور ۱۴ فی صفحہ -
تقطیع ۸ × ۵½ - خط نستعلیق - عنوانات
اور حاشیہ سرخی میں - مصنف میر ولی فیاض
ویلوری - سنہ تصنیف ۱۱۳۷ھ کاتب غیبی
سنہ کتابت ۱۱۷۰ھ -

یہ تقریباً ۵۰۰۰ ابیات کی طویل دکنی مثنوی ہے جو ملا حسین واعظ الکاشفی کی فارسی روضۃ الشہداء کا ترجمہ ہے - فارسی کتاب نثر میں ہے - ولیؔ نے اس کا بڑا کامیاب ترجمہ کیا ہے یہ مثنوی دس مجلسوں پر مشتمل ہے اور اسی لئے وہ مجلس بھی کہلاتی ہے۔

اس کا مصنف ویلور (علاقہ مدراس) کا متوطن چٹ پیٹھ کا جاگیردار اور پختہ مشق شاعر تھا - پہلے سات گڈھ میں حراست خاں صوبہ دار کا اور بعد کو سدھوٹ میں عبدالمجید خاں قلعدار کا متوسل رہا - آخرکار ارکاٹ میں شاید ۱۱۵۰ھ میں وفات پائی - روضۃ الشہداء کے علاوہ اور کتابیں بھی لکھیں جن میں "رتن پدم" (تقریباً ۴۰۰۰ ابیات میں) مشہور ہیں جو ٹیپو سلطان کے کتب خانہ میں موجود تھی

روضۃ الشہدا دبمبئی میں ۱۲۹۱ھ و ۱۲۹۶ھ میں چھپ بھی چکی ہے لیکن مطبوعہ نسخے کمیاب ہیں - یورپ میں اس کے تین قلمی نسخے (دو انڈیا آفس میں اور ایک رائل ایشیاٹک سوسائٹی لندن میں) موجود ہیں۔ نواب سالار جنگ بہادر کے کتب خانے میں اس کے چھے نسخے (۱۱۳۷ھ، ۱۱۵۹ھ - ۱۱۵۹ھ - ۱۲۲۴ھ و ۱۲۳۲ھ کے مکتوبہ) ہیں۔

اس کتاب کے سنہ تصنیف میں اب تک غلط فہمی رہی - شمس اللہ قادری نے اُردوئے قدیم میں ۱۱۱۹ھ۔ پروفسر سروری نے فہرست مخطوطات میں ۱۱۰۹ھ۔ اور نصیر الدین ہاشمی صاحب نے اُردوئے قدیم میں ۱۱۳۰ھ لکھا ہے - لیکن ادارے کے دونوں نسخوں میں ۱۱۳۷ھ لکھا ہے جو بالکل صحیح ہے کیونکہ نواب سالار جنگ بہادر کے یہاں اسی سنہ کا لکھا ہوا جو مخطوطہ موجود ہے اس میں نہ صرف متن کتاب میں بلکہ ترقیمے میں بھی سنہ تصنیف ۱۱۳۷ھ صاف طور پر درج ہے - نواب صاحب کا یہ نسخہ نہایت اہم ہے کیونکہ اس سے نہ صرف سنہ بلکہ مصنف کا صحیح نام بھی معلوم ہوجاتا ہے - بعض لوگوں نے غلطی سے ولی کا نام سیّد مُحمّد فیاض لکھا ہے (دیکھو اردوئے قدیم صفحہ ۱۰۰) لیکن سالار جنگ بہادر کے اس اہم نسخے کے حسب ذیل ترقیمے سے یہ غلط فہمی بھی رفع ہوجاتی ہے:-

" ۱۱۳۷ ہجری کتاب دکھنی روضہ دربیان
امام حسین علیہ الصلوٰۃ والسّلام تصنیف
میر ولی فیاض صاحب سجاد منوچہر کردہ اند
واللہ اعلم بالصواب تمت تمام شد

کاتب الحروف سید وجہ اللہ حیدری
ولد سید بڑے منوچہری در مقام ایلور
روز یکشنبہ بوقت سہ پہر بتاریخ غرہ ذیحجہ
۱۱۳۹ھ مطابق ۱۱۳۶ فصلی"

اس عبارت کے درمیان ایک بیضوی مہر میں
"سید جاہ محمد خاں ۱۱۳۰ھ" کندہ ہے
اور اس کے نیچے لکھا ہے :-
"مالکہ سید جاہ محمد خاں ولد سید شاہ محمد خاں"
کتاب کے سرورق کی حسب ذیل عبارت سے معلوم
ہوتا ہے کہ اُس زمانہ میں قلمی نسخے کتنے گراں بہا تھے

"جلد اوراق کتاب روضۃ الشہداء
یکصد و نود بقیمت سہ صد و نیم روپیہ
بمعرفت شیخ لعل و غلام علی بیگ در
قلعہ ایلور گرفتہ شد۔ مالکہ سید جاہ محمد خاں
ولد سید شاہ محمد خاں بتاریخ پانزدھم
شہر ذی حجہ ۱۱۶۲ھ مطابق ۱۱۵۹ف
در سنہ ۲ احمد شاہی۔"

ادارے کا زیر نظر نسخہ بھی مکمل اور قدیم ہونے
کی وجہ سے بے حد اہم ہے۔

آغاز :-

کروں نامے کوں بسم اللہ سوں آغاز
اچھوں تا ہیں فصاحت سوں سرافراز
سراؤں کیا اسے جز یک سخن میں
بندیا جیو دم کے رشتے سوں بدن میں

اختتام :-

کیا ہوں ختم جب یو درد کا قال — اگیارہ سو پہ تھا سینتیسواں سال
زمانہ مہدی آخر زماں کا — اتھا اوس باعث امن و اماں کا
ولی اب مکو رقم ہو ختم کر بات — نبی ہور آل پر نت بول صلوات

ترقیمہ :-

کیا ہوں نقل روضے کی تمامی — بہ تصنیف ولی الفاظ نامی
اگیارہ سو او پر ستر تھی ہجری — ہوا مرقوم روضہ وقت فجری
جمادی الاخر اس مہینے کے دیاں — دوشنبہ ہی نویں کو ختم ہے جاں
لکھیا غیبی نے لکھ کر ہوش اوڑائے — ملے لکھتے و پڑتے ہوش اوڑجائے
کہ سر سوں پانوں لک درد شہیداں — بھریا ہے غم اماین سب شہیداں
مرتب شد رقم سوں نامہ اکرام — بحق سید و الاد عظام
جو مجلس کے سخن ہار ہور پڑنہار — تحیت خواہ مخواہ بھیجیں بہ تکرار

نیچے نواب عنایت جنگ بہادر کی چھوٹی سی مستطیل
مہر ہے جس پر "عنایت جنگ ۱۲۴۳ھ" کندہ ہے
یہ کتاب ان ہی کی عطیہ ہے۔

---

(۳۲) روضۃ الشہداء [۸]

اوراق ۲۲۱۔ سطور ۱۳ فی صفحہ۔
تقطیع ۵½ × ۸"۔ خط نستعلیق۔ عنوان
سرخی میں۔ مصنف میر ولی فیاض ویلوری
سنہ تصنیف ۱۱۳۷ھ

یہ مخطوطہ نمبر ۳۱ کا دوسرا نسخہ ہے جس میں
ابتدائی ایک ورق نہیں ہے اور جملہ ۲۳ ابیات کم ہیں
ان ابیات سے یہ نسخہ شروع ہوتا ہے :-

آغاز :-

نواجامہ حسین سرور کے تن میں — پنائے سی کوں جیوں گل پیرہن میں
کہے حضرت کی تم خدمت میں جاؤ — نواجامہ یو پہنے سو دکھاؤ

اختتام :-

کیا ہوں ختم جب یو درد کا حال — اگیارہ سو پہ تھا سیتی سوال سال
زمانہ مہدی آخر زماں کا — اتھا اس باعث امن و اماں کا
وجدی اب رکھ قلم ہور ختم کر بات — نبی ہور آل اوپر بول صلوٰۃ

کوئی ترقیمہ نہیں ۔ اواخر بارہویں یا اوائل تیرہویں صدی کی کتابت ہے ۔ آخری صفحہ کے گوشے میں نصیر الدین ہاشمی صاحب کے دستخط ہیں کہ :-

" تحفہ بخدمت محبی ڈاکٹر زور صاحب ۔ ہاشمی ۔
۲۷ ر رمضان ۱۳۵۹ھ "

یہ نسخہ ہاشمی صاحب کا راقم الحروف کے لیے تحفہ تھا جس کو راقم نے اپنی دوسری کتابوں کے ساتھ ادارۂ ادبیات اُردو کے کتب خانہ میں داخل کر دیا ہے ۔

---

(۳۳) پنچھی باچھا [۱۵۸]

ورق ۱۲۴ ۔ سطور ۱۵ فی صفحہ ۔
تقطیع ۵½ × ۸ ۔ خط نستعلیق ۔ عنوانات
سرخی میں ۔ مصنف وجدی ۔ سنہ تصنیف ۱۱۴۶ھ
کاتب محمد قمر الدین ۔ سنہ کتابت ۔ ۱۲۶۳ھ

شیخ فریدالدین عطار کی منطق الطیر کا دکنی ترجمہ ہے جس کو شیخ وجیہہ الدین وجدی نے ۱۱۴۶ھ میں مثنوی کی شکل میں قلمبند کیا ۔ وجدی زوال سلاطین دکن کے بعد کے ایک مشہور صوفی شاعر تھے جنہوں نے قدیم ذوق سخن کو جاری رکھا ۔ یہ شیخ دکنی طرز کے آخری شعرا میں سے ہیں ۔ انھوں نے شیخ فریدالدین عطار کی ایک اور فارسی مثنوی گل و ہرمز کا تحفۂ عاشقاں کے نام سے ۱۱۵۱ھ میں ترجمہ کیا تھا ۔ اس کے علاوہ اور کتابیں باغ جاں فزا (۱۱۲۵ھ) وغیرہ بھی لکھی تھیں ۔ ان کا ایک دیوان بھی تھا جو اب تک دستیاب نہ ہو سکا ۔ البتہ ان کی کئی غزلیں بیاضوں میں ملتی ہیں جن میں سے منتخب اشعار یہ ہیں :-

چنچل کا آج بچھڑا مجھ اُپر بھاری ہوا یاراں
تو میں اس دو جگت سیتیں نرآدھاری ہوا یاراں
ہماری بت پرستی کوں نہیں سمجھے اجھوں زاہد
برائے کفر ست دیں کو تو پو جاری ہوا یاراں
نکو کہہ وجدیا اپنیاں نیٹ سب وصل کیاں باتاں
کتے ہیں لوگ سب تجہ کوں کہ زناری ہوا یاراں

کٹی ہے عمر سب میری سدا صورت پرستی میں
سیٹا ہے حسن کا مد مجھ سو ہشیاری تھے مستی میں
نکل جا وجدیا شیخی کے شیویاں کی جھنجھ سیتے
اگر مقصود خود حاصل کیا ہے بت پرستی میں

تِل دیکھ کر سکھی کا یک تِل میں بھُل گیا ہوں
اُس حسن کا سو مد پی ستی سوں جھُل گیا ہوں
وجدی کوں آج حاجت کس کیف سوں نہیں ہے ۔
لڑیا بھونک پرت کا کیفاں میں گھُل گیا ہوں

یہ تینوں غزلیں نواب نصیر الدین خاں صاحب ایم ۔ اے ناظم دفتر دیوانی کی خاندانی بیاض کے صفحات ۲۹ و ۳۰ پر

درج ہیں۔

"پنچھی باچھا" کے نسخے یورپ کے کتب خانوں کے علاوہ حیدرآباد میں کتب خانہ آصفیہ، جامعہ عثمانیہ و نواب سالار جنگ بہادر وغیرہ میں بھی موجود ہیں۔ فہرست اُردوئے مخطوطات، دکن میں اُردو، اردوئے قدیم وغیرہ میں اس کا ذکر درج ہے۔ یہ کتاب مدراس میں ۱۲۴۳ھ و ۱۳۱۲ھ اور بمبئی میں ۱۲۸۰ھ و ۱۳۱۹ھ میں چھپ چکی ہے۔ ادارے کے نسخے میں تقریباً ۲۵۰۰ ابیات ہیں

آغاز:-

اے پنچھی پیارے سخن آغاز کر	حمد سوں حق کے بلند آواز کر
شوق سوں ایسا اوچا یک جھبا	جی رہے ترلوک کا عالم لوبھا

اختتام:-

اس تجارت کا مجھے بس یو نفا	بے کریں مجکوں دعا دل سوں صفا
تا کہ بخشے جائیں میرے سب گناہ	ہووے اجلا یو مرا نامہ سیاہ
اس منے ہوتا ہے یارب میرا کام	شکر ہے ہے ہوئے پنچھی باچھا تمام
جب کیا تاریخ کا دل میں حساب	تب ہوا میزاں میں کیا خاصی کتاب

ترقیمہ:-

"تمام شد منطق الطیر فریدالدین عطار قدس اللہ سرہ در زبان دکنی معروف پنچھی باچا تالیف شیخ وجیدالدین وجدی بوقت استوی روز سہ شنبہ تاریخ چہاردہم شہر رجب المرجب ۱۲۹۳ھ یکہزار و دو صد و شصت و نہ ہجری بید فقیر الحقیر محمد قمرالدین ابن شاہ رحمت اللہ قادری نوراللہ قلبہ بنورالایمان والعرفان حسب الخواہش مجمع اشفاق یگانہ آفاق، صداقت پناہ، صداقت دستگاہ منبع فتوت واتحاد، مجمع مروت و وداد حسینی صاحب دام اشفاقہ بقلم آمد۔ بحق محمد و آل محمد صلی اللہ علیہ وسلم"۔

ترقیمے کے نیچے معلیٰ کتاب نواب عنایت جنگ بہادر کے دستخط ۱۳۴۲ھ ہیں اور ایک بیضوی مہر بھی ثبت ہے جس سے ان کے نام کا سجع "مصدر الطاف و عنایت حسینؑ" نکلتا ہے اس مہر میں ۱۳۳۶ھ کندہ ہے۔

---

(۳۴) پنچھی باچھا [۵۸]

اوراق ۱۵۸۔ سطور ۱۱ فی صفحہ۔
تقطیع ½۶" × ½۱۰"۔ خط نستعلیق۔ عنوانات سرخی میں۔ مصنف وجدی۔ سنہ تصنیف ۱۱۲۶ھ۔ کاتب خواجہ امین الدین۔
سنہ کتابت ۱۲۹۳ھ۔ بمقام رسول آباد۔

کتاب نمبر ۳۱ کا دوسرا نسخہ ہے جس میں تقریباً ۲۴۰۰ ابیات ہیں۔ اتفاق کی بات ہے کہ دونوں نسخے ایک ہی سال نقل کیے گئے ہیں۔ زیر نظر نسخہ چار ماہ ۱۶ دن قبل نقل ہوا ہے۔

ابتدائی ابیات میں کوئی فرق نہیں ہے۔ البتہ آخر کی دو بیتوں میں خفیف سا فرق ہے۔

اختتام:-

اس منے یارب مرا ہونا ہو کام	شکر کر جو ہوی پنچھی باچا تمام
جب کیا تاریخ کا دل میں حساب	تب ہوا میزان میں کیا خاص کتاب

ترقیمہ:-

"منطق الطیر عرف پنچھی باچا بتاریخ غرہ شہر صفر روز شنبہ

باوقت ظہر بید اضعف العباد خواجہ امین الدین عرف خواجہ
دبیر ساکن رسول آباد و ۱۲۶۳ھ "

---

(۳۵) پنچھی باچھا [۵۱۱]

اوراق ۸ - سطور ۱۲ متن میں - ۱۴ حاشیے پر
تقطیع ۶" × ۱۰½" - خط نستعلیق -
مصنف وجدی - سنہ تصنیف ۱۱۴۶ھ
سنہ کتابت - ۱۲۸۶ھ

مخطوطات نمبر ۳۱ و ۳۲ کا ایک ناقص نسخہ ہے جس کے سرورق پر کتاب کا نام اس طرح لکھا ہے -

" پنچھی نامہ شیخ فرید الدین عطار کا کہا ہوا یعنے جس کو من تیغ کہتے ہیں "

اسی کے نیچے مالک کتاب شیخ حیدر اور ۱۲۸۶ھ درج ہے -

ابتدائی اشعار تینوں نسخوں میں وہی ہیں یہ مخطوطہ ان ابیات پر ختم ہوتا ہے -

عشق گل سوں بند ہے نت چت مرا
نیں ہے وو جے سات ہرگز ہت مرا
جگ منے غوغا ہے میرے عشق کا
کچھ عجب سودا ہے میرے عشق کا

---

(۳۶) دیوان ولی [۹۳]

اوراق ۱۳۸ - سطور ۱۵ فی صفحہ -
تقطیع ۴¾" × ۸½" - خط نستعلیق پاکیزہ
ہر غزل کا مقطع سرخی میں - مصنف ولی اورنگ آبادی - سنہ تصنیف تقریباً ۱۱۱۵ھ - سنہ کتابت ۱۱۵۹ھ
بمقام حیدرآباد -

یہ دکن کے معروف شاعر ولی اورنگ آبادی کا دیوان ہے جس میں غزل (۱۲۵ اوراق) مستزاد (۳ اوراق) مخمس (۳ اوراق) - ترکیب بند (۲ اوراق) مثنوی (۴ اوراق) اور قصیدہ (۴ اوراق) غرض جملہ اصناف سخن موجود ہیں -

یہ دیوان ولی کے قدیم ترین نسخوں میں سے ہے اور اس میں اندازاً چار ہزار ابیات ہیں - اس کی بعض غزلیں غیر مطبوعہ بھی ہیں - درمیان میں جگہ جگہ بعض صفحات خالی چھوڑ دیے گئے تھے جن پر دوسرے شعرا کا فارسی و اردو کلام نقل کیا گیا ہے - حاشیہ پر بھی اشعار کا اضافہ کیا گیا ہے اور بعض جگہ اصلاح بھی کی گئی ہے جس سے معلوم ہوتا ہے کہ یہ نسخہ خاص اہتمام سے نقل کرایا گیا ہے - دیوان سے قبل نعمت خان عالی کے قطعات و نثر درج ہیں جس کو اسی کاتب نے نقل کیا ہے - دیوان کے اوراق ۱۲۶ تا ۱۲۸ کے حاشیہ پر ایک اور دکنی شاعر اور صوفی شاہ میرانجی خدا نما کا چکی نامہ بھی نقل کیا ہے ان سب کا ذکر علٰحدہ درج ہوگا -

ولی اور اس کے دیوان کے متعلق اُردو میں کافی معلومات شایع ہوچکی ہیں اس لئے یہاں مزید وضاحت کی ضرورت نہیں۔ البتہ اس نسخے سے اس امر کا ثبوت بہم پہنچتا ہے کہ ولی ۱۱۵۶ھ تک خود شہر حیدرآباد میں بھی کافی مقبول و مشہور ہوچکا تھا اور بخشئی بادشاہ موسیٰ رضا خاں کی حویلی میں غالباً ان ہی کے حکم سے یہ نسخہ لکھا گیا تھا۔

اس نسخہ کا آخری ایک ورق غائب ہے۔ اس لئے کوئی ترقیمہ نہیں ہے البتہ ورق ۱۲۸ و سے ایک مستزاد شروع کرنے سے قبل کاتب نے حسب ذیل جملہ سرخی میں لکھا ہے۔

"واین چند اشعار نیز از جملہ مصنفات

آں غواص سخنداں است چنانچہ مرقوم

گردد"

اس سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ ولی کے اس قدر قریبی زمانہ میں بھی اس کے کیسے قدرداں پیدا ہوگئے تھے۔

آغاز :-

کیتا ہوں ترے ناووں میں ورد زبان کا

کیتا ہوں ترے شکر کوں عنوان بیاں کا

جس خاک اوپر پانوں رکھیں تیرے رسولاں

اوس گرد کوں میں کحل کروں دیدۂ جاں کا

اختتام :-

دل جو تجہ زلف بیچ بند ہوا — کون کھولے یہ عقدۂ لاحل

دل ہوا سپند تب سے جب سوں — غم ترے میں ہوا ہو تن....

چونکہ یہ دیوان ناقص الآخر ہے اس لئے اس سے قبل نعمت خان عالی کے قطعہ کے آخر میں دیوان کے کاتب نے جو ترقیمہ لکھا ہے اس سے اس دیوان کا سنہ و مقام کتابت ظاہر ہوتا ہے۔

"قطعہ و شرح قطعہ بیست پنجم شہر جمادی الاول ۱۱۵۶ھ

بروز پنجشنبہ وقت سہ پہر در بلدہ حیدرآباد

در حویلی موسیٰ رضا خاں کہ بخشی بادشاہ اند"

---

(۳۷) دیوان ولی [۱۱۲]

اوراق ۹۲۔ سطور ۱۷ فی صفحہ۔

تقطیع $\frac{۸}{۴}$۵ × $\frac{۸}{۴}$۸۔ خط نستعلیق پاکیزہ

ہر غزل میں تخلص سرخی میں۔ مصنف

ولی اورنگ آبادی سنہ تصنیف ۱۱۱۵ھ

کاتب منوہر لال۔ سنہ کتابت ۱۱۹۱ ہجری

مقام حیدرآباد

دیوان ولی کا ایک اور نسخہ ہے جو نہایت اعلیٰ کاغذ پر خوشخط لکھا گیا ہے۔ اسی کے ساتھ دستورالاعتیاز (۱۱۶۰ھ) کا ایک نسخہ بھی مجلد ہے مگر اس کا کاغذ اور خط اتنا پاکیزہ نہیں ہے۔ یہ نسخہ بھی دیوانِ ولی کے قدیم ترین مخطوطوں میں شامل ہے اور اس میں بھی حاشیہ پر بعض جگہ اشعار کا اضافہ کیا گیا ہے۔

آغاز :-

کیتا ہوں ترے نام کوں میں ورد زباں کا

کیتا ہوں ترے شکر کوں عنوان بیاں کا

جس گرد اوپر پانو رکھیں تیرے رسولاں
اُس گرد کوں میں کحل کروں دیدۂ جاں کا

اختتام :-

جو ہیں پیاسے سخن کے اُن کے نزدیک — شعر میرا ہے آب سوں نرمل
گوش حاسد میں جب پڑے یو شعر — راکھ ہو جائے رشک سوں جل بل

ترقیمہ :-

«تمت تمام شد دیوانِ ولی بتاریخ بیست وچہارم صفر ۱۱۹۱ھ در شہر نوشتہ بود باقی ماند (۹) در لشکر نوشتہ شد بجہتہ کبیر جیو بخط کمترین منوہر لعل تحریر یافت در خانہ لالہ درگا داس»

سرورق پر مولوی سید محمد حسین صاحب جعفری سابق ناظم تعلیمات کے دستخط (سید محمد حسین ۱۳۴۳ھ) ثبت ہیں۔ یہ نسخہ اُن ہی کا عطیہ ہے۔

(۳۸) چکّی نامۂ عرفان [۹۳ب]

اوراق ۳ - سطور ۱۸ فی صفحہ۔ دیوان ولی (نسخہ ۳۶ نمبر ۹۳) کے حاشیہ پر۔ خط نستعلیق۔ مصنف سید شاہ میراں جی حسین خدانما۔ سنہ تصنیف قبل ۱۰۷۰ھ - سنہ کتابت ۱۱۵۹ھ۔

یہ ایک ترکیب بند ہے جس میں تین تین اور دو دو مصرعوں کے سولہ (۱۶) بند ہیں اور ہر بند کے آخر میں ایک ہی شعر بطور ٹیپ کے لکھا گیا ہے۔ میراں جی خدانما نے اپنے مریدوں کے لیے چکّی کے گیت کے طور پر قلمبند کیا ہے اور اس میں تصوّف کے مسائل بیان کئے ہیں تاکہ چکّی پیستے وقت بھی مرید خدا کے خیال سے غافل نہ رہیں۔ سید میراں حسینی حیدرآباد میں عبداللہ قطب شاہ کے معتبر ملازمین میں سے غالباً کسی سررشتہ کے عہدہ دار تھے بادشاہ نے ۱۰۶۰ھ میں ان کو کسی کام سے بیجاپور روانہ کیا تھا وہاں شاہ امین الدین اعلیٰ کے ایسے معتقد ہوئے کہ بادشاہ کی ملازمت ترک کردی اور عمر بھر اہل حیدرآباد کو شاہ امین الدین سے حاصل کیا ہوا فیض پہنچاتے رہے۔ آخر کار ۱۰۷۰ھ میں فوت ہوئے۔ ان کا گنبد حیدرآباد کے محلہ کارواں میں بہت مشہور ہے۔ انھوں نے اپنے مرشد کی طرح اُردوٗ نظم ونثر میں کئی رسالے لکھے ہیں۔ ان کے حالات تذکرہ اولیائے دکن (جلد دوم ص ۹۵۵) پر تفصیل سے درج ہیں۔ میراں جی خدانما کی یہ نظم غالباً کسی اور کتب خانے میں موجود نہیں ہے۔ البتہ ان کی اُردوٗ شرح شرح تمہیدات عین القضات بہت مشہور ہے۔

آغاز :- بسم اللہ ذاتی ناؤں
قران اوپر لیا ٹھاؤں
کل شیٔ اس کی چھاؤں
لا الٰہ کہنا الّا اللہ میں رہنا — نبی رسول سے من لانا اللہ اللہ کہنا

اول اللہ ناؤں صفت جس کا ٹھاوں

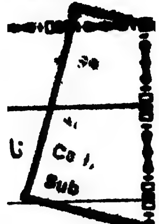
یاد ہے میرے جی میں ہردم تیرا ناؤں
لا الٰہ کہنا الّا اللہ میں رہنا — نبی رسول سوں من لانا اللہ اللہ کہنا
اللہ آپی گنجِ خفی ظاہر ہونے آیا۔

نبی صاحب کے برقعہ میں اپس کوں دکھلایا
لا الٰہ کہنا الّا اللہ میں رہنا — نبی رسول سے من لانا اللہ اللہ کہنا

اختتام :-

عرفان کا چکی نامہ
بولے سید خداوند خدانما
پیر سے مرید یو سمجھانا
اللہ اللہ کہنا الّا اللہ میں رہنا — نبی رسول سے من لانا اللہ اللہ کہنا

نشان تہہ



نا

من کی بیتا				
سرگزشت غالب ...	۹۳	۰	۸	۰
نظام الملک ...	۴۰	۰	۴	۰
تاریخ گولکنڈہ ...	۳۳۰	۳	۸	۰
ریڈیو نمبر (۸ تصاویر)	۱۶۰	۱	۰	۰
ارمغان جذب ...	۱۲۰	۰	۱۲	۰
سوتیلی ماں ...	۴۸	۰	۴	۰
سر سید احمد خاں ...	۱۶	۰	۲	۰
سر سالار جنگ ...	۴۸	۰	۶	۰
مغربی تصانیف کے اردو تراجم	۱۴۵	۱	۴	۰
محبت کی چھاؤں ...	۱۳۲	۱	۴	۰
اقبال نمبر ...	۱۶۸	۱	۴	۰
سائنس کے کرشمے ...	۱۱۲	۱	۰	۰
شعرائے عثمانیہ ...	۲۳۰	۲	۱۲	۰
مکتوبات شاد عظیم آبادی	۳۰۰	۲	۸	۰
دادا بھائی ...	۱۶	۰	۲	۰
اردو نامہ ...	۲۰۰	۲	۰	۰
ارسطو جاہ ...	۶۵	۰	۶	۰
عماد الملک ...	۴۰	۰	۶	۰
اردو دانی کی پہلی کتاب	۵۶	۰	۲	۶
" دوسری کتاب	۵۶	۰	۴	۶
محمد حسین آزاد ...	۲۰۰	۲	۰	۰
کاغذ کی ناؤ ...	۱۲۰	۱	۴	۰
فن تقریر ...	۹۶	۰	۸	۰
مقدمہ تاریخ دکن ...	۱۴۴	۱	۰	۰
پانی کی کہانی ...	۴۵.	۰	۶	۰
رسایل طبیہ ...	۳۱۲	۲	۸	۰
سلک گوہریں ...	۴۰	۰	۴	۰
تاریخ ادب اردو ...	۱۷۶	۱	۴	۰
ورڈس ورتھ اور اسکی شاعری	۱۸۴	۱	۴	۰
ہوش کے ناخن ...	۹۴	۱	۰	۰
یوسف ہندی قید فرنگ میں	۸۹	۱	۰	۰
شاد اقبال ...	۱۷۶	۲	۸	۰
آریائی زبانیں ...	۱۰۴	۱	۰	۰
نظام علی خاں ...	۳۲	۰	۴	۰
عرب اور عربستان ...	۵۶	۰	۱۰	۰

[illegible]	۱۱۸	۱	۳	
متاع سخن ...	۱۲۴	۰	۱۲	۰
کیف سخن ...	۱۲۲	۰	۱۲	۰
بادہ سخن ...	۱۲۷	۰	۱۲	۰
سراج سخن ...	۱۵۲	۰	۱۲	۰
ایمان سخن ...	۱۲۰	۰	۱۲	۰
فیض سخن ...	۱۴۴	۰	۱۲	۰
مرقع سخن جلد اول (۵۵) تصاویر	۵۰۰	۵	۰	۰
" دوم (۵۰) "	۴۳۲	۵	۰	۰
نقد سخن ...	۱۷۵	۱	۰	۰
نذر ولی ...	۲۴۸	۲	۸	۰
گریہ و تبسم ...	۱۹۲	۲	۰	۰
مشاہیر قندھار دکن	۱۸۴	۱	۰	۰
من کی دنیا ...	۱۴۵	۱	۰	۰
مدراس میں اردو	۱۹۶	۱	۸	۰
محرم نامہ ...	۱۱۲	۱	۰	۰
نذر دکن ...	۱۰۴	۱	۴	۰
روح غالب ...	۲۴۰	۲	۸	۰
عاصمہ ...	۲۰۰	۱	۴	۰
دفتری معلومات ...	۵۶	۰	۶	۰
آبدوزکشتیاں اور سرنگ	۴۸	۰	۶	۰
اردو مثنوی کا ارتقاء	۱۴۳	۱	۱۲	۰
نمود زندگی ...	۲۱۲	۱	۸	۰
سرگذشت ادارہ ...	۳۰۴	۰	۱۲	۰
میر محمد مومن (۳۴) تصاویر	۳۱۲	۲	۸	۰
بلقان ...	۳۲	۰	۳	۰
خطابیات ...	۱۱۲	۰	۱۲	۰
علم خانہ داری ...	۱۵۰	۱	۰	۰
چیونٹی (۱۶) تصاویر	۱۱۸	۱	۸	۰
انوار ...	۱۶۸	۱	۸	۰
کشمش نانی (۴) تصاویر	۸۰	۰	۱۰	۰
کارساں دتاسی ...	۱۲۸	۱	۴	۰
رات کا بھولا ...	۱۶۸	۱	۰	۰
سکندر جاہ ...	۲۴	۰	۴	۰
بلاغت ...	۵۶	۰	۸	۰
ادارہ سفر ۱۹۴۲ء میں	۲۰۰	۰	۸	۰

مطبوعہ اعظم اسٹیم پریس حیدرآباد دکن


سب رس


ادارۂ ادبیات اُردو

ادارۂ ادبیات اُردو حیدرآباد دکن کا ماہ نامہ

نشان ٹپہ آصفیہ ۱۵۳
نشان ٹپہ برطانیہ M3950
ٹیلی فون نمبر ۴۲۰۹
چندہ سالانہ چار روپے آٹھ آنے
بچوں کا سب رس ایک روپیہ آٹھ آنے

سب رس

زیر نگرانی
ڈاکٹر سید محی الدین قادری زور
مجلس ادارت
خواجہ حمید الدین شاہد بی اے
سکینہ بیگم
عبدالحفیظ صدیقی بی ایس سی

جلد (۶) | بابت ماہ جون سنہ ۱۹۴۳ء | شمارہ (۶)

ہم سفر

ادارۂ ادبیات اردو کی طرف سے تعلیم بالغاں اور اردو کی ترویج و اشاعت کے لئے علاقۂ رحمت آباد کا جو دورہ کیا گیا اس میں جناب تحسین سروری صاحب بھی مدیر سب رس کے ساتھ تھے شاہ آباد سفر میں ہنگولی اسٹیشن سے روانہ ہوتے ہوئے یہ نظم کہی اور بسمت پہنچ کر سنائی سفر کی یادگار کے طور پر اسے سب رس میں شائع کیا جا رہا ہے۔ شاہد

جانے تجھے کیا سوجھا ہوگا   تو نے مجھے کیوں دیکھا ہوگا

سوچ رہا ہوں اب کیا ہوگا

تو بھی مسافر، میں بھی مسافر

شاید پھر ہم مل نہ سکیں گے   غنچے دلوں کے کھل نہ سکیں گے

جانے کہاں تک جانا ہوگا!

تو بھی مسافر، میں بھی مسافر

حیرت ہے، یہ عنایت کیسی؟   نامحرم سے الفت کیسی؟

اُنس بھی کیونکر پیدا ہوگا

تو بھی مسافر، میں بھی مسافر

یہ دن، اور نہ یہ عالم ہوگا   ایک الجھن ہوگی غم ہوگا

اور نہ جانے کیا کیا ہوگا!

تو بھی مسافر، میں بھی مسافر

بکھری زلفیں، آنکھوں کے ساغر   کیسے بھولوں! اُف یہ منظر!

لیکن، بھول ہی جانا ہوگا

تو بھی مسافر، میں بھی مسافر

تحسین سروری

میں سفر کس طرح کرتا ہوں

حیدرآباد دکن کے رسالے "ہماری کتابیں" نے ایک خاص عنوان مقرر کیا کہ "میں مطالعہ کس طرح کرتا ہوں"۔ اس عنوان کے تحت مجھ سے لکھوایا گیا تو میں آج کل اس عنوان کو مصرع طرح قرار دے کر مضامین پر مضامین لکھے جا رہا ہوں چنانچہ اخبار "خلافت بمبئی" اخبار "آئینہ بمبئی" اور رسالہ "مشہور" دہلی میں "میں مطالعہ کس طرح کرتا ہوں" اور "میں مضامین کس طرح لکھتا ہوں" کے عنوانات سے میں نے اپنی اس وقت تک کی پڑھائی، لکھائی کی زندگی شائع کر دی۔ اب یہ عنوان "سب رس" کے لئے پورا کرتا ہوں کہ "میں سفر کس طرح کرتا ہوں" لیکن اخبار اور رسالے والوں سے التماس ہے کہ وہ میرے ان عنوانات سے یہ یقین نہ فرمالیں کہ میں یہ بھی بتا دوں کہ میں حقہ کس طرح پیتا ہوں یا میں مرغا مرغی کس طرح پالتا ہوں؟

پس میرے خیال میں سفر کے طور طریقوں کا تمام تر تعلق مسافر کی افتاد، مذاق اور روپے پیسے سے ہے لہٰذا جیسا ذوق اور جتنا روپیہ ویسا ہی سفر اور بس۔ اب نفسِ سفر کے لئے عربی والوں نے کہا ہے کہ سفر یا تو فتح تک پہنچا دیتا ہے یا جہنم میں۔ بعض نے اس حرکت کو ضرورت کا تابع ایک عمل قرار دیا ہے اور بعض نے "آل انڈیا مشاعرہ" میں شرکت کا بہانہ، مگر میرے لئے سفر کبھی "از غیبی سلطانی" کی حد خاص سے آگے نہیں بڑھا اس لئے میں اپنے "از غیبی سفر" اور "سلطانی سفر" کی واردات تو صدہا صفحات میں پیش کر چکا ہوں، البتہ آج صرف یہ دکھانا ہے کہ "میں سفر کس طرح کرتا ہوں"؟ سو واضح رائے عالی ہو کہ نجوم کے حساب سے میرے ستاروں کی ترکیب اثر اس طرح واقع ہوئی ہے کہ میرے خیالات میں غرور و نخوت، تکبر و تمکنت اور حشم و خدم قسم کا اقتدار اتنا زیادہ ہے کہ اس کے اعتبار سے بے حد خاص قسم کا ساز و سامان ہو تو میں خوش دل ہو کر سفر کروں لیکن ضروری نہیں ہے کہ جس شخص کے زائچہ میں خیال و علم اور شعور و فراست کے ستارے درجۂ اعلیٰ کے ہوں اس میں مال و منال اور نقد روپیہ دینے والے ستارے بھی برابر کے ہوں۔ لہٰذا ہوا یہ کہ میرے خزانے کے خانے میں قمر کے ساتھ کیتو یا سایۂ زمین ہے اس لئے میں اتنا روپیہ جمع ہی نہیں کر سکتا کہ اپنی ذاتی ریل امریکہ سے بنوا کر اس میں سفر کروں اور جب یہ نہیں ہے تو میں شرف یافتہ مشتری کے طالع کا آدمی ہو کر ہندوستانی ریل کے پسلی توڑ تیسرے درجے کے سفر سے کس طرح خوش ہو سکتا ہوں۔ لہٰذا سفر کے پیش آتے ہی گویا میرے دماغ پر خفقان اور اختلاج قلب کے سے دورے پڑنے لگتے ہیں اور میرے ظاہری تاثرات کو دیکھ کر میری غیر عربی دال بیوی نمبر ۳ اور ۴ مجھے سفر سے ڈرنے والا شوہر تصور کر لیتی ہیں۔

اب زندگی یہ کہ سفر کا وقت دن اور مہینہ ابھی کوسوں دور ہوتا ہے مگر مشکلاتِ سفر کا احساس سفر کے ارادہ ہی سے شروع ہو جاتا ہے اس لئے فرض کیجئے کہ مجھے ایک ہفتے بعد گھر سے روانہ ہونا ہے، تب بھی میں اپنے ہر حال میں بدحواس، بے حال، بے ہوش بے قرار، بے ربط اور انتہا بے ترتیب ہو جاتا ہوں گویا سفر سے نہیں بلکہ نزاع کے وقت سے قریب ہوتا جا رہا ہوں اس لئے نبضیں ڈوب رہی ہیں اور حواس کھوتے جا رہے ہیں۔ وہ تو کہئے کہ شوہر کے وقار و اقتدار کا لحاظ مجبور کرتا ہے، ورنہ مزاجی حیثیت سے میں تو سفر کے وقت چاہتا ہوں کہ بیویوں کو وصیت نامہ بھی لکھ کر دیتا جاؤں۔

اب یہاں سوال پیدا ہوتا ہے کہ صرف مالی کمی سے وہ کون سے خطرات پیدا ہو سکتے ہیں جن سے بیوی نامہ یا وصیت نامہ تک لکھنے کی ضرورت محسوس ہوتی ہے، سو واضح ہو کہ سفر میں روپے کی قلت اور وصیت کا موقع اس طرح پیدا ہوتا ہے کہ فرض کیجئے کہ تیسرے درجے کی ہڑتال تمام ہو بمگ اور بغاوت کی قسم کی گڑبڑ میں میرا ہمین اور پتلا سا ٹکٹ کھو گیا اور میں اس کا تاوان ادا نہ کر سکا اس لئے دیسی ٹکٹ کلکٹر نے ڈپٹی کلکٹری سے اگر کام لیا تو آدمی بے وقار ہونے والا ہوں نہیں، ادھر عظیم بغاوت سے ادھر کے جرم بغیر چالان گرفتاری حوالات پیشی پر پیشی، جرح، بحث، قید محض، قید با مشقت، قید مع جرمانہ، حبس دوام بہ عبور اٹلانٹک یا پھانسی کو برداشت نہیں کر سکتا لہٰذا میرے اس باغیانہ اور نمک حرام قسم کے مزاج کا ایک ہی اثر ہوگا کہ میں ریلوے کے ٹکٹ کلکٹر کے اشارہ سے خود کو نہ گرفتار ہونے دوں گا نہ فوراً نتیجہ 'تو' 'تو میں' میں سے بڑھ کر آخرکار پھانسی تک ہی جا پہنچے گا۔ ادھر ہندوستان میں ادیبوں، شاعروں اور مزاح نگاروں کے لئے ضمانت کا کوئی بیت المال ہے نہیں لہٰذا سفر کے وقت اس خطرے کے پیش نظر ایک بیوی ہی کے لئے وصیت نامہ لکھ دینا ضروری ہو جاتا ہے چہ جائے کہ میری بیویوں کی تعداد کا نمبر جب چار ہو اور ان میں بھی تین انگریزی داں اور "ولایت لوٹ" بھی ہوں تب تو سفر کے وقت نہ پوچھئے کہ وصیت نامہ لکھنے کو کتنا جی چاہتا ہے مگر صرف شوہرانہ وقار مانع رہتا ہے اور میں خواہ نصف دن ہی کا سفر کروں مگر بیویوں پر جو نظر ڈالتا ہوں وہ آخری ہی سمجھ کر۔ آپ کہیں گے کہ اور بچوں پر؟

تو میں عرض کروں گا کہ میں سارے ایشیا کے بچوں کو بے کار سی چیز سمجھتا ہوں تو خود کے دو چار بچوں کو میں کیا خاطر میں لا سکتا ہوں، ادھر مزاجی حیثیت سے میں اولاد کی محبت کو غلامانہ بے چارگی سمجھنے والا والد ماجد ہوں اس لئے الحمدللہ اولاد کا سوال تو میرے دماغ کے حق میں کسی قابلِ غور و بحث ہوتا ہی نہیں، البتہ ان کے شرعی حقوق کا ادا کرنا ضروری سمجھتا ہوں سو وہ بیویوں کے وصیت ناموں سے بھی ادا ہو سکتے ہیں۔

الحاصل سفر کے خاص دن سے پہلے ہی جب سفر کی بدحواسی مجھے محاصرہ میں لے لیتی ہے تو عین سفر کے دن میری گھبراہٹ کا اندازہ کر لینا بے حد آسان سی چیز ہے، لہٰذا سفر کے لئے میری بدحواسی کا آغاز میرے سفر کے سامان سے ہوتا ہے، اس طرح کہ بار بار سوچ کر یادداشت میں لکھ کر بیویوں کو جتا کر اور خود یاد رکھ کر بھی سفر کی بعض انہی چیزوں کو بھول جاتا ہوں جن کی سفر میں ضرورت زیادہ ہوتی ہے، مثلاً کوئی کتاب، کوئی مسودہ، کوئی کاپی، کوئی مضمون، کوئی نظم، کوئی غزل، کسی تقریر کا حوالہ وغیرہ اور میرے سفر کی یہی چیزیں روح ہو سکتی ہیں نہ کہ سوٹ کیس، یا سگار، یا تاش، یا برف دان یا ٹائی کالر یا صوبہ سرحد کا حقہ یا لکھنو کا خاصدان یا چارپائی کی لکڑیاں۔ ادھر اتنا سچا اور پکا عابد و زاہد نہیں ہوں کہ سفر کے وقت گلے میں حمائل شریف اور ہاتھ میں رسی سے بندھا ہوا لوٹا لے کر نکلوں۔ ناشتہ دان سے اس لئے فارغ رہتا ہوں کہ میں یورپ کی کسی ادا کا گھائل ہی نہیں ہوں جو صبح کو چلتے انڈے اور کیک کا عادی ہوتا۔ بس چائے پیتا ہوں سو وہ بھی بے انڈے اور بسکٹ کی البتہ صبح و شام کا کھانا ضرور ڈٹ کر کھاتا ہوں تاکہ پشتو زبان جتنی جانتا ہوں وہ زندہ رہے۔ اس لئے ۱۹۲۹ء کا ایک سیاہ رنگ کا لوہے کا صندوق جو انگریز بھائیوں کے شہر بمبئی سے خرید کیا تھا وہ ساتھ ہوتا ہے اور ایک بستر، لیکن احساس اور شعور جو روسی جرمن محاذ سے بھی زیادہ طویل و عریض

پایا ہے تو اس کے اثر سے جب یہ مختصر سامان نے کر چلتا ہوں تو اس کے ایک ایک جزو کو اس وجہ لمبے چوڑے پن سے سوچتا رہتا ہوں گویا تین چار مال گاڑیوں میں میرا سامان لدا ہوا ہے ظاہر ہے کہ میری تمام عمر ریل کے تیسرے درجے کے سفر میں گزری ہے اور اب جو میں نے ترک سفر کا نصف حلف کیا ہے وہ تیسرے درجے ہی کی تکالیف سے اکتا کر اس لئے کہ میں جب بھی تیسرے درجے میں بیٹھ کر کہیں سے کہیں گیا کہ مجھے ایسا محسوس ہونے لگا گویا میں مضمون نگاری کا کام چھوڑ کر کسی ٹین ساز کارخانے میں مزدوری کر کے دس آنے ماہانہ کی کوٹھری یا کھولی کرایہ پر لے کر اس میں رہنے لگا ہوں جس میں نہ چارپائی بچھائی جا سکتی نہ پھیل کر لیٹا اور بیٹھا جا سکتا، کیونکہ ریل کے تیسرے درجے کا تمام ہندوستان میں یہ قاعدہ ہے کہ وہ مسافروں سے کبھی کچھ تو ہو جاتا ہے گر پورے سفر کے لئے خالی نہیں رہتا۔ پھر مسافر بھی وہ ساتھ ہوتے ہیں جو تین دوسرے مسافروں کی جگہ گھیر کر اپنے قبضے میں رکھنے پر حریص رہتے ہیں نہ کہ دوسروں کے لئے فیاض و ہمدرد۔ ادھر مجھ میں یہ عیب ہے کہ میں ایشیائی اخلاق کی بوڑھی تربیت کا مارا ہوا ہوں جس میں خودی کو حرام اور دوسروں کے لئے جان دے دینے کو حلال کہا گیا ہے اس لئے تیسرے درجے میں خود ٹکٹ خرید کر اپنی جگہ پر بھی دوسروں کو مارے رحم و شرافت کے اس طرح قابض ہو لینے دیتا ہوں گویا ساتھیوں نے مجھے ریل کا ٹکٹ دلایا ہے۔ نتیجہ یہ نکلتا ہے کہ میں مارے مروت، شرافت اور ایثار کے تیسرے درجے میں بغیر تہجد کی نماز کے جاگتا اور اونگھتا رہتا ہوں اور بے حس مسافر میری گود میں اپنے غیر تعلیم یافتہ پاؤں پھیلائے سوتے رہتے ہیں۔

مجھے ریل گاڑی میں دو عظیم و مہیب خطرے کبھی چین سے سونے نہیں دیتے، ایک یہ کہ اگر میرے اترنے اور ٹھیرنے والا اسٹیشن نکل گیا تو ؟ دوسرے یہ کہ اگر میرا سامان چوری جاتا رہا تو ؟ اس کے بعد جو چیز مجھے تمام راستہ ہر دوسرے تیسرے منٹ پرستاتی ہے وہ اپنے ٹکٹ کی بار بار دیکھ بھال، چونکہ زمانہ جنگ کا ہے اس لئے ممکن ہے کہ دشمن فائدہ اٹھائے اس لئے میں اپنے ریل کے ٹکٹ رکھنے کی جگہ کو شائع نہیں کر سکتا البتہ اتنا بتا دیتا ہوں کہ جس جگہ اپنا ٹکٹ رکھ دیتا ہوں اس کو ہزار بار نہیں تو کوئی چھ سات سو مرتبہ تو ٹٹول لیتا ہوں حتیٰ کہ جب تک مقام قیام نہ آجائے اور میں ٹکٹ والے کو ٹکٹ دے کر ریل کے اسٹیشن سے صحیح سلامت باہر نہیں نکل آتا مجھے اس وقت تک ٹکٹ کے کھو جانے ہی کا خطرہ لاحق رہتا ہے۔

سفر کی ایک "بھوک ہڑتالی عادت" یہ ہے کہ مجھ سے اجنبی لوگوں کے سامنے کھانا نہیں کھایا جاتا اور ریل کے تیسرے درجے میں کس طرح تین مرتبہ یہ کہہ سکتا ہوں کہ "پردہ کر لینا کھانا کھاتا ہوں" "پردہ کر لینا کھانا کھاتا ہوں" "پردہ کر لینا کھانا کھاتا ہوں" اس لئے اکثر سفر ایسے گزرے ہیں جن میں مارے حجاب کے میں بھوکا رہا اور ایسا سفر سقر کا کام کرتا رہا۔

اور اسی لئے ریل کے سفر کے دو وقت میرے لئے بے حد ایمان آزما اور جرأت طلب ہوا کرتے ہیں۔ ایک سفر کے آغاز پر یہ خیال کہ دیکھیں ریل میں جگہ ملتی بھی ہے یا نہیں دوسرے یہ کہ دیکھیں ریل میں رات کو سو بھی سکتا ہوں یا اونگھتا ہی رہوں گا۔ اسی طرح تیسرے درجے میں وہ وقت بے حد عذاب ناک ہے جب خدا خدا کر کے گھٹنوں کو کلیجے سے لگا کر سونے کے لئے تیاری کرنا، شیریں تر نیند کے خمار کا آغاز اور ناگاہ مسافروں کی کثرت میں اضافہ۔

تیسرے درجے کی مسافرت کے اس معجزے سے میں پناہ چاہتا ہوا چلتا ہوں کہ شدید تھکن سے پلک جھپکی ہی نہیں کہ

صندوق کے ساتھ ریل کا ٹکٹ بھی غائب اور ٹکٹ کلکٹر حاضر — اس لئے میں تمام راستہ ریل کا ٹکٹ ٹٹولتا رہتا ہوں حتیٰ کہ بعض اوقات تو ٹکٹ کو جب تک نکال کر دیکھ نہیں لیتا اس کے کھو جانے یا گر جانے کا وہم یا خوف دور نہیں ہوتا۔ پس جو مسافر کہ تمام راستہ سامان اور ٹکٹ کی فکر میں مبتلا رہے گا بتائیے کہ وہ ریل کی کھڑکی سے مناظر قدرت وغیرہ کا تماشا کیا خاک دیکھے گا؟

روانگی کے وقت خیر میں تو اس لئے بدحواس ہو جاتا ہوں کہ سفر کے خطرات سے مجھ ہی کو مقابلہ کرنا ہوگا لیکن قدیم روایات میں مسافرت کے جو خطرات پرانی وضع کی عورتیں سنتی آئی ہیں ان میں اسی عہد کے ریل کے ٹکرا جانے، ریل کے اندر قتل ہو جانے، ریل میں قلب کی حرکت بند ہو جانے، ریل کی پٹری اکھاڑ دینے اور ریل میں سے ورغلا کر کہیں سے کہیں لے بھاگنے کے حوادث جو اضافہ ہو گئے ہیں ان کے تصور سے میرا تمام خاندان مجھ سے سوا نہیں تو میرے ہی برابر گھبرایا ہوا اور بدحواس ضرور ہو جاتا ہے، اور الحمدللہ کہ تمام عورتیں صحیح روح اسلام اور عقائد کے فلسفیانہ اجزا سے واقف ہیں اس لئے ہمارے ہاں سفر کے وقت امام ضامن کی رقم نہیں باندھی جاتی اس لئے کبھی کبھی میں سوچتا ہوں کہ کہیں "امام ضامنی رقم" کے ہضم کر جانے سے سفر میں کوئی خطرہ پیش نہ آجائے۔ اس لئے بے امام ضامن کے گھر والے سفر سے پہلے میرے لئے جو دعائیں مانگتے پھرتے ہیں، اور جو دعائیں مجھے دیتے ہیں اور جس طرح مجھ سے آکر ملتے ہیں ان سب کے اثر سے مجھے سفر ہی میں وفات پا جانے کا یقین سا ہونے لگتا ہے اور اسی لئے ہوا ہے کہ میں نے عین سفر کے وقت بعض سفر ملتوی کر دئے ہیں، اور طلب کرنے والوں کو ایسے جھوٹے بہانے لکھ دئے کہ غریب آج تک میری اس سفری بزدلی کو سمجھے بھی نہ ہوں گے۔ مگر میں جانتا ہوں کہ سفر کے وقت ایسے وساوس انہی لوگوں میں پیدا ہوتے ہیں جو احساس و فراست کی دولت سے معزز و سرفراز کئے گئے ہیں۔ ان کو کیا جو بے حس و بے خبر اور اندازے و اندیشے کی مقدرتوں سے محروم کر کے چوپایوں کی طرح زمین کا بوجھ بنا کر چھوڑ دئے گئے ہیں۔

میرے سفر کی ناقابل برداشت اذیت یہ بھی ہے کہ تیسرے درجے میں نہ مجھ سے کوئی کتاب پڑھی جاتی نہ اخبار دیکھا جاتا، اس لئے راستہ پورا کرنا اور آگرہ کے پاگل خانے میں بند رہنا برابر ہو جاتا ہے، ادھر مجھ پر جو سفر سوار ہوتا ہے وہ چار پانچ سو میل سے ادھر کا ہوتا نہیں اور اس طویل راستے کو خوش گوار طریق سے گزارنے کے لئے مجھ سے یہ ہو نہیں سکتا کہ میں تیسرے درجے کے مسافر سے لے کر درجہ اعلیٰ تک کے مسافر سے اس طرح گفتگو کرتا رہوں کہ کہئے جناب والا آپ کہاں تشریف لے جا رہے ہیں؟

جناب کا اسم شریف؟

وطن؟

اخاہ ٹھیک ہے جی ہاں اب پہچانا آپ کو۔

اسی طرح میں کسی مسافر سے محض راستہ کاٹنے کے لئے یہ نہیں کہہ سکتا کہ نیاز مند کو جی، آئی، پی، آر کہتے ہیں، والد صاحب خان بہادر این، ڈبلو، آر، ہیں نیاز مند کے خالو جان رگھبیٹا ایم، ایل، ایم کی کوٹھیاں لکھنو اور لاہور میں ہیں مگر گورنمنٹ نے میرے بھائی کو اعزازی وظیفہ دے کر پیرس یونیورسٹی بھیجا تھا جہاں وہ بم باری سے پہلے ہی ایک آپریشن سے وفات پا گئے، میں بمبئی اور پونا میں "بزنس" کرتا ہوں۔

نہ مجھے مسافروں سے یہ باتیں کرنا بھلا معلوم ہوتا کہ "پاکستان" پر میری رائے یہ ہے اور کانگریس کو میں یہ سمجھتا ہوں۔

البتہ میں مین قومی یوروپی سیاست پر گفتگو کو سوتے میں بھی تیار رہتا' سو الحمد للہ کہ ان عظیم معلومات کا ہندوستانی آج تک کے سفر میں توطا نہیں۔ اسی طرح میرے بس کا نہیں کہ میں ہندوستان کے سینما کے تماشوں ان کے کھلاڑیوں اوران کے حالات پر گفتگو کو اپنی وسعت علم کی نشانی قرار دوں۔

نتیجہ یہ نکلتا ہے کہ تمام راستہ یا اونگتا رہتا ہوں یا ہندوستانیوں کی نقال اور یکسر غیر علمی وغیر سیاسی افتاد مذاق پر کھولتا رہتا ہوں۔ اسی لئے چند سال سے ریل کا راستہ کاٹنے کے لئے میں نے ایک صاحب کو ساتھ رکھ لیا ہے جو تمام راستہ جرمنی' فرانس روس' امریکہ' برطانیہ ایسی عظیم اقوام کی تاریخ سیاست اور ان کی سیاسی فراست کے اتار چڑھاؤ پر مجھ سے بحث فرماتے رہتے ہیں اور میں عقل اعلیٰ کے ان بلند تر موضوعات ومباحث میں کھو کر تیسرے درجے کی تمام شدتوں کو بھول کر سال دو سال میں کہیں چلا جاتا ہوں سو الحمد للہ کہ جنگی گرانی کے ہاتھوں اب وہ بھی محال ہو گیا۔

ملّا رموزی

دیوی

میں نے اپنے من کے مندر میں ایک مجسمہ بنانا چاہا ——— سکون آگیں وحیات بخش ——— میں نے کائنات سے التجا کی کہ وہ میرے لئے ضروری اسباب فراہم کرے ——— میری دعا مقبول ہوئی ——— نسیم سحر نے اپنے لطیف ونازک دامن میں کائنات کے پھولوں کی نرمی اور عطریت بسا لائی ——— سمندر نے اپنی موجوں کی لچک اور والہانہ پن بخشا ——— ڈوبتے ہوئے سورج نے اپنی زرین کرنیں اس دیوی کی رنگت کے لئے پیش کیں ——— قوس قزح نے اپنے رنگوں کی نذر گزرانی ——— چاند نے اپنی مستانہ روی کو اس میں جذب کیا ——— تاروں نے اپنی چمک نچھاور کی ——— برق نے لاابالی پن دیا ——— سبزہ سے بیگانگی اور شبنم کے موتیوں کی آب وتاب لی ——— مرغان چمن نے اپنی خوش گلوئی اور ترانہ سنجی دی ——— کبک وطاؤس سے مستانہ روی لی ——— نرگس نے اپنی تمام مستی اس کی آنکھ کے لئے وقف کر دی ——— شب تاریک اور ساون کی گھٹاؤں سے زلف کی سیاہی ——— سنبل پیچاں سے زلفوں کا پیچ وخم ——— کوہساروں کی برف سے صباحت ——— بہار سے شباب لیا ——— اور صبح کے سہانے وقت اساوری کے دھیمے سروں میں ——— ان سب کو اکٹھا کیا ——— تصور کے ہاتھوں نے اس سے دیوی کا ایک مجسمہ تیار کیا ——— من کے مندر میں ——— انتظار کی توانائی نے اس مجسمہ میں اجتہاد کی روح پھونک دی ——— وہ گویا ہوئی ——— اس نے سب سے پہلے اپنا نام ظاہر کیا ——— دیوی نے کہا میرا نام ——— "امید" ——— ہے ——— کیسا دلکش نام ———

ریاض جنیدی

(طبع زاد)

رات کا بھولا اور دیگر افسانے ۔ پروفیسر عبد القادر صاحب سروری ایم اے۔ ایل ایل بی صدر شعبۂ اردو' فارسی وعربی مہاراجہ کالج میسور کے گیارہ بلند پایہ افسانوں کا دلچسپ مجموعہ ہے جو نہایت اہتمام کے ساتھ بہت ہی دیدہ زیب شائع ہوا ہے۔ اس کتاب کا ٹائیٹل ملک کے بلند پایہ حسن کار مسٹر عبد القیوم نے بنایا ہے۔ طباعت وکتابت پاکیزہ اور دیدہ زیب ہے۔

صفحات ۱۶۸ قیمت عہ

غزل

رقصاں ہیں کیوں نظر میں کونین کی بلائیں
شاید مرے جنوں کی معصوم ہیں خطائیں
کھیلیں وہ میرے دل کی ہر آرزو سے کھیلیں
کیا کیجئے اگر وہ اس سے بھی باز آئیں!
ہے پاسِ وضع بھی اک نیرنگیٔ محبت!
کہئے تو آستاں پر سو بار سر جھکائیں!
دل چیر کر بھی ان کو رکھ دوں تو کیا بھروسہ
ارمانِ قرب جانے کیا اور رنگ لائیں
مجبورِ آرزو کی مجبوریاں بھی توبہ!!
یوں ورنہ کوئی روئے اور آپ مسکرائیں
اتنی سی بے رخی پر یہ حال ہو گیا ہے
کیا کیا ترے کرم تک مغرور تھیں وفائیں
اچھا نہیں قتیلؔ اب ذوقِ غزل سرائی
اک رازِ زندگی کو افسانہ کیا بنائیں!

حفیظ قتیلؔ

واردات

حسرتِ دید کی قسم برقِ نظر گرائے جا
حسنِ نظر کا واسطہ ذوقِ نظر بڑھائے جا
حسن کی بارگاہ میں سوز نہیں تڑپ نہیں
بربطِ عشق چھیڑ دے نغمۂ غم سنائے جا
اصلِ حیات عشق ہے، عشق سے لطفِ زندگی
کیف حیات بخش دے ذوقِ نظر بڑھائے جا
حد تعینات سے تیرا مقام ہے بلند
قیدِ مکاں سے نکل ساری فضا پہ چھائے جا
تیرا جمالِ دلفروز وجہ سکوں سہی مگر!
مجھ کو سکوں نہ چاہئے درد کو دل بنائے جا
دونوں جہاں کی وسعتیں تنگ سہی ترے لئے
وسعتِ دل کا واسطہ دل میں مرے سمائے جا
شاہدؔ نغمہ سنج کو تیرے اسیرِ زلف کو
شوقِ دوام کر عطا درد کو اور بڑھائے جا

شاہدؔ

نسیمہ

وسیمہ کا تپ دق اتنا شدید ہو گیا تھا کہ اس کی زندگی کی کوئی امید ہی باقی نہ تھی۔ ادھر ننھے ننھے بچوں کا یہ حال کہ کوئی ان کا پرسان حال نہ تھا۔ ایک نسیمہ سو وہ بیچاری کیا کیا کرتی۔ سرائے فانی سے رخصت ہونے والی ماں کی تیمارداری کرتی یا بچوں کی دیکھ بھال۔ غرض وسیمہ کے گھر کے ذرہ ذرہ میں ادبار و افلاس چھائی ہوئی تھی۔ مسلسل علالت کی وجہ سے وسیمہ کی حالت اب مایوس کن ہوتی جاتی تھی موت اس کے سر پر منڈلا رہی تھی اور فرشتۂ اجل اس کی چارپائی کا طواف کر رہا تھا۔ وسیمہ کی آنکھوں میں تاریکی ذرہ ذرہ میں پیوست تھی۔ ساری فضا پر ایک ہولناک اور غم انگیز سکوت چھایا تھا۔ ننھے ننھے معصوم بچے دنیا کے غم و اندوہ سے بے پروا گہری نیند میں مصروف تھے۔ نسیمہ ماں کی چارپائی کے پاس دو زانو ہو کر بیٹھ گئی۔ اس کے کانوں نے سنا۔

"بیٹی نسیمہ! میری زندگی کی چند سانسیں اور باقی رہ گئی ہیں اور کوئی دم میں میں تم لوگوں سے ہمیشہ کے لئے جدا ہو جاؤں گی۔ آہ! میرا کلیجہ کٹتا ہے کہ میں تم لوگوں کو اتنا بیکس بنا کے جا رہی ہوں بیٹی! موت پر قابو نہیں چلتا ورنہ اس سے کہتی کہ خدا کے لئے مجھے اتنی تو مہلت دے کہ اپنے بچوں کا کچھ انتظام کر دوں میں انھیں کس پر چھوڑ کے جاؤں۔ وہ بیچارے بن ماں باپ کے رہے جاتے ہیں۔ میری بیٹی! میں تم سے سخت نادم ہوں کہ تمہارے لئے جیتے جی کچھ نہ کر سکی۔ مجھ سے تمہاری کوئی آرزو پوری نہ ہو سکی اس لئے کہ میں بے بس و لاچار تھی۔ اور اب جبکہ میں دنیا سے رخصت ہو رہی ہوں تمہارے لئے کچھ بھی چھوڑ کے نہیں جا رہی ہوں۔ [illegible] کو فکر میں بھی بیقرار رکھے گا۔ نسیمہ تم مجھے معاف کرنا۔ تمہارا حق مجھ پر تھا جسے میں ادا نہ کر سکی۔ میں تم سے ہمیشہ کے لئے جدا ہو رہی ہوں اور اس وقت میرا دل مجبور کر رہا ہے کہ میں تم سے ایک التجا کروں۔ اور وہ یہ کہ تمہارے چھوٹے بھائی بہن بے یار و مددگار رہے جاتے ہیں۔ ایک تم ہی ان کی دنیا میں رفیق و ہمدرد ہو میرے بعد تم ہی ان کی ماں بنو گی۔ دیکھو ان کے دلوں پر میل نہ آنے پائے۔ یہ بیچارے تم سے زیادہ واجب الرحم ہیں۔ یہ غریب باپ کی صورت بھی نہ پہچاننے پائے تھے کہ باپ دنیا سے اٹھ گیا اور ماں کی آغوش محبت میں ابھی اچھی طرح پلنے بھی نہ پائے تھے کہ ظالم موت ان سے اسے بھی چھین لے رہی ہے"

وسیمہ اپنی نحیف آواز میں اتنی گفتگو کر پائی تھی کہ اس کی سانس اکھڑ گئی اور ایک گھنٹے کے اندر ہی اس کی روح عالم شہود کی جانب پرواز کر گئی۔ نسیمہ پر اس وقت ایک قیامت ٹوٹ پڑی تھی وہ بدحواس تھی وفور غم سے وہ فرش پر گر پڑی اور بے ہوش ہو گئی اور کامل تین گھنٹے کے بعد اسے ہوش آیا تو اس کا دماغ واقعہ کی نوعیت کے سمجھنے سے قاصر تھا۔ خاتون وسیمہ کی عیادت کے لئے آئی تو قیامت کا منظر اس کی آنکھیں دیکھ رہی تھیں۔ آن کی آن میں یہ خبر بجلی کی طرح بستی میں دوڑ گئی۔ اللہ کی نیک بندی خاتون نے لاوارث میت کو غسل دیا اور شام کو ۶ بجے وسیمہ اپنے دل میں حسرت و ارمان کی ایک دنیا لئے ہوئے خاک میں دفن کر دی گئی۔

غم و اندوہ انسان کے دل کو کھرچتا، کلیجے کو کاٹتا اور دماغ کو معطل کر دیتا ہے۔ نسیمہ غریب پر مصیبتوں کا ایک پہاڑ ٹوٹ پڑا تھا۔ پاس پڑوس والوں نے ہمدردی کی جہاں تک ہو سکا۔ اور ملی جلی کی جس حد تک بن پڑا۔ لیکن "ماں" کو کوئی نہیں

بن سکتا تھا۔ سچ یہ ہے کہ دنیا سے "ماں باپ" کا اٹھ جانا خود بچوں کے لئے ایک طرح "موت" کا پیغام ہے۔ ان کو سکھ اور راحت اس وقت تک ہے جب تک کہ انھیں ماں کا آغوش حاصل ہے۔ ماں دنیا سے اٹھی کہ ان کی راتیں خواب ہوگئیں سکھ اور چین ان کے لئے حرف غلط کی طرح مٹ کے رہ گیا اور یاس و حرمان کی بدلیاں ان کے دلوں پر چھا گئیں۔ الغرض اللہ نہ کسی کو "ماں" کے سائے سے محروم کرے۔ یسیری کا داغ خدا بچائے بڑا سخت ہوتا ہے۔ حرماں نصیب نسیمہ ماں کی آغوش سے ہمیشہ کے لئے محروم ہوگئی۔

زمانہ ایک حال پر قائم نہیں رہتا۔ اس کی فطرت میں تغیر اور انقلاب ہے۔ اس کی طلسم کاریاں نئی نہیں ہیں۔ وہ گرگٹ کا سا رنگ بدلتا رہتا ہے۔ حیرت کی بات ہے کہ اس کارخانۂ ہستی میں کبھی ہم سخت المناک مناظر دیکھتے ہیں اور کبھی انتہائی خوش کن۔ واقعات زمانہ اس بات کے شاہد ہیں کہ دنیا کا کوئی فرد بشر اپنی زندگی میں یکسانی و یک رنگی نہیں پاتا۔ اس کی زندگی مختلف دوروں سے ہو کر گزرتی ہے اور جس کا ہر دور ایک دوسرے سے مختلف و الگ ہوتا ہے۔ ایک ہی بستی کو لیجئے بلکہ اس کے کسی محلے کو بلکہ اس کی ایک گلی کو۔ بیسیوں مکان ایسے ملیں گے جو مسرت کا گہوارہ اور خوشیوں کا مرکز نظر آئیں گے۔ کہیں کرتا ٹوپی کی رسم ادا ہو رہی ہوگی کہیں چوتھی چالے کی تیاریاں ہو رہی ہوں گی۔ لیکن ذرا دس قدم اور ہٹ کر دوسرے گھروں کی حالت پر نظر ڈالو تو ایک دوسرا ہی عالم نظر آئے گا۔ ماں جگر تھامے ہوئے اپنے جوان بیٹے کی لاش پر سر جھکائے کھڑی ہے۔ اس کے سینے میں ایک محشرستان بیقراری برپا ہے اور آنکھیں خون برسا رہی ہیں دنیا اس کی نظروں میں تیرہ و تار ہے۔ غم نصیب دلہن اپنے سرتاج کی میت پر حسرت و بیکسی کے ساتھ نظریں جمائے ہوئے اپنی قسمت کی تاریخ کے مطالعہ میں مصروف ہے۔ اس کا سینہ غم کی گرمی سے جلتا جا رہا ہے۔ اس کی امیدوں کا چراغ بجھ رہا ہے بیوی کا سہاگ لٹ رہا ہے۔

الغرض زمانے کی یہ کرشمہ سازیاں نئی نہیں ہیں دنیا میں ایسے واقعات ہوتے آئے ہیں اور آئندہ بھی ہوتے رہیں گے۔

نسیمہ قدرتاً تھی بڑی ہوشمند فہیم اور معاملہ فہم۔ ماں باپ کے سائے کا اٹھ جانا اکثر بچوں کی زندگیوں کی تباہی کا سبب بنتا ہے۔ ان کے بعد بچوں کو صحیح تربیت دینے والا زندگی کے اونچ نیچ سے اور زمانے کی چالوں سے آگاہ کرنے والا کوئی نہیں رہ جاتا۔ اس لئے ایسے بچے جو والدین کے سائے سے محروم ہو جاتے ہیں دنیا میں عموماً ناکام و نامراد زندگی بسر کرتے ہیں مگر آفریں ہے اس سلیقہ شعار نسیمہ پر جو حوادث روزگار سے ناک بھوں چڑھائے بغیر اور واقعات دہر سے متاثر نہ ہو کر سلامت روی سے چلتی رہی اور ایسی چال چلی کہ اس کی حالت جو بھی دیکھتا حیرت کرتا۔ سب سے پہلے اس نے اپنی سلیقہ مندی سے اس گھر میں جہاں اکثر فقر و فاقہ سے زندگی بسر ہوتی تھی ایسی ترکیب نکالی کہ دو وقت نہیں تو ایک وقت سب شکم سیر ہو کر کھانا کھا لیتے۔ وہ اجرت پر کپڑے سیتی گھر میں مرغیاں پالتی۔ انڈے بیچتی اور دوسرے جائز ذریعوں سے کماتی۔ اس کی ان ہنرمندیوں کا چرچا گھر گھر ہونے لگا اور جسے دیکھو نسیمہ ہی کا ثنا خواں اور مداح نظر آتا تھا۔

نسیمہ نے کچھ تو اپنے طور پر اور کچھ اپنی ایک پڑوسن کی مدد سے پہلے قرآن شریف اور چند مذہبی کتابیں اور پھر اردو کی چند

مروجہ کتابیں پڑھیں۔ اس کے اخلاق کی عمدگی اور کردار کی خوبی کا تنہا ضامن اس کی نیک سرشت تھی۔ ورنہ دیکھا جائے تو اس کو صحبت اچھی ملی اور نہ تعلیم ہی کچھ اعلیٰ قسم کی حاصل ہوئی اس نے جو کچھ سیکھا وہ فطرت کے عالمگیر دبستان میں سیکھا سچ پوچھو تو انسان کی سب سے بڑی معلمہ فطرت ہے۔

نسیمہ کا کاروانِ حیات جب عمر کی پندرھویں منزل پر پہنچا تو بستی میں اس کے حسن سیرت کا گھر گھر چرچا ہونے لگا۔ وہ پیکر حلم اور مجسمۂ اخلاق تھی، صوم وصلوٰۃ کی پابند سگھڑ سلیقہ شعار اور بڑی ہی نفاست پسند۔ بستی کے ہر گھر کی بڑی بوڑھیاں اس کے اخلاق وکردار کی بیحد گرویدہ ہو رہی تھیں کسی گھر میں جب نسیمہ کا ذکر آتا تو ہر ماں اپنے بیٹے کا بیاہ اس سے رچانے کے لئے آرزو مند نظر آتی۔

زمانے کی یہ ریت نئی نہیں ہے کہ انسان کسی کی بیٹی بیاہتے وقت اس کی مالی حالت پر بھی غور کرتا ہے اور جہیز پر پہلے نگاہ جاتی ہے۔ بن ماں کی بچی نسیمہ کے پاس اس کا کل اثاث البیت چکی، لوٹا، کٹورے چند مٹی اور تانبے کے برتن اور ایک گائے تھی جو اس نے اپنی چھوٹی بہن کو دودھ پلانے کی خاطر خریدی تھی۔ اور یہ گائے اس کی اپنی کمائی سے خریدی گئی تھی۔ غرض جہیز کے لحاظ سے بلاشبہ نسیمہ بڑی بدقسمت لڑکی تھی۔ دنیا میں ہر طرح کے لوگ ہوتے ہیں کوئی لڑکی کے جہیز پر نظر ڈالتا ہے کوئی اس کی سیرت عمدہ چاہتا ہے اور کوئی ان دونوں کی جستجو میں رہتا ہے۔

نسیمہ کی استانی خاتون تھیں۔ سن رسیدہ اور جہاں دیدہ۔ جب تک وسیمہ زندہ رہی خاتون اس کے پاس اکثر آیا کرتیں اور خدا رسول کی باتوں میں دن کاٹ دیتیں۔ زہد و ورع کی وجہ سے محلہ کی بیبیاں ان کا خاص وقار واحترام کرتی تھیں۔ ان کو نسیمہ سے خاص شفقت تھا۔ وسیمہ کے مرنے کے بعد وہ ان کا بوجھ بھی بہت بڑھ گیا اور وہاں بھی توجہ ہوئیں۔ ہم یہ نہیں کہہ سکتے کہ نسیمہ نے دنیا میں جو ترقیاں کیں وہ سب کی سب اس کی اپنی ذہانت اور محنت کا نتیجہ تھا۔ بلاشبہ خاتون نے بڑی حد تک اس کی مخلصانہ رہبری کی۔ ماں کی جگہ پر ماں کا سا سلوک کیا اور استانی کی جگہ استانی کا۔ ہمارے نزدیک استانی اور ماں کے مفہوم میں کچھ بھی فرق نہیں۔ سنتے ہیں کہ اگلے زمانے میں استانیاں لڑکیوں کے ساتھ ماؤں کا سا سلوک کرتی تھیں۔ ان کی ہر ہر بات میں وہی پیار و محبت، شفقت و وارفتگی پائی جاتی تھی جو صرف ایک ماں میں قدرت ودیعت کر سکتی ہے۔ ان کے دلوں میں محبت و دل سوزی کی وہی کیفیت موجود ہوتی تھی جو اپنے بچوں کے لئے صرف ماؤں کے دلوں میں پیدا ہو سکتی ہے۔ الغرض خاتون غم نصیب نسیمہ کے لئے فرشتۂ رحمت بن کر آئی اور اس کی مخلصانہ کوشش نے نسیمہ کی مصیبتوں کو دور نہیں تو ہلکا ضرور کر دیا تھا۔ خاتون نے جب دیکھا کہ نسیمہ شباب کی منزل میں قدم رکھ چکی تھی تو اسے اس کی شادی کی فکر دامن گیر ہوئی۔ ہمارے یہاں کی مائیں بیٹیوں کو گھر میں بٹھائے رکھنا بہت معیوب سمجھتی ہیں۔ جوان ہو کر بیٹیاں ان کے لئے عذاب ہو جاتی ہیں۔ انھیں قطعاً گوارا نہیں کہ شباب کی منزل میں قدم رکھنے کے بعد ان معصوم ہستیوں کو اپنے گھر میں جگہ دیں۔ یہ مائیں آہ! انہیں مطلق درد نہیں ہوتا کہ ان بے زبان دیویوں اور اللہ کی سب سے زیادہ محترم مخلوق کو بغیر ان کی مرضی اور ایما کے مردوں کے حوالے کر دیتی ہیں۔ وہ تو اس فرض سے سبکدوش ہو جاتی ہیں۔ لیکن انھیں خبر نہیں کہ اپنی ناعاقبت اندیشی سے ان بے زبان لڑکیوں

کتنا ظلم ڈھایا گیا ہے۔ ایشیائی عورت شرم و حیا کی پتلی ہوتی ہے جس گھر میں اس کی ڈولی جاتی ہے اسی گھر سے اس کا ڈولا نکلتا ہے۔ وہ دکھ اٹھاتی، صدمے برداشت کرتی اور مصیبتیں سہتی ہے لیکن اپنے شوہر کے در کو چھوڑنا اپنے لئے موجبِ عار سمجھتی ہیں۔ وہ میکے کی امیرانہ زندگی اور ملوکانہ شوکت و اقتدار پر اپنے سسرال کی فلاکت زدہ اور آشفتہ حال زندگی کو ترجیح دیتی ہے اس کی آرزوؤں کا منتہا شوہر کی خوشنودی اور خواہشوں کی معراج شوہر کی رضا جوئی ہے۔ غور کا مقام ہے کہ لڑکیاں جب میکے سے سسرال پہنچتی ہیں تو ان کے نازک دلوں پر کیا گذرتی ہوگی وہ ایک ایسی دنیا میں قدم رکھتی ہیں جو ہر حیثیت سے اس دنیا سے مختلف ہوتی ہے جسے وہ چھوڑ کر جاتی ہیں۔ اس دنیا کے زمین و آسمان بدلے ہوئے ہوتے ہیں۔ یہاں کی تہذیب و مدنیت، گفتار کردار، رسم و رواج غرض ہر چیز اور زندگی سے متعلق ہر بات اتنی مختلف اور بعض دفعہ اس درجہ انوکھی ہوتی ہے جس پر قابو پانا عام لوگوں کے لئے ممکن نہیں پھر ستم بالائے ستم یہ کہ ان کو کمزور سمجھ کر اور اس کا یقین کر کے کہ ان کی آواز اتنی بھی وقعت نہیں رکھتی جتنی کہ نقارخانے میں طوطی کی آواز رکھتی ہے اس درجہ ستایا اور دکھ پہنچایا جاتا ہے کہ جس کا تصور کر کے انسانی روح کو شرم آتی ہے اور کلیجہ کانپ اٹھتا ہے۔ ساس، نندوں کے نزدیک ان کا وجود ایک حقیر خواص اور ذلیل لونڈی سے زیادہ نہیں ہوتا اور پھر ان کی ستم رانیوں کا آغاز کچھ اس دردناک طریقہ سے ہوتا ہے جس سے تہذیب و انسانیت کی دیوی اپنا سر پیٹتی نظر آتی ہے۔ الغرض یہ عورت ہی کا کلیجہ ہے کہ سسرال کے شدائد اور مصائب کا ہدف بنتی ہے لیکن زبان سے اف نہیں نکالتی۔ نندوں کے جگر دوز فقرے سنتی ہے اور کلیجہ تھام کے رہ جاتی ہے۔ ساس کی آمرانہ حیثیت تو مستقل ہوتی

[illegible] ضرورت چاہیے ہو کہ وہ باتیں سنا دے اس کی کوئی اپیل نہیں اس جرم کے خلاف دنیا کی کوئی عدالت کوئی سزا نہیں تجویز کر سکتی۔

اسلم اسی بستی کا ایک میٹرک پاس نوجوان تھا جو ہر جانہ حسن سے آراستہ اور انسانی صفات کا پیکر تھا خاتون نے نسیمہ کے لئے اسی نوجوان کا انتخاب کیا۔ ظاہرا دیکھا جائے تو انتخاب کسی اعتبار سے بھی غلط نہ تھا۔ لیکن آئندہ حالات نے جو کروٹیں بدلیں ان سے یہ پایا جاتا ہے کہ خاتون سے اس معاملے میں تھوڑی چوک ہو ہی گئی۔ ازدواجی زندگی کو بہتر اور کامیاب بنانے کے لئے میاں بیوی کے مزاج میں ایک گونہ یکسانیت و اتحاد ہونا ازبس ضروری ہے جیسا کہ آنکھیں دنیا کے واقعات دیکھ رہی ہیں۔ ان سے تو یہی نتیجہ نکالا جا سکتا ہے کہ ہر زمانے کا رجحان مختلف ہوتا ہے۔ انسان کو بدلے ہوئے احوال اور حالات کا ساتھ دینا پڑتا ہے۔ ورنہ زمانے کی گردش اسے پیس کے رکھ دیتی ہے۔

ع زمانہ با تو نہ سازد تو با زمانہ بہ ساز

آج کل کی دنیا میں ہمیں زمانے کے ایسے کرشمے نظر آتے ہیں کہ آنکھیں حیران اور دل ششدر رہ جاتا ہے۔ پرانے زمانے میں تو انسانی دماغ اتنے تاریک تھے کہ شادی کے بارے میں مرد و عورت کو اپنے رجحانات اور خواہشات کو ظاہر کرنے کی مطلق آزادی نہ تھی۔ برعکس اس کے آج کل کی دنیا میں بغیر اس کے کوئی رشتۂ ازدواج قائم ہو ہی نہیں سکتا۔ لڑکوں کا یہ عالم ہے کہ لڑکی کے ظاہری و معنوی حسن و جمال کے متعلق جب تک معلومات نہیں حاصل کر لیتے کم تر شادی کے لئے آمادہ نظر

آتی ہیں۔ ہمارے یہاں کی ازدواجی زندگیاں اسی لئے مایوس کن ہوتی ہیں کہ شادی لڑکے اور لڑکی کی باہمی رضامندی پر نہیں ہوتی۔ اور اسی لئے ان میں الفت و شیفتگی کا وہ جذبہ قطعاً مفقود ہوتا ہے جو ان کی آئندہ زندگی کو خوش گوار بنانے میں معاون ہوتا ہے۔ الغرض اس طرح پر جو شادیاں رچائی جاتی ہیں ان کا انجام صد درجہ حسرتناک اور الم انگیز ہوتا ہے اس کی مثالیں ہندوستان [illegible] گھر گھر مل سکتی ہیں۔

وسیمہ مرحومہ کے گھر میں پڑوس کی ۲۰۔ ۲۵ عورتیں جمع ہیں۔ آج نسیمہ کے نکاح کا دن ہے۔ وہ ایک کوٹھڑی میں مجسم غم کا مرقع بنی ہوئی بیٹھی ہے۔ رات کو نو بجے اس کا نکاح اسلم کے ساتھ پڑھا دیا گیا۔ دوسری صبح نسیمہ کی رخصتی کا دن تھا۔ بن ماں کی بچی نسیمہ کو جدا کرانے کے لئے پاس پڑوس کے لوگ جمع تھے۔ وہ اپنے ساتھ جہیز میں ایک جانماز لوٹا، دو چار برتن اور چار جوڑے کپڑے لیکر میکے سے سسرال سدھاری۔ رخصتی کا منظر یوں بھی بڑا دردناک ہوتا ہے اور اپنے پرائے سب ہی اس وقت آنسو بہاتے ہیں۔ لیکن بن ماں باپ کی بچی نسیمہ کی رخصتی کا منظر جس جس نے دیکھا ہے آنسوؤں کا تار بندھ گیا ہے۔ ایک قیامت صغریٰ تھی جو اس وقت برپا تھی اور ہر چھوٹا بڑا، اپنا پرایا رنج و ماتم کا پیکر بنا نظر آتا تھا۔ جس وقت غم نصیب نسیمہ ڈولی پر سوار کی جارہی تھی وہ ایسا بلک بلک کر رو رہی تھی کہ اس کا عروسی جوڑا آنسوؤں سے تر تھا۔ اپنے چھوٹے بھائیوں سے ایسا چمٹی تھی کہ ان سے جدا ہونے کا بھی نام نہ لیتی تھی۔ دیکھنے والوں میں سے کوئی ایسا نہ تھا جس نے یہ دلخراش منظر دیکھا ہو اور دل پر ایک چوٹ نہ محسوس کی ہو۔ غرض گریہ و زاری کی گونج میں نسیمہ کی ڈولی سسرال کی طرف روانہ ہونے کو اٹھی تو خاتون نے تھوڑی دیر کے لئے ٹھیرایا اور اپنی منہ بولی بیٹی نسیمہ کو کلیجے سے لگایا۔ اس وقت اس کی آنکھوں سے آنسو ابل رہے تھے۔ نسیمہ دھاڑیں مار مار کر رونے لگی جب اس کی حالت کچھ سنبھلی تو خاتون نے اپنے دوپٹہ سے اس کا منہ پونچھا اور کہنے لگی۔

"بیٹی نسیمہ! آج سے تمہاری زندگی کا ایک نیا دور شروع ہوتا ہے۔ مجھے امید ہے کہ جس طرح میکے میں تم نے اپنی سلیقہ مندی اور سگھڑاپن کا ثبوت دیا ہے اسی طرح سسرال میں بھی تم اپنی حکمت عملی سے سب کے دل میں گھر کرکے رہوگی۔ بیٹی! لڑکیوں کے لئے یہ وقت بڑی قیامت کا ہوتا ہے۔ بہن بھائی کی محبت پر شوہر کی محبت کو مقدم سمجھنا اور خبردار کبھی ساس نند کی مرضی کے خلاف کوئی بات نہ کرنا۔ بعض وقت تم کو اپنے جذبات پر پتھر رکھنا پڑے گا اور اپنی خواہش کو سسرال والوں کی خواہشات پر قربان کرنا پڑے گا۔ تم وہاں تنہا ہوگی تمہارے ساتھ ہمدردی کرنے والا کوئی نہ ہوگا۔ تمہاری بے بسی پر آنسو بہانے والا کوئی نظر نہ آئے گا۔ دیکھو بیٹی! در و دیوار تم سے دشمنی کریں گے۔ گھر کی لونڈیاں بھی تم سے کترائیں گی تم صبر و ضبط سے کام لینا۔ بیٹی نسیمہ! محبت اور بدگمانی بظاہر دو لفظ سہی لیکن ان کے معنی ایک ہیں۔ شوہر ذرا سی بدگمانی پر بیوی سے الفت و محبت ترک کر بیٹھتا ہے۔ بات چیت موقوف کر دیتا ہے۔ بیوی لاکھ آنسو بہاتی ہے۔ منت و سماجت کرتی ہے لیکن وہ ٹس سے مس نہیں ہوتا۔ اس کے علاوہ نند کا بھی یہی حال ہوتا ہے۔ بھاوج نے ذرا بھی اس کی مخالفت کی کہ اس پر آفتوں کا نزول ہونے لگا طرح طرح سے اس غریب کو ذلیل کیا

جاتا ہے۔ اور رسوائی کی سو سو ترکیبیں کی جاتی ہیں۔ پہلے شوہر کو بدگمان کیا جو شوہر بدگمان ہوا تو بیوی کہیں کی نہ رہی۔ پس میری پیاری بیٹی! تم اپنے شوہر کو اپنا سرتاج اور اپنا آقا سمجھنا اور اپنے کو ادنیٰ کنیز۔ شوہر کے دل میں جگہ کرنا اور اس میں پریم کا ایک عظیم الشان مندر تیار کرنا۔ اس مندر کی دیوی تم ہو گی اور اس کا پجاری تمہارا شوہر۔ غرض اگر تم سکھ کی زندگی بسر کرنا چاہتی ہو تو پہلے یہ دکھ اٹھانا۔ اس لئے کہ دکھ اٹھانے کے بعد جو سکھ حاصل ہوتا ہے وہ زیادہ پائدار اور لازوال ہوتا ہے۔ اچھا اب تم کو خدا کے سپرد کرتی ہوں۔ جاؤ اور دیکھو غریب مرحوم ماں باپ کی لاج رکھنا۔ وہ دنیا میں اچھی بسر کر گئے۔ لوگ آج بھی اچھے اوصاف کی وجہ سے ان کو سراہتے ہیں۔ تم ان کی دختر نیک اختر ہو۔ ایسی حرکت نہ کر بیٹھنا جس سے ان کی روح کو اذیت پہنچے۔ یہ کہہ کر خاتون نے نسیمہ کو کلیجے سے لگا لیا نسیمہ پھوٹ پھوٹ کر رونے لگی خاتون نے چٹ چٹ بلائیں لیں۔ اور سیکڑوں دعاؤں کے ساتھ نسیمہ کی ڈولی سسرال کی طرف روانہ ہوئی۔

نسیمہ جب سسرال پہنچی تو واقعی اسے خاتون کی نصیحت حرف بہ حرف صحیح معلوم ہوئی جو کچھ وہاں کانوں سے سنا تھا وہی یہاں آنکھوں سے دیکھ رہی تھی۔ نندیں بلا وجہ اس سے بغض و عداوت رکھتیں۔ اور ساس کو وہ ایک نظر نہ بھاتی۔ شوہر بھی اس سے اس لئے ناراض تھا کہ وہ تہذیب جدید اور مغربی انداز آرائش سے قطعاً ناواقف تھی۔ ساس اس لئے چیں بہ جبیں رہتی کہ بہو ننگی بچی میکے سے آئی۔ وہ یہ کہتی تھی کہ اب مولوی فتح اللہ کا خاندان ایسا بھی کیا غریب ہو گا کہ بیٹی کے لئے سات جوڑے گرٹے پٹھے کے اور اکیس سادے بھی نہ ملیں گے۔ خیر! زیور نہ

چڑھاؤ نہ سہی تو ایک ایک جوڑ ساہ تو ملتا۔ برتنوں میں لوٹے، سیلفچی، پٹاری، سنگھار دان تک نہیں۔ ایسا کیا میرا لڑکا گرا پڑا تھا کہ اس کو بڑے کیاں نہ ملتیں۔ میں تو جہیز کی طرف سے پہلے ہی سے ہاتھ دھوئے بیٹھی تھی۔ یہ اسلم کے ابا جان ہیں جن کو ہر وقت اسی کا پٹنا پڑا رہتا تھا کہ لڑکی میں لڑکی فتح اللہ خاں کی لڑکی۔ دن رات اسی لڑکی کی تسبیح پڑھتے تھے اور کہتے تھے کہ میں اسلم کے لیے اسی کو بیاہ کر لاؤں گا۔ اب لائے ہیں تو ہم اس کے ناز اٹھائیں اور اس کا پورا بھی وہی کریں۔ میں تو ایسی بہو کو ایک نظر بھی اٹھا کر دیکھوں نہ اس کو اپنی بہو سمجھوں۔

نسیمہ جب سے سسرال آئی۔ اس کی آنکھوں میں آنسوؤں کا تار بندھا رہا وہ اکیلی کونے میں بیٹھی اپنی شوریدہ بختی پر آنسو بہاتی۔ اس کی آنکھوں کے سامنے دنیا تیرہ و تار تھی۔ میکے، سسرے کہیں اس کا کوئی نہ تھا۔ کس سے التجا کرتی اور کس سے فریادی ہوتی۔ شوہر بھی اسے گفتگو کا موقع نہ دیتا۔ مصیبت کی ماری نسیمہ کو بیاہے تین مہینے کامل گزر گئے اس نے نہ جانا کہ دلہنا پا کیسا ہوتا ہے اور شوہر کی محبت کیا چیز ہے۔ وہ بیاہ کر آئی تو گھر میں شوہر، ساس اور نند غرض سب ہی کو اپنا دشمن پایا۔ شرم کی وجہ سے وہ ساس سے بول بھی نہ سکتی تھی ایک دن وہ دل میں کئی بار یہ سوچتی رہی کہ لاؤ ان کے کاموں میں ہاتھ بٹاؤں۔ اس طرح پر شاید ان کے دل میں کوئی جگہ پیدا کر سکوں کئی بار ارادہ کیا۔ لیکن ہمت نہ بڑھتی تھی۔ ایک روز جب ساس برتن مانج رہی تھی نسیمہ دل مضبوط کر کے آگے بڑھی اور برتن اپنے ہاتھ میں لینا چاہا کہ ساس نے اس زور سے ہاتھ کو جھٹکا دیا کہ غریب نسیمہ کی چوڑیاں ٹوٹ گئیں اور ہاتھ لہولہان ہو گیا۔ ڈائن ساس نہ جانے کتنا سخت سست سناتی رہی نسیمہ کا برتن ہاتھ میں لینا گویا شہد کی مکھیوں کو چھیڑنا تھا۔ سارا ملتوبھی

جھگڑا لگا رہا۔ نسیمہ جب واپس اپنی جگہ پر آئی تو اپنی تیرہ بختی پر آنسو روئی کہ آنکھیں سرخ ہو گئیں۔ ہچکیاں بندھیں اور بالآخر غشی طاری ہو گئی۔ بن ماں کی بچی اور بدنصیب بہو کی اس حالت پر بھی اسے ترس نہ آیا۔ کچھ دیر کے بعد نسیمہ کو ہوش آیا۔ لیکن آنسو اب بھی رواں تھے پیاس کی شدت سے اس کا حلق خشک ہو رہا تھا۔ لیکن دو بوند پانی دینے والا بھی اسے کوئی نظر نہ آتا تھا۔ نئی دولہنوں پر طرح طرح کی بندشیں ہوتی ہیں وہ از خود کسی کام کا ارادہ بھی نہیں کر سکتیں۔ ہر معاملے میں انہیں دوسروں کا محتاج بننا پڑتا ہے۔ پانی پینے کے لئے اُٹھ کر جانا اس کے لئے ایسا تھا گویا وہ ایک بڑے جرم کی طرف قدم اٹھا رہی ہے۔ بھوک تو اسے لگتی ہی نہ تھی۔ پیاس کے لئے البتہ وہ اکثر بیتاب رہی۔ گھنٹوں سوچتی۔ نظریں بچا کر گھڑونچی کے پاس خود جا کر ٹھنڈا گرم جیسا بھی پانی لُنڈھا پی لیتی اور الٹے پاؤں واپس آتی۔ گھر کی نائن "نجبین" نسیمہ کی اس بے بسی پر بےحد ترس کھاتی۔ کئی بار ایسا ہوا کہ نسیمہ نے اسے اپنا ہمدرد پا کر پانی منگوا منگوا کے پیا۔ نجبین کی ہمدردیاں نسیمہ کے حق میں بڑھتی گئیں اور وہ اب اس امر کی منتظر رہتی کہ دولہن بیگم اس سے کوئی خدمت لیں۔

اسلم کا طرزِ عمل بھی نسیمہ کے ساتھ افسوسناک حد تک خراب ہو چلا تھا۔ وہ کبھی نسیمہ سے سیدھے منہ بات نہ کرتا۔ ایک روز وہ کسی کام سے نسیمہ کی طرف گیا۔ دکھ کی ماری نئی دولہن جھٹ قدموں پر گر پڑی اور لگی گریہ و زاری کرنے۔ شوہر سے گفتگو کرنے کا یہ پہلا موقع تھا۔ وہ بہت گڑگڑائی اور رو رو کر یہ کہنے لگی۔

"میرے سرتاج! اپنی اس ناچیز لونڈی کی خطاؤں کو درگزر فرمائیے اور خدا را کچھ تو کہئے کہ آپ مجھ سے کیوں خفا ہیں۔ میں اپنی ہستی کو آپ کے قدموں پر قربان کرنے کے لئے آرزومند ہوں۔ کچھ تو بولئے میرے آقا! کیا میں اس قابل نہ تھی کہ آپ کی شریکِ حیات بن سکوں۔ ہائے اللہ میکے میں جب تک رہی ماں باپ کی جدائی میرے دل کو کچوکے دیتی رہی اب سسرال آئی تو میری قسمت نے یہ گل کھلائے۔ آپ کی ناراضگی کی وجہ سے زندگی مجھ پر بوجھ ہو گئی ہے۔ کوئی لمحہ اور کوئی پل ایسا نہیں گزرتا کہ جس میں فکر و غم کی آنچ میرے دل کو جھلساتی نہ ہو۔ اماں جان بھی خدا جانے کیوں مجھ سے ناراض ہیں۔ اس گھر کا ذرہ ذرہ مجھ سے دشمنی پر آمادہ ہے۔"

یہ کہہ کر نسیمہ شوہر کے قدموں پر منہ رکھ کر سسکیاں بھرنے لگی۔ اور کسی حال بھی قدموں سے سر اٹھاتی ہی نہ تھی۔ اسلم لاکھ نسیمہ سے متنفر سہی لیکن اس کے پہلو میں بھی دل اور دل میں درد و احساس تھا۔ اس کا دل نسیمہ کی بےبسی پر پگھلا اور اس نے اتنا تو کیا کہ بےحال نسیمہ کو اٹھا کر چارپائی پر لٹا دیا اور اس سے دو چار تسکین و محبت کی باتیں بھی کیں۔ نسیمہ نے جب شوہر کا یہ شفقت پایا تو اس کے گلابی ہونٹوں پر ایک قسم کا فتح مندانہ تبسم رقص کر رہا تھا۔ پریم کا سچا پجاری اسلم پریم کی دیوی نسیمہ کے آگے سر نیاز و عبودیت جھکائے ہوئے اپنی لغزشوں اور زیادتیوں پر اس طرح پشیمان اور نادم تھا کہ اس کی آنکھیں زمین پر گڑی تھیں۔ دفعتہً اس کی پُرنم آنکھیں اٹھیں اور نسیمہ کی سرگیں آنکھوں سے ٹکرائیں۔ آنکھوں ہی آنکھوں میں خدا جانے محبت کی اک طویل داستان کس طرح دونوں کے دلوں میں اتر گئی۔

ادھر نجبین نے نسیمہ کا سارا حال خاتون سے جا سنایا۔ خاتون گو نسیمہ کی ماں نہ تھی لیکن ماں کا دل ضرور رکھتی تھی۔ اس کی بھی بیٹیاں تھیں۔ وہ بھی ساس، نند اور شوہر کی بیجا زیادتیوں سے

خوب واقف تھی۔ ایک روز موقع پاکر وہ اپنی سمدھن کے گھر گئی نسیمہ سے ملی اور نگی تنہائی میں کرید کرید کر پوچھنے کہ تمہاری ساس بڑی چنچل اور تیز ہیں۔ ناک پر مکھی تک بیٹھنے نہیں دیتیں۔ کہو تمہارے ساتھ ان کا کیا سلوک رہتا ہے اور وہ موئی زادہ تمہاری نند جس کی زبان دو گز کی ہے، بڑی دماغ والی ہے۔ کبھی سیدھے منہ بات نہیں کرتی۔ گالی اور کوسنے دینے میں تو محلہ بھر میں مشہور رہتی ہے۔ اس کی اسی بدزبانی کی بدولت اسے آج تک بر نہ جڑ سکا۔ بات یہ ہے کہ وہ بڑے اللہ آمین کی پلی ہے۔ بچپن سے یہ میں دیکھتی آئی ہوں کہ وہ کنجڑنوں اور دھوبنوں کی لڑکیوں کے ساتھ کھیلتی تھی اور کبھی اس کی ماں نے ٹوکا اور کس کی شامت آئی تھی کہ اسے ٹوکتا۔ ایک کے بدلے ہزار سنا کر بھی بس نہ کرتی۔ ناچار ملنے والے خاموش ہو رہتے۔ نتیجہ یہ ہوا کہ وہ جو حیا کا پانی آنکھوں میں ہوتا ہے ڈھل گیا۔ اس کا ڈھلنا تھا کہ اس میں طرح طرح کے عیب نکلنے شروع ہوگئے۔ یہاں تک کہ اب اس کو سوائے گالیوں کے کچھ نہیں آتا۔ مگر ہاں اتنا تو کہوں گی کہ تمہارا شوہر بڑا نیک منش اور سمجھدار لڑکا ہے۔ اللہ اس کو پروان چڑھائے اور تمہارا سہاگ باقی رکھے۔ وہ بے شک تمہارا خیال کرے گا۔ تمہیں نند اور ساس کی وجہ سے کسی قسم کی اذیت نہ پہنچے گی۔ تمہیں بھی چاہئے کہ اس کی نگاہیں پہچان کر کام کرتی رہو اور ہر وقت اس کی فرمانبرداری کے لئے تیار۔ تمہاری دنیا اور دین سب اسی کے دم سے ہے۔ اس کو تم نے اپنا بنا لیا گویا تم نے دین و دنیا کو اپنا بنایا۔ اس موقع پر لڑکیوں کا سلیقہ اور فراست دیکھی جاتی ہے۔ جو لڑکیاں اس مشکل کو آسان کر لیتی ہیں اور شوہر کا دل جیت لیتی ہیں ان کے لئے دنیا ہی جنت بن جاتی ہے۔

نسیمہ خاتون کی اس حکیمانہ گفتگو کو بغور سنتی رہی۔ اس کے چہرے پر مسرت و شادمانی کے آثار ہویدا تھے۔ اس نے خاتون کے سوالات کا جواب اپنے معنی خیز سکوت مجسم سے دیا۔ خاتون مطمئن ہو کر اپنے گھر چلی گئی۔ دوسری رات کو جب اسلم نسیمہ سے ملا تو دونوں نے خوب دل کھول کر باتیں کیں دیر تک گلے شکوے ہوتے رہے۔ اسلم نے بہت جلد نسیمہ کی ذہنی قابلیت۔ خداداد فراست اور عمدہ سیرت و کردار کا اندازہ لگا لیا۔ اور اب وہ اپنی قسمت پر نازاں تھا کہ نسیمہ جیسی اعلیٰ صفات کی خاتون اس کی شریک حیات بنی ہے۔

نسیمہ نے اس امر پر اظہار افسوس کیا کہ اماں جان اس سے ناراض رہتی ہیں اور یہ مجھ سے نہیں ہو سکتا کہ عرصہ تک انہیں ناراض رکھوں۔ مجھے اس وقت تک سکون نصیب نہیں ہو سکتا جب تک کہ میں ان کی محبت نہ حاصل کر لوں گی۔

سلیم پور کی آبادی کا بچہ بچہ یہ جانتا تھا کہ اسلم اور نسیمہ کی زندگی محبت و عشق کے ان مدارج پر پہنچ گئی ہے جہاں کیوپڈ کے محبت کے سارے تیر ناکارہ ہو کر رہ جاتے ہیں اور وہ اپنی شکست تسلیم کرنے کے لئے آرزومند نظر آتا ہے۔ نسیمہ اسلم کی محبت میں جذب ہو گئی تھی اور اسلم نسیمہ میں اور کوئی قوت ایک دوسرے کو جدا کرنے میں کامیاب نہ ہو سکتی تھی۔

فضل الرحمٰن

جنگ انسانی زندگی کے لئے ضروری ہے

ایک مباحثہ

صدر۔ خواتین وحضرات! آج ایوان کے سامنے ایک نہایت اہم موضوعِ بحث پیش کیا جارہا ہے۔ اس کا عنوان ہے "جنگ انسانی زندگی کے لئے ضروری ہے۔"

اس خوفناک زمانہ میں جب کہ انسان گاجر مولی کی طرح کٹ رہے ہیں ـــــ انسانی خون سے ہولی کھیلی جارہی ہے اور ـــــ جنگ کے شعلے ہندوستان کی طرف بڑھ رہے ہیں ـــــ یہ معلوم کرنا دلچسپی سے خالی نہ ہوگا کہ آیا جنگ انسانی زندگی کے لئے ضروری ہے یا نہیں۔

مجھے امید ہے کہ ایوان کے قابل اراکین موضوع کے موافق اور مخالف مقررین کی تقریریں توجہ کے ساتھ سنیں گے کیونکہ اس مسئلہ کے صحیح حل پر ہماری زندگی کے ایک نہایت اہم مسئلہ کا انحصار ہے۔

اب میں قابل محرک جناب ظفر علی خاں صاحب سے درخواست کروں گا کہ موضوعِ بحث کو ایوان کے سامنے پیش کریں جنابِ ظفر علی خاں صاحب!

ظفر علی خاں:۔ جناب صدر! آج کا موضوعِ بحث یعنی "جنگ انسانی زندگی کے لئے ضروری ہے" نہایت دلچسپ ہے۔ یہ ایک کھلی حقیقت ہے کہ جنگ اور زندگی ایک دوسرے کے لئے لازم اور ملزوم ہیں۔ اگر عناصر میں جنگ نہ ہوتی تو نہ دنیا وجود میں آتی اور نہ زندگی نظر آتی ـــــ نہ قابل مخالف زندہ ہوتے نہ میں ہوتا اور نہ جناب صدر ہوتے!

ایوان کی جانب سے آوازیں:۔ "یہ تو فلسفی معلوم ہوتا ہے ـــــ فلسفی!"

جناب صدر کے توسط سے میں ایوان کو یقین دلانا چاہتا ہوں کہ میں قطعاً فلسفی نہیں ہوں ـــــ ابھی میری دماغی حالت بالکل درست ہے (ایوان:۔ ہنسی)

ایک رکن:۔ جناب صدر! میں قابل محرک سے دریافت کرنا چاہتا ہوں کہ کیا فلسفیوں کی دماغی حالت درست نہیں ہوتی ـــــ میں بھی تو آخر فلسفہ کا طالب علم ہوں۔

ظفر علی خاں:۔ جی ہاں! اسی لئے تو آپ اس قسم کا بے معنی اعتراض کر رہے ہیں!! (قہقہے)

ایوان کی جانب سے آوازیں:۔ "واہ خوب بنایا! خوب بنایا!"

جنابِ صدر۔ آرڈر! آرڈر! آرڈر۔ چونکہ وقت کم ہے میں ایوان سے درخواست کروں گا کہ جہاں تک ہوسکے اس قسم کے غیر ضروری سوالات نہ کئے جائیں ـــــ قابل محرک تقریر جاری رکھیں۔

ظفر علی خاں:۔ جناب صدر! جب ہم انسان کی ابتدائی زندگی پر نظر ڈالتے ہیں تو معلوم ہوتا ہے کہ اس زمانہ میں جب کہ رہنے کے لئے بیابان زمین تھی، کھانے کے لئے گھاس پات اور میوے تھے، جسم چھپانے کے لئے جھاڑیوں کے پتے تھے ـــــ اس وقت تک

لڑائی ہوتی تھی۔

زمانہ ترقی کرتا ہے۔ یہی وحشی باشندے ایک دوسرے سے مل جل کر خاندانوں میں بستے ہیں۔ قبیلے بنتے ہیں۔ لوگ مل جل کے اپنے سرداروں کے تحت زندگی گزارتے ہیں۔ کھانے پینے، رہنے سہنے، ملنے جلنے کے طریقوں میں بڑی بڑی تبدیلیاں ہوتی رہیں۔ —— لیکن پھر بھی انسانی زندگی کے اس درمیانی زمانہ کی تاریخ لڑائیوں سے بھری ہوئی ہے۔

زمانہ کچھ اور کروٹیں بدلتا ہے۔ دنیا کے کونے کونے میں علم کی روشنی پھیلتی ہے۔ تہذیب اور تمدن، رواداری اور محبت کا چرچا ہوتا ہے۔ سائنس کی حیرت انگیز ترقی کی وجہ سے وقت کی مشکل دور ہوجاتی ہے، دوری کا خیال ختم ہوجاتا ہے، زمانہ کا تصور بدل جاتا ہے۔ بین قومی خیالات تمام دنیا میں پھیل جاتے ہیں۔ امن کی کمیٹیاں بنائی جاتی ہیں۔ صلح کی انجمنیں قائم ہوتی ہیں۔ اور لوگوں کو بڑے بڑے انعام دیئے جاتے ہیں —— لیکن دنیا نے دیکھ لیا کہ جنگ عظیم کے بعد بیس سال بھی گزرنے نہ پائے کہ تاریخ کی شاید سب سے بڑی جنگ پہلی ستمبر ۱۹۳۹ء سے شروع ہوگئی۔ ۱۹۱۴ء کی جنگ عظیم کے وقت یہ کہا گیا کہ یہ جنگ صرف امن کی خاطر لڑی جارہی ہے۔ اس کا مقصد دنیا سے ہمیشہ کے لئے جنگ ختم کردینا ہے۔ لیکن دنیا جانتی ہے کہ گزرے ہوئے بیس سال میں سے ایک سال بھی ایسا نہیں گزرا جب کہ دنیا کے کسی نہ کسی حصہ میں لڑائی نہ ہوئی ہو —— ایک مہینہ بھی ایسا نہیں گزرا جب کہ سائنس دانوں نے تباہی اور بربادی کے لئے نئی نئی چیزیں بنانے کی فکر نہ کی ہو اور ایک ہفتہ بھی ایسا نہیں گزرا جب کہ دنیا کے بڑے بڑے مدبروں نے جنگ کے منصوبے نہ سوچے ہوں!

ایوان کی جانب سے آوازیں:۔ "شیم، شیم، شیم، شیم"

اس سے صاف ظاہر ہوتا ہے کہ مارپیٹ، لڑائی بھڑائی اور جنگ انسان کی فطرت میں داخل ہے اور انسانی زندگی کا ایک جزو ہے، خواہ وہ انسان ابتدائی زمانہ کا ہو، درمیانی زمانہ کا ہو یا موجودہ زمانہ کا —— پس معلوم ہوا کہ جنگ دنیا کی ابتدا سے اب تک ایک فطری چیز رہی ہے اور اگر اس فطری چیز کو، زندگی کے اس ضروری حصہ کو قابل مخالفین اور ان کے ساتھی اپنی غفلت اور بے علمی کی وجہ سے انسانی زندگی سے خارج کردینا چاہتے ہیں تو کوئی وجہ نہیں کہ آج انھیں انسانیت کے دائرہ سے خارج نہ سمجھا جائے! (ہیر ہیر کی آوازیں) اور ان سے صاف صاف کہہ دیا جائے کہ ان کا صحیح مقام اس علمی مجلس میں نہیں بلکہ کسی اندھیرے غار میں —— کسی ڈراؤنے جنگل میں یا پھر —— دماغی امراض کے کسی دواخانے میں ہے (ہیر ہیر کی آوازیں)

موجودہ زمانہ میں ہم زندگی کے بہت سے مسائل تجارتی، صنعتی اور معاشی نقطۂ نظر سے دیکھنے کے عادی ہوچکے ہیں۔ جنگ کا سوال بھی اس حیثیت سے بڑی اہمیت رکھتا ہے۔ انیسویں صدی کے آخر میں دنیا کے تقریباً تمام آزاد اور ترقی یافتہ ملکوں میں صنعتی ترقی کی ایک لہر دوڑ جاتی ہے۔ آدمیوں کی بجائے مشینیں استعمال کی جاتی ہیں اور مشینیں نہایت کم وقت اور کم صرفہ میں طرح طرح کی مصنوعات زیادہ سے زیادہ تعداد اور جلد سے جلد تیار کرتی ہیں۔ معاشیات کی زبان میں چیزوں کی پیداوار میں اس تبدیلی کو صنعتی انقلاب کے نام سے یاد کیا جاتا ہے۔ بیسویں صدی کے ابتدائی زمانہ میں یہ انقلاب بہت ترقی کرجاتا ہے۔ تمام صنعتی ملک اپنے کارخانوں کے مال سے پٹ جاتے ہیں۔ جب مال ملکی ضروریات سے زیادہ جمع ہوجاتا ہے تو سرمایہ داروں، کارخانے والوں اور حکومتوں کو ان کی

کھپت کی فکر ہوتی ہے۔ یہ نئی منڈیوں کی تلاش میں نکلتے ہیں۔ تجارت، صنعت و حرفت کی خاطر دوسرے کمزور ملکوں کی طرف بڑھتے ہیں۔ اب ان میں سے ہر ملک دوسرے ملک سے بازی لیجانے کی فکر کرتا ہے۔ آپس میں اختلافات پیدا ہوجاتے ہیں۔ رشک، حسد، نفرت اور حقارت کے جذبات پرورش پاتے ہیں اور یہ ایک دوسرے کے سخت دشمن ہوجاتے ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ صنعتی انقلاب سے آج تک انہی تجارتی کشمکش اور معاشی مقابلہ کی وجہ سے ان میں زیادہ خون ریز لڑائیاں ہوتی رہیں۔ موجودہ زمانہ میں یہ تو ناممکن ہے کہ یہ ملک اپنی مشینیں نکال پھینک دیں، کارخانے بند کردیں اور گرنیاں توڑ ڈالیں ———— یہ سب موجودہ تہذیب کی نہ مٹنے والی نشانیاں ہیں۔ اگر یہ نہ ہوں اور موجودہ تجارتی، صنعتی اور معاشی کشمکش نہ ہو تو زندگی کی تمام آسانیاں اور راحتیں ختم ہوجاتی ہیں اور شاید انسانیت ———— اس ابتدائی زمانہ کی طرف لوٹ جائے جس میں قابل مخالف اور ان کے ساتھی وحشیوں کی طرح جنگلوں میں مارے مارے پھریں!!! (ہیر ہیر ہیر کی آوازیں)

ان حالات کے تحت میں ایوان کے اراکین سے درخواست کروں گا کہ موضوع کی مخالفت نہ کریں اور قابل مقررین سے پر زور اپیل کروں گا کہ موضوع کی تائید میں ایڑی چوٹی کا زور لگادیں (چیرز)

جناب صدر:- اب مسٹر خلیفہ عبدالمجید موضوع کی مخالفت کریں گے ———— جناب خلیفہ عبدالمجید صاحب!

خلیفہ عبدالمجید:- جناب صدر! اگر آپ مجھے اجازت دیں تو پہلے ایک چھوٹا سا قصہ بیان کروں۔

ایوان کی جانب سے آوازیں:- "کہیئے کہیئے ———— سوائے قصوں اور گپ ہانکنے کے آپ کو آتا ہی کیا ہے!"

خلیفہ عبدالمجید:- کہتے ہیں کہ ایک مرتبہ لیلیٰ نے ————

ایوان:- "اوہو! یہ تو لیلیٰ مجنوں کا قصہ ہے!"

خلیفہ عبدالمجید:- جی ہاں! لیلیٰ نے مجنوں سے خواہش کی تھی کہ اگر تمھیں مجھ سے محبت ہے تو تم میرے کتے سے بھی محبت کرو (ہنسی) جی ہاں! ٹھیک اسی طرح ہمارے قابل محرک کی یہ تمنا اور خواہش ہے کہ نہ صرف وہ خود موضوع کی تائید کریں بلکہ ایوان کے اراکین اور دوسرے مقررین بھی ان کی تائید کریں (ہنسی) ———— ہم تو صاحب اس قسم کی محبت سے کوسوں بھاگتے ہیں (قہقہے اور گڑبڑ)

جناب صدر:- آڈر۔ آڈر۔ آڈر

خلیفہ عبدالمجید:- جناب صدر! انسان کی فطرت کا اگر مطالعہ کیا جائے تو معلوم ہوگا کہ اس کی فطرت سے جنگ اتنی ہی دور ہے جیسا کہ عقل قابل محرک سے (شیم شیم شیم) اس کی رگ رگ میں جنگ سے نفرت اور امن سے محبت کوٹ کوٹ کر بھری ہوئی ہے۔ اگر اس کی فطرت میں خون ریزی اور لڑائی ہوتی تو قدیم زمانہ کے انسان ایک دوسرے سے لڑ مر کر ختم ہوجاتے۔ اس طرح نسل انسانی ہی ختم ہوجاتی۔ مگر وہ تو امن سے رہنے کی کوشش کرتے تھے۔ اپنے خاندان، قبیلہ اور ملک کے امن کی خاطر جانوں کی قربانی سے بھی پیچھے نہ ہٹتے تھے۔

انسان کی فطرت میں امن و اماں کو جتنا دخل ہے کسی اور جذبہ کو نہیں۔ اس کا اندازہ قابل مخالف کی زبانی جمع خرچ سے نہیں بلکہ ان لوگوں کے احساسات کی چھان بین سے ہوسکتا ہے جو خود جنگ میں حصہ لیتے ہیں۔ بڑے بڑے بہادر سورما بھی لڑائی کو پسند نہیں کرتے۔ لیکن وہ بے بس اور مجبور ہیں۔ جب کسی کے حکم سے وہ میدان جنگ کی طرف بڑھتے ہیں تو ان کے دلوں میں جنگ سے

زیادہ بیوی بچوں کا خیال رہتا ہے۔ میدان جنگ [illegible] ایسا شخص ہے جس کی یہ خواہش نہ ہو کہ لڑائی جلد سے جلد ختم ہو جائے تاکہ وہ گھر لوٹے اور امن سے زندگی بسر کرے۔ اس کی یہ [illegible] لڑائی کے خوف اور دہشت یا بزدلی کی وجہ سے پیدا نہیں ہوتی بلکہ اس لئے کہ امن کی خواہش ایک فطری خواہش ہے اور انسان پیدائشی طور پر امن پسند واقع ہوا ہے۔

قابل محرک کا یہ خیال کہ زندگی کی ابتداء سے اب تک لڑائیاں ہوتی رہی ہیں اس لئے آئندہ بھی ان کا جاری رہنا ضروری ہے —— ایک ایسا خیال ہے اور ایک ایسی حجت ہے جو مدرسہ کے چھوٹے اور کم سمجھ بچوں کے لئے تو معقول ہے لیکن کالج کے ایک طالب علم کے لئے ہرگز نہیں (شیم شیم) زندگی نام ہے ایک تبدیلی کا۔ ہر مہینہ، ہر دن، بلکہ ہر منٹ دنیا میں تبدیلیاں ہو رہی ہیں۔ پرانے نقشے بگڑ رہے ہیں، نئے نئے خیالات پیدا ہو رہے ہیں اور نئی نئی باتیں معلوم ہو رہی ہیں۔ اس لئے آنے والا زمانہ بھی گزرے ہوئے اور موجودہ زمانہ سے بالکل مختلف ہوگا۔ یہ قطعاً ضروری نہیں کہ آنے والے زمانے میں بھی لڑائیاں ہوتی رہیں۔ محض اس وجہ سے کہ گزرے ہوئے زمانہ میں ہوتی رہی ہیں۔

اب رہا یہ سوال کہ یورپ کے صنعتی انقلاب کی وجہ سے قوموں اور ملکوں میں جنگ ناگزیر ہوگئی ہے —— ایک پرانا اور مہمل خیال ہے جسے اس بیسویں صدی میں لوگ پیش کرنے سے بھی ہچکچاتے ہیں۔ حقیقت یہ ہے کہ انیسویں صدی سے پہلے ہی زمین اور دولت کی خاطر لڑائیاں چلی آ رہی ہیں۔ اگر دولت اور زمین لوگوں اور قوموں میں مساوی تقسیم ہو جائیں تو یہ سب جھگڑے ہی ختم ہو جائیں۔ کیونکہ جنگ کی وجہ سے اتنے بڑے نقصانات ہوتے ہیں کہ تجارت یا صنعت کی مدد سے بھی پورے نہیں ہو سکتے۔ چنانچہ جنگ عظیم میں جو تجارتی، صنعتی، معاشی اور جانی نقصانات ہوئے وہ اب تک پورے نہ ہو سکے۔

علاوہ جانی اور مالی نقصانات کے جنگ کی وجہ سے کامیاب اور ناکام دونوں قوموں کی اخلاقی اور ذہنی حالت خراب ہو جاتی ہے۔ ناکام قوموں اور ملکوں کا تو حال ہی نہ پوچھئے۔ نہ صرف آزادی کھو دیتے ہیں، ہر چیز کے لئے دوسروں کے محتاج ہو جاتے ہیں بلکہ احساس پستی کی وجہ سے طرح طرح کی برائیوں کے شکار ہو جاتے ہیں انھیں قسم قسم کے ذہنی روگ لگ جاتے ہیں۔ کامیاب قومیں اور ملک جنگ کے بعد خود غرض ہو جاتے ہیں۔ فتح کے نشہ میں مست ہو جاتے ہیں۔ عیش اور عشرت کی طرف بڑھتے ہیں اور تباہی کے غار میں گر پڑتے ہیں۔

برخلاف جنگ کے امن کے زمانہ میں انسان اپنی اخلاقی، جسمانی اور دماغی قوتوں کو کام میں لاتے ہیں اور زندگی کو بہتر بناتے ہیں۔ عجیب و غریب ایجادات، دنیا کے بڑے بڑے کام اور زندگی کی راحت کے تمام سامان —— یہ سب امن کے زمانہ کی پیداوار ہیں۔ جنگ تو صدیوں کے امن کے اچھے کاموں کو تباہ اور برباد کر دیتی ہے

اب میں قابل محرک اور ان کے ساتھیوں سے دریافت کرنا چاہتا ہوں کہ جنگ جو گنجان آبادیوں اور لہلہاتی کھیتیوں کو کھنڈروں میں تبدیل کر دیتی ہے، جو بے گناہ بچوں، عورتوں اور بوڑھوں کو بے رحمی سے موت کے گھاٹ اتارتی ہے —— چین اور خوشی کی دنیا کو دوزخ بنا دیتی ہے اور جو —— فاتح اور مفتوح قوموں اور ملکوں کے لئے جسمانی اور

مالی نقصانات کے لحاظ سے بدترین لعنت ہے ـــــ کیا ایسی خونخوار چیز انسانیت کے لئے ضروری ہے؟

ایوان کی جانب سے آوازیں:- "ہرگز نہیں، ہرگز نہیں، ہرگز نہیں"

تو پھر یہ ثابت ہو چکا کہ جنگ انسانی زندگی کے لئے ضروری نہیں (چیرز)

جنابِ صدر:- موضوع کی موافقت اور مخالفت میں تقریریں ختم ہو چکی ہیں۔ اب مسٹر سکندر حیات موضوع کی تائید کریں گے ـــــ

جناب سکندر حیات صاحب!

سکندر حیات:- جنابِ صدر! قابلِ مخالف کو معلوم ہونا چاہیے کہ یہ ایک علمی جلسہ ہے اور یہاں الف لیلیٰ کی داستان، چہار درویش، طلسم ہوشربا یا لیلیٰ مجنوں کے قصوں سے کام نہیں چل سکتا (ہیر ہیر) پھر لطف یہ کہ دوسروں کو لیلیٰ بنا کر خود مجنوں بن بیٹھے (شیم شیم) قابل مخالف ـــــ مجنون ۱۹۴۱ء کی طرح موضوع کی مخالفت میں ایسی بے تکی باتیں بیان کر رہے تھے کہ ڈر ہو رہا تھا کہیں وہ کسی پہاڑ سے ٹکرا کر دم نہ دیدیں۔

حلیفہ عبدالمجید:- پائنٹ آف آرڈر سر! قابلِ مقرر کا طرزِ بیان نہایت قابلِ اعتراض ہے۔

سکندر حیات:- جنابِ صدر! نہایت افسوس کی بات ہے کہ قابل معترض اس چیز کو اب قابلِ اعتراض سمجھ رہے ہیں جس کا ذکر انھوں نے آتے ہی اپنی تقریر کے ابتدائی حصہ میں کیا تھا۔ یہ تو ٹھیک ان لوگوں کا حال ہے جو شیشہ کے محل میں بیٹھ کر دوسروں پر پتھر پھینکتے ہیں اور خیال کرتے ہیں کہ خود محفوظ ہیں۔ مجھے ایسے لوگوں کی نادانی اور کم سمجھی پر ترس آتا ہے۔

اصل سوال یہ نہیں کہ جنگ اچھی ہے یا بُری بلکہ یہ کہ جنگ انسانی زندگی کے لئے ضروری ہے یا نہیں۔ ایک زمانہ کہ لڑائیاں اگر ختم ہو جائیں تو دنیا بجائے آگے بڑھنے کے پیچھے ہٹے گی۔ چاروں طرف امن اور اماں کا دور دورہ ہوگا۔ ہر طرف عیش و عشرت کے سامان ہوں گے۔ لوگ کم ہمت، بزدل اور آرام پسند ہو جائیں گے۔ غور و فکر کا مادہ ختم ہو جائے گا۔ نئی نئی باتوں اور چیزوں کی دریافت کا زمانہ گزر جائے گا۔ جسمانی اور دماغی قوتیں مسلسل آرام اور راحت کی وجہ سے بیکار ہو جائیں گی ـــــ یہاں تک کہ انسان موم کی بنی ہوئی جاپانی گڑیا کی طرح نرم، نازک اور کمزور ہو جائے گا۔ یہ امن و اماں، یہ عیش و عشرت تو انسانی زندگی کے لئے موت ہے۔ زندگی کی شرط ہی اور ہے۔ چنانچہ اقبال فرماتے ہیں۔

موت ہے عیشِ جاوداں ذوقِ طلب اگر نہ ہو
گردشِ آدمی ہے اور گردشِ جام اور ہے

شمعِ سحر یہ کہہ گئی سوز ہے زندگی کا ساز
غم کدۂ نمود میں شرطِ دوام اور ہے

ایک دوسری جگہ فرماتے ہیں:-

کوہ شگاف تیری ضرب، تجھ سے کشادِ شرق و غرب
تیغِ ہلال کی طرح عیشِ نیام سے گزر

امن کی بجائے اگر جنگ انسان زندگی میں داخل ہو جائے تو یہ تمام کمزوریاں اور برائیاں ختم ہو جائیں۔ انسان اپنی حفاظت کی خاطر اپنی تمام قوتوں سے کام لیتا ہے۔ نہ صرف اپنی مدد آپ کرتا ہے بلکہ دوسروں کو بھی فائدہ پہنچاتا ہے۔

محض جنگ کی وجہ سے لوگوں کی چھپی ہوئی صلاحیتیں اور خوبیاں ظاہر ہو جاتی ہیں۔ حکومتیں اپنے بچاؤ کے لئے جنگی تعلیم اور تربیت لازمی کر دیتی ہیں۔ لوگ بہادر، طاقتور اور مستقل مزاج ہو جاتے ہیں۔ ان میں تمام مردانہ خوبیاں پیدا ہو جاتی ہیں۔ زندگی کے دوسرے شعبے بھی جنگ کی وجہ سے بڑی ترقی کرتے ہیں۔ سپاہیوں کو کھلانے کے لئے زندگی پیدا وار میں بے حد اضافہ کرنا پڑتا ہے۔ انھیں جنگی ضرورتوں سے لیس کرنے کے لئے نہ صرف مصنوعات میں اضافہ ہوتا ہے بلکہ نئی نئی صنعتوں کی ابتدا ہوتی ہے ــــــ آپ کو یہ معلوم کر کے حیرت ہوگی کہ جہاں ہندوستانی مصنوعات کی گنتی انگلیوں پر ہو سکتی تھی وہاں موجودہ جنگ کی وجہ سے یہ مقدار بیس ہزار تک پہنچ چکی ہے۔ مشرقی گروپ کانفرنس اور حکومت برطانیہ کے فراہمی امداد کے روجر کمیشن کی کوششوں کی بدولت یہ تعداد چالیس ہزار تک پہنچ جائے گی۔

اس میں کوئی شک نہیں کہ جنگ کی وجہ سے بہت سا جانی نقصان ہوتا ہے۔ لیکن جہاں وبائی بیماریوں، زلزلوں، طوفانوں اور سیلابوں سے نقصان ہوتا ہے وہاں لڑائیوں سے بھی جانی نقصان ہو سکتا ہے۔ لیکن یہ تو ایک کھلی حقیقت ہے کہ تاریخ کی سیکڑوں بلکہ ہزاروں لڑائیوں کے باوجود انسان ابتدا سے اب تک برابر ترقی کرتا چلا آ رہا ہے ــــــ اس کی کیا وجہ ہے؟

اس کی وجہ محض یہی ہے کہ جنگ انسانی زندگی کے لئے ضروری ہے (چیرز)

اسی لئے شاعر جو انسانی زندگی کے اس اٹل راز سے واقف ہے کہہ اٹھتا ہے ــــــ

میں تجھ کو بتاتا ہوں، تقدیر امم کیا ہے   شمشیر و سناں اول طاؤس و رباب آخر (چیرز)

جناب صدر:۔ اب بہادر علی صاحب موضوع کی مخالفت کریں گے ــــــ جناب بہادر علی صاحب!

ایوان کی جانب سے آوازیں:۔ "ارے یہ تو کوئی نیا بلبل معلوم ہوتا ہے۔ دیکھو! کیا گھبرا رہا ہے۔ ذرا اسے دیکھ لینا۔"

بہادر علی:۔ جناب صدر! چونکہ وقت کافی ہو چکا ہے اس لئے میں زیادہ وقت نہیں لوں گا ــــــ

ایوان کی جانب سے آوازیں:۔ "بیٹھ جائیے بیٹھ جائیے! بہت بہت شکریہ"

بہادر علی:۔ لیکن میں آج ضرور تقریر کروں گا۔ جناب صدر! میں یہ کہنا چاہتا تھا ــــــ میں یہ کہنا چاہتا تھا ــــــ اوہو! مجھے اس وقت پیاس بہت لگ رہی ہے (ہنسی)

ایک رکن:۔ پائنٹ آف آرڈر سر کیا میں قابل مقرر سے دریافت کر سکتا ہوں کہ وہ صرف پانی پینے کے لئے ڈیس پر تشریف لائے ہیں؟ (ہنسی)

بہادر علی:۔ جی ہاں! جی نہیں! (ہنسی)

ایک دوسرا رکن:۔ جناب صدر! کیا میں قابل مقرر سے دریافت کر سکتا ہوں کہ آیا "جی ہاں" صحیح ہے یا "جی نہیں"؟ (ہنسی)

بہادر علی:۔ دونوں صحیح نہیں! نہیں نہیں دونوں غلط ہیں! ہاں! تو جناب صدر! میں یہ کہنا چاہتا تھا ــــــ میں یہ کہنا چاہتا تھا ــــــ جی نہیں، میں یہ نہیں کہنا چاہتا تھا

ایک رکن:۔ جناب صدر! قابل مقرر کا دماغی توازن اس وقت بگڑا ہوا معلوم ہوتا ہے۔ اس لئے کیوں نہ انھیں پانی پلا کر لوٹا دیا جائے؟

(قہقہے اور گڑبڑ)۔

جناب صدر:۔ آڈر۔ آڈر۔ آڈر۔ قابل مقرر جہاں تک ہو سکے اپنی تقریر جلد ختم کریں۔

بہادر علی:۔ ہاں میں ابھی تقریر ختم کروں گا۔ لیکن افسوس میرا کاغذ کھو گیا۔ اوہو! کاغذ' پانی ——— پانی' کاغذ! (ایوان ہنسی اور آوازیں)

خیر! کاغذ گیا تو کوئی فکر کی بات نہیں۔ میں تقریر کروں گا۔ میں برابر تقریر کروں گا (ایوان:۔ شور اور پکار)

تم سب مجھے ڈرانے اور پریشان کرنے کی فکر کر رہے ہو۔ میں ہرگز نہیں ڈروں گا! ——— میں بہادر ہوں ——— میرا نام بہادر علی ہے ——— ٹھیرو میں ابھی بولوں گا (ایوان: گڑبڑ، ہنسی اور آوازیں)

جناب صدر:۔ آڈر۔ آڈر ——— چونکہ کافی وقت ہو چکا ہے اور موضوع بحث پر بھی روشنی پڑھ چکی ہے میں ایوان سے درخواست کروں گا کہ اپنی رائے کے ذریعہ اس اہم مسئلہ کا تصفیہ کریں کہ آیا جنگ انسانی زندگی کے لئے ضروری ہے یا نہیں۔

وہ اراکین جو موضوع کے موافق ہیں براہ کرم اپنے ہاتھ اٹھائیں (۱' ۲' ۳' ۵' ۷' ۱۰' ۱۲ ...... آرا گننے کی آواز) دیکھیے بعض حضرات اپنے دونوں ہاتھ اٹھا رہے ہیں ———

اب وہ اراکین جو موضوع کے خلاف ہیں اپنے ہاتھ اٹھائیں ۔ دیکھیے اس کونہ میں بعض اراکین ووٹ حاصل کرنے کے لئے زور اور جبر سے کام لے رہے ہیں (۱' ۲' ۳' ۴' ۶' ۸' ۹ ...... آرا گننے کی آواز) شکریہ

نہایت خوشی کے ساتھ میں اس امر کا اعلان کرتا ہوں کہ ایوان نے بغلبۂ آرا یہ طے کیا ہے کہ جنگ انسانی زندگی کے لئے ضروری ہے (چیرز)

اب جلسہ برخاست کیا جاتا ہے۔

محمد بن عمر

فن تقریر:۔ عہد حاضر میں تقریر کو بہت اہمیت حاصل ہوتی جا رہی ہے اور ترقی یافتہ زبانوں میں فن تقریر و خطابت سے متعلق کئی کتابیں لکھی گئی ہیں لیکن اردو میں اس موضوع پر کوئی کتاب موجود نہ تھی اس میں جگہ جگہ تصویریں بھی شامل ہیں جن کی مدد سے تقریر کرتے وقت ٹھیک طور پر کھڑے ہونے اور حرکات و سکنات کے سلسلے میں مفید معلومات حاصل ہوتی ہیں صفحات (۹۶) قیمت صرف ۸ر۔

خطابات:۔ فن تقریر پر شیخ حیم الدین صاحب کمال ظہیرآبادی نے یہ کتاب سلیس اور عام فہم انداز میں لکھی ہے۔ تقریباً تمام اصناف پر بحث کی گئی ہے۔ صفحات (۱۱۲) قیمت ۱۲ر

معین الدّولہ

محمد معین الدین خاں نام اور اعانت جنگ، معین الدولہ خطابات رہیں۔ آپ امیر کبیر عمدۃ الملک سر آسمانجاہ بہادر کے اکلوتے فرزند تھے۔ ۷ ذی قعدہ ۱۳۰۵ھ کو سرورنگر حیدرآباد میں پیدا ہوئے۔ کمسنی میں ہی والد بزرگوار کا سایہ سر سے اٹھ گیا۔ چنانچہ ۲۶ صفر ۱۳۱۶ھ میں نواب سر آسمانجاہ نے انتقال کیا تو اس وقت آپ کی عمر سات سال کی تھی۔ پدر نامدار کے انتقال کے بعد حضرت بادشاہزادی صاحبہ پرقدس النسا بیگم (محل بزرگ نواب سر آسمانجاہ) نے اپنی نگرانی اور سرپرستی میں آپ کی تعلیم و تربیت کا انتظام فرمایا۔ جب یکم رجب ۱۳۲۲ھ کو بمقام لالہ گوڑہ حیدرآباد بادشاہزادی پرقدس النسا بیگم نے بھی انتقال فرمایا تو اس وقت تک آپ علوم مدرسی کے منازل طے کرکے سن شعور کو پہنچ چکے تھے۔ بعد انتقال والدۂ ماجدہ آپ برسر اقتدار ہوئے اور امیر پائیگاہ کہلائے۔ لیکن کچھ عرصے کے بعد بمصالح انتظامی حسب فرمان خسروی مندرجۂ جریدۂ غیر معمولی مطبوعہ ۲۰ آبان ۱۳۲۱ف دوسری پائیگاہوں کی طرح پائیگاہ آسمانجاہی بھی ۲۳ شوال ۱۳۳۰ھ سے سربراہ ایجرٹن کی نگرانی میں دی گئی جو ۵ شعبان ۱۳۳۴ھ م ۱۵ اسفندار ۱۳۲۵ف کو واگزاشت ہوکر پورے اختیارات کے ساتھ آپ کے زیر نگرانی کردی گئی اور آپ اپنے بزرگوں کی طرح امیر پائیگاہ قرار پائے۔

نواب معین الدولہ بہادر کو سیر و سیاحت کا بہت شوق تھا چنانچہ ۲۹ ربیع الاول ۱۳۳۱ھ کو اپنے پورے اسٹاف کے ساتھ آپ نے کشمیر کا سفر کیا اور تین ماہ کے قیام کے بعد بلدۂ حیدرآباد واپس ہوئے۔ اس کے بعد ۲۳ ربیع الثانی ۱۳۳۲ھ کو صیغہ مال کی واقفیت اور تجربہ کے لیے نظام آباد بھیجے گئے جہاں سے تقریباً چھ مہینے کے بعد ۲۲ رمضان ۱۳۳۲ھ کو بلدہ حیدرآباد واپس ہوئے۔

اعلیٰ حضرت شہریارِ دکن آصف جاہ ہفتم نے بتقریب دربار سالگرہ مبارک ۱۷ رجب ۱۳۳۶ھ کو اعانت جنگ اور ۲۵ جمادی الثانی ۱۳۴۲ھ کو معین الدولہ کے خطابات سے ممتاز فرمایا۔ ابتدا میں آپ کا تقرر خدمت صدر المہامی صیغہ صنعت و حرفت سرکار عالی پر بتاریخ ۲۵ صفر ۱۳۴۲ھ بماہوار دو ہزار (۲۰۰۰ روپے) عمل میں آیا تھا۔ چنانچہ ۳۰ جمادی الثانی ۱۳۴۳ھ تک اس خدمت کو آپ نے باحسن وجوہ انجام دیا مگر جب خدمت صدر المہامی صنعت و حرفت تخفیف کردی گئی تو آپ صدر المہام فوج مقرر ہوئے۔ لیکن ماہ ذی قعدہ ۱۳۴۵ھ م ۶ تیر ۱۳۳۶ف کو اس خدمت سے آپ سبکدوش ہوگئے۔

نواب معین الدولہ بہادر نہایت ہی ذہین اور طباع، دلیر اور جفاکش، ذی فہم اور وسیع اخلاق، لایق اور مستقل مزاج، علم پرور اور بہت فیاض امیر تھے۔ اردو علم و ادب سے خاص دلچسپی تھی۔ شکار کے بہت شایق تھے، شاہسواری اور نشانہ بازی میں کامل مہارت حاصل تھی۔ شعر و سخن کا بڑا اچھا ذوق رکھتے تھے۔ آپ کا دیوان معین سخن آپ کی زندگی میں ہی شایع ہوکر مقبول خاص و عام ہوچکا تھا۔ آپ نے اپنے زمانے میں پائیگاہ جاگیرات کی بہت کچھ اصلاح فرمائی تھی۔ اردو نثر میں ایک دلچسپ اور مفید شکارنامہ بھی لکھا تھا۔

بتاریخ غرہ رمضان ۱۳۶۰ھ م ۲۳ ستمبر ۱۹۴۱ء روز سہ شنبہ باون سال کی عمر میں مرض فالج سے سرورنگر میں آپ نے انتقال فرمایا اور نعش خاندانی قبرستان موقوعہ درگاہ حضرت سید حسین برہنہ شاہؒ میں سپرد زمین کی گئی۔

سید مراد علی طالع

رابعہ دورانی

مجھے خوشی ہے کہ آج میں دکن کی ایک مشہور خاتون کا حال آپ کے گوش گزار کر رہی ہوں۔ تاریخ اور خطۂ دکن میں اس خاتون کا نام ہمیشہ عزت اور احترام کے ساتھ لیا جائے گا۔ زندگی میں بھی اس خاتون نے اپنی ذاتی خوبیوں کی وجہ سے بلند مدارج حاصل کئے اور مرنے کے بعد بھی اس کی قسمت نے اس کے نام کو انہی اعزاز و مراتب کے ساتھ زندہ رکھا۔ جب میں اورنگ آباد گئی تھی تو مجھے اس نامور خاتون کے مقبرہ کی زیارت کا موقع ملا تھا۔ جس طرح آگرہ کو "تاج محل" مرجع خلائق بناتا ہے اسی طرح یہ مقبرہ "رابعہ دورانی" اورنگ آباد کو زائرین اور سیاحوں کا مرکز بناتا ہے۔ وہاں بھی ایک شوہر کی محبت کی حسین اور سہانی یادگار قائم ہے اور یہاں بھی شوہر کی محبت اپنا نقش چھوڑ گئی ہے۔ مرنے والا مر جاتا ہے لیکن اس کی یاد دُکھے ہوئے دلوں کا سرمایہ بن جاتی ہے اور مرنے والے کی یاد جیسے حسین اور دل کش تصورات کے ساتھ باقی رہتی ہے، ویسی ہی کوئی حسین یادگار اس کی یاد کو تازہ رکھنے کے لئے قائم کی جاتی ہے۔ "تاج محل" کو دیکھ کر کون ہوگا جو شاہ جہاں اور ممتاز محل کی محبت اور وفاشعاری کے تصور میں کھو نہ جائے۔ یہاں بھی جذبۂ تقدس ایک روحانی مسرت کے ساتھ ہم آہنگ ہو کر دل میں سما جاتا ہے اور دیکھنے والے کی آنکھیں ان دلوں کی کیفیات تک پہنچ جاتی ہیں، جن کی دھڑکنیں حسن و محبت کی ایسی حسین یادگار میں تبدیل ہوگئیں۔ محبت اور موت کی کش مکش سے جو نتیجہ حاصل ہوتا ہے وہ ایک فلسفیانہ مسئلہ سے کم نہیں۔ کیا انسان کی طرح محبت بھی فانی ہے؟ کیا مرنے والے کی یاد اسی دلکشی اور آن بان کے ساتھ قائم رہ سکتی ہے جیسی کہ اس کی زندگی تھی؟ کیا مرنے والے کی یاد میں حسین و جمیل یادگاریں قائم کر نا موت کی چیرہ دستیوں پر فتح پانا ہے؟ یوں سوچیئے تو صاف ظاہر ہوگا کہ فنا کی دست برد سے کوئی محفوظ نہیں رہ سکتا۔ آج وہ شاہ جہاں بھی نہیں رہا جس نے اپنی عزیز اور چہیتی بیوی کے غم جدائی کو "تاج محل" بنا کر غیر فانی بنا دیا وہ اورنگ زیب عالم گیر بھی نہ رہا جس نے مقبرۂ دورانی کی بناء ڈالی لیکن تاج محل اور مقبرۂ دورانی جب تک صفۂ روزگار کی زینت بنے رہیں گے شاہ جہاں اور اورنگ زیب کے نام زندہ رہیں گے اور زندہ بھی ایسے رہیں گے کہ دنیا ان کے ذوقِ تعمیر کی شانِ دلنوازی کو خراج تحسین ادا کرتی رہے گی۔

مقبرۂ رابعہ دورانی کی ایک عزیز شوہر نے بناء ڈالی اور ایک چہیتے بیٹے کے ہاتھوں اس کی تکمیل ہوئی۔ اس مقبرہ میں جو ہستی ابدی نیند سو رہی ہے اس کا نام دلرس بانو بیگم ہے جو رابعہ دورانی کے لقب سے مشہور ہے۔ یہ شاہ نواز خاں صفوی صوبہ دار گجرات کی چہیتی بیٹی تھی۔ شاہ نواز خاں صفوی ایران سے ہندوستان آیا تو اورنگ زیب عالم گیر سریر آرائے سلطنت تھا۔ شاہ نواز خاں کی سپاہیانہ اور منتظمانہ صلاحیتوں کی قدر کرتے ہوئے شہنشاہ نے گجرات کی صوبیداری پر اسے مامور کیا۔ دلرس بانو بیگم کے حسن کا پہلے ہی سے بڑا شہرہ تھا۔ لیکن اورنگ زیب اس کے حسنِ صورت سے زیادہ اس کی دانائی اور سلیقہ شعاری سے متاثر تھا۔ یہ بیگم فصاحت اور بلاغت میں یکتائے زمانہ تسلیم کی جاتی تھی اور سلیقہ شعاری کا جوہر اس کی خداداد قابلیتوں کے لئے سونے پر سہاگے کا کام دیتا تھا۔ ایسا بہت کم دیکھنے میں آتا ہے کہ کسی ایک خاتون کی ذات میں قسمت اتنی ساری خوبیاں جمع کر دے۔ شہنشاہ اورنگ زیب نے

اسے اپنی بیگم بنایا اور اس کے حسن اور لیاقت نے شہنشاہ کے دل کو ایسا موہ لیا کہ محل میں دلرس بانو کا اقتدار آفتاب بن کر چمکنے لگا۔ یہ بیگم اپنے دل میں غریبوں، مسافروں اور بیکسوں کا بڑا درد رکھتی تھی۔ اس کی غربا پروریوں اور فیض رسانیوں کی ساری قلمرو میں دھوم تھی۔ اس کی داد و دہش سے ہزاروں کے دامنِ امید بھرے جاتے اور ہزاروں دلوں کی دعائیں اس کے نام سے وابستہ رہتیں۔ یہ بیگم خدا ترس تھی اور مذہب کا دل سے احترام کرتی تھی۔ فقیروں اور خدا رسیدہ لوگوں کی ہر طرح خدمت کرتی اور ان سے خاص عقیدت رکھتی۔ اس کی نظر وسیع تھی۔ اس کا مذہب انسانیت کی خدمت تھا۔ یہی وجہ ہے کہ آج اس بیگم کی قبر پر مسلمان زائروں کے علاوہ دوسرے مذاہب کی عورتیں بھی اپنی منت مرادیں مانگنے کے لئے دور دور سے آتی ہیں۔

اورنگ زیب کی تین بیویاں اور بھی تھیں۔ نواب بائی، اورنگ آبادی محل اور بائی اودے پوری۔ لیکن دلرس بانو بیگم سے اسے جو انس اور محبت تھی وہ کسی دوسرے کے حصے میں نہیں آئی۔ شہنشاہ خود اعتراف کرتے تھے کہ دلرس کی میٹھی میٹھی باتوں نے ہمارا دل موہ لیا ہے۔ لیکن دلرس بانو صرف میٹھی میٹھی باتوں کی ہی ملکہ نہ تھی، وہ یہ ہمہ صفت موصوف تھی۔ اس کا حسنِ خداداد اس کی نیک طینتی، اس کی دریا دلی، اس کی خدا ترسی اور سلیقہ شعاری نے بڑے بڑے بادشاہوں پر حکومت کرنے والے باجبروت شہنشاہ کے دل کو اپنی مٹھی میں کر لیا تھا۔ سارے محل میں اس کی آؤ بھگت ہوتی اور دوسری بیگمات بھی اس کی قدر و منزلت کرتیں۔ شہنشاہ اورنگ زیب سیاست اور حکومت کے معاملات میں بھی اس سے مشورہ کرتے اور یہ اپنی بیدار مغزی اور فراست کا ثبوت دیتی۔ اس کی طبیعت میں نرمی اور حلم بھرا تھا لیکن جب کبھی کوئی بات خلافِ طبیعت یا ناگوار ہو جاتی تو غصہ کی آگ بھڑک اٹھتی۔ شہنشاہ اورنگ زیب اس لئے بھی اس کی دلداری کرتے تھے کہ یہ سب بیگموں میں کثیر الاولاد تھی۔ اس کی مرضی اور خوشنودی سب پر مقدم ہوتی تھی۔ اس کے بطن سے پانچ اولادیں ہوئیں، دو لڑکے اور تین لڑکیاں۔ لڑکوں کا نام محمد اعظم اور محمد اکبر تھا۔ محمد اعظم ۱۲ شعبان ۱۰۶۳ھ کو پیدا ہوا اور عالمگیر کی وفات کے تین مہینے اکیس روز بعد انتقال کر گیا۔ اسی شہزادۂ اعظم نے اپنی ماں کے مقبرہ کی تعمیر کو مکمل کروایا۔ لڑکیوں میں زیب النساء بیگم، زینت النساء بیگم اور زبدۃ النساء بیگم اسی کے بطن سے تھیں۔

شاہ نواز خاں صفوی اپنی بیٹی کو اتنا چاہتا تھا کہ وہ اس کی شادی کو محض اس کی جدائی کے ڈر سے ٹالتا رہا اور جب شادی ہو گئی تو اس نے اپنا یہ دستور بنا لیا کہ مہینے میں ایک دفعہ ضرور آگرہ یا دہلی آکر اپنی بیٹی کو دیکھ جاتا اور دوسرے تیسرے مہینے اپنے ساتھ وطن لے جاتا۔ خود شہنشاہ اورنگ زیب کے دل میں بھی اس کی بڑی جگہ تھی، جس کا ثبوت یہ ہے کہ جب وہ انتقال کر گئی تو شہنشاہ نے اپنے باپ کے نقشِ قدم پر چلتے ہوئے ایک ایسے مقبرہ کی بناء ڈالنے کی ٹھانی جو تاج محل کی طرح لاثانی ہو اور ان کی محبت کی داستان آنے والی نسلوں کو زبانِ حال سے سنائے۔ لیکن شہنشاہ کو اس قبر کو پایۂ تکمیل تک پہنچانے کا موقع نہ ملا۔ شہزادہ اعظم شاہ نے اس مقبرہ کو مکمل کروایا۔ شوہر اور بیٹے کی پُرخلوص تمنائیں اس بیگم پر سایہ کی ہوئی ہیں اور ایک خوبصورت مقبرہ جسے بی بی کا مقبرہ بھی کہا جاتا ہے اس تیموری ملکہ کی خاک کو اپنی امانت میں لئے ہوئے ہے۔ اس مقبرہ کو بجا طور پر ہم دکن کا تاج محل کہہ سکتے ہیں جیسا کہ میں کہہ چکی ہوں جب میں اورنگ آباد گئی تھی تو مجھے اس مقبرہ کو دیکھنے کا موقع ملا اور مجھ پر ہی موقوف نہیں جو بھی اورنگ آباد جاتا ہے وہ اس مقبرہ کو ضرور دیکھتا ہے۔ یہ مقبرہ محلہ بیگم پورہ کے نواح میں واقع ہے۔ شہنشاہ اورنگ زیب نے اس کی تعمیر ۱۰۸۱ھ میں شروع

کرادی تھی اور یہ ۱۶۵۸ء سے پہلے پایۂ تکمیل کو پہنچا۔ اس مقبرہ کی تعمیر کا کام عطاء اللہ نامی ایک معمار کے سپرد تھا اور اس کی تعمیر میں آگرہ کے "تاج محل" کا نمونہ ملحوظ تھا لیکن اس زمانے میں فن تعمیر رو بہ زوال ہو گیا تھا اس لئے یہ عمارت "تاج محل" کے پایہ کی نہ بن سکی لیکن اس سے انکار نہیں کیا جاسکتا کہ خوبصورتی اور تعمیری خوبیوں کا خیال کرتے یہ تعریف و توصیف کی مستحق ہے۔ مقبرہ کا احاطہ ۵۰۰ گز لمبا اور ۳۰۰ گز چوڑا ہے۔ صحن میں حوض، سرو اور دوسرے پھولوں کے درخت ہیں۔ بازو ہی ایک مسجد بنی ہوئی ہے اس مقبرے کے اندر داخل ہوتے ہیں تو دل پر ایک عجیب کیفیت طاری ہوتی ہے اور دنیا کی ناپائیداری کا گہرا نقش بیٹھتا ہے ع

کیسے کیسے نام آور ہو گئے پیوندِ خاک

موت نے ان کے رشتۂ حیات کو منقطع کر دیا، لیکن وہ نیک نامی جوان کے نام کو زندۂ جاوید بناتی ہے ہمیشہ زندہ رہے گی اور یہ حسین مقبرہ اس کی یاد کو عقیدت اور عزت کے جذبات سے معمور رکھے گا۔

قبر کے اطراف سنگ مرمر کی جالی کا کام ہے اور قبر پر پھولوں کی چادریں نظر آتی ہیں۔ منت مانگنے والوں کی نذروں کا بھی ایک انبار نظر آتا ہے۔ مجاوروں کی زبانی مجھے معلوم ہوا کہ اکثر عورتیں شادی اور اولاد کی منتیں لے کر آتی ہیں اور بامراد لوٹتی ہیں۔ رابعہ دورانی کے متعلق بہت سی روایتیں مشہور ہیں۔ کئی کرامتیں اور کئی عجیب و غریب واقعات اس سے منسوب کئے جاتے ہیں، لیکن تاریخ سے ان کی تصدیق نہیں ہوتی۔ اس لئے میں بھی ان کا ذکر نہ کروں گی لیکن آخر میں یہ کہے بغیر نہیں رہ سکتی کہ دکن کو ہمیشہ اس بات کا فخر رہے گا کہ رابعہ دورانی اس کی خاک میں آسودہ ہے اور مقبرۂ "رابعہ دورانی" جیسی عمارت اس کی عظمت اور نیکی کی یاد کو زندہ رکھتی ہے۔

(لاسلکی نشرگاہ حیدرآباد سے پڑھا گیا) مظفر النساء (بیگم نواب احمد بیگ خاں)

رمِ آرزو

ایک موجِ تپاں بے کنارہ
ایک طوفاں زدہ ابر پارہ
ایک اڑتا ہوا سا شرارہ!
ایک ٹوٹا ہوا سا ستارہ

کیا خبر کب سے گرمِ سفر ہے
کب سے آوارۂ رہ گزر ہے

دھندلا دھندلا افق جلوہ گر ہے
بکھری بکھری ہوئی سی نظر ہے
کھوئی کھوئی سی اک رہ گزر ہے
بہکا بہکا قدم تیز تر ہے

پے بہ پے ٹھوکریں کھا رہا ہوں
بے تحاشا چلا جا رہا ہوں!

ہیں رواں نور و ظلمت کے دھارے
بہہ رہے ہیں برابر نظارے
ہم سفر ہیں مرے چاند تارے
میرے ہم راز ہیں یہ ستارے

ڈوبتا ہوں، ابھرتا چلا ہوں
منزلوں سے گزرتا چلا ہوں

جا رہا ہوں نظر سامنے ہے
شامِ غم اک سحر سامنے ہے
زندگی جلوہ گر سامنے ہے
ایک پیغام بر سامنے ہے

بہہ رہا ہوں اجالے کی رو میں
کتنے سورج ہیں میرے جلو میں

چلتے چلتے ٹھہرنا خطا ہے
پاؤں منزل پہ دھرنا خطا ہے
رہ گزاروں سے ڈرنا خطا ہے
خضر سے بات کرنا خطا ہے

مسکراتا بڑھا جا رہا ہوں!!
گنگناتا چلا جا رہا ہوں!!

دور تنظیم کے ہیکلوں سے
دور تہذیب کے مرکزوں سے
دور دولت کے عشرت کدوں سے
دور.... ان پاپ کی بستیوں سے

دور ہے میرے خوابوں کی دنیا
سرخ رو انقلابوں کی دنیا

رہزنوں کی سیاست سے بچ کر
جاہلوں کی قیادت سے بچ کر
کذب "تقدیس و طاعت" سے بچ کر
دوستوں کی خصومت سے بچ کر

اک جہانِ دگر چاہتا ہوں!
ظلمتوں کی سحر چاہتا ہوں!

شورؔ

تصویرِ وفا

عرصہ ہوا کہ بھارت ماتا میں ایک بہت مشہور راجا اور اس کی سندر رانی راج کرتے تھے ان کے گھر اولاد نہ ہوتی تھی۔ آخر ایک سنیاسی کی دعا سے ایک لڑکی پیدا ہوئی، جو چاند کو شرماتی تھی۔ اس کی آنکھیں ہرن کے مانند خوبصورت تھیں۔ اس کے بال رات کی طرح سیاہ اور اس کے لب گلاب کی پنکھڑیوں کی طرح نازک تھے۔ اس کا نام ساوتری رکھا گیا۔

جب اس نے گلشنِ شباب میں قدم رکھا تو اس کے لئے بر کی تلاش ہوئی۔ مگر کوئی راج کمار اس کے قابل دکھائی نہ دیا۔ ایک دن لڑکی اپنے باغ کی سیر کے بعد واپس آئی اور ماں کے پاس گئی وہ بہت شرمائی ہوئی تھی۔ اس کا چہرہ شرم سے گلنار ہو گیا تھا۔ اس نے ماں سے کہا ماتا جی جنگل میں ایک جھونپڑا ہے اس میں ایک خوبصورت نوجوان ہے۔ وہ مجھے بہت پسند ہے۔ اگر میرا بیاہ کرنا ہے تو اس سے کر دو ورنہ نہیں۔ ان کی ذات اونچی ہے۔ وہ راجا کا بیٹا ہے۔ راجا جلاوطن ہو کر جنگل میں رہتا ہے اور وہ اندھا بھی ہے۔

اسی مہاراج یعنی ساوتری کے والد کے دربار میں ایک رشی آیا ہوا تھا جس کا نام نارد تھا۔ یہ مہاتما تھا۔ اس سے مشورہ کیا گیا اس نے ستارے دیکھے اور اپنے علم کے رو سے معلوم کیا کہ ساوتری کا بیاہ اس جوان سے جو راجا کا بیٹا ہے ہوا تو شادی کے ٹھیک ایک سال بعد ساوتری بیوہ ہو جائے گی۔ ساوتری کی ماں یہ سن کر بہت پریشان ہوئی اور کہنے لگی کہ بیٹی ساوتری تم ستیاوان کو بھول جاؤ مجھ سے تمہارا رنڈاپا نہیں دیکھا جائے گا تم اس کی بیوی نہیں بن سکتیں۔ ساوتری نے کہا۔ ماتا جی میں تو اسی سے شادی کروں گی میرا دل ایک ہی ہے اور وہ ستیاوان کا ہو چکا ہے۔ شادی ہمارے مذہب میں محبت کا نام ہے۔"

آخر کار مہاراج اور رانی راضی ہو گئے اور ساوتری کا بیاہ ستیاوان سے کر دیا۔ وہ وفا کی دیوی شوہر کے ساتھ اس کے جھونپڑے میں رہنے لگی۔ وہ اپنے ہاتھ سے کھانا پکاتی۔ اپنے شوہر، ساس اور سسرے کی بے حد خدمت کرتی تھی۔ وہ اپنے شوہر پر جان دیتی تھی۔

سکھ کے دن پلک جھپکتے گزر جاتے ہیں۔ جوں جوں دن گزرتے تھے ساوتری کا دل بیٹھا جاتا تھا۔ وہ دعائیں مانگتی تھی کہ کسی طرح یہ کشتی کٹ جائے۔ مگر بھگوان کی سرکار میں اس کی شنوائی نہ ہوئی۔

ایک سال گزر گیا۔ جب ستیاوان کے مرنے کا دن آیا تو اس نے اپنی پیاری بیوی سے کہا کہ لکڑیاں ختم ہو گئیں ہیں میں لانے جاتا ہوں۔ یہ کہا اور کلہاڑی لے کر جنگل کی راہ لی۔ ساوتری کو چین کہاں تھا۔ وہ بھی اس کے پیچھے جنگل میں گئی۔ تھوڑی دیر کے بعد ستیاوان نے ساوتری سے کہا۔ پیاری بیوی میں بہت تھک گیا ہوں ذرا آرام کرنا چاہتا ہوں۔ ساوتری نے اس کا سر اپنی گود میں رکھ لیا۔ ستیاوان کو جب نیند لگ گئی تو موت کا دیوتا آیا اور اس کی روح قبض کر لی اور واپس جانے لگا۔ ساوتری بھی روتی ہوئی اس کے پیچھے پیچھے جانے لگی۔ تھوڑی دیر کے بعد دیوتا نے پلٹ کر کہا کہ ساوتری دیوی ابھی تیرا وقت نہیں آیا۔ ساوتری نے کہا "جہاں میرا خاوند جائے گا وہیں میں بھی جاؤں گی۔ اے دیوتا! میں نے تیرے درشن کئے ہیں مجھے دان دیجو۔

دیوتا۔ ساوتری مانگ کیا مانگتی ہے مجھے تیرے حسن پر رحم آتا ہے۔

ساوتری۔ میرے خاوند کا باپ اندھا ہے اسے آنکھیں دلوادو۔

دیوتا۔ جا تیری آرزو پوری ہوئی۔

تھوڑی دور چلنے کے بعد دیکھا کہ ساوتری پھر پیچھے چلی آتی ہے تو دیوتا نے کہا اے حسن کی دیوی یہاں سے چلی جا۔

ساوتری۔ محبت کی پجارن کسی سے نہیں ڈرتی۔

دیوتا۔ اچھا مانگ کیا مانگتی ہے۔ سوائے خاوند کی روح کے سب کچھ ملے گا۔

ساوتری۔ میرے خاوند کے باپ کی سلطنت قبضے سے نکل گئی ہے، واپس دلا دو دیوتا۔

دیوتا۔ اچھا جا تیری یہ التجا بھی ضرور پوری ہوگی۔ لیکن ساوتری پھر بھی اس کے پیچھے جارہی تھی اب تو دیوتا کو بہت غصہ آیا۔ وہ بجلی کی طرح کڑکا اور بادل کی طرح گرجا اس نے ساوتری سے کہا کہ ساوتری تو نے سب چیزیں دوسروں کے لئے مانگیں کچھ اپنے لئے مانگ میں سوائے تیرے شوہر کی روح کے سب کچھ دوں گا۔

ساوتری نے کہا۔ مجھے سات بیٹے عنایت ہوں۔

دیوتا۔ جا تو سات بیٹوں کی ماں بن جائے گی۔ اب ساوتری پھوٹ پھوٹ کر رونے لگی۔ دیوتا پریشان ہوگیا اور وجہ پوچھی۔

ساوتری نے کہا۔ اے طاقتور دیوتا تو نے مجھے سات بیٹے عنایت کئے ہیں لیکن جب تک میرا خاوند نہ دے گا میں کیسے ان کو ان سکتی ہوں۔ تجھے معلوم ہے کہ میرے مذہب میں شوہر کی موت کے بعد عورت ستی ہوجاتی ہے۔ پھر میں کیسے اپنی ذات کو بٹہ لگاؤں تو چاہتا ہے کہ میں بدچلن اور پاپن کہلاؤں میرا خاوند مجھے دے دے۔ موت کا دیوتا لاجواب ہوگیا۔ اس نے مسکراکر سیتاوان کی روح اس کو واپس کردی۔ سیتاوان بھگوان کا نام لے کر اٹھ بیٹھا وہ دونوں اس جگہ آئے جہاں بوڑھا آنکھوں والا راجا کھڑا تھا اور سپہ سالار اس کو دوبارہ تخت پر بٹھانے کے لئے آئے ہوئے تھے۔

ظہیر النساء

معراج

محبت کے پُرکیف خوابوں کی دنیا لطیف و پریشاں حجابوں کی دنیا
جلو میں لئے مستیٔ صبحِ خنداں! نگاہوں میں کچھ بے قراری کے ارماں
لبوں پر کوئی آسمانی اجالا یہ چہرہ شبِ ماہ نے جس کو ڈھالا
چمن زاد نغمہ، سحر خیز جلوا! تصور کی راحت، خیالوں کا دھوکا
ادا شوق افزا، نگہ دل رسیدہ گلستاں دریدہ، بہار آفریدہ
نگاہوں کا ارماں، دلوں کا شرارہ چمکتا تبسم، دمکتا ستارہ!!
جوانی کی چھاؤں میں نیند آ رہی ہے کلی جیسے کوئی کِھلی جا رہی ہے!
کوئی کیا کہے کس کی تصویر ہے یہ محبت کے خوابوں کی تعبیر ہے یہ!
ٹھہرتی نہیں، مست فرما رہی ہے چلی آ رہی ہے، چلی آ رہی ہے!

ہنسانے لگی ہے، رلانے لگی ہے!
مجھے کہکشاں میں بلانے لگی ہے!

یہ خوابوں کی پُرکیف خوابوں کی دنیا لطیف و پریشاں حجابوں کی دنیا
نہ جانے کہاں، کیوں لئے جا رہی ہے گریباں کے ٹکڑے کئے جا رہی ہے
چلا جا رہا ہوں، اڑا جا رہا ہوں! ستاروں کے آگے بڑھا جا رہا ہوں
مجھے روک سکتا نہیں حسنِ زُہرہ مجھے تھام سکتا نہیں سیلِ نغمہ!
مری پائے ناہید منزل نہیں ہے جو کھو جائے ایسا مرا دل نہیں ہے
میں جبریل پیکر، مرا ساتھ کیا دیں مہ و مہر کے کارواں تھک گئے ہیں!
فرشتوں نے چاہا کہ مجبور کر دیں حسینانِ جنت سے مسحور کر دیں!
مگر میری دنیا میں حیرت نہیں ہے ہوس آزمودہ مسرت نہیں ہے
شرابِ محبت پیئے جا رہا ہوں! نگاہوں میں سب کچھ لئے جا رہا ہوں

محبت کو کروٹ بدلنا نہ آئے!
مجھے زندگی بھر سنبھلنا نہ آئے!

نظر (حیدرآبادی)

محبت کی کہانی

میں کہتا رہا شبِ ہجراں سے کہانی وہ سنتے رہے میری جادوبیانی
زلفِ سیہ رخ پہ بکھری ہوئی سی
وہ شانوں سے ساری ڈھلکتی ہوئی سی
وہ خوش بُو ہواؤں میں پھیلی ہوئی سی
غشی ماہ پاروں کو آئی ہوئی سی
وہ سہمی ہوئی سی مری زندگانی وہ سازِ محبت وہ سوزِ جوانی
وہ دستِ حنائی وہ چاہِ زنخداں
حیاؤں سے بوجھل نگاہیں پُرارماں
بہ ایں شوق و ارماں بہ ایں سازوساماں
میں حرفِ تکلم وہ میری زباںداں!
بھاتی تھی دل کو مری خوش بیانی کسی صاف چشمہ کی جیسے روانی
وہ نورِ شبِ مہ خراماں خراماں!
رہا تھا، بیاباں بیاباں!
بنا جس سے کرہ، چراغاں چراغاں
ہر اک ذرہ ذرہ، فروزاں فروزاں
دکھاتا رہا ان کو نقشِ معانی نہ شیریں مقالی نہ شیریں بیانی.

نگاہوں میں ان کو سماتا گیا میں!
سماتا گیا میں بساتا گیا میں!
امیدوں کے سایہ میں بڑھتا گیا میں
سنبھلتا، جھجکتا، لرزتا گیا میں
زمانہ تھا ساقی فضائیں سہانی گلوں کی طرح ہنس رہی تھی جوانی!
نہ فرضی کہانی نہ فرضی زمانہ!!
وہی حسن و نغمے کا دلکش ترانہ!
کبھی دلبرانہ، کبھی مطربانہ!!
کبھی کافرانہ، کبھی عارفانہ!!
محبت ہے روزِ ازل کی نشانی نہیں تو! تو پھر کس لئے زندگانی
وہ افسوس واقف نہ تھے عہدِ غم سے
وہ آزاد تھے قصۂ بیش و کم سے
نہ الجھے تھے اب تک وہ رنج والم سے
رہے تھے وہ وابستہ عہدِ کرم سے
زمانے نے ٹھانی ہے اب سرگرانی مٹادے کوئی زندگی کی نشانی

شاہ یعقوب عارف

نئی کتابیں

۱۔ نقش فریادی۔ (مجموعہ کلام) از فیض احمد فیض ۱۲۵ صفحے۔ مکتبہ اردو لاہور۔

۲۔ دو فی کس نقد بچاؤ (سلیس کہانیاں) از عبدالواحد سندھی ۲۰ صفحے۔ مکتبہ جامعہ۔ دہلی

۳۔ یادگار حضرت شاد (گلدستہ مشاعرہ) مرتبہ راجہ نرسنگ راج عالی ۴۰ صفحے۔ اعظم پریس حیدرآباد۔

۴۔ جگ بیتی حصہ اول (پنڈت جواہر لال نہرو کی کتاب کا ترجمہ) از محمود علی خاں ۲۷۵ صفحے۔ مکتبہ جامعہ۔ دہلی۔

۵۔ کلام حرماں (مجموعہ کلام) از حرماں خیرآبادی۔ ۱۰۲ صفحے۔ اتحاد پریس۔ لاہور۔

۶۔ رہنمائے قرآن (نواب سر نظامت جنگ بہادر کی کتاب کا ترجمہ) از ڈاکٹر میر ولی الدین استاد فلسفہ جامعہ عثمانیہ ۸۰ صفحے۔ مکتبہ برہان۔ دہلی

۷۔ پتنگے اور دیگر افسانے از محمد امین خرقپوری۔ ۲۰۵ صفحے قیمت عہ شمع بکڈپو۔ پھاٹک حبش خاں۔ دہلی۔

۸۔ شور دروں (ناول) از رشید اختر ندوی۔ ۱۹۰ صفحے قیمت عہ۔ اردو بک اسٹال۔ بیرون لوہاری دروازہ۔ لاہور۔

۹۔ یادگار جگر (مجموعہ کلام) از منشی رنگ بہادر لال جگر گورکھپوری قیمت عہ۔ حشر بکڈپو۔ ملتان چھاؤنی۔

۱۰۔ شہاب تخیل (مجموعہ کلام) از منظور احمد افسر قیمت عہ۔ قصر اردو۔ ملتان۔

۱۱۔ مضامین ملک (مقالات) از عبدالملک آروی ۲۰۸ صفحے قیمت ۲؎۔ ادارۂ طاق بستان۔ آرہ۔

۱۲۔ شاہد معنی (نظمیں) از ماسٹر باسط بسوانی قیمت عہ قصر اردو۔ ملتان۔

۱۳۔ ان داتا (افسانے) از مرزا ادیب بی اے قیمت عہ۔ نرائن دت سہگل۔ لاہور۔

۱۴۔ کلام حرماں (غزلوں کا مجموعہ) از حرماں خیرآبادی قیمت عہ۔ دفتر مجلس اردو نمبر ۴۷، جی بلاک۔ ماڈل ٹاؤن۔ لاہور

۱۵۔ نورس (نظمیں) از مسعود اختر جمال قیمت عہ۔ مکتبۂ ادبستان۔ پانڈے حویلی۔ بنارس۔

۱۶۔ شگوفے (کہانیاں) از شفیق الرحمٰن قیمت عہ۔ مکتبۂ جدید۔ چوک انارکلی۔ لاہور

۱۷۔ عورتوں کے افسانے (دوسرا ایڈیشن) از کوثر چاندپوری۔ قیمت عہ۔ مکتبۂ اردو۔ لاہور۔

۱۸۔ سنگ و خشت (طنزیہ مضامین) از پروفیسر کنہیالال کپور۔ مکتبۂ جدید۔ چوک انارکلی۔ لاہور۔

۱۹۔ صحت و صفائی (حفظان صحت) از محمد حسین خاں۔ ۶۰ صفحے قیمت ۴ر مکتبۂ جامعہ۔ دہلی۔

۲۰۔ جواہر العلوم (علامہ طنطاوی جوہری کی کتاب کا اردو ترجمہ) از عبدالرحیم پروفیسر عربی اسلامیہ کالج پشاور ۲۱۰ صفحے قیمت عہ۔ کتابستان پوسٹ بکس نمبر ۲۱۶۴ بمبئی نمبر ۳۔

۲۱۔ خونی (کہانیاں) از اختر انصاری قیمت عہ۔ مکتبۂ اردو۔ لاہور۔

۲۲۔ ایک لڑکی (کہانیاں) از خواجہ احمد عباس قیمت عہ۔ مکتبۂ اردو۔ لاہور

۲۳۔ عرب اور عربستان (عربوں کی معاشرت اور ان کے رسم و رواج) از جہاں بانو بیگم ۴۵ صفحے قیمت۔ ۱ر سب رس کتاب گھر خیریت آباد۔ حیدرآباد

۲۴۔ یقین و عمل (وائیکونٹ سیموئیل کی کتاب کا ترجمہ) مرتبہ ادارۂ اشاعت اردو قیمت عہ۔ سید عبدالرزاق تاجر کتب عابد روڈ حیدرآباد۔

مرزا سیف علیخاں

گل بوٹے

ایک خزاں رسیدہ قطعہ دار صاحب کو بیکاری میں بیوپار کی سوجھی، آپ کے بعض تجربہ کار دوستوں نے صلاح دی کہ حیدرآباد سے مرغ انڈے لے جاکر بمبئی میں فروخت کرلے چاہییں، ایک دوست نے کہا کہ بمبئی میں سگریٹ کے کاغذ کے ڈبے بہت مہنگے بکتے ہیں اگر حیدرآباد سے بنواکر لے جائیں تو خاصہ نفع ہوسکتا ہے، یہ مشورہ بھی پسند آیا اور پچاس سگریٹ کی ڈبیاں رکھنے کے پانچ سو ڈبے بنوائے گئے، اتنی ہی مرغیاں خریدی گئیں اور کوئی دو ہزار انڈے جمع کیے گئے۔

خالی ڈبے لکڑی کے کیسوں میں رکھے جارہے تھے، ایک دوست نے کہا کہ انڈوں کو ڈبوں میں اور ڈبوں کو صندوقوں میں رکھنا بہتر ہوگا چنانچہ اسی طرح "پیکنگ" ہوئی اور ہمارے "ملک التجار" کو دھوئیں کی گاڑی اڑاتی ہوئی بمبئی لے پہونچی۔

معلوم ہوتا ہے کہ مرغیوں میں وبا پھوٹ پڑی تھی، کچھ تو راستے ہی میں اللہ کو پیاری ہوئیں اور کچھ بمبئی پہونچتے پہونچتے پرواز کر گئیں، انڈے بھی سیکڑوں کی تعداد میں ٹکرا ٹکرا کر "پڈنگ" بن گئے اور ان ڈبوں کی جو "انڈے دان" بنے تھے گت بن گئی، بچے کچھے انڈے مرغیاں اونے پونے فروخت کر دی گئیں، جو روپیہ ان کے خریدنے میں صرف ہوا تھا بمشکل اس کا آدھا وصول ہوا۔ اب رہے ڈبے! ان کی فروخت میں بڑی دشواری ہوئی۔ کرافورڈ مارکٹ میں انڈے مرغیوں کے ساتھ تو یہ بکنے سے رہے!! ایک ڈبہ بطور نمونہ لے کے سارا شہر روند ڈالا مگر کوئی اللہ کا بندہ لاگت سے کم پر بھی خریدنے کو تیار نہیں ہوا، آخر بیزار ہوکر انہیں فروخت کرنے کی ہمارے "ملک التجار" نے ایک بڑی آسان تدبیر نکالی، سارے ڈبے الگ نیلام گھر میں رکھ دیے اور یہ "پڈنگ زدہ" ڈبوں کا لاٹ مبلغ پونے دو روپے میں "ونس ٹوائس اینڈ تھری ٹائمس" ہوکر چل بسا۔

مرغیوں کی تجارت میں ملک التجار صاحب کو سو فی صدی "[illegible]" بننے کا یقین تھا، اس تجارت کا سرمایہ چار روپے سیکڑہ قرض لیا گیا تھا، اس میں سے کچھ رقم پاس تھی اور کچھ انڈے مرغیوں کی فروخت سے ہاتھ آئی تھی، خیال ہوا کہ گھاٹے کو پورا کرنے کی تدبیر نکالی جائے۔ ذہن رسا نے یہ رائے دی کہ بمبئی سے کچھ چینی کانچ کا سامان حیدرآباد لے جاکر بیچنا چاہیے۔ یہ خیال آتے ہی آپ فوراً ہوٹل سے نکل دوسرا دھندا کرنے چلے۔

ایک جگہ سر راہ گانا ہو رہا تھا، آپ موسیقی کے بڑے دلدادہ ہیں بس وہیں ڈٹ گئے، کچھ دیر بعد جب کام یاد آیا تو چل پڑے، ایک دکان پر پہونچے، بہت سا سامان پسند کیا اور حکم دیا کہ اچھی طرح پیک کر دیا جائے حیدرآباد لے جانا ہے، کوئی دو سو روپے کا سامان ہوا! جب سامان کا بل آپ کے ہاتھ میں دیا گیا تو روپے نکالنے شیروانی کے نیچے کی جیب میں جو ہاتھ ڈالا تو جیب مع نوٹوں کے "یا منظر العجائب" تھی!! دکان دار نے مشورہ دیا کہ پولس میں رپورٹ کرنی چاہیے، تھانے پر اطلاع دی گئی نام اور پتہ لکھوا دیا گیا، بمبئی کو کہتے رہے کہ چوروں اور جیب کتروں کی بستی ہے، کہیں ٹھیرنا مشکل! کھانا سونا حرام!! ہوٹل میں جو "باقیات الصالحات" چھوڑ آئے تھے وہ کام آئے اور سامان کی قیمت ادا کر دی گئی مگر نئی یہ آ پڑی کہ آپ اب بمبئی نہ چھوڑ سکتے تھے، تھانہ دار صاحب کا حکم تھا کہ سراغ لگنے تک بمبئی رہیں اور اس سلسلے میں صبح شام ایک ہفتہ تک تھانے پر حاضری دیتے رہے، چور نہ ملنا تھا نہ ملا آخر "تنگ آمد بجنگ آمد" ایک روز تھانہ دار سے جھڑپ ہو گئی۔ اس نے کہا "ہم سراغ لگا رہے ہیں، نقدی کا ملنا دشوار ہے آپ اپنا حیدرآباد کا پتہ نوٹ کرا دیں اگر چور گرفتار ہوگا تو ہم آپ کو اطلاع دیں گے۔" چلیے صبح شام تھانہ کی حاضری سے نجات ملی!! اسی رات آپ نے حیدرآباد کے لئے رخت سفر باندھا جو کچھ بچا تھا اس کی حفاظت کے لئے ساری رات آنکھوں میں کاٹ دی۔

صبح سویرے ایک دوست سے ملاقات ہوئی جو گلبرگہ جا رہے تھے ہمارے "ملک التجار" نے اپنی بپتی کی واردات ان کو سنائی اور کہا کہ "ساری رات چوروں کے خوف سے نیند نہیں آئی، آنکھیں ملی جا رہی ہیں جب آپ گلبرگہ پر اتریں جگا دینا"! خود کو دوست کی حفاظت میں دے کر بے فکر سو گئے، جب گلبرگہ کا اسٹیشن آیا دوست نے جگا دیا، آپ جاگ تو پڑے مگر رات بھر جاگنے کی وجہ سے آنکھوں میں نیند کا طوفان برپا تھا، پھر سو گئے اور کروٹیں بدل بدل کر خوب سوئے جب آنکھ کھلی تو شام ہو رہی تھی۔ "پان چٹا، بیڑی سگریٹ! ڈبل روٹی نان پاؤ بسکوٹ!! گرما گرم چاہ کافی"!!! وغیرہ کی صدائیں کسی اسٹیشن کا پتہ دے رہی تھیں۔ ڈبے سے سر نکالا تو ایک آسمانی رنگ کے بورڈ پر بہ خط "ریل نستعلیق" نہایت خوبصورت حرفوں میں "رائچور" لکھا نظر آیا۔ آپ کو بڑا تعجب ہوا کہ جاتے وقت یہ اسٹیشن کہیں نظر نہ آیا تھا! اس کھوج میں آپ اتر پڑے اور لگے ایک ایک سے پوچھنے کہ گاڑی حیدرآباد کب پہنچے گی۔

ایک صاحب نے کہا۔

"اجی حضرت! یہ گاڑی تو مدراس کو جاتی ہے نا"!!

آپ نے کہا "مگر میں تو حیدرآباد جا رہا ہوں"!

انھوں نے پوچھا "اپے کاں سے آتے سو جی حضرت"!

کہا "بمبئی سے"!

ان ہی صاحب نے سوال کیا "آپے واڑی کے اسٹیشن پو گاڑی کو کیوں نہیں بدل کو ڈالے"؟

جواب دیا "واڑی تو آیا ہی نہیں"!

اتنے میں ٹکٹ انسپکٹر آ دھمکا ٹکٹ دیکھ کر اس نے کہا "ٹکٹ تو حیدرآباد کا ہے، آپ حیدرآباد کیوں نہیں گئے؟ یہ گاڑی تو مدراس جا رہی ہے"!

آپ نے کہا "میں بھی تو یہی پوچھ رہا ہوں کہ یہ گاڑی حیدرآباد جاتے جاتے مدراس کی طرف کیسے نکل پڑی؟ عجب شتر بے مہار ہے جدھر جی چاہا چل دیا"!!

اس نے کہا "آپ کو واڑی پر گاڑی بدلنا چاہیے تھا"!

آپ نے پھر وہی کہا "واڑی تو آیا ہی نہیں"! کچھ سوچ کر پوچھا "اچھا تو بتاؤ یہاں سے مدراس کتنی دور ہے"؟

جواب ملا "صرف چند گھنٹے کا راستہ ہے صبح ہوتے ہوتے مدراس پہونچ جائیں گے"!

فرمایا "جب مدراس اتنا قریب ہے تو اس کو بھی کیوں نہ دیکھ لوں"! محصول کا تکملہ ادا کر دیا اور علی الصبح مدراس پہونچ گئے۔

دو تین دن مدراس کی سیر کی، لوٹتے وقت کھاری مچھلی اور سمندری جھینگوں کے دو چار تھیلے ساتھ رکھ لئے کہ عزیز و احباب میں بطور تحفہ مدراس تقسیم کریں۔ مگر اس "تحفہ" کی خوشبو سے ڈبہ مہک رہا تھا اور ہر کس و ناکس سے جھڑپ ہو رہی تھی۔ ایک اسٹیشن پر مسافر گارڈ کو کھینچ لائے گارڈ نے پوچھا کہ "تھیلے لگیج میں کیوں نہیں رکھوائے گئے"۔

فرمایا "جیب کے روپیے تک تو چور نہیں چھوڑتے لگیج کے سامان کا کیا ٹھکانہ"!

واقعات سن کر گارڈ بھی مسکرایا اور آپ کے ساتھی مسافروں کو یہ سمجھا کر سوار کرا دیا کہ تھوڑی دیر میں گاڑی بجواڑہ پہنچ جائے گی جانے بھی دیجیے!

خدا خدا کر کے مال تجارت اور تحفوں کے ساتھ حیدرآباد پہونچے، تحفے تقسیم ہوئے سامان ادھار فروخت کیا گیا جو آج تک "ادھار" ہی ہے اور ساہوکار کی "دام دوپٹ" ڈگری میں جائیداد نیلام چڑھنے کو ہے۔ "ملک التجار" حیران ہیں آخر ان سے کہاں غلطی ہوئی تھی جو یہ خمیازہ بھگتنا پڑا۔

"ملک التجار" نے بمبئی کے ایوان تجارت سے درخواست کی ہے کہ وہ بہت جلد اپنے ایک غیر معمولی جلسہ میں یہ گتھی سلجھائے کہ ان سے کب کہاں اور کس طرح غلطی ہوئی اور اب انھیں کیا کرنا چاہیے!!

"باغبان"

نکڑ

روزانہ سیکڑوں لوگ وہاں سے گزرتے ہیں۔ امیر غریب، بوڑھے جوان، مرد عورتیں۔ وہ بڑی بارونق جگہ ہے۔ ہمیشہ ہجوم رہتا ہے۔ صبح کو طلبہ اور طالبات، دفتری لوگ، ڈاکٹر، نرسیں، دوکاندار کتابیں بغل میں دبائے یا جھولا لٹکائے بس کے انتظار میں کھڑے نظر آتے ہیں۔ دوپہر اور سہ پہر میں گاہکوں کا تانتا بندھا رہتا ہے اور شام کو موٹروں کی "پوں پوں" اور "بھوں بھوں" سے کان پڑی آواز سنائی نہیں دیتی۔

تانگے والے سواریوں کو اپنے تانگے میں بٹھانے کی کیا کیا تدبیریں کرتے ہیں۔ کوئی کہتا ہے "مولوی صاحب بس سے پہلے پہونچا دوں گا۔" "راجہ ادھر آؤ کیا آرام دہ تانگہ ہے۔ بس پلک جھپکنے میں پہونچا دوں گا۔" "بس اپنے بس کی تھوڑی ہے۔ آپ کے قابل کی سواری ہے میری۔" "اجی خفا کیوں ہوتے ہیں، ادھر دیکھئے۔" "ٹخ ٹخ۔ پٹ پٹ!!" "چل ری میری کجلی۔" "کیوں صاحب کیسی چلتی ہے میری کجلی۔" "خوب۔ کیا کہنے۔"

بے شمار بائیسکلیں مستانہ ریگتی چلی جاتی ہیں۔ رکشا والے زور لگاتے گھونگرو چھنچھناتے مجمع سے کتراتے بڑھے چلے جاتے ہیں۔ ایک چھوٹا دو دو تین تین سواریوں کو اس طرح کھینچ لے جاتا ہے جیسے دیو گھوڑا۔ اس کے سیاہ جسم پر پسینے کی دھاریں بہہ رہی ہیں۔ لیکن رکشا میں بیٹھنے والے اکڑے بیٹھے ہیں گویا وہ چار آنے میں انھوں نے غلام بنا لیا ہے۔

بس خاموشی سے آکر ٹھیر جاتی ہے۔ لوگ ایک دوسرے پر پل پڑتے ہیں۔ پہلے صنف نازک کو جگہ دی جاتی ہے۔ شام کو چھڑکاؤ ہوتا ہے۔ ابھی چہل پہل رہتی ہے۔ بھانت بھانت کے مرد تماشا دیکھنے آتے ہیں۔ وہیں قریب ہی چمن ہے جہاں سنجیدہ لوگوں کا اجتماع رہتا ہے۔ وہاں ایک خوبصورت پان والی کی دوکان ہے۔ کس کا دل نہ چاہے کہ ایک پیسے میں عمدہ خوشبودار پان بھی کھا لے۔ جب بجلی روشنی کھل جاتی ہے تو اور بھیڑ لگ جاتی ہے۔ دور سے دیکھو تو فلمی ستارہ معلوم دے۔ جیب کتروں اور لفنگوں کی بن آتی ہے۔ پیلا ری چھوکروں کی خوب بکری ہوتی ہے۔

اس نکڑ پر ضروریات زندگی کی بہت ساری چیزیں مل جاتی ہیں۔ تھکے ماندے لوگوں کے لئے گرم حمام، حجامت خانے موجود ہیں۔ وہیں سڑک کی پٹری پر جوتے صاف کرنے والے اور سر کو مالش کرنے والے لڑکے ملیں گے۔ آنا فانا سر کی صفائی اور جوتے کی صفائی سستے داموں میں ہو جائے گی۔ پھر ہوٹل کے بالا خانے پر بیٹھ کر دو پیسے کی چائے کی پیالی نوش جان کر کے سیر بھی کر لیجئے۔ غرض کہ نکڑ سدا بہار رہتا ہے۔ یہ شہر کی جان ہے۔ وہیں ایک بجلی کا خوبصورت ہنڈا لٹکا رہتا ہے۔ جس نے اس نکڑ کو آس پاس کی سڑکوں سے ممتاز کر دیا ہے۔ ان سب خوبیوں کے باوجود اس میں خرابی بھی ہے۔ بے عیب ذات خدا کی۔ اکثر حادثے ہوا کرتے ہیں۔ ریل پیل میں گر پڑنا معمولی بات ہے۔ پچھلے ہفتے ہی کا ذکر ہے کہ ایک لڑکا بھیڑ میں بے ہوش ہو گیا۔ ایک دوشیزہ ٹھمکتی آ رہی تھی، پیر پھسلا گر پڑی اور تماشا بن گئی۔ ایک فقیر دھکا کھا کر گر پڑا اور تانگے کے پہیے تلے اس کا پیر ٹوٹ گیا۔ تانگوں کی ٹکر موٹروں کی مڈبھیڑ تو روز ہوا کرتی ہے۔ پولیس کے دو سپاہی بھی ٹرافک سنبھال نہیں سکتے۔ کیا کریں بچارے وہاں ...... ورنہ اتنے حادثے نہ ہوتے۔ نکڑ رہنا یا نظر کا چند ثانیوں تک جمے رہنا یا خیال کا بٹ جانا خود اتفاقی چیزیں ہیں۔

"نکڑ پر بے شمار فسانے بکھرے پڑے ہیں جنہیں ادیب اور شاعر گھر پر تصور میں چن لیتے ہیں۔ بعضوں کے دماغ میں واقعات مرتسم ہو جاتے ہیں اور وہ فسانہ بنا ڈالتے ہیں۔ بیشتر لوگ دنوں یاد رکھتے ہیں۔ لیکن کاروبار میں بھول جاتے ہیں۔" زندگی خود فسانہ ہے۔

شبیر حسین تحسین

تنقید و تبصرہ

تحقیق قربانی از عرشی شائع کردہ دفتر امت مسلمہ امرتسر۔

یہ اس کتاب کا دوسرا ایڈیشن ہے جو قربانی کے مسئلہ پر ۱۹۳۲ء میں شائع ہوئی تھی اور جس کے بعد سے اس کی مخالفت اور تائید میں کئی مضامین اور مقالے لکھے گئے۔ اس میں مصنف نے اس امر کی تحقیق کی ہے کہ قربانی صرف مکہ معظمہ میں فرض ہے۔ کیونکہ کعبہ ملت اسلامیہ کے سالانہ اجتماع اور اس کی دینی و دنیوی فلاح و بہبود کا مرکز ہے اور ان ہدیوں اور قربانی کے جانوروں کی وہیں ضرورت ہے تاکہ ملت کے اس اجتماع میں جو لوگ اطراف و اکناف عالم سے آکر شریک ہوں ان کی خورش اور غذا کا سامان ہو سکے۔ اس طرح قرآن شریف اور دوسرے ذرائع سے عرشی صاحب نے یہ ثابت کیا ہے کہ مروجہ قربانی جو مسلمان ہر مقام پر عید الضحیٰ میں کرتے ہیں غیر قرآنی ہے۔

یہ مسئلہ نہایت اہم ہے اور ضرورت ہے کہ اس کتاب کا غور و خوض سے مطالعہ کیا جائے۔

جدید تعلیمی تصورات اور چند اصلاحی تجاویز از محمد اعظم خاں ایم اے ڈپ ایڈ مطبوعہ عنایت دکن پریس حیدرآباد دکن۔

اس مختصر کتاب میں تعلیم کے نصب العین، نظام تعلیم کے ارتقاء اور اس کے جدید اصول بیان کرنے کے بعد ہندوستانی مدرسوں کی موجودہ حالت پر نظر ڈالی گئی ہے۔ پھر اصلاحی تدبیریں پیش کی گئی ہیں اور یہ سمجھایا گیا ہے کہ مدرس کی کیا اہمیت ہوتی ہے، اس کے اوصاف و فرائض کیا ہیں، مدرسین کے انتخاب میں کن امور کو پیش نظر رکھنا چاہیئے اور ان کی عدم دلچسپی کے اسباب اور علاج کیا ہو سکتے ہیں۔

تعلیمی امور سے دلچسپی رکھنے والے اصحاب اور خاص کر مدرسین اور عہدہ داران تعلیمات کو اس کتاب کا مطالعہ کرنا چاہیئے۔

نقد و نظر از حامد حسن قادری پروفیسر سینٹ جانس کالج آگرہ۔

یہ کتاب اصل میں پروفیسر حامد حسن قادری کے مختلف مضامین کا مجموعہ ہے اس میں فن نقد و نظر سے متعلق کوئی مسلسل اور مفصل معلومات نہیں ہیں بلکہ اردو کے بعض شاعروں اور کتابوں پر تبصرے درج کئے گئے ہیں۔ مرزا غالب، نظیر اکبرآبادی اور آغا شاعر دہلوی کے علاوہ کتابوں میں مخمانۂ ریاض، شرح درد اور غالب کی شرحوں پر تنقیدی نظر ڈالی گئی ہے۔ دو مضمون زبان اور عروض پر بھی ہیں جن کے عنوان ہیں عروضی غلطیاں اور زبان کے چند نکتے۔ کتاب دیدہ زیب اور صاف پاک چھپی ہے اور اردو کے تنقیدی ادب میں اس کو ایک نمایاں جگہ حاصل ہو سکتی ہے۔ اس کے مصنف نے اردو ادب کی تاریخ پر بھی اس سے قبل چند کتابیں داستان تاریخ اردو، تاریخ مرثیہ گوئی اور تاریخ تنقید کے عنوان سے شائع کی ہیں۔

علم شہریت از سید احمد علی خاں ایم اے ایم ایڈ بار ایٹ لا مطبوعہ انتظامی پریس حیدرآباد دکن۔ یہ کتاب نویں اور دسویں جماعتوں کے لئے مرتب کی گئی ہے اور مجلس نصاب تعلیم ثانوی کے شعبۂ تاریخ کی منظورہ ہے۔ اردو میں اپنی طرز کی پہلی ابتدائی کتاب ہے۔ اس کو آٹھ ابواب میں منقسم کیا گیا ہے اور ہر باب میں نہایت ضروری اور دلچسپ معلومات شریک کی گئی ہیں۔

پہلے باب میں علم شہریت کا مقصد اور اس کے تعلیمی مدارج بیان کئے گئے ہیں۔ دوسرا باب سماج اور فرد کے لئے وقف ہے۔ اس میں ایک کا دوسرے پر اثر اور خاندان، والدین، اولاد، پڑوسیوں اور مدرسہ سے متعلقہ اصحاب کی ذمہ داریوں کے تذکرے کے بعد گاؤں اور شہر کی اہمیتوں اور انتظامات اور حکومت پر بحث کی گئی ہے۔ تیسرے باب میں سماجی فلاح و بہبود کو پیش نظر رکھا گیا ہے۔ چوتھا معاشی خوشحالی سے بحث کرتا ہے۔ آخری چار باب ہندوستان اور ممالک محروسہ سرکار عالی کے سیاسی نظام، حکومتی اور انتظامی

امور پیش کرتے ہیں۔ اس طرح یہ کتاب نہ صرف طلبہ بلکہ عام تعلیم یافتہ اصحاب کی وسعت معلومات کے لئے مفید ثابت ہوگی۔

نسل اور سلطنت از عزیز احمد بی اے آنرز لندن۔ شائع کردہ انجمن ترقی اردو دہلی۔

اس کتاب میں تاریخ اور سیاسیات میں نسل کا جو تصور ہے اس پر علمی و تحقیقی انداز میں بحث کی گئی ہے۔ اس موضوع کو چھ عنوانوں میں تقسیم کیا گیا ہے۔ پہلا باب نسلی امتیاز کے آغاز و ارتقاء سے بحث کرتا ہے۔ دوسرے باب میں ذات پات اور خاصان خدا کے عنوان سے نسل اور زبان کے معیاروں کا تفصیلی مطالعہ کیا گیا ہے۔ تیسرے باب میں شہنشاہیت کی قسموں اور اس کے تاریخ وار ارتقاء کو قلم بند کیا ہے۔ چوتھا باب یورپی تمدن اور اس کی برتری کے اسباب و نتائج کے لئے وقف ہے۔ آخر میں دو عنوان ہیں جن میں مدنیت الکبریٰ کی روایتوں اور طلمہ گی پسند شہنشاہی پر تاریخی اور سیاسی نقطۂ نظر سے بحث کی گئی ہے۔ کتاب میں بعض ضروری نقشے بھی شریک ہیں اور جگہ جگہ ان کتابوں کے حوالے دیئے گئے ہیں جن سے زیر نظر کتاب کی معلومات ماخوذ ہیں۔ ابتدا میں ایک دیباچہ یا تمہید کی ضرورت تھی جس کے بغیر اس کتاب کے سبب تالیف اور موضوع کی اہمیت واضح نہیں ہو سکتی۔

شاد اقبال شائع کردہ ادارۂ ادبیات اردو حیدرآباد دکن۔

مہاراجہ سرکشن پرشاد یمین السلطنت اور علامہ سر محمد اقبال کے آپس میں تین سال سے زیادہ کی مدت تک جو تعلقات رہے ان کا اس کتاب میں اجمالی تذکرہ درج ہے اور ساتھ ہی ان دونوں کے سو سے زیادہ خطوط بھی شریک ہیں جن کے مطالعہ سے ہندوستان کے دو بڑے انسانوں کے قلبی و ذہنی رجحانات بے نقاب ہو جاتے ہیں۔ ان میں ان دوستوں کی اخلاقی اور روحانی قوتوں کی گہرائیاں آئینے کی طرح صاف و شفاف نظر آتی ہیں۔ یہ خطوط اس حقیقت حال پر سے پردہ اٹھا دیتے ہیں کہ دوستی اور محبت کے نبھانے اور اس میں ترقی دینے کے لئے قلب و دماغ کی کیسی وسعتیں درکار ہیں اور دو انسان وطن مذہب اور مرتبے کی وسیع سے وسیع تر خلیجوں اور اختلافات کے باوجود کیونکر ایک دوسرے کے رنج و راحت کے شریک اور کمالات کے معترف رہ سکتے ہیں۔

اس مجموعہ میں علامہ اقبال اور مہاراجہ کی تصویریں اور تحریر کے عکس بھی شریک ہیں۔

اصلاح تلفظ از ابوالخیر صدیقی ناشر مکتبہ شرقیہ سیالکوٹ۔

اردو اور فارسی میں جو عربی الفاظ کثرت سے مستعمل ہیں ان کو صحیح طور پر تلفظ کرنے اور بعض مروجہ غلطیوں کی اصلاح کی غرض سے یہ کتاب تالیف کی گئی ہے۔ اس میں عربی مصادر کے اوزان کے تحت ان تمام الفاظ کو درج کر دیا گیا ہے جو اردو میں مستعمل ہیں۔ ہر لفظ کے آگے ان کا مفہوم بھی لکھ دیا گیا ہے۔ آخر میں تقریباً ان تمام الفاظ کو درج کرنے کی کوشش کی گئی ہے جن کا تلفظ یا استعمال عوام میں غلط طور پر رائج ہو گیا ہے۔ اس فہرست میں عربی کے علاوہ فارسی اور ہندی لفظ بھی شریک ہیں۔

مصنف کی یہ کاوش قابل قدر ہے کیونکہ اس کی وجہ سے تلاش و جستجو کرنے والوں کے لئے آسانی پیدا ہو گئی ہے۔ ضخیم لغتوں کی چھان بین کی جگہ اس چھوٹی سی کتاب کے مطالعہ سے تلفظ کی صحت آسانی سے کی جا سکتی ہے۔ مدرسوں اور طلبہ کے لئے یہ خاص طور پر مفید ثابت ہوگی۔

نواب سکندر جاہ آصفجاہ ثالث از سید مراد علی طالع

ناشر ادارہ ادبیات اردو۔

اس کتاب میں بچوں اور عوام کے لئے حضرت آصفجاہ سوم کے

۔ لاتِ زندگی سلیس اور سادہ زبان میں بیان کئے گئے ہیں۔ اگرچہ یہ سرزمین دکن کے ایک جلیل القدر حکمران کے مختصر سے حالاتِ زندگی ہیں لیکن ان میں ان کی ولادت، تعلیم و تربیت، مسند نشینی سیرت اور اولاد کے حالات کے علاوہ ان کے عہد کے جملہ سیاسی اور تاریخی واقعات درج ہیں اور چونکہ اب تک ان کی کوئی اور سوانح عمری شایع نہیں ہوئی ہے اس لئے یہ کتاب تاریخ دکن سے دلچسپی رکھنے والے تمام اصحاب کے لئے ایک مفید حوالہ کی کتاب ثابت ہوگی۔

بن باسی دیوی

از اشرف صبوحی دہلوی حجم ۲۹۰ صفحے مجلد قیمت عالہ پتہ کتب خانہ علم و ادب۔ دہلی۔

یہ افسانہ آزاد ترجمہ ہے ایک انگریزی افسانہ کا، صاف ستھری اور سلیس زبان میں جناب اشرف صبوحی نے ترجمہ کیا ہے، یہ افسانہ انسانی تمدن اور معاشرت کی ابتدائی تاریخ ہے، اس تصور کو اس خوش اسلوبی سے پیش کیا گیا ہے کہ تخیل واقعہ بن گیا ہے، انسانی تمدن کے ابتدائی زمانہ کی نسبت جو تصور مغرب کے ذہن میں ہے اس کا عکس اس افسانہ میں موجود ہے مغرب کے اس خاکہ میں جناب مترجم نے مشرق کی رنگ آمیزی خوب کی ہے جس کی وجہ سے افسانہ کی دلچسپی بڑھ گئی ہے اور اس میں رنگینی اور دلکشی پیدا ہوگئی ہے۔

نامۂ تہدید

از محمودہ رضویہ حجم ۱۵۲ صفحے قیمت عالہ پتہ ہندوستانی دارالاشاعت انجمن ترقی اردو کراچی

یہ مجموعہ ہے بارہ اسلامی افسانوں کا، ان میں زیادہ تر آنحضرتؐ کے زمانے کے واقعات بیان کئے گئے ہیں، طرز بیان زیادہ دلچسپ نہیں۔

ارمغان

از محمودہ رضویہ حجم ۱۴۲ صفحے قیمت عہ پتہ ہندستانی دارالاشاعت انجمن ترقی اردو۔ کراچی

اس مجموعہ میں ۱۴ مختصر رنگین مضامین شامل ہیں، اس مجموعہ کا انتساب مصنفہ نے " اہل سندھ کی اردو کشی اور ادب سنجی

کے نام کیا ہے اس مجموعہ کے " نغمۂ آزادی " میں مسلم خاتون سے اس طرح خطاب کیا گیا ہے۔

" وقت خوابیدگی گزر چکا از بہر خدا اب بیدار ہو، یہ پستی! ہستی کو درجہ نیستی تک پہنچا دینے والی پستی!، جس نے تیری روح پر غاصبانہ پردۂ غفلت ڈالا ہوا تھا اسے مٹا دینے کا وقت ہے مسلم ہندی آج عالم بیچارگی میں ہے ــــ درحقیقت اس کا وجود مفقود!! ایسا معلوم ہوتا ہے جیسے سرد جھونکوں سے کوئی کنول کا پھول منجمد ہو کر رہ گیا ہو ــــ دختر اسلام! اپنی رفعت گزشتہ یاد کر ــــ غلامی کی سیاہ چڑیل بر سر پیکار اٹھے ہند ہے۔ ہر طرف جہل کا دور دورہ ہے اور مفلسی کی کثرت ــــ! اپنی قدر پہچان اور نیم جان قوم کو روح آزادی دلا دے "!!

مثنوی عائشہ صدیقہ

از احمد حسین وقار وارثی حجم ۴۸ صفحے قیمت ۴ر عصمت بکڈپو۔ دہلی

یہ مثنوی حضرت عائشہ صدیقہ کی منظوم سوانح حیات ہے، اس میں جناب صدیقہ کے عہد طفلی سے لیکر ایام رحلت تک کے تاریخی واقعات قلمبند کئے گئے ہیں، یہ مختصر سوانح حیات لڑکیوں کے لئے کافی سبق آموز ہے۔

سلاسل

از جاں نثار اختر حجم ۱۲۸ صفحے قیمت ۱۲ر پتہ کتب خانہ علم و ادب دہلی

جناب اختر کی ازتیس انقلابی نظموں کا یہ مجموعہ ہے۔ جناب جوشؔ نے اس مجموعہ کے پیش لفظ میں مصنف اور اس کے کلام کا جو تعارف کرایا ہے اس کا اعادہ تبصرہ کے لئے کافی ہے، وہ لکھتے ہیں۔

" اختر کی شاعری میرے نزدیک زندگی کی حقیقتوں، مناظر کی تفسیروں، نفسیات کی باریکیوں اور معانی کی

برائیاں ملتی ہیں۔ اور یہ سب چیزیں ایسی سموئی ہوئی ہیں جس طرح کوئی ماہر موسیقی متعدد راگنیوں کو ملاکر ایک ایسا نغمۂ شیریں پیدا کرتا ہے کہ بزم پر وجد کی سی کیفیت طاری ہوجاتی ہے۔"

قرآن اور علاج غضب

از ڈاکٹر میر ولی الدین استاد فلسفہ جامعہ عثمانیہ حجم ۱۴ صفحے مطبوعہ معارف پریس اعظم گڑھ۔

ڈاکٹر صاحب کا یہ فلسفیانہ مقالہ حیدرآباد فلسفیکل کانفرنس کے چودھویں سالانہ اجلاس میں پڑھا گیا تھا۔ یہ مقالہ اول سے آخر تک قرآن کریم سے ماخوذ ہے۔ جذبۂ غضب و غصہ سے نجات کی نسبت اس مقالہ میں نفسیاتی اصول پر بحث کی گئی ہے اور اس جذبہ کی برائیاں اور اس سے نجات کے طریقے جب کہ وہ حد اعتدال سے باہر ہوجائے، قرآن مجید کی روشنی میں بیان کئے گئے ہیں۔

۱۹۴۲ء کی بہترین نظمیں

مرتبہ حلقۂ ارباب ذوق حجم ۱۰۰ صفحے قیمت عہ ناشر اردو دبستان لاہور۔

یہ مجموعہ ہے سیاسی، انقلابی، سماجی اور فلسفیانہ نظموں کا جن کو حلقۂ ارباب ذوق نے انتخاب کرکے سلیقہ کے ساتھ شائع کیا ہے۔ ان کے لکھنے والوں میں تاثیر، راشد، شاد عارفی، عبدالمجید بھٹی، حفیظ جالندھری، میراجی، مسعود پرویز، قیوم نظر، احمد ندیم قاسمی، انجم رومانی، احتشام حسین، اختر الایمان، اسلام مچھلی شہری، مسعود قریشی، ماہر القادری، محمود جالندھری قابل ذکر ہیں۔

احساس کمتری

از شیر محمد اختر۔ ناشر مکتبہ اردو لاہور، صفحات ۶۴ قیمت ۸ر

اس چھوٹے سے رسالے میں مختلف انگریزی کتابوں سے استفادہ کرکے احساس کمتری کے متعلق مفید معلومات جمع کی گئی ہیں اور بڑی خوشی کی بات ہے کہ اس کتاب کے آخر میں ان انگریزی الفاظ کی فہرست بھی دیدی گئی ہے جن سے اس کی ترتیب میں فائدہ اٹھایا گیا ہے۔ اس کتاب کے مطالعہ سے انسان اپنی اہمیت سے واقف ہوسکتا ہے اور ان میں وہ خود اعتمادی پیدا ہوسکتی ہے جس کے بغیر کوئی شخص اپنی اس زندگی کی کشمکش میں کامیاب نہیں ہوسکتا۔

منتخب نظمیں

مرتبہ ادارۂ ادب لطیف لاہور صفحات (۸۰) قیمت ۱۲ر

اس مجموعہ میں ۱۹۴۲ء کی منتخب نظمیں یکجا کی گئی ہیں جن کی تعداد (۳۷) ہے۔ ابتدا میں ادارہ کی طرف سے ایک پیش لفظ لکھا گیا ہے۔ حیدرآباد کے شعراء میں صرف مخدوم محی الدین کی نظم "اندھیرا" منتخب کی گئی ہے۔ یہ مجموعہ قابل مطالعہ ہے اور اس سے اندازہ ہوسکتا ہے کہ ۱۹۴۲ء میں اردو شاعری کا کیا رنگ رہا۔

اسلامی پارٹی کا آئین

از عزیز ہندی ناشر اقبال اکیڈمی لاہور قیمت عہ صفحات (۱۰۰)

اس کتاب میں پیش لفظ اور دیباچہ کے بعد گیارہ فصلوں میں اصل موضوع کو منقسم کیا گیا ہے۔ پہلا باب اساسی معلومات کے لئے اور دوسرا باب پارٹی کی مرکزیت اور نظام بندی کے لئے وقف کیا گیا ہے۔ ساتواں باب بیت المال اسلامی سے بحث کرتا ہے۔ اس کتاب کے جملہ مباحث اس قابل ہیں کہ مستقبل کے ہندوستان کی نسبت جو لوگ غور و خوض کر رہے ہیں اس کا مطالعہ کریں اور نیز ملکی سیاسیات سے دلچسپی رکھنے والے اس کو مفید پائیں گے۔

اعلان

ادارۂ ادبیات اردو کے وفد نے ممالک محروسہ کے اضلاع کے جن مقامات کا دورہ کیا تھا اس کی مفصل رپورٹ مرتب ہوچکی ہے جو عنقریب شائع کی جائے گی۔

مہتمم

سو سال قبل کے حیدرآباد کی خبریں

(بسلسلۂ گزشتہ)

اخبار قران السعدین دہلی ۱۸۴۹ء

بملاحظہ مجمع الاخبار سے واضح ہوا کہ نواب شمس الامرا بہادر دیوان اعظم دولت آصفیہ نے صرف ایک ماہ کے عرصہ میں انفصال پرانے مقدمات کا بوجہ احسن کر دیا۔

خزانچیوں کو حکم ہے کہ فرد حساب داخل و خارج ایک ہفتہ میں تیار کر کے حضور میں گزرانیں اور مال گزاروں پر تاکید کہ جلد دو قسط ادا کریں ورنہ تبدیل علاقہ ہو جائیں گے اور ایسی ہی ہر کار گزار سے محاسبہ طلب ہے۔ صاحب حسین جمعدار جو تنخواہ ہزار سپاہی کی سرکار سے لیتا تھا باوجودیکہ ملازم کل چار سو آدمی تھے زیر مواخذہ ہے اور چھوٹے لال جو جعلی فہرست ملازمان رجمنٹ کی تیار کیا کرتے تھے اب عند التحقیق جھوٹے نکلے الغرض جمیع جعلسازوں کا قافیہ تنگ ہے اور دغابازوں کا سر بسر سنگ۔ ایک روز چند قرض خواہ مختار صاحب کی خدمت میں تقاضے کے لیے گئے حکم ہوا کہ ہنگام ملاحظہ دفاتر حساب کے زر واجبی بے تامل ادا کیا جاوے گا اور جن لوگوں نے مواضع سرکاری پر بغیر اجازت قبضہ کر لیا ہے ان سے بھی سمجھا جائے گا۔ ساہوکار اس جواب سے خوش ہوئے اور وہ لوگ جنھوں نے کچھ غبن کیا ہے سخت ہوناک۔ مشہور ہے کہ صاحب رزیڈنٹ بہادر حسن تدبیر نواب صاحب سے بہت راضی اور ہر طرح سے ان کے مددگار رہیں گے۔ چنانچہ ۲۳ ربیع الثانی ۱۲۶۵ھ کو دیوان صاحب مع دو صاحبزادوں کے بڑی دھوم اور تیاری سے صاحب رزیڈنٹ بہادر کی ملاقات کو گئے اور ان کی بڑی تواضع و تکریم ہوئی اور خوش خوش بعد رسم عطر و پان کے مراجعت کی۔ اور ۲۶ ماہ مذکور کو بتقریب جشن نوروز ارکین سلطنت اور منصبین دولت جمع ہوئے اور نذریں لائق حضور میں نظام الملک آصفجاہ کے گزرانیں۔ الحاصل ان دنوں میں وہاں ہر طرح چین و سکون امن و اماں ہے۔ از عمدۃ الاخبار

یکم مئی ۱۸۴۹ء

از روئے زبدۃ الاخبار کے واضح ہوتا ہے کہ ان دنوں رزیڈنٹ بہادر نے اس روپے کا تقاضہ جو بطور کنٹینجنٹ خزانہ سرکار کمپنی بہادر سے صرف ہوا تھا وہاں کے کار پردازان ریاست سے کیا ہے اور واسطے انفصال اس مقدمہ کے کپتان ڈیوڈسن صاحب بہادر کو وزیر اعظم جناب نواب شمس الامرا بہادر کے پاس بھیجا تھا چونکہ خزانہ میں روپیہ نہیں ہے اس واسطے نواب صاحب موصوف ادائی زر سرکاری میں نہایت متفکر ہیں۔ ان دنوں عملہ دفتر خانہ عالیہ نے کاغذات داخل و خارج ملک کے مرتب کر کے حضور میں گزرانے تھے۔ مگر جناب نواب صاحب ممدوح کے پسند خاطر نہ ہوئے اور بہت خفا اور درہم برہم ہو کر تمام ان کاغذات کو کہ کار سازی اور چالاکی متصدیان دفتر سے خالی نہ تھے سر دربار چاک کر ڈالا۔ متصدیاں خیانت کیش برسوں سے تغلب تصرف کرتے تھے اور حساب صاف نہ رکھتے تھے اب سخت گیری اور محاسبہ طلبی سے تنگ آ گئے ہیں اور جناب معلی القاب نواب سراج الملک بہادر کے عہد کو جن کے ایام دولت میں ان پر اس قدر تنگ گیری نہ تھی بہت یاد کرتے ہیں۔ نصیب خاں جمعدار افغانوں کو دربار کی آمد و رفت سے منع کر دیا ہے اور بڈھن خاں جمعدار نے نواب عالیجناب کی خدمت میں بہت تقرب پیدا کیا ہے اور ہر روز دربار میں حاضر رہتا ہے اور متوقع ترقی مدارج اور علو مراتب کا ہے۔

۲۲ مئی ۱۸۴۹ء

صاحب زبدۃ الاخبار ریل اپنے اخبار میں ارقام فرماتے ہیں

اندرونے خط آمدہ حیدرآباد کے معلوم ہوا کہ منشی دفتر رزیڈنٹی کے
بعلت حیلہ انگیزی اور افترا سازوں کے ماخوذ ہیں یہ بزرگوار
واسطے جلب ونافع اور اخذ مال کے کاغذات پر جعلی مہریں لگاکر
راجہ بالا پرشاد اور راجہ رام بخش اور عمدۃ الدولہ بہادر وغیرہ کے
پاس بھیجا کرتے تھے اور اس وسیلہ سے خوب ہاتھ رنگتے تھے مگر
اب ان عیاروں کا بہ سبب جاسوسوں کے بھید کھل گیا یعنی صاحب
رزیڈنٹ بہادر اس امر سے مطلع ہوا درکشف اس معاملہ کا فکر
آٹھ آدمیوں کو جو اس معاملہ میں شریک تھے بند مواخذہ میں
ڈالا تحقیقات اس مقدمہ کی درپیش ہے اگر جرم نشان مذکور
پر ثابت ہوا تو سخت عذاب میں گرفتار ہوں گے اور اپنے کیے کی
سزا بھگتیں گے اور نہیں تو جاسوس بہتان بندی کا مزا چکیں گے۔

۳۰ مئی ۱۸۴۹ء

ازروئے زبدۃ الاخبار کے واضح ہوتا ہے کہ ایک جماعت
سپاہیوں کی واسطے تقاضائے تنخواہ کے مستعد فتنہ وفساد ہوئی
نواب شمس الامرا وزیر الممالک بہادر نے اس سے پہلے کہ
فتنہ کی آگ شعلہ زن ہو سپاہیوں کو اپنے روبرو بلا کر تسلی وتشفی
کی اور فرمایا کہ اطمینان رکھو دو ماہ میں تم کو تنخواہ مل جائے گی۔
اس سبب سے سپاہیاں مطمئن ہوکر فتنہ وفساد سے باز رہے
ان دنوں نواب عالیجناب نے کسی سنار کو کسی علت
میں قید کا حکم دیا۔ حضرت بندگان عالی نے یہ حال سن کر
زبانی چوبدار کے کہلا بھیجا کہ زرگر بے گناہ ہے اسے چھوڑ دینا
چاہیے اور امتثال واطاعت فرمان واجب الاذعان میں
کسی طرح سے توقف اور ڈھیل نہ کرنی چاہیے۔ نواب معز الیہ
نے زبانی چوبدار کے عرض کر بھیجا کہ معاملہ زرگر کی تحقیقات کی جاتی
ہے اگر بے قصور ثابت ہوگا تو چھوڑ دیا جائے گا ورنہ بحالت
ثبوت جرم کے بموجب قانون عدالت وانصاف کے سزا اور
پاداش عمل کو پہنچے گا۔ جب یہ معروضہ زبانی چوبدار کے سمع
ہمایونی تک پہنچا خاطر ملکوت مناظر خدیو اس بات سے شخص
اور ترش ہوئی اور اوپر زبان کرامت ترجمان کے گذرا کہ عجب
ماجرا ہے کہ جو کوئی مرتبہ وزارت کو پہنچتا ہے طریق فرمان برداری
اور انقیاد وتابعداری کی نگاہ نہیں رکھتا اور امورات وکاروبار
اپنی مرضی کے موافق سرانجام دیتا ہے۔ جناب رزیڈنٹ بہادر
نے حضور پر نور میں لکھا ہے کہ محمد مقیم مرد ظالم وجفا کار ہے
اگر سرکار تعلقہ گلبرگہ کا اس کو سونپے گی ہاتھ اس جفا کار سے
رعایا انواع جور وجفا کھینچے گی مناسب کہ تعلقہ مذکور ایسے
شخص کے تفویض ہوئے کہ خدا ترس وحق شناس اور
کفایت شعار سرکار اور خیر خواہ رعیت کا ہو۔

۵ جون ۱۸۴۹ء

ازروئے زبدۃ الاخبار کے واضح ہوتا ہے کہ ان دنوں
میں ساہوکاروں نے زر قرضہ کے واسطے در دولت سلطانی
پر استغاثہ اور واویلا مچایا۔ حضرت بندگان عالی نے ان کو
بہت تسلی اور تشفی دی اور فرمایا کہ دو ماہ اور صبر کرو اس
عرصے میں تدبیر ادائی قرضہ کی جائے گی۔ اہل فوج رات دن
در دولت پر حاضر ہوکر تقاضہ تنخواہ کا کرتے رہیں۔ نواب شمس الامرا
بہادر تدبیر زر میں مصروف ہیں۔ محمد مقیم کو تعلقہ گلبرگہ ہزار جان سے
خواہاں اس کا تھا موافق ہدایت رزیڈنٹ بہادر کی عنایت نہ
ہوا۔ ناچار مایوس ہوکر شمس آباد کو چلا گیا۔ ۱۱ جون ۱۸۴۹ء

صاحب زبدۃ الاخبار کو ایک خط آمدہ حیدرآباد مورخہ ۲۲
رجب المرجب سے واضح ہوا کہ نواب وزیر الممالک شمس الامرا بہادر
نے بموجب ارشاد صاحب رزیڈنٹ بہادر کے جمعدار اعلیٰ روہیلہ کو

فرمایا کہ تم حیدرآباد سے نکل جاؤ۔ در جواب اس کے جمعداروں نے عرض کیا کہ باسٹھ لاکھ روپے ہمارے بطور قرض امرائے نامور حیدرآباد کی سرکار میں لینا چاہتے ہیں۔ جب تک نہ ملے گا ایک آدمی بھی حیدرآباد سے قدم باہر نہ رکھ سکے گا۔ نواب صاحب نے یہ سن کر برہم ہوئے اور عبداللہ بن علی جمعدار کو فرمایا اپنے سپاہیوں لیکر روہیلوں کو شہر بدر کردو۔ عبداللہ مذکور نے عرض کیا کہ اول ان کا قرض واجب الدین ادا کیا جائے۔ بعد اس کے ان کو کوئی عذر نہ رہے گا۔ ایک آن میں نکال دیے جائیں گے یہ سن کر نواب صاحب خاموش ہوئے اور دوبارہ ان کو نکال دینے میں کوئی اصرار نہ کیا۔

ان دنوں منجملہ تنخواہ دو سال تین ماہ کی سپاہیوں کو تقسیم ہوئی۔ پچپن لاکھ روپے سرکار انگریزی کو بابتہ سپاہ کنٹنجنٹ کے سرکار حیدرآباد سے لینا ہے اور پندرہ لاکھ روپے سال کی قسط مقرر ہوگئی ہے چنانچہ نواب صاحب نے بہزار جد و جہد قسط اول سرکاری خزانہ میں داخل کئے۔

عزیز و اقارب حضرت بندگان عالی کے سالہائے دراز سے بسبب نہ پانے مرسوم معینہ کے کمال تکلیف میں ہیں اور اسی سبب سے بعضوں نے ارادہ ترک وطن مصمم کیا ہے۔

در ینولا فیما بین فرزندان نواب وزیر الممالک بہادر کے کمال بے اتفاقی واقع ہوگئی ہے۔ خدا جانے کہ اس نااتفاقی کا انجام کیا ہوگا۔

منصبداروں نے تنخواہ کے واسطے عرضداشت نواب صاحب کے حضور میں گذرانی حکم ہوا کہ تنخواہ ایام دیوانی راجہ رام بخش اور نواب سراج الملک بہادر سے نا امیدی اور پہلے وقت کی نوکری پانے سے بالکل مطمئن رہو۔

، ر جولائی ۱۸۴۹ء

وہاں کا حال جو از روئے زبدۃ الاخبار کے دریافت ہوا۔ مختصر یہ ہے کہ وزیر الممالک نواب شمس الامراء بہادر سے باوجود اتنی مدت کے کچھ انتظام اور بندوبست اس ریاست کا نہیں ہوا اور سوائے اس کے چند بار بجا آوری احکام عالی ریاست سے پہلو تہی کی۔ اس واسطے نواب نظام الملک بہادر ان سے ملول ہیں شاید ایسا معلوم ہوتا ہے کہ یہ عہدہ پھر نواب سراج الملک بہادر کے نامزد ہو۔ زبان زد اہل دربار ہے کہ صاحب رزیڈنٹ بہادر سے حضور بندگان عالی بیچ مقرر کرنے مختار کے پھر کچھ صلاح و مشورہ فرماویں گے۔

، راگست ۱۸۴۹ء

زبدۃ الاخبار مورخہ ۱۰ اگست ۱۸۴۹ء مندرج ہے کہ حضرت بندگان عالی بہ رسم سیر و شکار سرور نگر کو تشریف فرما ہوئے ہیں اور امیر کبیر نواب شمس الامراء بھی ہمرکاب ہیں۔ جو کہ خاطر بندگان عالی بسبب اختلاف رائے کے وزیر الممالک سے کچھ مکدر ہے جس وقت نواب ممدوح باریاب ملازمت ہوتے ہیں آثار غبار و ملال کے پیشانی بندگان عالی سے معائنہ کرتے ہیں ایک دن موقع پاکر خلوت میں عرض کیا کہ فدوی کمترین فرمان پذیروں بارگاہ عالی اور پروردہ نعمت قدیم اس خاندان جلیل الشان کا ہے جس دن سے خدمت دیوانی پر مامور ہوا ہوں حتی الوسع نظم و نسق معاملات سلطنت میں سعی و کوشش کرتا ہوں اور بصد جان خواہاں اس امر کا ہوں کہ کاروبار مملکت اچھی طرح سے اور موافق آرزو اعیان دولت کے ظاہر ہوئیں اور بعض معاملات جو میں کہ برخلاف مرضی مقدس کے عمل میں آئے از راہ عزل و انحراف کے نہیں بلکہ اندیشہ کمال دولت خواہی اور خیر اندیشی کے ہے جو مزاج مقدس کو مکدر اور پر غبار دیکھتا ہوں۔ جان اور عزت و آبرو سے اپنی ترساں و لرزاں ہوں اور اس خدمت سے استعفیٰ چاہتا ہوں آپ جس کو لائق دیکھیں خلعت دیوانی سے سرفراز فرماویں۔

حضور پرنور نے یہ سن کر تبسم کیا اور کلمات تسلی آیات زبان پر لاکر یہ ارشاد فرمایا کہ آیندہ ہیچ سرانجام کسی امر کہ امور جزوی اور کلی سلطنت سے بغیر رضامندی ابد دولت کے سبقت و کرنی چاہیے اور خود پسندی اور خود رائی سے کہ بدترین افعال ہے بچی پرہیز رہنا چاہیے۔ یہ کہہ کر دار الحکومت کی طرف رخصت فرمایا نواب عالیجناب آداب تسلیمات بجالاکر مرخص ہوئے اور باتفاق رشید الدین خاں بہادر کے سرو رنگر سے روئے عزیمت کا طرف حیدر آباد کے لائے اور حضرت بندگان عالی بڑے فرزند نواب صاحب کو ہمراہ لیکر شکارگاہ کی طرف رونق افروز ہوئے۔ ۱۳ اگست ۱۸۲۹ء

از روئے زبدۃ الاخبار واضح ہوا کہ حضرت بندگان عالی نے مرتضیٰ پور و مدیا پور محلات جاگیر نواب سراج الملک بہادر کو جو بعد معزولی نواب ممدوح کے ضبط ہوا تھا از سر نو نواب صاحب کو مرحمت فرمایا اور رقعہ صاحب رزیڈنٹ بہادر کا جواب طلب تھا۔ ہمراہ رشید الملک کے واسطے تحریر مسودہ جواب نواب صاحب کے پاس بھیجا۔ نواب عالی القاب نے فی الفور بہ قوت عقل صواب اندیش اور فکر مصلحت گزیں کے مسودہ جواب رقعہ کا مضامین شایستہ درست کرکے حوالہ رشید الملک بہادر کے فرمایا بعد ملاحظہ مضامین اس کے موافق مرضیٔ مقدس کے تھے۔ اوپر ہر فقرہ اس کے لئے نہایت تحسین و آفرین فرمائے۔ بہ ظہور ایسی عنایات کے سب اہل دربار و ارکان دولت کو ثابت ہوا ہے کہ عنقریب قلمدان وزارت کا نواب منیر الملک کو عنایت ہو۔ سب چھوٹے بڑے دعا مانگتے ہیں کہ خدا کرے مسند وزارت دوبارہ بوجود فیض آمود جناب محتشم الیہ کے رونق تازہ و زینت بے اندازہ حاصل کرے۔

۳ ستمبر ۱۸۲۹ء

از خط حیدر آباد دکن مرقومہ بست و نہم شہر شوال المکرم ۱۲۴۵ھ

بہ ہمدریں ہفتہ نزد راقم ایں اخبار رسیدہ چناں واضح و لائح

گردیدہ کہ بتاریخ مذکور بہ سبب شدت باد و باراں آب رودخانہ چنان رو بہ طغیان آورد کہ آب از سر پل گزشتہ اندرون شہر رسید و در سیگم بازار و بازار نگاگنسی میاں و در بعضے جا آب تا بکمر و در بعضے جا تا بہ زانو بود و کوٹھی کپتان وپی سنگھ صاحب کہ کرسی بلند دارد آب سیل تا پائے زینۂ اول رسیدہ بود صاحب موصوف کہ بجائے رفتہ بودند چوں مراجعت کردند نتوانند کہ اسپ سوارہ بہ کوٹھی داخل شوند زیرا کہ ہمہ احاطہ کوٹھی پر آب بود و مثل بحر مواج می نمود فی الجملہ فیل کوہ پیکر را حاضر آوردند تا بر آں سوار شدہ داخل کوٹھی شدند ہزاراں عمارات بلند از پا در افتاد و بہ سبب در آمدن آب اندروں دوکان ہا اہل بازار را زیان عظیم رو داده گویند کہ مال و متاع چندیں لک روپے تباہ شدہ فی الجملہ ایں چنیں طغیانی آب کہ یاد از طوفان نوح میداد در زمان پیشین در آں دیار گاہی رو ندادہ بود۔ و بتاریخ سیزدہم ماہ گزشتہ راجہ رام بخش بہادر از پیشگاہ عواطف حضرت بندگان عالی دام ملکہ بہ خلعت وکالت و پیشکاری مخلع شدہ فرق شرف و افتخار بر فرق فرقداں رسانیدند۔ از زبدۃ الاخبار ۱۶ اکتوبر ۱۸۲۹ء

از زبدۃ الاخبار مطبوعہ دوم نومبر چناں بہ وضوح پیوستہ کہ راجہ رام بخش بہادر اگرچہ بہ منصب وزارت مامور شدہ مہمات دیوانی بانجام می رسانند اما بر استقلال منصب مذکور اعتماد کلی ندارند زیرا کہ حضرت بندگان عالی دام ملکہ بر حال راجہ موصوف التفات کمتر مبذول می فرمایند و ہمگی ہمت والا نہمت بر آں مصروف است کہ چناں تدبیری بکار رود کہ نواب سراج الملک بہادر مجدداً متکفل سرانجام مہام وزارت شوند و اگر نواب ممدوح از ایجاب آں منصب جلیلہ پہلو تہی کنند در آں حالت خلعت وزارت بہ خلعت اکبر نواب شمس الامراء بہادر عنایت مانند فی

فرمایند۔ وزیر حال بسبب استقلالی خود نظر کردہ بہ مشیت مہمات ریاست بدل مشغول و متوجہ نمی شود و تعلقہ داران و ساہوکاران نیز بسبب بے ثباتی وزیر نظر کردہ از معاملات وادوستد دست کشیدہ اند فی الجملہ دریں روزہا وزارت آں سرکار عظمت مدار چوں سایہ دیوار است کہ یک سو و یک جانب سکون قرار ندارد ودیولا راجہ رام بخش بہادر از ساہوکاراں پنج لک روپیہ قرض خواستند تا سپاہ کنٹنجنٹ را تنخواہ دہند ساہوکاراں بہ قرض دادن راضی نہ شدند از بہر آنکہ بر استقلال وزیر مطمئن نہ بودہ اند۔ نواب شمس الامرا بہادر ہنوز در کشمکش مطالبہ زرد ندمانہ سرکار مبتلا اند زر در کیسہ ندارند کہ داخل خزانہ عامرہ کنند۔

۶ نومبر ۱۸۴۹ء

بتاریخ دہم نومبر جناب صاحب رزیڈنٹ بہادر باتفاق ڈیوڈسن صاحب بہ دربار رونق بخش شدہ دربابِ مصالح مملکت در خلوت تا یک ساعت کامل مشورت ہا کردند اما احدی را از اعیان و ارکان دربار آگہی نہ شد کہ چہ حکایت ہا درمیان ماندا اما بقراین و آثار معلوم شدہ کہ از طرف گورنمنٹ قدغن بلیغ است کہ قلمدان وزارت بہ کسی تفویض شود کہ خردمند و عاقل و امین و آگاہ دل باشد تا از رائے جہاں پیرایش امورات ملک و دولت و مہمات سلطنت نظم و نسق شائستہ پذیرد و از تدابیر صائبہ اش فتنہ و آشوب سر بہ بالیں عدم نہد و رعایا و برایا در عہد امن و آسایش بہ غنوند فی الجملہ بر ہمہ اعیان و ارکان دربار ثابت و متحقق است کہ خوشنودی ارباب گورنمنٹ در آن است کہ نواب سراج الملک بہادر مجدداً بر مسند وزارت تمکن فرمایند کہ اخلاق ستودہ و صفات پسندیدۂ او چوں آفتاب عالم تاب بر گورنمنٹ ظاہر و آشکار شدہ گویند کہ حضرت بندگان عالی نیز بدل میخواہند کہ نواب ممدوح منصب وزارت را اختیار فرمایند گر نواب بہ نظر بعضے رسم و آئین مروج آں ریاست کہ ثمرہ فسادی دہد از اقبال آں امر خطیر پہلو تہی می فرمایند پس صلاح ملک و دولت در آنست کہ حضرت بندگان عالی معظم الملک اول آئین تازہ کہ مثمر فوائد شد نافذ فرمایند آنگاہ خردمندان کار آگاہ در ابر مناصب بزرگ منصوب و مامور گردانند تا جملہ مہام بر قاعدہ انتظام سمت امضا پذیرد و برہمی و ابتری ہا رفع شود۔

از زبدۃ الاخبار۔ ۳ دسمبر ۱۸۴۹ء

سنہ ۱۸۵۲ء

واضح ہوتا ہے کہ منجملہ قرضہ سرکار دولت مدار کمپنی بہادر کے چھالیس لاکھ روپے باقی تھے اس میں سے دس لاکھ روپے اور خزانہ رزیڈنسی میں داخل ہوئے اور تیس لاکھ روپے باقی ہے اس کی۔ ادائی کی تدبیر بھی عمل میں آتی ہے انشاء اللہ وہ بھی حسن سعی و تدابیر وزیر اعظم سے جلد ادا ہوجائے گا اعیان گورنمنٹ کہ عوض زر قرضہ کے دعویٰ لینے صوبہ برار کا رکھتے تھے اب اس دعوی سے دست بردار ہوئے ہیں کیونکہ بہت سا روپیہ وصول ہوگیا ہے اور جو کچھ باقی ہے وہ بھی عنقریب میں ادا ہوجائے گا۔ ۲۷ جنوری ۱۸۵۲ء

اخبارات سے واضح ہوا کہ نواب نظام الملک نے اب تک صرف چھ لاکھ قیمت جواہرات سے ادا کئے اور باقی اب تک نہیں ادا کئے اور نواب گورنر جنرل بہادر کا حکم ہو کہ کل روپیہ بے باق ہوجائے اور کہتے ہیں کہ وہ الماس جو نواب صاحب نے خزانہ سے نکالا ہے: وہ پچھتر لاکھ روپے کا قیمتی ہے مگر بہ سبب ناتراشیدہ ہونے کے اس کی قیمت

ہنوز قرار نہیں پائی۔ بازار میں فروخت کے لئے بھیجا گیا ساہوکاروں نے اس کی خریدی میں تامل کرتے ہیں شاید اس کی قیمت سے زرِ قرضہ سرکار کا ادا ہو جائے۔ الّا ریاستِ حیدرآباد بہت مقروض ہو گئی ہے اور فوج کی تنخواہ مدت سے باقیات میں ہے حتیٰ کہ اب تین برس کی تنخواہ دینی ہے اور تعلقدار محاصل پیشگی دینے سے انکار کرتے ہیں اور سب کار خانہ ساہوکاروں کے اختیار میں ہے۔ کہ وہ خاطر خواہ منافع اٹھاتے ہیں اور ملک میں قلتِ زر سے خرابی عائد ہے۔ نواب صاحب نے سابق میں ارادہ کیا تھا کہ تیس لاکھ روپے خزانہ خاص سے نکال کر دیا جائے۔ الّا یہ امر ظہور میں نہ آیا۔

۱؍ مارچ سنہ ۱۸۵۲ء

وہاں کی چٹھیات تازہ وارد سے واضح ہوتا ہے کہ ایک گروہ عربوں اور روہیلوں کا آپس میں لڑ رہے ہیں اور انھوں نے نواح مومن آباد میں دست غارت بھی دراز کر رکھا ہے ابھی حال مفصل باعث فساد انگیزی اقوام مذکورین کا معلوم نہیں ہوا۔ لیکن یہ موجب تعجب ہے کہ نیاز گنج ... نواب نظام الملک بہادر کیوں اس فساد کے روکنے کے لئے امور نہیں کئے۔ کیونکہ چٹھیات مذکور میں کچھ حال مداخلت سپاہ مذکور کا نہیں لکھا ہے۔

۹؍ مارچ سنہ ۱۸۵۲ء

اخبار انگلش مین سے معلوم ہوا کہ نواب نظام الملک بہادر نے منجملہ متروکہ اکبر جاہ اپنے چچا سے دس لاکھ روپے وزیر کو دیئے اور وزیر نے زر مذکور کو بہ عوض قرضہ سرکار کمپنی حوالہ رزیڈنٹ بہادر کیا۔

۲۳؍ مارچ سنہ ۱۸۵۲ء

۳ اخبارات سے دریافت ہوتا ہے گزشتہ دنوں میں درمیان مردمان سراج الملک بہادر وزیر ریاست اور پٹھانوں کے معرکہ سخت ہوا اور وزیر کے رخسار پر ایک زخم گولی بندوق کا لگا۔

۲۰؍ اپریل سنہ ۱۸۵۲ء

واضح ہوتا ہے کہ زخم گولی کا جو کہ چہرۂ مبارک جناب وزیر اعظم نواب سراج الملک بہادر پر لگا تھا معالجہ طبیبان کامل فن سے بھر گیا اور اس حسن خدمت کے صلہ میں طبیبوں کو بہت انعام مرحمت ہوا اور پیشگاہ حضرت بندگان عالی سے یہ حکم صادر ہوا کہ روہیلوں کو جو کہ نہایت مفسد اور فتنہ انگیز ہیں جس جگہ پائیں ان کو ماریں اور تمام ممالک محروسہ میں سے خارج کر دیں چنانچہ بموجب حکم فوج کنٹنجنٹ ان مفسدوں کی گرفتاری اور تنبیہ کے لئے مامور ہوئی۔ اور قلع قمع میں مصروف ہے اور ان کو قلعوں میں بند کر کے ملجا و ماوا کے منہدم کرنے میں سرگرم رہتے ہیں۔

۱۱؍ مئی سنہ ۱۸۵۲ء

مہتمم صاحب اخبار آگرہ بموجب خط مقام مذکور کے رقم فرماتے ہیں کہ نواب عالیجناب معلی القاب وزیر اعظم نواب سراج الملک بہادر نے زر قرضہ کی ادائی کے واسطے سرکار دولت مدار کمپنی بہادر کے یہ تدبیر کئے ہیں کہ زمینداران مالگزاری اور تعلقداران والا اقتدار اور امرائے نامدار اور بزرگان والا تبار سے قدیم الایام سے نمک پروردہ سرکار عالی مقدار حیدرآباد ہیں موافق وسعت اور مقدار ہر ایک کی زر خطیر بطریق توجیہ جمع کر کے داخل خزانہ مذید مُنسی کریں تاکہ تقاضائے شدید سے نجات حاصل ہو۔ چنانچہ اسی قرارداد پر پندرہ لاکھ روپیہ جناب نواب مستطاب امیر کبیر نواب شمس الامرا بہادر سے بھی طلب کئے ہیں اور

نواب ممدوح اس قدر زرِ خطیر کے دینے میں عذرات درمیان لائے ہیں اور نہایت درہم اور برہم ہوکر آمدورفت دربار حضرت بندگان عالی سے پہلو تہی کیا ہے اور یہ بات خاطر مبارک حضرت بندگان عالی پر بہت دشوار اور ناگوار ہے۔

۱۷ مئی سنہ ۱۸۵۲ء

نواب سراج الملک بہادر نے یہ تجویز کی ہے کہ سرکار انگریز سب ملک اپنے قبضے میں چند روز کے واسطے کرے اور اس میں سے جو خراج حاصل ہو آپ لیں تاوقتیکہ زرِ قرضہ سرکار ادا ہوجاوے۔ مگر یہ تجویز وزیر کی نظام الملک کی منظوری سے نہیں ہے اخبار سکیٹیٹر کا مہتمم اس تدبیر کو اچھا لکھتا ہے اس واسطے کہ اس کی رائے میں یہ بات بہت اچھی ہے اور اس میں انصاف اور رحم بھی ہے کہ سارا ملک قبضہ سرکار انگریزی میں آجائے اور تمام ملک کو نفع حکومت سرکار انگریزی سے حاصل ہو اور اگر سرکار انگریزی کچھ تھوڑا سا ملک لے لیں گے تو یہ بات نامناسب ہے اس واسطے کہ جو ملک سرکار انگریزی کے تحت میں آجاوے گا وہ تو آسودہ اور خوش رہے گا باقی جو نظام الملک کے پاس رہے گا وہ ویسی ہی مصیبت میں رہے گا۔ نظر بریں یہ بات بہت اچھی ہے کہ اگر نفع ہو تو سب ملک کو ایک بار ہو ورنہ کہ ایک جگہ آرام ہو اور دوسری جگہ کے لوگ ویسی ہی تکلیف میں رہیں جیسی کہ اب ان پر ہے صاحب اخبار کے نامئندہ اس بارے میں یوں لکھتے ہیں کہ اگر سرکار انگریز کا یہ ارادہ ہے کہ تھوڑا سا ملک لے لیں تو یہ تجویز وزیر کی جس کو صاحب اسپکٹیٹر لکھتے ہیں لائق پذیرائی ہے۔

۱۵ جون سنہ ۱۸۵۲ء

ایک سپارڈنٹ صاحب مقام مذکور سے لکھتا ہے کہ سپاہ کنٹیجنٹ کو ان کے مطالبہ میں سے ابھی کچھ نہیں ملا ہے مگر سنا جاتا ہے کہ ایک مہینے کی تنخواہ کی ہنڈیاں آگئی ہیں۔ راقم صاحب لکھتے ہیں کہ ایک فوج جس کی آٹھ مہینے کی تنخواہ باقی ہے اس سے وفاداری کی توقع نہیں ہو سکتی اور

علاوہ اس کے اکثر شکایات بھی اس طرف کی تحریرات سے ہویدا ہیں اگرچہ وزیر سلطنت اپنی طرف سے تدبیر اور کوشش کرتے ہیں لیکن روپے کا کام روپے ہی سے نکلتا ہے۔

۲۲ر جون ۱۸۵۱ء

سال گزشتہ افواہ سنا جاتا تھا اور اکثر اخبارات کے انگریزی اور فارسی میں تھے دیکھا گیا تھا کہ اعیان گورنمنٹ اپنے زر قرضہ کے عوض سرکار دولت مدار حیدر آباد پر واجب الادا ہے اس ریاست میں سے کچھ ملک مانگتے ہیں چنانچہ اس بات کے سننے سے حضرت بندگان عالی نے بہت تشویش اور متردد ہو کر ارکان دولت کو نہایت تاکید کی کہ جس طرح زر قرضہ سرکار انگریزی کا ادا ہو اس میں بہت کوشش کریں چنانچہ حسن سعی نواب سراج الملک بہادر سے قریب نصف زر قرضہ سرکار انگریزوں کے داخل خزانہ رزیڈنسی ہو گیا اور بعد اس کے تقاضا لینے ملک کا فرو ہو گیا اب کہا جاتا ہے بقیہ زر قرضہ میں وقت معہود سے زیادہ دیر ہو گئی۔ پھر خبر لینے ملک کی سنی جاتی ہے۔ یقین ہے کہ اس دفعہ بھی نواب صاحب ممدوح کی کوشش سے کچھ روپے ادا ہو جائیں۔ اور تقاضائے سخت سے نجات حاصل ہو۔ ۱۴ر جولائی ۱۸۵۲ء

واضح ہوا کہ سرکاری ڈیوڑھی پر دو سپاہیوں میں تکرار ہوئی اور حرب و ضرب میں ایک مارا گیا ایک قرض خواہ اپنے قرض دار کو پکڑ کر گھر لے گیا اور چونکہ یہ شخص کہ بضرب المثل تھا قرض دار نے موقع وقت پا کر اول اپنے قرض خواہ کو قتل کیا اور پھر آپ گلا کاٹ کر مر گیا۔ صالح محمد خاں نے تین سو روہیلوں کو لیکر ایک بازار کا راستہ بند کر دیا اور بزور اپنی باقی شدہ تنخواہ طلب کرنے لگا آخر کار اقراروں سے راضی کر کے راستہ کھلوا دیا گیا مگر وہ ابھی جھگڑا فساد سے باز نہیں آتا۔ اور نواب نظام الملک بہادر نے روپے بابت تنخواہ فوج کنٹینجنٹ کے تمام و کمال ادا نہیں کئے ہیں اور بچشم ظاہر اس کا ادا ہو جانا مشکل معلوم ہوتا ہے۔

۲۴ر اگست ۱۸۵۲ء

حیدر آباد کی خبر بذریعہ دہلی گزٹ یوں تحریر کرتا ہے کہ آٹھ مہینے کی تنخواہ کل فوج کی باقی ہے اور قرض ملنے کا یہ حال ہے کہ سرداروں کو پندرہ ۱۵ روپے فیصد سود سے کم نہیں ملتا اور سپاہیوں کو چوبیس ۲۴ روپے فیصد سے کم نہیں ملتا بلکہ سپاہیوں کی تنگی کا یہ حال ہے کہ جن کے ہاں دو بیویاں ہیں ایک کو بطمع چند پیسوں کے اوروں کی خدمت کے واسطے بھیجتے ہیں۔ اور یہ خبر کو صاحب رزیڈنٹ بہادر نے سن کر بہت افسوس کیا اور رپورٹ اس کے نواب گورنر جنرل بہادر کی خدمت میں بھیجی ہے۔ ۱۲ر اکتوبر ۱۸۵۲ء

ادارے کی خبریں

اردو امتحانات

ادارۂ ادبیات اردو کے اردو امتحانات ۱۰ تا ۱۲ مہر مطابق ۱۵ تا ۱۷ اگست ۱۹۴۳ء گذشتہ سالوں کی طرح بلدہ حیدرآباد کے مراکز ذکور و نسواں کے علاوہ مختلف اضلاع میں بھی لئے جائیں گے۔ شرکت کی فیس اور درخواستیں ۵ امرداد مطابق ۱۰ جون تک دفتر ادارہ پر مکمل خانہ پری کے بعد وصول ہونی چاہئیں۔ جس مقام سے ۲۵ سے زیادہ امیدوار شریک ہوں گے اس کو امتحانات کا مرکز قرار دیا جائے گا بشرطیکہ مجلس انتظامی کی نظر میں وہاں مرکز کا اطمینان بخش انتظام ہو سکے۔ امیدوار انفرادی طور پر درخواستیں روانہ کرنا چاہیں راست دفتر کو بھیج دیں۔ کسی شاخ یا مرکز کا توسط لازمی نہیں ہے۔ سال حال میسور اور بنگلور کے علاوہ ایوت محل اور کھام گاؤں (برار) سے بھی کافی تعداد میں امیدوار شریک ہو رہے ہیں۔

گذشتہ سال کے جن کامیاب امیدواروں کو اپنے مرکز یا شاخ سے اب تک سندیں وصول نہیں ہوئی ہیں وہ بھی دفتر کو اطلاع دیں تاکہ اسناد کی تقسیم کا انتظام کیا جائے۔

مجلس انتظامی

ادارۂ ادبیات اردو کی مجلس انتظامی کا اجلاس پنجشنبہ ۲۲ اپریل ۱۹۴۳ء شام کے چھ بجے دفتر ادارہ میں منعقد ہوا۔ مولوی محمد لیاقت اللہ خاں صاحب ایچ سی ایس نے صدارت اور حسب ذیل ارکان نے شرکت فرمائی۔

مولوی خواجہ معین الدین صاحب انصاری ایچ سی ایس معتمد سیاسیات
" سید محمد اعظم صاحب ایم اے بی ایس سی آنرز ناظم تعلیمات
" سید علی اکبر صاحب ایم اے معتمد تعلیم صنعت و حرفت
" عبدالمجید صاحب صدیقی ایم اے ایل ایل بی استاد تاریخ جامعہ عثمانیہ
" عبدالقادر صاحب سروری صدر شعبۂ اردو جامعۂ میسور
ڈاکٹر سید محی الدین قادری زور معتمد اعزازی ادارہ

مولوی نصیر الدین صاحب ہاشمی اور مولوی عبدالقادر صاحب صدیقی نے اپنی عدم شرکت کے بارے میں کوئی اطلاع نہیں دی۔

حسب ذیل امور طے پائے۔

۱۔ گذشتہ اجلاس کی روئداد پڑھ کر سنائی گئی اور اس کی توثیق عمل میں آئی۔

۲۔ قلعہ گولکنڈہ میں نمائش گھر کے لئے پٹہ پر زمین لینے کے لئے معاہدے کی تکمیل منظور کی گئی۔

۳۔ گذشتہ مجلس انتظامی کے بعد سے ادارے کی جو شاخیں حسب ذیل مقامات پر قائم ہوگئیں اور جن کا اجازت نامہ معتمد نے منجانب ادارہ روانہ کیا تھا ان کے قیام کی منظوری کی توثیق کی گئی۔

۱۔ بلولی ۲۔ داور واڑی ۳۔ داور واڑی نسواں ۴۔ ہنگولی نسواں۔ ۵۔ گدوال ۶۔ رائچور ۷۔ بسمت نگر ۸۔ فتح آباد ۹۔ ناماپن کیٹر ۱۰۔ بیڑ ۱۱۔ کھام گاؤں ۱۲۔ ایوت محل ۱۳۔ میسور۔

ب۔ مولوی سید علی اکبر صاحب نے تحریک فرمائی کہ مرکزی دفتر کا کام کم کرنے کے لئے مناسب ہے کہ ہر صوبے کی شاخوں کو قریبی بڑے مقام کی شاخ کے ماتحت قرار دیا جائے تاکہ وہ مرکزی ادارہ کے مسلک اور قواعد و ضوابط کے مطابق عمل پیرا رہیں لیکن ذیلی امور میں اپنی سمت کی صدر شاخ سے مراسلت رکھیں اور مشورہ کرتے رہیں۔

طے پایا کہ اس تحریک پر آئندہ شاخوں کے مزید اضافے کی صورت میں غور کیا جائے گا۔

۴۔ شعبۂ سائنس کی معتمدی پر پروفیسر محمد سعید الدین صاحب صدر شعبۂ نباتیات جامعہ عثمانیہ کے انتخاب کی توثیق کی گئی۔

۵۔ شعبۂ شعراء و مصنفین کی حسب ذیل سفارش پر غور کیا گیا۔

- موجودہ معتمد شعبہ نے اپنی دیگر مصروفیات نیز پروفیسر

سوری صاحب کے میسور جانے کی وجہ سے شعبۂ امتحانات کی پوری ذمہ داری کے باعث اس شعبہ کی معتمدی کے لئے اپنی بجائے مولوی نصیر الدین صاحب ہاشمی کو معتمد منتخب کرنے کی تحریک کی جس کو جلسہ نے منظور کیا۔ طے پایا کہ فی الحال حسب سابق مولوی سید محمد صاحب ہی اس شعبہ کی معتمدی کے فرائض انجام دیں۔

۶۔ مولوی سید علی اکبر صاحب نے تین سال سے زیادہ عرصہ ہونے کی وجہ سے صدارت مجلس اردو امتحانات سے سبکدوشی کی جو تحریری خواہش ظاہر کی تھی اس کو پیش کیا گیا اور پوری مجلس کے اصرار پر صاحب موصوف نے بحیثیت صدر مجلس امتحانات اس شرط پر کام کرنے کی رضامندی ظاہر کی کہ آئندہ سے جلسہ تقسیم اسناد کی شکل بدل دی جائے اور سالانہ روئداد مولوی محمد لیاقت اللہ خاں صاحب بحیثیت نائب صدر ادارہ پڑھیں۔

۷۔ محترمہ سکینہ بیگم صاحبہ معتمد شعبۂ نسواں کی تحریک کہ "ادارے کی رکنیت الف کا چندہ بجائے ۱۰ کے ۸ روپئے کر دیا جائے اور ارکان کو ادارے کا ترجمان سب رس مفت دیا جائے۔ اسی طرح رکنیت (ب) کا چندہ بجائے ۳ کے ۴ کر دیا جائے اور ایسے ارکان کو بچوں کا سب رس مفت دیا جائے" پیش کی گئی۔ بعد غور و خوض جناب صدر صاحب اجلاس کی یہ تجویز منظور ہوئی کہ دونوں قسم کے ارکان سے اس بارے میں معلومات حاصل کرلئے جائیں کہ آیا ان کو اس قسم کی تبدیلی منظور ہے۔

۸۔ گذشتہ کارروائی مورخہ ۱۰ دسمبر ۱۹۴۲ء بابت انتخاب رفقاء کی توثیق کی گئی۔

۹۔ حسب ذیل کتب کے مسودے پیش ہوئے ادارہ ان کے متعلق مناسب تصفیے کئے گئے۔

۱۔ تاثرات سفر یورپ از پروفیسر ہارون خاں شروانی ایم اے بیرسٹر۔

۲۔ کائناتی طبیعیات از پروفیسر محمد علی خاں صاحب اے آر سی ایس (لندن)

۳۔ تاریخ ادب عربی از مولوی سید ابو الفضل صاحب ایم اے

۴۔ رسالہ جات رنگ کاری، تصویر سازی، کشیدہ کاری، ابتدائی مشاغل [illegible] از مولوی امجد علی صاحب۔

۱۰۔ ادارہ اور اردو امتحانات کی رجسٹری کے متعلق طے پایا کہ معتمد ادارہ نواب عسکر یار جنگ بہادر کے مشورے کے بعد حسب ضرورت انتظام کریں۔

۱۱۔ ادارے کے لئے ایک علاحدہ عمارت کی فراہمی کے سلسلہ میں مجلس عمارت منعقدہ ۱۴ اپریل ۱۹۴۳ء کے تصفیے بغرض اطلاع پیش کئے گئے۔ اور جملہ ارکان نے مجلس عمارت کی تجویز بالا کو پسند کیا۔

گزشتہ سال کی خدمات پر رسالۂ معارف کی رائے

دار المصنفین اعظم گڑھ کے مشہور مجلۂ معارف نے اپنے شمارے بابت ماہ اپریل میں کتاب ادارۂ ادبیات اردو ۱۹۴۳ء پر تبصرہ کرتے ہوئے لکھا ہے کہ

"ادارۂ ادبیات اردو حیدرآباد نے اپنی دس سالہ عمر میں مختلف حیثیتوں سے اردو زبان کی جو خدمت انجام دی ہے وہ اسکے دوسرے نوعمر اداروں کے لئے سبق آموز نمونہ ہے۔ اردو کی اشاعت و ترقی کے اتنے وسائل کسی ادارہ نے اختیار نہیں کئے۔ مذکورہ بالا کتاب ادارۂ مذکور کی ۱۹۴۲ء کی کارگزاریوں کی روئداد ہے جس سے اس کی خدمت کی وسعت و ہمہ گیری کا اندازہ ہوتا ہے"

مجلس اردو امتحانات

اردو امتحانات ادارۂ ادبیات اردو کی مجلس انتظامی کا اجلاس بتاریخ ۲۶ اپریل ۱۹۴۳ء بصدارت عالیجناب مولوی سید علی اکبر صاحب ایم اے کینٹب معتمد نظامت تعلیمات سرکار عالی میں صبح کے دس بجے منعقد ہوا جب ذیل اصحاب نے شرکت فرمائی۔

مولوی محمد سجاد مرزا صاحب ایم اے کینٹب۔ نائب صدر مجلس۔

ڈاکٹر سید محی الدین صاحب قادری زور۔

مولوی کمال رضا صاحب مددگار ناظم تعلیمات سرکار عالی۔

〃 عبدالمجید صاحب صدیقی ایم اے ایل ایل بی۔

〃 نصیر الدین صاحب ہاشمی مددگار ناظم رجسٹریشن ماسٹاپ۔

〃 سید محمد صاحب ایم اے شریک معتمد مجلس۔

〃 عبدالقادر صاحب سروری ایم اے ایل ایل بی صدر شعبہ اردو جامعہ میسور معتمد مجلس۔

مسٹر سری کرشن بیرسٹرایٹ لا رکن مجلس دیر میں تشریف لائے۔

گزشتہ مجلس انتظامی کی روئداد سنائی گئی اور اس کی توثیق کی گئی۔

سال ہائے ماسبق کے ممتحنین کی فہرستیں پیش کی گئیں اور بعد تبادلۂ خیال طے پایا کہ۔

"چونکہ اکثر ممتحنین تین سال تک رہ چکے ہیں اس لئے امسال ان کی جگہ نئے اصحاب کا انتخاب کیا جائے۔"

چنانچہ اسی تصفیے کے مطابق سال حال کے ممتحنین منتخب ہوئے۔

معاوضۂ ممتحنی کے بارے میں طے پایا کہ مجلس امتحانات کی ذیلی کمیٹی غور کرکے مناسب تجاویز مرتب کرے۔

طے پایا کہ مولوی کمال رضا صاحب کو ذیلی کمیٹی کا رکن منتخب کیا جائے۔

اجلاس شعبۂ شعرا و مصنفین دکن

بتاریخ ۲۵ اپریل ۱۹۴۳ء شام کے ۶ بجے ادارۂ ادبیات اردو کے دفتر میں شعبۂ شعرا و مصنفین دکن کا اجلاس منعقد ہوا جس میں حسب ذیل اصحاب نے شرکت کی۔

ڈاکٹر سید محی الدین قادری صاحب زور

پروفیسر عبدالقادر صاحب سروری

مولوی نصیر الدین صاحب ہاشمی

مولوی محمد سلطان صاحب

مولوی سید مراد علی صاحب طالع

مولوی سید محمد صاحب ایم اے معتمد شعبہ

نواب عزیز یار جنگ بہادر عزیز نے بذریعہ ٹیلیفون اور راجہ نرسنگ راج بہادر عالی نے بذریعۂ تحریر عدم شرکت کی اطلاع دی۔

۱۔ کتابوں کے حسب ذیل مسودے پیش ہوئے اور ان کے متعلق مناسب تصفیے کئے گئے۔

۱۔ ہماری غذا۔ از ڈاکٹر مرزا غوث بیگ صاحب۔

۲۔ اردو ادب کے جدید رجحانات۔ از سید اشفاق حسین صاحب ایم اے۔

۳۔ عجائبات عالم۔ از مولوی فیض محمد صاحب بی اے ایم ایڈ۔

۴۔ کام کی باتیں۔ از سیدہ عظیم النساء بیگم صاحبہ۔

۵۔ العروض۔ از سید کلیم اللہ حسینی صاحب

۶۔ جدید آلات جنگ۔ از فیض محمد صاحب۔

(طے پایا کہ کتب نمبر ۱ و ۶ شعبۂ سائنس میں۔ نمبر ۲ شعبۂ تنقید میں۔ نمبر ۳ شعبۂ تالیف و ترجمہ میں۔ نمبر ۴ شعبۂ نسواں میں اور نمبر ۵ شعبۂ زبان میں بھیجی جائیں)

طے پایا کہ مولوی مراد علی صاحب طالع سے خواہش کی جائے کہ وہ دو جلدوں میں شہر حیدرآباد اور اضلاع حیدرآباد کے مشاہیر اولیاء کا ایک تذکرہ مرقع سخن کی طرز پر مرتب کریں۔

ہاشمی صاحب نے بیان کیا کہ محبت صاحب نے مرقع نثر میں بہت کچھ اضافہ کرلیا ہے اس لئے انھیں ختم امرداد تک مہلت دی جائے تاکہ وہ اس کو مکمل حالت میں پیش کریں۔ اس کام کے سلسلہ میں معتمد صاحب ادارہ نے اطلاع دی کہ انھوں نے مولوی عبدالرحمن خاں صاحب اور مولوی سردار علی صاحب کے حالات فراہم کرلئے ہیں۔ مولوی مراد علی صاحب طالع نے وعدہ کیا کہ وہ ملک راؤ ڈھل راؤ صاحب کے حالات قلم بند کردیں گے اور معتمد صاحب شعبہ نے سراج الدین صاحب

طالب کے حالات لکھ دینے کا وعدہ کیا۔

ہاشمی صاحب نے نواب تقان الدولہ ولی کی قبر پر کتبہ لگانے کا انتظام اپنے ذمہ لیا۔

طے پایا کہ شعبۂ تنقید کی طرح شعبۂ ہذا کے بھی ایسے اجلاس ہوں جن میں شعراء مصنفین دکن پر تحقیقی مضامین سنائے جائیں۔

اس سلسلہ میں ہاشمی صاحب سے فخرالدین خاں امیر کبیر پر اور ڈاکٹر زور صاحب سے ابوالحسن تاناشاہ پر مضامین سنانے کی فرمائش کی گئی جس کو ہر دو اصحاب نے منظور کیا۔

طے پایا کہ مرقع نثر میں مولوی اکبر علی مرحوم مدیر صحیفہ کے حالات بھی شریک کیے جائیں۔

طے پایا کہ ملا عبدالباسط صاحب کو شعبۂ ہذا کا رکن بننے کی دعوت دی جائے۔

طے پایا کہ ڈرامہ رومان پسند سب رس میں شائع کیا جائے۔

شعبۂ زبان

بتاریخ ۱۵ اپریل ۱۹۴۳ء ادارے کے شعبۂ زبان کا اجلاس دفتر ادارہ میں شام کے ساڑھے پانچ بجے منعقد ہوا جس میں ذیل اصحاب نے شرکت فرمائی۔

ڈاکٹر سید محی الدین صاحب قادری زور، مولوی عبدالقادر صاحب سروری، مولوی سید محمد صاحب ایم اے، ڈاکٹر محمد راحت اللہ خاں صاحب ایم اے ڈی فل (اکسن) معتمد شعبہ۔

(نواب مرزا سیف علی خاں صاحب نے بذریعہ تحریر شرکت سے معذرت چاہی اور دکھنی محاوروں کی ایک فہرست واپس ارسال فرمائی)

۱. سابقہ جلسہ کی روداد پڑھی گئی اور اراکین نے اس کی توثیق فرمائی۔

۲. دکھنی محاوروں کے سلسلہ میں بالاتفاق طے پایا کہ مولوی قاضی عبدالغفار صاحب اور مولوی ضیاء الدین صاحب انصاری کے پاس سے دکھنی محاوروں وغیرہ کی فہرستیں واپس طلب کی جائیں تاکہ ان کی اشاعت کا جلد انتظام کیا جا سکے۔

۳. پروفیسر سروری صاحب نے اطلاع دی کہ وہ اور ڈاکٹر سید مسعود صاحب (پروفیسر لسانیات پرنس آف ویلز کالج جموں) ہر دو حضرات نے مل کر فن لسانیات اور صوتیات کی ایک جامع تالیف کی ہے، نیز وعدہ فرمایا کہ وہ تیار شدہ نسخہ شعبہ کی رائے کے لئے ارسال فرمائیں گے۔ بالاتفاق طے پایا کہ ڈاکٹر زور صاحب اپنی رائے کے ساتھ اس کتاب کو شعبہ کے آئندہ اجلاس میں پیش فرمائیں۔

۴. بالاتفاق طے پایا کہ ڈاکٹر اے شرما صاحب پروفیسر سنسکرت جامعہ عثمانیہ اور آغا حیدر حسن صاحب پروفیسر اردو نظام کالج کو شعبہ ہذا کا رکن بنایا جائے۔

۵. مولوی کلیم اللہ حسینی صاحب مولوی فاضل کی تالیف "العروض" شعبہ کی رائے کے لئے پیش کی گئی۔ بالاتفاق طے پایا کہ ڈاکٹر زاہد علی صاحب پروفیسر عربی نظام کالج اور ڈاکٹر خضر علی خاں صاحب پروفیسر فارسی جامعہ میسور کے پاس یہ کتاب بغرض اظہار رائے ارسال کی جائے۔

شعبۂ سائنس

شعبۂ سائنس ادارۂ ادبیات اردو کا اجلاس جمعہ ۱۴ مئی ۱۹۴۳ء شام کے ساڑھے چھ بجے دفتر ادارہ میں منعقد ہوا جس میں ذیل اصحاب نے شرکت فرمائی۔

۱. پروفیسر محمد سعیدالدین صاحب ایم اے بی ایس سی آنرز (ایڈنبرا)
۲. سید محمد علی خاں صاحب اے آر سی ایس بی ایس سی (لندن)
۳. ڈاکٹر سید محی الدین قادری صاحب زور ایم اے پی ایچ ڈی (لندن)
۴. مولوی خواجہ محی الدین صاحب ایم اے
۵. عبدالسلام صاحب ایم ایس سی
۶. مسٹر مہندر راج سکسینہ ایم ایس سی

۱. شعبہ کی مطبوعہ کتاب پودوں کی کہانی پیش کی گئی۔

۱۱۔ حسب ذیل کتابوں کے مسودے جو اس شعبہ کی طرف سے اس اثنا میں تیار ہوئے ہیں بغرض تصفیہ پیش ہوئے۔

۱۔ طبیعیاتی کائنات از پروفیسر محمد علی خان صاحب۔

۲۔ زہریلے پودے از مولوی عبدالسلام صاحب۔

۳۔ آلات جنگ از مولوی فیض محمد صاحب صدیقی۔

پہلی کتاب پر معتمد صاحب شعبہ کی حسب ذیل رائے کو باتفاق منظور کیا گیا۔

"اگرچہ یہ کتاب عام لوگوں کے لئے مفید نہیں ہو سکتی لیکن ہم چاہتے ہیں کہ سائنسی مضامین جاننے والوں کے لئے بھی کتابوں کا ایک علحدہ سلسلہ شروع ہو تاکہ اعلیٰ معلومات کی اشاعت بھی عمل میں آئے۔"

"زہریلے پودے" کی نسبت طے پایا کہ پروفیسر سعیدالدین صاحب کی نظر ثانی کے بعد شایع کی جائے۔

"آلات جنگ" پروفیسر محمد علی خاں صاحب کی نظر ثانی کے بعد شایع کی جائے۔

۳۔ مسٹر مہندر راج سکسینہ کی کتاب "جراثیم" نصف کے قریب تیار ہو چکی ہے۔ ماہ جون میں مکمل حالت میں پیش کی جائے گی۔

۴۔ مولوی خواجہ محی الدین صاحب سے خواہش کی گئی کہ وہ ستاروں پر ایک عام فہم کتاب لکھ دیں۔ صاحب موصوف نے وعدہ فرمایا کہ اکتوبر تک یہ کتاب تحریر فرما دیں گے۔

۵۔ مسٹر بھیمیا ایم ایس سی نے زہریلی گیاسوں پر کتاب لکھنے کا وعدہ کیا ہے۔

۶۔ سانپوں پر مسٹر نارائن سنگھ سے اور مولوی رحیم اللہ صاحب سے مچھلیوں پر عام فہم اور دلچسپ کتابیں لکھنے کی فرمائش کی جائے۔

ذیلی کمیٹی مجلس اردو امتحانات

اردو امتحانات ادارہ کی مجلس انتظامی کی ذیلی کمیٹی بتاریخ ۱۱ مئی ۱۹۴۳ء مطابق ۔۔ صفر ۱۳۵۲ف روز چہارشنبہ شام کو ساڑھے چھ بجے دفتر ادارہ میں منعقد ہوئی۔ مولوی محمد سجاد مرزا صاحب ایم اے کینٹب نے صدارت اور مولانا کمال رضا صاحب بی اے بی ٹی، ڈاکٹر سید محی الدین قادری صاحب زور اور مولوی سید محمد صاحب ایم اے شریک معتمد شعبہ نے شرکت کی۔

گزشتہ مجلس کی روئداد سنائی گئی اور اس کی توثیق عمل میں آئی۔

اردو عالم کے دوسرے پرچہ کی ممتحنی سے متعلق ضروری تصفیہ کیا گیا۔

کتاب معاون خانہ داری دستیاب نہیں ہو رہی ہے اس کی بجائے آئندہ "بچوں کی تربیت" مولفہ مسرت جہاں بیگم ایجوکیشنل پبلشرز علیگڑھ شریک نصاب کی جائے۔ اب چونکہ یہ کتاب بھی جلد دستیاب نہ ہو سکے گی اس لئے فی الحال "امور خانہ داری" مولفہ محمودہ صدیقی کے ابتدائی دو باب (۳۰ صفحے) حذف کرکے شریک نصاب کی جائے۔

مہتمم صاحب ادارہ نے چند کتابوں کی عدم دستیابی کی اطلاع دی اس لئے ان کی جگہ متبادل کتابیں تجویز کی گئیں جو درج ذیل ہیں۔

موجودہ شریک نصاب	متبادل کتاب
پردۂ غفلت	نئی روشنی از فضل الرحمن صاحب
کیمیاگر اور دوسرے افسانے	سات کا بھولا اور دیگر افسانے از پروفیسر سروری
توبۃ النصوح	مضامین عظمت حصہ دوم

پرچۂ سوالات کے تبصرہ کے وقت ذیلی مجلس ان متبادل کتب کے متعلق بھی سوالات کا اضافہ کرے گی۔

معاوضہ ممتحنی کا مسئلہ آئندہ ذیلی مجلس تک ملتوی کر دیا گیا۔

تاریخ اسلام کو اردو عالم میں اختیاری مضمون شریک کرنے کی تحریک پیش کی گئی اور طے پایا کہ آئندہ سال جب نصاب پر از سر نو غور ہوگا تو اس تحریک پر بھی غور کیا جائے گا۔

اردو امتحانات میں ہندی اور فارسی کے پرچے شامل کرنے کی تحریک بھی ناقابل لحاظ قرار دی گئی۔

شاخ فتح آباد

۲۸ اپریل ۱۹۴۲ء شاخ ادارۂ ادبیات اردو فتح آباد کا ایک جلسہ بمکان مولوی محمد یحییٰ خاں صاحب ڈرائنگ ماسٹر و رکن شاخ بوقت پانچ بجے شام بصدارت جناب مولوی محمد سمیع الدین صاحب صدیقی صدر مدرس مدرسہ وسطانیہ فتح آباد منعقد ہوا جلسہ میں بستی کے علم دوست اور معزز اصحاب نے شرکت کی جس میں سے چند کے نام یہ ہیں۔

مولوی مرزا صفدر علی بیگ صاحب، مولوی محمد اسمٰعیل خاں صاحب و مولوی عبدالحمید خاں صاحب سوداگر مسٹر وشوناتھ راؤ صاحب اول مددگار مدرسہ ہذا و رکن شاخ ہذا، مولوی محمد امان اللہ قریشی صاحب نائب صدر، مسٹر شیو لال صاحب، مسٹر چنو سنگھ صاحب۔ مسٹر جنیدی پرشاد صاحب۔

مولوی الیاس صاحب نشتر صدر نے اردو زبان کی ابتداء اور اس کی تدریجی ترقی پر تاریخ کے حوالے سے روشنی ڈالی اور یہ بتلایا کہ اس زبان کو عروج دینے میں ہندوستان کی دو ممتاز قوموں یعنی مسلمانوں اور ہندوؤں نے کافی دلچسپی اور خلوص سے حصہ لیا جس کا نتیجہ یہ ہے کہ یہ زبان دونوں قوموں کے تمدن اور تہذیب کا مشترکہ نمونہ ہے اس کی ترقی میں ایک طرف تو جناب سرسید، حالی، نذیر احمد خاں، غالب، مومن، امیر نے حصہ لیا تو دوسری طرف پنڈت رتن ناتھ سرشار، برج نارائن چکبست، منشی پریم چند، علامہ دتاتریہ کیفی نے اس چمن کی آبیاری کی ہے اور اس شاداب گلشن میں دونوں کے گلہائے مراد کھلے ہوئے ہیں۔ یہ زبان بالعموم ترکے کی ہے اس لئے ہر ہندوستانی کا مقدس فریضہ ہے کہ اس کو ترقی دے۔ ادارہ ادبیات اردو کی داغ بیل اردو کے ایک نوجوان بہی خواہ ڈاکٹر سید محی الدین صاحب قادری زور نے حیدرآباد میں ڈالی اور کئی دشوار گذار مرحلوں کو طے کر کے اس ادارہ کو یہ دن نصیب ہوا کہ اس کی شاخیں اب ریاست کے طول و عرض میں پھیلی جا رہی ہیں۔ صدر جلسہ نے اپنی تقریر میں فرمایا کہ یہ میٹھی زبان ہے ہی ایسی کہ اس کو ہر شخص دل سے پسند کرتا ہے۔ اس کی وسعت اتنی ہو گئی ہے کہ اب کوئی زمانہ آتا ہے کہ یہ بین قومی بولی کی حیثیت دنیا میں حاصل کرے گی۔ صدر نے کہا کہ ہم ملازم سرکار ہیں یہ کام تو بستی کے باشندوں کا ہے کہ وہ اس زبان کو ترقی دینے کے لئے شاخ ادارۂ ادبیات اردو فتح آباد کی سرگرمیوں میں پوری تندہی اور خلوص سے حصہ لیں بعد میں یہ تجویز منظور ہوئی کہ بستی کے لوگ جو تعلیم یافتہ ہیں اس شاخ کے عملی کام میں حصہ لیں جس کے لئے پہلا کام یہ کیا جائے کہ ادارہ کے ابتدائی امتحانوں کی جماعتوں کی تعلیم جاری کر دی جائے جس کے لئے مولوی محمد امان اللہ صاحب قریشی نائب صدر شاخ و مولوی ولی الدین صاحب رکن شاخ و مولوی عبدالقادر صاحب و مولوی قمیر الدین صاحب نائب معتمد و مولوی ابراہیم بیگ صاحب و مولوی امیر الدین صاحب منشی ٹپہ رکن شاخ نے تدریسی و تعلیمی کام کرنے کے لئے اپنی خدمات پیش کیں۔ انشاءاللہ عنقریب میں تعلیمی کام شروع ہو جائے گا اور اصحاب نے بھی تعلیمی کام میں ہاتھ بٹانے کا وعدہ کیا ہے۔ جلسہ کامیابی کے ساتھ معتمد صاحب کی جانب سے شکریہ ادا کرنے کے بعد ختم ہوا۔

شعبہ طلبہ پرلی

جناب شاہد صاحب قائم مقام نے ۲۴ اپریل ۱۹۴۲ء کو دفتر ہذا کے معائنہ کے بعد حسب ذیل تحریر دی:۔

مجھے شعبۂ طلبہ شاخ ادارہ کے کاموں سے غائبانہ علم تھا۔ آج وفد ادارہ کے ساتھ اس شعبہ کا معائنہ کر کے بڑی مسرت حاصل ہوئی یہ سب کام یہاں کے نوجوان ہونہار طالب علموں کی دلچسپی اور کوشش کا

رہین منت ہیں اردو زبان کی جو مخصوص خدمت یہ نوجوان انجام دے رہے ہیں وہ اردو کی ترقی کی ضامن ہے۔ ان ارکان کی نمایاں خصوصیت ان کا جوش عمل اور جذبۂ خدمت گزاری ہے۔ سب مل کر اتحاد و اتفاق سے کام کرتے ہیں بڑی خوشی کی بات ہے کہ ان کو بعض ہمدرد اصحاب کی رہنمائی حاصل ہے اگر یہ اپنے بزرگوں کے مشورہ کی روشنی میں اس کام کو جاری رکھیں۔ تو کوئی وجہ نہیں کہ پرلی کے تمام رہنے والے اردو لکھنے پڑھنے سے واقف ہو جائیں۔ میں اپنی مسرت کے اظہار کے ساتھ ساتھ ان جوشیلے نوجوان دوستوں کو نصیحت کرتا ہوں کہ وہ ہمیشہ باضابطگی اور تنظیم کو ہاتھ سے نہ جانے دیں گے۔ اردو زبان کی خدمت وقت کی ایک اہم ضرورت ہے۔ اس اہمیت کے مدنظر ہر قوم اور ہر فرقہ کے اصحاب کا تعاون حاصل کرنا بہت ضروری ہے۔ آپس کے نفاق اور جھگڑوں کو اس مقدس کام میں حائل نہیں ہونا چاہیے۔ اس شعبہ کے ساتھ میری بہترین تمنائیں اور دلی دعائیں وابستہ ہیں۔ اس شعبہ کی کامیابی کا سہرا اس کے مخلص صدر مسٹر ملکاپانی مہتمم مارکٹ پرلی کے سر ہے۔ جن کی دلچسپی اور مالی مدد نے شعبہ کو پروان چڑھانے میں بہت بڑا حصہ لیا ہے۔"

اور صاحب موصوف نے شعبہ طلبہ کو تین روپیہ بطور عطیہ عنایت فرمایا جس کا شعبہ طلبہ تہہ دل سے شکریہ ادا کرتا ہے۔

جلسہ تقسیم اسناد بھینسہ ۱۳؍ اپریل ۱۹۴۳ء کو شام میں ۶½ بجے مدرسہ وسطانیہ کی عمارت میں بصدارت قاضی میر ولایت علی صاحب بی اے بی ٹی صدر مدرس جلسۂ عام منعقد ہوا۔ جس میں ہندو و مسلم اصحاب کثیر تعداد میں شریک تھے۔ خطبۂ صدر نے ارکان وفد کا تعارف کرایا اور گلپوشی کے بعد صدر وفد خواجہ حمید الدین صاحب شاہد بی اے نے اپنے دورہ کے اغراض و مقاصد پر ایک بسیط اور معلومات آفریں تقریر کی۔ مولوی رحیم الدین صاحب کمال نظیر آبادی نے اردو امتحانات کی اہمیت اور ترغیب پر اپنے مخصوص انداز میں روشنی ڈالی۔ جناب تمکین سرمدی صاحب نے ایک نظم "اردو کی رائج و بہی" سنائی۔ جناب صدر نے کامیاب امیدواروں کو اسناد تقسیم فرمائے۔ اور حصول علم و اردو زبان کی اہمیت پر پُر از معلومات تقریر کی۔ مولوی غلام غوث صاحب بانی مرکز اردو امتحانات کے شکریہ کے بعد جلسہ برخاست ہوا۔

جلسہ تقسیم اسناد پرلی ۲۶؍ اپریل ۱۹۴۳ء کو تقسیم اسناد اردو دانی زبان دانی، اردو عالم کا ایک عظیم الشان جلسہ بتحریک محترمہ غوث النساء بیگم صاحبہ صدر معلمہ مدرسہ نسواں اردو پرلی بصدارت مسٹر مولوی سید عظمت اللہ حسینی صدر مدرس مدرسہ وسطانیہ پرلی منعقد ہوا۔ اس جلسہ میں مسز ڈاکٹر صاحب، مسز منتظم صاحب اور دیگر عہدہ داران مستقر کی معزز خواتین نے شرکت کی۔ ٹھیک چار بجے جلسہ تقسیم اسناد کا آغاز محترمہ طاہرہ بی صاحبہ معلمہ مدرسہ ہذا کی قرات و حمد شہنشاہ بیگم اور نعت عارف النساء بیگم سے ہوا اور لڑکیوں نے تقریریں کیں۔ بعد ختم جلسہ لڑکیوں کو شیرینی تقسیم کی گئی اور صدر صاحبہ کی جوابی تقریر نے طالبات کے دلوں کو متاثر کیا اور امید ہے کہ امسال زائد لڑکیاں شریک امتحان ہوں۔

پروگرام:- تعریف بندگانعالی۔ طالبات۔ تحریک صدارت محترمہ صدر معلمہ صاحبہ تائید صدارت محترمہ طاہرہ بی صاحبہ۔ قرات محترمہ طاہرہ بی صاحبہ۔ حمد، شہنشاہ بیگم۔ قصیدہ بندگانعالی، خواجہ بی۔ تقریریں حسب ذیل خواتین نے کیں:-

اقبال النساء بیگم، فرخ بیگم، نور النساء بیگم، اقبال النساء بیگم، شریف النساء بیگم، بانو بی، بسم اللہ بی، قمر النساء بیگم، محمودہ بیگم، رحیم النساء بیگم۔ مقابلہ طاہرہ بی صاحبہ (اردو ہند کی مشترکہ زبان ہے) ڈرامہ طالبات مدرسہ ہذا۔ شکریہ محترمہ نیاز بی صاحبہ معلمہ مدرسہ ہذا۔ دعا سلامتی بادشاہ ذیجاہ محترمہ سیدابست بی صاحبہ۔ ہمدردی کے متعلق چند اہم الفاظ۔ فردوس النساء بیگم۔ تعلیم نسواں۔ افتخار النساء بیگم معلمہ مدرسہ ہذا

قیام شاخ کاماریڈی

ادارۂ ادبیات اردو کا وفد ۱۴ اپریل ۱۹۴۳ء کو ۱۰ بجے دن کاماریڈی پہنچا۔ جناب تحصیلدار صاحب اور متعلقہ علم دوست اصحاب سے تبادلۂ خیال کیا گیا اور شام میں ۵ بجے کلب میں مولوی عبد القادر صاحب صدیقی بی اے تحصیلدار کی صدارت میں ایک جلسہ عام منعقد ہوا۔ جناب صدر اور ارکان وفد کی تقریروں کے بعد شاخ کا قیام عمل میں آیا اور مجلس انتظامی کے حسب ذیل عہدہ داروں اور ارکان کا انتخاب کیا گیا۔

سرپرست :- مولوی رشید الدین خاں صاحب بی اے ایل ایل بی منصف۔ رائے ہرشچندر صاحب مددگار مہتمم پولیس۔

صدر :- مولوی عبد القادر صاحب صدیقی بی اے تحصیلدار۔

نائب صدر :- مولوی عبد الرحمٰن خاں صاحب انسپکٹر آبکاری۔

خازن :- پیشکار صاحب تحصیل۔

معتمد :- قاضی ملک محمد صدیق صاحب۔

ارکان مجلس انتظامی :- وینکٹ رامیا صاحب، محمد ابراہیم صاحب قریشی، راملو صاحب سوداگر، ہیرالال صاحب ساہو، مصرف نرسہواں راؤ صاحب، لکشمن راؤ صاحب وکیل، مطیع الرحمٰن صاحب مولوی فاضل، راج مل صاحب ساہو، کنڈو سویا صاحب ساہو، نرسا گوڑ صاحب متاجر، عثمان علی صاحب جدی سررشتہ دار عدالت، نرسنگ راؤ صاحب پٹواری یلا ریڈی، نرسنگ راؤ صاحب پٹواری راجم پیٹھ، ترل راؤ صاحب پٹواری یلاریڈی، سید جمال الدین صاحب، شیشاچاری صاحب

شاخ نرل کا قیام

وفد ادارہ ۱۸ اپریل ۱۹۴۳ء کو ۱۱ بجے دن نرل پہنچا۔ جناب لائق احسن صاحب صدر مدرس مدرسہ فوقانیہ اور دیگر مقامی علم دوست اصحاب سے اردو زبان کی اشاعت، تعلیم بالغاں پر تبادلۂ خیال کیا گیا اور سب نے شاخ قائم کرنے پر آمادگی ظاہر کی۔ شام ۶ بجے مدرسہ فوقانیہ کی عمارت میں ایک جلسۂ عام کیا گیا جس میں اکثر مقامی عہدہ دار، وکلاء، معززین اور طلبا نے شرکت کی۔ جناب لائق احسن صاحب نے بحیثیت صدر جلسہ ارکان وفد کا تعارف کیا۔ ارکان وفد اور صدر جلسہ کی تقریروں کے بعد قیام شاخ کی تحریک پیش کی گئی جس کو حاضرین نے بخوشی منظور کیا اور مجلس انتظامی تشکیل دی گئی۔

سرپرست :- مولوی احمد علی صاحب دوم تعلقدار، مولوی دوست علی خاں صاحب مددگار جنگلات، مسٹر ڈیوڈسن مہتمم آبکاری، مسٹر وی راگھون صاحب مہتمم تعمیرات۔

صدر :- مولوی مصطفیٰ علی اکبر صاحب تحصیلدار۔ نائب صدر :- مسٹر گوبند راؤ صاحب منصف۔ معتمد :- مولوی علی بن عبد الحبیب صاحب المحضرمی، شریک معتمد۔ مولوی یوسف الدین علی صاحب منتظم پولیس۔

ارکان مجلس انتظامی :- مولوی محمد صدیق خاں صاحب وکیل، مولوی عبد الہادی صاحب وکیل، مسٹر وینکٹ راؤ وکیل، مسٹر سدرشن راؤ وکیل، مسٹر سرینواس راؤ وکیل، مولوی برہان الدین صاحب وکیل، مولوی شیخ داود صاحب، مولوی عبد الجلیل صاحب مدرس، مولوی وحید اللہ خاں صاحب ایم اے مددگار مہتمم آبکاری، آسارام صاحب متاجر آبکاری، موڈو رام صاحب ساہو، راجہ ریڈی صاحب متاجر، کاشی رام صاحب، مولوی خواجہ کریم الدین صاحب۔

شاخ بھومم

ارکان مجلس انتظامی کے انتخاب کے لئے بتاریخ ۱۸ مئی ۱۹۴۳ء بوقت ۴ ساعت سہ پہر منعقد ہوا جس میں حسب ذیل اصحاب کا انتخاب بالاتفاق آراء عمل میں آیا۔

ارکان مجلس انتظامی :- کے نرسنگ راؤ صاحب میڈیکل افسر صدر۔ مولوی عبد الرحیم صاحب نائب صدر، محمد علی خاں صاحب علی بھوموی معتمد، مولوی معین الدین صاحب صدیقی صدر مدرس بحر العلوم نظام الدین شریک معتمد۔ سید حبیب سالم صاحب رکن، مولوی شیخ عمر صاحب (شیخ اپید) رکن، مولوی عبد الرزاق صاحب پٹیل رکن، محمد محمود خاں صاحب رکن۔ سید اللہ صاحب جاگیردار رکن۔

ادارہ کے وفد کا دوسرا دورہ

ادارۂ ادبیات اردو کا ایک وفد اردو کی ترویج اور تعلیم بالغان کے کاموں کے معائنہ کے لئے سمت اورنگ آباد و نرمل و عادل آباد ۲۸ مئی کو روانہ ہوا تھا تقریباً ۲۲ مقامات کا دورہ کرکے بلدہ واپس ہو چکا ہے اور اپنی رپورٹ تیار کر رہا ہے۔

سید فیصل اور دوسرے ارکان کو بہ سمت گلبرگہ کے دورہ کے لئے روانہ ہوگا اور حسب ذیل مقامات میں اردو کی تعلیم بالغان کے کام سے متعلق معلومات فراہم کرے گا۔ ظہیر آباد، بیدر، کلیانی، اودگیر، ہمنا آباد، گلبرگہ، کپل، کنگی، شاہ آباد، چیتاپور، تانڈور، سیڑم، بھومم، عثمان آباد وغیرہ۔ مرہٹواڑی اور کرناٹک کے دوروں کے بعد توقع ہے کہ ادارہ کا وفد تلنگانہ کا بھی دورہ کرے گا۔

ادارۂ ادبیات اردو کی کتابیں

نام کتاب	صفحات	قیمت روپیہ	آنہ	پائی
من کی بینا ...	۸۰	۰	۸	۰
سرگزشت غالب ..	۶۴	۰	۸	۰
نظام الملک ...	۴۰	۰	۴	۰
تاریخ گولکنڈہ ...	۳۳۰	۳	۸	۰
رنگ بو نمبر (۸ تصاویر)	۱۶۰	۱	-	۰
ارمغان حذب ...	۱۲۰	۰	۱۲	۰
سوتیلی ماں ...	۴۸	۰	۴	۰
سر سید احمد خاں ..	۱۶	۰	۲	۰
سر سالار جنگ ...	۴۸	۰	۶	۰
مغربی تصانیف کے اردو تراجم	۱۴۵	۱	۴	۰
قسمت کی چھاؤں ..	۱۳۲	۱	۴	۰
اعمال نامہ ...	۱۶۸	۱	۴	۰
سائنس کے کرشمے ...	۱۱۲	۱	-	۰
شعرائے عثمانیہ ...	۲۳۰	۲	۱۲	۰
مکتوبات شاد عظیم آبادی	۳۰۰	۲	۸	۰
دادا بھائی ...	۱۶	۰	۲	۰
اردو نامہ ...	۲۰۰	۲	-	۰
ارسطو جاہ ...	۶۵	۰	۶	۰
عماد الملک ...	۴۰	۰	۶	۰
اردو دانی کی پہلی کتاب	۵۶	۰	۲	۶
" دوسری کتاب	۵۶	۰	۴	۶
محمد حسین آزاد ...	۲۰۰	۲	-	۰
کاغذ کی ناؤ ...	۱۲۰	۱	۴	۰
فن تقریر ...	۹۶	۰	۸	۰
مقدمہ تاریخ دکن ...	۱۴۴	۱	-	۰
پانی کی کہانی ...	۴۸	۰	۶	۰
رسائل طبیہ ...	۳۱۲	۲	۸	۰
سلک گوہریں ...	۴۰	۰	۴	۰
تاریخ ادب اردو ...	۱۷۶	۱	۴	۰
ورڈس ورتھ اور اسکی شاعری	۱۸۴	۱	۴	۰
ہوش کے ناخن ...	۹۴	۱	-	۰
یوسف ہندی قعر فرنگ میں	۸۹	-	-	۰
شاد اقبال ...	۱۷۶	۲	۸	۰
آزمائی رباعیں ...	۱۰۴	۱	-	۰
نظام علی خاں ...	۳۲	۰	۴	۰
عرب اور عربستان ...	۵۶	۰	۱۰	۰
ٹیگور اور ان کی شاعری	۱۲۸	۱	۴	۰
متاع سخن ...	۱۲۴	۰	۱۲	۰
کیف سخن ...	۱۲۲	۰	۱۲	۰
بادہ سخن ...	۱۲۷	۰	۱۲	۰
سراج سخن ...	۱۵۲	۰	۱۲	۰
ایمان سخن ...	۱۲۰	۰	۱۲	۰
فیض سخن ...	۱۴۴	۰	۱۲	۰
مرقع سخن جلد اول (۵۵) تصاویر	۵۰۰	۵	۰	۰
" دوم (۵۰) "	۴۲۲	۵	۰	۰
نقد سخن ...	۱۷۵	۱	۰	۰
نذر ولی ...	۲۴۸	۲	۸	۰
گریہ و تبسم ...	۱۹۲	۲	-	۰
مشاہیر قدمائے دکن	۱۸۴	۱	-	۰
من کی دنیا ...	۱۴۵	۱	-	۰
مدراس میں اردو	۱۹۶	۱	۸	۰
محرم نامہ ...	۱۱۲	۱	۰	۰
نذر دکن ...	۱۰۴	۱	۴	۰
روح غالب ...	۲۴۰	۲	۸	۰
عاصمہ ...	۲۰۰	۱	۴	۰
دفتری معلومات ...	۵۶	۰	۶	۰
آبدوز کشتیاں اور سرنگ	۴۸	۰	۶	۰
اردو مثنوی کا ارتقاء	۱۴۳	۱	۱۲	۰
نمود زندگی ...	۲۱۲	۱	۸	۰
سرگذشت ادارہ ...	۳۰۴	۰	۱۲	۰
میر محمد مومن (۳۴) تصاویر	۳۱۲	۲	۸	۰
بلقان	۳۲	۰	۳	۰
خطابات ...	۱۱۲	۰	۱۲	۰
علم خانہ داری ...	۱۵۰	۱	۰	۰
چیونٹی (۱۶) تصاویر	۱۱۸	۱	۸	۰
انوار ...	۱۶۸	۱	۸	۰
کشمش نانی (۴) تصاویر	۸۰	۰	۱۰	۰
کارساں دتاسی ...	۱۲۸	۱	۴	۰
رات کا بھولا ...	۱۶۸	۱	۰	۰
سکندر جاہ ...	۲۴	۰	۴	۰
بلاغت ...	۵۶	۰	۸	۰
ادارہ سنہ ۱۹۴۲ء میں	۲۰۰	۰	۸	۰

مطبوعہ اعظم اسٹیم پریس حیدرآباد دکن

ستمبر ۳ء

سب رس



ادارۂ ادبیات اردو حیدرآباد دکن کا ماہ نامہ

نشان ٹپہ آصفیہ ۱۵۳
نشان ٹپہ برطانیہ M3960
ٹیلی فون نمبر ۲۲۰۹
چندہ سالانہ چار روپیہ آٹھ آنے
بچوں کا سب رس ایک روپیہ آٹھ آنے

سب رس

جلد ۶ — بابت ماہ ستمبر ۱۹۴۳ء — شمارہ ۹

مہماں نوازی کی بدہضمی

اہلِ حیدرآباد کی فیاضی اور مہماں نوازی اتنی زبان زدِ خواص و عوام ہے کہ اس سرزمین کو عرصہ قبل ہی باہر والوں کی چراگاہ کہا گیا ہے اور یہ بھی سمجھا جاتا ہے کہ دکن میں ہُن برستے ہیں اور یہاں کی دولت ننگے سر پڑی پھرتی ہے جو چاہے اڑا لے جائے۔ لیکن کچھ عرصہ سے ایسا معلوم ہوتا ہے کہ دولت کے ساتھ ساتھ حمیت اور عقل بھی نت نئے 'مہمانوں کے نذر ہوتی گئی ہے اور شائد اسی وجہ سے اعلیٰ اور ادنیٰ اور اچھے اور بُرے کی تمیز بھی رفتہ رفتہ مفقود ہوتی جارہی ہے۔ قاضی عبدالغفار صاحب کا یہ مضمون اس قابل ہے کہ اس کی زیادہ سے زیادہ اشاعت عمل میں آئے اور اہلِ حیدرآباد اس کو غور سے پڑھیں۔

اس میں کوئی شک نہیں کہ انسان اپنی تعریف سننے کی طرف زیادہ راغب ہوتا ہے اور کیا تعجب کہ اہلِ ملک اسی جذبہ کے تحت مہمانداری میں ایک دوسرے پر فضیلت حاصل کرنے کی کوشش کرتے رہے ہوں۔ لیکن مبارک عہدِ عثمانی کی برکات نے جہاں اس سرزمین کے باشندوں کو علم و فضل کے ساتھ ساتھ ہمہ جہتی ترقیوں سے بہرہ مند کیا ہے یقین ہے کہ وہ اپنے معائب معلوم کرنے اور تنقید سننے کے لئے بھی تیار ہوں گے اور اسی یقین کے ساتھ ادارہ سب رس نے تہیہ کیا ہے کہ اس قسم کے اور مضامین شائع کرے۔ ہم ممنون ہوں گے اگر ہمارے معاونین اس قسم کے مضامین بھی روانہ فرماتے رہیں گے۔

"ادارہ"

کوئی بھی عمر گزار دے، ہندوستان کے کسی صوبہ کا رہنے والا ہو یا غیر ممالک کا، چاہے اپنے وطن میں کتنا ہی گمنام ہو لیکن جس دن اُس نے کے اسٹیشن پر قدم رکھتا ہے اُسی دن (اگر وہ حیدرآباد کی ترکیبوں سے واقف ہے یا کافی ذہین ہے) دنیا کے یا کم از کم ہندوستان کے مشاہیر کی فہرست میں اپنا نام لکھوا دیتا ہے! اس شہرت کا پہلا قدم تو یہ ہے کسی نیوز ایجنسی کو ایک "بیان" دیدیا جائے۔ خواہ وہ بیان قطب شمالی کے متعلق ہو یا "غلہ زیادہ اگاؤ" کی مہم کے متعلق۔ ہماری نیوز ایجنسیاں ایسے بیانات کی تلاش میں بالکل اسی طرح چشم براہ اور گوش برآواز رہتی ہیں جیسے ایک شوقین ماہی گیر اپنا کانٹا سنبھالے دریا کے کنارے سکارے صبح سے شام تک ٹہلتا رہے۔ اس بے چارے کو اگر ہر روز کوئی چھوٹی موٹی مچھلی نہ مل جائے تو اس کے گھر فاقہ ہو جائے! یہی حال ہماری نیوز ایجنسیوں کا ہے۔ پہلی ملاقات اور پہلے ہی "بیان" کے بعد ضروری ہے کہ نئے مہمان کو فوراً "علامہ" یا "فاضل اجل" یا "قائد ملت" بنا دیا جائے۔ نیوز ایجنسی کے صفحات پر یہ سرخی بلا پس و پیش قائم ہو جاتی ہے۔ اب رہے مقامی جرائد تو وہ بھی اپنے اس رواج کو ہر حال میں مستحب سمجھتے ہیں اگر نیوز ایجنسی نے کسی مہمان عزیز کو "علامہ" لکھ دیا ہے تو پھر اخباروں کے ایڈیٹروں کو یہ زحمت گوارا نہیں کہ نیوز ایجنسی کی ساختہ پرداختہ سرخی میں کوئی ترمیم کرکے اس مہماں نواز ایجنسی کی دل شکنی کریں۔ اس کے بعد پہلی ہی دفعہ جو یہ "علامہ" صاحب مقامی صحافت پر روڈ تے ہیں تو جب تک ان کے بیانات اور ان کی تقریروں کو پڑھنے والوں کے مذاق سلیم کا دم نہ نکل جائے ایجنسیاں اپنے سیکڑوں صفحات کالے کرنے سے باز نہ آئیں گی اور ہر اخبار کے لئے ضروری ہے کہ ایجنسی کے کارخانہ کی اس پیداوار کو بصیرت افروز چشم ناظرین کرام کرتا رہے! ـــــ اتنا تو ہم کہہ سکتے ہیں کہ ہندوستان میں حیدرآباد سے زیادہ زرخیز کوئی زمین نہیں جہاں شخصی پروپیگنڈے کے پودے اتنی جلد بار آور ہو سکتے ہوں۔

اس حالت پر اردو زبان کی وہ مثل صادق آتی ہے کہ ہلدی لگے نہ پھٹکری اور رنگ چوکھا آئے! ـــــ ہماری اس مہمان داری کا یہ حال ہو گیا ہے کہ اللہ کا ہر بندہ جو بمبئی یا لاہور یا دلی کے کسی مد سے تحمل کر حیدرآباد کا ٹکٹ خریدے وہ دو دن کے سفر میں ریلوے کی ٹرین کے اندر ہی "علامہ" اور "قائد" اور "فاضل" اور "عالم" اور سب کچھ جو وہ چاہے ہو جاتا ہے۔ یعنی اگر گلی قاسم جان یا قرول باغ یا سیالکوٹ سے "الدین" یا چنے خاں حیدرآباد کا ٹکٹ لیکر یا بغیر ٹکٹ ہی کے گرانڈ ٹرنک اکسپرس میں بیٹھ گئے تو ہمیں یقین ہے کہ قاضی پیٹھ، بلکہ بلہار شاہ ہی سے ان کی قلب ماہیت شروع ہو جاتی ہے اور پھر جیسے ہی وہ حیدرآباد کی کسی ہوٹل میں پہنچے اور کسی نیوز ایجنسی سے دوچار ہوئے اسی لمحہ گویا شہرت کی کیمیا کا نسخہ ان کے ہاتھ آ گیا! اب آئی مصیبت اخبار پڑھنے والوں کی! آج حضرت موصوف نے بلدیہ کے چوبچوں کا معائنہ فرمایا اور یہ رائے ظاہر فرمائی کہ یہ چوبچے بہت صاف رکھے جاتے ہیں! آج جناب علامہ مدرسہ قدوریہ، صدوریہ یا مخزن العلوم کا معائنہ فرمانے تشریف لے گئے اور یہ بیان نیوز ایجنسی کو دیا کہ انھوں نے آج تک فن لینڈ اور پولینڈ میں بھی اس سے بہتر مدرسہ نہیں دیکھا! یا کل شام جناب قائد صوبہ فلاں نے بیت المعذورین یا دار المجانین کو اعزاز بخشا اور یہ رائے ظاہر فرمائی کہ بیت المعذورین کے معذورین بہت سے ملکوں کے پہلوانوں سے بھی زیادہ توانا ہیں اور اسی طرح دار المجانین کے مجنون اتنے فہمیدہ اور ہوشیار ہیں کہ ان کو دیکھ کر بسمارک اور چیمبرلین یاد آتے ہیں! ان لاتعداد بیانوں کے درمیانی وقفہ میں علامہ موصوف توران یا آذر بائیجان یا مبکٹو کے سیاسی حالات پر بھی تبصرہ فرماتے جاتے ہیں۔ اس تبصرہ کو مقامی صحافت میں اس طرح ہاتھوں ہاتھ لیا جاتا ہے کہ گویا حیدرآباد میں کوئی ابن خلدون یا کم از کم شبلی نعمانی پیدا ہو گیا! اب چاہے یہ تبصرہ

کتنی ہی تاریخی غلطیوں سے گرانبار ہو مگر وہ ہماری نظر میں علامہ موصوف کی شہرت کو چار چاند لگا دیتا ہے۔ ان معائنوں اور تبصروں کے علاوہ ایک ہنگامہ عصرانوں اور ظہرانوں کا بھی ہے! حضرت علامہ یا حضرت قائد کو کسی طرح ان تقاریب سے فرصت نہیں ملتی۔ دس آدمیوں کی ٹی پارٹی بھی نیوز ایجنسی کی اصطلاح میں ایک شاندار عصرانہ ہے اور پانچ آدمیوں کا دسترخوان بھی ایک بہت بڑی ضیافت ہے۔ حضرت علامہ صبح سے شام تک اس مہمان نوازی سے لطف اندوز ہو رہے ہیں اور حیدرآباد کے ہر لڑکے کو یہ حق حاصل ہے کہ وہ آٹھ آنے کے ہاتھ اپنی ایک انجمن بنا کر معزز مہمان کو تقریر کرنے کی دعوت دیدے۔ اب اگر معزز مہمان اپنی تقریر میں سراسر غلط واقعات کو تاریخی سند بنا دیں تو اس کا ان کو پورا اختیار حاصل ہے اور جب ان کے اجتہادات کے ساتھ ہی نیوز ایجنسی کا صداقت نامہ بھی موجود ہو تو کسی اخبار کو کیا غرض ہے کہ وہ خواہ مخواہ زمین کھودے یا یہ بحث شروع کر دے کہ یہ پھٹکری نہیں ہلدی ہے! ہمیں اپنے صفحات بھرنے سے غرض اور ایجنسی کو اپنی مہمان نوازی کے ساتھ ہی اپنی کارگزاری دکھلانے سے مطلب! تشہیر اور نمود کے اس کھلے بازار میں ایسے بہت سے سوداگر آتے ہیں اور بہت سے سوداگر چلے جاتے ہیں لیکن بیوقوف بنتے ہیں تو صرف حیدرآباد والے! وہ نیوز ایجنسیوں اور مقامی اخباروں میں عمر، بکر، زید کے اشتہاروں پر یقین کر کے ہر کس و ناکس کو اپنے کاندھوں پر چڑھا لیتے ہیں اور اس حقیقت کے علم سے محروم رہتے ہیں کہ ان اشتہاری مہمانوں کے دھوکہ میں آ کر وہ اپنے قومی وقار کو صدمہ پہنچا رہے ہیں اور اپنی ناواقفیت کم نظری اور سادہ لوحی کا ثبوت دے رہے ہیں! وہ نہیں سمجھتے کہ ایسے معزز مہمان جو حیدرآباد کی تعریف و توصیف میں بڑے بڑے بیانات شائع کراتے ہیں اپنے دل میں ہنستے ہوں گے اور

کہتے ہوں گے خوب بیوقوف بنایا!

بلا شبہ ایک ترقی پسند ملک میں باہر کے مشاہیر کی مہمان نوازی اور قدر شناسی ایک قومی فرض ہے اور ایسے اصحاب کی آمد سے ملک کی ذہنی ترقی کے لئے فوائد حاصل کرنے چاہیں۔ ایسے مشاہیر کی خدمات کا اگر ہم اعتراف نہ کریں یا اگر ان کے شایان شان ان کا خیر مقدم نہ کیا جائے تو یہ افسوس ناک فروگذاشت ہماری قومی کردار پر ایک بدنما دھبہ ہوگی لیکن ایسے موقعوں پر قوت امتیازی سے کام لینا چاہیے اور ہر چرب زبان مسافر کو جو حیدرآباد آئے آنکھیں بند کرکے یہ موقع نہ دینا چاہیے کہ وہ دس پندرہ دن دعوتیں کھائے اپنی شہرت کے ڈھول بجائے اور حیدرآباد کی مہمان نوازی سے بیجا فائدہ اٹھا کر مسرور و مطمئن اپنے گھر کو چلا جائے! ــــ

ــــ نمود و نمائش کے اس بازار میں جو لوگ اس امتیاز کے بغیر کہ کون مستحق ہے اور کون غیر مستحق خراج تحسین ادا کرتے ہیں اور مہمان نوازی کے اس مبالغہ کو روا رکھتے ہیں وہ اپنے ملک کی مہمان نوازی کو بدنام کرتے ہیں اور خود غرض لوگوں کو یہ سمجھنے کا موقع دیتے ہیں کہ حیدرآباد میں بہت سے مفید قسم کے بیوقوف بستے ہیں!

اس تصویر کا ایک رخ اور بھی ہے۔ وہ یہ ہے کہ ہمارے ملک کے بعض حلقوں میں ایک ذہنی پستی پیدا ہو رہی ہے یعنی بعض اصحاب خود اس تلاش میں رہتے ہیں کہ انہیں کسی پلیٹ فارم پر نظر آنے کا موقع ملے۔ سنجیدہ اور واقعی قابل اشخاص تک تو ان کا دسترس ہے نہیں؛ اس لئے وہ باہر کے آنے والوں کو تاکتے رہتے ہیں جب کوئی شہرت کا بھوکا ان کے ہاتھ لگ جاتا ہے تو وہ اس کو فوراً برات کا دولہا بنا کر نقارے بجانے لگتے ہیں تاکہ ایک طرف تو قدر شناسی اور مہمان نوازی کا پہلو نمایاں رہے اور دوسری طرف اس پہلو کے پردہ میں کچھ اپنی بھی نمود و نمائش کا انتظام ہو جائے! اس صورت میں آنے والے سوداگر اور مقامی سوداگروں کے درمیان ع

من ترا حاجی بگویم تو مرا حاجی بگو

والا معاملہ ہو جاتا ہے اور دونوں ایک دوسرے سے مستفید بھی ہوتے ہیں اور ایک دوسرے کو بیوقوف بھی سمجھتے ہیں۔

یہ افراط و تفریط حیدرآباد کی شایان شان نہیں ہے اور ہم سب کو بہت احتیاط کے ساتھ صرف ایسے ہی لوگوں کا استقبال کرنا چاہیے جو اس کے مستحق ہوں۔ مہمان نوازی کی اس بدنظمی کو جس کی وجہ سے غیر معروف اور گمنام اشخاص حیدرآباد کو اپنی چراگاہ بنا لیتے ہیں ہم کسی طرح بھی قابل ستائش نہیں کہہ سکتے!

بادۂ شیراز

یکے در سایۂ شاخِ صنوبر نغمہ ہا بر زد — کہ برگِ گل بتقدیرِ زحمتِ صنعاری ارزد

کسے داند؟ بوقتِ صبح بر ہر قطرۂ شبنم — شعاعِ مہرِ عالمتاب می رقصد کہ می لرزد

ماہر القادری

فوجی ہوا گاہ

ایروڈروم (Aerodrome) کی اردو اصطلاح کہیں ہوا گاہ استعمال ہو رہی ہے اور کہیں ہوائی بندرگاہ اور بعض اخبارات میں طیران گاہ اور ہوائی اڈہ۔ ظاہر ہے کہ وہی اصطلاح باقی رہ جائے گی جس کو مقبولیت عام حاصل ہو۔ اس لئے ہم ان کے حسن و قبح پر بغیر کسی بحث کئے اس مفہوم کی ادائی کے لئے فی الحال ہوا گاہ کا لفظ استعمال کرتے ہیں۔ آپ میں سے بہت سے حضرات نے معمولی ہوا گاہیں دیکھی ہوں گی، بعض کو قریب سے مشاہدہ کرنے کا موقع ملا ہوگا اور بعض کو دور سے۔ ان ہوا گاہوں کے لئے ایک ایسا مقام منتخب کیا جاتا ہے جو شہر سے نہ زیادہ دور واقع ہو اور نہ بالکل نزدیک، کافی کھلا ہوا یہ ایک مسطح میدان ہوتا ہے تاکہ ہوائی جہاز سو ڈیڑھ سو میل فی گھنٹہ کی رفتار سے آتے ہوئے بغیر کسی رکاوٹ کے اتر سکے، اور جاتے ہوئے اسی رفتار سے ہوا میں اڑ سکے۔ آپ نے مشاہدہ کیا ہوگا کہ بڑے اور وزنی پرندے جب اڑنا چاہتے ہیں تو وہ یکدم نہیں اڑ سکتے بلکہ ان کو کچھ فاصلہ دوڑنا پڑتا ہے اس کے بعد وہ اڑتے ہیں۔ اسی طرح ہوائی جہاز کو بھی اڑنے سے پہلے زمین پر سو، سوا سو میل کی رفتار سے دوڑنا پڑتا ہے اور ہوا سے زمین پر اترتے ہوئے بھی رکنے سے پہلے زمین پر دوڑتے ہوئے آہستہ آہستہ رفتار کم کرنی پڑتی ہے یہی وجہ ہے کہ ہوا گاہ کے لئے ایک کافی وسیع میدان کی ضرورت ہوتی ہے اس سے متعلق کچھ مکانات مثلاً دفتر، عملے اور عہدہ داروں کے مکان اور جہازوں کے سائبان، گودام وغیرہ ہوتے ہیں۔ اس قسم کے ہوا گاہ آپ نے حکیم پیٹھ (حیدرآباد) چیکل تھانہ (اورنگ آباد) وغیرہ میں دیکھے ہوں گے۔ ظاہر ہے کہ ان ہوا گاہوں کی تیاری کے لئے جب کہ حالات موافق ہوں دو تین لاکھ سے زیادہ رقم کی ضرورت نہیں ہوتی۔ اس کے برخلاف فوجی ہوا گاہیں ہیں جن کی تیاری کے لئے کم از کم فی ہوا گاہ ۲۰ لاکھ روپے درکار ہوتے ہیں۔ اس غرض کے لئے کم از کم چار میل لمبے اور چار میل چوڑے میدان کی ضرورت ہوتی ہے، پھر اس کے اندر تین میل لمبا اور تین میل چوڑا حصہ لیا جاتا ہے جس میں سے ہر قسم کی رکاوٹ دور کی جاتی ہے، اور حتی الامکان اس حصہ کو مسطح بنا لیا جاتا ہے اور پھر اس میں سمنٹ کی دو سڑکیں جن میں سے ہر ایک ۱۵۰ فٹ چوڑی اور سوا میل لمبی ہوتی ہے بنائی جاتی ہیں ان سڑکوں کی ہر دو جانب ڈھائی، ڈھائی سو فٹ چوڑی مورم کی سڑکیں اسی طول کی بنائی جاتی ہیں اس طرح ہر ایک سڑک کی جملہ چوڑائی چھ سو پچاس فٹ کی ہوتی ہے۔ یہ سڑکیں ایک دوسرے کی متوازی نہیں ہوتیں بلکہ یا تو بہ شکل چلیپہ (×) ہوتی ہیں یا انگریزی حرف وی (V) کی مماثل دونوں میں سے کسی ایک شکل کا اختیار کرنا اس مقام کے جغرافی حالات پر منحصر ہوتا ہے اور دونوں سڑکوں کے درمیانی زاویے کا انحصار موسمی اور غیر موسمی ہواؤں کے رخ پر ہوتا ہے جس کو بڑی احتیاط سے متعین کیا جاتا ہے اس کی ضرورت اس لئے ہوتی ہے کہ ہوائی جہاز کو ہوا سے زمین پر اتارتے ہوئے یا زمین سے ہوا میں اڑاتے ہوئے ہمیشہ ہوا کے مخالف سمت میں اڑانا پڑتا ہے تاکہ اس پر قابو رہ سکے۔ اگر آپ نے کسی چھوٹی کشتی، بجرے یا پڑوے کو کافی تیز بہتے ہوئے دریا یا ندی میں چپوؤں سے چلاتے ہوئے دیکھا ہو تو آپ نے ضرور مشاہدہ کیا ہوگا کہ یہ کشتی صرف اسی وقت قابو میں رہ سکتی ہے جبکہ اس کو پانی کے مخالف سمت میں چلایا جاتا ہے تاکہ ماحصل رفتار ندی کے دوسرے

کنارے پر پہنچا دے۔ برخلاف اس کے اگر کشتی پانی کے بہاؤ کی سمت میں چلائی جائے تو اس کے الٹ جانے اور کسی بھنور میں گھر جانے کے ہر وقت امکانات پائے جاتے ہیں، بالکل یہی نسبت ہوائی جہاز کو ہوا کے ساتھ ہوا کرتی ہے۔ جب یہ سڑکیں ہواؤں کے رخ کے لحاظ سے بنائی جاتی ہیں تو ایک خاص زمانہ میں وہی سڑک استعمال کی جاتی ہے جو ہوا کے چلنے کا رخ ہوتا ہے۔ اس کے بعد یہ سوال پیدا ہو سکتا ہے کہ اس کے لئے سمنٹ کے سڑکوں کی کیا ضرورت ہے، کیا معمولی ہوا گاہوں کی طرح میدان کو مسطح کرنا کافی نہ ہوگا ؟ وجہ یہ ہے کہ جب ایک بمبار (Bomber) زمین پر اترتا ہے تو اس کی رفتار کم از کم ۱۵۰ میل فی گھنٹہ ہوتی ہے۔ اور زمین پر اس کے ٹکرانے کی قوت تیس ٹن وزن کی ہوتی ہے، یوں سمجھئے کہ تین ٹن وزنی لدی ہوئی دس لاریاں اتنی انتہائی رفتار سے یکدم کسی چیز سے ٹکرا گئیں، اس کی برداشت معمولی زمین یا مورم کی سڑک کیا کر سکے گی، اس کے تو پرخچے اڑ جائیں گے، سمنٹ ہی کی سڑکیں ہیں جو اس قوت کا مقابلہ کر سکتی ہیں۔ یہ بے لگام بمبار جو اس بے پناہ رفتار سے زمین پر اترتے ہیں تو صرف ان کے انجنوں کو بند کیا جاتا ہے اور ان کو اس وقت تک ان سڑکوں پر گھمایا جاتا ہے جب تک کہ وہ سڑک اور پہیے کی رگڑ کی وجہ سے خود بخود ساکن نہ ہو جائیں۔ بریک لگانا نہایت خطرناک ہوتا ہے، اس سے نہ صرف ان کے الٹ جانے کا اندیشہ ہوتا ہے بلکہ پٹرول میں آگ لگ کر ان کے خاکستر ہونے کے سامان پیدا ہو جاتے ہیں اس لئے اس قدر وسیع میدان اور اس قدر طویل و عریض سڑکوں کی ضرورت ہوتی ہے۔ خود یہ بمبار کافی جسیم ہوتے ہیں۔ اوسط درجے کے بمبار کا طول سرے دُم تک ساٹھ پینسٹھ فٹ کا ہوتا ہے اور عرض پنکھے کے اس سرے دوسرے سرے تک نوے فٹ کا۔

جب یہ زمین پر اتر جاتے ہیں تو فوراً ہر پہیہ کہ ان کو چلاتے ہوئے ان کی پناہ گاہوں میں لے جا کر رکھنا نہایت دشوار امر ہے اس لئے ان کو لاری سے کھینچ کر پناہ گاہوں میں جن کو (Blast Pens) کہتے ہیں پہنچاتے ہیں، بالکل اسی طرح جس طرح کہ ایک بڑے جہاز کو انجن بند کرنے کے بعد چھوٹے جہاز سے کھینچ کر بندرگاہ میں لایا جاتا ہے۔

ان پناہ گاہوں کے علاوہ درستی کے کارخانے، پٹرول اور بم کے ذخیرے اس طرح اور اس احتیاط سے بنانے پڑتے ہیں کہ خدانخواستہ دشمن کے بمباری کرنے پر بھی زیادہ نقصان نہ پہنچے۔ چونکہ یہ ایک ہوائی مرکز ہوتا ہے اس لئے عملہ اور عہدہ داروں کے رہائشی مکانات، باورچی خانے، حمام، دواخانے وغیرہ کی بھی تعمیر کی ضرورت ہوتی ہے۔ ان مکانات کو اس میدان کی بیرونی حدود پر درختوں کے نیچے، ٹیلوں سے متصل جھاڑیوں کے درمیان اس طرح بنایا جاتا ہے کہ دشمن کو ہوا میں سے بآسانی اس کی تمیز نہ ہو سکے اگر اس قسم کی سہولتیں حاصل نہ ہوں تو مختلف رنگوں اور مصنوعی ترکیبوں سے ماحول کے ساتھ ایسی ہم رنگی پیدا کی جاتی ہے کہ یہ مقصد بدرجہ اولیٰ حاصل کر لیا جاتا ہے۔

ابھی حال حال میں اس قسم کی تین فوجی ہوا گاہیں بیدر حیدرآباد اور ورنگل میں بنائی گئی ہیں جن کو ہر نقطہ نظر سے ہندوستان کی بہترین ہوا گاہوں میں شمار کیا جاتا ہے۔ زمانہ جنگ میں ہماری فوج کے لئے اقدامی اور دفاعی کارروائیوں کے لئے یہ لاجواب مرکز ہوں گے اور زمانہ امن میں سول آمد و رفت کے لئے بیش قیمت اسٹیشن ثابت ہوں گے۔

محمد ابراہیم

افسانے کی شکست

"کھوئی ہوئی زندگی کے پُرمسرت لمحات"

نگہت! تمھیں اس حسین رومانوی زندگی کی بیتی ہوئیں ساری باتیں یاد ہوں گی، بس یہی دن، یہی راتیں، یہی بہار کا موسم تو تھا۔ رنگ و بو میں ڈوبی ہوئیں، عطر خیز پہاڑی فضائیں، زمردیں وادیاں، برف پوش پہاڑیاں، شفاف چمکتی جھیلیں، گویا قدرت نے ہماری کوٹھی کے اطراف ایک پاکیزہ جنت بنائی تھی، آہ وہ تین مہینے ہنستے بولتے، سیر و تفریح میں بیت گئے۔ دکھ درد کا نام و نشان تک نہ تھا، مسکراہٹیں لئے ہوئے ہم بستروں سے اٹھ بیٹھے، اور قہقہوں کے ساتھ نیند کی آغوش میں چلے جاتے، سوچتا ہوں، یہ پُرمسرت لمحات اب کیا ہمیں کسی قیمت پر بھی واپس مل سکتے ہیں، بتاؤ نگہت! کیا تمھارا دل بھی اس رومان خیز زندگی کے لئے مچلتا ہے، آرزوئیں مضطرب ہیں کہ ایک بار اسی فردوسی خطہ پر پہونچ کر، مسرت و کامرانی کا دلکش گیت الاپیں، اس قدر طویل جدائی کیا ہمیں ان مختصر عشرتوں کے معاوضہ میں ملی ہے، سچ کہتا ہوں اب میرا دل اس پُرفریب غم آلود زندگی سے اکتا سا گیا ہے، جی چاہتا ہے کسی طرح بھاگ کر تمھارے پاس چلے آؤں اور پھر تمھارے ساتھ کسی ویران غیر آباد جزیرہ میں پہونچ کر بقیہ زندگی کے دن گزار لوں، یہی میری زندگی کا اہم اور کامیاب مقصد ہے،

دل ڈھونڈتا ہے پھر وہی فرصت کے رات دن
بیٹھیں رہیں تصورِ جاناں کئے ہوئے

کاش ہماری زندگی کا ہر لمحہ رومان خیز، پرمسرت ہوتا، وہی گیت ہماری نوکِ زبان ہوتے، جو کبھی ہم نے لبِ جھیل چاندنی رات میں گائے تھے، وہی پریوں کے طلسم خیز قصے، چاند اور سورج کی کہانیاں، شہزادے اور شہزادی کی محبت کی حیرت خیز داستان، کاش ایک بار ہم دہرا سکتے، جی چاہتا ہے پھر سے ہم ایک بار طوطا اور مینا کا بیاہ آپس میں رچاتے۔

نگہت! تمھیں میری تحریر پڑھ کر حیرت تو ہوتی ہوگی، رومان خیز پہاڑ کی مجھے ذرا ذرا سی بات یاد ہے، لو آج میں تمھیں ایک عجیب واقعہ سناتا ہوں، جو کبھی وقوع میں آیا تھا، تم سن کر لوٹ جاؤگی، ایک حسین رات کا ذکر ہے تم ناسازی مزاج کے باعث میرے ہمراہ تفریح کرنے نہ چل سکیں، البتہ گلاب کے ساتھ کوٹھی والے باغیچہ میں نارنگی کی کلیاں چنتی رہیں، میں رات گئے، شبنم نہایا ہوا ایک افسانہ کا تازہ پلاٹ دماغ میں لئے ہوئے گھر پہونچا۔ مجھے اچھی طرح یاد ہے، میں اس وقت تم سے کچھ کہے بغیر لکھنے کی میز پر آبیٹھا، اور تیزی کے ساتھ افسانہ کی ابتدا کی، افسانہ اور اس کے کردار کے بارے میں میں تم سے کچھ کہہ نہیں سکتا۔

چپکے سے تم میرے قریب آئیں، اور لکھنے کی میز پر ہاتھ ٹیک کر کھڑی رہیں، اس وقت تم نے غالباً اپنے سر کے اطراف ریشمی رومال باندھ رکھا تھا۔ میں افسانہ لکھنے میں ہمہ تن محو تھا، اس لئے تمھارے آنے اور کھڑا رہنے پر زیادہ توجہ نہ دے سکا۔ پھر تم نے اپنے آپ کو کچھ بے چین ہو کر صوفہ پر گرا دیا، دو ایک منٹ مشکل سے تم نے اپنے آپ کو سنبھالا، آخر اکتا کر سنگار میز کے بڑے آئینہ کے مقابل پہونچیں اور سر کا باندھا ہوا رومال نکال کر پھینک دیا جو درد کی وجہ سے تم نے لپیٹ رکھا تھا۔ وہیں کھڑے کھڑے چند ثانیوں تک تم نے مجھے گھورنا شروع کیا، شاید میں تمھاری طرف متوجہ ہو سکوں، ادھر میری یہ حالت کہ لکھنے میں کھویا جا رہا تھا، گویا ایک نظر بھی دیکھنا میرے لئے بار تھا۔ پھر تم مڑیں اور تیزی کے ساتھ پیانو کے قریب پہونچ کر بے ترتیبی کے ساتھ اس کی پتیوں کو چھیڑا۔ تمھارے ہر فعل و ہر حرکت سے بے چینی

ٹپک رہی تھی، مگر میرے لیے تمھارے یہ حرکات حد درجہ دلچسپ ثابت ہو رہے تھے۔ غم و غصہ سے مغلوب ہو کر تم آئینہ دار سرکلی میز کے قریب آئیں اور گلدستہ سے نارنگی کی کلیوں کے گچھے کو اکھڑا جو کچھ دیر پہلے تم نے گلاب کے ساتھ چُنا تھا، دو ایک لمحے تک تم انھیں ہاتھوں میں لے کر مسلتی رہیں، پھر نہ جانے کیا خیال کر کے ان کلیوں کے گچھے کو میری طرف پھینک مارا۔ اف وہ منظر بھی کتنا حسین اور ناقابلِ فراموش تھا۔ میری ایک ناتمام نظر پر تمھارا شیرازۂ ضبط و سکون بکھر گیا، اور تم ایک شکست خوردہ ہرنی کی مانند بے تحاشا مسہری کی طرف بڑھیں اور تکیہ میں منہ چھپا کر سسکیاں بھرنے لگیں، اب میرا قلم ہاتھوں سے چھوٹ پڑا اور میں بیتاب سا ہو کر اپنی جگہ سے اٹھا، اور بڑھ کر تمھیں اپنی آغوش میں لے لیا، تم میری باہوں میں سمٹ گئیں، تمھاری بڑی بڑی آنکھیں اب بھی پرآب تھیں، تم میرے ہاتھوں کا سہارا لیے ہوئے میں لکھنے کی میز کے قریب آئیں اور عجیب انداز سے پھر تم نے میرا نامکمل افسانہ اٹھا کر پرزہ پرزہ کر ڈالا ——— "نگوڑا، افسانہ ——— سوت بنا ہے"۔ فتح کے خیال سے تمھارا حسین چہرہ خوشی کے مارے دمک اٹھا، تمھارا وہ سوال بھی کتنا دلفریب تھا۔

"پیارے ہاشمی! دیکھ لی، آپ نے میری فتح، اور اپنے افسانہ کی شکست ؟"

آہ نکہت! کاش تم ایک مرتبہ پھر سے میرے افسانہ کو شکست دے سکتیں!

باقی پھر کبھی ——— خدا حافظ "تمھارا ہاشمی"

صابر کوسگوی

محبت

محبت ہے آئینہ سازِ حیات — محبت سے ہے شوکتِ کائنات
محبت ہے وجہِ زمین و زماں — محبت سے ہیں انجم و کہکشاں
محبت کا جلوہ ہے خورشید میں — محبت نہاں سازِ ناہید میں
محبت سے تھا حسنِ یوسف کا نور — محبت سے تھا ضو فشاں بامِ طور
محبت ہے پیغمبری کی نمود — محبت سے ہے عالمِ ہست و بود
محبت ہے سرمایہ دارِ جنوں — محبت جوانی کا ہے اک فسوں
محبت ہے تاب و توانِ حیات — محبت ہے روحِ روانِ حیات
محبت سے ہے زرفشاں زندگی — محبت سے ہے کامراں زندگی
محبت ستاروں میں جلوہ فروز — اسی سے ہے ساز اور اسی سے ہے سوز
محبت ہی ہے مصدرِ جزو و کل — محبت ہی ہے خالقِ خار و گل

محبت ہواؤں میں مستی فروش — محبت بہاروں کے سینہ کا جوش
اسی سے جوانی کے رخ پر چمک — گلستاں میں پھولوں کے رخ پر دمک
محبت ہے رنگِ قبائے بہار — محبت سے ہے تخمیرِ لیل و نہار
محبت سے شاداب ہے باغِ دل — محبت سے ہے ضو فشاں داغِ دل
محبت ہے بنیادِ کون و مکاں — محبت کا ہر سو ہے سکہ رواں
محبت ہے اک مذہبِ کائنات — محبت ہے رخشندۂ شش جہات
محبت شہیدوں کے ہے پاؤں میں — محبت ہے تلواروں کی چھاؤں میں
محبت کی ہے سب سے عجب بارگاہ — یہاں سب ہیں یکساں گدا ہو کہ شاہ
یہاں کا نرالا ہی دستور ہے
یہاں جو بھی پہنچا وہ منصور ہے

اختر ہوشیارپوری

ولی کی یاد کیوں منائی جاتی ہے

ولی نے تاریخ ادب اردو میں اپنی کرامت سے جس نمایاں مقام پر قبضہ کرلیا ہے وہ کسی زمانے میں بھی اس سے چھینا نہ جا سکے گا۔ اورنگ آباد کے اس سیاح شاعر کو گزرے ہوئے ڈھائی سو سال کا عرصہ ہو چکا اور اس وقت سے اب تک اردو ادب نے کئی رنگ بدلے اور اردو شاعری کا قافلہ کہاں سے کہاں نکل گیا۔ لیکن جب کبھی اہل قافلہ نے پیچھے پلٹ کر دیکھنے کی کوشش کی، ولی کا کلام ان کو ایک بلند مینار کی طرح رہنمائی کرتا نظر آیا۔

ولی سے پہلے کے بڑے بڑے اساتذہ سخن کے اردو کارنامے اس اثناء میں روشناس ہو چکے ہیں اور یہ بھی قطعی طور پر معلوم ہو چکا ہے کہ وہ اردو کا پہلا صاحب دیوان نہیں تھا لیکن ولی کی کرامت ایسی چل نکلی ہے کہ بدعقیدہ سے بدعقیدہ نقاد بھی اس کے کمال انفرادیت سے انکار نہیں کر سکتا۔ شاید یہ خیال کمترین نے اسی لئے پیشین گوئی کی تھی کہ

ع ولی پر جو سخن لاوے اسے شیطان کہتے ہیں

سچ تو یہ ہے کہ ولی اورنگ آبادی اردو کی زندگی کی ایک ایسی موڑ پر کھڑا ہوا ہے جہاں صحیح رہبری کے بغیر راہ روی مشکل نظر آ رہی تھی اور اندیشہ تھا کہ کہیں اعرابیوں کی یہ یادگار کعبۂ مقصود کی جگہ کسی ترکستان میں بھٹکتی نہ پھرے۔ ولی ہی کی رہنمائی سے اردو کا لشکر پر پیچ راہوں سے نکل کر ایک ایسی شاہراہ پر آ پڑا جو آخر کار اس کو ترقی کے میدان میں پہنچانے کی باعث ہوئی۔

ولی نے اردو شاعری میں سلاستِ بیان اور اندازِ فکر کو کس طرح اجاگر کیا ہے اس کا اندازہ ایک معمولی سی مثال سے یوں لگایا جا سکتا ہے کہ اس سے نصف صدی قبل کے ایک باکمال اردو شاعر نے گولکنڈے کے دربار میں ایک غزل لکھی تھی جس کے تین شعر ہیں۔

جب ترا عشق ستیا دست گریباں میں آئی   صبر ٹکڑے ہو پڑیا عقل کے میداں میں آئی
بہت دیساں تھیں عیس کہ پیانہ تو عشاق تیرا   کہ مقام آج مری زمین کے اسماں میں آئی
شعر سوں جو تول منگھا پ سیتی یو سیر کرن   سیر کر ذوق سوں غواصی کے دیواں میں آئی

اپنے پیش رو ملک الشعرائے حیدر آباد یعنی ملا غواصی مصنف طوطی نامہ و سیف الملوک و بدیع الجمال کی اسی زمین میں ولی نے بھی غزل کہی ہے۔ اس کے بھی چند شعر سنیے۔

وہ صنم جب سوں بسا دیدۂ حیراں میں آ   آتش عشق پڑی عقل کے ساماں میں آ
ناز دیتا نہیں گر رخصت گلگشت چمن   اے چمن زار حیا دل کے گلستاں میں آ
نالہ و آہ کی تفصیل نہ پوچھو مجھ سوں   دفتر درد بسا عشق کے دیواں میں آ
عیش ہے عیش کہ اس مہ کا خیال روشن   شمع روشن کیا مجھ دل کے شبستاں میں آ
غم سوں تیرے ہے ترحم کا محل حال ولی   ظلم کوں چھوڑ سجن شیوۂ احساں میں آ

پھر اسی ردیف میں قافیہ بدل کر ایک اور غزل لکھی ہے تاکہ اپنی قادر الکلامی اپنے پیشرو شاعر کے مقابل میں ظاہر رہے۔ اس کا مطلع ہے ؎

اے رشک ماہتاب تو دل کے صحن میں آ   فرصت نہیں ہے دن کو اگر تو رین میں آ

غواصی اور ولی دونوں قادر الکلام اساتذۂ سخن تھے۔ اور دونوں نے ایک ہی زمین میں غزلیں لکھی ہیں اور اس میں تو کوئی شبہ نہیں کہ شاعر اورنگ آباد نے ملا غواصی کے اتباع میں اس کی زمینیں اختیار کی ہیں اور غواصی کو اولیت کا بھی شرف حاصل ہے۔ لیکن ولی کے یہاں زبان اور انداز بیان کے نمایاں فرق کے علاوہ لطیف احساسات کی جو نزاکت پائی جاتی ہے در اصل وہی اس کے شاعرانہ کمال کا وہ طرۂ امتیاز ہے جس نے شاہجہاں آباد کے فارسی اساتذہ کے ذوقِ سخن کو بدل دیا اور انہیں محسوس کرایا کہ

ایک ہندوستانی شاعر اپنی زبان (اردو) میں جو لوچ اور اثر پیدا کر سکتا ہے وہ فارسی کی شیرینی اور عرصہ دراز کی مومنی کے باوجود پیدا نہیں ہو سکتا۔

گونا گوں قلبی واردات اور عشق و مستی کی نازک کیفیات کے ادا کرنے کی یہی سہولت تھی جس نے میر تقی میر جیسے اردو شاعر کے خود پسند سرتاج سے یہ کہلوا دیا کہ۔

خوگر نہیں کچھ یوں ہی ہم ریختہ گوئی کے　　معشوق جو تھا اپنا باشندہ دکن کا تھا

میر سے پہلے ان کے حریف مقابل مرزا رفیع سودا کے استاد اور دہلی کے مشہور باکمال شاہ ظہور الدین حاتم نے تو بار بار اس دکنی معشوق کی استادانہ سحر طرازیوں کا اعتراف کیا ہے۔ وہ کہتے ہیں۔

حاتم یہ فن شعر میں کچھ تو بھی کم نہیں
لیکن ولی ولی ہے جہان سخن کے بیچ

اسی طرح میر کے ایک اور پیشرو اور حاتم کے معاصر نجم الدین مبارک آبرو نے اعلان کر دیا کہ۔

آبرو شعر ہے ترا اعجاز　　پر ولی کا سخن کرامت ہے

یہ آبرو وہی ہیں جو میر تقی میر کے ماموں سراج الدین علی خاں آرزو کے شاگرد اور جانشین تھے۔

مشاہیر شعرائے دہلی ہی نے اپنے کلام میں ولی کی یاد نہیں منائی بلکہ ولی کے ہم وطن شعرا نے بھی ان کی بزرگی اور انفرادیت کا عقیدت مندانہ ذکر موقع بہ موقع کیا ہے اور یہ امر زیادہ تعجب خیز ہے۔ اس لئے کہ کسی ملک کے باکمالوں کی قدر ان کے ہم وطن بہت کم کرتے ہیں اور خاص کر سرزمین دکن شروع ہی سے اپنے فرزندوں کی ناقدری کے لئے بدنام ہے۔ اس کے علاوہ ایک وجہ یہ بھی تھی کہ ولی کے ہم وطن شعراء کو ہندستان دکن کے ان باکمال شعرائے پیشین کی شہرت اور کلام سے بخوبی واقف تھے جن کا خود ولی خوردہ گیر تھا اور جن کی غزلوں پر اس نے خود بھی غزلیں لکھی تھیں۔

ان حالات کے پیش نظر سراج اور داؤد جیسے شعرائے اورنگ آباد کا اپنے کلام میں جگہ جگہ ولی کو یاد کرنا ایک تصفیہ کن جواب ہے اس سوال کا کہ ولی کی یاد کیوں منائی جاتی ہے؟

سراج اور داؤد دونوں ہمعصر باکمال شاعر تھے اور دونوں کو ولی کی جانشینی کا فخر تھا۔ لیکن افسوس ہے کہ دونوں میں سے کوئی بھی ولی کی جملہ خصوصیات اپنے کلام میں پیدا نہ کر سکا جہاں تک فقر و استغنا اور تصوف کی چاشنی کا تعلق ہے سراج ولی کے جانشین سمجھے جا سکتے ہیں لیکن شاعرانہ رنگینی اور جذبات کی گونا گونی داؤد کے حصہ میں آئی۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ ولی نے اپنے کمالات کے ورثہ کو ان دو شاعروں میں تقسیم کر دیا تھا۔

کلام سراج کے سوز و گداز اور تخیل کی گہرائی کے لئے ان کی اس مشہور غزل کی طرف اشارہ کر دینا کافی ہے جس کا مطلع ہے ؎

خبر تحیر عشق سن نہ جنوں رہا نہ پری رہی
نہ تو تو رہا نہ تو میں رہا جو رہی سو بے خبری رہی

سراج نے اسی رنگ میں کمال حاصل کیا اور اسی کی حد تک ان کا یہ دعویٰ حق بجانب ہے کہ۔

تجھ مثل اے سراج بعد ولی　　کوئی صاحب سخن نہیں دیکھا

سراج کے مقابلہ میں داؤد ایک دنیا دار انسان تھے اور انھوں نے ولی کی رنگین مزاجی اور نزاکت بیان کو اپنے کلام میں ترقی دی۔ اور اسی وجہ سے وہ ادبی حلاوت اور نیاز مندانہ اثر نہ پیدا کر سکے جو ولی سے صرف سراج کو حاصل ہوا تھا اور جس کی بنا پر ان کا کلام سراج کے مقابلہ میں زیادہ مقبول نہ ہو سکا۔ اگرچہ وہ بار بار اس امر کا دعویٰ کرتے رہے کہ:۔

حق نے بعد از ولی تجھے داؤد　　صوبۂ شاعری بحال کیا

مرزا داؤد چونکہ ایک آصفجاہی منصبدار تھے اس لئے انھیں صوبہ داری اور تعلقداری ہی کا خیال آتا رہا۔ وہ ایک اور جگہ کہتے ہیں ؎

بعد از ولی ہوئے ہیں کئی شاعراں ولیکن
داؤد شعر تیرا مشہور ہے دکن میں

ان کے دیوان میں کئی شعر ایسے ملتے ہیں جن سے پتہ چلتا ہے کہ وہ سراج کے مقابلے میں اپنی جانشینی منوانے کے لئے مضطرب ہیں اور کوشش کرتے ہیں کہ اپنی غزل میں ولی کے جیسا اثر پیدا کریں۔ اسی خیال کے تحت انھوں نے ایک دفعہ لکھا کہ ؎

کہتے ہیں سب اہل سخن اس شعر کو سن کر
تجھ طبع میں داؤد ولی کا اثر آیا

غرض ولی نے جہاں زندہ دلوں اور رنگین مزاجوں کے لئے ایک شگفتہ نمونہ کلام پیش کیا، آشفتہ حالوں اور صاحب درد دلوں کی خاطر بھی ایسے ایسے شعر اپنی یادگار چھوڑے ہیں جو کسی طرح میر کے نشتروں سے کم دلدوز نہیں ہیں اور اسی لئے وہ زندہ دلوں اور درد مندوں دونوں کی محفلوں میں ہمیشہ یاد کئے جائیں گے۔

ان دونوں اصناف میں انھوں نے جو استادانہ شان دکھائی ہے اس کے نمونے کے طور پر صرف دو چار غزلوں کے منتخب شعر پیش ہیں۔

صحبت غیر میں جایا نہ کرو — درد منداں کو کڑھایا نہ کرو
دل کو ہوتی ہے سجن بے تابی — زلف کوں ہاتھ لگایا نہ کرو
ہم کوں برداشت نہیں غصہ کی — بے سبب غصہ میں آیا نہ کرو
پاک بازاں میں ولی ہے مشہور — اس سوں چہرہ کو چھپایا نہ کرو

ایک اور غزل کے دو شعر ہیں ؎

جسے عشق کا تیر کاری لگے — اسے زندگی کیوں نہ بھاری لگے
نہ چھوڑے محبت دم مرگ تک — جسے یار جانی سوں یاری لگے
ہر اک وقت مجھ عاشق زار کوں — پیارے تری بات پیاری لگے
ولی کوں کہے توں اگر یک بچن — رقیباں کے دل میں کٹاری لگے

یہ اشعار بھی ملاحظہ ہوں ؎

آغوش میں آنے کی کہاں تاب ہے اس کوں
کرتی ہے نگہ جس قد نازک پہ گرانی
مت دور ہو یک آن ولی پاس سوں ہرگز
اے باعث جمعیت ایام جوانی

عہد حاضر میں زندگی کی ترجمانی کا جو نظریہ اردو شاعری اور ادب میں اپنی جملہ عریانیوں اور تلخیوں کے ساتھ جلوہ گر ہے اس کو پیش نظر رکھ کر بھی اگر ولی کے کلام کا مطالعہ کیا جائے تو اس میں اس قسم کی بے باکیوں کے ایسے ایسے نقوش اولیں نظر آئیں گے کہ اس شاعر اورنگ آباد کی یاد کبھی محو نہ ہو سکے گی اور معلوم ہوگا کہ طرح طرح کے قید و بند اور قسم قسم کے تکلفات کی دنیا میں رہ کر بھی ولی نے کتنی ذہنی آزادی اور اخلاقی جرأت سے کام لیا ہے۔ آج کی صحبت میں مثال کے طور پر صرف ایک موضوع کی طرف اشارہ کر دینا کافی ہے۔ امرد پرستی اب بھی معیوب ہے اور عہد ولی میں بھی معیوب تھی۔ لیکن اس شاعر نے بدنامی اور بے حیائی کے الزام کی پروا کئے بغیر اپنی کئی غزلیں ایسے امردوں کی یاد میں قلم بند کیں جنھوں نے اس کی زندگی اور شاعری کو رنگین بنانے میں خاطر خواہ حصہ لیا تھا۔ اگر چہ یہ امر سماج کے قوانین و حجاب کے خلاف تھا لیکن ولی زندگی کو بے نقاب دیکھنے کا عادی تھا اور ساتھ ہی اس میں وہ جرأت رندانہ بھی موجود تھی جو صرف بے پناہ اپنی طاقت اور انتہائی اخلاقی قوت ہی سے پیدا ہو سکتی ہے۔

وہ اپنے ایک جوان رعنا محبوب کی تعریف میں لکھتا ہے۔

تما قد دیکھ اے سید معالی　　ہوئی روشن دلاں کی فکر عالی
ترے پاواں کی خوبی پر نظر کر　　ہوئے ہیں گل تماں جوں نقش قالی
شفق لوہو میں ڈوبا سرسوں پگ لگ　　تو باندھا سر پہ جب چیرا گلالی
تری انکھیاں دسیں مجھ یوں سیت　　پیا گویا شراب پرتگالی
گیا ہے خوف سوں اڑ لعل کا رنگ　　ترے یاقوت لب کی دیکھ لالی
تری انکھیاں میں ڈورے دیکھ کر غیر　　بنائی خلق نے ریشم کی جالی
ولی تب سوں ہوا ہم کار فرہاد　　سنا جب سوں تری شیریں مقالی

اسی طرح اور متعدد دوستوں کا ذکر بے باکی کے ساتھ کیا گیا ہے۔ بہت سوں کے نام لئے ہیں۔ اور بعضوں کی طرف صرف اس طرح اشارہ کردیا ہے کہ:۔

عجب معشوق لڑکا مرہٹہ ہے　　کٹیلا اور ہٹیلا لٹ پٹا ہے۔ وغیرہ

عہد حاضر میں مزدوروں اور مفلسوں کی ترجمانی اور فلاح وبہبود کا خیال بھی ہمارے ادب اور شعر وسخن کا ضروری عنصر بن گیا ہے اور ہر نیا ادیب یا شاعر (خواہ وہ اس طبقہ کی زندگی کا کوئی ذاتی تجربہ نہ بھی رکھتا ہو) ایک فیشن کے طور پر ایسے مضامین کی ٹوہ میں رہتا ہے۔ لیکن ولی نے خود بھی زندگی کی اس دکھتی رگ کے درد والم کو محسوس کرلیا تھا اور اس نے اپنے کلام میں بعض موقعوں پر نہایت ہی لطیف پیرائے میں ان کی ترجمانی بھی کی ہے اس قسم کے چند اشعار آج کی اس تقریر کے عنوان کو یاد دلائیں گے کہ ولی کی یاد کیوں منائی جاتی ہے۔ وہ کہتا ہے ——

یہ مرا رونا کہ ہے تیری ہنسی
آپ بس نہیں پربسی ہے پربسی
رات دن جگ میں رفیق بے کساں
بے کسی ہے بے کسی ہے بے کسی
باعثِ رسوائی عالم ولی
مفلسی ہے مفلسی ہے مفلسی

ایک اور شعر ہے:۔

مفلسی سب بہار کھوتی ہے
مرد کا اعتبار کھوتی ہے

سید محی الدین قادری زور

(دہلی ریڈیو کی ایک تقریر)

قطعات

جہالت:۔

یہ پستی، یہ بلندی، کچھ نہیں، کہنے کی باتیں ہیں
کوئی خالق کسی مخلوق کو بھی چھوڑ سکتا ہے
ہزاروں قہقہوں کی گونج ہو جن کے مکانوں میں
وہ کیا جانیں خدا مفلس کے اشکوں میں جھلکتا ہے

حقائق:۔

کیفِ عشرت سے چمکتی ہوئی آنکھوں کے قریب
غم میں ڈوبی ہوئی مایوس نگاہیں بھی تو ہیں
دیکھ! اے تلخ حقائق سے مکرنے والے
صرف نغمے ہی نہیں بزم میں آہیں بھی تو ہیں

شاہد صدیقی

ریڈی قوم کی خواتین

جنوبی ہند خصوصاً تلنگانہ میں ریڈی قوم زمانہ دراز سے آباد ہے، ان کی مفصل تاریخ اب تک اردو زبان میں مرتب نہیں ہوئی ہے، یہاں ہمارا مقصد یہ تو نہیں ہے کہ اس قوم کی کوئی تاریخ قلمبند کی جائے، بلکہ عنوان مندرجۂ بالا کے تحت صرف عورتوں کی ترقی کے متعلق کچھ صراحت کرنی مقصود ہے، لیکن اولاً مختصر طور پر ریڈی قوم کے متعلق بھی کچھ نہ کچھ روشنی ڈالنی ضروری ہے۔

کہا جاتا ہے کہ لفظ "ریڈی" راشٹر کوٹ سے نکلا ہے جو اس قوم کا صدر مقام یا مولد و منشا تھا، دکن میں یہ قوم شمالی ہند سے آکر آباد ہوئی، اولاً اس نے کرناٹک میں اپنی سلطنت قائم کی (سنہ [illegible]ء) اس کے بعد تلنگانہ میں آئے، اور یہاں اپنی حکومت کی بنیاد رکھی، اب صرف تلنگانہ میں ریڈی قوم پائی جاتی ہے، یا بہ الفاظ دیگر اندھرا دیس میں آباد ہے۔

شمالی ہند میں ان کو "راٹھور" کہا جاتا تھا، اور کرناٹک میں "کورڈیکیل کر" سے موسوم تھے، شمالی ہند میں "کام پلیہ" ان کا اصلی مقام تھا، اسی وجہ سے اس قوم کو "کانپو" بھی کہا کرتے ہیں، چنانچہ علاقہ مدراس میں اس قوم کو "کانپو" ہی کہا جاتا ہے۔

بیان کیا جاتا ہے کہ راشٹر کوٹ سے "رٹکوڈی" بنا اور پھر "رٹیڈ" ہوا، اور اس کے بعد "روی" بنا، سنہ [illegible]ء تک اسی لفظ "روی" کا پتہ چلتا ہے، تلنگی زبان کا مشہور شاعر "رادھیا" نے جو ورنگل کے کاکتیا سلطنت کے زمانہ میں تھا اپنی نظم میں اسی لفظ "روی" کا استعمال کیا ہے، اس کے بعد کثرت استعمال سے "روی" سے ریڈی ہوگیا۔

یہ تحقیقات تلنگی مواد سے کی گئی ہیں، جس کے لئے ہم مسٹر پرتاب ریڈی صاحب اڈیٹر گولکنڈہ پتریکا کے ممنون ہیں،

فارسی کتابوں سے جو معلومات ہوتی ہیں ان کی صراحت حسب ذیل ہے۔

تاریخ حدیقۃ العالم سے واضح ہوتا ہے کہ سلطان محمد قلی قطب شاہ راج بندری کی فتح کے لئے روانہ ہوا اور روی وار قوم سے جنگ ہوئی، (سنہ ۱۶۰۰ء) چنانچہ اس کی فارسی عبارت کا ترجمہ یہ ہے۔

"جب امین الملک اور میرزین العابدین، کمندراج سے لڑنے کے لئے راج بندری کی طرف سے کسٹمکوٹہ کی طرف متوجہ ہوئے تو یہاں کے متوطن روی وار قوم سے لڑائی ہوئی ایلور کے قرب وجوار میں طرفین کے لشکر صف آرا ہوئے" صفحہ ۲۳۵

بہر حال اس میں کوئی شک نہیں کہ لفظ ریڈی دراصل روی سے بنا ہے، کہا جاتا ہے کہ ریڈی چھتری قوم سے تھے، اس کے بعد ان کو "شودر" کہنے لگے اس کی وجہ یہ بیان کی جاتی ہے کہ راشٹر کوٹہ کے زمانہ میں ریڈی قوم کے بعض افراد نے جین مذہب اختیار کرلیا، اور اس کے بعد ورنگل کی کاکتیا سلطنت کے زمانہ میں "ونیا شیا" یعنی لنگایت مذہب اختیار کیا، ایک زمانہ تک دونوں میں ذات کی پابندی نہیں تھی، آپس میں رشتہ داری ہوتی تھی، اس کے بعد اکثر افراد نے لنگایت مذہب ہی اختیار کرلیا، اور زنار ترک کردی تھی وجہ سے ان کو شودروں میں شمار کرنے لگے، لیکن پوجا پاٹ میں ان کو چھتری کا درجہ دیا جاتا ہے اور برہمنوں کے بعد ہی پوجا پاٹ ادا کرتے ہیں، کاکتیا سلطنت ریڈی قوم کی ہی تھی، اس سلطنت کے زمانہ میں ریڈی کما اور ولیا تینوں ایک ہی مذہب سے تعلق رکھتے تھے، آپس میں رشتہ داری کرلیتے تھے۔

کاکتیا تلنگانہ کی ایک مشہور سلطنت تھی جس کا پائے تخت ورنگل تھا، تین سو برس تک اس سلطنت کی حکومت رہی، اپنے

یہ معلومات مسٹر پرتاب ریڈی، اڈیٹر گولکنڈہ پتریکا سے ہم دست ہوئی ہیں۔

مسٹر پرتاب ریڈی سے یہ معلومات حاصل کی گئی ہیں۔

زمانہ میں یہ بڑی شان وشوکت کی حکومت تھی، اس کے زمانے میں تلنگی اور سنسکرت علوم وفنون کو بڑی ترقی ہوئی ورنگل، رامپا، گھن پور اور پاکھال وغیرہ میں جو آثار قدیمہ کاکتیا سلطنت کے موجود ہیں، وہ زبان حال سے اپنے بانیوں کی عظمت شان و شوکت کی ترجمانی کرتے ہیں، ان سے ان کے جاہ وجلال صولت و طمطراق، اعلیٰ تہذیب اور رفاہ عام کے کاموں کا اندازہ کیا جاسکتا ہے، اس سلطنت کے زمانہ میں اچھے اچھے ادیب اور قابل شاعر پیدا ہوئے جنھوں نے تلنگی اور سنسکرت ادب میں قابل قدر اضافہ کیا۔

کاکتیا سلطنت کی تباہی اور خاتمہ کے بعد اس کے حصے بخرے ہوگئے، اس خاندان کے ایک شخص نے کنڈور میں اپنی سلطنت قائم کرلی اور کنڈا ویدو کا قلعہ تعمیر کیا جس کے کھنڈر آج تک موجود ہیں، دو سو سال تک یہ سلطنت قائم رہی، ویجانگر کے راجہ کشن دیوراج نے دھوکے سے اس قلعہ کو حاصل کرلیا، اور کنڈور کی ریاست کا خاتمہ ہوگیا، اس کے بعد ریڈی قوم کی چھوٹی چھوٹی سلطنتیں قائم ہوگئیں جو گدوال، امرچنتہ، گوپال پیٹھ، دونتی، سرناپلی، دوم کنڈہ، لنگال وغیرہ سے موسوم ہوئیں۔[1]

تلنگانہ میں جب اسلامی سلطنتیں یعنی قطب شاہی، اور آصفیہ قائم ہوئیں تو ریڈی قوم اور ان کے نائکوں نے حکومت کا ساتھ دیا، اطاعت اور فرماں برداری کرتے رہے، اور ان حکومتوں کی جانب سے بھی اس قوم کی عزت افزائی اور قدر دانی ہوتی رہی، نہ صرف قدیم سمستانوں کو بحال اور برقرار رکھا گیا، بلکہ اس قوم کے قابل افراد کو دیسکمی اور دیسپانڈیہ گری وغیرہ خدمات سے بھی سرفراز کیا جاتا رہا، انعامات اوطان، مقطعات، بیرلت وغیرہ دیے گئے، جو آج بھی باقی ہیں اور ریڈی قوم کے افراد اور خاندان ان سے متمتع ہورہے ہیں۔

اس قوم کا پیشہ زمانہ سابق میں زراعت کے ساتھ سپاہ گری بھی تھا اس طرح یہ ایک بہادر قوم ہے، اس کے ساتھ ہی علم وادب میں بھی اس نے ترقی کی اور نام آوری حاصل کی ہے، چنانچہ تلنگی اور سنسکرت کے کئی ایک شاعر اس قوم میں پیدا ہوئے ہیں، بعض ریڈی شاعروں کا تذکرہ اس موقع پر کیا جاتا ہے۔

ملا ریڈی جو ابراہیم قطب شاہ کے زمانہ میں تھا تلنگی اور سنسکرت دونوں زبانوں میں شاعری کرتا تھا، اور درباری شاعر کی حیثیت رکھتا تھا۔ ویمنا نام ایک دوسرا شخص تلنگی زبان کا زبردست شاعر تھا۔ "کنددونونا" دوسرا شاعر ہے اس کی تلنگی نظموں کا ترجمہ براؤن نے انگریزی میں کیا ہے، اناویاریڈی سنسکرت زبان میں شاعری کرتا تھا، تماریڈی عالم پوری یہ بھی تلنگی میں شاعری کرتا تھا۔ اشنا بھاسا گوپال راؤ یہ شخص آٹھ زبانوں کا ماہر تھا، سمستان ونپرتی کے موروثوں میں شامل ہے، گونابدہ ریڈی اس نے راماین کو تلنگی زبان میں لکھا ہے۔[2]

بہرحال اس طرح علم وادب کی ترقی میں ریڈی قوم کے افراد نے خاصا حصہ لیا ہے۔ اس تفصیل کے بعد اب ہم نفس مضمون کی طرف متوجہ ہوتے ہیں، اولاً ریڈی قوم کی پیش رو عورتوں کا مختصر تذکرہ کیا جاتا ہے، جنھوں نے آج سے پہلے اپنے کارناموں سے اپنے نام کو زندہ چھوڑا ہے۔

---

[1] یہ معلومات مسٹر پرتاب ریڈی سے حاصل ہوئی ہیں، ہم نے ذاتی طور پر کوئی تحقیق نہیں کی ہے۔

[2] مسٹر پرتاب ریڈی صاحب سے معلومات حاصل ہوئی ہیں۔

سب سے پہلے مہارانی رودراما دیوی کا نام لینا چاہئے۔ جو کاکتیا سلطنت کی ایک مشہور اور نام آور مہارانی تھی، عرصہ تک خود حکمرانی کرتی رہی، ایک دوسری مہارانی نایک رانیلو تھی اس نے جنگ پلناڑو میں فوج کی سپہ سالاری کی تھی، یہ جنگ سنہ ۱۱۸۲ء میں ہوئی تھی۔

ان زمانۂ قدیم کی رانیوں کے قطع نظر آصفی دور میں بھی کئی ایک نام آور رانیاں گزری ہیں مثلاً رانی شنکراما جو سمستان میدک کی والیہ تھی اور حضرت آصفجاہ ثانی نے اس کو اس کی بہادری اور شجاعت کے مدنظر "رانی شیرزن" کا خطاب سرفراز فرمایا تھا، اور ہمیشہ نوازشات سے شاد کام کرتے تھے۔

اسی نام کی رانی شنکراما سے موسوم سمستان ونپرتی اور رانی لنگما جو گدوال کی رانی تھی۔ زمانہ حال کے نام آور عورتیں ہیں جنھوں نے نہایت کامیابی اور خوش انتظامی سے اپنے سمستانوں کی حکومت کی ہے۔

اس موقع پر سرناپلی کی رانی چیلم جانکا بائی کا نام بھی فروگزاشت نہیں کیا جا سکتا جو اپنے گوناگوں صفات کے باعث نہ صرف ریڈی عورتوں میں بلکہ دکنی عورتوں میں عزت اور وقعت کے ساتھ یاد کئے جانے کے قابل تھی۔

جانکا بائی کے والد لنگا ریڈی تعلقہ یلاریڈی میں موضع بیلم کے وطن دار تھے۔ سنہ ۱۲۹۱ھ میں جانکا بائی کی شادی چیلم پرتاپ ریڈی سے ہوئی جو سمستان سرناپلی کے والی تھے سنہ ۱۲۹۴ھ میں پرتاپ ریڈی کا انتقال ہوگیا۔ اس کے بعد جانکا بائی ان کے اسٹیٹ کی وارث بنی اور نہایت دانشمندی اور سلیقہ سے اپنے اسٹیٹ کو سنبھالا۔ فن تعمیر اور ذرائع آبپاشی میں ان کو بڑی اچھی مہارت تھی جس کی وجہ سے سمستان سرناپلی ہمیشہ سرسبز اور شاداب بنا رہا۔ مرحوم اعلیحضرت نے ان کو اپنی جوبلی کے موقع پر رانی کا خطاب مرحمت فرمایا تھا۔

جانکا بائی اپنی داد و دہش میں بہت مشہور تھیں ان کی سخاوت بڑی شہرت رکھتی تھی۔ سنہ ۱۳۲۹ھ
۱۳۲۹ف
میں ان کا انتقال ہوا

نصیر الدین ہاشمی

شاد اقبال :- اقبال اور شاد دونوں کی ہستیاں محتاج تعارف نہیں۔ البتہ اس خبر سے اردو دنیا میں مسرت کی ایک لہر دوڑ گئی کہ علامہ اقبال مرحوم اور مہاراجہ یمین السلطنۃ کے درمیان پچیس تیس سال تک جو مسلسل مراسلت ہوتی رہی ہے۔ یہ پوری مراسلت ادارۂ ادبیات اردو کی طرف سے شایع ہو چکی ہے۔ اس کے مطالعہ سے اقبال کی زندگی اور کردار کے ایسے پہلوؤں پر روشنی پڑتی ہے جن کے متعلق دوسرے ذرائع سے کوئی علم حاصل نہیں ہو سکتا۔ ان گراں مایہ خطوط کو جناب ڈاکٹر زور صاحب نے اپنے بسیط مقدمہ کے ساتھ مرتب کر کے شایع کیا ہے۔ شاد اقبال کی نایاب تصاویر بھی شامل ہیں۔

صفحات (۲۰۰) قیمت ۱۲/

طوائف

فاروق نے شبنم کو چاہا اور سچا چاہا گیا، مگر مفلسی سنگِ راہ ثابت ہوئی اور شبنم زمانہ کی ہوس کاریوں کی شکار ہو کر اپنی صحت تک لٹا بیٹھی۔ مگر فاروق کے یہ جذبات ظاہری حسن فنا ہو جانے پر بھی قائم رہے۔

نرگسی آنکھوں میں کھوئے ہوئے مغموم سے خواب   عشرتِ رفتہ کی عظمت کا پتہ دیتے ہیں

زرد چہرے کے یہ رنگین و دلاویز نقوش   شاہدِ دورِ مسرت ہیں مرے دوست ابھی

سوکھے سوکھے ہوئے لب ہائے دلاویز و حسین   ہائے اس پچھلی لطافت پہ ہیں غماز ہنوز

الجھے الجھے سے سیاہ اور پریشاں گیسو   کسی وارفتہ مزاجی کی ہیں دراصل دلیل

مرمریں لاغر و کمزور یہ سوکھا ہوا جسم   اپنی رعنائی رفتہ پہ ہے خود نوحہ فگن

اکھڑی اکھڑی سی یہ مایوس و پریشاں رفتار   حشر سازی گزشتہ کی خبر دیتی ہے

صندلی صندلی پنڈلی کی یہ حرکت یاس   ایک بیتے ہوئے افسانہ کی ہے شوخ دلیل

بے حنا خشک سے پاؤں جو ہیں آلودہ گرد   اپنی گزری ہوئی رفعت پہ ہیں نازاں اب تک

قمری

تاریخ گولکنڈہ:- حیدرآباد کے مشہور مورخ اور جامعہ عثمانیہ کے معلم تاریخ پروفیسر عبدالمجید صاحب صدیقی ایم اے۔ ایل ایل بی نے سلاطین قطب شاہیہ کی نہایت مستند اور مبسوط تاریخ قلمبند کی ہے جس میں گولکنڈہ اور اس کے آس پاس کی سلطنتوں کے تعلقات، دکن کا تمدنی ارتقاء، بادشاہوں اور امیروں کے حالات، لڑائیاں، علم و فضل کی سرپرستی غرض ہر پہلو پر قدیم نادر اور قلمی تاریخوں کی مدد سے روشنی ڈالی ہے۔ اپنے موضوع پر پہلی کتاب ہے جو اس اہتمام اور محنت سے لکھی گئی ہے

تاریخ گولکنڈہ باتصویر ہے اور اس کی تصویریں بھی اس کے مواد کی طرح قدیم تاریخی ماخذوں سے حاصل کیگئی ہیں۔ بڑی سائز سوا تین سو سے زیادہ صفحات قیمت (ہے)

مقدمہ تاریخ دکن:- یہ کتاب بھی پروفیسر عبدالمجید صاحب صدیقی نے نہایت تحقیق اور محنت سے مرتب کی ہے اس میں انھوں نے سرزمین دکن کے پچیس حکمراں خاندانوں کے آغاز، ارتقاء عروج اور زوال کے متعلق تعارفی معلومات کے علاوہ حکمرانوں کا پورا شجرہ نسب اور حکمرانوں کی تاریخیں بھی قلمبند کردی ہیں۔ اس کتاب کے آخر میں ایک مبسوط اشاریہ بھی ہے۔ متوسط تقطیع ۱۴۴ صفحات قیمت (عہ)

سماج سدھار

آبادی سے دور ——— بہت دور، پہاڑوں کے دامن میں اور ندی کے کنارے ایک چھوٹا سا مگر خوبصورت مکان ہے جس کے سامنے ایک بہت بڑا باغ بھی ہے باغ میں گلہائے رنگا رنگ کھلے ہوئے ہیں اور ان کی بھینی بھینی خوشبو فضائے بسیط میں پھیلی ہوئی ہے ——— آج آسمان پر کالے کالے بادل چھا گئے ہیں۔ چاند روپوش ہو گیا ہے۔ اور ہر طرف گھُپ اندھیرا چھایا ہے۔ ٹھنڈی ہوا کے جھونکے یکے بعد دیگرے مکان کی کھڑکیوں میں سے گذر کر مکان میں رہنے والوں تک پہنچ رہے ہیں ——— یہ مکان ایک زمیندار صاحب کا ہے جو اپنی بیوی اور اکلوتی بیٹی کے ساتھ اس میں سکونت پذیر ہیں۔

چند نوکر راستے پر نظر جمائے ہوئے بیٹھے ہیں۔ شاید کہ کسی کی آمد کا انتظار ہے۔ دور تک نظر دوڑانے پر بھی کوئی نظر نہ آتا تھا۔ کبھی کبھی بجلی کا تیز ہوتی بادلوں میں نمودار ہو جاتی اور بھولے بھٹکے مسافروں کو اپنا صحیح راستہ ڈھونڈنے میں مدد دیتی۔

"اُف! ——— کیسی خوفناک رات ہے نرملا! ——— اور سردی غضب کی ہے۔ میرا خیال ہے کہ وہ اس وقت نہیں آئیں گے۔ ہمارا انتظار کرنا بیکار ہے۔" زمیندار نے اپنی بیوی سے کہا۔

"ابھی تو دس بج رہے ہیں۔ ایک گھنٹہ اور انتظار کریں گے۔ اس میں کچھ شک نہیں کہ رات بہت ڈراونی ہے۔ شاید وہ اسٹیشن ہی پر سو گئے ہوں! ———" نرملا نے کہا۔ "تو کیا اب وہ نہیں آئیں گے؟" لیلا نے معصومانہ انداز میں دریافت کیا۔ لیلا کی عمر اس وقت سولہ سال کی ہے۔ باپ کی اکلوتی بیٹی ہونے کی وجہ سے لاڈ پیار میں پلی تھی ——— سانولا رنگ، بھرا بھرا بدن اور قد موزوں ہے۔ آنکھیں بھی خوب صورت ہیں۔ اس کی پیشانی دیکھنے سے معلوم ہوتا ہے کہ وہ ایک سنجیدہ عورت ہے۔

رام پور ایک چھوٹا سا گاؤں ہے۔ اگر کوئی وہاں جانا چاہے تو پہلے کرشن گڑھ کے اسٹیشن پر اترنا ہوگا اور وہاں سے بیل گاڑی کرایہ پر لینی ہوگی ——— کچھ دیر بعد جنگل میں ایک ٹمٹماتی ہوئی روشنی نظر آنے لگی ——— "نیلکنٹھ! لو وہ روشنی نظر آ رہی ہے۔ شاید وہی آ رہے ہوں گے" بھولو نے کہا۔ یہ بھولو اور نیلکنٹھ زمیندار صاحب کے پہرہ دار ہیں اور اس وقت آنے والے شخص کے انتظار میں ہیں۔

"گاڑی بان! ابھی ہماری منزل کتنی دور ہے! ——— سردی بھی غضب کی ہے" ——— "جی ——— ابھی ایک میل ہے سرکار!" ——— گاڑی بان نے چلم میں تمباکو بھرتے ہوئے کہا: "سرکار! آپ گرم کوٹ پہنے نہیں! ——— میرے پاس تو یہ کمبل ہے۔ اور یہی کمبل ہمارا سب کچھ ہے" گاڑی بان نے چلم کو سلگاتے ہوئے کہا، ہیڈ ماسٹر صاحب نے بھی اپنا سگریٹ کیس نکالا اور ایک سگریٹ سلگایا ——— "گاڑی بان! تمہیں معلوم ہے یہ زمیندار صاحب کیسے آدمی ہیں!" ——— ہیڈ ماسٹر صاحب نے دریافت کیا۔

"جی..... بڑے دیالو ہیں سرکار، کسانوں پر تو بہت مہربان ہیں" ——— یہ سن کر ہیڈ ماسٹر صاحب کے دل کو بڑی تسلی ہوئی۔ اس لئے کہ انھوں نے سمجھا تھا، جیسا کہ عام قاعدہ ہے یہ زمیندار صاحب بھی سنگ دل اور بے رحم ہوں گے اور غریب کسانوں کا خون چوستے ہوں گے۔ لیکن یہ معلوم کر کے کہ وہ ایک شریف انسان ہیں انھیں بڑی خوشی ہوئی ——— ہیڈ ماسٹر صاحب کا دل بلند ارادوں سے بھرا ہوا تھا۔ انھیں بی اے پاس کر کے دو سال ہوئے تھے اور ایک دفتر میں کلرک کی نوکری کر رہے تھے۔ یہ تھے بیچارے غریب ان کی سفارش کون کرے؟ ——— بڑی نوکری

حاصل کرنے کے لئے یا تو بڑے آدمی کی سفارش پہنچتی یا نقد روپیہ۔ مگر ہیڈ ماسٹر صاحب ان دونوں سے محروم تھے۔ ایک دن انھوں نے اخبار میں دیکھا کہ رامپور کے مڈل اسکول کے لئے ایک ہیڈ ماسٹر کی ضرورت ہے۔ اس پر انھوں نے درخواست پیش کردی اور قسمت سے وہ منظور بھی ہو گئی ——— چنانچہ اس وقت وہ زمیندار صاحب ہی کے پاس جا رہے تھے۔ "معلوم نہیں۔ اس وقت وہ جاگ بھی رہے ہیں یا سو گئے ہیں"۔ ہیڈ ماسٹر نے کہا اور جواب کا انتظار کئے بغیر کسی خیال میں غرق ہو گئے۔ وہ آئندہ کے لئے اپنا پروگرام مرتب کر رہے تھے۔ وہ چاہتے تھے کہ مدرسے کو نئے طریقہ پر چلائیں۔ تمام مدرسین کو ہدایت کردیں کہ وہ تعلیم دینے کے جدید طریقوں کو اختیار کریں۔ غرض اس قسم کے خیالات ان کے دماغ میں آتے اور چلے جاتے۔ "گاڑی بان! ——— یہ بڑا مکان کس کا ہے۔ مجھے تو ایسا معلوم ہو رہا ہے کہ کوئی کچہری وچہری ہوگی!" ——— "جی نہیں ——— وہ مدرسہ ہے" ———

"اچھا تو مجھے یہیں کام کرنا ہوگا"۔ انھوں نے کہا اور پھر خیالات کے بحر ناپیدا کنار میں بہنے لگے ——— بیل بچارے بہت تھک گئے تھے اس لئے آہستہ آہستہ قدم بڑھا رہے تھے ———

"سرکار! ——— وہ دیکھئے، آگیا زمیندار صاحب کا مکان" گاڑی بان نے کہا ——— ہیڈ ماسٹر صاحب نے اطمینان کی ایک لمبی سانس لی ——— "ڈنگ، ڈانگ، ڈنگ" بیل بھاگنے لگے۔ ان کی گردن میں بندھے ہوئے گھنٹوں کی آواز سن کر نیلکنٹھ اور بھولا ان کی طرف دوڑ آئے۔

"نمستے ہیڈ ماسٹر صاحب!" زمیندار صاحب نے کہا۔ "سفر میں آپ کو کچھ تکلیف تو نہیں ہوئی"۔ "جی بالکل نہیں" ہیڈ ماسٹر صاحب نے مسکراتے ہوئے کہا۔ "چلئے اندر تشریف لے چلئے"۔

ہیڈ ماسٹر صاحب کا سامان بالکل مختصر تھا۔ ایک بستر، ایک صندوق، ایک لوٹا اور بس۔ لیلا ہیڈ ماسٹر صاحب کو دیکھ کر اندر بھاگ گئی اور اپنی ماں سے کہا: "ماں! ——— وہ آگئے" ——— "بڑی خوشی کی بات ہے" نرملا نے کہا ——— زمیندار صاحب اور ہیڈ ماسٹر صاحب دونوں ایک وسیع کمرے میں داخل ہوئے زمیندار صاحب نے ہیڈ ماسٹر صاحب کو صوفہ پر بیٹھنے کا اشارہ کیا اور خود بھی ایک کرسی پر بیٹھ گئے۔ "آپ نے اب تک کھانا نہیں کھایا!" ہیڈ ماسٹر نے دریافت کیا۔ "جی نہیں ——— بھلا مہمان کو چھوڑ کر ہم کیسے کھا سکتے تھے"۔ "اوہو ——— آپ نے بڑی تکلیف کی" ——— زمیندار صاحب نے ہیڈ ماسٹر صاحب کے سامان کو دیکھ کر کہا "آپ کا اتنا تھوڑا سامان! ——— کیا باقی گاؤں ہی میں چھوڑ آئے؟" ——— "جی نہیں ——— بس میں اکیلا ہوں اور اتنا ہی سامان ہمیشہ ساتھ رکھتا ہوں"۔

بجلی کی روشنی سے کمرہ بقعۂ نور بنا ہوا تھا ——— کمرہ کے بالکل وسط میں ایک گول اور خوبصورت میز تھی جس پر گلدان رکھا ہوا تھا ——— اور ایک جانب دیوار سے لگی ہوئی ایک بڑی الماری تھی جس میں کتابیں نہایت سلیقہ سے رکھی گئی تھیں۔ دیوار پر چاروں جانب دلفریب مناظر کی تصویریں لگی ہوئی تھیں۔ اور دروازہ کے بالکل سامنے ایک بڑی گھڑی دیوار سے لگی ہوئی تھی جس کی شکل سے معلوم ہو رہا تھا کہ بچاری کم از کم سو سال سے زمیندار صاحب کے مکان والوں کی خدمت کر رہی ہوگی۔ زمیندار صاحب کی عمر پچپس کے لگ بھگ تھی مگر زیادہ وہ قدامت پسند نہ تھے۔ فیشن کی ہوا رام پور پر سے بھی ہو گزری تھی۔ ایک طرف، کھڑکی کے پاس ایک خوبصورت میز پر ریڈیو بھی رکھا ہوا تھا۔ غرض زمیندار صاحب کے کمرہ کا جائزہ

لینے کے بعد یہی معلوم ہوا کہ وہ بھی روشن خیال آدمی ہیں۔

"ٹن ٹن ......" گھڑی نے گیارہ بجائے ـــــ اور اتنے میں بھولو نے آکر کہا "صاحب! ـــــ کھانا تیار ہے"۔

"چلئے ہیڈ ماسٹر صاحب منہ ہاتھ دھو لیجئے" ـــــ ہیڈ ماسٹر صاحب اٹھے اور زمیندار صاحب کے ساتھ مکان کے اندرونی حصہ میں داخل ہوئے۔ وہ ایک طویل قامت اور شکیل نوجوان ہیں۔ سینہ چوڑا اور دیکھنے میں اتنے موٹے بھی نہیں کہ بھدے معلوم ہوں۔ پیشانی بہت اونچی ہے اور ایسا معلوم ہوتا ہے کہ آدھا سر پیشانی ہی میں تبدیل ہو گیا ہے! آنکھیں بڑی اور خوبصورت ہیں اور ان میں ایک خاص چمک بھی ہے۔ باتیں بہت آہستہ اور دھیمی آواز میں کرتے ہیں۔ چہرہ پر ہمیشہ سنجیدگی کی کیفیت طاری رہتی ہے۔

"یہ میری بیوی ہیں ـــــ اور یہ میری ایک اکلوتی بیٹی لیلا" زمیندار صاحب نے تعارف کرایا ـــــ "آپ کو دیکھ کر ہمیں بڑی مسرت ہوئی" زمیندار صاحب کی بیوی نے مسکراتے ہوئے کہا۔ ہیڈ ماسٹر صاحب زمیندار صاحب کے حسنِ سلوک سے بہت متاثر ہوئے۔ "ہیڈ ماسٹر صاحب آپ اکیلے آئے ہیں! ..... اور ...... آپ کی وہ" نرملا نے دریافت کیا ـــــ "نہیں۔ میری ابھی شادی نہیں ہوئی" ـــــ "اسی لئے تو سامان اتنا مختصر ہے۔ ورنہ یہ ڈھیر کا ڈھیر ہوتا ...... اور .... چیاں، پیاں کی آواز! ـــــ" نرملا نے مذاق کے انداز میں کہا اور سب ہنسنے لگے ـــــ ہیڈ ماسٹر صاحب کو ان کا یہ مذاق بہت پسند آیا۔ "شاید ہیڈ ماسٹر صاحب کو ہمارا کھانا پسند نہ آیا ہو گا" زمیندار نے کہا۔ "کیا کہتے ہیں آپ بڑا ذائقہ دار تھا ـــــ"

"آپ کے مدرسے میں کتنے لڑکے ہیں؟" ہیڈ ماسٹر صاحب نے پان کھاتے ہوئے دریافت کیا۔ "ہوں گے کوئی دو سو کے قریب"۔ زمیندار نے جواب میں کہا "پہلے کے ہیڈ ماسٹر صاحب بہت بیمار ہیں اور کام کرنے کے قابل نہیں ہیں۔ اتنے دن تو میں ہی جا کر مدرسے کا کام بھی کر لیا کرتا تھا ـــــ مگر ایک وقت میں دو دو کام کیسے کر سکتا ہوں۔ اِدھر زمینداری اور اُدھر ہیڈ ماسٹری ـــــ ہم خوش قسمت ہیں کہ آپ ہمیں مل گئے" ـــــ "آپ کی مہربانی ہے" ـــــ "کل سویرے آپ اور ہم مل کر مدرسے کو جائیں گے۔ تمام مدرسین سے ملاقات کراؤں گا اور کل ہی سے اگر آپ تیار ہیں تو سارا کام آپ کے سپرد کر دیا جائے گا"۔ زمیندار صاحب نے کہا ـــــ "جیسی آپ کی مرضی" ـــــ ہیڈ ماسٹر نے دبی ہوئی آواز میں جواب دیا ـــــ اور اس کے بعد زمیندار صاحب نے ہیڈ ماسٹر صاحب کو ان کا کمرہ بتا دیا اور خود آرام کرنے چلے گئے۔

(۲)

دوسرے دن صبح ہی ناشتے کے بعد دونوں نے مدرسے کا رخ کیا۔ تمام لڑکے جو باہر میدان میں کھیل رہے تھے زمیندار صاحب کو آتے دیکھ کر اپنی اپنی کلاسوں میں بھاگ گئے۔ گوکل بابو جو اس مدرسے کے پرانے ماسٹر تھے زمیندار صاحب کے استقبال کے لئے آگے بڑھے۔ گوکل بابو نے بڑی عزت کے ساتھ اپنا سر جھکایا اور کہا "نمستے" ـــــ تینوں مدرسے میں داخل ہوئے۔ اتنے میں ایک بچہ بھاگتا ہوا زمیندار صاحب کے پاس آیا اور ان کا ہاتھ اپنے ہاتھ میں لیتے ہوئے کہا ـــــ "بابو صاحب! ـــــ ہمارے نئے ہیڈ ماسٹر صاحب کب آئیں گے؟" "لو، یہ رہے تمہارے ہیڈ ماسٹر" زمیندار نے ہیڈ ماسٹر کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا ـــــ "آپ .....! نمستے! ـــــ" "آپ ہماری کلاس کو پڑھائیں گے نا ہیڈ ماسٹر صاحب؟" "ہاں ہاں" ہیڈ ماسٹر نے ہنستے ہوئے جواب دیا ـــــ

اس کے بعد وہ چاروں طرف نظر دوڑانے لگے ——— مدرسے کی حالت نہایت ابتر تھی ——— بالکل دیہاتی مدرسہ معلوم ہوتا تھا ——— کئی دنوں سے دیواروں کو چونا نصیب نہ ہوا تھا ان پر دو دو انچ گرد جمع ہو گئی تھی ——— چھت پرانی قسم کی تھی اور اس میں جا بجا سوراخ پڑ گئے تھے اور سورج کی روشنی چھن چھن کر کمروں میں داخل ہو رہی تھی ——— بعض جماعتوں کی کھڑکیاں اور دروازے ٹوٹ گئے تھے۔

چند کمرے تو بالکل تاریک اور بند تھے ۔ ہیڈ ماسٹر صاحب کی نظر نے ان سب کا معائنہ کیا ۔ انھیں مدرسہ کی اس ابتر حالت کو دیکھ کر بہت صدمہ ہوا ——— مگر اس ابتر حالت کے ذمہ دار زمیندار صاحب نہیں تھے۔ انھوں نے ترمیم کے لئے سابق ہیڈ ماسٹر صاحب کو رقم کی منظوری دے دی تھی لیکن بوڑھے ہیڈ ماسٹر بہت لاپرواہ اور سست آدمی تھے ——— چند اور جماعتوں کا معائنہ کرنے کے بعد ہیڈ ماسٹر صاحب اپنے اجلاس کی طرف بڑھے۔ "ہیڈ ماسٹر صاحب یہ آپ کا اجلاس ہے۔ مگر ابھی اس میں کچھ ترمیم کرنی ہے۔ سابق ہیڈ ماسٹر صاحب بہت کاہل اور لاپروا واقع ہوئے تھے اس لئے اجلاس میں کوئی تبدیلی نہ ہو سکی۔ حالانکہ میں نے اس کام کے لئے روپیہ بھی دیدیا تھا ——— یہ دروازہ ٹوٹ گیا ہے' یہ کرسی اور میز بھی بدل دینا ہے"۔ "کوئی بات نہیں ——— یہ کام میں کرا دوں گا" ——— کچھ دیر بعد زمیندار نے کہا "اچھا ہیڈ ماسٹر صاحب! ——— اب آپ ہمیں اجازت دیں۔ مجھے اور بہت سے کام ہیں" ——— اور رخصت ہو گئے ———

ہیڈ ماسٹر صاحب نے اپنے دائیں طرف کی کھڑکی میں جھانکا ——— صحن میں چند پھولوں کے درخت اور ایک طرف کوڑا کرکٹ کا ڈبہ نظر آیا ——— اس مختصر سے باغ کی حالت بھی ابتر تھی۔ تمام درخت سوکھنے لگے تھے۔ پھول مرجھائے ہوئے تھے شائد کئی دن سے انھیں پانی میسر نہ آیا تھا ——— کچھ دیر کھڑے رہنے کے بعد وہ اپنے اجلاس کی کرسی پر بیٹھ گئے۔ وہ مدرسہ کی ترمیم کے متعلق سوچ رہے تھے ——— چند منٹ گذرنے کے بعد ہوا کا ایک جھونکا آیا ——— اجلاس میں ایک دم بدبو اٹھی۔ ہیڈ ماسٹر صاحب ایک چھلانگ مار کر اجلاس کے باہر آ گئے۔ بوڑھے منشی نے گھبرا کر ہیڈ ماسٹر صاحب سے دریافت کیا "کیا بات ہے سرکار؟" "بھئی وہاں بڑی بدبو ہے ———" "شاید چوہا اور ہا مر گیا ہوگا سرکار اس میں ——— کئی دن سے اجلاس خالی پڑا تھا" منشی نے ڈرتے ہوئے کہا۔ "تو کیا ہوا ——— اب صاف کرا دیجئے"۔

ہیڈ ماسٹر صاحب کھڑے کھڑے منشی صاحب کی میز پر رکھے ہوئے نقشوں کو دیکھنے لگے ہندوستان کا نقشہ بالکل پرانا تھا۔ اور دوسرے نقشے جابجا پھٹ گئے تھے ——— "منشی صاحب! ——— ذرا مدرسے کا ٹائیم ٹیبل تو بتائیے ———"

منشی صاحب نے تختۂ اوقات پیش کر دیا۔ اس میں بہت سی باتیں اصلاح طلب تھیں۔ ریاضی جیسے پیچیدہ مضمون کو دوپہر میں رکھا گیا اور جسمانی ورزش کے لئے کوئی خاص وقت مقرر نہ تھا اور لفظ "ڈبیٹ" تو نظر ہی نہیں آ رہا تھا۔ اس لئے ہیڈ ماسٹر صاحب نے اس میں ضروری رد و بدل کر دی اور مختلف جماعتوں کے لئے مختلف تختۂ اوقات نوٹس بورڈ پر چسپاں کر دیے گئے۔

"منشی صاحب! ——— میں یہ بہتر سمجھتا ہوں کہ آج مدرسہ کو چھٹی دیدی جائے اور تمام مدرسین کی ایک کمیٹی مقرر ہو تاکہ چند ضروری باتوں سے متعلق بحث کی جائے۔" ہیڈ ماسٹر صاحب نے کہا۔

تعطیل کی خبر سن کر تمام لڑکے خوش ہو گئے اور کودتے ہوئے باہر چلا گئے۔ مدرسین کی ایک کمیٹی مقرر ہوئی جس میں یہ طے ہوا کہ لڑکوں کو خاص طور سے جسمانی ورزش کی طرف

راغب کیا جائے اور یہ کہ لڑکوں میں یک رنگی خاصیت (Spirit d' Corpo) یا جوش اتحاد پیدا کردے اور ہر ہفتہ میں ایک دن تقریری مقابلہ بھی ہو —— غرض اس قسم کی چند ضروری باتوں پر بحث ہونے کے بعد کمیٹی برخاست ہوئی ——

دوپہر کا وقت تھا ہیڈ ماسٹر صاحب بہت تھک گئے تھے۔ مکان واپس آنے پر زمیندار صاحب نے دریافت کیا۔ "کیوں جناب! —— آج آپ نے بڑی دیر کی ؟" —— "چند ضروری باتوں پر بحث ہو رہی تھی —— مثلاً" —— "خیر —— وہ آپ بعد میں بتائیے۔ چلئے اب کھانا کھالیں۔ آپ بہت تھک کر آئے ہیں۔"

کھانے سے فراغت پانے کے بعد زمیندار صاحب نے کہا "ہیڈ ماسٹر صاحب! —— آپ نے شاید ہماری لائبریری نہیں دیکھی ہے۔ چلئے بتاؤں" —— دونوں لائبریری میں داخل ہوئے۔ زمیندار صاحب کی لائبریری بہت بڑی تھی۔ اس میں چاروں طرف بڑی بڑی الماریاں رکھی ہوئی تھیں جس میں مختلف قسم کی کتابیں نہایت سلیقہ سے جمائی گئی تھیں —— زمیندار صاحب کو کتابوں کے مطالعہ کا بہت شوق تھا۔ چنانچہ ہر وقت ان کے ہاتھ میں کوئی نہ کوئی کتاب ہوتی تھی۔ ہیڈ ماسٹر صاحب نے یکے بعد دیگرے تمام الماریوں کا معائنہ کیا۔ ہیڈ ماسٹر صاحب کو اس قیمتی مجموعہ کو دیکھ کر بڑی حیرت ہوئی۔ اور دل ہی دل میں زمیندار صاحب کے اس نیک شوق کی تعریف کرنے لگے —— "واقعی آپ نے زبردست لائبریری تیار کی ہے" —— "میں نے چند اور کتابوں کے لئے آرڈر روانہ کیا ہے۔ امید ہے کہ جلد آجائیں گی۔" زمیندار نے خوش ہوتے ہوئے کہا: "ہیڈ ماسٹر صاحب مجھے کتابوں سے محبت ہوگئی ہے۔ اور میری بیٹی لیلا کو بھی مطالعہ کا بہت شوق ہے۔ اس لئے میں نے اتنی کتابیں جمع کی ہیں —— کچھ دیر بعد زمیندار صاحب نے کہا" ہاں۔ تو آج کن ضروری باتوں پر بحث ہوئی؟" "یہی لڑکوں میں جوش اتحاد پیدا کرنا، انھیں جسمانی ورزش کی طرف خاص طور سے راغب کرنا اور ہر روز انھیں اپنے افعال اور کام کو نوٹ بک میں درج کرنے کے لئے کہنا وغیرہ وغیرہ —— میرا خیال ہے کہ اس لڑکے کے لئے کوئی انعام مقرر کریں جو ایک دن میں زیادہ سے زیادہ اچھے کام کرتا ہے۔ اس طرح ہم لڑکوں کو اچھے کاموں کی طرف راغب کر سکتے ہیں —— آپ کا کیا خیال ہے؟" —— "بالکل درست ہے۔ واقعی آپ ایک قابل ہیڈ ماسٹر ثابت ہوئے۔" "یوں تو میرے نزدیک اور بہت سے کام ہیں لیکن ان سب کو وقتِ واحد میں پایۂ تکمیل کو پہنچانا مشکل ہے۔ میں چاہتا ہوں کہ وہ تمام خامیاں جو آج کل کے طالب علم میں پائی جاتی ہیں دور کردیں اور اس کو حقیقی معنوں میں طالب علم بنائیں —— "ٹھیک ہے" زمیندار نے الماری سے ایک کتاب کو باہر نکالتے ہوئے کہا —— "اچھا اب آپ آرام فرمائیے ——" ہیڈ ماسٹر صاحب نے کہا اور اپنے کمرے کی طرف چلے گئے۔

(۳)

ہیڈ ماسٹر صاحب اپنے کمرے میں جاکر کسی رسالہ کے مطالعہ میں مصروف ہوگئے۔ کچھ دیر بعد کسی کے پاؤں کی آہٹ سنائی دی۔ ہیڈ ماسٹر صاحب چونک پڑے "May I come in sir" لیلا نے جھجکتے ہوئے دریافت کیا "جی۔ ضرور" —— لیلا ہیڈ ماسٹر صاحب کے پاس گئی اور ایک لفافہ ان کی طرف بڑھاتے ہوئے کہا "یہ لیجئے آپ کا خط" —— "شکریہ" —— "جی کوئی

بات نہیں تھی ۔۔۔۔ کہہ کر لیلا بھاگ گئی۔ ہیڈ ماسٹر صاحب حیران تھے کہ انھیں آئے ہوئے ابھی دو دن بھی ہوئے نہ تھے کس نے خط لکھا۔ انھوں نے لفافہ چاک کیا خط ان کے دوست نریندر کا تھا۔ شاید ناظرین خط کا مضمون جاننا چاہتے ہوں گے مگر کوئی اہم خط نہ تھا۔ ان کے دوست نریندر نے ہیڈ ماسٹر صاحب سے التجا کی تھی کہ اس کے لئے بھی اگر کوئی جگہ خالی ہو تو دلا دیں۔ لیکن ہیڈ ماسٹر صاحب خود نئے تھے۔ یہ کام ذرا مشکل تھا۔ ہیڈ ماسٹر صاحب اسی بارے میں سوچتے سوچتے سو گئے جب آنکھ کھلی تو دیکھا کہ شام ہو چکی ہے۔ لیکن وہ بہت اداس معلوم ہو رہے تھے۔ انھوں نے خواب میں دیکھا کہ ان کا دوست نریندر ان سے التجا کر رہا ہے کہ اسے بھی کہیں نوکری دلا دی جائے اور اس کی بیوی اور بچے رو رہے ہیں۔ انھیں کئی دن سے کھانا نصیب نہیں ہوا۔ حالانکہ نریندر بھی ایک گریجویٹ ہے۔ گر در در کی ٹھوکریں کھانے کے باوجود کہیں ملازمت نہ ملی ہیڈ ماسٹر صاحب کو اپنے دوست کی ابتر حالت پر رحم آیا اور وہ بے قرار ہو کر چلا اٹھے دوست! تمھیں اگر نوکری نہ ملی تو میں بھی اپنی چھوڑ دوں گا ۔۔۔ اتنے میں ان کی آنکھ کھل گئی۔

شام کا وقت تھا ۔۔۔۔ پھولوں کی خوشبو سے معطر ہوا کے جھونکے یکے بعد دیگرے آ رہے تھے۔ آفتاب غروب ہونے کو تھا۔ اس کی آخری اور زرد زرد کرنیں دریا کی شفاف سطح پر رقصاں تھیں ۔۔۔۔ اور دوسری طرف وہ رنگ برنگ کے پھولوں کے لب چوم رہی تھیں ۔۔۔۔ ایسا معلوم ہوتا تھا کہ وہ ان کو بوسے دے رہی ہیں۔ دور ۔۔۔ کھیت میں کسان گا رہے تھے۔ پرندے ادھر ادھر شور مچاتے ہوئے اڑ رہے تھے ۔۔۔۔ ہیڈ ماسٹر اکیلے ۔۔۔۔ ایک بڑے پتھر پر بیٹھے ہوئے کسی خیال میں گم تھے ۔۔۔۔ وہ یکایک کسی آواز سے چونک اٹھے مگر وہاں کوئی نہ تھا ۔۔۔۔ انھوں نے چاروں طرف دیکھا ۔۔۔۔ قدرت سورج کی گرمی سے آزاد ہو کر ایک اور مرتبہ مسکرا رہی تھی ۔۔۔۔ تمام کلیاں مکمل کر پھول بن گئی تھیں۔ ہیڈ ماسٹر صاحب کی نظر ہر ایک درخت اور گل تک گئی اور پھر ندی کی طرف۔ ندی نہایت اطمینان سے بہہ رہی تھی ۔۔۔۔ ان کی نظریں ندی کے ساتھ ساتھ سفر کرنے لگیں لیکن ایک جگہ جا کر جہاں ندی پہاڑوں کے پیچھے چلی جاتی ہے۔ ان کی نظریں رک گئیں۔ ندی ایک مست ناگن کی طرح بل کھاتی ہوئی چلی گئی تھی۔ ہیڈ ماسٹر صاحب کا دل وہاں کے ان دلفریب اور نظر نواز مناظر کو دیکھ کر مسرت سے بھر گیا۔ وہ کچھ دیر کے لئے نریندر کو بھول کر قدرت کے اس رنگین منظر میں کھو گئے۔ ہیڈ ماسٹر صاحب کو بچپن ہی سے نیچر سے دلچسپی تھی۔ ان کی آنکھیں ہمیشہ نظر فریب نظاروں اور خوش نما مناظر کی متلاشی رہتی تھیں ۔۔۔۔ نیچر کی رنگینی کو دیکھ کر ہر ایک اداس دل کچھ دیر کے لئے ہلکا ہو جاتا ہے ۔۔۔۔ ہیڈ ماسٹر صاحب کی عادت تھی کہ وہ ہمیشہ جب اکیلے ہوتے تو کسی نہ کسی خیال میں گم رہتے۔ وہ کہا کرتے تھے "مجھے بحر خیالات میں بہنے میں بڑا مزہ آتا ہے"۔ لیکن وہ زیادہ تنہائی پسند بھی نہ تھے۔ ہر ایک سے ہنستے ہوئے ملتے تھے وہ نہایت خوش مزاج اور شریف آدمی تھے ان کے سینے میں ایک انسان کا سا دل تھا اور اس دل میں درد، اور یہی درد انھیں ہمیشہ بے قرار رکھتا تھا۔ یہ درد کسی محبوبہ کے لئے نہ تھا بلکہ ملک و قوم کی ڈوبتی ہوئی حالت کے لئے ۔۔۔۔ غریب اور مفلسوں کی قابل رحم حالت کے لئے ۔۔۔۔ لوگوں کے دماغ ابھی اتنے روشن نہیں کہ وہ اصلاح پسند علما کی باتوں کو قبول کر لیں۔ اگر کوئی شخص سماج کے خلاف آواز بلند کرتا ہے تو اسے خارج از ذات کر دیا جاتا ہے۔ ہر طرف سے

گالیوں کی بوچھاڑ ہوتی ہے۔ ہر شخص اسے کوستا ہے اور کبھی کبھی پتھروں کی بارش بھی شروع ہوجاتی ہے!—— غرض آخرکار اس دردمند کی آواز نحیف ہوتے ہوتے نابود ہوجاتی ہے —— ہیڈ ماسٹر صاحب نے ان تمام باتوں پر غور کیا۔ ایسے ماحول اور ایسی فضا میں یہ ناممکن تھا کہ اکیلا کسی کام کی اصلاح پر کمر باندھ کھڑا ہوجائے۔ اس کے لئے ساتھیوں کی ضرورت تھی۔ لیکن سچے ساتھیوں کا ملنا بھی دشوار ہوتا ہے۔ وہ لوگ کس کام کے جو اس طرف کو جھک جاتے ہیں جدھر وزن زیادہ ہوتا ہے۔ پنڈتوں اور مہاجنوں کی ڈانٹ ڈپٹ اور برسر اقتدار لوگوں کی گرج اور غصہ سے لوگ ڈرتے تھے۔ کئی بار چند لوگوں نے چاہا کہ اپنے سماج کے خلاف آواز بلند کریں اور اس کی خامیوں کو روشنی میں لائیں لیکن پھول کو کھلنے سے پہلے ہی مسل دیا جائے —— تو کیا کریں؟ —— اس کی خوشبو جو خود انہی کے دماغ کو معطر کرنے والی تھی —— اب کیسے پیدا ہو؟ —— یہ ایک مانی ہوئی بات ہے کہ سچی بات کڑوی لگتی ہے لیکن لوگ جھوٹ کے میٹھے زہر کو بڑی خوشی سے پی جاتے ہیں ——

غرض ہیڈ ماسٹر صاحب کے دماغ میں اس وقت اسی قسم کے خیالات آرہے تھے۔ وہ بہت دیر تک اسی حالت میں بیٹھے رہے۔ یہاں تک کہ شام رات میں تبدیل ہونے لگی جب کسی آواز سے ہیڈ ماسٹر صاحب کا سلسلۂ خیال ٹوٹا تو انھوں نے دیکھا کہ رات ہو چلی ہے۔ وہ نہایت تیزی سے گھر پہنچے۔ گھر پر زمیندار صاحب اور ان کی اکلوتی بیٹی خوش گپیوں میں مصروف تھی۔ ہیڈ ماسٹر صاحب بھی ان میں مل گئے۔ "ہیڈ ماسٹر صاحب آج آپ تفریح کے لئے کدھر گئے تھے؟" زمیندار نے دریافت کیا۔ "ندی کنارے" —— "بڑا اچھا مقام ہے" ہیڈ ماسٹر صاحب نے کہا —— "ہاں —— لیلا کو بھی وہ جگہ بہت پسند ہے اور وہ بھی اکثر ادھر ہی جایا کرتی ہے"۔ "لیکن آج تو نہیں آئی تھیں" —— ہیڈ ماسٹر نے کہا۔ "جی۔ آج میری طبیعت کچھ سست تھی" لیلا نے کہا —— اتنے میں اس کی ماں نرملا دیوی بھی آگئیں —— "اوہو! —— ہیڈ ماسٹر صاحب نمستے! —— آپ نے ٹائم ٹیبل میں واقعی اچھی تبدیلی فرمائی ہے۔ بوڑھے ہیڈ ماسٹر کو نہ معلوم کیا ہو گیا تھا جو انھوں نے ریاضی جیسے پھیکے مضمون کو دوپہر میں رکھ دیا تھا اور اب تک مباحثہ کے لئے کوئی وقت مقرر نہ تھا۔ لڑکوں کو تقریر کی عادت ڈالنی چاہیے ——" "ہاں —— ٹھیک ہے" زمیندار صاحب نے کہا —— کچھ دیر بعد نوکر نے آکر اطلاع دی کہ کھانا تیار ہے اور وہ سب اٹھ کر اندر چلے گئے۔

"اُف!" کہہ کر لیلا نے جلدی سے اپنا ہاتھ تھالی سے نکال لیا۔ چاول بہت گرم تھے۔ اس لئے اس کی نازک انگلیاں جل گئیں۔ ماں باپ تو ہنسنے لگے لیکن ہیڈ ماسٹر صاحب اس وقت خاموش رہنا مناسب سمجھے —— چند لمحوں بعد ہیڈ ماسٹر نے کہا "زمیندار صاحب یہاں اچھے مکانات کرایہ پر مل سکتے ہیں؟" "لیکن اب کس کو ضرورت ہے"؟ —— "مجھے ..... میرا ارادہ ہے کہ......" —— "بس کیجئے صاحب! آپ ہمارے ساتھ ہی رہیں گے" نرملا دیوی نے کہا —— "ہاں ہاں۔ بڑی خوشی ہوگی ہمیں اگر آپ ہمارے ساتھ رہنا منظور فرمائیں" —— زمیندار صاحب نے کہا۔ اب ہیڈ ماسٹر صاحب سوچ میں پڑ گئے "اس میں سوچنے کی کیا بات ہے ہیڈ ماسٹر صاحب" نرملا دیوی نے کہا۔ "نہیں....... میں

سوچ رہا تھا...... کہ" "بس ہم نے کہہ دیا کہ آپ ہمارے ساتھ رہیں گے۔ اب آپ خاموش رہیئے اور پھر اس بارے میں کبھی نہ بولیں" نرملا دیوی نے ان الفاظ کو اس انداز میں کہا کہ ہیڈ ماسٹر صاحب کو سر تسلیم خم کرنا پڑا ———

(باقی آئندہ)

جے، آر، دیسائی

ساقی!

مجھے ساقی حیاتِ نو عطا کر

یہ آفاتِ جہاں، آلامِ پیہم
پیامِ مرگ سے ہرگز نہیں کم
تری چشمِ عنایت پھر گئی ہے
کوئی یہ زندگی بھی زندگی ہے؟
خدارا بخششِ ماضی بھلا کر   پلا کر مئے رخِ رنگیں دکھا کر
مجھے ساقی حیاتِ نو عطا کر

(۲)

ترے قبضہ میں ساقی کیا نہیں ہے
تری محفل میں ہے عشرت ہی عشرت
ترا پیمانہ لبریزِ محبت
تری آنکھیں ہیں پیمانے کی تفسیر
یہ چھلکاتی ہیں میخانے کی تقدیر
تری آغوش فردوسِ بریں ہے   خدارا وصل کا مژدہ سنا کر
مجھے ساقی حیاتِ نو عطا کر

(۳)

ذرا تو دیکھ میخانے کی حالت
یہاں میکش نہیں اب بوالہوس ہیں
کہاں پروانہ؟ سب شکلِ مگس ہیں
مئے پندار سے مخمور ہیں یہ
حقیقت سے بہت ہی دور ہیں یہ
ہو میرے حال پر چشمِ عنایت   ریاکاروں کی صحبت سے بچا کر
مجھے ساقی حیاتِ نو عطا کر

(۴)

اٹھا دے پردۂ رازِ حقیقت
نہ ہو کچھ فکر مجھ کو ماسوا کی
نہ گنجائش رہے چون و چرا کی
قیامت تک نہ میں آپے میں آؤں
خودی کیا ہے خدا کو بھول جاؤں
پلا کر جلد اک جامِ حقیقت   مٹا کر ہستیِ فانی مٹا کر
مجھے ساقی حیاتِ نو عطا کر

عطا (کلیانوی)

مکتوبِ رموزی

(بقلم خود)

عزیز مدیر "سب رس" کو بعد دعائے درازیٔ عمر اور رسالہ معلوم ہو کہ الحمد اللہ یہاں پر خیریت ہے صرف بارش نے گھر دیکھ لیا ہے یعنی جغرافیہ پڑھنے والوں نے بتایا ہے کہ میرا مکان بحیرۂ ہند سے روانہ ہونے والی بارشی ہواؤں کے خط میں ایک طرح سے خط استوا کا کام دیتا ہے اگرچہ میں بقلم خود اپنے گھر کے برج جدی میں یا یوں سمجھئے کہ میں اپنے مکان کے جغرافیہ کے حساب سے اپنے گھر کے دکن میں مع الماری اور دوسرے کاغذات از قسم مضامین، تصنیفات، دواوین، اور سیاسی تجاویز از قسم چرخہ، عدم تعاون، ترک موالات، مقاومتِ مجہول و معروف، بھوک ہڑتال، مجلس قانون ساز کی رکنیت لیگ کے اجازت نامہ احتجاج، اور طویل خطبات صدارت کے ہمراہ رہتا ہوں مگر بارش جب بھی آتی ہے مکان کے نیم تمام ہونے سے ایسا محسوس ہوتا ہے گویا شب کو میری چارپائی کے نیچے جرمنی کی آبدوز نے تارپیڈو مارا ہے اور میں اٹلانٹک میں بغیر وصیت نامہ لکھے غرق ہو رہا ہوں، حد یہ ہے کہ پرسوں میرے بھائی نمبر ۲ کے دولت خانے کی دیوار اسی بارشی یو بوٹ کے ہاتھوں منہدم ہو گئی اور خیر و عافیت آن محترم کی مع خورد و کلاں کے درگاہ خداوند کریم سے شب و روز نیک مطلوب،

دیگر احوال یہ ہے کہ میری عادت یہ ہے کہ میں ہر آنے والے رسالے میں اپنے مضمون کو اس لئے سب سے پہلے پڑھتا ہوں کہ دیکھوں کاتب صاحب نے کہاں کہاں اور کس کس طرح ہاتھ صاف فرمایا ہے اس کے بعد بقیہ مضامین پر "پرندجا فورانہ نظر" یا درخت کی بیلوں کی طرح کی "پھسلتی ہوئی نظر" ڈالتا ہوں، اب جس جگہ نظر یہ مصرع بن جاتی ہے کہ ؎

کرشمہ دامن دل می کشد کہ جا اینجا است

بس وہیں سے کھانا کھاتے وقت پڑھنے لگتا ہوں کیونکہ کھانا کھانے کے بعد سے دوسرے کھانے کے وقت تک "بیویوں کے محوری لشکر ہوتے ہیں" اور یہ نیاز مند اس لئے اس مرتبہ کے "سب رس" کے صفحہ دو اور پر دس پر جناب شور ایم اے کی غزل پر نظر پڑی تو چند لمحے سوچتا رہا کہ یہ ناگپور والے پروفیسر منظور حسین شور ہیں یا کوئی اور صاحب، مگر ان کے ان دو شعروں سے یقین کرنا پڑا کہ یہ یقیناً وہی شور صاحب ہیں جو اپریل ۱۹۴۲ء میں میرے اور آپ کے ساتھ ناگپور میں اٹھتے بیٹھتے تھے، چنانچہ ان کی پہچان کے اشعار یہ ہیں کہ

تلاطم کی عظمت مسلم تو ہے کنارہ پہ تکیہ کیا جائے نا
دعا اور اس کے اثر کی تلاش عبادت کو رسوا کیا جائے نا؟

ان اشعار کی فلسفیت اور منطقیت کو جب میں نے بالغ نظر منظور شور کی ذہنی صلاحیتوں سے ملایا تو یقین رتبہ حق الیقین تک مستحکم ہو گیا، اس کے بعد غزل کے اس شعر نے تو میری اور مولوی حیات مہری کی جان لے لی کہ ؎

چل اس سے بھی آگے چلیں اے جنوں ، حرم تک تو آکر رکا جائے نا

جان یوں خطرے میں پڑ گئی کہ حیات مہری تو ایک طرح کے دائمی معتکف ہیں اور میں اپنے وقت کا ہندوستانی مستشرق چنانچہ جواہر اور علم ستارہ کی تحقیق کے سلسلہ سے جب میں ریاست میسور کے ایک سرحدی پہاڑی علاقہ سے گزر رہا تھا تو وہاں چند دیہاتی لڑکیاں ایک خاص باجہ کے ساتھ اس نوع کا مصرع گا رہی تھیں کہ ؎

بنا ان کے ہم سے رہا جائے نا

ممکن ہے مصرع مجھے غلط یاد ہو مگر ردیف وقافیہ میں کوئی کلام نہیں پھر اس پر دوشیزگی کی آوازیں اور ان کا "ونیزر ڈوبیان" کی گرفت سے زیادہ دل گیر انداز،

الحاصل شوہر کی غزل نے میرے اس پہاڑی وقفہ کو یاد دلادیا، لیکن میرا خیال ہے کہ بیوی کے علم میں اگر شوہر شاعر ثابت ہو جائے تو میرے عقیدہ میں اس سے سخت بدنصیبی کوئی اور نہیں اسی لئے میں حیات بھری کے اس پہاڑ پر چڑھ گیا جہاں وہ وقت قرار تے ہیں اور غزل کہی۔

لیکن اب میرے غزل پن میں قدرے ترچھا پن ہے کیا میں نے کہ میں رباعی کو شاعر کا بڑا پایا مانتا ہوں اور غزل پر غزل کہنے کو شاعر کا انتقال اور چونکہ میرے ہاں ابھی "نکاح پر نکاح کئے جانے کی مہم جاری ہے اس لئے میں ابھی مزا بھی نہیں چاہتا ہوں اور اس غلیم و لعین غزل پر کہے بغیر بھی رہا نہ گیا تو ترکیب یہ کی کہ اپنی غزل کی ردیف کو چکر میں ڈال دیا، یعنی قانون "تعزیرات شعر" کی رو سے شوہر کی ردیف انکاری ہے اور میری ردیف "استفسار اثباتی" گر معاف کیجئے شعری مصطلحات سے چونکہ عربی اردو سے زیادہ گار طبعی ہونے والی تھی اس لئے اصل غزل ہی ارسال ہے اب اگر پسند آجائے تو اتنا کرم کیجئے گا کہ کاتب صاحب سے میری طرف سے درجہ بدرجہ سلام کہہ کر کہہ دیجئے گا کہ میری غزل کو اگر نیزہ جانب سے لکھنے کے عوض بانس بریلی کے بانس سے لکھنے کا عرف جلی،

دیگر احوال یہ ہے کہ:۔

آپ نے بڑا کرم فرمایا جو میری بتائی ہوئی مضمون نگاروں کی "آزاد فرانسیسی جماعت" کے ارکان کے نام رسالہ "سب رس" جاری فرمادیا گویا امریکہ کی طرح آپ نے بھی ان لوگوں کو مضمون نگاری کے اسلحہ فراہم فرمادیئے۔ اب ایک ہی چیز ہے اور وہ یہ کہ جس طرح امریکہ و برطانیہ کی امداد سے آزاد فرانسیسی محوری لشکروں کا مقابلہ ڈٹ کر کریں گے میری مجلس کہ یہ "آزاد فرانسیسی" بھی انشاءاللہ "سب رس" کی مضمون نگاری کے مورچہ پر جان ہی دیدیں گے مگر کلمائی سے منہ نہ موڑیں گے اور اس طرح میرا مضمون نگارانہ ڈیگال پن "بھی مسلم رہے گا اور ان کا ہمارا "اٹلانٹک چارٹرانہ معاہدہ" بھی نافذ رہے گا، اودھر اردو میں ان نوجوانوں کی گویا "جبری بھرتی" بھی پوری ہو جائے گی اس لئے لازم و ملزوم طور پر اردو کی "ہائی کمانڈ مولوی عبدالحق صاحب" کی خوشنودی مزاج کا باعث ہوگی، اور جب یہ ہوگا تو ایک نہ ایک دن میرا بھرتی کیا ہوا یہ رسالہ تاریخ اردو میں وہی رتبہ پالے گا جو تاریخ فرانس میں مارشل پیتاں کی موجودہ رعایا کے مقابل آزاد فرانسیسی پاکر رہیں گے، البتہ ایک خاص بات یہ ہے کہ "سب رس" کے لئے مضمون نگاروں کے بھرتی کے فرائض ادا کرنے اور ان کو جدید اسلحہ عرف عصر حاضر کے ادبیات کو شاداب بنانے کی جو تربیت میرے ذمہ ہوسکتی ہے اس میں میرے نکاح پر نکاح کئے جانے کے مورچوں اور ان تک رسد اور کمک پہنچاتے رہنے کے لئے جو "مالی گلائیڈر" عرف رسد رسان ہوائی جہاز مجھے حاصل اور جمع کرنا پڑتے ہیں ان کی عظیم ذمہ داری کے پیش نظر میری کوتاہ کاریوں سے اگر درگزر فرمایا گیا تو انشاءاللہ اگر شریف ہوں تو میں بھی بہادر روسیوں کی طرح، سب رس " میں مضمون نگار پر مضمون نگار جھونکتا چلا جاؤں گا اور خاص بات یہ ہوگی کہ میں اپنے مرغا مرغیوں بکرا بکریوں گھوڑا گھوڑیوں اور کھٹملوں کے موسم بہار کے "بڑے حملہ" سے بہت پہلے ہی میں ایسے مضامین نگار بھرتی کرلوں گا جو ادبیات اردو میں تراجم پر تراجم اور فلمی ڈراموں کے خاکوں اور چربوں کو اڑا کر اردو کے رسالوں میں مضمون و افسانے کے نام سے شائع کرادینے کے عوض ان کے ذاتی دماغ سے پیدا کئے ہوئے جدید تر مقالات ہوں گے،

کیونکہ بدقسمتی سے اردو میں سب کچھ ہوا حتی کہ یورپی افریقی اور ایشیائی زبانوں کے تراجم اور حوالوں سے اب اردو کے منہ کا مزا اس حد تک خراب ہو چکا ہے کہ اگر اردو میں جلد سے جلد ذاتی سوچا ہوا پیش نہ کیا گیا تو ذہین دماغوں کو استلا کی شکایت ہو جائے گی، مگر افسوس کہ میں ذاتی غور و فکر سے لکھنے اور تصنیف کرنے کے لئے اردو میں سب سے پہلے کھڑا ہوں اور اس موضوع پر آج تک اکیلا ہی لکھ رہا ہوں مگر ہنوز کوئی محقق و مصنف دماغ میدان میں نظر نہ آیا، بلکہ جو کچھ لکھا جا رہا وہ آج بھی از سر سید تا ڈاکٹر اقبال ہی ہے جس کا صاف مطلب یہ ہے کہ اردو میں لکھنے والوں کی ذہانت میں وسعت نہ جدت اس لئے وہ ملا رموزی کا لکھا ہوا پڑھ کر پر تول کر رہ جاتے ہیں مگر محدود دماغ سے کوئی نادر ذخیرہ اردو میں پیش نہیں کر سکتے،

ممکن ہے کہ اس عہد کے اردو والے اردو کی وسعت کے جنرا فیے پیش فرمائیں مگر میرا خیال ہے کہ بہ لحاظ زبان' اردو نے ایک شوشے کے برابر بھی ترقی نہیں کی ہے ہاں یہ صحیح ہے کہ اردو بولنے اور سمجھنے والوں کی مردم شماری کے اعداد بڑھ گئے ہیں لیکن وہ خالص اردو نہیں بڑھی جو دوسری زبانوں سے قواعد اور تراجم لئے بغیر خود اس کے بولنے والوں کے ذاتی غور کئے ہوئے اور ایجاد کئے ہوئے اصول کی ترقی کو ثابت کرتی اس لئے اب تو میں اردو میں جس جہاد کی پرچم کشائی کر چکا ہوں اور جو اعلان جہاد آج سے دو برس پہلے کر چکا ہوں وہ یہ ہے کہ

"خدا کے لئے اردو میں تراجم کا دروازہ بند کر کے
"اپنے ذاتی دماغ سے اس کے جدید اصول و ضوابط
"وضع فرمائیے جیسا کہ میں نے جدید غزل کے جدید
"اصول و اسالیب بقلم خود وضع کئے ہیں اور جو الحمد کہ
"فارسی عربی اور یورپی زبانوں کے اصول سے اتنے

ہی دور ہیں جتنا ہندوستان سے امریکہ،

مگر مشکل یہ ہے کہ اردو میں واضعین زبان اور مقننین زبان کا مرحلہ یا مسئلہ فلکیات سے متعلق ہے نہ کہ حکومت ہند سے، کیونکہ جب تک کہ فوق الفطرۃ برقیت کے مالک پیدا نہ ہوں گے زبان کے اصول و ادب کے جدید ضوابط مرتب کر لینا کہنہ مشقی سے متعلق نہیں نہ عمدہ انگریزی دانی سے بلکہ یہ مسئلہ بھی علم ستارہ عرف نجوم ہی سے وابستہ ہے اور وہی بتا سکتا ہے کہ کس ستارہ کا کتنا نور یا برقیت حاصل کر کے کون شخص موجد ہو سکتا ہے اور کون نقال بہر حال اس بحث کو ادق اہم اور سنجیدگا ثابت کرنے سے میں پھر بحر العلوم بن کر "سب رس" کے حق میں ملا رموزی کے عوض علامہ مبلغ العلما" ہو کر رہ جاؤں گا اس لئے بارش بعد جناب کو میرے فرزند نمبر ۲ کے عقیقہ میں شرکت کرنا ہو گا تو اس وقت میں اردو کے جدید عہد کے آغاز کے چند اصول پیش کر دوں گا۔

دیگر احوال یہ ہے کہ الحمد اللہ والمنت مبلغ چھبیس[26] جولائی ۱۹۴۳ء مطابق بائیس[22] رجب المرجب ۱۳۶۲ھ اسلامی کو ٹھیک ساڑھے سات بجکر سات منٹ نو سکنڈ پر جولائی ۱۹۴۳ء کے مروجہ وقت پر بعد طلوع آفتاب میرے ہاں فرزند نمبر ۲ پیدا ہوا ہے جس کے زائچہ کی لگن برج جوزا ہے جو دن میں بیحد قوی ہوتا ہے اور اس کا مالک ذہانت اور فراست اعلیٰ کا امین ستارہ عطارد ہے جو شرف یافتہ مشتری کے ساتھ ہے اس لئے اللہ تبارک تعالیٰ سے امید ہے کہ یہ لڑکا بھی صاحب تدبیر و فراست ہو گا اور اسی ۲۶ جولائی کی پیدائش جارج بزناڈ شاہ انگلستانی کی ہے جس کو ہندوستان کے انگریزی داں اردو والے اردو کے تمام اصحاب قلم سے زیادہ مانتے ہیں۔

پس اس مولود کے عقیقہ کے لئے بارش بعد کا زمانہ میں نے اس لئے طے کیا ہے کہ اس وقت تک انشاء اللہ ایک سو آدمیوں زیادہ

عقیقے اور ولیمے کے شکار کا موسم بھی شروع ہو جائے گا اور ریلوں کے کرایہ میں تخفیف بھی ہو جائے گی، اب اگر اُس طرف خالص گھی بکثرت دستیاب ہو سکے تو ہمراہ لیتے آئیے گا یا کسی آنے جانے والے کے ذریعہ بشرطیکہ وہ معتبر ہو اور یہ بھی نہ کرے کہ گھی تو میرے گھر پہنچا دے اور چنگی کا محصول خود کھا جائے تو بچے کے عقیقے کی تقریب میں چنگی والوں کی قرقی کا مزا چکھنا پڑے اس لئے بڑی چھان بین کے بعد کسی ایم اے ایل ایل بی کے ہمراہ گھی روانہ فرمائیے گا زیادہ بجز دعائے خاتمۂ جنگ جرمنی اور کیا عرض کیا جائے، خورد و کلاں کو درجہ بدرجہ سلام۔

مکرر آنکہ۔ کیوں صاحب یہ وکالت پر وکالت اور ڈاکٹری پر ڈاکٹری ہی پاس کئے جانے کا یہ مطلب ہے نا کہ طلباء اور ان کے بزرگوں میں مختلف علوم کے انتخاب کی فراست ہی نہیں جو آنکھیں بند کئے نئی نسل والے ان آسان علوم ہی میں گھسے چلے جا رہے ہیں بہرحال یہ سوال دماغی جودت کا علمی مسئلہ ضرور بن سکتا ہے۔

ملا آرموزی

حیدرآباد

(نشرگاہ حیدرآباد سے پڑھی گئی)

میرا آغوش ہے گہوارۂ آثارِ قدیم
علم و انسانیت و عیش کا دربارِ قدیم

میرے ہر حال میں ماضی کے فسانے پنہاں
میری مٹی میں جواہر کے خزانے پنہاں

کج کلاہوں کی ضرورت نے بسایا ہے مجھے
بادشاہوں کی محبت نے سجایا ہے مجھے

وہ نہ سمجھے گا جو اسرار سے بیگانہ ہے
رودِ موسیٰ کی خموشی میں اک افسانہ ہے

فتح کیوں مجھ کو نہ حاصل رہے افتادوں پر
میری تعمیر ہوئی عشق کی بنیادوں پر

وہ زمانہ مرے نزدیک ابھی زندہ ہے
میں سمجھتا ہوں مری "بھاگ متی" زندہ ہے

کی بڑی شان سے مہمان نوازی میں نے
گولکنڈہ کے پیاسوں کو جگہ دی میں نے

جوشِ سیلاب نے جھولے میں جھلایا ہے مجھے
انقلابات نے پروان چڑھایا ہے مجھے

نقشِ ماضی جو تصور میں ابھر آتا ہے
"چار مینار" نگینہ سا نظر آتا ہے

میں نے دیکھے ہیں زمانے کے بدلتے ہوئے رنگ
صلح غیروں سے کبھی، اور کبھی اپنوں سے بھی جنگ

میری گلیوں سے دلیرانِ جہاں گزرے ہیں
صف شکن، تیغ بکف، نعرہ زناں گزرے ہیں

جنتوں سے مرے باغوں میں ہوا آتی ہے
بعض پھولوں سے ابھی بوئے وفا آتی ہے

بادشاہانِ اولوالعزم کا مدفن ہوں میں
بجلیاں جس میں ہیں آسودہ وہ خرمن ہوں میں

ہیں بہت عہدِ گزشتہ کے دفینے مجھ میں
ذوق پختہ ہو تو ملتے ہیں خزینے مجھ میں

اب بھی روشن ہے بلندی پہ ستارا میرا
"ظلمتیں" ڈھونڈھتی پھرتی ہیں سہارا میرا

شمع ہے نور فزا شاد ہے محفل میری!
اب بھی پروانوں سے آباد ہے محفل میری!

شاہد صدیقی

اخلاقی جرأت

مولانا حالی کی نظم "راست گوئی" کو پڑھ رہا تھا۔ اس کی آسان زبان، سادہ طرزِ بیان کی رو میں جب پڑھتا ہوا چلا گیا تو ابتدا میں مجھ کو محسوس ہی نہیں ہوا کہ میں صداقت و راست بازی کی شان میں مدحیہ قصیدہ کا مطالعہ کر رہا ہوں کہ ہجو یہ کلام کا۔ شاعر کی شخصیت کی طرح خود نظم بھی اپنی بے نفسی کا اعلان کر رہی تھی لیکن بے نفسی کے پردہ میں احساسات کی بلند آہنگی، جذبات کی اٹھان چھپائے نہیں چھپتی تھی۔ ایک بلند حوصلہ عظیم الہمت انسان کس طرح اس کے جملے، اس کی تراکیب، اس کے الفاظ زور و اثر معانی کے انبار کو اٹھائے ہوئے پھر بھی اپنی معنویت کو پوشیدہ رکھنے کی کوشش کر رہے تھے لیکن جس طرح اس بلند رتبہ انسان کے افعال تمام کیفیات قلبی کے آئینہ دار ہوا کرتے ہیں۔ بالکل اسی طرح ان تراکیب کی در و بست، ان جملوں کی چستی بندش، ان الفاظ کا محلِ وقوع معانی کے تمام پردوں کو چاک کر رہا تھا۔ لیکن ان سب کے باوجود میری قوت فیصلہ مدح و ذم کے سلسلہ میں آئینۂ حیرت بنی ہوئی تھی۔ بلکہ جوں جوں مطالعہ کی نگاہیں بلند ہوتی جا رہی تھیں میری حیرت سامانیوں میں بیش از بیش اضافہ ہوتا جا رہا تھا۔ خود آپ اس پر غور کیجیے کہ جو راست گوئی قہر ہو جو حق پرستی زہر ہو جس کی وجہ سے اپنے پرائے ہوتے ہوں، گھر گھر تلواریں چلتی ہوں جس کے صلہ میں سولی لے اور ننگ، کانٹوں کے افسر زیبِ سر ہوتے ہوں جس کے جلو میں رسوائیوں اور تنہائیوں کی بے سری فوج ہو جو مصلحت بینی سے برسرِ پیکار ہو اور صلح و آشتی کے تمام رشتوں کو شمشیرِ عریاں سے قطع کرنے میں مصروف جس کی جلوہ گستری سے نظم و نسق کے دفتر میں درہمی و برہمی پیدا ہو جاتی ہے کہ ہر ہر قدم پر، ہر ہر مرحلہ پر زلزلوں کی خوفناک مصیبتیں ٹوٹ پڑتی ہوں کونسا دیوانہ، کونسا منچلا ہوگا جو اس کی موافقت پر آمادگی کا اظہار کرے، جس کے مضمون ہی میں اس قدر وحشت انگیزیوں کا تصور ساتھ ساتھ چلتا ہو کس بہادر کا دل اور گردہ ہو کہ اس کی موافقت کرے؟ مگر خدا جانے اس سیلابِ بلا میں کونسی کشش ہے کہ جہاں یہ طوفان صداقت سیل حقانیت امنڈنا شروع ہو گی تو پھر وہاں اس کی زبردست موجوں (بلکہ حق و صداقت کی فوجوں) کے زور میں نہ تو کوئی کذب و باطل، حرص و ہوس کی کشتی ٹھہر سکتی ہے اور نہ جھوٹی امنگوں، پُرخود غلط حوصلوں کے پہاڑ آڑے آ سکتے ہیں۔ پھر تو اس کی رو میں تمام دنیا کی عظمتیں، اہلِ نخوت کی بزرگیاں ارباب غرور کی بڑائیاں اور تمام عالم کے شہنشاہوں کی پندار سامانیاں خس و خاشاک کی طرح بہتی ہوئی نظر آتی ہیں۔ اس کی عظمت کے مقابلہ میں اگر پربت بھی رائی بن جائیں، بادشاہوں کی گردنیں بھی جھک جائیں تو ہم کو کوئی تعجب کوئی تحیر نہیں۔ اس لیے کہ اس کا جادو وہ ہے جو سر پر چڑھ کر بولتا ہے اور اس کی ادا ہر آدمی کو گھائل بنا دیتی ہے۔ اس کی تلخیوں میں بھی عجیب شیرینی محسوس ہوتی ہے اس کا مخالف سا مخالف اس کے آگے اپنی سپر ڈال دیتا ہے نہ صرف یہی بلکہ اس کی ہر آواز پر لبیک کہنے کے لیے تیار ہو جاتا ہے۔ جب اس کی زمزمہ سرائیوں کے لوگ اس قدر گرویدہ ہو جاتے ہیں تو اس کی وہی دھیمی لے، وہی سریلی آواز رفتہ رفتہ جنگل کی آگ بن کر ہر مرد و زن، ہر دشت و چمن میں اس طرح پھیل جاتی ہے کہ وہ لوگ جو اس کی آہٹ سن کر بھی اس کی طرف رخ کرنا پسند نہ کرتے تھے ان کے دل میں بھی گدگدی پیدا ہو جاتی ہے۔ گو وہ آغاز میں اس کی زد سے اس کے نشانے سے دور رہنا چاہتے ہیں لیکن اس کا تیرِ صداقت پیکانِ قضا بن کر پیوستِ رگِ جاں ہو ہی جاتا ہے اور ہر انسان زخم خوردہ شکار کی طرح

چوٹ کھاکر اس کے قدموں میں اپنا سر رکھ ہی دیتا ہے لیکن ان میں سے بھی جو وحشی ہرن کی طرح اس کو دیکھ کر رم کرتے ہیں، بدکتے ہیں وہ بھی تیر اس کے قدر اندازی کے کمال کو دیکھنے کے لئے مڑ مڑ کر دیکھتے ضرور ہیں۔ ہاں، ہاں وہ بھی تیر اس کے غمزۂ پنہاں کے نخچیر ہو چکے ہیں اس کے دل میں جو زخم نہاں پیدا ہو چکا ہے وہ کبھی نہ کبھی ان کو ضرور اس کے قدموں میں لا ڈالے گا۔ یہ ہے وہ مد و جزر حقانیت کے سمندر کے تلاطم کا جس کی بلند و پست موجوں کے چند چھینٹے آپ کے خیالات کی جدولوں میں بھی طوفان آفریں ہو سکتے ہیں۔ یہ اس مد و جزر اسلام (مسدس حالی) کی شاید پہلی کرن ہو جس نے آگے بڑھ کر اردو کی اخلاقی شاعری کے در و دیوار کو اپنی غیر محدود شعاعوں سے منور کر دیا اور حالی کو اخلاقی مصنفین اردو کی صف اول میں بٹھا دیا۔ لیکن ہم کو تو اس سے سبق ملتا ہے خود مصنف کو جو کچھ ہونا تھا وہ ہو چکا لیکن اس نے ہمارے سامنے، ہماری نگاہوں میں صداقت کا ایک نورانی پردہ قائم کر دیا جس کی تابانیوں میں ہم پورے نظام معاشرت کا مشاہدہ کر سکتے ہیں کہ وہ کس طرح رسوم و روایات میں جکڑ بند ہو چکا ہے؟ اور اس کے لئے کس قسم کی اخلاقی جرأت کی ضرورت ہے؟ اور اس جرأت اخلاقی کے مظاہرہ کے سلسلہ میں ہم کو کن کن منزلوں سے گزرنا پڑے گا؟ اور کن کن نتائج سے دوچار ہونا پڑے گا؟ بالآخر فتح و کامیابی کا سہرا کس کے سر ہے؟

اگر غور سے دیکھا جائے تو حقیقتاً ہر قوم کی ترقی کا سنگ بنیاد نظام اخلاق ہی ہوتا ہے اس کے لئے دلاوری و دلیری کی ضرورت ہے لیکن وہ دلیری نہیں جس کا تعلق جسمانی و حقیقی شجاعت کے ساتھ ہے بلکہ وہ جرأت و دلاوری جو ہمارے چال چلن سے وابستہ ہے۔ یہ اسی وقت بروئے کار ہوتی ہے جب کہ نیکی و بدی کے امتیاز کا سوال پیدا ہوتا ہے جب تک خیر و شر کی اخلاقی قدرت باقی ہے ہم کو حق کی شکست اور باطل کی فتح کا اندیشہ نہیں پیدا ہو سکتا گو بعض اوقات باطل کا سیاہ و تاریک بادل حق کے سورج پر چھا جائے اور دنیا کو تیرہ و تار بنا دے لیکن تھوڑے ہی عرصہ میں حق کا آفتاب اپنی تیز کرنوں سے باطل کے غلیظ بادلوں کو پگھلا کر اور زیادہ نکھر کر نکل آتا ہے اس لئے یہ کہنا غلط نہیں ہے کہ فتح ہمیشہ ایمان و اعمال کی ہوا کرتی ہے۔

بلند مرتبہ مرد، اعلیٰ درجہ کی عورتیں صرف اخلاقی دلیری سے مستحق فضلیت قرار دی جاتی ہیں۔ تلاش حق اور راست گوئی میں دلیری، منصف و راست باز ہونے کی جرأت، ایماندار رہنے کا عزم محکم اور استقلال تمام امتحان و آزمائش میں پورے اترنے کی سعی و کوشش اور مردانگی اپنے فرائض کو سرانجام دینے کی دھن بھی اعلیٰ درجہ کی بہادری میں شامل ہیں۔

بنی نوع انسان نے ارتقائی مدارج کو طے کرنے میں قدم قدم پر جن جن مشکلات کا مقابلہ کیا ہے اور غلبہ حاصل کیا ہے صرف وہ مساعی ہمارے سر افتخار کو بلند کرنے کے لئے جائز وسیلہ بن سکتی ہیں۔ تاریخ انسانی کی یہی نمایاں فتوحات اشرف المخلوقات کا تاج پہننے کے لئے وجہ جواز ہو سکتی ہیں۔ لیکن جن بہادروں نے یہ کارنمایاں انجام دیے انھوں نے ہمارے خیالات کا راستہ کرنے میں توانہی اسلحہ سے کام نہیں لیا۔ بلکہ بڑے بڑے مباحث سے ان مشکلات کو روئی کی طرح توم کر رکھ دیا۔

اگر فولادی ہتیاروں سے تہذیب و اخلاق پر مجبور کیا جاتا، نوع انسانی کو انہیں آلات حرب کا تختۂ مشق بنایا جاتا تو پرانی قوموں کی طرح آج ہمارا، ہماری تہذیب کا ہمارے تمدن کا

وجود بھی ناپید ہوتا۔ لیکن ان اخلاقی مصلحین نے فوجی سپہ سالاروں کے برخلاف خود اپنے آپ کو ایثار و جانبازی کی قربان گاہ پر پیش کرکے جریدۂ عالم پر ایسے گہرے نقوش ثبت کئے ہیں کہ امتداد زمانہ بھی ان کو محو نہیں کرسکا۔

عوام نے کسی بڑی صداقت، اعلیٰ اصول کو بلا شور و شغب خوشنودی خاطر کے ساتھ کبھی نہیں قبول کیا۔ بلکہ اگر یوں کہہ دیا جائے کہ بزور شمشیر اس کو تسلیم کرانا پڑا اور جبر و قہر سے ان کا سر تسلیم خم کرایا تو آپ شاید اعتراض کر بیٹھیں کہ پھر ان مصلحان قوم اور سپہ سالاران فوج میں کیا فرق رہ جاتا ہے؟ لیکن حقیقت یہی ہے۔ ہاں! صرف ایک نقطہ کا فرق ہو کہ وہ آہنی تیغ نہیں تھی بلکہ اخلاقی تلوار جس نے اعضاء و جوارح سے گزر کر روح و دل پر قبضہ کرلیا وہ جبر و قہر مادی زنجیروں سے جکڑبندی کے ذریعہ نہیں ہوا تھا بلکہ روح کے ان سچے تعلقات کے روحانی رشتوں کے واسطہ سے جس نے دل و جان کا تمام تار ایک لڑی میں پرو دیا۔ اس اخلاقی فتح مندی، اس اخلاقی ظفریابی کو بھی آپ مادی جبر و قہر سے اگر تعبیر کرنے لگیں تو خدا را مجھے بتائیے کہ پھر میں آزادی و غلامی، خود مختاری و محکومی کے فرق کو کس طرح بیان کرسکتا ہوں۔ میں سچی جمہوریت اور صحیح آمریت کے امتیاز کو آپ کے سامنے کس طرح پیش کرسکتا ہوں۔ بلکہ مجھ کو ماننا پڑے گا کہ دنیا سے عقل سلیم و مذاق صحیح کا جنازہ اٹھ چکا ہے۔ اس لئے اگر آپ مادی جبر اور اخلاقی فتح و ظفر میں امتیاز نہیں کرسکتے تو آپ کو اپنی قوت ممیزہ کھو جانے پر ماتم کرنا پڑے گا۔ اسی ایک نقطہ کے فرق سے حقائق میں زمین و آسمان کا فرق پیدا ہوگیا ہے۔ بہرحال ہر عقیدہ، ہر خیال کو عوام میں منوانے کے لئے بڑی زبردست سرفروشی کے مظاہرہ کی ضرورت ہے۔

ہر مقام پر، ہر ملک میں، خاص کر ہندوستان میں جہاں ہر گروہ، ہر جماعت اور ہر سوسائٹی کی تربیت و ترتیب انتہائی سخت گیر بیحد جابرانہ ہے۔ ہمارے رسوم و روایات اس قدر سخت ہیں کہ کسی شخصیت کو پنپنے کا موقع ہی نہیں ملتا۔ رسم و رواج کی ان جکڑبندیوں کی وجہ سے اثبات خودی کو نشو و نما حاصل کرنے کی گنجائش ہی نہیں ملتی ہے۔ ہر طرف پابندیوں کی آہنی باڑھ نظر آتی ہے جس کی وجہ سے اس تنگ درہ تنگ راستہ میں بدقت تمام جھک جھک کر چلنا پڑتا ہے۔

ہندستانی قوم شخصیت، ذاتی ذمہ داری کے احساس، آزادانہ خیال و عمل سے عاری نظر آتی ہے۔ معلوم ہوتا ہے کہ ہمارا تمدنی ڈھانچہ ایک مطلق العنان بادشاہ کا لفظی قانون ہے جس کے مقابلہ میں کسی قسم کی چون و چرا کرنے کی مطلق گنجائش نہیں۔ وہ جو ایک پرانا مقولہ ہے کہ بادشاہ سلامت کا ہر لفظ قانون ہے ہندستانی سوسائٹی کی رسم و رواج پر حرف بحرف صادق آتا ہے۔ خواہ اس کی وجہ کے الفاظ میں یہ ہو کہ ہندوستانی سوسائٹی اب تک ابتدائی حالت میں ہے قدیم زمانہ کی سوسائٹی کا جزو واحد خاندان تھا اور زمانۂ حال کی سوسائٹی کے اجزائے ترکیبی افراد ہیں

خواہ بشپ کالڈویل کے خیال میں یہ ہو کہ ہندستانی اپنی ذات و فرقہ کے قدیمی دستوروں کو قائم رکھنے میں بہت محتاط ہیں ان کے خیالات پر اگرچہ مغربی تعلیم کا رنگ چڑھ گیا ہے مگر ان کے روزآنہ اعمال ان کے آباواجداد کے کاموں سے مختلف نہیں ہیں۔ لیکن ہم کو تسلیم کرنا پڑے گا کہ ہمارے قوائے عقلیہ و عملیہ عصریاتی رجحانات کے سمجھنے اور ان پر عمل پیرا ہونے سے محروم ہوگئے ہیں جس کی وجہ سے ہم اپنی انفرادیت کے تحفظ و بقا سے نابلد ہو رہے ہیں۔ فاسٹر صاحب کہتے ہیں کہ:۔

بعض وقت انسان اپنے ارادہ کو تبدیل کرنے پر مجبور ہوتا ہے۔ یہ تبدیلی خواہ سوسائٹی کے ساتھ ربط وضبط رکھنے میں ہو۔ خواہ اس کا طریقہ بدلنے میں۔ گر سب سے اول یہی سوال پیدا ہوتا ہے کہ کیا یہ اچھا ہوگا؟ وہ یہ خواہش رکھتا ہے کہ ہر امر اس کی مرضی کے مطابق ہو۔ ہر نئی تجویز پر عمل درآمد کرنے کو تیار ہوتا ہو گر دوسرے ہی دن یہ شک پیدا ہوتا ہے کہ کیا ایسا کرنا دانشمندی میں داخل ہے۔ اس کو بہت سی باتوں میں سوچنا پڑتا ہے مبادا اس کے نئے ارادہ کو عملی جامہ پہنانے میں ایسی خرابی پنہاں ہو کہ اس کو جس کی خبر نہ ہو۔ کیا یہ وقت کے مناسب خیال ہے؟ لوگ کیا کہیں گے؟ اگر وہ باقاعدہ پرانے ارادہ کو ترک نہیں کرتا گر ایسی باتیں سوچ کر جھکتا ہے۔

چاہتا ہے کہ کسی طرح اس ارادہ کو ترک کرنے کی مصلحت کا قائل ہوجائے۔ گر جب اخلاقی جرأت موجود ہوتی ہے تو انسان ایک دوسری پالیسی (حکمت عملی) اختیار کرتا ہے جو آدمی قوت فیصلہ کی دولت سے بہرہ مند ہے وہ یہی کہے گا کہ میرا یہی ارادہ ہے یہی مقصد میرے پیش نظر ہے۔ میں یہی کروں گا۔ خواہ مجھ کو کتنے ہی خطرات میں گھر جانا پڑے لیکن میں ثابت قدم رہوں گا۔ پیش آنے والی مصیبتوں اور مستقبل کی بھیانک اندیش ناکیوں محض خالی خولی تاریک تصورات کی وجہ سے اپنا قدم پیچھے ہٹانے کے لئے کبھی آمادہ نہ ہوسکوں گا۔

تمام قوموں کے مصلحین کو ایسی ہی غیر معمولی دلیری کی بدولت کامیابی ہوتی ہے۔ ایسے ہی روشن ضمیر اشخاص و افراد کی دنیا اپنی ترقی کے لئے احسان مند ہے۔

وجدی الحسینی

کیا لکھوں؟

ایک ہلچل سی مچی ہے آتشیں جذبات میں
نظم لکھنا چاہتا ہوں، سوچتا ہوں کیا لکھوں

چاندتاروں کے مناظر، ظلم کی بے باکیاں
کیا لکھوں —— حیران ہوں، کچھ ذہن میں آتا نہیں
عشق کی رُودادِ غم، دنیا کی وحشت ناکیاں!
یوں تو عنواں ہیں بہت، کچھ بھی لکھا جاتا نہیں
دل بھی ہے سہما ہوا، نغمہ کوئی گاتا نہیں!!

اِن سکوں ناآشنا، اور دکھ بھرے لمحات میں
وقت کی غارت گری، یا حالِ دلِ اپنا لکھوں؟

تحسین سروری

جوانی کا خواب

وہ اپنی پھوپھی کے گھر جاتا تو اس کی کچھ عجیب حالت ہو جاتی۔ جانے سے پہلے وہ عجیب کشمکش میں مبتلا رہتا۔ سوچتا یہ شیروانی لوں یا وہ کوٹ؟ یہ پتلون اچھی رہے گی یا وہ سوٹ؟

آج بھی ڈاڑھی بناتے بناتے یہی خیال اس کے دماغ میں گھوم رہا تھا۔ پھوپھی اور سعادت کی ملاقات کے لئے میں کتنا دیوانہ ہو جاتا ہوں۔ ان کے شوہر والد کے بچپن کے دوست تھے۔ والد کا خاندان دولت مند تھا۔ زیادہ لکھے پڑھے نہ ہونے پر بھی وہ آج دو کپڑے کی گرنیوں کے مالک ہیں اور پھوپھی کے شوہر کون بُری حالت میں تھے؟ اچھی خاصی سرکاری نوکری.....

نجمی پھوپھی جیسی محبت کرنے والی بیوی سعادت اور نیلم دو ہی بچے۔ وظیفے پر سبکدوش ہونے کے دو برس بعد ہی پھوپھی بیوہ ہو گئیں۔ سعادت تو بی اے پاس کر کے آج ڈیڑھ سو روپے کما ہی رہا ہے اور نیلم؟ وہ بھی ایف اے میں ہے۔ بری تھوڑی ہے پھوپھی کی زندگی!

چہرے پر اسنو ملتے ہوئے اس نے آئینہ دیکھا۔ نیلم کی تصویر اس کی آنکھوں کے سامنے آتے ہی بچپن کے چند رنگین لمحات اسے یاد آ گئے اور اس کے شریر دل نے کہا۔ تم صرف سعادت اور پھوپھی سے ملنے ہی نہیں جا رہے ہو بلکہ نیلم سے بھی ....

سات سالہ نیلم فراک پہنے ہوئے اس کی نظروں میں گھوم گئی۔ نیلم کو سنترے بہت پسند تھے۔ چھٹیوں میں یا پھوپھو رخصت لے کر نیلم کے گھر والے ندیم کے والد کے پاس چلے جاتے اور ان کے باغ میں خوب سنترے کھاتے۔ ایک دن چھوٹی نیلم سنتروں کے لئے ضد کرنے اور منہ بسورنے لگی۔ گھر کے سارے لوگ مناتے اور سمجھاتے تھک گئے۔ مگر وہ نہ مانی۔ اتنے میں چھوٹے ندیم نے کہیں سے چار پانچ سنترے اٹھا لائے اور اس کے سامنے رکھ دیئے اور تین منٹ میں جادو کا اثر کرنے والے "پین بام" کی طرح ندیم کی اس حرکت سے نیلم خوش ہو گئی۔ ندیم کی ماں نے یوں ہی ہنستے ہنستے کہا۔ "تمہاری نیلم کو کوئی سنترے والا شوہر....."

"یہ کھڑا ہے نا سنترے والا اس کا ہاتھ پکڑ لے" نیلم کی ماں نے جملہ پورا کیا اور ساری مجلس میں ہنسی کا ایک سمندر ٹھاٹھیں مارنے لگا۔ ندیم کی آنکھوں کے سامنے یہ تمام حسین تصویریں کوند گئیں۔ بالوں پر برش پھیر کر کچھ گنگناتا ہوا اٹھا۔

دوسرے دن جب ندیم اسٹیشن پہونچا تو نیلم استقبال کے لئے موجود تھی۔ "او ہو قبلہ! میں تو سمجھی تھی کہ آپ آتے بھی ہیں یا نہیں؟" نیلم کی باتوں سے زیادہ وہ اس کے کانوں میں ہلنے والے بُندوں کی طرف غور کر رہا تھا۔ چونک کر بولا "ہاں! تم جیسے لوگ استقبال کو آئیں تو دوڑتی ہوئی گاڑی سے بھی کود پڑنے کو تیار ہوں۔"

دیکھتے دیکھتے وہ چند منٹوں میں گھر پہونچ گئے۔ گھر میں قدم رکھتے ہی اس کی پھوپھی نے کہا "بہت دُبلے ہو گئے ندیم"

"ہاں! محبت کرنے والے آدمی اور ڈاکٹر دونوں کو سارے لوگ بیمار اور کمزور ہی دکھائی دیتے ہیں" ندیم نے کرسی پر بیٹھتے ہوئے کہا۔

"لیکن دونوں کے نقطۂ نظر میں بھی فرق ہوتا ہے" نیلم نے بازو کی کرسی کھینچتے ہوئے کہا۔

"تسلیم! مگر یہ چائے جو آ گئی ہے پہلے اس کی خیریت پوچھ لیں اور بعد میں آپ کا جواب!" وہ ابھی چائے پی ہی رہے تھے کہ باہر سے کسی نے آواز دی اور پھوپھی انہیں چھوڑ کر چل دیں۔

نیلم تو ندیم سے خوب خوب باتیں کرتی تھیں لیکن فرصت ہی نہ ہوتی تھی۔ کھانے کے بعد وہ پھوپھی سے میٹھی میٹھی باتیں کرتا رہا اور سعادت دفتر سے لوٹا تو دونوں مل کر تفریح کے لئے چلے گئے۔ واپس جو آئے تو رات کے ساڑھے آٹھ بج چکے تھے۔

پھوپھی، سعادت اور نیلم کی پیار بھری صحبتوں میں ندیم کے چھ دن کس طرح گزرے پتہ ہی نہ چلا۔ محبت کرنے والے لوگوں کا ساتھ قسمت ہی کی تو بات ہے ؟

ایک دن صبح چائے کے وقت نیلم نے کہا۔ ” آج شام بھائی تم اور میں ہیرا تالاب چلیں گے"! نیلم کی آنکھوں کی زبان سمجھنے کی کوشش کرتے ہوئے ندیم نے جواب دیا" ہاں چلیں گے"۔ لیکن دوپہر ہی میں کوئی ضروری کام نکل آیا اور سعادت دورہ پر کسی قریب کے گاؤں کو چلا گیا ۔ پانچ بجتے ہی نیلم نے موٹر نکالی اور اب ندیم اور نیلم دونوں ہی چل دیئے ــــ ہیرا تالاب پر سکوت اور خاموشی تھی ۔ صرف ایک سیتھیا پانی کی لہروں میں پاؤں ڈالے مچھلیوں کو روٹی کے ٹکڑے ڈال رہا تھا اور اس سے پرے، دو پارسی دوشیزائیں ایک نوجوان کے ساتھ مصروف تکلم تھیں ــــ ” کتنا سکون ہے یہاں ! ورنہ حسین ساگر ؟ ایک مچھلی بازار ہی ہے ۔ نیلم نے ندیم کے اڑتے والے بالوں کی طرف دیکھ کر کہا ۔

” لیکن حسین ساگر کے دلفریب نظارے یہاں کہاں" ندیم اس کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر بولا ۔

” مجھے تو حسین ساگر پر ایسا معلوم ہوتا ہے جیسے کسی مل کے اندر کھڑے ہوں !" ہاں ! گرنیوں میں راگ اور رس ہے اسی لئے تو ان بنگلے والوں کی زندگی میں سُریلا پن اور رنگینی ہے" سامنے پانی کی طرف دیکھتے ہوئے اس انداز سے بولا جیسے آدھا جملہ خود سے آدھا نیلم سے کہہ رہا ہو ۔ چیک چیک کرنے والی لہریں بھی جیسے اس کی بات کی تصدیق کر رہی تھیں ۔ نیلم کو اس کا خیال پسند آیا اور وہ موضوع بدلنے کے لئے بولی ” ارے یہ دِمٹو پینا ہے ۔ یہ تو نہیں ملتا ہوگا تمہارے گاؤں میں" ۔

” نہیں وہاں کہاں، باؤلیوں کا پانی جیسے امرت !"

دِمٹو پیتے پیتے ندیم نے کہا یہ تو میٹھا ہے لیکن شہر میں آدمی بھی میٹھے ہیں یا نہیں ؟

” اس آدمی کا جہاں اس سے بھی زیادہ میٹھا ہے" ترچھی نظروں سے دیکھ کر نیلم نے کہا ! ندیم اس جواب پر جی بھر کر ہنسا اور دونوں یہاں سے ہٹ کر ذرا اچھی جگہ چلے گئے ۔

ڈوبتے ہوئے سورج کی سنہری کرنیں نیلم کے بھورے بالوں پر پڑ رہی تھیں اور اس کے چہرے پر بُندوں کا عکس شام کا دلفریب منظر پیش کر رہا تھا ۔

” چار دن بعد جانے کا خیال ہے ! کتنے دن ابھی تمہیں چھٹی ہے ۔ ندیم نے ایک ہاتھ سے ریت کے کنکر دور پھینکتے ہوئے کہا"

” ابھی سے جاؤ گے ؟ میں نے کتنے منصوبے باندھے ہیں ! کل سینما چلیں گے "جھلی" اچھی فلم ہے ۔ اِس کے بعد ہمارے اور پروگرام ہیں"

” اور اگر میں نہ چاہوں تو ؟"

” وہ کچھ نہیں ــــ ہمارے پاس کا دستور ہے کہ جہاں ہماری مرضی کے بغیر کچھ نہیں کر سکتا" نیلم نے کہا ۔

” اس پر بھی چلے جاؤں تو" ــــ ” اِس کا بھی علاج ہے اس طرح ہاتھ پکڑ کر روک لوں گی" نامعلوم طور پر اس نے ندیم کا ہاتھ اپنے ہاتھ میں لے لیا ۔ سامنے اتھاہ تالاب میں جس طرح پانی کی بے شمار لہریں اٹھ رہی تھیں ۔ اسی طرح اس کے سارے جسم میں نیلم کے لمس سے لذت و سرور کی لہریں دوڑ گئیں ۔ نہ جانے وہ کتنی دیر تک ایسے ہی ہاتھ میں ہاتھ ڈالے بیٹھے رہتے مگر کچھ اندھیرا ہو گیا تھا اور اتنے میں ایک شخص ان کی طرف آتا دکھائی دیا ۔ اور وہ دونوں یہاں سے اٹھ گئے ۔ گھر لوٹتے ہوئے انھوں نے محسوس کیا کہ موٹر کی رفتار کے ساتھ ساتھ ان کے خیالات کی رفتار تیز ہوتی جا رہی ہے ۔

دوسرے دن صبح ندیم معمول سے ذرا دیر میں بیدار ہوا ۔ نیلم کسی کتاب کی اوراق گردانی کرتی ہوئی کمرے میں بیٹھی تھی ۔

"گھر پر روز اتنی دیر میں اٹھتے ہیں آپ؟" نیلم نے ہنستے ہوئے پوچھا۔

میں اب بھی نہ اٹھتا مگر میرے ایک دوست نے خواب میں آکر جگا دیا۔"

"اوہو شیخ چلی صاحب! سچ کی ہوا بھی لگی ہے تمہیں" نیلم کو کسی نے آواز دی اور بات یہیں ختم ہو گئی۔

کپڑے بدل کر ندیم اپنے جس دوست کے پاس گیا وہ نہ ملا۔ اتنی جلدی گھر واپس جانا بھی اسے اچھا معلوم نہ ہوا۔ وہ بازو کے ایک ہوٹل میں گھس گیا۔ میز پر پڑے ہوئے ایک اخبار کی سرخی نے اسے اپنی طرف متوجہ کر لیا۔ "خانم پور میں ہڑتال"

"نامہ نگار خصوصی لکھتا ہے کہ سارے مزدوروں نے ایک دم ہڑتال کر دی۔ ہڑتال کا سبب اضافۂ مزدوری نہیں بلکہ دو دن قبل ایک مزدور حیدر کو کام پر سے نکال دیا جانا بتلاتے ہیں۔ سارے مزدوروں نے تہیہ کر لیا ہے کہ حیدر کو رجوع کئے بغیر وہ ہرگز کام پر نہیں جائیں گے"

ندیم نے فوراً پیالی نیچے رکھ دی۔ پیسے دے کر باہر نکل آیا۔ اس کے دماغ میں خیالات کے چرخے چل رہے تھے ——— مل میں ہڑتال! حیدر علٰحدہ کر دیا گیا۔ آخر قصور؟ دوسرے مزدوروں پر کتنا وزن تھا اس کا! ۔ اس کے بوڑھے ماں باپ، بیوی اور دو بچے! کہاں جائیں گے سب؟ کیا کریں گے؟ ———

نیلم کی موہنی نظروں سے میں مسحور ہو گیا۔ مجھے محسوس ہوا کہ ساری دنیا پریم کے لفظوں اور اس کی زبان سے عبارت ہے۔ پورن ماشی کی صاف اور ٹھنڈی چاندنی تو نظر آگئی، مگر اس کی بھیانک تاریکی کہاں دیکھی میں نے! اگر دیکھتا بھی تو اس ٹھنڈی اور ستھری چاندنی میں بھول جاتا۔ نہیں مجھے جانا ہی چاہئے۔ نیلم بگڑ جائے گی۔ مگر اس کا علاج؟ اکیلی نیلم سے حیدر اور اس کے سہارے جینے والی پانچ زندگیاں زیادہ قیمتی ہیں؟ نیلم کی محبت ہی کچھ مقصد حیات نہیں! ۔

خیالات کی رو میں وہ کب گھر پہونچ گیا معلوم نہ ہو سکا۔ نجمی پھوپھی کوئی کتاب پڑھ رہی تھی۔ "پھوپھی! نیلم کہاں ہے۔

"کیوں تم سے کچھ کہا نہیں وہ عورت آئی تھی نا اس وقت اس کے ساتھ قریب کے ایک گاؤں کو گئی ہے۔ دوپہر میں جلد آجائے گی۔ کہاں سینما جانا ہے تمہیں؟"

نہیں، آج دوپہر کی گاڑی سے میں جا رہا ہوں۔

"کیوں اتنی جلد ارادہ بدل دیا کیا لڑ پڑے دونوں؟" ——

"نہیں یہ بات نہیں بلکہ ہماری گرنی میں ہڑتال ہو گئی۔"

"ہاں تو پھر جاؤ مگر دیکھو خط ضرور لکھنا۔"

چھ دن بعد دوپہر میں ایک روز نیلم پڑھتی بیٹھی تھی کہ پوسٹ مین نے ایک بھاری لفافہ لا دیا۔ نیلم نے خط کھولا، لکھا تھا۔

"میں اپنی بات پر اڑا رہا۔ تم سے بغیر ملے چلا آیا۔ ناراض نہ ہونا۔ بات ہی کچھ ایسی تھی! کیا کرتا؟ کہتے ہیں لڑائی اور محبت میں سب جائز ہے! ہڑتال لڑائی کی ایک صورت ہی تو ہے۔ تم کہو گی کہ مجھے کیا کرنا تھا اس ہڑتال سے؟ ٹھیک ہے! لیکن حیدر کام سے نکال دیا گیا۔ یہ میرا بچپن کا ساتھی ہے۔ ریاضی کے اکثر سوال وہ مجھے حل کر دیتا تھا۔ حالات اجازت دیتے تو وہ اعلیٰ تعلیم حاصل کر کے آگے بڑھتا لیکن غریب رہنا آج کی دنیا میں ناقابلِ معافی گناہ ہے۔ چوتھی جماعت کے بعد اس نے تعلیم ختم کر دی اور اب وہ اور اس کی بیوی جمرت ــ دونوں ہمارے پاس نوکر ہیں۔

ہڑتال سے دو دن پہلے کی بات ہے۔ جمرت کسی پاس کے گاؤں گئی ہوئی تھی نچلے طبقے میں پیدا ہوئی ہے ورنہ! اچھی ساڑی پہن کر ذرا بنی ٹھنی رہے تو تمہارے درجے کی عورتوں کو بھی نیچا دکھا دے ــ شام کو گھر آ رہی تھی۔ سورج ڈوبے کچھ دیر ہو گئی تھی۔ اندھیرا پھیل چکا تھا۔ راہ داری گم ہو گئی تھی۔ ہماری گرنی کے منیجر صاحب خاں۔ تم تو دیکھ ہی چکی ہو ان کو ——— اس کے بازو آ رہے تھے۔ سنا کہ بہت دنوں سے جناب کی

اس پر آنکھ تھی۔ لیکن واہ ری حوا کی بیٹی! کبھی لگاؤ غلط انداز بھی نہ ڈالی۔ اِس دن منیجر نشہ میں تھا یا کیا کون جانتے ہ؟ احسن نے ایک دم جمرت کا ہاتھ پکڑلیا۔ وہ چیخی۔ اِسی راستے سے کہیں حیدر بھی جارہا تھا۔ کیسے۔ کون جانے ہ۔ چیخ سن کر وہ عقاب کی طرح منیجر پر ٹوٹ پڑا۔ وہ تو اچھا ہی ہوا کہ منیجر نے معافی مانگ لی ورنہ وہ کام تمام ہی کردیتا۔

نتیجہ وہی ہوا جو ہونا تھا۔ حیدر کو نوکری سے علحدہ کردیا گیا۔

حیدر کو تنہا بلاکر میں نے ساری معلومات فراہم کیں!۔ ان مزدوروں نے اپنے تحفظ کے لئے اگر ہڑتال کردی تو کون برا کیا۔ کیا قصور ان کا؟ حیدر کو واپس کام پر بلانے کے واسطے میں والد سے دو دن برابر لڑتا رہا۔ کافی بحث ہوئی۔ آخر میں نے فیصلہ سنادیا کہ — حیدر کو واپس بلاؤ یا مجھ سے رشتہ توڑ لو! ۔ میری کوشش بارآور ہوئی۔ حیدر بحال ہوگیا۔ گرنی چلنے لگی اور میں مزدوروں کا سردار بن گیا۔

تم کہوگی میں اشتراکی ہوگیا' باغی ہوگیا! لیکن کیا بُرا ہے۔ میری وجہ سے سیکڑوں غریبوں کو امن مل سکتا ہے تو ....

یہ سب مجھ پر جان چھڑکتے ہیں۔ اس وقت میرے اطراف جمع ہیں۔ پوچھتے ہیں بیگم کو کب لائیں گے۔ کبھی آکر انھیں بھی شاد کام کئے جاؤ ——————— "نیم"

محمد عبدالقادر فاروقی

تنقید و تبصرہ

زندہ کھلونے ۔ مصنف مولوی سید محمد یحییٰ صاحب ۔ ناشر ڈپارٹمنٹ آف پبلیکیشن پٹنہ ۔ یہ چھوٹی سی کتاب سلسلۂ ریڈیائی کہانیاں کا پہلا شمارہ ہے اور ان ننھے منے سننے والوں کے نام معنون کیا گیا ہے جو ریڈیو سنتے ہیں۔

اس مجموعے میں پانچ کہانیاں ہیں۔ یہ زیادہ تر بچوں کے مکالمے ہیں لیکن مصنف نے جگہ جگہ ایسے انگریزی اور عربی، فارسی الفاظ بھی استعمال کئے ہیں جو بچوں کے لئے مشکل ہیں۔

اردو میں ادب اطفال کی بڑی کمی ہے اور افسوس ہے کہ جو کتابیں اب بھی بچوں کے لئے لکھی جاتی ہیں ان میں زبان کی سلاست اور اسلوب کی سادگی کا خیال نہیں رکھا جاتا۔ بچوں کے لئے لکھنا بہت مشکل ہے اور اس کتاب کے مولف نے دیباچہ میں اس کا اعتراف بھی کیا ہے۔ اس لئے ان سے توقع ہے کہ وہ اپنی کاوشوں میں زیادہ کامیاب رہیں گے۔

چوں چوں اور دوسری کہانیاں ۔ مصنف مولوی سید محمد یحییٰ ناشر ڈپارٹمنٹ آف پبلیکیشن پٹنہ ۔ یہ کتاب بھی ریڈیائی کہانیوں کے سلسلے کی ایک اور کڑی ہے اور احمد شاہ بخاری کے نام معنون کی گئی ہے۔ اس میں بھی پانچ کہانیاں ہیں جو دہلی یا لکھنؤ یا لاہور سے نشر ہو چکی ہیں اس سلسلے کے ناشروں نے یہ التزام کیا ہے کہ ہر دو مہینے ایک ایسا ہی مجموعہ شائع کیا کریں گے۔

افسوس ہے کہ اس مجموعے میں بھی زبان اور اسلوب کا وہی نقص موجود ہے جو اس سلسلے کی پہلی کتاب میں تھا۔ لیکن کہانیاں بہت ہی دلچسپ ہیں اور بچوں کی اعلیٰ ذہنی نشو و نما میں مدد دے سکتی ہیں۔

جلوہ زار ۔ از م ، ن واثق ۔ مطبوعہ مذاقی شبین پریس حیدرآباد دکن ۔ اس مختصر سی کتاب میں حیدرآباد کی طوائفی زندگی اور مشہور طوائفوں کے حالات درج کئے گئے ہیں۔ راگ اور رنگ زندگی کو خوش گوار بنانے کے لئے ہزاروں برس سے مقبول رہے ہیں۔ لیکن جن قوموں نے اس بارے میں حد اعتدال سے آگے قدم بڑھایا اور زندگی کو راگ اور رنگ ہی کے لئے وقف کر دیا وہ بہت جلد زوال پذیر ہو گئیں۔

حیدرآباد مشرقی تہذیب و تمدن کا آخری مرکز ہے اور یہاں تہذیب شائستگی کے جملہ قدیم و جدید لوازم ساتھ ساتھ نشو و نما پا رہے ہیں۔ دہلی اور خاص کر لکھنؤ میں کسی زمانے میں طوائفین کے مکان آداب مجلس اور حسن و موسیقی کے ادارے سمجھے جاتے تھے۔ حیدرآباد میں بھی عہد آصف جاہ ثانی کی طوائفین اپنی تہذیب و علم دوستی میں اپنے حسن و کمال کے برابر مشہور تھیں۔ اس کتاب میں حیدرآباد کے اس شعبۂ زندگی کا تاریخی خاکہ پیش کیا گیا ہے۔

اس کا پیش لفظ ڈاکٹر کرنل فیض جنگ بہادر نے لکھا ہے جو حیدرآباد کے قدر دانان و باکمالان موسیقی میں خاص طور پر مشہور ہیں۔ کتاب میں حیدرآباد کی پہلی رقاصہ بھاگ متی المخاطب بہ حیدر محل اور ماہ لقا بائی چندہ کی نفیس تصویریں بھی شریک ہیں۔

طبیعیاتی کائنات ۔ از پروفیسر سید محمد علی خاں اے، آر سی ایس۔ بی ایس سی آنرز (لندن) مطبوعہ دار الطباعت حیدرآباد۔

یہ کتاب سائنس سے دلچسپی رکھنے والوں کے لئے نظام کالج حیدرآباد کے پروفیسر طبیعیات نے قلمبند کی ہے اور اس کا پیش لفظ ملک کے ایک مشہور ماہر سائنس مولوی محمد عبد الرحمن خاں صاحب، سابق صدر کلیۂ جامعۂ عثمانیہ نے تحریر کیا ہے۔

طبیعیاتی کائنات کو چار حصوں میں تقسیم کیا گیا ہے۔ پہلے حصہ میں زمین، سورج، چاند، ستارے اور آسمان کے متعلق جدید ترین معلومات اور نظریوں کو بیان کیا گیا ہے۔ دوسرا حصہ حرارت، مادہ، نور، برقی مقناطیسی نظریہ، ایتھر اور نظریۂ اضافیت سے بحث کرتا ہے۔ تیسرا حصہ آواز اور مختلف قسم کی شعاعوں کے لئے وقف ہے۔ اور چوتھے حصہ میں جوہر، الکٹرون، پروٹون اور ننھے ذرات وغیرہ کے متعلق اہم اور ضروری انکشافات درج ہیں۔ آخر میں ان اردو

اصطلاحات کی فرہنگ بھی شریک ہے جو اس کتاب میں استعمال کی گئی ہیں ۔ اس فرہنگ میں اردو کے محاذی انگریزی اصطلاحیں بھی درج ہیں۔

اس قسم کی مفید اور اعلیٰ مضامین کی سلیس کتابوں کی اردو کو بے حد ضرورت ہے ۔ ادارۂ ادبیات اُردو کے شعبۂ سائنس نے اس کو شایع کیا ہے ۔ اس کے پیش لفظ میں پروفیسر محمد عبدالرحمٰن خاں صاحب نے لکھا ہے کہ :۔

" عام فہم پیرایہ میں اس مشکل مضمون پر کتاب لکھنا آسان کام نہیں خواہ وہ کسی زبان میں ہو ۔ اُردو میں لکھنا تو اور بھی مشکل ہے اس لئے کہ زبان مذکور میں سوائے درسی چھوٹی بڑی کتابوں کے اب تک بہت کم ایسی کتابیں تالیف یا ترجمہ ہوئی ہیں ۔ مجھے یقین ہے کہ اس کے پڑھنے والے جدید سائنس کے انکشافات سے روشناس ہو کر نہ صرف محظوظ ہوں گے بلکہ مزید معلومات حاصل کرنے کی کوشش کریں گے ۔"

جمہوریۂ چین ۔ از میر عابد علی خاں بی اے (عثمانیہ) ۔ مطبوعۂ اعظم اسٹیم پریس ۔ یہ دیدہ زیب کتاب ڈاکٹر سن یات سین کی وصیت کے نام معنون کی گئی ہے جس پر جدید چین کا موجودہ سیاسی نظام استوار کیا گیا ہے ۔

اس کا مقدمہ مولوی میر حسن صاحب ایم اے نے قلمبند کیا ہے اور اس میں چین کی تہذیبی اور سیاسی اہمیت واضح کی گئی ہے ۔ اصل کتاب آٹھ عنوانات پر منقسم کی گئی ہے ۔ پہلے عنوان میں انقلاب چین کا پس منظر دکھایا گیا ہے ۔ دوسرے میں ۱۹۱۱ء میں چین میں جو انقلاب واقع ہوا اس کو بیان کیا گیا ہے ۔ اس کے بعد کے عنوانات میں انقلاب کے بعد سے آج تک چین میں جو کچھ خانہ جنگیاں ہوئیں اور سیاسی تغیرات رونما ہوئے ان سب کو وضاحت سے پیش کیا ہے ۔ سن یات سین کی صدارت اور چیانگ کائی شک کی قیادت پر وضاحت سے بحث کی گئی ہے اور آخر میں چین و جاپان کی جنگ ۔ اور جدید چین کی سیاسی' معاشی اور معاشرتی ترقیاں درج ہیں ۔

کتاب میں ایک نقشہ اور حوالہ کی کتابوں کی تفصیلی فہرست بھی شامل ہے ۔ بقول میر حسن صاحب ایم اے مصنف نے

"انقلاب چین کے اسباب اور چینی جمہوریت کی تاریخ اور تشکیل سے متعلقہ معلومات سلیقہ کے ساتھ اکٹھی کردی ہیں ۔ جدید چین کی سیاست کے موضوع پر اردو ادب میں جمہوریۂ چین پہلی کتاب ہے جو مواد اور انداز بیان کی وجہ سے انتہائی دلچسپ بھی ہے ۔"

اگر اس کے مصنف میر عابد علی خاں صاحب بی اے اسی طرح کی مفید اور دلچسپ کتابیں جمہوریۂ ترکی اور جمہوریۂ روس پر بھی تحریر فرمادیں تو اردو ادب میں مفید اضافہ ہوگا ۔

تاریخ ادب ہندی ۔ مصنفہ سید ظہیر الدین احمد علوی ۔ ایم اے ایل ایل بی ۔ ناشر رام نرائن لال الہ آباد ۔ ہندی ادب کی یہ تاریخ سر تیج بہادر سپرو کے نام معنون کی گئی ہے ابتدا میں کیفی چڑیا کوٹی صاحب کا ایک بسیط مقدمہ اور سعید احمد صاحب اکبرآبادی کی تقریظ اور مصنف کا دیباچہ شامل ہے ۔

مصنف نے اس کتاب کو سات عنوانات پر منقسم کیا ہے ۔ پہلا عنوان زبان اور اس کی ابتدا سے بحث کرتا ہے ۔ دوسرے میں ہندستان کی زبانوں کی نسبت مختصر سی معلومات قلمبند کی گئی ہیں ۔ لیکن ان کی فراہمی میں مصنف نے جدید ترین ماخذوں سے استفادہ نہیں کیا بلکہ انہی کتابوں کو پیش نظر رکھا ہے جو سر جارج گریرسن کے لنگوسٹک سروے آف انڈیا کا اپنا ماخذ اور سند سمجھی ہیں حالانکہ ماہرین لسانیات کی نظر میں گریرسن کی تحقیقات اور اس کے نتائج اب تقویم پارینہ سمجھے جاتے ہیں اور پروفیسر ٹرنر اور ڈاکٹر چٹرجی نے

اپنی کتابوں میں اس کی بہت سی غلطیاں ثابت کردی ہیں اور ہندستانی زبانوں کی تقسیم اور ان کے ارتقاء سے متعلق زیادہ واضح اور صحیح معلومات پیش کردی ہیں ۔ اس کتاب کے مصنف کو بھی چاہیئے کہ وہ اس کے دوسرے ایڈیشن میں ان جدید معلومات سے استفادہ کرکے اس عنوان میں ضروری تبدیلی کرے ۔

تیسری سرخی کے تحت مصنف نے ہندی ادب کا سرسری جائزہ لیا ہے اور چوتھے عنوان میں ہندی ادب کے مختلف ادوار بیان کئے ہیں ۔ پانچواں عنوان دورِ جدید کی نثر و نظم سے متعلق ہے ۔ اور آخری دو عنوانات میں ہندی کے ادبی ادارے اور اس زبان کے موجودہ رجحانات زیرِ تبصرہ آئے ہیں ۔ کتاب اس قابل ہے کہ اہلِ اُردو بھی اس کے مطالعہ سے مستفید ہوسکتے ہیں اور معلوم کرسکتے ہیں کہ ہندی کے بنانے اور ترقی دینے میں مسلمان مصنفوں اور شاعروں کا بھی کتنا حصہ ہے ۔

ناصرالدولہ آصف جاہ رابع ۔ از سید مراد علی صاحب طالع مطبوعہ اعظم اسٹیم پریس حیدرآباد دکن ۔ اس چھوٹی سی با تصویر کتاب میں سلسلۂ سلاطین آصفیہ کے چوتھے فرماں روا نواب میر فرخندہ علی خاں ناصرالدولہ کے حالات زندگی اور انتیس سالہ دورِ حکمرانی کے واقعات اجمال کے ساتھ بیان کئے گئے ہیں ۔ اس کا مقدمہ پروفیسر عبدالمجید صاحب صدیقی ایم اے ۔ ایل ایل بی نے قلمبند کیا ہے اور یہ کتاب ادارۂ ادبیات اُردو کے شعبۂ تاریخ نے شائع کی ہے ۔

اصل کتاب میں ولادت و تخت نشینی کے حالات کے بعد مہاراجہ چندو لال کی مدار المہامی صوبۂ برار کا فیصلہ اور دہابیوں کے زور جیسے سیاسی امور کو پیش کرکے آخری تین سرخیوں میں نواب ناصرالدولہ غفران منزل کے انتظام مملکت، سیرت اور وصیت پر روشنی ڈالی گئی ہے ۔ ان کے بعد اس عہد کے دیگر سماجی اور سیاسی واقعات کو تاریخی ترتیب کے ساتھ قلمبند کیا گیا ہے ۔

یہ کتاب طلبہ اور عوام کے مطالعہ کی غرض سے مرتب ہوئی ہے اور اس کی نسبت مقدمہ میں کہا گیا ہے کہ ۔

"ان سوانح حیات پر ضخیم کتابیں لکھائی جاسکتی ہیں اور یہ ادارے کے پیش نظر بھی ہے لیکن تاریخ کی خوش گوار خدمت یہ بھی ہے کہ چھوٹے رسالوں کے ذریعہ سے اس کی اشاعت کی جائے تاکہ عوام اور طلبہ ان سے فائدہ اٹھاسکیں ۔ کیونکہ تاریخ اور سوانح کی بلند پایہ جلدیں عوام کی دسترس سے باہر ہوتی ہیں ۔"

یک صد و چہل سالہ یادگار عدالتی ۔ از محمد شمس الدین صاحب صدیقی منصف وظیفہ یاب ۔ مطبوعہ شمس الاسلام پریس ۔ اس رسالے میں مولوی شمس الدین صاحب نے حیدرآباد میں محکمۂ عدالت کی خدمات کا وہ پہلو واضح کیا ہے جو اُن کے خاندان سے تعلق رکھتا ہے ۔ ایسے چھوٹے چھوٹے رسالے کسی ملک کی سماجی اور تمدنی تاریخ کی تدوین میں مفید ثابت ہوتے ہیں اور شمس الدین صدیقی صاحب ہر چھ مہینے کو ایک ایسا رسالہ اپنی ضعیفی کے باوجود برابر شائع کرتے رہتے ہیں ۔

سچ کا جادو ۔ از علی بن عبدالحبیب الحضرمی ۔ مطبوعہ اعظم اسٹیم پریس ۔ حیدرآباد دکن یہ ایک تعلیمی اور اخلاقی ڈراما ہے جو طلبہ کے لئے خاص طور پر سبق آموز ہے اور کئی بار مدرسوں میں اسٹیج پر پیش کیا جاچکا ہے ۔ اس کو ادارۂ ادبیات اُردو کے شعبۂ ادب اطفال نے شائع کیا ہے جو پرنسپل رفیعہ بیگم زین یار جنگ کی صدارت اور مولوی میر حسن صاحب ایم اے کی معتمدی میں بچوں کے لئے مفید اور دلچسپ کتابوں کی ترتیب و اشاعت کا اچھا کام انجام دے رہا ہے ۔

اس ڈرامہ میں ایک ایسے بچے کی کامیاب زندگی سلیس اور سادہ اسلوب میں پیش کی گئی ہے جس نے اپنی ماں کی نصیحت کے مطابق نازک سے نازک وقت پر بھی سچ بولنے سے کام رکھا اور اس لئے دنیا میں ہر طرح کی عزت اور خوشحالی کا ۔

مملکت آصفی میں نشریات کی ترقی ۔ مرتبۂ محکمۂ نشریات لاسلکی سرکارِ عالی ۔ مطبوعہ دار الطبع سرکارِ عالی ۔ اس دیدہ زیب باتصویر کتاب میں ان ترقیوں کا تذکرہ درج ہے جو مملکت حیدرآباد میں ریڈیو کے محکمہ نے گزشتہ چند سالوں میں کی ہیں ۔ ابتداء میں ایک تمہید ہے جس میں اس محکمہ کی مختصر سی تاریخ بیان کی گئی ہے اس کے بعد حیدرآباد اور اورنگ آباد دونوں مقامات کی نشرگاہوں کے تفصیلی حالات درج ہیں ۔ ان نشرگاہوں میں موسیقی تقاریر اور اخبار وغیرہ کے جو شعبے ہیں ان سب کی خصوصیات اور افادیت پر روشنی ڈالی گئی ہے ۔ حیدرآباد کی نشرگاہ سے بچوں اور عورتوں کا جو خاص پروگرام ہوتا ہے اور اسی طرح اورنگ آباد کی نشرگاہ سے جو دیہی پروگرام خاص طور پر نشر کیا جاتا ہے ان سب پر نہایت خوبی سے بحث کی گئی ہے ۔ آخر میں فنی شعبہ کا حال درج ہے جو سنہ وار ترتیب کے ساتھ پیش کیا گیا ہے ۔ پھر اس روئداد نظم دستر پر حکومت سرکارِ عالی کی جانب سے جو تبصرہ کیا گیا ہے اس کو بھی کتاب کے آخر میں شریک کر دیا گیا ہے ۔ جس کے مطالعہ سے معلوم ہوتا ہے کہ حکومت کی نظر میں بھی اس محکمہ کے کام اطمینان بخش ثابت ہوئے ۔ حکومت نے اس تبصرہ کے فقرہ نمبر ۹ میں اس نشرگاہ کی اس خصوصیت کو واضح کر دیا ہے کہ ۔

"یہ بات خاص طور پر قابلِ ذکر ہے کہ پروگرام میں و نیز سررشتہ کے عملہ کے لئے ملکی اہلِ کمال کی خدمات کو حاصل کرنے کے علاوہ فنی عملہ کے انتخاب میں خاص احتیاط برتی گئی ۔ اسلئے قابلیت پر زور دیا گیا ۔ مزید عملی تربیت دلائی گئی اور جہاں تک ممکن ہو سکا حتی کہ شعبۂ فنی میں بھی غیر ملکیوں کے انتخاب سے اجتناب کیا گیا ۔"

یہ کتاب دراصل ایک سرکاری محکمہ کی رپورٹ ہے لیکن اس میں زبان اور اسلوب بیان کی جو خوبیاں پائی جاتی ہیں وہ اس قابل ہیں کہ دوسرے سرکاری محکمے بھی ان کی تقلید کریں ۔ جس خوبی ترتیب اور خوشنمائی کے ساتھ اس میں دفتری اور فنی معاملات کو بھی پیش کیا گیا ہے اس کے پیشِ نظر یہ رپورٹ ایک ادبی کتاب سمجھی جا سکتی ہے اور اس کے لئے یہ محکمہ قابلِ مبارکباد ہے ۔

ناصر جنگ شہید ۔ از رہبر فاروقی ۔ مطبوعہ اعظم اسٹیم پریس حیدرآباد دکن ۔ یہ ایک دلچسپ تاریخی سوانح حیات ہے جس میں نواب میر احمد خاں نظام الدولہ ناصر جنگ شہید فرزند حضرت آصف جاہ اول کے حالات زندگی درج کئے گئے ہیں ۔

اس کتاب کو چار حصوں میں تقسیم کیا گیا ہے اس کے مصنف نے ناصر جنگ کی زندگی سے متعلق جملہ ماخذوں سے استفادہ کرنے کی کوشش کی ہے ۔ اور اپنے وسیع مطالعہ سے بہت اچھا کام لیا ہے ۔ البتہ جو ابواب قائم کئے ہیں وہ واقعات اور مصنف کی معلومات کے متحمل نہیں ہوتے ۔ اگر مندرجہ معلومات کو چار کی جگہ چھ یا آٹھ ابواب میں تقسیم کیا جاتا تو فن تاریخ کے لحاظ سے یہ کتاب اور زیادہ مکمل ہوتی اور پڑھنے والوں کی سہولت کا باعث بنتی ۔

چونکہ مصنف کو تاریخ کا بڑا اچھا ذوق حاصل ہے اور انھوں نے اس کتاب کے علاوہ اور بھی تاریخی مضامین اور مقالے شائع کئے ہیں اسلئے توقع ہے کہ یہ کتاب مقبول ہوگی اور اس کے مصنف عہد آصفی کے دیگر تاریخی ابواب کو بھی منظر پر لائیں گے ۔ اس عہد کی تاریخ پر کام کرنے کی بے حد ضرورت ہے لیکن افسوس ہے کہ اس عظیم الشان دور عثمانی میں بھی ایسے اصحاب قلم کی کمی ہے جو دکن کی تاریخ کے مختلف پہلوؤں پر روشنی ڈال سکیں ۔

رہبر فاروقی صاحب مستحق مبارکباد ہیں کہ انھوں نے اس کتاب کے ذریعہ سے ایک ایسے دور کو نمایاں کیا جس کے متعلق معلومات روز بروز تاریکی میں روپوش ہوتی جا رہی تھیں اور ہمارے قدیم مورخین نے بھی غالباً سیاسی مصلحتوں کی بنا پر اس عہد کو تاریک رکھنا ہی مناسب سمجھا تھا ۔

ادارہ

ادارے کی خبریں

حیدرآباد میں خواندگی کی مہم

مردم شماری کی تازہ ترین روئداد کے بموجب ہندستان کی آبادی دیسی ریاستوں کو شامل کرنے کے بعد چار ملین تک پہنچ گئی ہے لیکن خواندوں کی تعداد دس فیصدی سے زیادہ نہ ہو سکی۔ حیدرآباد کی آبادی برار کو چھوڑ کر تقریباً پندرہ ملین ہے لیکن یہاں بھی خواندوں کی تعداد برطانوی ہند کے بعض صوبوں سے بہتر نہیں ہے۔ اس مسئلہ سے دلچسپی رکھنے والے اس تلخ حقیقت کو شدت سے محسوس کرتے ہیں۔ حکومت اور عوام کا ترقی پسند طبقہ جلد سے جلد ناخواندگی کو دور کرنا ضروری سمجھتا ہے۔ چنانچہ محکمۂ تعلیمات سرکارعالی مقتدر اعتماد بلدیہ کے تعاون سے تعلیم بالغاں کے ایک منصوبہ پر عمل پیرا ہے۔ محکمۂ تعلیمات عمارتوں اور فرنیچر کی فراہمی کا ذمہ دار ہے اور بلدیہ کی جانب سے اساتذہ کی تنخواہیں اور مدارس کے مصارف برداشت کئے جاتے ہیں۔ اس وقت ۶۳ مدارس میں تقریباً دو ہزار طلبہ شریک ہیں ان میں سے زیادہ تر بلدہ حیدرآباد میں اور اضلاع کے بڑے مقامات میں قائم ہیں۔ یہ تعداد زیادہ ہمت افزا نہیں۔ لیکن خواندگی کی مہم کا ایک امید افزا پہلو یہ ہے کہ بعض خانگی ادارے سرگرمی سے تعلیم کی اشاعت کے لئے اپنے طور پر کوشش کر رہے ہیں۔ ان میں ادارۂ ادبیات اردو نمایاں ہے۔ ہر چند اس کی بنیاد ڈاکٹر سید محی الدین قادری زور نے اردو زبان اور ادب کی ترقی کے لئے رکھی تھی لیکن بعد میں خواندہ و ناخواندہ بالغوں کی تعلیم کے لئے ایک خاص شعبہ قائم کیا گیا۔ اس کی کوششوں میں مختلف درجوں کے امتحانات شامل ہیں جن کے لئے مستند ماہروں سے ادارے کی طرف سے خاص کتابیں لکھوائی اور شائع کی جاتی ہیں۔ کامیاب امیدواروں کو صداقت نامے اور سندیں دی جاتی ہیں جس کی وجہ سے ان امتحانات کی مقبولیت ملک کے ہر طبقے میں بڑھتی جا رہی ہے۔ ان کی مقبولیت کا ثبوت ان طلبا کی حیرت انگیز طور پر بڑھتی ہوئی تعداد سے ملتا ہے جو اندرون و بیرون حیدرآباد سے ہر سال شریک ہوتے ہیں حالانکہ ادارے کے صداقت ناموں اور سندوں کو ابھی سرکاری طور پر تسلیم نہیں کیا گیا اور نہ ہی اس وقت تک ادارے نے اس کی کوشش کی۔

ہر سال ادارے کی جانب سے حسب ذیل امتحانات لئے جاتے ہیں۔

۱۔ اردو دانی ۲۔ اردو زبان دانی ۳۔ اردو عالم ۴۔ اردو فاضل ۵۔ خوش نویسی ۶۔ خطاطی و کتابت۔

اردو دانی کا امتحان ناخواندہ سن رسیدہ مردوں اور عورتوں کے لئے مقرر کیا گیا ہے۔ ادارے نے ان امتحانوں کے لئے مولوی اظہر الدین صاحب مدرس مدرسہ مشتی سے مولوی محمد سجاد مرزا صاحب پرنسپل عثمانیہ ٹریننگ کالج کی نگرانی میں نصابی کتابوں کا ایک سلسلہ مرتب کرایا ہے جو اردو دانی کی کتابوں کے نام سے موسوم ہے۔ اس کو ہندستان کے مختلف حصوں میں مقبولیت حاصل ہوئی ہے اور بالغوں کے نصاب میں شریک کیا گیا ہے بالغوں کو پڑھنے اور لکھنے کی جانب راغب کرنے کے لئے یہ امتحان کس قدر موثر ثابت ہوا ہے اس کا اندازہ اس حقیقت سے لگایا جا سکتا ہے کہ تین سال کے عرصہ میں اس کے امیدواروں کی تعداد چار گنی ہو گئی ہے۔ اس سال تقریباً ایک ہزار امیدواروں نے شرکت کی درخواست کی ہے ان میں بڑی تعداد خواتین کی ہے۔ دوسرا دلچسپ پہلو یہ ہے کہ ایسے ناخواندہ بھی جن کی مادری زبان اردو نہیں ہے کثیر تعداد میں شریک ہو رہے ہیں۔ بعض ماہرین تعلیم ممکن ہے امتحان کے طریقہ کو اچھی نظر سے نہ دیکھیں لیکن تجربہ اس کا شاہد ہے کہ ہندستان میں ناخواندہ لوگ ان سے گہری دلچسپی لیتے ہیں۔ حالانکہ ابھی بازار میں ان کی کوئی قدر نہیں ہے۔

ہر سال صداقت نامے اور سندیں تقسیم کرنے کے لئے ادارہ ایک بڑا جلسہ منعقد کرتا ہے۔ اور یہ جلسے بھی خواندگی کی اشاعت کے لئے مفید ثابت ہو رہے ہیں کیونکہ بلدہ حیدرآباد کے علاوہ امتحانات کے ہر مرکز میں وہاں کی کسی مقتدر و معروف شخصیت کی صدارت میں تقسیم اسناد کے جلسے منعقد ہوتے ہیں۔ مملکت حیدرآباد میں ایسے پچاس مراکز ہیں اور ان کی تعداد میں ہر سال اضافہ ہو رہا ہے۔ اس طرح سے حیدرآباد میں تعلیم بالغان کی مہم کو روز افزوں تقویت حاصل ہو رہی ہے۔

خواندہ اصحاب کے لئے نہ صرف مختلف معیاروں کے امتحانات مقرر کئے گئے تاکہ ان کی دلچسپی برقرار اور مطالعہ جاری رہے بلکہ مختلف عنوانات پر دلچسپ کتابیں معانی اور شائع کرائی جاتی ہیں ان کے مطالعہ سے وہ لوگ بھی اپنا ذوق جاری رکھ سکتے ہیں جو بڑے امتحانوں میں شریک ہونا نہیں چاہتے۔ ایسے بالغوں کے لئے جنہوں نے لکھنا پڑھنا سیکھ لیا ہے "رفیق اردو داں" کے عنوان سے مولوی عصمت اللہ بیگ صاحب سے بھی ایک کتاب مرتب کرائی گئی ہے جو زیر طبع ہے۔ یہ کتاب فرصت کے اوقات میں ایک دلچسپ دوست کا کام دے گی۔ دوسری کتابوں کے بھی خاکے بنائے جا رہے ہیں اور بہت سی لکھائی جا رہی ہیں کیونکہ یہ محسوس ہو رہا ہے کہ اردو زبان میں بالغوں کے لئے اچھی کتابیں بہت کم ہیں۔

ادارہ کی جانب سے مندرجۂ بالا بیان جملہ اخبارات و جرائد میں بغرض اشاعت روانہ کیا گیا ہے

۱۹۴۳ء کے اردو امتحانات

ادارے نے تعلیم بالغان اور ترقی اردو کی اشاعت کے لئے جو امتحانات قائم کئے ہیں وہ ہر سال مقبول ہوتے جا رہے ہیں۔ اس سال جو امتحانات ۴۶ مرکزوں میں لئے گئے ان میں جملہ (۱۵۹۶) امیدواروں نے شرکت کی جن کی تفصیل یہ ہے۔

اردو فاضل ۱۳۱۔ اردو عالم ۲۵۶۔ اردو زبان دانی ۴۰۲۔ اردو دانی ۹۰۸ خوشنویسی ۱۷

وقت نامہ امتحانات

جملہ امتحانات ہر مرکز میں ایک ہی وقت میں شروع کئے گئے جن کا حسب ذیل وقت نامہ ہال ٹکٹ کے ساتھ جملہ امیدواروں کو روانہ کیا گیا تھا۔

اردو دانی

۱۶ اگسٹ / ۹ مہر دوشنبہ	۱۰ تا ۱ تحریری امتحان	۲ تا ۶ ...... زبانی امتحان

اردو زبان دانی

۱۶ اگسٹ / ۹ مہر دوشنبہ	۱۰ تا ۱ پہلا پرچہ (نظم و نثر و قواعد)	۲ تا ۵ دوسرا پرچہ حصہ اول مضمون نگاری و املا نویسی " دوم - عام معلومات ابتدائی امور خانہ داری تلنگی، مرہٹی، کنڑی سے ترجمہ
۱۷ اگسٹ / ۱۰ مہر سہ شنبہ	۱۰ تا ۱ زبانی امتحان	

اردو عالم

۱۵ اگسٹ / ۸ مہر یکشنبہ	۱۰ تا ۱ پانچواں پرچہ (اختیاری، خوشنویسی، شارٹ ہینڈ، ٹائپ، دفتری معلومات۔ امور خانہ داری)	۲ تا ۵ چوتھا پرچہ (عام معلومات)
۱۶ اگسٹ / ۹ مہر دوشنبہ	۱۰ تا ۱ پہلا پرچہ (نثر و قواعد)	۲ تا ۵ دوسرا پرچہ (نظم و بلاغت)
۱۷ اگسٹ / ۱۰ مہر سہ شنبہ	۱۰ تا ۱ تیسرا پرچہ (تاریخ ادب و مضمون نگاری)	

اردو فاضل

۱۵ اگسٹ / ۸ مہر یکشنبہ	۱۰ تا ۱ پہلا پرچہ (نثر)	۲ تا ۵ دوسرا پرچہ (نظم)
۱۶ اگسٹ / ۹ مہر دوشنبہ	۱۰ تا ۱ تیسرا پرچہ (تاریخ ادب و تنقید)	۲ تا ۵ چوتھا پرچہ (عام معلومات)
۱۷ اگسٹ / ۱۰ مہر سہ شنبہ	۱۰ تا ۱ پانچواں پرچہ (مصنف کا مطالعہ)	۲ تا ۵ چھٹا پرچہ (مضمون نگاری)

خوش نویسی

۱۵ اگسٹ / ۸ مہر یکشنبہ	۱۰ تا ۱ پہلا پرچہ	۲ تا ۵ ...... دوسرا پرچہ

صدر نگران کار | ہر مرکز کے لئے منجانب ادارہ ایک صدر نگران کار صاحب متعین کئے گئے تھے جو جوابی بیاضوں اور پرچہ سوالات کے مہر زدہ پیکٹوں کو لے کر بروقت مرکزوں پر پہنچ گئے جہاں ان کے استقبال اور قیام و طعام کا مناسب انتظام پہلے سے مقامی اصحاب نے کر لیا تھا۔ مراکز مذکورہ کی صدر نگرانی کے فرائض حسب ذیل اصحاب نے انجام دیئے۔ جنکی زحمت فرمائی کا منجانب ادارہ شکریہ ادا کیا جاتا ہے۔

۱۔ اورنگ آباد ۔ مولوی مرزا عبدالحلیم بیگ صاحب۔

۲۔ بسمت ۔ مسٹر صدیقی۔

۳۔ بلولی ۔ ۔ مراد علی صاحب طالع اردو فاضل۔

۴۔ بھوم ۔ ۔ قاضی محمد حبیب الدین صاحب (عثمانیہ ٹریننگ کالج)

۵۔ پربھنی ۔ ۔ عابد علی خاں صاحب بی اے۔

۶۔ پٹن ۔ ۔ ولی محمد خاں صاحب بی اے ڈپ ایڈ

۷۔ پرلی ۔ مولوی قدرت احمد صاحب راز (علیگ)

۸۔ پرینڈہ ۔ مولوی عبدالرزاق صاحب۔

۹۔ پوسے گاؤں ۔ ۔ محمد عبدالکریم صاحب (عثمانیہ ٹریننگ کالج)

۱۰۔ جولہ نظام الدین۔ جناب نارائن راؤ صاحب (" ")

۱۱۔ چیتاپور ۔ مولوی کلیم اللہ حسینی صاحب مولوی فاضل۔

۱۲۔ حیدرآباد سٹی کالج۔ مولوی سید محمد صاحب ایم اے۔

۱۳۔ " فتح میدان پویلین۔ مولوی عبدالمجید صدیقی صاحب ایم اے ایل ایل بی

۱۴۔ رینا پور ۔ مولوی عبدالواحد صاحب (عثمانیہ ٹریننگ کالج)

۱۵۔ سائے گاؤں ۔ ۔ فصیح اللہ حسینی صاحب (عثمانیہ ٹریننگ کالج)

۱۶۔ شاہ آباد ۔ ۔ مولوی رحیم الدین صاحب کمال ظہیرآبادی۔

۱۷۔ کاماریڈی ۔ ۔ معین الدین صاحب ایم ایس سی۔

۱۸۔ کلیانی ۔ ۔ عبدالعزیز رضوی صاحب (عثمانیہ)

۱۹۔ گدوال ۔ ۔ سید محی الدین احمد صاحب (عثمانیہ)

۲۰۔ گلبرگہ ۔ ۔ عبدالواحد صاحب (مدرسہ وسطانیہ مشتی خیریت آباد)

۲۱۔ نظام آباد ۔ مولوی عبدالفتاح صاحب (مدرسہ وسطانیہ مشتی خیریت آباد)

۲۲۔ ویجاپور ۔ مولوی شرف الدین صاحب بی اے بی ٹی۔

۲۳۔ ہمنا آباد ۔ جناب شیشیا صاحب (مدرسہ وسطانیہ مشتی خیریت آباد)

۲۴۔ ہنگولی ۔ مولوی محبوب حسین صاحب جگر (عثمانیہ)

مراکز نسواں | نسوانی مرکزوں کی نگرانی کے لئے بلدہ سے خواتین کو بھیجنے میں سہولت نہیں ہے تاہم کوشش کی جارہی ہے کہ علمدوست خواتین اس کام میں ادارے کا ہاتھ بٹائیں۔ اس سال مراکز نسواں میں حسب ذیل خواتین نے صدر نگرانی کے فرائض انجام دیئے۔ جس کے لئے منجانب ادارہ دلی شکریہ ادا کیا جاتا ہے۔

۱۔ اورنگ آباد ۔ سعیدہ بیگم صاحبہ معلمہ مدرسہ نسواں۔

۲۔ بسمت ۔ مسز فرید مرزا صاحب تحصیلدار

۳۔ بلولی ۔ بیگم صاحبہ سید افضل صاحب پیشکار۔

۴۔ بھوم ۔ کلثوم بی صاحبہ۔

۵۔ پربھنی ۔ صدر معلمہ صاحبہ مدرسہ نسواں۔

۶۔ پٹن ۔ صدر معلمہ صاحبہ مدرسہ نسواں

۷۔ پرلی ۔ غوث النساء بیگم صاحبہ معلمہ مدرسہ نسواں۔

۸۔ پرینڈہ ۔ بسم اللہ بیگم صاحبہ صدر معلمہ و مسز قدرت اللہ قادری

۹۔ پوسے گاؤں ۔ آمنہ بیگم صاحبہ۔

۱۰۔ جولہ نظام الدین ۔ ×

۱۱۔ چیتاپور ۔ شریفہ خاتون صاحبہ صدر معلمہ مدرسہ نسواں۔

۱۲۔ حیدرآباد ۔ بشیر النساء بیگم صاحبہ بشیر (یکشنبہ) رابعہ بیگم صاحبہ (دوشنبہ) سکینہ بیگم صاحبہ (سہ شنبہ)

۱۳۔ رینا پور ۔ عارف النساء بیگم صاحبہ معلمہ

۱۴۔ شاہ آباد ۔ صدر معلمہ صاحبہ مدرسہ نسواں۔

۱۵۔ کلیانی ۔ صدر معلمہ صاحبہ نسواں۔

۱۶۔ گدوال ۔ عائشہ بی صاحبہ صدر معلمہ۔

۱۸۔ گلبرگہ۔ صدر معلمہ صاحبہ مدرسہ نسواں

۱۹۔ میدک۔ غوثیہ بیگم صاحبہ معلمہ زنانہ ہائی اسکول ناپلی حیدرآباد

۲۰۔ نظام آباد۔ بیگم صاحبہ ڈاکٹر ابو طاہر عبدالقادر صاحب سول سرجن۔

۲۱۔ ویجاپور۔ سارا بیگم صاحبہ صدر معلمہ

۲۲۔ ہمنا آباد۔ قمرالنساء بیگم صاحبہ۔

۲۳۔ ہنگولی۔ قمرالنساء بیگم صاحبہ صدر معلمہ مدرسہ تحتانیہ نسواں۔

اجلاس شعبۂ زبان

ادارہ کے شعبۂ زبان کا ایک اجلاس ۲۰ شہریور ۱۳۵۲ف م ۲۷ جولائی ۱۹۴۳ء منعقد ہوا جس میں ذیل اصحاب نے شرکت کی۔

ڈاکٹر سید محی الدین صاحب قادری زور، مولوی سید محمد صاحب، نواب سیف علی خاں صاحب، ڈاکٹر رضی الدین صاحب صدیقی، ڈاکٹر محمد راحت اللہ خاں صاحب معتمد شعبہ۔

ف ۱۔ سابقہ جلسہ کی روئداد پڑھی گئی اور اراکین نے اس کی توثیق فرمائی۔

ف ۲۔ بنیادی ٹائپ کے متعلق مولوی محمد سجاد مرزا صاحب کا مراسلہ اور کاغذات مجلس میں پیش کئے گئے۔ اراکین نے مختلف پہلوؤں سے اس پر بحث کی اور حسب ذیل قرارداد بالاتفاق منظور کی گئی۔

"بنیادی اردو ٹائپ کے نمونوں اور اس کی خصوصیات پر غور و خوض کیا گیا۔ یہ ٹائپ خاص محنت اور توجہ سے تیار کیا گیا ہے اس کی بڑی خوبی یہ ہے کہ اس میں نستعلیق جیسی متعدد کرسیاں نہیں ہیں۔ البتہ اس کی شکل ابھی مانوس نہیں ہوئی اور اس لحاظ سے توقع ہے کہ مولوی سجاد مرزا صاحب کی کوششیں اس کو مزید دیدہ زیب بنائیں گی اور اس کے حروف میں جو سختی نظر آتی ہے وہ نزاکت اور حسن میں بدل جائے گی جو نظر اس وقت نستعلیق کی سڈول اور مدور شکلوں کو دیکھنے کی عادی ہے وہ اس ٹائپ سے اسی وقت مانوس ہوگی جب اس کے حروف میں بھی کچھ سڈول پن پیدا ہو۔"

ف ۳۔ مولوی احمد علی صاحب کی پیش کردہ تالیف "فرہنگ اصطلاحات حسن کاری" کے متعلق بالاتفاق طے پایا کہ مولوی سید محمد صاحب اس فن کے اساتذہ اور حسن کاری سے دلچسپی رکھنے والے حضرات کے مشورہ سے اس میں ضروری اصلاح فرماکر اس فرہنگ کو بغرض اشاعت معتمد صاحب ادارہ کے پاس روانہ فرمادیں۔

ف ۴۔ فرہنگ لسانیات کے متعلق مولوی عبدالقادر صاحب سروری کی تحریر مجلس میں پیش کی گئی جس سے معلوم ہوا کہ چند الفاظ ابھی تکمیل طلب ہیں۔ بالاتفاق طے پایا کہ بعد از تکمیل اس سلسلہ میں سابقہ قرارداد کے مطابق عمل کیا جائے۔

ف ۵۔ دکھنی محاوروں اور کہاوتوں وغیرہ کے متعلق بالاتفاق طے پایا کہ اس سلسلہ میں جس قدر مواد فراہم ہو چکا ہے اس کو نواب مرزا سیف علیخاں صاحب کے سپرد کردیا جائے تاکہ نواب صاحب موصوف ان کو حروف تہجی کے لحاظ سے مرتب اور ان کی تشریح مکمل فرماکر اشاعت کے قابل بنائیں۔ اس سلسلہ میں قاضی عبدالغفار صاحب اور مولوی ضیاءالدین صاحب انصاری کے پاس جو فہرستیں موجود ہیں ان کو بھی نواب صاحب بالمشافہ حاصل فرمالیں۔

ف ۶۔ مولوی مختار احمد صاحب کی تحریر جو املا سے متعلق تھی۔ مجلس میں پیش کی گئی۔ بعد از بحث اس کے متعلق حسب ذیل قرارداد بالاتفاق منظور کی گئی۔

"اردو املا میں تبدیلی کا مسئلہ سالہا سال سے اہل اردو کے پیش نظر رہا ہے اور جن الفاظ کو جیسا ملفوظ کیا جاتا ہے ان کو تلفظ کے مطابق لکھنے کا سوال بھی نیا نہیں۔ دکنی مصنفین و شعرا نے عہد قطب شاہی میں یہی طریقہ رائج کیا تھا لیکن بعد کو یہ جاری نہیں رہا۔ اور تمام اردو دنیا میں ہم آہنگی اور یکسانیت پیدا کرنے کی خاطر اہل دکن نے اپنی قدیم زبان اور طریقۂ املا کو

آج سے ڈیڑھ سو سال قبل بدل دیا۔

یہ زمانہ اردو کے تحفظ اور بقا کے لئے ایک عبوری دور ہے اور اس دور میں ایسی جملہ کوششیں جو تبدیلی سے متعلق ہوں تخریبی اثر پیدا کریں گی کیونکہ اندیشہ ہے کہ تمام اردو دنیا میں اس وقت جو یکسانیت ہے وہ تبدیلی کی صورت میں باقی نہ رہ سکیگی اور اس طرح ہر صوبہ اور ہر علاقہ اپنی خصوصیتیں رائج کرنے یا اصلاح کی کوشش میں اس کل ہند زبان کے حصے بخرے کرے گا۔"

ف۔ اجلاس ساڑھے سات بجے برخاست ہوا۔

مجلس انتظامی اردو انسائیکلوپیڈیا

اردو انسائیکلوپیڈیا کی مجلس انتظامی کا

گیارھواں اجلاس ۷؍ جولائی ۱۹۴۳ء کو ۶ بجے شام ادارہ کے دفتر میں منعقد ہوا جس میں حسب ذیل اصحاب نے شرکت فرمائی۔

۱۔ ڈاکٹر سید محی الدین صاحب قادری زور۔ صدر
۲۔ " رضی الدین صدیقی صاحب ۔ رکن
۳۔ " محمد راحت اللہ خاں صاحب ۔ "
۴۔ مولوی سید محمد صاحب "
۵۔ " عبدالقادر صاحب صدیقی "
۶۔ " سید بادشاہ حسین صاحب معتمد
۷۔ " فیض محمد صاحب صدیقی معتمد

صدر صاحب مجلس نے اردو انسائیکلوپیڈیا کی طباعت کے بارے میں دارالطبع سرکار عالی سے جو مراسلت ہوئی تھی وہ پڑھ کر سنائی اور ناظم صاحب طباعت سے جو بالمشافہ تفصیلی گفتگو کی تھی اس سے واقف کرایا۔ اخراجات طباعت و کاغذ و بلاک کا تخمینہ تین ہزار روپیہ فی جلد کیا گیا۔

طے پایا کہ طباعت کا کام شروع کر دیا جائے اور صدر صاحب اور معتمدین صاحبین ناظم صاحب طباعت سے مل کر اخراجات کی کمی کی کوشش کریں

طے پایا کہ اردو انسائیکلوپیڈیا ہی نام برقرار رکھا جائے۔

طے پایا کہ کتاب ڈبل ڈمی سائز پر چھپوائی جائے الا یہ کہ دوسری سائز کا کاغذ بہت ہی سستے داموں مہیا ہوتا ہو۔

ذیلی مجلس اردو امتحانات

مجلس انتظامی اردو امتحانات کی ذیلی مجلس کا ایک اجلاس

بتاریخ ۱۹ شہریور ۱۳۵۲ف م ۲۶ جولائی ۱۹۴۳ء بروز دوشنبہ تین بجے عثمانیہ ٹریننگ کالج میں بصدارت مولوی محمد سجاد مرزا صاحب ایم اے کینٹب منعقد ہوا۔ ڈاکٹر سید محی الدین صاحب قادری زور اور مولوی عبدالمجید صاحب صدیقی ایم اے ایل ایل بی نے شرکت فرمائی۔ مولوی سید محمد صاحب ایم اے شریک معتمد شعبہ نے دوسری اہم مصروفیت کی وجہ سے بذریعہ تحریر شرکت سے معذرت کی اطلاع دی۔

گزشتہ اجلاس کی روداد کی توثیق کے بعد مولوی خواجہ حمید الدین صاحب شاہد بی اے مہتمم ادارہ نے اردو امتحانات کے امیدواروں کی وہ درخواستیں پیش کیں جو دیر سے وصول ہوئی تھیں لیکن جن کی فیس مقررہ تاریخ سے قبل وصول ہو چکی تھی۔ جملہ درخواستوں پر کافی غور و خوض کے بعد طے پایا کہ صرف اس سال ان درخواستوں کو فیس دیرانہ کے ساتھ قبول کر لیا جائے۔ اور ادارہ کی شاخوں کے معتمد صاحبان کو ہدایت کر دی جائے کہ آئندہ سے وہ جملہ درخواستیں مقررہ تاریخ سے قبل مکمل حالت میں روانہ فرمادیں۔ ورنہ اس بارے میں شاخوں کے ساتھ بھی کوئی رعایت نہ کی جائے گی۔

مہتمم صاحب ادارہ نے اردو امتحانات کے جملہ امیدواروں

اور مرکزوں کی تفصیل پیش کی اور طے پایا کہ آئندہ سے اسی مقام پر مرکز قائم کیا جائے جہاں سے پچاس یا اس سے زیادہ امیدوار شریک ہوں۔

اردو عالم کے اختیاری مضمون کے بارے میں مولوی نصیر الدین صاحب ہاشمی کی تحریک پیش کی گئی کہ

"خواتین کے لئے امور خانہ داری کو مختص کر دینا مناسب نہیں ہے بلکہ جو خواتین دفتری معلومات یا کوئی دوسرا اختیاری مضمون لینا چاہتی ہیں ان کو اس کی اجازت دی جائے۔"

معتمد صاحب ادارہ نے کتابچۂ قواعد و ضوابط امتحانات سے واضح کیا کہ اس قسم کی کوئی قید موجود نہیں ہے چنانچہ اب تک خواتین نے امور خانہ داری کے علاوہ دوسرے اختیاری مضامین بھی لئے ہیں۔

اردو امتحانات کی آمد و خرچ کے حسابات پیش کئے گئے اور سالحال کا موازنہ منظور کیا گیا۔ ممتحنین کے معاوضے میں اضافے کا مسئلہ پیش ہوا اور بعد غور و خوض طے پایا کہ شرکت امتحان کی فیس بہت کم ہونے کی وجہ سے بحالت موجودہ اضافہ کی گنجائش نہیں ہے۔

گذشتہ مجلس میں جن پرچہ جات سوالات پر تبصرہ نہ ہو سکا تھا ان پر تبصرہ کیا گیا۔

مجلس معتمدین شعبہ جات

ادارۂ ادبیات اردو کے معتمدین شعبہ جات کا چوتھا اجلاس شنبہ ۲۴ اگست ۱۹۴۳ء م ۲ اردیبہشت ۱۳۵۲ ف شام کے چھ بجے دفتر ادارہ میں منعقد ہوا۔

حاضرین۔

محترمہ سکینہ بیگم صاحبہ معتمد شعبۂ نسواں۔

مولوی عبدالمجید صاحب صدیقی معتمد شعبۂ تاریخ دکن۔

پروفیسر محمد سعید الدین صاحب معتمد شعبۂ سائنس۔

نواب مرزا سیف علیخاں صاحب " " کتب خانہ۔

مولوی سید بادشاہ حسین صاحب " " اردو انسائیکلوپیڈیا۔

" فیض محمد صاحب صدیقی " " " "

" نصیر الدین صاحب ہاشمی رکن مجلس انتظامی۔

ڈاکٹر سید محی الدین صاحب قادری زور معتمد عمومی ادارہ۔

مولوی نصیر الدین صاحب ہاشمی رکن مجلس انتظامی ادارہ کو ایک اہم تحریک کے محرک ہونے کی حیثیت سے شرکت کی دعوت دی گئی۔ ڈاکٹر محمد رحمت اللہ خاں صاحب معتمد شعبۂ زبان نے ایک شدید ضرورت کی بنا پر اپنی عدم شرکت کی اطلاع دی اور تحریکات کے بارے کمیٹی کے دوران میں بذریعہ ٹیلیفون اپنی رائے سے آگاہ کیا۔

مولوی ظہیر الدین احمد صاحب معتمد شعبۂ تالیف و ترجمہ نے بالمشافہ اور مولوی میر حسن صاحب معتمد شعبۂ اطفال نے بذریعہ ٹیلیفون شرکت سے معذرت چاہی۔

گزشتہ اجلاس کی روداد سنائی گئی اور مولوی ہاشمی صاحب کی حسب ذیل تحریک پیش ہوئی۔

"ادارۂ ادبیات اردو کے جو شعبے اس وقت قائم ہیں ان میں کسی قدر ترمیم کرنی مناسب ہے۔ مثلاً شعبۂ شعرا و مصنفین اور شعبۂ تنقید کو ایک کر دیا جا سکتا ہے۔ میرے خیال میں حسب ذیل شعبے قرار دیئے جا سکتے ہیں۔

۱۔ شعبۂ ادبیات و تنقید۔ ۲۔ شعبۂ تاریخ و جغرافیہ۔ ۳۔ شعبۂ سائنس و ریاضی۔ ۴۔ شعبۂ اردو امتحانات۔ ۵۔ شعبۂ نسوانیات۔ ۶۔ شعبۂ معاشیات ۷۔ شعبۂ اطفال۔ ۸۔ شعبۂ لسانیات۔ ۹۔ شعبۂ ترجمہ۔

شعبۂ شعرا و مصنفین سے کتبات کا نصب کرنا شعبۂ تاریخ کے ذمہ کیا جا سکتا ہے۔ کیونکہ یہ ایک تاریخی جزو ہے۔ شعبۂ ترجمہ سے صرف ترجمہ شدہ کتابیں متعلق ہوں گی۔

یہ تحریک چونکہ ادارے کی علمی مصروفیتوں اور لائحۂ عمل پر اصولی طور پر اثر انداز ہوتی ہے اس لئے اس پر کافی غور و خوض کیا گیا اور ادارے کی مجلس انتظامی کے غور و خوض کیلئے یہ رائے طے پائی کہ:۔

ادارہ کی روز افزوں مصروفیتوں اور وسعت کار اور گزشتہ کئی سال کے تجربہ کے پیش نظر مناسب معلوم ہوتا ہے کہ آئندہ سے ادارہ کے کام حسب ذیل گیارہ شعبوں میں تقسیم کئے جائیں:۔

۱۔ اردو امتحانات۔ ۲۔ اردو انسائیکلوپیڈیا ۳۔ کتب خانہ ۴۔ نسواں۔ ۵۔ ادب اطفال ۶۔ طلبہ ۷۔ سائنس۔ ۸۔ تاریخ۔ ۹۔ علوم عمرانی۔ ۱۰۔ زبان۔ ۱۱۔ ادب۔

(ب) بعض شعبوں کے وسعت کار کے پیش نظر ضروری ہے کہ ان کی ذیلی مجالس بھی قائم کی جائیں جن کی تفصیل یہ ہے۔

شعبۂ تاریخ:۔ یہ شعبہ تین ذیلی مجلسوں پر مشتمل ہوگا۔ ۱۔ عام تاریخ ۲۔ جغرافیہ۔ ۳۔ تاریخ دکن۔ مشاہیر سے متعلقہ کتبات کی تنصیب کا کام بھی اسی شعبہ کے سپرد رہے گا۔

شعبۂ علوم عمرانی:۔ اس شعبہ میں حسب ضرورت سیاسیات، معاشیات، عمرانیات وغیرہ کی ذیلی مجلسیں قائم کی جائیں اور اس شعبہ کے معتمد مولوی ظہیر الدین احمد صاحب ایم اے ایچ سی ایس (حال معتمد شعبۂ تالیف و ترجمہ) ہوں گے۔ اس لئے کہ تالیف و ترجمہ کا کام زیادہ تر اسی شعبہ میں پیش آئے گا۔

شعبۂ سائنس:۔ اس شعبہ کے تحت ریاضی بھی شامل رہے گی۔

شعبۂ ادب:۔ اس شعبہ میں ادبی نظم و نثر کی کتابوں کے علاوہ قدیم شعرا و مصنفین دکن سے متعلقہ کام بھی شامل ہوگا۔ عند الحال اس کے معتمد ڈاکٹر زور صاحب اور نائب معتمد مولوی نصیر الدین صاحب ہاشمی رہیں گے۔ شعبۂ تنقید بھی اسی کی ذیلی مجلس ہوگا۔ اور اس کے معتمد سعادت علی صاحب رضوی ہی رہیں گے۔

(ج)۔ طے پایا کہ شعبہ جات تاریخ علوم عمرانی اور کتب خانہ کے اراکین اور اول الذکر دو شعبوں کی ذیلی مجالس کے معتمدین کا انتخاب جلد ان شعبوں کے اجلاس منعقد کر کے کیا جائے۔

(د) شعبۂ طلبہ کی نگرانی اور انتخابات کا کام مولوی فیض محمد صاحب صدیقی کے تفویض کیا گیا۔

۲۔ شعبہ جات کی مصروفیتوں سے متعلق معتمدین نے روداد بیان کی اور شعبۂ نسواں کی مصروفیتوں سے متعلق محترمہ سکینہ بیگم صاحبہ نے ایک مختصر سی تحریری رپورٹ پیش کی جس کو پسند کیا گیا اور طے پایا کہ دیگر شعبہ جات کے معتمدین بھی یکم آبان ۱۳۵۲ف تک اپنے اپنے شعبوں سے متعلق ایسی ہی روداد یں روانہ فرمائیں۔

۳۔ محترمہ سکینہ بیگم صاحبہ کی حسب ذیل تحریک پیش ہوئی۔

"اردو میں تلمیحات و تشبیہات کی ایک مستند لغت کی ضرورت کو محسوس کرتے ہوئے میں تحریک کرتی ہوں کہ انسائیکلوپیڈیا کی طرح اس کام کو بھی ادارہ اپنے ذمہ لے کر اردو میں ایک اہم اور گراں قدر کتاب کا اضافہ کرے۔"

طے پایا کہ یہ ایک مفید اور ضروری کام ہے اس لئے اس تحریک کو اس اجلاس کی سفارش کے ساتھ شعبۂ ادب میں پیش کیا جائے تاکہ یہ شعبہ جلد سے جلد اس کام کا آغاز کرے۔

۴۔ محترمہ سکینہ بیگم صاحبہ نے تحریک پیش کی کہ

"ادارہ کے شعبۂ تاریخ کی جانب سے اردو میں ایک کتاب "رہنمائے حیدرآباد" مرتب کر کے شائع کی جائے۔"

معتمد صاحب تاریخ نے اس تحریک سے اتفاق کیا اور طے پایا کہ اس مجلس کی رائے میں یہ کتاب جلد شعبۂ تاریخ کی جانب سے شائع کی جائے۔ اور اس میں پوری ریاست کے متعلق ضروری معلومات شامل ہوں۔

نرمل میں اردو کا کام

۲ خورداد ۱۳۵۲ف روز دوشنبہ ۵ بجے شام ادارۂ ادبیات اردو شاخ نرمل کی مجلس انتظامی کے انتخاب کے لئے ایک جلسۂ عام زیر صدارت جناب ملا سید فخر الحسن صاحب بی اے بی ٹی صدر مدرس مدرسہ فوقانیہ نرمل منعقد ہوا جس میں معززین، تجار، وکلاء اور عہدہ داران مقامی بھی شریک تھے جن کو ادارہ کے ارکان وفد مولوی خواجہ حمید الدین صاحب شاہد بی اے، مولوی رحیم الدین صاحب ظہیر آبادی نے مخاطب فرمایا اور تحسین صاحب سروری کی نظم کے بعد انتخابات عمل میں آئے۔ جناب صدر نے پر مغز تبصرہ فرمایا۔ ختم جلسہ پر مسٹر حضرمی نے بحیثیت معتمد شکریہ کے فرائض انجام دیئے۔

شاخ چنتا پور

نواب ظہیر یار جنگ بہادر امیر پائیگاہ نے ۱۵ امرداد سنہ ۱۳۵۲ف کو ادارۂ ادبیات اردو شاخ چنتا پور کا معائنہ فرما کر (۵۰) عطا فرمائے اور کتاب الرائے میں تحریر فرمایا کہ:-

"آج میں نے آبادی چنتا پور کے معائنہ کے اثناء میں اس ادارہ کا بھی معائنہ کیا۔ یہ ادارہ اپنی حد تک مفید کام کرتا پایا جاتا ہے اور یہ مقامی عہدہ داروں کی دلچسپی کا نتیجہ ہے معتمد ادارہ محبوب خاں صاحب کی محنت اور کوشش، امید ہے کہ اس ادارہ کے کاروبار کی سرگرمی میں اور اضافہ کرے گی"

شاخ گلبرگہ

ادارہ ادبیات اردو گلبرگہ شریف کی شاخ کا ایک اجلاس ۱۰ جولائی ۱۹۴۳ء منعقد ہوا جس میں صاحب ذوق حضرات نے شرکت کی۔ نور الحسن صاحب انور نے ایک بصیرت افروز تقریر کی کہ ہر شہر میں ایک نہ ایک ادبی محفل ایسی ہے جس کا مقصد اردو ادب کی اشاعت اور ترقی ہے۔ یہ کمی گلبرگہ میں ایک عرصہ سے محسوس کی جارہی تھی۔ کئی نوجوان ادیب اپنی انفرادی کوششوں میں منہمک تھے مگر ان سب کو مرکزیت پر لانے کے لئے ایک ایسی انجمن کی ضرورت ہے جس کے ذریعہ تمام انفرادی کوششوں کو ایک جا جمع کیا جاسکے اس کے بعد موصوف نے شعبۂ تالیف و ترجمہ کے قیام کی تحریک پیش کی اور اس کے اغراض و مقاصد، قواعد و ضوابط کو اچھی طرح واضح کیا۔ باتفاق آراء یہ تحریک منظور کی گئی اور مجلس انتظامی کی تشکیل عمل میں آئی۔

صدر۔ مولوی نصیر الدین صاحب ایم اے لکچرار اردو گلبرگہ کالج۔

معتمد۔ ” نور الحسن صاحب انور (عثمانیہ)

اراکین:- مولوی نیاز علی خاں صاحب نیاز اردو فاضل، مولوی عبد الرشید صاحب سہروردی اردو عالم۔ مولوی عبد الحمید صاحب اردو عالم مولوی محمد جعفر صاحب اردو عالم۔ مولوی عبد الغنی صاحب آفسر اردو فاضل

خازن:- مولوی مسعود انصاری صاحب اردو عالم۔

آغاز کار:- فی الحال اس شعبہ کی جانب سے بہترین علمی و ادبی مضامین اور معیاری افسانے شائع کئے جارہے ہیں۔ آئندہ کوشش کی جائے گی کہ بہترین ادیبوں کی مستقل تصانیف کو بھی منظر عام پر لایا جائے۔ اس شعبہ میں جناب مولوی محمد بن عمر صاحب ایم اے بھی نمایاں دلچسپی لے رہے ہیں۔

شعبۂ طالبہ پرلی

اس شعبہ میں چکر پانی صاحب کے تبادلہ کے بعد حسب ذیل انتخابات ہوئے۔

صدر:- مسٹر دیوی داکس راؤ صاحب مہتمم مارکٹ پرلی۔

نائب صدر:- مسٹر سندراج صاحب میڈیکل افسر دواخانہ سرکار عالی پرلی۔

معتمد:- محمد سعید الدین صاحب صدیقی۔

نائب معتمد:- محاسب صاحب لوکل فنڈ پرلی۔

منتظم کتبخانہ:- نجم الدین صاحب۔

اراکین:- غلام احمد خاں صاحب، اکبر حسین صاحب، سرور علی صاحب۔ صدر معلمہ صاحبہ مدرسہ نسواں، عبد الکریم صاحب، سلطان خاں صاحب۔

امتحانات کے مرکزوں کی رُوداد

اضلاع مدینہ کے ہر مرکز پر جو صدر نگران کار صاحب تشریف لے گئے تھے انھوں نے اپنے مرکز کے کام کی نسبت تفصیلی رپورٹیں روانہ فرمائی ہیں۔ ان کے ضروری اقتباسات درج ذیل ہیں۔

مرکز اورنگ آباد میرا قیام اورنگ آباد میں اپنے ایک عزیز کے یہاں تھا جس کی وجہ سے میں معتمد صاحب ادارہ یا مولوی عارف الدین صاحب کے پاس ٹھیر نہ سکا۔ اسٹیشن پر میرے عزیز اور مولوی غازی معین الدین صاحب بی اے ایل ایل بی وکیل معتمد موجود تھے۔ اگرچہ میں بروز شنبہ بوقت صبح تقریباً ۹ بجے اورنگ آباد پہونچ چکا تھا مگر غازی صاحب سے معلوم ہوا کہ وہاں جمعہ کی صبح میں میری آمد کی اطلاع یا توقع تھی۔ پٹن کے لئے مولوی ولی محمد خاں صاحب لکچرار اورنگ آباد کالج نے بحیثیت صدر نگران کار تکلیف فرمانے پر آمادگی ظاہر فرمائی تھی مگر ایک تو پٹن میں ہیضہ کی وجہ سے اور دوسرے پرچہ جات کی دیررسی کے باعث مولوی صاحب موصوف نے انکار فرما دیا۔

مولوی عارف الدین صاحب نے جو مجسمۂ خلوص و ایثار ہیں اس موقع پر وہ سب کچھ کیا جس کی ضرورت تھی۔ اصلاح غلط فہمی و معذرت خواہی سے ہر کام بنالیا اور حتیٰ کہ مولوی شرف الدین صاحب صدر نگران کار ویجاپور کے ہمراہ خود بھی تشریف لے گئے۔ یہ کہنا مبالغہ نہیں ہے کہ مولوی عارف الدین صاحب مراکز اورنگ آباد۔ ویجاپور کی بقا کے ضامن ہیں اور تھے۔ یہ نہ ہوتے تو اورنگ آباد جس کو مُردوں کی بستی کہنا چاہیے، مردہ دلی کا ثبوت دیتا۔

امتحانات کے انتظامات اورنگ آباد کالج میں کئے گئے تھے جس کے لئے مولوی محمد ابراہیم صاحب پروفیسر اور مولوی محمد علی صاحب اور اسی کالج کا اسٹاف قابلِ تشکر ہے کہ یہاں ہر قسم کی مدد و سہولت بہم پہونچائی گئی۔

امتحانات شعبۂ اناث کی نگرانی محترمہ سعیدہ بیگم صاحبہ معلمہ نے فرمائی اور بوجہ احسن اپنے فرائض انجام دیئے جن کا شکریہ ادا کرنا ضروری ہے پرچہ کے انتظامات مولوی غلام دستگیر صاحب صیغہ دار ڈویژن نے فرمائے جو نہایت بہتر تھے۔

اورنگ آباد میں اگرچہ اور بھی ادارے بنام "ادبستان" "بزم سراج" ہیں مگر بےجان۔ اگر کچھ احساس زندگی ہے تو ادارہ ادبیات اردو میں۔ ضرورت ہے کہ اس کو اور زیادہ اجاگر کیا جائے۔ اس وقت ادارہ کا دفتر اڈولہ باغ میں ہے جو ایک سرکاری عمارت ہے۔ لحاظاً اس کے کہ اورنگ آباد دارالخلافہ رہا ہے اور دیگر خصوصیات بھی اس شہر کو حاصل ہیں ضرورت ہے کہ یہاں ادارہ کی ایک مستقل عمارت تعمیر کی جائے یا موجودہ عمارت ہی ادارہ کو دے دی جائے۔ اس بارہ میں جناب نواب صوبہ دار صاحب سے میں نے بالمشافہ تبادلۂ خیال بھی کیا ہے اور ان کو وجناب امل تعلقدار صاحب کو ہر ممکنہ معاونت پر آمادہ کر لیا ہے ضرورت ہے کہ مہینہ دو مہینہ بعد ایک وفد معتمد صاحب ادارہ کی قیادت میں اورنگ آباد روانہ ہوتا کہ وہاں فراہمیِ سرمایہ کے لئے بصدارت جناب صوبہ دار صاحب ایک جلسہ طلب کیا جائے۔ جب تک مولوی عارف الدین صاحب سے توقع ہے کہ وہ فضا کو ایسی ہموار کرلیں گے کہ ہمارا مقصد حاصل ہو۔

اورنگ آباد میں سرسوتی بھون دیکھنے کے بعد اگر ہم کچھ کام نہ کرسکے تو ہمارے لئے شرم کا مقام ہے ہم کو زندہ رہنا ہے اور اردو کی خدمت کرنے کا دعویٰ ہے تو ہم کو بھی یہ عزم کرلینا چاہیے کہ اورنگ آباد میں انشاء اللہ کچھ کرکے رہیں گے۔

بموجب گزشتہ مرکز اورنگ آباد کے لئے دو نقروی میڈل متعاقب روانہ کئے جاتے ہیں جن میں سے ایک امتحان اردو عالم ذکور میں اول آنے والے امیدوار کو دیا جائے اور دوسرا امتحان اردو عالم اناث میں اول آنے والی لڑکی کو۔

مرزا عبدالحلیم بیگ

مرکز بلولی ۔ مہر ۱۳۵۲ف کی صبح ٹھیک ۱۰ بجے بذریعہ موٹر بس بلولی پہنچا۔ مولوی محمد عبدالبصیر صاحب صدر مدرس و معتمد شاخ ادارہ، مولوی مرزا یوسف بیگ صاحب، مولوی محمد بن عبداللہ صاحب ارکان ادارہ نے استقبال کیا۔ مدرسہ تحتانیہ ذکور اور مدرسہ تحتانیہ نسواں کی عمارتیں امتحانات کے لئے منتخب کی گئی تھیں۔ امیدواروں کی نشستوں کا معقول انتظام تھا۔ ہر روز تمام امیدوار مقررہ وقت سے کچھ پہلے ہی امتحان گاہ میں جمع ہوتے اور ٹھیک وقت پر لفافہ چاک کیا جا کر سوالات کے پرچے امیدواروں کو تقسیم کئے جاتے تھے۔

امتحان گاہ ذکور میں مولوی عبدالبصیر صاحب صدر مدرس اور مولوی مرزا یوسف بیگ صاحب مددگار صدر مدرس نے پابندی کے ساتھ نگرانی کے خوشگوار فرائض انجام دیے اور ان ہی اردو پرست حضرات کی پرخلوص کوششوں کا نتیجہ ہے کہ ضلع ناندیڑ میں ادارۂ ادبیات اردو کی سب سے پہلی شاخ بلولی میں قائم ہوئی اور سال حال یہ مقام مرکز امتحان بھی بن گیا۔ اس سال صرف اردو دانی اور اردو عالم کے امتحانات یہاں لئے گئے ہیں توقع ہے کہ یہاں کا علم دوست طبقہ آئندہ سال ادارہ کے دوسرے امتحانوں میں زیادہ سے زیادہ تعداد میں شرکت کرے گا۔

مولوی سید افضل صاحب پیشکار تحصیل خاص طور پر شکریہ کے مستحق ہیں جن کی بیگم صاحبہ نے امتحان گاہ اناث میں صدر نگران کار کے اہم فرائض نہایت ہی خوش اسلوبی سے انجام دیے۔ وہ مقامی ادارہ کی مخلص و دل رکن بھی ہیں۔ صدر معلمہ صاحبہ مدرسۂ نسواں بلولی کا دلی شکریہ ادا کرنا بھی ضروری ہے جنھوں نے نگرانی کے سلسلے میں صدر نگران کار صاحبہ کی مدد فرما کر اپنی علم دوستی کا ثبوت دیا۔

زمانۂ امتحانات میں میرے قیام و طعام کا انتظام ارکان ادارہ نے اپنے ذمہ لے رکھا تھا جن میں مولوی عبدالبصیر صاحب صدر مدرس، مولوی مرزا یوسف بیگ صاحب مدرس، مولوی مرزا ناصر علی بیگ صاحب سوداگر اور مولوی بشیر احمد خاں صاحب صیغہ دار رجسٹری قابل ذکر ہیں اور یہی حضرات ادارہ کے ارکان ہیں۔ اگرچہ کہ بعض دیگر علم دوست حضرات اور وکلا صاحبان بھی ادارہ کے ارکان ہیں لیکن باوجود اس کے ادارہ کی شاخ کی طرف بہت کم توجہ کی گئی ہے۔ اردو کی پرخلوص خدمت گزاری اہل ملک کا مقدس فریضہ ہے اور اس کا عملی ثبوت یہ ہو سکتا ہے کہ اطراف و اکناف میں جہاں تک ہو سکے اردو کی توسیع و اشاعت کی جائے۔ ہر سال زیادہ سے زیادہ تعداد میں امیدوار فراہم کئے جائیں۔ شاہزادۂ والاشان حضرت ولیعہد بہادر دام اقبالہٗ کا ارشاد ہے کہ "اردو ہندوستان کے کسی خاص صوبے یا فرقے کی زبان نہیں بلکہ ہندو مسلم طرز گفتگو کا سنگم اور دونوں قوموں کے میل جول کی یادگار ہے۔"

ارکان شاخ ادارہ کو چاہیے کہ ادارہ کے کاروبار میں باقاعدگی پیدا کریں، باضابطہ کتب خانہ قائم کیا جائے، مہینہ میں کم از کم ایک بار تعلیمی جلسہ ہوا کرے اور اس کی اطلاع مرکزی ادارہ کو دی جایا کرے اور ناگزیر صورتوں میں مرکزی ادارہ سے مدد طلب کی جائے۔

چنانچہ معتمد صاحب سے بالمشافہ میں نے یہی چند باتیں کہہ دی ہیں امید ہے کہ وہ ان پر عمل کر رہے ہوں گے ۱۱ مہر کی صبح مولوی عبدالبصیر صاحب، مولوی مرزا یوسف بیگ صاحب، مولوی بشیر احمد خاں صاحب اور بعض دیگر حضرات مجھے رخصت کرنے کے لئے موٹر تک تشریف لائے جن کا شکریہ ادا کر کے میں بلولی سے روانہ ہو گیا۔

سید مردو علی طالع

مرکز بھوم (جاگیر) ۔ ۲۵ مہر ۱۳۵۲ف کی صبح میں بارسی اسٹیشن پہنچا ادارۂ ادبیات اردو کی شاخ بھوم کے معتمد مولوی محمد علی خاں صاحب علی وغیرہ پھول لئے ہوئے

ہمارے منتظر تھے۔

بارسی سے بھوم تک ۱۵-۱۶ میل کا فصل ہے۔ کچھ دور بیل گاڑی پر اور کچھ دور پیدل چل کر ہم رات میں داخل بھوم ہوئے۔

ہمارا انتظام رہائش مولوی سید تجمل حسین صاحب منشی ڈپہ خانہ بھوم نے اپنے مکان پر فرمایا۔ ادارے کی شاخ "بھوم" کے صدر مسٹر رنگا راؤ (جو وہاں کے ڈیکل افسر بھی ہیں) نے ہمارے لئے کافی سہولتیں بہم پہنچائیں جناب مولوی مرزا رحمت اللہ بیگ صاحب تحصیلدار بھوم نے ہماری مہمان نوازی میں کوئی دقیقہ اٹھا نہ رکھا تھا۔ امتحان گاہ کے لئے عمارت مدرسہ بھوم منتخب کی گئی تھی۔ اسی عمارت کے ایک حصے میں زنانہ کا انتظام تھا۔ جناب مولوی سید عبدالرحیم صاحب صدر مدرس مدرسہ بھوم کی عنایتوں سے ہمیں امتحان میں بڑی مدد ملی۔ مولوی کریم الدین صاحب متوطن بھوم نے بھی نگرانی میں مدد فرمائی۔ جناب کلثوم بی صاحبہ جو وہاں کی پڑھی لکھی خاتون ہیں۔ پردہ نشین امیدوارات کی نگران کار بنائی گئیں۔ بہرحال ۲۱ مہر ۵۲ف سے شروع ہوکر ۲۵ مہر ۵۲ف کو ہمارا امتحان اطمینان کے ساتھ اختتام کو پہنچا۔

چونکہ ہمارا تعلق عثمانیہ ٹریننگ کالج کی جماعت آئی۔ ٹی۔ سی۔ سے تھا اس لئے جناب صدر مدرس صاحب کی خواہش اور اصرار پر ایک عملی سبق بمضمون انگریزی مدرسہ بھوم میں دیا گیا۔

قاضی محمد حبیب الدین

مرکز پربھنی

ادارۂ ادبیات اردو کے سالانہ امتحانات کے صدر نگار کی حیثیت سے مجھے پربھنی جانے کا اتفاق ہوا۔ پربھنی کی شاخ ادارہ کی تمام شاخوں میں اپنی تنظیم اور کارکردگی کی وجہ سے اہمیت رکھتی ہے۔ میں ادارہ کے ایک سرگرم معاون مولانا ابرار حسین صاحب صدر مدرس مدرسہ فوقانیہ کے ہاں مقیم تھا۔ جناب موصوف کو ادارہ سے گہری دلچسپی ہے جس کا ثبوت آپ کی وہ دوڑ دھوپ اور مساعی ہیں جو ادارہ کی کسی تقریب کے موقع پر یا تیاری امتحانات کے سلسلے میں ظاہر ہوتی ہیں تحریری اور زبانی امتحانات تین روز تک ہوتے رہے۔

میرا یہ ایقان ہے کہ ادارہ کا یہ اقدام ہندستان کی علمی دنیا میں ایک بہت بڑا انقلاب ہے جو اپنے نتائج و افادیت کے اعتبار سے ایک دن کل ہند مقبولیت حاصل کرلے گا۔ اردو یا علم کے شائقین محض سیکھنے اور پڑھنے کی غرض سے ان امتحانات میں شریک ہوتے ہیں۔ ان کا مقصد جامعی امتحانات کی طرح سند حاصل کرنا نہیں ہے۔ مرکز پربھنی میں جو امیدوار شریک تھے ان میں پانچ چھ سال کے بچوں سے لے کر ساٹھ سال کے ضعیف بھی تھے۔ کسی جامعہ کو شاید ہی یہ امتیاز مل سکے گا کہ بچے اور بوڑھے دونوں ساتھ ساتھ حصول علم میں مصروف ہیں۔ ان امتحان دینے والوں میں اکثریت غریبوں کی تھی ان میں چپراسی درزی، معمار، باغبان، قلی، مزدور اور طالب علم سبھی تھے یہ اپنے پیشے کی مصروفیتوں کے اختتام کے بعد تھوڑا سا وقت نکال کر ان امتحانات کی تیاری کرتے رہے ہیں۔ ادارہ کا یہ اقدام صرف اسناد ہی عطا نہیں کررہا ہے بلکہ تعلیم بالغاں جیسے فرض کو بھی انجام دے رہا ہے۔ حیدرآباد میں بہت دنوں سے اس سلسلے میں کوشش کی جارہی ہے مگر میرا یہ یقین ہے کہ ادارہ کے اس اقدام ہی سے ملک میں بالغاں کی تعلیم کوئی مستقل اور محکم انتظام ہوا ہے۔ ادارہ بلدۂ حیدرآباد میں مختلف جماعتوں اور توسیعی تقاریر کے ذریعہ طلبہ کو سہولت بہم پہنچاتا ہے مگر قصبات و دیہات کے مراکز میں اس انتظام کا نہ ہونا خراب نتائج کا باعث ہوگا۔

مجھ سے کئی اصحاب نے یہ استفسار کیا کہ خارجی امتحانات کے تسلیم کئے جانے سے عوام کا رجحان ان تسلیم کردہ امتحانات کی جانب ہورہا ہے۔ میں نے ہر ایسے استفسار کا یہی جواب دیا ہے کہ کارروائی ہورہی ہے اور حکومت ان امتحانات کے نتائج و عواقب اور افادیت سے ناواقف نہیں ہے۔ ادارہ خواندگی کی مہم میں جو ممتاز ترین حصہ لے رہا ہے اور حکومت کا ہاتھ بٹا رہا ہے اس کو حکومت بنظر تحسین دیکھتی ہے اور وہ دن دور نہیں ہے جب کہ

یہ امتحانات بھی تسلیم کر لئے جائیں گے۔

ادارہ کا مقامی دفتر جو بزم رنداں سے ملحق ہے بہت اچھی اور پاک و صاف حالت میں ہے۔ ادارہ کے سرگرم و پر جوش معتمد جناب حمید اللہ خاں شیدا قابل مبارکباد ہیں کہ ان کی مساعی سے ایک بہت بڑا قومی کام انجام پا رہا ہے۔

میں مولوی ابرار حسین صاحب ایم اے (علیگ) و فاضل مصر حمید اللہ خاں صاحب شیدا اور اساتذہ صاحبان مدرسہ فوقانیہ و صدر معلمہ صاحبہ کا ممنون ہوں جنھوں نے نگرانی امتحانات کے سلسلے میں زحمت فرمائی اور میرا ہاتھ بٹایا۔

ناشکر گزاری ہوگی اگر جناب محمد علی خاں صاحب منتظم ہال اور مظہر علی خاں صاحب کنٹرولنگ افسر کا تذکرہ نہ کیا جائے جو ادارہ کے ہمدردوں میں ہیں اور جنھوں نے مجھے پر تکلف ضیافت دے کر میری عزت افزائی فرمائی۔

میر عابد علی خاں

مرکز پرلی اسٹیشن پرلی پر میں کوئی رات میں ساڑھے دس بجے پہونچا جناب مولوی سعید الدین صاحب معتمد ادارہ مولوی عبدالستار صاحب صدیقی نائب معتمد ذی وجاہت بزرگ مولوی فیاض الدین صاحب مدرس ذی اثر رکن مولوی شیخ حسین صاحب مدرس اور سید غنی صاحب معتمد انجمن مسلم نوجوانان کے علاوہ اور بھی اراکین تشریف فرما تھے۔ معتمدین صاحبان نے پھول پہنائے۔ رخصت کرتے بھی علی الصباح ۸ بجے کم و بیش یہی حضرات موجود تھے۔

انتظام قیام و طعام نہایت معقول تھا۔ سہ روزہ دعوتوں کا باقاعدہ پروگرام رہا۔ دعوتوں میں مندرجۂ بالا حضرات کے سوا مولوی شریف الدین صاحب مدرس اور محترمہ صدر معلمہ صاحبہ بھی شریک تھیں۔

میں ادارہ ہی میں ٹھیرایا گیا تھا۔ مجھے یہاں ہر طرح کا آرام خصوصاً مولوی سعید الدین صاحب معتمد ادارہ اور سرگرم رکن مولوی شیخ حسین صاحب نے مہماں نوازی کا حق ادا کیا۔ وہ ہر طرح ہمارے (ادارہ کے) مستحق شکریہ ہیں۔ ہم مولوی عظمت اللہ حسینی صاحب کے شکر گزار ہیں جنھوں نے ہمیں امتحانات کے لئے مدرسہ عنایت فرمایا۔

ادارہ جناب صدر معلمہ صاحبہ کی اجازت سے ان کے مکان کے دیوانخانہ میں ہے۔ اس کا کام طلبہ کے ہاتھوں میں ہے۔ سال حال ان کی سخت آزمائش ہوئی۔ آفرین ہے ان کی ہمتوں پر کہ باوجود سخت مخالفت کے یہ مرکز برقرار رکھنے میں کامیاب ہوئے۔ یہ ان کا بڑا کارنامہ ہے۔

دفتر کی تنظیم اور کتب خانہ کی داد و ستد کا انتظام لائق تحسین ہے۔ درسی کتب امتحانات ادبیات اردو کے (خصوصاً اردو فاضل کے کتب جو قیمتی ہیں) فراہمی کی طرف توجہ دلائی گئی ہے تاکہ کم استطاعت طلبا ان سے فائدہ اٹھا سکیں۔

کارگزاری یہ کہ شبینہ تعلیم کے ذریعہ سے ایسے امیدوار ادارہ سے شریک کرائے گئے ہیں جو دن بھر زراعت کے کام میں لگے رہتے ہیں۔

آخر میں یہ میری دعا ہے کہ خداوند کریم ان کے ارادوں میں بلندی اور پختگی، دلوں میں ہمت اور خلوص، آپس میں اتفاق و اتحاد اور زیادہ دے جس سے وہ اس سے بڑھ کر اردو کی خدمت کر سکیں۔

مولوی بدر الدین صاحب مدرس مدرسہ سلیم (مومن آباد) بر اردو عالم کے امتحان کی غرض سے آئے ہوئے تھے۔

مولوی فیاض الدین صاحب مدرس مدرسہ کمیر (مومن آباد) جو طالبات کو ساتھ وہاں لائے تھے۔ مولوی سراج الدین صاحب مدرس

مدرسہ تحتانیہ عباسیہ گھاٹ نانمدہ (جو نواب عباس یار جنگ بہادر فرزند نواب تراب یار جنگ بہادر کی جاگیر ہے) نے اپنے پاس سے پانچ ہندو اور دو مسلمان امتحان زبان دانی میں شریک کرائے ہیں۔

ان تینوں حضرات نے مجھ سے وعدہ فرمایا ہے کہ ہو سکا تو ششماہی امتحان کے لئے ورنہ سالانہ کے لئے تو یقینی وہ اپنے اپنے مقامات کو آئندہ مرکز بنانے کی کوشش کریں گے۔ اس معاملہ میں بہت جلد ان کا ارادہ ادبیات اردو کے ادارہ سے خط و کتابت کرنے کا ہے۔

دو قواعد کی کتابیں جو ساتھ تھیں ان میں سے دو کے حوالے کی گئیں۔

ان امتحانات کے سلسلہ کرانے کی نسبت استفسار کیا گیا ساتھ ساتھ امتحان منشی کا زیادہ رجحان ہونے کی طرف توجہ معطوف کرائی گئی۔

اس کا جواب یہ دیا گیا کہ کوشش جاری ہے۔ اس کے لئے یہ ضروری نہیں کہ عالم اور فاضل ہی میں شریک ہوں۔ اردو دانی اور زبان دانی میں اس کثرت سے شریک ہوں کہ مقامی زبان عام اردو ہو جائے۔

قدرت احمد راز

مرکز پوسے گاؤں تعلقہ ہنگولی | تاریخ ۲، بہمن ۱۳۵۲ف

ٹھیک ۳ بجے ذریعہ بس ہنگولی پہونچا مولوی سید موسیٰ صاحب مجھے لینے کے لئے پہلے ہی سے حاضر تھے چنانچہ موصوف نے میرا خیر مقدم کیا اور گلپوشی کی جس کا شکریہ ادا کیا گیا۔ بنڈی تیار تھی اسی وقت نکل کر قریب ۸ بجے شام پوسے گاؤں پہونچا بستی کے باہر مولوی احمد شاہ خاں صاحب معتمد اور دیگر مدرسین اور علماء میری آمد کی منتظر تھی۔ مولوی احمد شاہ خاں صاحب نے گلپوشی کی رسم ادا کی اور باجے کی آواز کے ساتھ میری آمد کا اعلان کرتے ہوئے قیام گاہ پر پہونچے۔ قیام گاہ پر پہونچ کر مجھ ناچیز کو ادارۂ ادبیات اردو کے باعث جو عزت بخشی گئی اس کا شکریہ ادا کیا گیا۔ چونکہ رات کافی گزر چکی تھی۔ اس لئے جملہ اصحاب کو گھر جانے کی اجازت دی گئی۔ معتمد صاحب نے میرے خورد و نوش کا پہلے ہی سے معقول انتظام فرما دیا تھا۔ بعد تناول طعام معتمد صاحب و مددگاران مدرسہ سے کچھ دیر تبادلۂ خیال کے بعد آرام کیا گیا۔

۸ بجے صبح مدرسہ پہونچا معتمد صاحب نے پہلے ہی سے نشستوں کا معقول انتظام کر دیا تھا۔ مگر اردو عالم کے امیدواروں کی نشستیں بالکل قریب قریب تھیں اس لئے اس میں تبدیلی کی جا کر امیدواروں کو دور دور بٹھایا گیا۔ ٹھیک وقت پر یعنی ۹ بجکر پچاس منٹ کو پہلی گھنٹی بجائی گئی اور ۱۰ بجے آغاز امتحان کی گھنٹی کے ساتھ ہی کام شروع کر دیا گیا۔ دوپہر میں بھی اسی طرح ۱ کو پہلی گھنٹی اور ۲ بجے آغاز امتحان کی گھنٹی بجانے کا انتظام کیا گیا۔ ہر روز تا ختم امتحان اس کی سختی سے پابندی ہوتی رہی۔ آغاز امتحان کے ساتھ ہی ہال ٹکٹ کی تنقیح شروع کی گئی۔

دوران امتحان میں کافی اچھا انتظام رہا مولوی احمد شاہ خاں صاحب اور مسٹر بلی رام پنت اور مولوی محمد یعقوب صاحب کو نگران کار مقرر کیا گیا تھا۔ نگرانی اچھی رہی کسی قسم کی بدنظمی نہ ہو سکی۔ ۱۲ بہمن ۱۳۵۲ف کو ایک بجے میں اپنے فرائض سے سبکدوش ہو چکا تھا لیکن رعایا کی خواہش پر مزید ایک یوم رکجانا پڑا۔ ہدایت اللہ امیدوار کے والد دیسکھ نے پر تکلف دعوت کی۔ بلی رام پنت اور مولوی سید موسیٰ صاحب نے چار نوشی کی دعوت کی۔ رتن لال جی ساہو نے بھی جملہ اسٹاف مدرسہ کے ساتھ چار نوشی کی دعوت دی۔ بوقت چار ساعت معتمد صاحب نے ایک جلسہ منعقد فرمایا۔ جس میں تقریباً ڈیڑھ سو کا مجمع تھا۔ معتمد صاحب کی تحریک اور مولوی محمد یعقوب صاحب کی تائید سے میں نے کرسی صدارت پر بیٹھنے کی عزت حاصل کی۔ جلسہ کی ابتدا قرأت سے ہوئی۔ عبدالمعز طالب علم نے بچپن کا زمانہ نظم سنا کر حاضرین کو محظوظ کیا۔ عبدالعزیز طالب علم نے ایک قصیدہ پڑھا۔ ازاں بعد میں نے ادارۂ ہذا کی کارگزاری حاضرین کے گوش گزار کی۔ مولوی احمد شاہ خاں صاحب نے حاضرین جلسہ کا شکریہ ادا کیا اور ان کی حوصلہ افزائی فرمائی کہ مرکز ہذا کا قیام

انہیں کی کاوشوں کا نتیجہ ہے۔ امتحان زنانہ مرکز سے متعلق یہ عرض کرنا ضروری ہے کہ جناب آمنہ بیگم صاحبہ نے نگران کاری کا کام انجام دیا۔ اور محترمہ محبوب بی صاحبہ صدر معلمہ نے بھی اس خصوص میں کافی امداد بہم پہونچائی۔

مرکز پوسے گاؤں کا قیام مولوی احمد شاہ خاں صاحب کے نیک ارادوں اور مولوی محمد یعقوب صاحب کی کوششوں کا نتیجہ ہے۔ امیدواروں کی تعلیم کا انتظام مستقل طریقہ پر کیا جاتا ہے۔ اناث کی تعلیم محترمہ محبوب بی صاحبہ اہلیہ مولوی احمد شاہ خاں صاحب کی تنہا کوشش کا نتیجہ ہے

محمد عبد الکریم

مرکز جولہ نظام الدین باسی اسٹیشن پر جولہ نظام الدین کے صدر مدرس اور معتمد ادارہ میرے استقبال کے لئے حاضر تھے معلوم ہوا کہ وہ میرا انتظار دو دن سے کر رہے تھے۔ باسی سے جولہ نظام الدین جانے کے لئے بنڈی کی سواری کا انتظام کیا گیا تھا۔ ہم جولہ نظام الدین شام کے سات بجے پہنچے۔ آبادی کے قریب شہر کے بہت سے لوگ میرے انتظار میں کھڑے تھے۔ وہاں پہنچتے ہی پھول کے ہار وغیرہ پہنائے گئے اور باجہ کے ساتھ مدرسہ کی عمارت تک گاؤں میں سے جلوس بھی نکالا گیا۔ جلوس میں ہندو مسلمان بڑے اور چھوٹے شریک تھے۔ کچھ طلبہ ہاتھ میں اسکاوٹ کے ڈنڈے لے کر راستے سے "ابد خالق عالم" کا قومی ترانہ بھی گاتے ہوئے قطار میں جا رہے تھے۔ رعایا اور طلبہ کا تعلیمی ذوق دیکھ کر اس وقت مجھے بہت ہی مسرت ہوئی۔ مدرسہ کی عمارت میں جلوس پہنچنے کے بعد میں نے مجمع کو مختصر الفاظ میں مخاطب کیا اور وہاں کے لوگوں کے تعلیمی ذوق کو بہت پسند کیا اور ان کا شکریہ بھی ادا کیا۔

دوسرے دن ارعددانی اور اردو زبان دانی کا صبح میں امتحان شروع ہوا۔ دوپہر میں اردو دانی کا زبانی امتحان بھی لیا گیا۔ تمام امیدواروں کے ہال ٹکٹ موجود تھے۔ ان کی جانچ وغیرہ کی گئی۔

دوران امتحان میں کسی امیدوار نے نقل وغیرہ نہیں کی۔ امیدواروں کی تیاری اچھی تھی اور خوشی خوشی پرچہ جات حل کر رہے تھے۔ اردو دانی کا زبانی امتحان ۶ بجے شام ختم ہوا۔ جولہ نظام الدین اسی سال امتحان کا مرکز قائم ہوا ہے۔ اس کے قیام میں وہاں کے تحتانیہ کے صدر مدرس مولوی معین الدین صاحب صدیقی نے ان تھک کوشش کی ہے۔

اس مرکز میں نہ صرف جولہ کے امیدوار ہی شریک تھے بلکہ اطراف کے مواضعات انکور اور واکرٹی کے امیدوار بھی شریک تھے۔ انکور کے مدرس صاحب مولوی مرزا محسن بیگ نے بہت کوشش سے امیدواروں کو امتحان میں شریک کرایا۔ ان سے بہت ہی کم مدت میں امتحان کی تیاری کرائی۔ وہ خود امتحان کے دن موجود تھے۔ دوسرے دیہات کے امیدواروں کے قیام و طعام کا انتظام جولہ نظام الدین کے لوگوں نے چندہ جمع کر کے کیا تھا۔ اس کام میں وہاں کے انعامدار مولوی رفیع الدین صاحب اور سید عبد الکریم صاحب تاجر نے بہت نمایاں حصہ لیا تھا۔ مجھے یہ دیکھ کر بھی بہت خوشی ہوئی کہ ایک بالکل ہی نوجوان مسٹر لیسٹر راؤ نے جو وکرٹی کے باشندے تھے وہاں کے امیدواروں کو امتحان میں شریک کرایا اور خود شریک تھے۔

جولہ نظام الدین میں امتحان کا مرکز تو قائم ہو گیا تھا لیکن ادارہ کی شاخ وہاں پر ابھی قائم نہیں ہوئی تھی۔ دوشنبہ کی رات کو وہاں کی رعایا کو بلایا گیا۔ جلسہ میں میں نے ادارہ جو خدمت کر رہا ہے اس کا ذکر کیا۔ علم کی اہمیت اور اردو کی ضرورت پر تقریر میں بہت زور دیا۔ میں نے کہا اردو نہ صرف ہماری ریاست کی دفتری زبان ہے بلکہ وہ ہندوستان کی بھی قومی زبان بنتی جا رہی ہے۔ تقریر کے ختم پر شاخ کے صدر اور اراکین کا انتخاب عمل میں آیا۔ سید عبد الکریم صاحب صدر اور دوسرے صاحبین اراکین مقرر ہوئے۔ معتمدی کا کام خود مولوی معین الدین صاحب انجام دے رہے ہیں اور وہ آئندہ سال کے لئے ارعد زبان دانی کے کامیاب امیدوار کو معتمدی کے کام کے لئے تیار کر رہے ہیں۔

دس بجے جلسہ برخاست ہوا۔ جلسہ میں مجھے معلوم ہوا کہ بہت سے امیدوار آئندہ سال اردو عالم اور اردو زباں دانی کی تیاری کرنے والے ہیں۔ دس بجے کے بعد اسی دن چھوٹا سا گانے کا جلسہ بھی ہوا جس میں بہت سے نوجوانوں نے حصہ لیا۔ خود مولوی صاحب نے گانے میں حصہ لیا تھا۔ وہ وہاں بہت ہر دلعزیز ہیں۔

مدرسہ کا کام بھی بہت ہی عمدگی سے انجام دیتے تھے جس کے متعلق مہتمم صاحب تعلیمات وغیرہ کی رپورٹ بھی اچھی تھی جس کو خود میں نے پڑھ کر دیکھا۔ مدرسہ کی تعلیمی حالت وغیرہ اچھی تھی۔

بروز سہ شنبہ ۱۰ ار مہر ۱۳۵۲ف صبح اردو زباں دانی کا زبانی امتحان لیا گیا جو ایک بجے ختم ہوا۔ اور ہم اسی دن تین بجے وہاں سے بارسی روانہ ہوئے۔ خود مولوی معین الدین صاحب بھی بارسی تک میرے ہمراہ تھے۔ میرے قیام و طعام کا بہت ہی عمدہ انتظام کیا گیا تھا۔ سواری کا بھی انتظام اچھا تھا۔ لوگوں میں کافی تعلیمی ذوق نظر آیا۔ عنقریب وہاں رسالہ سب رس اور دو سرا روزانہ اخبار بھی جاری کیا جانے والا ہے۔ مختصر یہ کہ یہ سب کام مولوی معین الدین صاحب صدیقی صدر مدرس مدرسہ تحتانیہ جولہ کی انتھک کوشش کا نتیجہ ہے جس کی وجہ سے میں خود ان کا بہت شکر گزار ہوں اور ادارہ بھی شکر گزار رہے گا۔

نارائن راؤ ابلم کر

مرکز رینا پور رینا پور پہنچنے کے بعد جناب صدر شاخ ادارہ ادبیات اردو و صدر مدرس مدرسہ تحتانیہ رینا پور، مولوی شبیر علی صاحب معتمد شاخ، مسٹر وتاترے راؤ نائب صدر مولوی اشرف الدین صاحب فیضی اور دیگر حضرات نے نہایت ہی گرم جوشی سے میرا استقبال کیا۔

قیام و طعام کا معقول و مناسب انتظام کیا گیا تھا۔ امتحان کی سہولت کے خیال سے قیام کا انتظام مدرسہ تحتانیہ رینا پور میں کیا گیا تھا۔ دوپہر کے بعد نشستوں کا تعین کر لیا گیا اور بچوں پر ان کے ناموں کی چٹھیاں چسپاں کی گئیں۔ ۱۰ ار مہر ۱۳۵۲ف سے امتحان کا آغاز ہوا۔ صبح میں اردو عالم کا پانچواں پرچہ اور دوپہر میں چوتھا پرچہ تھا۔ عالم کے امتحان میں یہاں سے اس سال صرف ایک ہی امیدوار شریک ہوا۔ ۹ ار مہر کی صبح میں اردو دانی، اردو زباں دانی و عالم کے پرچے تھے۔ مسٹر گوبند راؤ اور مولوی شبیر علی صاحب اور مولوی اشرف الدین صاحب فیضی نے نگران کاری کے فرائض باحسن الوجوہ انجام دئے۔

مسٹر وتاترے راؤ صدر شاخ ادبیات اردو و مولوی شبیر علی صاحب معتمد ستائش کے قابل ہیں کہ ان کی انتھک کوشش محنت و جانفشانی کی وجہ سے یہاں مرکز قائم ہوا اور پہلے سال ۲۴ امیدواروں کو شریک امتحان کیا گیا اور آئندہ سال بھی ان حضرات کی مستعد مزاجی سے امیدواروں کی تعداد میں دگنی اور سہ گنی اضافہ کی امید ہے۔

معتمد صاحب یہاں اردو دانی، زباں دانی اور عالم کی تعلیم نہایت محنت اور جانفشانی سے دیتے ہیں۔ اس سے قبل مولوی سید محی الدین صاحب مدرس اس شاخ کے رکن تھے اور ان کی وجہ سے تدریس میں کافی مدد ملتی تھی۔ مگر صاحب موصوف کا یہاں سے تبادلہ ہو گیا ہے اور تمام تدریس کا کام مولوی شبیر علی صاحب کو انجام دینا پڑتا ہے اگر کوئی اردو داں مدرس اس شاخ کا رکن ہو جائے تو اردو کے امیدواروں کو بہت سہولت ہوگی۔

عارف النساء بیگم صاحبہ معلمہ مدرسہ نسواں رینا پور شکریہ کے لائق ہیں جنھوں نے اپنے فرائض کو نہایت ہی خوبی سے انجام دیا۔ اور ادارہ کی ہدایات پر پوری طرح عامل رہیں۔ مولوی اشرف الدین صاحب فیضی کی خدمات جو کہ انھوں نے مختلف مراکز قائم کرنے میں انجام دی ہیں محتاج بیان نہیں لیکن میرا یہ خوش گوار فریضہ ہے کہ صاحب موصوف کا شکریہ ادا کروں کہ آپ نے نہایت ہی خندہ پیشانی سے امتحان کے انتظام میں میرا ہاتھ بٹایا۔ آپ بعد اوقات مکتب

میرے ہی ساتھ رہتے تھے۔

مسٹر دتاترے راؤ صدر ادارہ و شبیر علی صاحب معتمد کا بھی مشکور ہوں کہ ان ہر دو حضرات نے دوران امتحان میں نہایت ہی دلچسپی سے میرے ساتھ تعاون عمل کیا۔

مولوی غلام صمدانی صاحب دفعدار پولیس ریناپید کا بھی مشکور ہوں جنھوں نے نہایت ہمدردی کا اظہار فرمایا اور میرے قیام کے سلسلے میں مختلف سہولتیں بہم پہنچائیں۔ نیز صاحب موصوف نے ۹؍ مہر کی شب میں ایک پر تکلف دعوت پر مدعو فرمایا۔

عبدالماجد بن سعید

مرکز سائے گاؤں

میں بتاریخ ۸؍ مہر ۱۳۵۲ف روز شنبہ ۸ بجے صبح مومن آباد پہنچا۔ یہاں سے بذریعہ بنڈی اسی روز شب کے نو بجے داخل سائے گاؤں ہوا۔ جناب مولوی منصور علی صاحب معتمد و مولوی معین الدین صاحب نائب معتمد و دیگر معزز مقامی حضرات نے استقبال کیا۔

قیام و طعام کا معقول انتظام کیا گیا تھا۔ اردو زبان دانی میں ۱۹ امیدوار شریک امتحان تھے لیکن ایک امیدوار غیر حاضر رہا۔ مولوی منصور علی صاحب معتمد کی جانفشانی کی وجہ سے اس مرکز کا قیام عمل میں آیا ہے۔ یہاں کے عوام میں علمی ذوق پایا جاتا ہے۔

سید فصیح اللہ حسینی

یہ خبر ادارۂ ادبیات اردو کے ہمدردوں میں نہایت تاسف کے ساتھ سنی جائے گی کہ ادارے کے ایک مؤسس اور مجلس انتظامی کے رکن مولوی محمد عبدالقادر صاحب صدیقی ایم اے لکچرار شعبۂ دینیات جامعہ عثمانیہ نے صرف چند روز کی علالت میں وفات پائی۔ موصوف جامعہ عثمانیہ کے شعبۂ دینیات کے پہلے فارغ التحصیل اور علوم عربیہ خاص کر کلام و تصوف کے جید عالم ہے۔

ادارے کی مجلس انتظامی منعقدہ ۳؍ ستمبر ۱۹۴۳ء نے حسب ذیل قرار داد تعزیت منظور کی ہے۔

"ادارۂ ادبیات اردو کی مجلس انتظامی ادارہ کے ایک مؤسس اور مجلس ہذا کے رکن مولوی عبدالقادر صاحب صدیقی ایم اے لکچرار شعبۂ دینیات جامعہ عثمانیہ کی بے وقت وفات کو ادارہ ہذا کا ایک نقصان عظیم تصور کرتی ہے۔ کیونکہ موصوف اس ادارے کے نہ صرف ایک مخلص بانی تھے بلکہ اسکی گزشتہ تیرہ سالہ زندگی میں اسکی نشو و نما کے لئے مرحوم نے اپنی ممکنہ کوششیں صرف کیں۔

یہ اجلاس مرحوم کے پس ماندوں کے ساتھ اظہار ہمدردی کرتا ہے۔ معتمد اعزازی ادارہ اس تحریک تعزیت کو ان کے پسماندوں تک پہنچا دیں۔"

ادارۂ ادبیات اردو کی کتابیں

نام کتاب	صفحات	روپے	آنے	پیسے
من کی بیتا ...	۸۰	۰	۸	۰
سرگزشت عالم ...	۹۴	۰	۸	۰
نظام الملک ...	۴۰	۰	۴	۰
تاریخ گولکنڈہ ...	۳۳۰	۳	۸	۰
ریڈیو نمبر (۸ تصاویر)	۱۹۰	۱	۰	۰
ارمغان جذ... ...	۱۲۰	۰	۱۲	۰
سوتیلی ماں ...	۴۸	۰	۴	۰
سرسید احمد خاں ...	۱۶	۰	۲	۰
سر سالار جنگ ...	۴۸	۰	۶	۰
مغربی تصانیف کے اردو تراجم	۱۴۵	۱	۴	۰
محبت کی چھاؤں ...	۱۳۲	۱	۴	۰
اقبال نمبر ...	۱۶۸	۱	۴	۰
سائنس کے کرشمے ...	۱۱۲	۱	۰	۰
شعرائے عثمانیہ ...	۲۳۰	۲	۱۲	۰
مکتوبات شاد عظیم آبادی	۳۰۰	۲	۸	۰
دادا بھائی ...	۱۶	۰	۲	۰
اردو نامہ ...	۲۰۰	۲	۰	۰
ارسطو جاہ ...	۶۵	۰	۶	۰
عماد الملک ...	۴۰	۰	۶	۰
اردو دانی کی پہلی کتاب	۵۶	۰	۵	۰
" دوسری کتاب	۵۶	۰	۵	۰
محمد حسین آزاد ...	۲۰۰	۲	۰	۰
کاغذ کی ناؤ ...	۱۲۰	۱	۴	۰
فن تقریر ...	۹۲	۰	۸	۰
مقدمہ تاریخ دکن ...	۱۴۴	۱	۰	۰
ہندستانی تمدن ...	۳۴۰	۳	۸	۰
پودوں کی کہانی ...	۸۰	۰	۱۰	۰
مہ لقا ...	۱۰۰	۱	۰	۰
پانی کی کہانی ...	۴۸	۰	۶	۰
رسائل طبیہ ...	۳۱۲	۲	۸	۰
سلک گوہریں ...	۴۰	۰	۴	۰
تاریخ ادب اردو ...	۱۷۶	۱	۴	۰
ورڈس ورتھ اور اسکی شاعری	۱۸۴	۱	۴	۰
ہوش کے ناخن ...	۹۴	۱	۰	۰
یوسف ہندی قید فرنگ میں	۸۹	۱	۰	۰
شاد اقبال ...	۱۷۶	۲	۸	۰
آریائی زبانیں ...	۱۰۴	۱	۰	۰
نظام علی خاں ...	۳۲	۰	۴	۰
عرب اور عربستان ...	۵۶	۰	۱۰	۰

نام کتاب	صفحات	روپے	آنے	پیسے
سحر کا جادو ..	۴۸	۰	۴	۰
ٹیگور اور ان کی شاعری	۱۲۸	۱	۴	۰
متاع سخن ...	۱۲۴	۰	۱۲	۰
کیف سخن ...	۱۲۲	۰	۱۲	۰
بادۂ سخن ...	۱۲۷	۰	۱۲	۰
سراج سخن ...	۱۵۲	۰	۱۲	۰
ایمان سخن ..	۱۲۰	۰	۱۲	۰
نبض سخن ...	۱۴۴	۰	۱۲	۰
مرقع سخن جلد اول (۵۵) تصاویر	۵۰۰	۵	۰	۰
" دوم (۵۰) "	۴۳۲	۵	۰	۰
نقد سخن ...	۱۷۵	۱	۰	۰
نذر ولی ...	۲۴۸	۲	۸	۰
گریہ و تبسم ...	۱۹۲	۲	۰	۰
مشاہیر قندھار دکن	۱۸۴	۱	۰	۰
من کی دنیا ...	۱۴۵	۱	۰	۰
مدراس میں اردو	۱۹۶	۱	۸	۰
محرم نامہ ...	۱۱۲	۱	۰	۰
نذر دکن ...	۱۰۴	۱	۴	۰
روح غالب ...	۲۴۰	۲	۸	۰
عاصمہ ...	۲۰۰	۱	۴	۰
دفتری معلومات ...	۵۶	۰	۶	۰
آبدوزکشتیاں اور سرنگ	۴۸	۰	۶	۰
اردو مثنوی کا ارتقاء	۱۴۳	۱	۱۲	۰
نمود زندگی ...	۲۱۶	۲	۸	۰
سرگذشت ادارہ ...	۳۰۴	۰	۱۲	۰
مدح محمد مومن (۳۴) تصاویر	۳۱۲	۲	۸	۰
بلقان ...	۳۲	۰	۳	۰
خطابیات ...	۱۱۲	۰	۱۲	۰
علم خانہ داری ...	۱۵۰	۱	۰	۰
چیونٹی (۱۶) تصاویر	۱۱۸	۱	۸	۰
انوار ...	۱۶۸	۱	۸	۰
کشمش نانی (۴) تصاویر	۸۰	۰	۱۰	۰
کاساں دتامی ...	۱۲۸	۱	۴	۰
رات کا بھولا ...	۱۶۸	۱	۰	۰
سکندر جاہ ...	۲۴	۰	۴	۰
بلاغت ...	۵۶	۰	۸	۰
ادارہ سفر ۱۹۴۲ء میں	۲۰۰	۰	۸	۰
ناصرالدولہ ...	۳۲	۰	۴	۰

مطبوعہ اعظم اسٹیم پریس حیدرآباد دکن

سب رس



ادارۂ ادبیات اردو حیدرآباد دکن کا ماہنامہ

نشان ٹپہ آصفیہ ۱۵۳
نشان ٹپہ برطانیہ M3950
ٹیلیفون نمبر ۲۲۰۹
چندہ سالانہ چار روپے آٹھ آنے
بچوں کا سب رس ایک روپیہ آٹھ آنے

سب رس

زیر نگرانی
ڈاکٹر سید محی الدین قادری زور
مجلس ادارت
خواجہ حمید الدین بی اے
سکینہ بیگم
عبدالحفیظ صدیقی بی ایس سی

جلد (۶) بابت ماہ اکتوبر ۱۹۴۳ء شمارہ (۱۰)

دراوڑ لڑکیاں

(بمبئی سے بنگلور جاتے ہوئے)

ریل گاڑی رک گئی اونچا ہے انجن کا دھواں
وہ کرونڈے بیچنے آئیں دراوڑ لڑکیاں

ارتقا کی خوں فشانی وقت کی رفتار دیکھ
شکلِ انسانی میں جھلسی ہرنیوں کی ڈار دیکھ

لانبی لانبی گردنیں ہیں ابھری ابھری ہنسلیاں
الجھے گیسو کہر میں جیسے گندھک کا دھواں

پڑ چکی جو زنگ سے کالی وہ تنویریں ہیں یہ
محنت و کاوش کا بنجۃ رنگ تصویریں ہیں یہ

جسم پر کرتا نہ کوئی اوڑھنی سر کے لئے
اودھی اودھی دھوتیاں گھٹنوں سے اوپر کے لئے

ان کے گہوارے بھیانک غار، دہشتناک کھنڈ
کیکروں کے بن، کھجوروں کے وڑے، تاڑوں کے جھنڈ

کھیلتی ہیں ان سے ہولی بجلیاں برسات میں
پختگی پاتے ہیں رنگ ان کے ڈرونی رات میں

گرچہ فاقوں کی فراوانی سے چہرے ہیں نڈھال
پھر بھی بشروں سے ٹپکتا ہے درندوں کا جلال

یہ مڑکتے دست و بازو یہ سلاجیتی شباب
ٹھوس رخساروں میں بے خوفِ خزاں کا لگلا آب

انقلابوں کی یہ روداد یں بقیدِ خد و خال
تھیں کبھی فہرستِ سلطانی میں آپ اپنی مثال

ان کے سینوں میں شقاوت زاد سیلابوں کو دیکھ
ان کی آنکھوں میں بغاوت کے جواں خوابوں کو دیکھ

شیر چیتوں پر بھی غالب تھا کبھی جن کا عتاب
کانچ کی دو چوڑیوں سے خوش ہے وہ خونی شباب

جن کے بازو پھینک دیتے تھے ستاروں تک کمند
ان کی بوسیدہ سی انگیاؤں میں فرسودہ سے بند!

شق نہ ہو جائے کلیجا کرب کی شدت نہ پوچھ
مجھ سے ان تاریخ کے اوراق کی عظمت نہ پوچھ!

یہ اگر چاہیں یہیں شادی بھی کر سکتا ہوں میں
کوہساروں میں انھیں کے ساتھ مر سکتا ہوں میں

احسان دانش

انوار۔ حضرت علی اختر حیدر آبادی کی غزلوں اور نظموں کا پہلا مجموعہ ہے جو نہایت ہی آب و تاب کے ساتھ شائع کیا گیا ہے۔ علی اختر صاحب ہندوستان کے چوٹی کے شاعروں میں اپنا بلند مقام رکھتے ہیں۔ ان کا کلام ان کے دل کی آواز اور تجربات زندگی کی سچی تصویر ہے۔ وہ نہ صرف ایک کہنہ مشق اور پر گو شاعر ہیں بلکہ حیات اور شباب پر ان کی نظر بہت وسیع ہے۔ ان کے کلام کے مطالعہ سے صاف ظاہر ہوتا ہے کہ ہر شعر ان کے دھڑکتے ہوئے دل کی آواز ہے۔ موجودہ زمانے میں سوائے جوش کے کوئی شاعر ان کی ٹکر کا نہیں۔ اس مجموعے کی اشاعت سے اردو شاعری میں ایک گراں بہا اضافہ ہوا ہے۔

صفحات (۱۶۸) قیمت عہ

بے روح مجمعے

انسان کو تو خدا نے پیدا کیا لیکن یہ کمیٹیاں یقیناً شیطان کی ایجاد ہیں۔ کہا جاتا ہے کہ انسان میں روح ہوتی ہے اور اس لحاظ سے ہر کمیٹی کو اگرچہ روحوں کا مجمع ہونا چاہیے مگر جب وہ منعقد ہوتی ہے تو ایسا معلوم ہوتا ہے کہ اس کے ارکان اپنی روحوں کو کسی اور کمرے میں رکھ آتے ہیں۔ آپ ایک مطلق العنان کے تحت بھی اگر وہ صحیح قسم کا ہو، کچھ نہ کچھ کام کر لینے کی توقع کر سکتے ہیں لیکن ایک کمیٹی بجز اس کے اور کوئی ٹھوس کام انجام دینے نہیں پاتی کہ وہ کسی ایک بے غرض آدمی کی محنتوں پر پانی پھیر دے۔ اور پھر مشکل یہ ہے کہ آپ کسی "کمیٹی" کو گولی بھی نہیں مار سکتے جو بعض وقت انفرادی صورتوں میں انتقام کے طور پر لوگ کرتے ہیں۔

بس جو کچھ آپ کر سکتے ہیں یہ ہے کہ ایک بے بسی اور بیچارگی کے ساتھ خاموش کھڑے رہیے اور اس اثنا میں جو کچھ ہوگا وہ یہ ہوگا کہ کچھ نہ ہوگا۔ یا جو کچھ اس سے پہلے ہوا تھا وہ "ان ہوا" ہو جائے گا۔

اور جب میں کمیٹی کا ذکر کرتا ہوں تو اس سے مراد صرف ایسا مجمع مردوں کا، عورتوں کا یا مخلوط، نہیں ہوتا جو اپنے کو کمیٹی کہتا ہو۔ میری مراد اس سے ہر وہ نشست ہے جو دو یا تین یا زیادہ آدمی مل کر کچھ "گفتگو" کرنے کے لئے قائم کریں۔ اور کیا آپ اس کی کوئی وجہ بتا سکتے ہیں کہ جب دو یا تین یا زیادہ آدمی جمع ہوتے ہیں تو جو چیز وہ انجام دیتے ہیں وہ صرف "گفتگو" ہی کیوں ہوتی ہے؟ اور جب یہ "کمیٹی کچھ کرتی" ہے تو ایک نیم رقصی انداز میں مسائل کی پیچیدگیوں کی بین بین کی راہ پر آہستہ آہستہ قدم بڑھاتی ہے اور وہ راہ کیا ہوتی ہے؟ وہ جس کے متعلق یہ سمجھا جاتا ہے کہ وہ مسٹر الف کو جو ذی اثر رکن کمیٹی ہیں، خوش رکھے گی اور نواب ب کو جو ایک مقتدر ہستی ہیں ناراض نہ کرنے پائے گی۔ گر چونکہ دس میں سے نو صورتوں میں مسٹر الف کی رائے جو کچھ بھی ہوتی ہے وہ اس لئے ہوتی ہے کہ نواب ب کی رائے اس کے مخالف ہے۔ خالص نتیجہ ایک "سمجھوتے" کی شکل میں نکلتا ہے جو پھر بھی منافقانہ ہی ہوتا ہے اور اس عرصے میں عوام الناس کا وہ حصہ جن کے فائدہ کے لیے مسٹر الف نواب ب اور ان کے شرکار کار جمع ہوئے تھے، خالی ہاتھ ہی رہ جاتا ہے۔

یا استعارتاً یوں سمجھئے کہ جہاں عوام نے پوری روٹی مانگی وہاں ان کے ہاتھ بمشکل ایک ٹکڑا لگتا ہے کیونکہ مسٹر الف اور نواب ب میں اس امر پر اتفاق نہ ہو سکا کہ یہ روٹی کس نانبائی سے پکوائی جائے اور اتنا تو آپ سمجھتے ہی ہیں کہ اس پکوان کے مسئلے میں جتنے ہاتھ لگیں گے اتنا ہی اندیشہ نہ صرف روٹی کے بگڑ جانے کا ہوگا بلکہ اسی مناسبت سے اتنی ہی کم مقدار ان اشخاص کے حصے میں آئے گی جن کے لئے دراصل روٹی پکوانی مقصود تھی۔ بلکہ بعض صورتوں میں تو یہ موخر الذکر اشخاص شاذ اپنے کو اسی پر خوش قسمت تصور کرنے پر مجبور ہوتے ہیں کہ کم از کم ان کے سر پر خالی توا ہی پھینک دیا گیا۔

کمیٹیوں اور لیگوں کی انہی کیفیات سے متاثر ہو کر پہلی بڑی جنگ کے بعد میرے ایک دوست نے کہا تھا کہ "انھیں مطلق تعجب نہ ہوگا اگر کسی آئندہ جنگ میں مجلس اقوام پر بمباری ہو اور دونوں طرف سے ہو۔ لیکن پھر بھی اس حادثے سے اس کے ارکان باتیں کرنے سے رکیں گے نہ ان کے عمل میں کوئی تیزی پیدا ہو سکے گی۔" آپ کی اجازت سے میں اپنے ان دوست کی خدمت میں یہ عرض کرنا چاہتا ہوں کہ خواہ اور کمیٹیوں اور لیگوں کے متعلق

ان کا فلسفہ صحیح ہو مگر دوسری بڑی جنگ آئی پھر بھی مجلس اقوام کی نسبت سے ان کے لئے کوئی سامان بے تعجبی نہیں پیدا ہوا اور وہ بالکل بخیریت ہے اور ان کی توقع کے خلاف بالکل خاموش معلوم ہوتی ہے۔

خیر، تو کہنا یہ تھا کہ اگر کوئی صاحب خیر اٹھتا ہے کہ اپنے کمتر نصیب کے انسانی بھائیوں کی مدد کرے تو ایسا معلوم ہوتا ہے کہ اس کے اس نیک ارادہ کے ساتھ ہی اس کے خلاف ایک طرح کی مقاومت کا انداز فضا میں پیدا ہو جاتا ہے اور یہ مقاومت ایسے اشخاص کی جانب سے نہیں ہوتی جو باقی انسانوں کو مصیبت کے گڑھے ہی میں رہنے دینا چاہتے ہوں۔ بلکہ ان اشخاص کی جانب سے ہوتی ہے جو اس صاحب خیر کی طرح، مصیبت زدہ انسانوں کے لئے خود بھی فوراً ایک نئی "جنت ارضی" بنانا چاہتے ہوں۔ اب یہ اشخاص اس پہلے شخص سے جھگڑیں گے، اس لئے نہیں کہ انھیں اس کے خیالات سے اتفاق نہیں ہے بلکہ اس لئے کہ وہ کوئی وجہ ایسی نہیں دیکھتے کہ کیوں یہی شخص سب سے پہلے اس جنت ارضی میں فتح کا جھنڈا لے کر داخل ہو۔ ایسی صورت میں اگر وہ شخص عقلمند ہے تو وہ اپنی پگڈنڈی پر اکیلا ہی راستہ طے کرتا ہوا چلا جائے گا لیکن اگر وہ بے وقوف ہے تو وہ اپنے ہم خیال بھائیوں سے استدعا کرے گا کہ وہ اس کے ساتھ اس کار خیر میں شریک ہو جائیں۔ اس کا نتیجہ یہ ہوگا کہ یہ سب مل کر ایک کمیٹی بنائیں گے اور بجائے اس کے کہ کسی بیرونی مقاومت کا مقابلہ کریں وہ آپس ہی میں ایک دوسرے سے لڑنا شروع کر دیں گے۔ لیکن اس سے بھی پہلے وہ قوم کے آگے ایک پُر درد اپیل پیش کر دیں گے۔

دنیا میں عام طور پر لوگوں کے پاس اتنا وقت ہوتا ہے نہ رغبت کہ وہ خود کوئی رفاہ عام کا کار خیر کریں لیکن عموماً وہ اس لئے تیار رہتے ہیں کہ ان کی جانب سے رفاہ عام کے کام کرنے والوں کو چندہ دے کر مدد کر دیں۔ پس چندہ کے بعد کمیٹی کا ایک اور اجلاس ہوتا ہے۔ پہلی چیز جس کا اس اجلاس میں تصفیہ ہوتا ہے یہ ہے کہ کمیٹی کے لئے ایک موزوں دفتر ہونا چاہیے جہاں گویا اس جنت ارضی کے پائے کے لئے پتھر جمع کئے جائیں گے۔ اب جلب دفتر بنتا ہے یا کہیں کرایہ کی عمارت میں قائم ہوتا ہے اور اس کے متعلقات وغیرہ ہی پر چندے کے پہلے چند ہزار صرف ہو جاتے ہیں۔ پھر کمیٹی کا اجلاس ہوتا ہے۔ نصف تعداد تعمیر کے کام کو ایک خاص نہج پر شروع کرنا چاہتی ہے دوسری نصف تعداد اس کو دوسرے انداز پر کرنا چاہتی ہے اور بہ ظاہر یہ اختلاف محض اختلاف ہی کی خاطر ہوتا ہے۔

اس اثنا میں فنڈ کی قلت عوام سے ایک دوسری اپیل کی ضرورت لاحق کر دیتی ہے۔ اس دوسری اپیل کا اہتمام پہلی اپیل سے جمع شدہ رقم کا پورا صفایا کرا دیتا ہے۔ ظاہر ہے کہ پھر کمیٹی اپنا اجلاس کرتی ہے۔ اس مرتبہ چند تازہ نزاعی مسائل پیدا ہو جاتے ہیں مثلاً ایک مذہبی نوعیت کا مسئلہ پیدا ہو جاتا ہے بعض ارکان کا خیال ہوتا ہے کہ یہ رفاہی کام کسی مذہبی جماعت کے زیر اثر ہو تو اچھا ہے۔ اس بحث میں جب کافی وقت ضائع ہو چکتا ہے تو پھر حکومت کا دروازہ کھٹکھٹایا جاتا ہے اور تھوڑے ہی عرصے میں دیکھئے کہ صدر کمیٹی کو اپنی کارگزاریوں کے صلے میں "خانصاحبی" یا "رائے بہادری" مل جاتی ہے اور یہ اعزاز سارے ارکان کے اندر ایک غصہ کی لہر دوڑا دیتا ہے کیونکہ صدر ہی ان میں ایک ایسا شخص تھا جس نے سب سے کم حقیقی کام کیا تھا۔ یہ سلسلہ جاری رہتا ہے لیکن یہ واضح رہے کہ ابھی اس "جنت ارضی" کے لئے کسی اراضی کا بھی انتخاب نہیں ہوا ہے اور کامرانی کا "جھنڈا" کرم زدہ ہوا جا رہا ہے۔

کیونکہ جو اشخاص اس کو گاڑھنا چاہتے ہیں وہ ابھی آپس میں اس کا فیصلہ نہیں کر سکتے ہیں کہ ان میں سے کون خوش قسمت علم برداری کا شرف حاصل کرے گا۔

یہ چیزیں استعارہ اور تشبیہ کے انداز میں بیان ہوئے ہیں لیکن چشم بینا ہر جگہ اپنے اطراف کے حالات پر ان کا انطباق کر سکتی ہے اور احول کی کیفیات سے ان کی تعبیر لے سکتی ہے۔

اور اگر ایک تمثیل کی آپ اور اجازت دیں تو کہوں کہ ایک آدمی جو روپے کا کلچہ کسی بھوکوں کے شہر کو پہنچا دیتا ہے وہ ان سیکڑوں نیک نیت اشخاص سے بہتر ہے جو جنگل میں بھوکوں کے لئے ایک آسودہ شہر بنانے کی باقاعدہ کوشش اور تنظیم کی فکر میں کمیٹیوں میں باتیں ہی کرتے رہ جاتے ہیں۔

لطیف احمد فاروقی

غزل

اک مجھی کو نہ رات نیند آئی
ہر ستارے نے آنکھ جھپکائی

یہ ترشح یہ سرد سرد ہوا!
لے رہی ہے بہار انگڑائی

ہم تو ہم کتنے پھول تھے جن کو
گلکدوں کی ہوا نہ راس آئی

حیف میری نظر کی رسوائی!
رہ گئے لیتے لیتے انگڑائی

اس کی چپ بھی مرا ہی افسانہ
میرے آنسو بھی اس کی رسوائی

دل میں اک ہوک سی تو اٹھتی ہے
محفلیں ہیں نہ محفل آرائی

کس سے ممکن ہے ہوش کا سجدہ
کون لے تہمتِ جبیں سائی

وقت کے زخم بھر نہیں سکتے
ختم گر دِن ہوا تو رات آئی

شورؔ آہٹ پہ دل دھڑکتا ہے
حشر ساماں ہے دل کی تنہائی

شورؔ

زبیدہ کے لکچر

"شاید آبا جان اور اماں جان کے لئے میرا وجود دوبھر تھا جو انھوں نے سترہ سال کی عمر میں میری شادی کر دی۔ ایک بلا کی طرح جس قدر جلد ہو سکا مجھے اپنے گھر سے نکال دیا اور یہ سمجھ کر خوش ہو گئے کہ وہ اپنی مذہبی ذمہ داری سے سبکدوش ہو گئے لیکن خدا منصف ہے۔ جو کچھ روحانی مصائب میں بھگت رہی ہوں اس کی ذمہ داری بھی ان ہی پر عائد ہوتی ہے۔ انھوں نے تو صرف یہ دیکھ لیا کہ حمید صاحب نے کچھ کتابیں رٹ رٹا کر امتحانات کامیاب کر لئے ہیں اور ان کو ایک اچھا عہدہ مل گیا ہے۔ اگر اپنی بیٹی کو ان سے بیاہ دیں گے تو اس کو کھانا اور کپڑا مل جائے گا اور ہم نواسا نواسی والے ہو جائیں گے۔ ان کو اس کا تصور بھی نہ آیا کہ حمید صاحب کی طبیعت اور ان کے خیالات کا بھی اندازہ لگاتے کہ آیا ان کی طبیعت ان کی بیٹی کی طبیعت سے ملتی بھی ہے یا نہیں اور شادی کے بعد دونوں میں اتفاق رہے گا بھی یا نہیں۔ اس چوک کا نتیجہ یہ ہے کہ میری زندگی برباد ہو گئی۔ آپ کی دولت اور آپ کی اولاد لے کر میں کیا کروں جب کہ آپ کے برتاؤ سے میرا خون پانی ہوا جا رہا ہے اور دق ہونے کی نوبت آ گئی ہے۔ میں جانتی ہوں کہ میں چند دنوں کی مہمان ہوں مجھے زندگی کی خواہش بھی نہیں لیکن رنج اس کا ہے کہ میری اولاد کا کیا حشر ہوگا۔ آپ یقیناً کسی دوسری کو بیاہ لائیں گے اور سوتیلی ماں کے برتاؤ میرے بچوں کو سہنے ہوں گے۔ آپ کی طبیعت سے واقف ہوتے ہوئے کہہ سکتی ہوں کہ ان بن ماں کے بچوں کی بڑی گت بنے گی آپ کی خود غرضی اس کو گوارا نہ کرے گی کہ آپ اپنی اولاد کے لئے کچھ ایثار کریں۔

ہماری بھی کوئی زندگی ہے کہ آئے دن جھگڑے ہی جھگڑے رہا کرتے ہیں اگر میں زمین کی کہتی ہوں تو آپ آسمان کی۔ پھر اتفاق پیدا ہو تو کیسے ہو۔ میں بری سہی، ہٹ دھرم سہی، لیکن جو کچھ کرتی اور کہتی ہوں اس کے لئے عقلی دلیلیں بھی پیش کرتی ہوں لیکن آپ جس بات کو مجھ سے کرانا چاہتے ہیں یہ کہہ کر حکم دیتے ہیں کہ بیوی کا فرض ہے کہ شوہر کا کہنا مانے۔ حمید صاحب! میرے بھی احساسات اور جذبات ہیں کب تک آپ انھیں ٹھیس لگائے جائیں گے۔ کبھی آپ نے ٹھنڈے دل سے سوچا بھی ہے کہ جو کچھ آپ کا سلوک ہے وہ کہاں تک روا ہے! اور کس حد تک آپ کی بیوی اس کو برداشت کر سکتی ہے! ہزار ہا باتوں میں انگریزوں کی تقلید آپ کے نزدیک جائز! لیکن بیوی کے ساتھ ان کی طرح برتاؤ ناجائز!! جہاں بیوی نے معمولی سی آزادی مانگی اور میاں صاحب کی بھنویں چڑھ گئیں اور کہہ اٹھے کہ اب نئی فیشن کی ہوتی جا رہی ہو۔

یہ بھی کوئی انصاف ہے کہ آپ اگر کلب سے دیر میں گھر واپس آئیں تو کوئی قباحت نہیں اور اگر میں یہی کام کروں تو مجرم ٹھیرائی جاؤں! آپ کو یاد ہے کہ جب میں لیڈیز کلب جایا کرتی تھی اور اتفاقیہ طور پر کبھی دیر ہو جاتی تو آپ کا منہ پھلکے کی طرح پھول جاتا اور طعنے دیے جاتے تھے اب جب کہ آپ "آزاد کلب" کے ممبر بنے ہیں تو روزانہ صبح کے گئے ہوئے گیارہ بجے رات کو واپس آتے ہیں اور اس میں کوئی قباحت اور نقصان نظر نہیں آتا۔ اس لئے کہ خدا نے بقول آپ کے مردوں کو حاکم اور عورتوں کو محکوم بنایا ہے۔ خدا کا انصاف تو جب تھا کہ وہ عورتوں کو احساسات اور جذبات بھی نہ دیا ہوتا یا جب دیا ہی تھا تو آپ جیسے شوہروں کو اتنا شعور بھی دیا ہوتا کہ یہ سمجھتے کہ میاں اور بیوی کے تعلقات حاکم و محکوم کے نہیں بلکہ برابری کے اور دوستانہ ہونے چاہئیں۔ اگر بیوی بھلا

اور باعزت ہو تو وہ ہرگز ایسے شوہر سے محبت نہیں کرسکتی جو بیوی کے ساتھ ایک لونڈی کا سا برتاؤ روا رکھتا ہو اور اس پر بھروسہ نہ کرتا ہو۔

آپ کے دوست حامد کی بیوی قمر کی حالت دیکھ لیجئے۔ یہ بیچاری کیسی کیسی روحانی تکالیف برداشت کرتی ہے۔ اور دنیا یہ سمجھتی ہے کہ اس کا میاں اس کو ہر قسم کی راحت پہنچاتا ہے۔ اس کے دکھ درد کو کوئی کیا جانے۔ میں خدا کا شکر ادا کرتی ہوں کہ کم ازکم اس کی زندگی سے میری زندگی بہتر ہے جب کبھی تھوڑی بہت شکایت وہ اپنے میاں سے کرتی ہے وہ کہتا ہے کہ خود اسلام نے مرد کو عورت پر برتری دی ہے اس لئے عورت کے لئے جائز نہیں کہ وہ مرد سے برابری کے حقوق طلب کرے۔ وہ بیچاری اس کو یقین کرلیتی ہے اور سمجھتی ہے کہ واقعی مسلمان عورتیں صرف اس لئے پیدا کی گئی ہیں کہ شوہروں کے مظالم سہیں اور اُف نہ کریں میں نے اس کو بتلایا ہے کہ جس طرح شیطان اپنی مطلب کی باتیں قرآن شریف سے نکال سکتا ہے اسی طرح حامد بھی نکال لیتا ہے ورنہ میرے خیال میں اسلام میں عورت کا رتبہ بلند ہے۔ وہ ہر قسم کی مساوات کی تعلیم دیتا ہے اور یہ بتاتا ہے کہ جو کام تم دوسروں کے لئے برا سمجھو اپنے لئے بھی ناروا رکھو ایسے ہی شوہر اپنی بیویوں کو محکوم رکھنا چاہتے ہیں جو خود غرض، کوتاہ نظر اور شکی ہوا کرتے ہیں۔ محبت اور ایثار کے اعلیٰ مطالب ان کے دماغ میں سماتے ہی نہیں اور اس پر یہ توقع کی جاتی ہے کہ بیویاں انھیں چاہیں اور ان پر نثار ہوں! کیا خوب!!

لاحول ولا! میں کہاں سے کہاں بھٹک گئی کسی اور وقت بتاؤں گی کہ میاں کس قسم کے برتاؤ سے بیوی کو اپنا گرویدہ کرسکتا ہے اور کس طرح دنیا ہی میں اس کو جنت کی زندگی مل سکتی ہے۔ آج تو یہ کہنا چاہتی ہوں کہ یہ "آزاد کلب" میں کیا ہوتا ہوگا۔ یہی نا شراب خوری، جوا، عہدہ داروں کی خوشامد، بیویوں کی شکایت، گورنمنٹ پر نکتہ چینی، کچھ اخبار بینی، ٹینس اور بلیرڈ۔ آپ لوگوں نے کلب کی زندگی تو انگریزوں سے سیکھ لی مگر ان کی روشن خیالی اور بیوی کے ساتھ برابری کے برتاؤ کو ناروا قرار دیا۔ جس طرح انگریز اپنی بیویوں کو اپنے ساتھ کلب لے جایا کرتے ہیں تاکہ وہ گھر میں قید تنہائی نہ بھگتیں آپ لوگ بھی کرتے تو میں جانتی! یا کم ازکم ان کی طرح شب کے آٹھ یا ساڑھے آٹھ بجے گھر واپس ہوتے تو بھی کوئی برائی نہ تھی۔ لیکن ہندوستانی جو باتیں بھی غیر اقوام سے سیکھتے ہیں وہ عموماً ان کی برائیاں ہی ہوا کرتی ہیں یا ان کی بھلائیوں کو حد سے تجاوز کرکے برائیوں میں منتقل کردیتے ہیں۔ قمر کہتی تھی کہ حامد آزاد کلب سے شب کے گیارہ بجے سے قبل کسی روز گھر نہیں لوٹتا اور اگر شبِ جمعہ ہو تو اس کی وہاں کی عبادت صبح چار بجے تک جاری رہتی ہے۔

میں یہ نہیں کہتی کہ آپ کلب نہ جائیں یا دوستوں سے نہ ملیں۔ میں ان بیویوں میں سے نہیں ہوں جو یہ چاہتی ہیں کہ ان کے شوہر چوبیس گھنٹے ان کے نزدیک رہیں اور اس کو میں برا بھی سمجھتی ہوں کیونکہ اس طریقے سے یقیناً میاں بیوی میں نفرت سی پیدا ہوجاتی ہوگی پھر آپ جیسے شوہر کا گھر میں رہنا نہ رہنا میرے لئے برابر ہے۔ کیونکہ آپ گھر میں رہ کر یا تو اخبار بینی کیا کرتے ہیں یا ریڈیو سنتے ہیں اور اگر کبھی گفتگو ہوا کرتی ہے تو اس کا نتیجہ برا ہی نکلتا ہے۔

ہم مختلف الخیال ہیں آپ سماج کے گرویدہ اور میں دوسروں کے بتلائے ہوئے اصول اور معیار کی پابند ہونا نہیں چاہتی۔ میں تو یہ چاہتی ہوں کہ زندگی کے ہر شعبے میں میں اپنے لئے اپنے ہی معیار پر ہر چیز کو جانچوں اور کچھ پروا نہ کروں کہ دنیا کیا کہے گی۔

میرا یہ عقیدہ ہے کہ کسی مقصد میں کامل طور پر کامیابی حاصل کرنا اتنا اہم مسئلہ نہیں جتنا کہ ایک اعلیٰ مقصد کا انتخاب۔ اس انتخاب میں کامیابی حاصل کرنے کے بعد اگر ہم اپنی تمام قوتیں

اس مقصد کے لئے صرف کردیں تو مرتے وقت ہمیں اس بات کی خوشی ہونی چاہیے کہ ہماری زندگی کی کامیابی اس سے بڑھ کر کچھ اور نہیں ہوسکتی تھی۔ حمید صاحب! تمام عقوبت اور جبر خوف کی نشانی ہے۔ آپ جیسے سماج پرست اشخاص جب یہ دیکھتے ہیں کہ کسی کے خیالات کی قوت بڑھی ہوئی ہے تو اپنے کمزور خیالات کی حفاظت کے لئے جبر و عقوبت پر اتر آتے ہیں اور جو آپ کے بس میں ہوتے ہیں انہیں مجبور کرتے ہیں کہ اپنے خیالات بدل ڈالیں۔ اگر آپ لوگوں کے خیالات میں صداقت ہوتی تو یہ جان کر کہ صداقت خود اپنی آپ محافظ ہوا کرتی ہے دوسروں کو خود ان کے خیالات کے مطابق عمل کرنے دیتے تاکہ وہ تلخ تجربے کے بعد راہِ راست پر آجائیں۔ کسی نے سچ کہا ہے کہ ہندوستان میں عورت ایسی عضوِ معطل بنادی گئی ہے جس کا علاج ڈاکٹروں کے پاس سوائے کاٹ ڈالنے کے اور کوئی نہیں ہے۔ توبہ توبہ!

پھر میں کہاں سے کہاں بھٹک گئی، مجھے ڈر ہے کہ اس "آزاد کلب" کی فضا آپ کو کہیں بد سے بدتر نہ کردے آپ فطرتاً کوتاہ نظر خود غرض، شکی، واقع ہوئے ہیں اور بری صحبت کا اثر آپ پر بہت جلد ہوا کرتا ہے اب جب کہ آپ روزانہ حامد اور اس کی ٹولی میں رہا کریں گے تو وہی مصداق ہوجائے گا کہ "اول ہی کریلا کڑوا اور پھر نیم چڑھا"! حمید صاحب اگر باہر ہی رہنا ہے تو اچھوں کی صحبت اختیار کیجیے تاکہ ان کے اثر سے آپ کی خامیاں دور ہوں اور آپ کے خیالات میں بلندی پیدا ہو۔ آپ کے موجودہ دوست کلچر موتی کی طرح ہیں جن پر اصلی ہونے کا آپ کو دھوکا ہو رہا ہے۔ بہرحال میں نے اپنا فرض ادا کردیا ہے آئندہ آپ کو اختیار ہے ورنہ میری زندگی خوشگوار بننے کی آس ٹوٹے ہوئے عرصہ گزر گیا۔"

محمود

ہلالِ عید

جس طرح دیتا ہے کوئی زندگانی کا پیام
دور سے شرما کے جیسے کوئی کرتا ہے سلام

جس طرح گاتا ہے کوئی چھپ کے دل کے ساز پر
جس طرح بیتاب آنکھوں میں ہو جلووں کا اثر

جس طرح خاموشیوں میں گنگناتی ہے حیات
چاندنی پی کر بہک جاتی ہے جیسے کائنات

جس طرح انگڑائیاں لیتی ہوئی آتی ہے شام
جس طرح چھلکیں پلاتی ہیں سرور انگیز جام

رقص کرتی ہے چمن میں جس طرح فصلِ بہار
جس طرح بے چین کرتی ہے ہوائے مشکبار

جس طرح ہوتے ہیں دل میں عشق کے روشن چراغ
جس طرح سرشار کرتے ہیں امنگوں کے ایاغ

جس طرح گاتی ہے سازِ گل پہ صبح تا بدار
چاندنی جس طرح کرتی ہے دلوں کو بے قرار

یونہی، کچھ محشر کئے برپا "ہلالِ عید" نے
جاگ اٹھیں دل کی امنگیں، مسکرائے ولولے
خشک اور افسردہ چہروں پر مسرت چھا گئی
زندگی سی زندگی ہر چیستر پر لہرا گئی

تحسین سروری

ہدایت کے تاریخی قصائد

(۶) ہجو حکیم بادشاہ۔

یہ ۲۶ اشعار کا ایک قصیدہ ہے جس میں ایک شاہی حکیم کی ہجو لکھی ہے۔ لیکن نام کسی کا نہیں لکھا بلکہ یہ لکھ دیا ہے کہ:-

نہ لینا نام میاں کو بیاں کی حاجت نیں
حکیم بادشہاں ہو یا بید خلق اللہ

نظام علی خاں کے عہد کے دو حکیم بہت مشہور ہیں۔ ایک محمد امام الملقب بہ معالج خاں فرزند حکیم معالج خاں اورنگ آبادی اور دوسرے حکیم عزت یار خاں الملقب بہ حکیم الحکما رمی الدولہ۔ معلوم نہیں کہ شاعر نے کس حکیم کی ہجو لکھی ہے۔ ممکن ہے کہ یہ ہجو اول الذکر کی ہو کیونکہ وہ بعد کو ارسطوجاہ کے متوسل ہو گئے تھے۔ اور یہ شاعر ارسطوجاہ کا بڑا مخالف تھا۔

(۷) مثنوی جدل ارزل۔

یہ ناقص الاول ہے۔ موجودہ نسخے میں اس کی ابیات کی تعداد ۹۶ ہے۔ معلوم ہوتا ہے کہ یہ ایک بہت طویل مثنوی ہے جس میں شاعر نے اپنے زمانہ کے ادنیٰ پیشہ والوں کی ہجو لکھی ہے۔ ابتدائی پچاس اشعار خدمت گاروں، باورچیوں کوچرٹوں اور سائیسوں کی مذمت میں ہیں۔ اس کے بعد ہجو حجام کی سرخی قائم کرکے اس زمانے میں حجامت کے کیا طریقے تھے ان کا مضحکہ اڑایا ہے۔ اسی سلسلہ میں حکیم شیخ قاسم کی بھی ہجو لکھ دی ہے۔ حجام کا نام ننھا اور اس کی بیوی کا امینہ بتاتا ہے۔

(۸) رزم نرمل

یہ ایک طویل تاریخی مخمس ہے جس میں چھپن بند ہیں اور جو بجائے خود ایک اہم تاریخی کتاب یعنی رزم نامہ کی حیثیت رکھتا ہے۔ اس مخمس کی وجہ سے نواب نظام علی خاں آصفجاہ ثانی کے معرکۂ نرمل کے متعلق اہم تاریخی معلومات تفصیل سے محفوظ ہو گئی ہیں۔ پہلے ہم اس معرکہ سے متعلق تاریخوں سے جو کچھ معلومات حاصل ہوتی ہیں ان کا خلاصہ بطور تعارف یہاں درج کرتے ہیں:-

مبارز الملک ظفر الدولہ ضابط جنگ ابراہیم بیگ خاں دھونسہ

(بسلسلہ رسالہ ماہ اگست ۱۹۴۳ء)

نے جب ۱۱۹۵ھ / ۱۷۸۱ء میں وفات پائی تو آصفجاہ ثانی کے حکم سے ان کے فرزند احتشام جنگ باپ کے قائم مقام اور نرمل کے حاکم ہوئے۔ لیکن کچھ عرصہ بعد بغاوت پر کمر باندھی تو ان کی سرکوبی کے لئے سردار جنگ گھانسی میاں اور نادر جنگ فرانسیسی کو روانہ کیا گیا۔ انہوں نے کنگیر اور بودھن فتح کرکے دریائے گوداوری کو عبور کیا جہاں احتشام جنگ کے سردار دولاور جنگ فرنگی وغیرہ مقابل ہوئے۔ اب آصفجاہ ثانی نے شرف الدولہ، نور آور جنگ، حشمت جنگ، سیف جنگ اور امجد الدولہ کو بھی گھانسی میاں کی مدد کے لئے روانہ کیا اور خود بھی ۱۱ ذیقعدہ ۱۱۹۶ھ کو بیدر سے نکلے۔ اور فتح میدان سے نجم الدولہ اور سید عمر خاں کو بھی آگے روانہ کر دیا۔ بتاریخ ۲۹ ذیحجہ ایلوارٹہ پہنچ کر نظام علیخاں نے قلعہ جگتیال کے محاصرہ کے لئے دولت رائے گوکریم داد خاں، یکہ تاز جنگ، شجاعت جنگ، غلام علی وغیرہ کے ساتھ روانہ کیا۔ جس پر سخت مقابلہ کے بعد ۲۰ محرم ۱۱۹۷ھ کو قبضہ ہو گیا۔ اور یکم صفر کو خود نظام علی خاں وہاں پہنچ گئے۔ ۱۰ صفر کو تمام فوج گوداوری پار کر گئی اور احتشام جنگ کی فوج کو بمقام جٹیال (قریب نرمل) شکست ہوئی۔ آخر کار ۱۴ ربیع الاول کو احتشام جنگ دربار میں معافی کے لئے حاضر ہوئے۔ ان کا قصور معاف کرکے آصفجاہ ثانی نے ظفر الدولہ کا خطاب دیا اور صوبہ داری ایلچپور پر مامور کیا۔ نرمل کی تعلقداری پر امام علی خاں برہان الدولہ نامزد ہوئے۔ اور وہاں سے بہت ساز و نقد ہاتھ آیا۔ اس واقعہ کو کتاب نظام علیخانی حصہ دوم میں تفصیل سے بیان کیا گیا ہے۔

اس رزم نامہ کا مصنف بھی اس معرکہ میں غالباً شمس الامرار کے ساتھ تھا اس نے اپنے چشم دید واقعات لکھے ہیں اس لئے اس نظم کا خلاصہ درج ذیل ہے:-

ضابط جنگ جب ارمرق سے بیمار ہوئے تو اپنے بیٹے کو بلا کر نرمل کے لئے چار وصیتیں کیں۔

پہلی یہ کہ مجھے اس باغ میں دفن کرنا جو میں نے نرمل میں خاص اہتمام سے بنایا ہے۔ دوسری یہ کہ میں نے بڑی محنت اور جانفشانی سے

کوکری کی جنگ اور دولہ کا خطاب حاصل کیا اور نرمل میں مال کے انبار جمع کئے۔ جیسی میں نے اپنے خداوند نعمت کی اطاعت کی تم اس سے زیادہ کرنا ورنہ نرمل کے لئے کئی دشمن دربار میں موجود ہیں۔ تیسری یہ کہ جب حضور پرنور ادھر آئیں تو اپنی سعادت جان کر ان سے ملو ورنہ نرمل کے لئے تمہیں ذلیل وخوار ہونا پڑے گا حضور نہایت رحیم وکریم اور اپنے فدویوں کے قدرداں ہیں وہ تمہاری بھی قدر کریں گے۔ تم کو جس مہم کے لئے بھیجیں وہاں سر کے بل جاؤ اور اپنی تلوار کا لوہا منواتا تاکہ نرمل تمہارے ہی قبضہ میں رہے۔

چوتھی وصیت یہ ہے کہ جو میرے قدیم اہل کار ہیں انہی سے کام لینا ظلم نہ کرنا اور نرمل میں دولت اس لئے جمع کی گئی ہے کہ تم سخاوت سے کام لو۔

غرض بعد وفاتِ ضابطہ جنگ حضور نے ان کے مال سے ایک حبّہ نہ لیا اور ان کے بیٹے کو احتشام جنگ کا خطاب دے کر نرمل ہی کا سردار مقرر کیا۔ لیکن وہ روز ہی میں اس نے اپنے باپ کی وصیت کے خلاف قتل عام شروع کر دیا۔ فوج کے بخشی اور دولت رائے کو مار ڈالا اور اپنے خویشوں اور ملازمان قدیم کو توپ کے منہ پر اڑا دیا۔ اور آخر کار سرکار سے جنگ کے لئے تیار ہو گیا اور اس کا چھوٹا بھائی جو حاضر دربار تھا وہ احتشام جنگ کو سازشی خطوط لکھنے لگا اور اس لئے اس کو گرفتار کر کے قلعہ گولکنڈہ میں قید کیا گیا۔ (سوانح نظام علی خاں میں یہ واقعہ درج نہیں ہے)

حضور نے دربار منعقد کر کے معرکہ نرمل کے لئے تیاری کا حکم دیا اور گھانسی میاں کو طلب کر کے روانہ فرمایا جو ایک پل میں بودھن پہنچ گئے اور اس پر قبضہ کر لیا۔ اس کے بعد خود حضور شہر سے نکلے اور خیمے میں قیام کیا اور حسب الحکم سب درباری حاضر رکاب ہوئے۔

جب دلاور جنگ فرنگی میدان میں آیا تو گھانسی میاں جلدی سے اس کے مقابلہ کے لئے روانہ ہوئے اور صلہ داروں کی مدد سے ایسی شکست دی کہ دلاور جنگ سے ہاتھی اور گھوڑے تک چھین لئے۔

اس کے بعد گھانسی میاں کی شجاعت اور سخاوت کی بڑی تعریف کی ہے جب اس جنگ کی اطلاع نظام علی خاں کو پہنچی وہ جگتیال کے قریب آگئے اور اپنے صاحبزادہ کو جلد پونا روانہ کیا۔ دولت رائے کو جگتیال کے محاصرہ کے لئے حکم ملتے ہی اس نے قلعہ کو گھیر کر گولوں کی ایسی بوچھاڑ کی کہ اہل قلعہ گھبرا گئے اور مجبور ہو کر قلعہ حوالے کر دیا۔

جگتیال دیکھ کر حضور گنگا (گوداوری) پر آئے اور احتشام جنگ کے یہاں فرمان بھیجا کہ جان کی امان دیجاتی ہے اگر اب بھی مان لے۔ لیکن اس نے نہ مانا تو حضور نے گنگا پار کرنے کے عزم سے کوچ کیا

جب لشکر فیروزی جٹپال کے متصل آکر اترا تو دشمنوں نے شب خون مارنا چاہا اس لئے پہلے چنور کے راجہ نے جا کر حملہ کیا اور پھر سدی عبداللہ اور سدی عنبر نے جا کر صف باندھی۔ ایک طرف سے نادر جنگ پہنچے اور دوسری طرف سے سید عمر۔

جب سید عمر کی لین سے گولے چلنے لگے تو دشمن بھاڑ کے چنوں کی طرح اڑ اڑ کے گرنے لگے۔ اور کشتوں سے میدان بھر گیا۔ زمین سے آسمان تک بارود کا دھواں چھا گیا۔ گولے اولوں کی طرح برسنے لگے (یہاں دو بند جنگ کے مناظر سے متعلق بہترین لکھے گئے ہیں) یہی حال صبح تک رہا۔ صبح حضور نے فوجوں کا مجرا لیا۔ اس کے بعد لڑائی شروع ہو گئی۔ گولوں کی بوچھاڑ میں صولت جنگ اڑ گئے۔ اس نوجوان سردار کی موت سے عام فوج کو رنج ہوا اور جب حضور نے سنا تو فرمایا۔

حیف ہے صد حیف ہے افسوس ہے اے واہ دل
کیا جواں مارا گیا سردار نرمل کے لئے

غرض گولوں کی جھڑی برس رہی تھی کہ شجاعت جنگ نے گھبرا کر لوہے کی کڑی توڑ کر اپنی عماری کی چھتری کو گرا دیا۔ اور ادھر یہ خبر ملی کہ سید عمر کی لین پر سخت بار پڑ رہا ہے تو حضور نے غضبناک ہو کر اپنی فوج کو حکم دیا کہ:-

دیکھتے کیا ہو اے اہلِ رزم اے شیرانِ جنگ
ہاں اوٹھا گھوڑے کرو تہہ تیغ عدو کو بے ڈرنگ

یہ سنتے ہی تمام اہلِ فوج تلوار لے کر چاروں طرف سے کود پڑے ۔ اور اوپر زور آور جنگ نے ہاتھی سے اوتر کر وضو کیا اور ساعت فتح و ظفر تک دعا مانگتے رہے کہ :-

فتح دے اے خالقِ جبار نرمل کے لئے

اس اثنار میں ایک طرف سے سیف جنگ فوج لے کر بے درنگ میدان میں جھپٹے اور ایک طرف سے غلام امام خاں گھوڑا اڑاتے ہوئے آئے اور نادر شاہ کی طرح دشمنوں کو مارنا شروع کیا۔ پرورش علی خاں بھی شیر نبرد کی طرح مدد کے لئے دوڑے ۔ اور ان کے ساتھی سواروں نے دشمنوں کو گرد میں چھپا دیا۔ ایک طرف ابہت جنگ دشمنوں کو مار رہے تھے اور ایک طرف سربلند جنگ نسیم کی طرح پہنچے اور قتل کرنے لگے۔ جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ حضور کو فتح عظیم نصیب ہوئی۔ احتشام جنگ کے حبشی اور روہیلے کب تک مقابلہ کرتے اور کیونکر جیتتے جب کہ ان کا مقصد اچھا نہ تھا۔ سچ اگر پوچھو تو شمس الملک (شمس الامرا) اگر ایسے شیر نر اور رستم حشم سردار جمع نہ کرتے تو اس جنگ میں فتح نہ ہوتی اس جنگ کے کشتوں کی تعداد اس سال ہجری کے اعداد کے مطابق ایک ہزار ایک سو ستانوے تھی۔ ۱۱۹۷

اس شکست کے بعد احتشام جنگ نے اپنی ماں کے کہنے کے مطابق منفعل ہو کر اپنی جان کی امان مانگی اور حضور نے قبول کر لیا۔ وہ ہاتھ باندھ کر آیا اور حضور کے قدموں پر سر رکھ دیا۔ اور اپنے قصور عقل کا اقرار کیا۔

جب حضور نرمل میں داخل ہوئے تو احتشام جنگ بالاحصار ہی میں فروکش تھا اور ابھی اس کے ذہن میں خیال باطل موجود تھا۔ جب حضور کے سامنے یہ اندیشہ پیش کیا گیا تو انھوں نے مشورہ کر کے احتشام جنگ کو بلوا بھیجا اور اپنے فیل خاصہ پر بٹھا کر سیر کے واسطے لے گئے۔ اور ادھر بارگاہ خاص کے آدمیوں نے بالاحصار میں داخل ہو کر اس پر قبضہ کر لیا اور اس عقلمندی سے ایک اور مرحلہ طے کر لیا گیا۔ اس کے بعد احتشام جنگ کو برار کا صوبہ دار بنا کر روانہ کیا۔ اور نرمل کی سیر میں مصروف ہوئے۔ لوگوں نے فتح کی نذریں گذرانیں۔

میں نے بھی یہ نظم اس شہر (نرمل) کی یادگار کے لئے ایک ہی روز میں دوپہر تک لکھ ڈالی اور اس کا نام "رزم نرمل" رکھا۔

(۹) قصیدہ بحر سخن.

یہ ۴۵ اشعار کا قصیدہ ہے جس میں شاعر نے موسیٰ ندی کی اس طغیانی کے چشم دید حالات بیان کئے ہیں جو سنہ ۱۲۰۸ھ میں آئی تھی اور جس سے شہر حیدرآباد کو بڑا نقصان پہنچا تھا۔ عجیب بات یہ ہے کہ ہدایت نے بھی حیدرآباد کو شعری ضروریات کے تحت اس شہر کے پہلے اردو شاعر محمد قلی قطب شاہ کی طرح حیدر نگر لکھا ہے۔ اور کمال یہ کیا ہے کہ بظاہر تو طغیانی کے بیان لکھا ہے لیکن اس کا اصل مقصد (یعنی ارسطو جاہ کی ہجو نگاری) بھی پورا ہو گیا ہے۔

چونکہ سنہ ۱۲۰۸ھ کی طغیانی ایک تاریخی واقعہ ہے اس لئے شاعر نے جو چشم دید حالات قلمبند کئے ہیں ان کا خلاصہ یہاں درج کیا جاتا ہے۔

ہندوستان سے ایک نجومی حیدرآباد آیا اور راستے میں پوتھی کھول کر بیٹھ گیا اور کہنا شروع کیا کہ عید قربان کے ساتھ ہی شہر میں آفتیں نازل ہو جائیں گی۔ چار مینار پر اس زور سے بجلی گرے گی کہ اس کی کڑک سے لوگوں کی آنکھیں اندھی ہو جائیں۔ عورتوں کے پیٹ گریں۔ اور بچے مر جائیں۔ اونچے درخت کے برابر شعلے نکلیں گے۔ اس کے بعد ابر تاریک چھا جائے۔ تین دن تک سورج نہ نکلے سانپ اور بچھو آسمان سے برسیں۔ توپوں کی طرح بادل گرجیں اور گولیوں کی طرح مینہ کے قطرے برسیں۔ تین روز اس شدت کی بارش ہوگی۔ دوسری محرم کو موسیٰ ندی میں اس زور کی طغیانی آئے گی کہ آدھا شہر ڈوب جائے گا۔ اور بہت سی مخلوق مر جائے گی۔

نجومی تو یہ کہہ کر اٹھ گیا۔ اب لوگ پریشان پھرنے لگے۔

اتفاق سے اسی تاریخ جب کہ سنہ ہجری پورا بارہ سو تھا رود موسیٰ میں طغیانی آئی۔ ہزاروں آدمی بہہ گئے۔ شہر کے حصار کو جا بجا سے توڑ کر پانی بیچ شہر تک آگیا۔ اگلی طغیانیوں سے موسیٰ ندی کی یہ طغیانی کسی طرح کم نہ تھی۔ پل سے چار محل تک ایک تختۂ آب بن گیا تھا۔ لوگ درختوں پر اس طرح چڑھے ہوئے تھے جیسے منصور دار پر۔ پولے گھاس پھوس کی طرح آدمی بہہ رہے تھے۔ اور پھر اک لوٹ کھسوٹ میں مصروف اور شاداں تھے۔ دو تین پہر کے بعد جب طغیانی کا زور گھٹا تو لوگوں کو اطمینان ہوا۔

اس واقعہ کے بعد ایک روز علی الصبح وہ نجومی مجھے پھر نظر آیا۔ میں نے پوچھا "اے جھوٹے اتنی بڑی جھوٹ کیا ضروری تھی پیٹ کو مانگ لیتا تو مل جاتا۔ نہ وہ بجلی گری، نہ وہ خورشید چھپ گیا، نہ آسمان سے سانپ بچھو گرے"۔ اس نے جواب دیا "اے صاحب یہ سب غضب الٰہی محض اس شخص کی وجہ سے نازل ہو رہا تھا جس کے ظلم و ستم سے اس شہر کی مخلوق نالاں ہے اور جو والیٔ ملک کی دولت پر قبضہ کر کے مغرور بن گیا ہے۔ لیکن چونکہ حضور آصفجاہ بندہ پرور، سخی، کریم اور ذات حق کی صفاتوں سے معمور ہیں اس لئے ان کی حسن نیت کی وجہ سے یہ بلائیں سب دور ہو گئیں۔

(۱۰) قصیدہ گلشن بہار

اس قصیدے میں نواب تیغ جنگ شمس الدولہ شمس الملک شمس الامراء کے فرزند نواب امام جنگ کی شادی کتب یعنی تقریب بسم اللہ خوانی کا حال بیان کیا گیا ہے۔ اور اس طرح شاعر نے اپنے ممدوح اور ان کے فرزند کو اس تقریب میں مبارک باد اور دعا کی نذر دی ہے۔ اس میں ۱۶۵ اشعار ہیں۔

پہلے بہاریہ تشبیب لکھی ہے جس کا گریز اس شعر سے کیا ہے۔

پوچھا میں باغبانِ خرد سے یہ دیکھ رنگ
کہہ کس سبب خوشی کا یہاں اشتہار ہے

اس کے بعد شمس الملک کی مدح نہایت تفصیل سے لکھی ہے جس میں ان کی شجاعت، تلوار، سپر، گرز اور اسپ ابلق وغیرہ کے اوصاف ہیں۔ اور پھر ان کے فرزند امام جنگ کی مدح شروع کی ہے جس میں ان کی فراست، ہونہاری، شریف دوستی، سپاہی زادوں پر نظر عنایت وغیرہ کی تفصیل بیان کی ہے۔

(۱۱) قصیدہ ہجو اخرج

اس میں ۱۱۹ اشعار ہیں۔ اس سے معلوم ہوتا ہے کہ مصنف شیعہ مذہب کا پیرو تھا اور اس کے زمانہ میں بھی مجلسیں ہوا کرتی تھیں جن میں شیعوں کے علاوہ سنی اور خارجی بھی شرکت کرتے تھے۔ چنانچہ وہ ایام عاشورہ میں ایک مجلس میں گیا تھا وہاں ایک شخص نے یزید پر لعنت بھیجنے سے انکار کر دیا جس کی بنا پر مذہبی معاملات پر مباحثہ ہوا۔ شاعر اس شخص کی تفصیلی ہجو لکھتا ہے جس میں اس کے باپ سعادت "ملا گھسلم" اور اس کی بیوی مبارزخاں کی کنیز کے متعلق بھی نہایت فحش اشعار شامل ہیں۔ مصنف نے مرزا رفیع سودا کی ہجو مولوی ساجد کی تقلید میں یہ قصیدہ لکھا ہے۔ اور اس کی طرف آخری اشعار میں اشارہ بھی کیا ہے۔

(۱۲) مخمس شب خون ٹیپو سلطان

اس مخمس میں ۱۳ بند ہیں اور اس میں اس تاریخی شب خون کا ذکر ہے جو بمقام شاہ نور ۱۱ صفر ۱۲۰۱ھ کو ٹیپو سلطان والیٔ میسور نے حیدر آباد اور مرہٹوں کی متحدہ فوجوں پر مارا تھا۔ تاریخوں میں اس واقعہ کا ذکر ہے لیکن اس کی تفصیلات درج نہیں ہیں۔ حسن اتفاق سے اس شاعر نے محققین کے لئے اس کی تفصیل بھی محفوظ کر دی ہے اس لئے اس کا خلاصہ درج ذیل ہے:۔

ابتدا میں شاعر اپنے زمانہ کے ظلم و ستم کی شکایت کرتا ہے۔ اور غالباً ارسطو جاہ کو ملک کی ساری خرابی کا باعث گردانتا ہے۔ اسی سلسلے میں وہ ظالموں کو رات بھر بددعا دیتا رہا اور صبح بھی کہتا ہوا باہر نکلا تو معلوم ہوا کہ شہر میں ایک قاصد آیا ہے جو یہ خبر لایا ہے کہ:۔

"ظالم طرف قہر خدا نازل ہوا۔ ایسی گولیاں چلیں کہ اس شب خون کے دریا میں سب پیر و جواں ڈوب گئے۔ جو زندہ بچے وہ قید ہو گئے اور اور جو مر گئے وہ رنج سے چھوٹے۔ ۱۱ رصفر ۱۲۰۰ھ کو جب وہ فوج شکوہ (یعنی مرہٹہ اور نظام) کو غافل پاکر ٹیپو نے شب خون مارا تو اہل سپاہ برہنہ سر بھاگے اور راستوں پر لوگوں نے جمع ہو کر پوچھنا شروع کیا کہ یہ سب لوگ کہاں ڈوبے۔

قاصد نے جو باتیں رو رو کر بیان کیں ان کو کیا بتاؤں۔

جب مرہٹے نے سب لشکر ساتھ لیا اور بادامی سے آکر شاہ نور کے قریب قیام کیا تو وہاں یہ سب مل کر تباہ ہوئے۔ بہت سے تو وہیں مر گئے لیکن اکثر لوگ جنگل میں بھاگ گئے۔

ان کے ساتھ تہور جنگ اور گھانسی میاں بھی تھے جو گویا بحر ہمت میں ڈوب گئے۔ مرہٹے اس بری طرح بھاگے کہ ان کو کسی بات کی سدھ نہ تھی۔"

معلوم ہوتا ہے کہ شاعر ٹیپو سلطان کے خلاف نظام اور مرہٹوں کے اتحاد سے ناخوش تھا۔ ورنہ وہ اس شب خون اور شکست و پریشانی کے واقعہ کو اس طرح بیان نہ کرتا۔ خاص کر گھانسی میاں کا تو وہ بڑا مداح ہے۔ لیکن اس کے باوجود وہ یہاں اپنے جذبات کو چھپا نہ سکا۔

(۱۳) قصیدۂ زلزلۂ فلک

یہ تیئیس اشعار کا قصیدہ ہے جس میں صرف مشیر الملک ارسطو جاہ کی ہجو کی گئی ہے۔ ابتدا میں زمانہ کی شکایت کی ہے کہ غریب اور مظلوم روز بروز پریشان حال ہیں اور ظالم مزے اڑا رہا ہے۔ ارسطو جاہ کا شاعر پر اتنا رعب طاری تھا کہ وہ قصیدے میں صاف طور پر نام نہیں لیتا۔ بلکہ اس نے اشعار ذیل کے ہر مصرع کے ابتدائی حرف سے ان کا خطاب مشیر الملک ظاہر کیا ہے۔

مصلحت کی میم سے جس کی بو ہووے نزول
شور و شر کی شین سے جس کی ہر اک دل کلکلے
پائے یاری سے ہو نقصان جس کے ....
رائے رسم ظلم رائے رحم کے اس کی ....

ان اشعار سے قبل ارسطو جاہ کا نام نہ لینے کا ذکر یوں کرتا ہے۔

یعنی ایسے سخت ظالم کو خدا دے ہے بٹھا
مسند ملک ستم کے شامیانے کے تلے
نام کے لینے سے جس کے پانچ سو چالیس دس
سورہ فکر طل سوں چشم سے آنسو ڈھلے
بس جو ایسا ہووے اور ...... ہلاکو وقت کا
ذکر کر کچھ اور اس کا اسم اب ہرگز نہ لے

آخر میں اس امر کی دعا کی ہے کہ ہم اس ظالم کی لاش جلد ہاتھی کے پاؤں تلے دیکھیں۔ جو دوسروں کو بھیک منگواتا ہے وہ خود بھیک مانگنے لگے۔ یا غیب سے اس پر ایسی مصیبت پڑے کہ مرغ بسمل کی طرح تڑپنے لگے۔ شاہ آصف تا ابد سلامت رہیں اور ان کی بلا بدخواہوں پر ٹلے۔ ان کی دولت و اقبال کا طبل سدا بجتا رہے اور ان کی ریاست کے نقش کا سکہ محشر تک چلتا رہے۔

شاعر کی دوسری دعا تو قبول ہوئی لیکن پہلی تمنا اس کے دل کے دل ہی میں رہ گئی ہو گی کیونکہ ارسطو جاہ آخر دم تک مختار و ممتاز رہے اور نظام علی خاں آصفجاہ ثانی نے ان کی لڑکی کی شادی ولیعہد سلطنت سے کر کے ان کو اور بھی ممتاز فرمایا۔

(۱۴) قصیدۂ صدمات زمانہ

یہ ۱۵ اشعار کا قصیدہ ہے جس میں تاریخ دکن کے ایک مشہور واقعہ کو قلمبند کیا گیا ہے جو ۱۲۰۳ھ کے جشن سالگرہ آصفجاہ ثانی سے متعلق ہے۔ اس سال آصفجاہ ثانی نے گولکنڈہ میں ایک نیا محل (جو آج کل موتی محل یا نو محل کہلاتا ہے) بنایا تھا اور اسی میں مقیم تھے۔ نئے مکان کی گھر بھرائی کی تقریب میں یہاں ایک مینا بازار قائم کیا گیا جس میں نفائس و جواہر کے علاوہ ہاتھی اور گھوڑے بھی بغرض فروخت مہیا کئے گئے تھے۔

آصفجاہ ثانی اور ان کے امرا اس مینا بازار کی دلچسپیوں میں منہمک تھے کہ ایک پالتو بندر نے حضور کے ہاتھ کو زخمی کر دیا جو ایک مہینہ کے بعد اچھا ہوا۔ اس کی خوشی میں غسلِ صحت و سالگرہ کا جشن قرار پایا جس کی تیاری نواب ارسطوجاہ کر رہے تھے کہ ایک روز دربار میں حیدر علی بیگ جمعدار (علاقۂ ارسطوجاہ) نے اپنی جاگیر کی ضبطی اور قرض داری کی شکایت کی اور اپنے ہمراہیوں کو نذر کے لئے پیش کرتے کرتے اپنی کٹار نکال لی اور ہاتھ آگے بڑھا کر کہنے لگا کہ "حضور یا تو مجھے اس سے ذبح کر دیں یا مقدمۂ جاگیر و تنخواہ سپاہ کا فیصلہ فرمائیں۔" ارسطوجاہ درمیان میں آکر کٹار چھیننے لگے اور اس کوشش میں ان کا ہاتھ زخمی ہو گیا۔ خون بہتا دیکھ کر ان کے ہوا خواہوں نے حیدر علی بیگ اور اس کے بعض ساتھیوں کو وہیں قتل کر دیا۔ اور حضور نے ارسطوجاہ کی صحت تک جشن کو ملتوی کر دیا۔ (تفصیل کے لئے دیکھو لقطام علیخاں از سراج الدین طالب ص۱۸۵)

اس واقعے کو آفتی نے شاعرانہ انداز میں بیان کیا ہے۔

لیکن بجائے گولکنڈے کے اس کو خاص شہر حیدر آباد کے واقعے کے طور پر پیش کیا ہے چونکہ وہ اس وقت شہر میں موجود تھا اس لئے اس کا بیان اہم ہے اور آئندہ ماہرینِ تاریخ کو اس سے مدد ملے گی اس لئے اس قصیدے کا خلاصہ یہاں درج کیا جاتا ہے:۔

میں صفحۂ کاغذ پر زمانے کے صدمات بیان کر رہا ہوں۔ اس زمانہ میں ظلم بلا کو، طوفانِ نوح، اور غرورِ نمرود کی یاد تازہ ہو گئی ہے۔

میں لوگوں کے ظلم و جفا پر سوچ رہا تھا کہ کسی ضرورت سے چوک کی طرف گیا وہاں شمالی ہند کے ایک دوست خواجہ سرا میاں منظور سے ملاقات ہوئی۔ وہ پریشان حال کھڑے تھے۔ میں نے حیرت سے پوچھا کہ یہ کل کی بات ہے کہ تم ملک ہند میں امیر با مقدور تھے اور آج ایسی کیا گزری کہ پھٹا پرانا جوتا پہننے پر مجبور ہو۔

میاں منظور نے رو کر تیرھویں صدی کی شکایت کی اور کہا کہ میں ایک دوست کی تلاش میں ہند سے نکل کر متھرا کی طرف آیا تو معلوم ہوا کہ وہ آج کل کا رو کن پر مامور ہے۔ اس کی دادی جو شوخ مزاج اور وجیہہ تھی محل خاص کی اصیلوں میں تھی اور ایک وقت خراب پوشیدہ کام کی وجہ سے پکڑی گئی تھی تو میں نے اس کی جان و آبرو بچائی تھی۔

غرض اس بھروسے پر کہ نجیب آدمی اپنے محسن کا شکر گزار ہے یہاں آیا۔ یہ شخص پہلے تو ٹھیک طور پر ملا لیکن بعد کو اتنا ستایا کہ آخر کار اپنے گھر میں ناظری کی خدمت دس روپے ماہوار پر قبول کرنے کی خواہش کی اور کہا کہ اگر اس سے زیادہ کی خواہش ہے تو اس ڈبیا کو یاد کرو جو تم میری دادی صاحبہ کے ہاتھ سے چھین لے گئے تھے اور جو کروڑ روپے قیمت کی تھی۔

میں اس کی جھوٹ پر خاموش ہو کر چلا آیا لیکن ہزاروں گالیاں دل میں دیتا رہا۔ اس کے ایک ملازم نے کہا کہ میاں منظور تمہاری کیا شامت آئی تھی جو تم ایسے انسان کے بھروسے پر چلے آئے جس کی بدی سے شیطان بھی عاجز ہے۔

ابھی ہم میں یہ گفتگو ہو رہی تھی کہ چوک میں لوگوں کی بھگدڑ مچ گئی اور شور ہوا کہ امیر کے گھر میں تلوار چل رہی ہے۔ راستوں سے زخمی جانے لگے۔ معلوم ہوا کہ حیدر بیگ نے مدارِ ریاست پر فتنہ و فساد کی غرض سے نذر دینے کے بہانے سے تلوار کھینچی ہے۔ اہلکار ریاست نے جرأت کر کے ٹالنا چاہا تو اس کا ہاتھ زخمی ہو گیا۔ اس پر تلوار چلی اور دو چار وہیں گر گئے اور بہت سے زخمی ہوئے۔ حیدر علی بیگ کے ساتھی بھاگ کھڑے ہوئے۔ زخمیوں کو قید کر کے حضور کے حکم سے قلعہ گولکنڈہ بھیج دیا گیا اور ان کے گھر لوٹ لئے گئے۔

یہ حال سن کر خواجہ سرا میاں منظور نے کہا کہ اگر ظالم کی جان بچ گئی تو کیا ہوا اس کی خصلت تو بد ہے۔ اب اس کے خزانے میں زر نقد اور اصطبل میں ماش صدقے کی داخل ہو گئی۔ ایسی صورت میں اگر محتاج لوگ ہاتھ اٹھا کر یہ دعا مانگیں تو کیا عجب کہ جو شخص

ناوک تیر جفا سے کسی کے دل چھیدتا ہے اس کے بدن کا ہر زخم ناسور بن جائے۔ اور اس کے زخم میں مرہم کافور زہر کا کام کرنے لگے۔

اس تمام قصے میں ارسطوجاہ کا کہیں نام نہیں لیا لیکن اصل میں انہی کی ہجو مقصود ہے کیونکہ اس وقت وہی کار ریاست پر مامور تھے اور انہی کا ہاتھ حیدر علی بیگ کی کٹار سے زخمی ہوا تھا۔

(۱۵) قصیدہ تنزل آفات

۱۳۰ اشعار کا ذوالمطلعین قصیدہ ہے جس میں مشیر الملک ارسطوجاہ کی تفصیلی ہجو لکھی ہے۔ ابتدا میں زمانہ کی حالت بیان کی ہے کہ آج کل خواہ کوئی ہنر اختیار کریں پریشانی اور نقصان کا باعث ہے۔ یہاں بے ہنر کو ہنرور سمجھا جاتا ہے۔ اگر کوئی دو دن کی زندگی کے تجمل کے واسطے ایسے مدار المہام کی ملازمت کرے جو خیر خواہان آصفجا کا بدخواہ ہو تو کیا فائدہ۔ اس کے بعد دوسرا مطلع شروع کیا ہے کہ۔

میرے کلام کی اس شوخی کو دیکھ کر عقل نے کہا کہ کیوں نہیں ایسے مدار المہام کی ایک زبردست ہجو لکھتا۔ اس کے بعد ہجو شروع کی ہے جس کے اکثر شعر فحش ہیں۔ ارسطوجاہ کی پیدائش سے لیکر ماں باپ اور استاد کے ساتھ برتاؤ، تعلیم کی حالت، شادی کا ایسے روز ہونا جس روز کہ نادر شاہ نے ہندوستان میں قتل عام کیا تھا۔ بہرحال تمام نحوستیں اور برائیاں بیان کی گئی ہیں۔ اس کے بعد کہا گیا ہے کہ ان کے گھر پر ایسا اژدہام رہتا ہے جیسے کوئی مر گیا ہے۔ پھر ان کے جسم، حلیہ، چال، آواز، گھوڑے، ہاتھی، مکان، تہخانے اور باغ کی تفصیلی ہجو لکھی ہے۔ ان کے مکان کی تعمیر کی تاریخ لفظ دار ظلم (۱۱۹۰ھ) سے نکالی ہے۔

ان کے ملازمین اور سپاہیوں کی بھی ہجو لکھی ہے اور کہتا ہے کہ یہ سب محمدؐ نظام کی برادری کے لوگ ہیں۔ انھوں نے دھوبی کو رسالدار اور جلاہے کو پیشکار بنایا ہے۔ اس کے بعد ان کے ہتیاروں کی ہجو ہے۔

ان کے دفتر میں دیوان، بخشی، کوتوال، عرض بیگی، قاضی اور منشی وغیرہ ایسے لوگ ہیں جن کے باپ کا نام تو عبدالشکور ہے اور ماں نیکی ہے۔ کسی کی ذات مومن ہے، کسی کا وطن گمن پورہ ہے کسی کی بیوی کسی ملا یا امام کی داشتہ ہے۔ یہ لوگ دن کو تو خدا کا نام لے کر مزدوری کر لیتے ہیں لیکن رات کو محمدؐ کے نام کی بھیک مانگتے ہیں۔

دوسرا لشکر تو ندی کے پار نکل جاتا ہے اور یہ لوگ ابھی گاؤں ہی میں کوچ یا واپسی کی خبر پوچھتے رہتے ہیں۔ ان کا بخشی قصاب کی اولاد سے ہے جو گائے کی چربی چرا لیتا ہے (اس طرح ہر عہدہ دار کی تفصیلی ہجو لکھی ہے)

پھر ارسطوجاہ کی سواری کا ڈھنگ، دستخط کی شکل، عادات و اطوار غرض ہر بات کی تفصیل درج جس سے مورخین کو بڑی مدد مل سکتی ہے۔ آخر میں ان کے مذہب کے متعلق لکھتا ہے کہ

کیونکر کہیے شیعہ کہو اس پلید کو
ضنبلی میں بارگاہ رکھے جو امام کی

اس کے بعد دو تین شعر شمس الملک اور بالاجی رائے کی مدح میں لکھے ہیں کیونکہ انہی کی وجہ سے وہ عیش و آرام سے زندگی بسر کر رہا ہے۔ اپنا تخلص اس شعر میں لکھا ہے:۔

افسوس زباں خموش بس آگے سخن نہ کہہ
رخصت نہ دے تو فسکر کو طول کلام کی

آخر میں ہم بطور نمونہ شاعر کی وہ نظم درج کرتے ہیں جو ٹیپو سلطان کے شب خون سے متعلق ہے۔

ٹیپو سلطان کا شب خون

خیال شکوۂ گردوں کے گر جادۂ زماں ڈوبے تو کیوں نہ بحرِ حیرت میں سخن کا خامہ ڈوبے
بجا ہے موج اس ہستی میں گر دل گل اماں ڈوبے کہ آفاتِ فلک سے مرد کا نام و نشاں ڈوبے
نہ ڈوبے اور وہ ظالم کہ جس سے سب جہاں ڈوبے

کہوں کیا ہائے یہ کس طرح کا دورِ زمانہ ہے کہ رسمِ آشنائی سے بگانہ ہر یگانہ ہے
کہیں بھی جورِ گردوں کے ستم کو اب ٹھکانا ہے کہ دورِ زر سے ہر ظالم غریب اوپر تو آیا ہے
شطط میں فکر کے کیونکر نہ اب ہر ناتواں ڈوبے

کہوں کیا اس فلک نے ظلم کے بادل کی بارانی کہ جس کی دیکھ کر موجِ غضب کی جوش طوفانی
تباہی میں پڑے حیرت کے جا کر عقلِ انسانی نہ کیوں اس بحرِ غم کی ملکِ دل پر کیونکہ طغیانی
کہ جس کی شورِ نالی سے زمیں تا آسماں ڈوبے

نگینِ اسمِ ظالم کا فلک نے نقش کر جاری ڈبو پایا ہے یہاں تک ملکِ دنیا کی عملداری
کہ ہیں تسخیر کر دو فن سے اس کی شان سب جاری تعجب نہیں اگر حالِ گدا کی دیکھ کر خواری
جو آبِ اشک سے کشتیٔ چشمِ مرداں ڈوبے

تبا رہے چرخِ گرداں یہ کہاں کی رسمِ شاہی ہے جدھر دیکھیے ادھر کو ترے ہاتھوں تباہی ہے
کہ جس اہلِ کرم کے چشم میں قدرِ سپاہی ہے یہاں تک حال اس کے پر تری اب کم نگاہی ہے
یہی منظور ہے تجھ کو کہ اس کا خاندان ڈوبے

بڑا ناخوب یہ نہیں ہے اس قدر ظالم کو اے گردوں کہ جس کے جور کے ہاتھوں سوں عالم ہو سب پر خوں
خدا سے ڈر نہ کر اتنا ستم خلقِ خدا پر توں قضا کی جلد موجِ بحر میں لے ڈوب تو اس کوں
بہارِ گلستاں کو جس طرح لے کر خزاں ڈوبے

غرض تھا میں اسی فکرِ سخن میں ایک دن یکسر بصد منت جنابِ حق میں رو رو کر دعا کر
سنا جو اپنے کانوں سے یہ قسمِ خالقِ اکبر جو لے کر اسمِ ہر ظالم کوں سب مظلوم ہو بے پر
چلا جاتا تھا یہ کہتا فلاں ابنِ فلاں ڈوبے

زمانے نے غرض صبحِ دو فتنہ کو جو کھولا ایک آ قاصد نے باہر سے خبر یہ شہر میں بولا
فلاں طرف ایسا یہ ہو بجا ہے خدا قہر کا جھولا چلے بان اس قدر لاکھوں بجا اس طرح سے گولا
جو اس شب خون کے دریا میں سبھی پیر و جواں ڈوبے

ہزاروں بان اور گولے یہاں تک اس جگہ چھوٹے کہ جیدِ گلشنِ ہستی سے بوٹے جاں کے ٹوٹے
پڑے جا قید میں جیتے ثمر سونج سے چھوٹے چمن کو پھر تو لشکر کے یہاں تک دو بنا لوٹے
کہ جس کو دیکھ بحرِ غم میں گل کے باغباں ڈوبے

صفر کی گیارھویں تاریخ یعنی آ کے ٹیپو جب کرا شب خوں وہ نو لشکر یہ غافل پا بوقتِ شب
برہنہ سر ہر ایک بھاگے او ڈرا ہو وہاں سے سب جمع ہو رہ گئے سارے یہ سن کر ہوش کھو کر سب
لگے سب پوچھنے اس کو کہو یہ سب کہاں ڈوبے

کہوں کیا بات کہنے سے کہتا ہے نہ ہے باہر بتاؤں کیا تمھیں قاصد یوں بولا اس نے رو رو کر
کہ بادامی سے آ نکلے شاہ نور کے جا کر جہاں اللہ تعالیٰ کے کرم سے نے سات سب لشکر
یہ سب مل کر ارے یارو وہاں ڈوبے وہاں ڈوبے

کہوں کیا اور پھر اس نے کہا وہ عقل کے دیوانے ہو شلق سے بان اور توپ کے ایسے وہ دیوانے
مرے سو مر گئے جیتوں نے لے جنگل کی بیجانے چھپے بچ ہزیمت میں وہ اخترِ رزم کے یعنے
تہور جنگ ادھر ڈوبے ادھر گھانسی میاں ڈوبے

کہا پھر اس نے کیا بولوں اے آفت با اس رنگی کہ بھاگے مرہٹے ایسے نہ سدھ ان کو رہی تن کی
خدا برباد ہو پھر ان کی ظفر کی آرزو من کی مدد سے لفظ اختر کے لکھا تاریخ اس دن کی
۱۲۰۱
سنے پیدل کے ہاتف نے وہ جب نواب و خاں ڈوبے

سید محی الدین قادری زور

سماج سدھار (بسلسلہ گزشتہ)

(۴)

رات بہت گزر گئی تھی۔ اس لئے ہیڈ ماسٹر صاحب سونے کے لئے اپنے کمرے کی طرف جانے لگے۔ لیکن بازو کے کمرے سے انھوں نے زمیندار صاحب کو یہ کہتے ہوئے سنا "لیکن۔ لیلا ــــ بیچاری لیلا کے لئے کیا کروں۔ اُف! ــــ اس کی حالت کو دیکھ کر مجھے رونا آتا ہے۔ نہ معلوم ہم نے گزشتہ جنم میں کون ایسا پاپ کیا تھا ــــ" ہیڈ ماسٹر صاحب وہیں رک گئے ــــ "یہ تو اس کی قسمت میں لکھا تھا" یہ نرملا دیوی تھیں ــــ "شائد اس نے اپنے گزشتہ جنم میں اپنے شوہر کو زیادہ ستایا ہوگا جو اب اس عمر میں اس کے شوہر کو اس سے چھین لیا گیا" ــــ "بس تم بھی عجیب ہو۔ آہستہ بولو کہیں وہ سن نہ لے بیچاری سو رہی ہوگی ــــ" زمیندار نے پدرانہ شفقت ظاہر کرتے ہوئے کہا ــــ ہیڈ ماسٹر صاحب نے جب یہ سنا کہ لیلا ودھوا ہے تو انھیں ایسا معلوم ہوا کہ کسی نے ان کے دل پر پتھر دے مارا ــــ انھیں بڑا صدمہ ہوا وہ دبے پاؤں اپنے کمرے میں داخل ہوئے اور بستر پر دراز ہوگئے۔ لیکن انھیں نیند نہیں آئی اور ان کی بیقراری میں اضافہ ہوتا گیا۔ وہ سوچنے لگے لیلا حسین ہے چاند کی طرح ــــ لیکن افسوس کہ اس کے اس بے پناہ حسن کا کوئی حقیقی قدرداں نہیں ــــ وہ ایک ودھوا ہے ــــ ایک حسین و کم سن ودھوا ــــ آہ! ــــ قدرت کا یہ کیسا ظلم تھا۔ بیچاری نے کون ایسا پاپ کیا تھا جو اس کے عین عالم شباب میں اس کے شوہر کو اس سے چھین لیا گیا ــــ وہ ایک سندر پھول ہے۔ لیکن افسوس ہے کہ اس کی خوشبو سے مستفید اور محظوظ ہونے والا کوئی نہیں ــــ ابھی بچپن پوری طرح رخصت بھی نہیں ہوا ہے ــــ اور آہ! ــــ اس کا شوہر چل بسا ــــ جانے والا تو جا چکا ــــ لیکن اس معصوم دوشیزہ کو کہیں کا نہ رکھا ــــ اور بیچارہ اس کے والدین بھی رنج کا شکار ہوئے۔ ایک کی وجہ سے اب تین کی زندگیاں بے لطف ہوگئیں۔ غرض ان کے دماغ میں اس قسم کے خیالات آرہے تھے۔ رات کافی گزر جانے کے بعد وہ سو گئے۔

لیلا گو ایک زمیندار کی بیٹی تھی ــــ مگر اسے بناؤ سنگار پسند نہ تھا۔ وہ کبھی سونا وغیرہ اپنے جسم پر نہ رکھتی تھی ــــ چاند سی حسین عورت کو بناؤ سنگار کی کیا ضرورت۔ اس کا حسن خود ایک بیش قیمت زیور ہے اور وہ بھی خداداد ــــ جب وہ باتیں کرتی تو ایسا معلوم ہوتا تھا کہ بہت سوچ سوچ کر بولتی ہے ــــ ہنستی بہت کم تھی لیکن ہمیشہ خوش رہنے کی کوشش کرتی تھی ــــ اس کے حسن کا قدرداں کوئی نہ تھا۔ اس کے جوانی میں قدم رکھنے کے ساتھ اس کا شوہر مر گیا تھا ــــ وہ بال ودھوا تھی ــــ وہ روئی ــــ خوب روئی مگر کیا اس کا شوہر واپس آسکتا تھا؟ ــــ نہیں ــــ کسی قیمت پر بھی ــــ وہ دوبارہ ــــ اس دہر فانی میں قدم نہیں رکھ سکتا تھا۔ وہ ہمیشہ اپنی پھوٹی قسمت پہ روتی مگر اس سے کوئی فائدہ نہ تھا۔ دل بہلانے کا واحد ذریعہ اس کے لئے کتابوں کا مطالعہ تھا۔ وہ ہمیشہ مذہبی اور دیگر کتابیں پڑھا کرتی تھی۔ رامائن اور مہابھارت اس نے کئی دفعہ پڑھی تھی اور بھگوت گیتا کا ہر ایک شلوک اسے یاد تھا۔ شوہر کے انتقال کے بعد چند دنوں تک وہ بہت اداس اور غمگین رہتی تھی۔ لیکن وہ بھی انسان تھی۔ اسے بھی نیچر کے قوانین کے مطابق چلنا تھا۔ چنانچہ وہ بھی اپنے شوہر کو بھول جانے میں کامیاب ہوگئی ــــ اور یہ بھولنا عین انسانی فطرت کے مطابق تھا۔ خواہ مرنے والا کتنا ہی عزیز کیوں نہ ہو چند دن بعد ہم اسے بھول جاتے ہیں ــــ لیلا کتابوں کے مطالعہ میں اس قدر کھو جاتی تھی کہ اسے کسی دوسری چیز کا خیال نہ رہتا تھا۔ گھر کا کام کاج تو اسے کرنا نہیں تھا۔ سوائے پڑھنے اور

تفریح کے کوئی کام نہ تھا۔ شام کے وقت وہ اکیلی ندی کی طرف چلی جاتی۔ پرندوں کی آواز ——— ہوا کی سنسناہٹ اور لہروں کے شور سے اس دل ہلکا ہو جاتا ——— کچھ دیر کے لئے وہ دنیا اور دنیا کی فکروں کو بھول کر کتاب قدرت کے اس رنگین باب کے مطالعہ میں مصروف ہو جاتی ——— نہ معلوم کیا ایک کبھی کبھی اس کے رسیلے لبوں پر پھیکا سا تبسم کیوں کھیلنے لگتا ——— اور ——— اور وہ پھر مغموم ہو جاتی ——— اور ایک بھاری سا دل لے کر گھر واپس ہوتی اور جا کر ریڈیو پر بیٹھ جاتی ——— ایک کمسن بیوہ کی جو ابتر حالت ہوتی ہے وہ صرف وہی جانتی ہے ——— ہم اور آپ نہیں سمجھ سکتے۔

(۵)

ہیڈ ماسٹر صاحب جب بیدار ہوئے تو ان کی آنکھوں کے اطراف سیاہ حلقے پڑ گئے تھے آج ان کا دل بہت اداس تھا۔ وہ بہت جلدی مدرسے کی طرف چلے گئے۔ وہ چاہتے تھے کہ جہاں تک ہو سکے مدرسے کی حالت کو سدھاریں اور اس کو نئے طریقے پر چلائیں۔ تمام مدرسین چونکہ بہت پرانے اور بوڑھے تھے اس لئے طریقۂ تعلیم میں کوئی تبدیلی کرنا مشکل تھا ——— ہیڈ ماسٹر صاحب ہر ہفتہ تمام جماعتوں میں جا کر مدرسین کے پڑھانے کے طریقہ کو دیکھتے تھے اور ضروری ہدایات دیا کرتے تھے ——— ماسٹر گوپال راؤ اور ماسٹر بھالچندر راؤ بہت بوڑھے ہو گئے تھے۔ وہ برابر کام کرنے کے قابل بھی نہ تھے ——— علاوہ اس کے وہ بہت خوشامد پسند بھی تھے۔ لڑکوں سے طرح طرح کے بہانے کر کے اپنا کام لیتے تھے ——— باغبانی کا شوق دلا کر اپنے گھر کے باغ میں لڑکوں سے کام لیتے ——— غرض اس قسم کی اور باتیں ہیڈ ماسٹر صاحب نے چند صاحبین سے سنیں اور ارادہ کر لیا کہ زمیندار صاحب سے کہہ کر انھیں یا تو وظیفہ دلا دیں گے یا مدرسہ سے ہٹا دیں گے۔ رام پور میں کوئی مطالعہ خانہ نہ تھا جس کی وجہ سے پبلک دور دور کے ممالک کے واقعات سے بے بہرہ رہتی تھی۔ ہیڈ ماسٹر صاحب کے پروگرام میں ایک پبلک لائبریری قائم کرنا تھا انھوں نے اس کے متعلق زمیندار صاحب سے کہہ دیا تھا، اور انھوں نے اپنی رضامندی بھی ظاہر کر دی کیونکہ انھیں یقین تھا کہ ہیڈ ماسٹر صاحب جو بھی کام کریں گے وہ سب کی بھلائی کے لئے کریں گے۔ لیکن اس کے لئے چندہ کی ضرورت تھی۔ چندہ وصول کرنا کوئی معمولی بات نہیں ایک شخص کے مکان پر دس دس مرتبہ جانا پڑتا ہے۔ اس کام میں چند اور اصحاب کی مدد کی ضرورت تھی۔ ہیڈ ماسٹر صاحب سے تمام اساتذہ بھی خوش تھے اس لئے کہ وہ فضول اپنا اقتدار کسی پر نہیں جتلاتے تھے جیسا کہ آج کل کے افسروں کا طریقہ ہے۔ ہیڈ ماسٹر صاحب اپنی نیک طبیعت اور اپنے حسن سلوک کی وجہ سے لوگوں میں بہت مقبول ہو گئے تھے جس شخص نے ان سے ایک مرتبہ گفتگو کی بس ان کا گرویدہ ہو گیا۔ نہ معلوم ان کی باتوں میں کون ایسی کشش تھی۔ ان کی زبان پر کبھی سخت الفاظ نہیں آتے تھے ———

ہیڈ ماسٹر صاحب جب مدرسے سے گھر واپس ہوئے زمیندار صاحب نے کہا "ہیڈ ماسٹر صاحب آپ سے کچھ کہنا ہے۔ کھانا کھانے کے بعد مہربانی فرما کر میرے کمرہ میں تشریف لائیے" ——— "بہت اچھا" ——— ہیڈ ماسٹر صاحب سوچنے لگے کہ کون ایسا کام ہوگا جو زمیندار صاحب نے انھیں خاص اپنے کمرہ میں بلایا تھا ——— زمیندار صاحب کے حکم کے مطابق وہ ان کے کمرہ میں گئے۔ "آئیے۔ تشریف رکھئے" زمیندار نے کہا۔

"بات یہ ہے کہ ماسٹر گوپال راؤ بہت بوڑھے ہو گئے ہیں ——— آپ کے آنے سے چند دن پیشتر انھوں نے وظیفہ کے لئے درخواست دی تھی۔ مگر میں اس وقت منظور نہیں کر سکتا تھا۔ ایک تو کوئی ہیڈ ماسٹر نہیں ملے تھے، اور دوسرے اگر اس وقت انھیں وظیفہ پر علحدہ کرتا تو مدرسے کا کام چلنا بہت مشکل ہو جاتا ——— اب چونکہ آپ آگئے ہیں ——— اور مدرسے کا کام بہت عمدگی سے ہو رہا ہے۔ اس لئے میں چاہتا ہوں کہ گوپال راؤ کو وظیفہ پر علحدہ کر دوں۔ لیکن مشکل

یہ ہے کہ کوئی دوسرا آدمی نہیں ملتا۔ ان کی جگہ بہت دن تک خالی نہیں پڑی رہ سکتی ـــــ" "جیسی آپ کی مرضی جہاں تک نئے مدرس کا تعلق ہے میں اس کام کو پورا کرتا ہوں ـــــ" "وہ کیسے؟" زمیندار نے دریافت کیا ـــــ اتنے میں کسی کام سے لیلا بھی اندر آگئی اور اپنے تپاجی کے پاس کھڑی ہوگئی "میرے ایک دوست ہیں ان کا نام نریندر ہے۔ وہ بھی گریجویٹ ہیں۔ اب تک انھیں کہیں ملازمت نہیں ملی" ہیڈماسٹر نے کہا ـــــ "دیکھئے آپ جو مناسب سمجھتے ہیں کیجئے۔ اگر وہ قابل آدمی ہیں تو انھیں بلا لیجئے ورنہ کسی دوسرے کو ڈھونڈ لیں گے"

"ایک اور بات یہ ہے کہ بیچارے بہت غریب ہیں مکان میں ان کی ماں، بیوی اور ننھے بچے بھوکے سوتے ہیں" ـــــ "تب تو انھیں کو بلا لیجئے تپاجی!" ـــــ لیلا نے کہا جس کا دل موم کی مانند نرم تھا۔ "اچھی بات ہے۔ آپ انھیں خط لکھ دیجئے ـــــ آج ہی" ـــــ "جیسی آپ کی مرضی" ـــــ کہہ کر ہیڈماسٹر صاحب اپنے کمرے کو چلے گئے۔ ہیڈماسٹر صاحب خوش تھے۔ ان کی فکر خود بخود دفع ہوگئی۔ اور نریندر کے لئے اچھا موقع ہاتھ آیا تھا۔ انھوں نے اسی وقت نریندر کو خط لکھ دیا ـــــ

"پیارے دوست!

معاف کرنا۔ جواب دینے میں تاخیر ہوئی۔ تمھارے خط نے مجھے رنج وغم کے سمندر میں ڈوبا دیا تھا۔ لیکن پرمیشور کی کرپا سے زمیندار کی ناؤ نے مجھے بچا لیا ـــــ زمیندار صاحب ایک مدرس کو جو بوڑھے ہوگئے ہیں وظیفہ پر علحدہ کردینے والے ہیں اور ان کی جگہ آپ کو مقرر کرنا منظور کرلیا ہے۔ اس لئے جہاں تک ہوسکے جلد آجانے کی کوشش کیجئے۔ فقط

نریندر مکان کے باہر ہی کھڑے تھے جب خطوط رساں نے ان کی طرف لفافہ بڑھایا۔ نریندر نے جب خط پڑھ لیا تو خوشی سے اچھل پڑے اور اس خوش خبری کو اپنی ماں اور بیوی سے کہہ سنایا۔ وہ دونوں بہت خوش ہوئیں "ہے پرمیشور آخر تم نے ہماری حالت پر دیا کی ـــــ تم بڑے دیالو ہو" ـــــ نریندر کی بیوی فرط مسرت سے دیوانی ہوئی جارہی تھی۔ اس نے اپنے ننھے بچے کو سینہ سے چمٹا لیا اور بوسوں کی بوچھار شروع کردی ـــــ غرض ہر ایک کا چہرہ خوشی سے دمک اٹھا۔ نریندر نے دل ہی دل میں ہیڈماسٹر صاحب کا شکریہ ادا کیا۔

ہیڈماسٹر صاحب نے نریندر کے لئے ایک چھوٹا سا مکان کرایہ پر لے لیا۔ نریندر ان کا بچپن کا دوست تھا۔ دونوں میں برادرانہ محبت تھی۔ علاوہ اس کے ہیڈماسٹر صاحب کو اپنے ارادوں کی تکمیل میں ایک سچے دوست کی ضرورت تھی۔ سو اب وہ مل گیا۔ وہ بہت خوش ہوئے۔ انھیں نریندر پر پورا بھروسہ تھا کہ وہ ان کی مدد کرے گا۔ نریندر ایک شریف اور محنتی آدمی تھے۔ گو کہ انھوں نے دو دو دن تک فاقہ کیا لیکن کبھی ان کی زبان پر پرمیشور کی شکایت نہ آئی۔ وہ نہایت بردبار اور مستقل مزاج تھے۔ وہ اپنی حد تک تمام مشکلات کا سامنا کرنے کے لئے تیار تھے مگر بلکتے ہوئے بچوں، سسکتی ہوئی ماں اور غم کی ماری بیوی کے لئے کیا کرسکتے تھے۔ ایسے بے روزگار کو قرض بھی کون دیتا ہے۔ اب صرف بھیک مانگنا باقی رہ گیا تھا۔ لیکن آفریں ہے ان کی ہمت پر! صد آفریں ہے ان کی بیوی کی مستقل مزاجی اور بردباری پر کہ اس نے اف تک نہ کیا۔ نریندر کی بیوی ایک شریف اور دولت مند خاندان سے تھی۔ اس نے بچپن میں گھر کا کوئی کام نہ کیا تھا۔ اسے کرنے کی ضرورت بھی کیا تھی جب کہ اس کے والدین کافی دولت مند تھے۔ لیکن اب اپنے نازک ہاتھوں سے کوئیں کا پانی کھینچنا پڑتا تھا۔ وہ کبھی حرف شکایت زبان پر نہ لاتی۔ وہ سمجھتی تھی کہ اس کا شوہر ہی اس کا سب کچھ ہے۔ اس کا گنج اور

اس کی خوشی سمجھتی تھی۔ وہ ایک فرشتہ سیرت عورت تھی۔ نرنیدر کو اس کی حالت پر رحم آتا تھا۔ مگر وہ مجبور تھا۔ اس نے کئی بار اپنی بیوی سے معافی بھی چاہی لیکن اس کی بیوی نے اسے یقین دلایا کہ اس حالت میں بھی وہ بہت خوش تھی ۔۔۔۔ لیکن اب وہ حقیقت میں خوش تھی۔

(۶)

ہیڈ ماسٹر صاحب کو اطلاع ملی کہ نرنیدر مع اپنے اہل و عیال کے رامپور آگئے ہیں۔ وہ بہت خوش ہوئے اور اسی دن شام کو ان کی ملاقات کے لئے گئے۔ زمیندار صاحب کے نوکر نے جو نرنیدر کو لانے کے لئے کرشن گڑھ کے اسٹیشن پر گیا تھا رامپور واپس آنے کے بعد نرنیدر کو ان کا مکان بتا دیا جسے ہیڈ ماسٹر صاحب نے ان کے لئے کرایہ پر لے لیا تھا ۔۔۔۔

"نرنیدر! ۔۔۔ تمھیں دیکھ کر مجھے بڑی مسرت ہوئی۔ آخر مجھے ایک سچا ساتھی مل گیا۔" "آپ کی کرپا ہے" نرنیدر نے کہا ۔۔۔

"نرنیدر! ۔۔۔ میرا خیال ہے کہ اس گاؤں میں ایک پبلک لائبریری قائم کریں تاکہ سب لوگوں کا فائدہ ہو۔ تمھارا کیا خیال ہے؟" ۔۔۔ "بالکل مناسب ہے" ۔۔۔ "کل صبح آپ میرے پاس آئیے دونوں مل کر مدرسے کو جائیں گے۔ پہلے آپ اپنا جائزہ لے لیجئے اس کے بعد لائبریری کے متعلق سوچیں گے۔" ۔۔۔ "جیسی آپ کی مرضی" نرنیدر نے کہا ۔۔۔

دوسرے دن ہیڈ ماسٹر صاحب اور نرنیدر دونوں مل کر مدرسے کو گئے۔ نرنیدر نے اپنا جائزہ لے لیا اور اسی دن سے اپنا کام شروع کر دیا۔ وہ ایک قابل گریجویٹ تھے۔ انھیں تعلیم دینے کے طریقے اچھی طرح معلوم تھے ۔۔۔ اس لئے ہیڈ ماسٹر صاحب کو ہدایت دینے کی ضرورت نہ تھی ۔۔۔ شام کے وقت جب دونوں مدرسے

لوٹ رہے تھے تو ہیڈ ماسٹر صاحب نے کہا "نرنیدر! ۔۔۔ اس لائبریری کے کام میں تمھاری امداد کی ضرورت ہے" ۔۔۔ "میں ہر وقت آپ کی مدد کے لئے تیار ہوں" ۔۔۔ "بھئی چندہ وصول کرنا کوئی معمولی بات نہیں۔ اور یہ مشکل کام تمھارے ذمہ کرنا چاہتا ہوں۔" "اچھی بات ہے۔ آپ مہربانی فرما کر ایک ایسی فہرست تیار کر لیجئے جس سے مجھے معلوم ہو کہ اس گاؤں میں کون کون شخص کس قدر چندہ دے سکتا ہے" "تم فکر نہ کرو ۔۔۔ میں نے فہرست تیار کر لی ہے۔ کل تمھارے ہاتھ میں دیدوں گا ۔۔۔" ہیڈ ماسٹر صاحب نے کہا "اور ہاں ۔۔۔ چندہ وصول ہو جانے کے بعد ایک کمیٹی مقرر کریں گے جس میں لائبریری کے لئے پریسیڈنٹ اور معتمد وغیرہ کا انتخاب عمل میں آئے گا۔"

ہیڈ ماسٹر صاحب کو رامپور میں آئے ہوئے صرف دو ماہ گزرے تھے لیکن اس قلیل عرصہ ہی میں وہ لوگوں میں کافی مقبول ہو گئے تھے۔ اس لئے چندہ وصول کرنے میں دقت پیش آنے کا اندیشہ نہ تھا۔ پھر بھی بعض سیٹھ صاحبین ایسے تھے جو ایک پیسہ اپنی جیب سے دینا پسند نہیں کرتے تھے۔

دوسرے دن چونکہ جمعہ تھا اور مدرسے کو تعطیل تھی اس لئے نرنیدر چندہ جمع کرنے کے لئے روانہ ہوئے۔ بعض کچہری کے ملازمین اور وکلا نے خوشی سے چندہ دیدیا۔ اس کے علاوہ تمام دوکاندار بھی چندہ دینے پر راضی معلوم ہو رہے تھے۔ مگر سیٹھ مولچند اور گلاب چند جو اس گاؤں کے مشہور رئیس تھے۔ چندہ دینے پر راضی نہ تھے۔ یہ نہایت کنجوس واقع ہوئے تھے۔ کبھی انھوں نے رفاہ عام کے کاموں میں حصہ نہیں لیا تھا۔ سر کے بال سفید ہو گئے تھے مگر اب تک انھوں نے کسی کو دان وغیرہ نہیں دیا تھا۔ بس اپنا خزانہ بھرتی کرنا ہی ان کی زندگی کا مقصد تھا۔ کبھی انھوں نے اس وسیع و عریض دنیا کے مختلف

پہلوؤں پر غور کرنے کی تکلیف نہ کی تھی۔ اردگرد کے ماحول سے بےخبر دنیا کی دوسری باتوں سے بےنیاز ہو کر وہ اپنے ہی دھندے میں مست نظر آتے تھے۔ نرنیدر نے ان سے چندہ طلب کیا مگر مایوسی ہوئی۔ انھوں نے سوچا کہ اب اس طرح یہ سیٹھ حضرات چندہ نہیں دیں گے۔ اس کے لئے لمبی چوڑی تقریر کرنی ہوگی۔

"سیٹھ! — پیسوں کی مجھے ضرورت نہیں — بلکہ آپ اپنے لئے خرچ کیجئے۔ لائبریری قائم ہونے سے آپ کا فائدہ ہوگا اور ساتھ ہی ساتھ غریب رعایا کا بھی۔ ایسے کاموں میں اگر آپ جیسے لوگ ہاتھ نہ بٹائیں گے تو کون ہماری مدد کرے گا اور یہ کام اپنا ذاتی بھی نہیں ہے۔ یہ تو آپ ہی لوگوں کے فائدہ کے لئے ہے۔ آپ اگر چندہ دے کر لائبریری کے ممبر بن جائیں گے تو لوگوں کا فائدہ ہوگا اور آپ کا نام بھی روشن ہوگا — لوگ کہیں گے "دیکھو بھئی — سیٹھ گلاب چند اور مولچند نے لائبریری کے لئے اتنی بڑی رقم چندہ میں دی۔ بڑے اچھے لوگ ہیں" — "ہاں — روپیہ دیں تو اچھے ورنہ برے کیوں صاحب؟" مولچند نے دریافت کیا —

"لیکن سیٹھ صاحب۔ یقینی اس میں آپ کا فائدہ ہے۔ آپ کا نام ہوگا اور ساتھ ہی آپ کو اخبارات و رسائل ہر ماہ پڑھنے کے لئے مل سکیں گے۔ اگر آپ چندہ نہیں دیں گے تو ضرور لوگ آپ کی طرف انگلی اٹھالیں گے اور کہیں گے "کیسے کنجوس اور کٹھور سیٹھ ہیں"۔ آپ معمولی چندہ دے کر بھی ممبر بن سکتے ہیں۔ دیکھئے آج ہی وکیل رام راؤ نے پچیس روپے دئے ہیں۔ ہم ان کے ممنون ہیں — اگر حقیقت میں دیکھا جائے تو ہمیں ممنون ہونے کی کوئی ضرورت نہیں اس لئے کہ انھوں نے ہم پر کوئی احسان نہیں کیا۔ یہ ان کا فرض تھا۔ یہ ان کے اخلاق کا تقاضا تھا — کہئے اب آپ کیا کہتے ہیں"

— سیٹھ حضرات پھر بھی ٹال دینا چاہتے تھے مگر نرنیدر بھی کوئی کچی گولیاں کھیلنے والے نہ تھے۔ انھوں نے آخرکار چندہ وصول ہی کرلیا۔

شام میں جب وہ ہیڈ ماسٹر صاحب سے ملے تو ان کے لبوں پر تبسم کھیل رہا تھا۔ وہ بہت خوش نظر آرہے تھے —

"کیوں نرنیدر — بہت خوش معلوم ہو رہے ہو!" — "میں نے آج ایک بہت بڑا کام کیا ہے" — "وہ کیا؟" ہیڈ ماسٹر صاحب نے — "اس گاؤں کے کنجوس سیٹھ گلاب چند اور مولچند سے چندہ وصول کرلیا ہے" — "قابل تعریف بات ہے — دوست سچ پوچھو تو تمھاری مدد کے بغیر میں کوئی کام نہیں کرسکتا" ہیڈ ماسٹر صاحب نے کہا۔ اور اس کے بعد دونوں مل کر تفریح کرنے کے لئے ندی کی طرف گئے۔

وہاں جاکر ہیڈ ماسٹر صاحب نے نرنیدر سے اپنے آئندہ پروگرام کے متعلق کہا۔ نرنیدر نے وعدہ کیا وہ ہر مشکل کام میں ان کی مدد کریں گے۔ چندہ تو ایک ہی روز میں کافی وصول ہو چکا تھا اس لئے ہیڈ ماسٹر صاحب اور نرنیدر نے طے کرلیا کہ دوسرے دن چندہ دہندگان کی ایک کمیٹی مقرر ہو۔ تاکہ پریسیڈنٹ اور سکرٹری کا انتخاب عمل میں آئے۔

حسب پروگرام دوسرے دن شام کے وقت چندہ دہندگان کی کمیٹی مقرر ہوئی جس کے پریسیڈنٹ خود زمیندار صاحب اور سکرٹری مولوی عبدالعزیز صاحب (اردو مدرس) منتخب ہوئے اس کے بعد اخبارات و رسائل کے متعلق بحث ہوئی اور بالآخر کار یہ طے ہوا کہ ہر زبان کا ایک اخبار اور ایک ماہواری رسالہ منگوایا جائے۔ غرض تمام معاملات طے ہونے کے بعد کمیٹی برخاست ہوئی — ہیڈ ماسٹر صاحب بہت خوش تھے۔ اس لئے کہ آج وہ اپنے ارادوں کی دوسری منزل میں کامیاب ہو گئے تھے۔ ناظرین کو یاد ہوگا کہ ہیڈ ماسٹر صاحب کے پیش نظر سب سے اولین کام مدرسے کی حالت کو سدھارنا تھا اور اس کے بعد پبلک کے فائدے کے کام کرنا تھا۔

اس وقت ہمیں ختم صاحب دارالمطالعہ عامہ اتنی پور کے متعلق

کچھ بیان کرنا ضروری ہے کیونکہ رفاہ عام کے کاموں میں وہ بھی ہر وقت پیش پیش رہا کرتے تھے۔ مولوی عبدالعزیز صاحب ایک سنجیدہ اور شریف آدمی تھے۔ ان کا دل تعصب جیسے زہر بھرے جذبے سے پاک تھا۔ وہ ہندو مسلم اتحاد کے حامی تھے ۔۔۔ چنانچہ کئی مرتبہ انھوں نے اپنی تقاریر میں اس بات پر زور دیا تھا۔ اور ہمیشہ اپنے طلبہ کو یہی نصیحت کیا کرتے تھے کہ متحد رہیں اور یہی وجہ تھی کہ وہ طلبہ اور لوگوں میں ہر دلعزیز تھے۔ قوم پرست انسان کی کون عزت نہیں کرتا ۔۔۔ وہ اپنے طلبہ سے اسی طرح پیش آتے تھے جیسے ایک باپ اپنی اولاد کے ساتھ پیش آتا ہو۔ اس کے علاوہ ان کے پڑھانے میں ایک خاص قسم کا جادو تھا۔ ان کی کلاس میں لڑکے گڑبڑ نہیں کرتے تھے ۔۔۔ نہ صرف آپ اردو کے منشی فاضل تھے بلکہ ہندی میں بھی اچھی مہارت رکھتے تھے۔ ہندی شاعری سے آپ کو خاص دلچسپی تھی۔ گاؤں میں جب کبھی لوگوں میں جھگڑا ہو جاتا تو زمیندار صاحب تک پہنچنے سے پہلے وہ ان ہی کے پاس فیصلے کے لئے آتے۔ اس سے ان کی ہر دلعزیزی کا پتہ چلتا ہے۔ انسان اس وقت تک ہر دلعزیز نہیں ہو سکتا جب تک کہ اس کا کردار ٹھیک نہ ہو اور تعصب جیسے زہر آمیز جذبے سے دور نہ ہو۔ تعصب ایک ایسی چنگاری ہے جو دوسروں کے دلوں کو جلانے کے علاوہ خود اس دل کو بھی جلا کر خاک کر دیتی ہے جس میں کہ وہ خود وجود پذیر ہے۔ عقلمند انسان کبھی درخت کی اس ڈالی پر کلہاڑی نہیں مارتا جس پر کہ خود کھڑا ہوتا ہے ۔۔۔ اور اگر وہ ایسا کرے گا تو نتیجہ ظاہر ہے ۔۔۔ آج ہندوستان کی ابتر حالت کو دیکھتے ہوئے ہم یہ محسوس کرتے ہیں کہ آپس کی رقابت کو بھول کر ایک ہو جائیں ۔۔۔

(۷)

چند دن بیت گئے۔ ہیڈ ماسٹر صاحب نہایت مصروفیت میں دن کاٹ رہے تھے۔ زمیندار صاحب ہیڈ ماسٹر صاحب کے کاموں کا بہت اچھا اثر پڑا۔ وہ بہت خوش تھے کہ انھیں ایک روشن خیال اور قابل ہیڈ ماسٹر مل گیا۔ اب مدرسے کی حالت بالکل بدل گئی تھی۔ ہر چیز اپنی اپنی جگہ درست نظر آ رہی تھی۔ لڑکے ہفتہ میں ایک مرتبہ ایک جگہ جمع ہوتے تھے اور کسی موضوع پر مباحثہ ہوتا تھا ان میں جسمانی ورزش کا شوق بھی بڑھتا گیا۔ غرض مدرسہ ترقی کی راہ پر تھا۔

ایک دن، شام کے وقت ہیڈ ماسٹر صاحب تفریح کے لئے جا ہی رہے تھے کہ لیلا ان کے کمرہ میں آ گئی ۔۔۔ اور کہا "ہیڈ ماسٹر صاحب! ۔۔۔ آپ روزانہ اس طرف تفریح کے لئے کیوں جاتے ہیں جدھر کہ میں جاتی ہوں ۔۔۔ وہ تو میری جگہ ہے!"

"۔۔۔ اوہو! ۔۔۔ معاف کرنا مجھے معلوم نہ تھا۔ آج میں ادھر نہ جاؤں گا ۔۔۔" ہیڈ ماسٹر صاحب نے کہا "ہی ۔۔۔ ہی!" لیلا نے ہنستے ہوئے کہا ۔۔۔ "میں مذاق کر رہی تھی ہیڈ ماسٹر صاحب ۔۔۔ آپ کا دل جدھر چاہے جا سکتے ہیں، روکنے والے ہم کون؟"

"اچھی بات ہے" ۔۔۔ "تو ۔۔۔ کیا میں بھی آپ کے ساتھ چل سکتی ہوں؟" ۔۔۔ "ضرور۔ خوشی سے" ان چند دنوں لیلا کی طبیعت ٹھیک نہ تھی اس لئے وہ کہیں باہر نہیں جاتی تھی ۔۔۔ اور آج پہلی دفعہ وہ ہیڈ ماسٹر صاحب کے ساتھ تفریح کے لئے جا رہی تھی۔ کچھ دیر بعد لیلا تیار ہو کر آ گئی اور دونوں مل کر ندی کنارے چلے گئے۔

"آہ! ۔۔۔ کیا دلفریب مقام ہے، لیلا دیوی!" ہیڈ ماسٹر صاحب نے کہا "جی۔ ہاں تو ۔۔۔ ایک شاعر اور افسانہ نگار کے لئے یہ جگہ بہت بہترین ہے۔ اگر میں شاعر ہوتا تو ضرور اس وقت ایک نظم لکھ دیتا۔ یا اگر مصور ہوتا تو اس کا نقشہ کھینچ دیتا" لیکن ہیڈ ماسٹر صاحب ان میں کوئی نہ تھے ۔۔۔ لیکن لیلا کثرتِ مطالعہ کی وجہ سے افسانے لکھنے کے قابل بن گئی تھی ۔۔۔ اور خود اس کا

غم بھی اسے افسانے وغیرہ لکھنے میں مدد دیتا ——" ہیڈ ماسٹر صاحب! —— ہاں" — "میں نے ایک افسانہ لکھا ہے" —— لیلا نے کہا۔ "آپ!!" —— "جی میں کل آپ کو بتا دوں گی۔ مہربانی فرما کر اس کی اصلاح فرما دیجئے" —— "میں کا۔کی۔ کے کی حد تک درست کر سکتا ہوں۔ مگر پلاٹ وغیرہ میں کوئی تبدیلی نہیں کر سکتا" —— ہیڈ ماسٹر صاحب میں تقریر کا مادہ زیادہ تھا —— انھوں نے کبھی کوئی افسانہ یا نظم لکھنے کی کوشش نہیں کی تھی۔ ان کا خیال تھا کہ تحریر سے لوگوں پر زیادہ اثر نہیں ہوتا —— اور اگر ہوتا بھی ہے تو وہ دیرپا نہیں ہوتا —— مگر ہمارے ناظرین سے مجھے ایسی امید نہیں۔ انسان قوم کی تین طریقے سے خدمت کر سکتا ہے۔ (۱) تن (۲) دھن (۳) قلم کے ذریعہ یا تقاریر کے ذریعہ۔ اور ہم میں سے ہر شخص کو چاہیئے کہ ان تین میں سے کوئی نہ کوئی طریقہ اختیار کریں ورنہ ہمارے وجود سے ہماری قوم کو کوئی فائدہ نہیں پہنچتا —— اب ہمارے ہیڈ ماسٹر صاحب ہی کو لیجئے۔ ان میں تقریر کا مادہ ہے اور تن کے ذریعہ بھی وہ خدمت کرنے کے لئے ہر وقت تیار ہیں۔ لیکن جہاں تک دھن کا سوال ہے وہ مجبور ہیں۔ تاہم وہ لائبریری، یتیم خانوں وغیرہ کے لئے چندہ برابر دیتے ہیں۔ ان کی آدھی تنخواہ چندہ وغیرہ دینے ہی میں صرف ہو جاتی ہے —— اوہو! —— معاف فرمائیے —— آپ کو اب لیلا اور ہیڈ ماسٹر صاحب کی باتیں سننا ہے ——

"جب سے آپ یہاں آئے ہیں ہمارے مدرسے میں جان پڑ گئی ہے" لیلا نے کہا۔ مگر ہیڈ ماسٹر صاحب نے کوئی جواب نہ دیا وہ خاموش تھے۔ "کیا سوچ رہے ہیں آپ؟" لیلا نے ہیڈ ماسٹر صاحب کو خاموش دیکھ کر دریافت کیا۔ "جی —— کچھ نہیں" —— "نہیں —— آپ ضرور کسی خیال میں گم تھے" —— "میں سوچ رہا تھا کہ اب میرا آئندہ پروگرام کیا ہوگا۔ میری خواہش ہے کہ اس گاؤں میں ایک کھادی پرچار کمیٹی بھی مقرر ہو —— اس کے لئے ایسے لوگوں کی ضرورت ہے جو دل سے کام کریں" —— "آپ کا خیال درست ہے" لیلا نے کہا۔ "مجھے یقین ہے کہ میرا دوست نریندر میری مدد کرے گا لیکن بیچارہ اکیلا کیا کر سکے گا۔ چند اور ساتھیوں کو ڈھونڈنا ہے" —— اس کے بعد ہیڈ ماسٹر صاحب پھر خاموش ہو گئے۔ لیلا بھی خاموش بیٹھی رہی —— لیکن وہ زیادہ دیر تک اس طرح نہ بیٹھ سکی۔ آخر اسی کو خاموشی توڑنا پڑا —— "ہیڈ ماسٹر صاحب! —— آپ کے والدین کہاں رہتے ہیں؟" —— "کیلاش میں" —— "اوہو!" —— لیلا کی آنکھیں نم ہونے لگیں۔ جیسا کہ اس سے پیشتر بیان کیا گیا ہے لیلا کا دل بیحد نازک اور حساس ہے۔ چنانچہ یہ معلوم کر کے ہیڈ ماسٹر صاحب کے والدین سورگباش ہو گئے اسے صدمہ پہنچا —— "آج اگر وہ ہوتے میری یہ حالت نہ ہوتی" ہیڈ ماسٹر صاحب نے کہنا شروع کیا "وہ بھی دولت مند تھے۔ ایک زمانہ تھا جب کہ گھر کے سامنے دس دس نوکر رہتے تھے اور ہر روز کئی مہمان ہمارے ساتھ کھانا کھاتے تھے۔ لیکن قرض کا بوجھ والد کے سر پر تھا اور ان کی موت کے ساتھ ہی تمام زمینات ضبط کر لی گئیں —— مکان فروخت کر دیا گیا اور میری ماں بیچاری رنج و غم میں گھل گھل کر لقمۂ اجل بن گئی۔ زمانہ ہمیشہ کروٹیں بدلتا ہے" ہیڈ ماسٹر صاحب کے چہرہ پر اداسی چھا گئی —— "تاہم مجھے پرمیشور کا شکر ادا کرنا چاہیئے کہ آپ جیسے لوگوں کی ہمدردی مجھے حاصل ہے۔ آپ کے پتا جی کی مجھ پر بہت مہربانیاں ہیں" —— لیلا نے ہیڈ ماسٹر صاحب کو اداس دیکھ کر باتوں کا رخ بدلا، اور ان کا دل بہلانے کی کوشش کرنے لگی —— "ہیڈ ماسٹر صاحب! —— آپ شادی کیوں نہیں کر لیتے؟" —— لیلا نے کچھ دیر بعد کہا —— "نہ معلوم دل کیوں نہیں چاہتا" —— لیلا تو اب کچھ نہیں کہہ سکتی تھی۔ اس نے کہا "اچھا چلئے ہیڈ ماسٹر صاحب اب دیر ہو گئی" —— دونوں نے گھر کی راہ لی۔ شادی کی بات ہونے کی وجہ سے ہیڈ ماسٹر صاحب کو پھر لیلا کی حالت کا خیال آ گیا۔ وہ

بغور اس کی طرف دیکھنے لگے۔ وہ بار بار اپنے دل میں یہی کہہ رہے تھے "کیا یہ حسین و نوجوان دوشیزہ ودھوا ہو سکتی ہے؟ اف!" لیلا کے شوہر کو سورگباش ہوئے کافی عرصہ ہو چکا تھا۔ اس لئے لیلا انھیں بھول گئی تھی اور جہاں تک ہو سکے خوش رہنے کی کوشش کرتی تھی۔ ہیڈ ماسٹر صاحب نے اس کے معصوم چہرہ کی طرف دیکھا۔ بے اختیار آنسوؤں کے دو بڑے بڑے قطرے ان کے رخساروں پر ڈھلک آئے۔ لیکن انھوں نے جلد پھر اپنی حالت کو سدھار لیا ـــــ لیلا کسی خیال میں مست آہستہ آہستہ قدم بڑھا رہی تھی۔

(۸)

دوسرے دن ہیڈ ماسٹر صاحب نریندر سے ملے اور کھادی پرچار کمیٹی کے متعلق اپنا خیال ظاہر کیا۔ "آج کل ولایتی مال کی قدر اور مانگ بڑھ گئی ہے جس کی وجہ سے اپنے ملک کی صنعت خوابیدہ ہے۔ اب ہمیں اس کو جگانا چاہیے۔ فیشن پرستی کی وبا اس بری طرح پھیل چکی ہے کہ ایک بیس روپیہ تنخواہ والا بابو بھی فیشن پرستی میں مست نظر آتا ہے۔ اپنے ملک کی چیز خواہ وہ کتنی ہی اچھی کیوں نہ ہو ناپسند کرنے لگے ہیں۔ ہمیں چاہیئے کہ کھادی کا پروپگنڈہ خوب زور سے کریں تاکہ ان تمام لوگوں کی توجہ جو فیشن پرستی کی خاطر ولایتی مال استعمال کرتے ہیں ملکی صنعت کی طرف مبذول کر سکیں۔" ہیڈ ماسٹر صاحب نے کہا۔ "جی ہاں ـــــ آپ بالکل ٹھیک فرماتے ہیں۔ کیا آپ نے زمیندار صاحب سے اس کے بارے میں کہہ دیا ہے؟" نریندر نے دریافت کیا "ابھی تو نہیں۔ کہہ دوں گا آج۔ وہ ضرور اس میں دلچسپی لیں گے۔"

رات کا وقت ہے ہیڈ ماسٹر صاحب اپنے بستر پہ کروٹیں بدل رہے ہیں۔ انھیں نیند نہیں آرہی ہے۔ ان کی آنکھوں میں ان کے پروگرام کے نقشہ کے ساتھ ساتھ لیلا کا منوہر چہرہ بھی پھر رہا ہے۔ جیسے لیلا کا دل نازک تھا ویسے ہی ہیڈ ماسٹر صاحب کا دل تھا۔ وہ اس مظلوم بیوہ عورت کی دلی کیفیات کو اچھی طرح پہچان چکے تھے۔ اور اس لئے انھیں بیحد صدمہ ہو رہا تھا۔ وہ سوچ رہے تھے اگر اس کا خاوند مر گیا تو اس میں اس بچاری کا کیا قصور۔ کیوں نہ وہ دوسری شادی کر لے۔ بیوی اگر انتقال کر جائے تو مرد دوسری بلکہ تیسری اور چوتھی شادی بھی کر سکتا ہے۔ لیکن ایک معصوم دوشیزہ اپنے خاوند کے مرنے پر دوسری شادی نہیں کر سکتی! ـــــ کیا یہ سماج کا ظلم نہیں؟ ـــــ عورت اور مرد کو برابر حقوق ملنے چاہئیں ـــــ عورت کو کمزور نہ سمجھنا چاہیے۔ وقت آنے پر وہ شیرنی سے بھی بڑھ کر خوفناک بن جا سکتی ہے ـــــ اس میں بھی اتنی قوت ہے کہ وہ سماج سے اس کا بدلہ لے۔ وہ "دھرم" دھرم ہی نہیں جو مساوات کا قائل نہ ہو ـــــ غرض ہیڈ ماسٹر صاحب نے بڑی پریشانی میں رات کاٹی اور صبح ہونے پر ان کی آنکھ جھپک گئی ـــــ

آج انھیں مدرسہ جانے میں کچھ دیر ہو گئی۔ رات میں بہت دیر تک جاگنے کی وجہ سے ان کی خوش نما آنکھوں کے اطراف سیاہ حلقے پڑ گئے تھے۔ ایسا معلوم ہو رہا تھا کہ وہ بیمار ہیں۔ "سرکار! ـــــ کیا آپ کی طبیعت ناساز ہے؟" منشی جی نے دریافت کیا "ہاں ـــــ سر میں درد ہے" ـــــ ان کا دل آج کام میں نہیں لگ رہا تھا۔ وہ لیلا سے کچھ کہنا چاہتے تھے۔ (باقی آئندہ)

جے۔ آر۔ دیسائی

اطلاع :- سال ختم ہو رہا ہے۔ براہ کرم جن احباب نے اب تک چندہ نہیں دیا ہے تقسیم کنندہ سے باضابطہ رسید لے کر دیدیں یا دفتر ہذا پر روانہ فرما دیں۔

مہتمم

خواتین کی فرصت کے مشاغل

زندگی کا راستہ ہموار بہت کم لوگوں کے لیے ہوتا ہے۔ آرام و تکلیف اور نشیب و فراز کی زندگی، ایسا معلوم ہوتا ہے کہ بہت سوں کے نصیب میں لکھی ہوئی ہے۔ اس پر زندگی کے روز آنہ کاروبار اور ان کی یکسانیت، اسے اور بھی بدمزہ بنا دیتی ہے۔ ایک لوہار، صبح سے شام تک اور شام سے صبح تک، اگر اپنی دھونکنی دھونکتا رہے، یا ایک دفتر کا اہلکار دن بھر قلم گھستا رہے، یا کوئی گھر کی خاتون کھانے پکانے کے دھندوں میں گھری رہے، تو اسے زندگی سے جلد اکتا جانے کی نوبت آ جائے گی۔ اکثر دیکھا جاتا ہے کہ انسان کی طبیعت، غیر شعوری طور پر، مشاغل کو بدلتے رہنے کی طرف مائل ہے۔ ایک کام کے ساتھ ہی، دلچسپ کیوں نہ ہو۔ اس کو مسلسل کرتے رہیں تو ہماری طبیعت اکتا جاتی ہے۔

ہماری دلچسپی کے مشاغل، زندگی کی بے مزہ یکسانیت میں تنوع پیدا کرتے ہیں۔ ان سے، زندگی کے بے روح جسد میں، روح پیدا ہو جاتی ہے اور حیات کی بے رنگ تصویر، رنگین نظر آنے لگتی ہے۔ ایک ہی طرح کی مصروفیت سے، جو اکتاہٹ ہم پر طاری ہو سکتی ہے، وہ دور ہو جاتی ہے۔ اسی لئے خواتین کو، فرصت کے اوقات کے لئے، کوئی نہ کوئی دلچسپی کا مشغلہ پیدا کر لینا اور اسے زندگی کا جزو بنا لینا چاہیے۔

اس میں شک نہیں کہ گھر کی بیویوں کے کام کاج میں خاصا تنوع اور ان کی نوعیت میں خاصی افادیت ہوتی ہے۔ اور یہ بھی ممکن ہے کہ گھر کے سارے مشاغل بعض خواتین کے لئے دلچسپ ہوں۔ لیکن، یہ انسانی فطرت ہے کہ چیزوں کا زندگی کے روز آنہ نظام عمل میں داخل ہو جانا، خواہ وہ کیسی ہی دلچسپ کیوں نہ ہوں، انہیں بدمزہ بنا دیتا ہے۔ کوئی شخص، دلچسپی کی بدولت کبھی کبھی تو کھانے پکائے، تو وہ اپنے لطف پر ایک پیشہ ور ماما، یا باورچی کے رات دن چولہے میں جھلسنے کی بدمزگی کا اندازہ نہیں کر سکتا۔

غرض ہماری وہ بہنیں، جو زندگی کی یکسانیت اور بدمزگی کو محسوس کرتی ہیں، اور وہ بہنیں بھی، جن کو اس کا احساس نہیں ہے، سب کے لئے، اپنی فرصت کے اوقات کو کچھ ایسے مشاغل میں صرف کرنا مناسب ہے، جو ان کی طبیعت اور حالات کے مناسب ہوں، اور جن میں ان کو دلچسپی ہو۔ اس کے دو فائدے ہیں، ایک تو گھر کے کام کاج کا بار کم ہو جاتا ہے۔ دوسرے فرصت کا وقت مفید اور پسندیدہ کاموں میں صرف ہو سکتا ہے۔

مشاغل بہت سے ہو سکتے ہیں، لیکن اس بات کا خیال رکھنا چاہیے کہ جہاں تک ہو سکے، ان کا کوئی مفید مقصد بھی ہو۔ بغیر مقصد کے زندگی کی کوئی چیز اپنی صحیح جگہ نہیں بیٹھ سکتی۔ ہر ایسی قوم میں، جسے اپنی ترقی اور خوش حالی کا خیال ہوتا ہے، عورتیں بھی اپنی ذمہ داری کا پورا احساس رکھتی ہیں۔ وہ سمجھتی ہیں کہ روپیہ کی طرح وقت بھی ایک قومی دولت ہے۔ اسے ایسے مشاغل میں صرف نہ کرنا چاہیے جن کا فائدہ کچھ نہ ہو اور نقصان ہر طرح کا ہو۔

عموماً دیکھا جاتا ہے کہ امیر خاندانوں اور بعض وقت متوسط گھرانے کی بیبیاں بھی سب سے زیادہ دلچسپ مشغلہ، سینما دیکھنا سمجھتی ہیں، جہاں فرصت ملی کہ وہ سینما کے ٹکٹ گھر پر پہرہ دینے کے لئے پہنچ جاتی ہیں۔ یہ عادت اب وبا کی طرح پھیل رہی ہے اور اس سے جو اثرات ہماری قوم کے نوجوان لڑکوں سے گزر کر لڑکیوں اور بعض وقت بڑی بوڑھی عورتوں پر بھی پڑ رہے ہیں، وہ ناقابل اصلاح بنتے جا رہے ہیں۔ کسی زمانے میں نئے نئے اوضاع اور انداز لباس کی تراش خراش، بات چیت کے انداز، اٹھنے بیٹھنے کے آداب، زیور، غرض ہر بات میں شریف خاندانوں کی روشن خیال عورتیں نمونہ سمجھی جاتی تھیں اور انہی سے نئے نئے طریقے اور وضعداری کے لوازم خواتین میں نقل کئے جاتے تھے، لیکن اب ہمارا قبلہ بدل گیا ہے۔ ہماری نوجوان لڑکیوں کی

نظریں اب سینما کی شخصیتوں پر جمی ہوئی ہیں اور وضعداری کی ساری کائنات وہیں سے نقل کرنے کی کوشش کی جاتی ہے۔

اس طرح کی عادت میں، جو اخلاقی برائیاں ہیں ان کو چھوڑ کر بھی عملی اعتبار سے ہم کو سوچنا چاہیے کہ سینما کی نظر فریبیاں سیمیائی جلوے ہیں جو ہماری عملی زندگی سے کبھی مطابق نہیں ہو سکتے۔ ایسے تمام مشاغل جن سے ہماری عملیت فنا ہو جائے، بچنے کے قابل ہیں۔

اس معاملے میں ہم کو بعض ایسی قوموں کی عورتوں سے سبق سیکھنا چاہیے جنھوں نے زندگی کے مقصد کو سمجھا ہے اور جو وقت کی قیمت سے واقف ہیں۔ ان میں جاپانی عورتوں کا طریقہ ہمارے لئے قابل تقلید ہو سکتا ہے جن کے دلچسپی کے مشاغل اور جن کے بچوں کے کھیل بھی کوئی نہ کوئی مفید پہلو رکھتے ہیں۔ ہم نے ایک ہوٹل میں ایک جاپانی بچے کا کھیل دیکھا تھا وہ دو تین تیلیوں اور سفید آٹے کی مانند مادہ سے مورتیں بنا رہا تھا۔ ہم کو دیکھ کر اس نے اور بھی توجہ سے مورت بنانی شروع کی۔ بات کی بات میں ایک اچھی خاصی تپلی تیار ہو گئی جس کے ہاتھ میں ایک چھتری بھی تھی۔ پھر دو تین جگہ رنگ لگا کر اس نے ایسی تپلی تیار کر دی جیسی ہم بازاروں میں دیکھتے ہیں۔ ہم نے وہ تپلی چار آنے میں خرید لی جو سو کھنے کے بعد اچھی خاصی نمائشی چیز بن گئی۔

دلچسپی کے مشاغل میں کاروباری احساس، اس میں شک نہیں کہ ان کے لطف اور مزہ کو برباد کر دیتا ہے، لیکن پھر بھی ہم کو اس کا خیال رکھنا چاہیے کہ محض بیکار اور نقصان دہ مشاغل سے دور رہیں۔ قدیم زمانے کی مرغ بازی، بلبل بازی یا بٹیر بازی کے مشاغل اسی طرح کے نقصان دہ مشاغل تھے جن سے ہماری قوم کو بہت کچھ کھونا پڑا۔

اچھے صحت بخش اور مفید مشاغل کی طرف مائل کرنے کے لئے اس بات کی ضرورت ہے کہ بچپن ہی سے بچوں کے اطراف ایسی چیزیں جمع کی جائیں جو انھیں مفید مشاغل کی طرف مائل کر سکیں۔ بچپن کا یہ میلان، بعد میں طبیعت ثانی بن جائے گا۔ بچیوں کے لئے، سینے پرونے گھر کی صفائی اور سلیقہ کی عادت ڈالنے والی چیزیں ضروری ہیں۔ ان کے علاوہ کشیدہ کاڑھنے، سلائیوں سے اونی چیزیں بنانے سوزن کاری وغیرہ کی اشیا بھی مہیا رکھی جا سکتی ہیں۔ لیکن تاکید سے کسی کام کی طرف متوجہ کرنے کی بجائے، مثال اور ترغیب سے مائل کرنا بہتر ہے، کیونکہ جہاں مجبوری کا شائبہ پیدا ہو گیا پھر اس کام سے دلچسپی جاتی رہتی ہے۔

ہمارے زمانے میں کئی دلچسپی کے مشاغل ایسے ہیں جو مغربی زندگی کے ساتھ یہاں آئے ہیں۔ مثلاً کام میں لائے ہوئے اسٹامپ جمع کرنا۔ پرانی اور نادر دست کاریوں کے نمونے فراہم کرنا جیسے چینی، کانچ یا بلوری چیزیں یا برتن اور سکے وغیرہ۔ پرانے اسٹامپ جمع کرنے کے لئے ہم کو بہت زیادہ محنت نہیں کرنی پڑتی، ملنے جلنے والوں کے پاس جو خطوط آتے ہیں ان کے اسٹامپ ہم آسانی سے جمع کر سکتے ہیں۔ انہی میں بعض وقت ایسے انوکھے اسٹامپ بھی ہم کو مل جائیں گے، جن کی بڑی قیمت ہوتی ہے۔ اسی طرح اگر ہم کو تلاش ہو تو دست کاریوں کے پرانے نمونے بھی ہم جمع کر سکتے ہیں جن سے ہم کو بعض وقت بہت فائدہ حاصل ہو سکتا ہے۔

بعض دست کاریاں ایسی ہیں جو دلچسپی کے مشاغل میں داخل ہو سکتی ہیں، مثلاً مٹھائیاں بنانا، مربے اور اچار تیار کرنا یا بیکار اور پھینکنے کی چیزوں کو جمع کرکے ان سے کام کی چیزیں تیار کرنا وغیرہ۔ آج کل کا زمانہ صنعتی برتری کا زمانہ ہے جس قوم کی عورتیں، بچے اور مرد، وقت، پیسہ اور توانائی کو کم سے کم ضائع ہونے دیتے ہیں، وہی خوش حالی اور عزت کی زندگی بسر کر سکتے ہیں۔ خاص طور پر موجودہ جنگ کی تباہ کاریوں نے، زندگی کو بچیدہ

شکل بنادیا ہے۔ ذرا ذرا سی چیزوں میں، ہم احتیاط سے کام لیکر نہ صرف گھر کے اخراجات گھٹا سکتے ہیں، بلکہ قومی خوش حالی میں بھی ہاتھ بٹا سکتے ہیں۔

ہماری روزمرہ کی زندگی میں، ہزاروں چیزیں ایسی ہیں جو بے کار سمجھ کر پھینک دی جاتی ہیں جن بہنوں کے پاس موٹر ہے اس کے مشین کو صاف کرنے کے لئے کتنے تاگے کے گچھے ہر مہینے صرف ہوتے ہیں جو بعد میں بے کار سمجھ کر پھینک دیے جاتے ہیں۔ کتنے میوے سڑ گل کر خراب ہو جاتے ہیں یا ان کے پس خوردہ حصے جیسے لیمو، سنترہ، نارنگی وغیرہ کے چھلکے، کام میں لائے ہوئے پھول، درختوں کے پتے سپھالیں وغیرہ، ہر گھر میں روزآنہ ضائع ہوتی ہیں۔ حالانکہ ذرا سی دلچسپی سے ان کو مفید کام میں لایا جاسکتا ہے۔ مثلاً پھینکے ہوئے تاگے کے گچھے، کاسٹک سوڈے کے پانی میں غوطہ دے کر، صاف کئے جاسکتے ہیں اور ان سے پھر کام لیا جاسکتا ہے۔ درختوں کے پتوں کو جمع کرکے عمدہ کھاد تیار کی جاسکتی ہے۔ لیمو، نارنگی اور سنترے کے چھلکے جمع کرکے، ان سے بیش قیمت تیل نکالا جاسکتا ہے۔ خانہ باغ سے نکلے ہوئے یا استعمال کئے ہوئے پھولوں کو پھینک دینے کی بجائے، ان کو جمع کرکے، تل وغیرہ میں رکھ دیں اور اٹھارہ یا بیس گھنٹوں کے بعد، تل کو معمولی لکڑی کے گھانے میں دباکر، خوشبودار تیل نکالا جاسکتا ہے۔ گھاس کی پتیاں، روسہ یا خس کا عطر بنانے کے لئے کام میں لائی جاسکتی ہیں۔ مٹھائیاں، جام اور مربے تیار کرنے کی ترکیبیں اکثر خواتین کو معلوم ہوں گی، لیکن دلچسپی نہ ہونے سے یا سستی کی وجہ سے یا ایسے کاموں کو اپنے مرتبے سے ادنیٰ سمجھ کر فائدہ نہیں اٹھایا جاتا اور اس زمانے میں بھی جب کہ آسٹریلیا اور کنیڈا وغیرہ سے جام اور مربے آنے موقوف ہو گئے ہیں، دُگنے تگنے بلکہ چوگنے دام دے کر بھی انھیں بازار سے خریدنا پسند ہوتا ہے لیکن ہاتھ ہلانا گوارا نہیں ہوتا۔ اپنی ان عادتوں کی وجہ سے ہم بہت گھاٹے میں رہتے ہیں۔ اگر ہم یہ محسوس کرلیں کہ ان ہی از کار رفتہ چیزوں کو کام میں لاکر دنیا کی ہشیار قومیں کتنی دولت کما رہی ہیں تو شاید ہم اس طرح آنکھ بند کرکے زندگی گزارنے کی عادت ترک کردیں۔ ہم کو یہ اچھی طرح محسوس کرلینا چاہئے کہ موجودہ جنگ کی بدولت زندگی کی ساری واقعی یا خیالی قیمتیں درہم برہم ہوگئی ہیں۔ ایسی حالت میں معمولی طور پر ہماری سستی یا غفلت سے ہم کو جو تھوڑا سا نقصان پہنچ سکتا تھا وہ اب کئی گناہ زیادہ ہو گیا ہے۔

محمودہ صدیقی

گلگشت

کل سحر سے شام تک جب کیفِ پنہاں تھا عیاں
ہمنشیں کیا تھا نہ پوچھ "عثمان ساگر" کا سماں

اس قدر ضربیں پڑی تھیں شوق کی ادراک پر
اک قدم تھا فرش پر اور اک قدم افلاک پر!

اس قدر مسحور تھا مسرور تھا سرشار تھا
نیند سی آئی ہوئی تھی، ہوش سے بیزار تھا

روح کی سرشاریوں میں چھپ گئی تھی زندگی
اک سریلا گیت گویا بن گئی تھی زندگی!

ایک ہم کیا، ہاں زمین و آسماں سرشار تھے
آسماں پر بادلوں کے کارواں سرشار تھے!

ہائے وہ دھندلی فضا اُف وہ جھڑی برسات کی
صبح میں حل ہو گئی تھی جلوہ کاری رات کی!

وہ نرالا کیف، نامعلوم احساسِ حسیں
بانسری سی ہر طرف بجتی تھی گویا ہمنشیں!

گدگدی کرتا تھا جاں افروز جھولوں کا جمال
چٹکیاں لیتا تھا دل میں بھیگ جانے کا خیال!

مست تھا میں، میرے ساتھی، مست تھی کل کائنات
ضو فشاں برسات کے کہرے میں تھی شمعِ حیات!!

نور کا سامان تھا، "تابندگی کا رقصِ تھا
بوندیوں کا رقص تھا یا زندگی کا رقص تھا!

کھیلتے پھرتے تھے "صحن باغ" میں یوں بےخطر
جیسے سچ مچ زندگی کے درد سے تھے بےخبر!!

ہائے وہ مسرور دوڑیں ہائے وہ شاداب کھیل
زندگی کے خواب میں وہ بے نیازِ خواب کھیل!

اف وہ حامد کے سہانے گیت وہ رقص کمال
ایک سرتاپا مسرت ایک سرتاپا خیال!

وہ تہاجر کی ادائے ناز، نازوں کا جمال
گاہ تصویرِ محبت گاہ تفسیرِ جلال!

وہ چمن کی طرح کھلتا رنگِ اندازِ منیر
قہقہوں کی گونج میں یا رنج و درد و غم، اسیر!

دیکھ کر شادابیِ طرزِ عنایاتِ عظیم
ہر قدم پر یاد آتا تھا ہمیں لطفِ کریم

اِس طرف وہ سیف کا پیہم مزاجِ "دل شکار"
اُس طرف وہ حضرتِ معروف کی شانِ وقار!

اِس طرف سردار کی وہ بے قراری کا قرار
اُس طرف نشتر کے نشترِ فضل کے سینے کے پار!!

اِس طرف چشمِ آسد کی وہ ادائے شرمگیں
اُس طرف صد حشر ساماں لغزشِ پائے متیں!

مختصر یہ ہے کہ دنیا حشر برپا ہو گئی
حضرتِ سعدی کی "خاموشی" بھی گویا ہو گئی!

آہ اس دنیا میں، ایسی "بزم" یہ خوش فعلیاں
جیسے سبزے پر چمکتی ہوں روپہلی بوندیاں!!

جبرئیلِ شوق کے نغمے تھے، اپنا ساز تھا!
فکر کیا انجام کی۔ آغاز ہی آغاز تھا!!

نظر حیدرآبادی

تاج محل

ریحانہ نے محبت پاش نظروں سے انور کا خیر مقدم کیا۔ انور اپنے کمرے میں داخل ہوا اور پیار کے لہجے میں ریحانہ سے پوچھا: "روحی بیجا! تو ہم تمھارے لئے کیا لائے ہیں؟" "ہم کیا جانیں آپ کیا لائے ہیں۔ ہم کوئی نجومی تو نہیں، جو غیب کا علم جانیں۔" ریحانہ نے معصومانہ انداز میں کہا۔ اس کی نظریں کھڑکی کے باہر بادلوں کے سمندر میں تیرتے ہوئے چاند پر تھیں۔ "ہم بتائیں" سنگ مرمر کے تاج محل کو انور نے میز پر رکھتے ہوئے کہا۔ "ریحانہ یہ تمھارا تحفہ ہے۔" ہلکی سفید چاندنی کھڑکی کی راہ سے کمرے کے فرش پر گر رہی تھی۔ ٹھنڈی ہوا کے ہلکے ہلکے جھونکے چل رہے تھے۔ سامنے رکھا ہوا تاج محل حسن و عشق کا خواب آگیں مجسمہ اپنی خاموش زبان میں صنم خانۂ محبت کے بتوں کو ماضی کے حسین لمحات کی یاد دلا رہا تھا جس کے مزار میں محبت کا ایک لافانی شاہکار مدفون تھا جس کی معصوم روح نور کا جامہ پہن کر ایک عجیب شان کے ساتھ تاج محل پر سایہ فگن تھی۔ انور نے ریحانہ کا ہاتھ اپنے ہاتھ میں لیا اور کہا: "روحی میں تم سے کئی سو میل دور جا رہا ہوں۔ یہ ہماری پاک محبت کا یادگار تحفہ ہے۔ میں تم سے بہت دور رہوں گا۔ ہماری روحیں ایک دوسرے سے پیوست رہیں گی۔ ہماری نگاہیں آڑے کے سارے پردوں کو ہٹا کر ایک دوسرے کو دیکھیں گی۔ میں وہاں ہوں گا لیکن میرا دل تم میں ہوگا اور میری نظروں میں تم ہوں گی۔" ریحانہ کی نیچی نظریں، مقدس محبت کا اعتراف کر رہی تھیں جب اس نے اپنی نظریں انور کی طرف اٹھائیں تو اس کی نازک آنکھوں سے آنسو بہہ رہے تھے۔ اس نے اپنے جذبات کو انتہائی ضبط سے برداشت کیا۔

انور ریحانہ کا چچیرا بھائی تھا۔ دونوں میں بڑا پیار تھا۔ انور کو تعلیم کی غرض سے علیگڑھ جانا پڑا۔ اس کا دل دھڑک رہا تھا۔ وہ جانے پر مجبور تھا۔ دوسرے روز وہ چلا گیا اور برابر ریحانہ کو خط لکھتا رہا۔ چند ماہ گزر گئے۔ ریحانہ کے والدین ریحانہ کی شادی کی فکر میں رہنے لگے۔ اس کو شادی کے لئے مجبور بھی کرنے لگے۔ وہ کئی ماہ تک ٹالتی رہی۔ وہ چاہتی تھی کہ انور جلد تعلیم سے فارغ ہو جائے تو ان ساری الجھنوں کا خود بخود خاتمہ ہو جائے گا۔ انور کی تعلیم کا اب آخری سال تھا۔ آج کل دونوں خاندانوں میں ضرورت سے زیادہ دشمنی بڑھ گئی تھی۔ ریحانہ کو شادی کے لئے ضرورت سے زیادہ مجبور کیا جانے لگا۔ ہندوستان میں پلی ہوئی مقدس ہستی مصیبتوں میں گھر گئی۔ اس کو ایک طرف انور کا خیال تھا دوسری طرف خاندان کا اصرار اور سوسائٹی کے طعن و تشنیع کا لحاظ۔ وہ ان دونوں میں سے کس کا ساتھ دے؟ اس کے سامنے ایک پیچیدہ سوال تھا۔

ریحانہ کے والد چاہتے تھے کہ جہاں تک ہو سکے اپنی بیٹی کے کارِ نیک سے جلد فارغ ہو جائے۔ ادھر انور کے والدین نے بھی خاموشی اختیار کی۔ انور ان ساری الجھنوں سے ناواقف تھا۔ اس کو صرف اپنی تعلیم کی فکر تھی۔ تاکہ علم کے خزانہ سے اپنی زندگی کی مسند کو سنوارے۔ ریحانہ کے ساتھ کامیاب زندگی بسر کر سکے۔ وہ اپنی ساری توجہ امتحان کی تیاری میں صرف کرنے لگا۔ وہ کئی ہفتوں سے اپنے گھر خط نہ لکھ سکا۔ ان ہی ہنگاموں میں ریحانہ کی شادی کسی دوسرے دولت مند شخص سے ہوگئی۔ شادی کے وقت ریحانہ کی جو حالت تھی وہ ناقابلِ بیان تھی۔ اس نے اپنے گوشت پوست سے بنے ہوئے حسین مجسمہ کو دولت کے ہاتھ فروخت کرنا منظور کر لیا۔ اس کی روح اب بھی آزاد تھی جو کسی اور کی تھی۔

امتحان کے بعد انور گھر واپس ہوا۔ سارے گھر میں ایک ہلچل تھی

دیکھی۔ کچھ دیر تک وہ انقلابی ماحول کو پہچان نہ سکا۔ اس کی نظریں عزیز و اقارب کے علاوہ کسی اور کے دیدار کی متلاشی تھیں۔ وہ مجسمہ اب وہاں نہ تھا کہ اس کو زیارت نصیب ہوتی وہ تو کسی اور کے ہاتھ فروخت ہو چکا تھا۔ وہ محسوس کر رہا تھا کہ اس کے غیاب میں ایک خوفناک ڈراما کھیلا جا چکا ہے اور عنقریب تاریکیوں کے پردوں میں سے ایک ہیبتناک واقعہ کا ظہور ہوگا۔ اس کا خیال ٹھیک نکلا۔ اس نے انتظار سے مایوس ہو کر پوچھا۔ "ریحانہ کہاں ہے؟" انور کی چھوٹی بہن نے جو اپنی عمر کے لحاظ سے معصومیت کی گود میں پرورش پا رہی تھی اپنی تتلی زبان میں کہا "بھائی جان وہ تو اپنے دولھے کے ہاں ہیں۔" بہن کے یہ الفاظ انور کے لئے تیروں سے کم نہ تھے!

اس نے انتہائی ضبط سے اس خبر کو سنا اور چپ ہو رہا۔ کتنی حسین امیدوں کے ساتھ اس نے علم کے مدارج طے کئے اور کن ارمانوں کی چھاؤں میں اس نے اپنے وطن میں قدم رکھا۔ اس خبر کے سننے کے بعد اس کی دنیا بدل گئی۔ چند دن بعد لوگوں نے سنا اور عزیز و اقارب نے دیکھا کہ انور فوج میں بھرتی ہو کر میدان جنگ میں چلا گیا۔ کوئی شخص بھی اس کو اس کے اٹل ارادے سے باز نہ رکھ سکا۔ زندگی اور موت اس کے نزدیک ایک بے حقیقت چیز تھی۔

شادی کے بعد ریحانہ کا حسین و شگفتہ چہرہ کملانے لگا۔ اس کا خوبصورت سڈول جسم کانٹا بن گیا۔ وہ معصوم بڑی بڑی آنکھیں جن میں ہمیشہ خوشی اور شادمانی کھیلتی رہتی تھی اب آنسوؤں کی چشمہ تھیں۔ اس کی سریلی آواز جو ہمیشہ نغمے برسایا کرتی تھی اب خاموش تھی وہ پتلی پتلی انگلیاں جو ہارمونیم پر ناچتی تھیں اب بیکار تھیں۔ ساز ٹوٹ چکا تھا۔

قانون قدرت کے مطابق دنیا کے سارے کام چلتے رہے۔ وہ گھر کا کام کاج کرتی، شوہر کی خدمت اور بچوں کی پرورش اس کا فرض تھا۔ دنیا یہ دیکھ رہی تھی کہ ایک مشین ہے جو برابر اپنا کام وقت پر کئے جا رہی ہے۔ ہنسی، قہقہہ اس سے کوسوں دور تھے۔ وہ خوشی کی گفتگو میں بہت کم حصہ لیتی اور شوہر سے بھی زیادہ بولتی نہ تھی۔ اس کا شوہر زمانہ حال کا ایک تعلیم یافتہ خوش رو نوجوان تھا۔ جو سینما کے پردوں پر تھرکتی ہوئی یا متمدن سوسائٹی کی بے پردہ ناچتی ہوئی تیتریوں کی طرح اپنی بیوی کو بھی دیکھنا چاہتا تھا۔ جب وہ گھر میں داخل ہوتا اور ریحانہ کو کوئی کتاب پڑھتے دیکھتا تو اس کے دل پر سانپ لوٹتے۔ اس کی آنکھوں میں دل کے زخم سانس لیتے۔ وہ جانتا تھا کہ اس کی بیوی بھی ہر شام اس کے ساتھ تفریح کرے۔ سینما گھر چلے جب وہ دفتر سے تھک کر گھر آئے تو اپنی سریلی آواز سے اس کی تھکن دور کرے۔ معلوم نہیں اس کے دل میں اور کیا کیا ارمان تھے۔ وہ اپنے جذبات کا اظہار ریحانہ کے سامنے کرے جب اس کو شوہر سے محبت نہ تھی تو شادی ہی کیوں کی۔؟ کیونکہ اس نے دوسرے کی زندگی تباہ کی؟ سوالات کی ریل گاڑی تھی جو اس کے دماغ کی پٹریوں پر دوڑ رہی تھی۔

آج کے دن کے کھیل میں اس نے موجودہ زمانہ کی فیشن پرستی اور ازدواجی زندگی کا بہترین نقشہ دیکھا تھا۔ راستہ تمام یہ دھن اس کے سر پر سوار رہی کہ کب گھر پہنچے اور کب ریحانہ کو اپنے فیصلے سے آگاہ کرے۔ اس کے تخیلات کے فانوس میں کھیل کا سارا نقشہ گھومنے لگا۔ جب کھیل کے سین کا یہ نقشہ اس کی نظروں کے سامنے آتا تو ایک کپکپی اس کے جسم میں دوڑ جاتی —— کس طرح ایک لڑکی نے اپنے شوہر کو اپنا زنانی لباس پہنا دیا اور خود شیروانی پہن لی پھر دونوں آئینہ کے سامنے کھڑے ہو گئے۔ عین وقت پر ایک سہیلی کا آنا۔ آہ کتنی پیاری اور کتنی رومانی زندگی تھی ان دونوں کی۔ اس خیال سے اس کے دل پر ہتھوڑے پڑنے لگے۔ وہ ان ہی خیالات کی

رو میں بہتا ہوا گھر میں داخل ہوا۔ بیوی کرسی پر لیٹی ہوئی کتاب پڑھ رہی تھی۔ سراج تیز تیز ریحانہ کے کمرے میں داخل ہوا۔ ریحانہ کی نظریں کتاب سے ہٹ کر اپنے شوہر پر جم گئیں۔ وہ خاموش انہیں دیکھ رہی تھی۔ سراج غصہ سے ریحانہ کی طرف تکنے لگا۔ "کیوں خیریت تو ہے۔ آج ذرا تیز معلوم ہوتے ہیں آپ"۔ "بس خاموش رہو۔ بہت اٹھایا ناز جب ایسا ہی تھا تو تم نے مجھ سے شادی ہی کیوں کی۔ جب تم کو کتابوں سے عشق تھا تو میری زندگی کیوں اداس، پھیکی، بے مزہ بنا ڈالی ——" "آخر چاہتے کیا ہیں آپ مجھ سے ——" "تم کو اپنا طرز بدلنا ہوگا۔ ورنہ موجودہ صورت میں مجھ سے تمھارا نباہ نہ ہو سکے گا ——" "میں نے آپ کو منع کب کیا ہے۔ خوشی سے آپ اپنی دوسری شادی کر سکتے ہیں۔ میں نے آپ کو کئی دفعہ کہا بھی۔ پھر کیوں خواہ مخواہ آپ مجھ پر بگڑتے ہیں۔ میں آپ کا سارا کام کرتی ہوں۔ پھر بھی آپ کو مجھ سے شکایت ہے ——" "بس رہنے دو آپ کا کام آپ کا دماغ۔ میں کچھ اور چاہتا ہوں۔ میں اپنے جذبات کا خون نہیں کرنا چاہتا۔ تم کو میرے اشاروں پر چلنا ہوگا ——" یہ گفتگو ہو رہی تھی کہ باہر سے موٹر کی آواز سنائی دی۔ تھوڑی ہی دیر بعد ایک نوجوان فیشن ایبل لڑکی کمرے میں داخل ہوئی۔ سراج کی نظریں متمدن سوسائٹی کی نورس کلی پر جم گئیں۔ "کتنی حسین ہے وہ" اس کی نظریں حسن کی بلائیں لے رہی تھیں۔ وہ ریحانہ کی سہیلی ذکیہ تھی۔ کالج میں تعلیم پائی تھی اور جہاں اسے آزادی کے پر ملے تھے۔ وہ بے لگام بے حجاب موٹر میں اڑاتی ہوئی پھرتی تھی۔ نئی روشنی کی علمبردار ذکیہ ریحانہ کو اپنے ساتھ کہیں لیجانے کے لئے آئی تھی۔

جن للچائی نظروں سے سراج نے ذکیہ کا خیر مقدم کیا ریحانہ سے چھپ نہ سکا۔ وہ اپنی سہیلی کے ساتھ جانے کے لئے تیار ہو گئی۔

دونوں سہیلیاں موٹر میں بیٹھ گئیں۔ ریحانہ نے اپنے شوہر کو آواز دی اور کہنے لگی۔ "آپ کو سکندرآباد تک جانا ہے نا۔ آئیے ہم آپ کو چھوڑ دیتے ہیں۔" سراج فوراً تیار ہو گئے۔ ریحانہ شرم و حیا کی پتلی تھی اپنی سہیلی کی طرح بے حجاب نہ تھی۔ ذکیہ موٹر چلا رہی تھی۔ سراج اس کے پہلو میں بیٹھے ہوئے تھے۔ ٹھنڈی ہوا کے جھونکے۔ ناز و خوبصورت لڑکی۔ شام کا سہانا وقت، سراج کو اور کیا چاہیے موٹر بھاگ رہی تھی جب کبھی گاڑی ہچکولے کھاتی تو سراج بری طرح پھسل کر خوبصورت جسم سے ٹکرا جاتے۔ موٹر ساٹھ میل کی رفتار سے دوڑ رہی تھی اچانک ایک بھینس موٹر کے سامنے آگئی۔ سراج نے عجیب پھرتی کے ساتھ موٹر کا اسٹرنگ گھما دیا۔ اس ایک لمحے میں اس کا ہاتھ خاتون کے ہاتھ سے چھو گیا۔ لمس کے ساتھ ہی بجلی کی لہر جسم میں دوڑ گئی۔

رفتہ رفتہ ذکیہ کی آمد و رفت ریحانہ کے ہاں ہونے لگی۔ ریحانہ کو خفیف حرارت بھی آنے لگی۔ جان بوجھ کر سراج نے ریحانہ کے علاج سے لاپروائی اختیار کی۔ اس کا عزیز وقت اور روپیہ ذکیہ کی نازبرداریوں میں صرف ہونے لگا۔ ریحانہ کی دوررس نظریں سراج کی بدلتی ہوئی تیوریوں کو دیکھ رہی تھیں۔ وہ خاموش تھی۔ وہ جانتی تھی کہ جہاں تک جلد ہو سکے ان الجھنوں کا خاتمہ ہو جائے۔

ایک رات جب کہ ریحانہ کی طبیعت میں شدت کی بے چینی تھی مسٹر سراج کا کہیں پتہ نہ تھا۔ شاید وہ سینما سے ابھی واپس نہ آئے تھے۔ موت کے آخری وقت اس کی نظریں سامنے رکھے ہوئے "تاج محل" پر تھیں۔ اسی کی دھندلی نظروں میں ماضی کا وہ سارا سہانا نقشہ پھر گیا۔ میز کا کنارا، تاج محل کے ایک طرف انور دوسری طرف ریحانہ۔ محبت کا مقدس اقرار —— آہستہ آہستہ اس کی آنکھوں کی بینائی سفید تاج محل میں پیوست

ہونے لگی۔ کچھ دیر بعد بے نور آنکھیں چھت سے لگ گئیں اور روح پرواز ہوگئی۔

یہ ایک المیہ کہانی تھی جو مجھے "تاج محل" کے مجسمہ میں سے دستیاب ہوئی یہ "تاج محل" کشتگانِ محبت کی آخری یادگار مجھے ہراج میں ملا۔ میں نے اسے اپنی بہن کو تحفہ دیا وہ اس "محل" کو لے کر خوش خوش اچھے کمرے میں بھاگنے لگی۔ پاؤں پھسل گیا، ہاتھ سے "تاج محل" چھوٹ کر ٹکڑے ٹکڑے ہوگیا۔ لڑکی نے ان ٹکڑوں کو جمع کیا جو فرش پر پھیلے ہوئے تھے۔ ان میں سے ایک کاغذ بھی ملا۔ جس پر اس کہانی کے موتی بکھرے ہوئے تھے۔ میں نے ان بکھرے ہوئے موتیوں کو افسانہ بنا دیا۔

سید محی الدین احمد

ہلالِ عید

اے مہِ نو آشنائے گردشِ لیل و نہار — عظمتِ تہذیبِ رفتہ کا ہے تو آئینہ دار

قسمتِ اقوامِ عالم تجھ سے وابستہ رہی — ملتِ بیضا کا دنیا میں رہا تجھ سے وقار

تو کہ عنوانِ تمنائے دلِ خاموش ہے — ہر زمانے میں رہا دنیا کو تیرا انتظار

جاگ اٹھے پھر سے ارماں سینۂ صد چاک میں — فطرتِ افسردہ کو دی زندگانی کی بہار

پرتوِ رنگیں سے رنگیں ہے فضائے دو جہاں — مسکراتی سی ہوائیں، گنگناتے آبشار

کچھ حسیں منظر نظر میں کچھ نظر حسن آفریں — کچھ بہاروں کا تبسم، کچھ تبسم کی بہار

پھر مسرت لے رہی ہے جھوم کر انگڑائیاں — زندگی پھر ہو رہی ہے ولولوں سے ہمکنار

ولولے پھر دے رہے ہیں زندگانی کا پیام

زندگانی، شادمانی، کامرانی کا پیام

ظفر

گل بوٹے

حال ہی میں ہمیں ایک "انوکھی انجمن" کی معتمد صاحبہ سے ملاقات کا شرف حاصل ہوا، اس انجمن کا نام ہے "انجمن انسداد بے رحمی برنسواں"۔ کوئی چھ مہینے ہوتے ہیں کہ اس کا صدر دفتر ہندستان کے دارالسلطنت میں قائم ہوا ہے۔ اس قلیل مدت میں ملک کے طول و عرض میں اس انجمن کی کئی شاخیں قائم ہو چکی ہیں، حیدرآباد کی شاخ کی تنظیم کے سلسلے میں معتمد صاحبہ تشریف لائی ہیں، انجمن کے اغراض و مقاصد اس کے نام سے ظاہر ہیں، انجمن کی مجلس عاملہ نے شوہروں کے نام جو "احکام عشرہ" نافذ کئے ہیں وہ بہت دلچسپ ہیں اور اس قابل ہیں کہ انہیں فریم کر کے ہر بیاہا اور ان بیاہا شخص اپنے آفس روم، ڈرائنگ روم اور بڈ روم میں لٹکائے، یہ اہم اور ضروری احکام ذیل میں ہدیۂ ناظرین کئے جاتے ہیں۔

(۱) "تیری بیوی اپنے والدین، اپنے متعلقین اور اپنی سہیلیوں سے جدا ہو کر تجھ سے وابستہ ہو گئی ہے، اس کی دلجوئی اور دلداری کرنا تو اپنی شان شوہری کے منافی خیال نہ کر، اس کی جائز خواہشوں کو حتی الامکان پورا کر، تیرے سوا اب اس کا دنیا میں کوئی نہیں ہے، تو اس کے لئے سب کچھ بن جا، اس کو یہ محسوس نہ ہونے دے کہ وہ ایک اجنبی کے پالے پڑی ہے، اس کے ساتھ اس طرح برتاؤ کر کہ وہ تیری "خادمہ" بن کر تیری خدمت کرنا اپنا فرض سمجھے، اس کو اپنی زندگی کا جزو بنالے اور اس کے دل میں اس طرح سما جا کہ وہ پکار اٹھے

"جدھر دیکھتی ہوں ادھر تو ہی تو ہے"!!

(۲) تیری بیوی کے کچھ عزیز و اقارب بھی ہیں اور کچھ سہیلیاں بھی، ان سب کے ساتھ اس طرح برتاؤ کر کہ وہ تجھ کو اپنے خاندان کا ایک فرد سمجھنے لگیں، اس کے بزرگوں کا ادب و احترام اس طرح کر کہ گویا وہ تیرے بھی بزرگ ہیں اور کبھی موقع آئے تو ان کی اسی طرح خدمت بھی کر، دنیا میں ایک دوسرے کے کام آنا بڑی انسانیت ہے، یہ جوہر جس میں نہیں وہ "انسان" کہلانے کا مستحق نہیں، بغیر کسی ناتے رشتے کے جب یہ فرض انسان پر عائد کیا گیا ہے تو تیری بیوی کے عزیزوں اور سہیلیوں کا تجھ پر بڑا حق ہے۔

(۳) یہ واقعہ ہے کہ دنیا میں انسان کی ہر توقع پوری نہیں ہوتی، اگر تیری بیوی تیری توقعات سے کچھ کم ہے تو کیا مضائقہ ہے، خدا کا شکر کر کہ دوسری سیکڑوں بیویوں سے تو بہتر ہے۔ انسان عیب سے خالی نہیں ہوتا۔ تیری بیوی بھی ایک انسان ہی ہے، فرشتہ نہیں، تو اس کو اگر "فرشتہ" دیکھنا چاہتا ہے تو تیری یہ امید کبھی پوری نہیں ہو سکتی، اس کی اچھائیوں اور برائیوں کو تول اور دیکھ کہ پلہ کس طرف جھکتا ہے، اگر تو ٹھیک ٹھیک موازنہ کرے تو ممکن ہے اس کی اچھائیاں برائیوں سے زیادہ ہوں۔

(۴) جس طرح تیری محبت بڑھتی گھٹتی رہتی ہے اسی طرح تیری بیوی کی محبت میں بھی تغیر ہو سکتا ہے۔ "محبت" محبت کو پیدا کرتی ہے، اگر تیرے دل میں محبت نہیں ہے تو تجھ کو کیا حق ہے کہ بیوی سے محبت کی توقع رکھے، اس کے علاوہ بیاہ کے وقت کی "جذباتی" محبت اور اولاد ہونے کے بعد کی محبت میں بھی بہت کچھ فرق ہوتا ہے، عورت کو دنیا میں سب سے زیادہ اولاد پیاری ہوتی ہے، اگر وہ تیری ہی اولاد پر اپنی محبت کا بڑا حصہ اور تجھ پر کچھ کم صرف کرتی ہے تو تجھ کو اس سے گلہ نہ ہونا چاہئے۔

(۵) تیری بیوی تیری شریک زندگی ہے، تیری ہر چیز اس کی اور اس کی ہر چیز تیری ہے، اگر وہ تیری آمدنی کا حساب دیکھنا چاہے تو کوئی ہرج نہیں۔ بعض شوہر ایسے بھی

ہوتے ہیں کہ ان میں روپے خرچ کرنے کی صلاحیت نہیں ہوتی اگر وہ اپنی پوری آمدنی بیوی کے حوالے کردیں تو ان کے لئے نازیبا نہیں ہے بلکہ ایسا کرنے میں ان کا بڑا فائدہ ہے۔ بیوی کو خوش کرنے اور اپنی دولت کی فوقیت جتانے کے لئے کبھی ناجائز طریقوں سے آمدنی بڑھانے کی کوشش نہ کر، حرام کا مال کبھی ہضم نہیں ہوتا، جیسے آتا ہے ویسے ہی نکل جاتا ہے اور اس کا پاپ اگر تیرے آگے نہ آئے تو تیری اولاد کے آگے آئے گا۔ اگر تیری بیوی تجھ کو شراب پینے، عیاشی کرنے اور جوا کھیلنے سے منع کرتی ہے تو اس سے لڑنے جھگڑنے کے عوض اس کو اپنے لئے ایک فرشتۂ رحمت سمجھ اور ٹھنڈے دل سے جب تو نشہ میں نہ رہے تو غور کر کہ وہ کہاں تک تیری دین دنیا سنوارنے کا سامان پیدا کر رہی ہے اور کس حد تک تیری بہی خواہ ہے۔

(۶) اگر تیری بیوی اپنی اندھی محبت کی وجہ سے بچوں کو بگاڑ رہی ہے اور ان کو فضول خرچی سکھا رہی ہے تو اس کو اس طرح صلاحیت سے سمجھا کہ اس کو اپنی غلطیاں صاف دکھائی دیں، بچوں کے سامنے کبھی اس کو ڈانٹ ڈپٹ نہ کر ورنہ ان کی نظروں میں اس کی کوئی وقعت باقی نہیں رہے گی، مثل مشہور ہے "ماں کے قدموں تلے جنت ہے" اگر تیرے برتاؤ کی وجہ سے تیرے بچے ماں کو ذلیل سمجھنے لگیں تو اس کی ذمہ داری تجھ پر ہوگی کہ تو نے اپنے بچوں کو ماں کے قدموں سے ہٹا کر جہنم کا راستہ دکھا دیا اور ان کی عاقبت بگاڑ دی، جو بچے آج ماں کی عزت نہیں کرتے وہ کل تیری بھی عزت نہیں کریں گے اور ایک دن گھر کے رہیں گے نہ گھاٹ کے۔

(۷) تو کبھی اپنی بیوی سے بدگمان نہ ہو، جب تک شوہر کا بیوی پر اور بیوی کا شوہر پر بھروسہ نہ ہو دونوں کی زندگی خوشگوار نہیں ہو سکتی، بدگمانیاں اقسام کے جھگڑے کھڑے کرنے کے علاوہ دلوں میں کدورتیں پیدا کر دیتی ہیں، اچھے دلوں میں برائی آجاتی ہے۔ میاں بیوی کا چین غارت ہو جاتا ہے، بات بات پر خانہ جنگیاں ہونا شروع ہو جاتی ہیں۔ اگر تیری بیوی تیرے کسی احمق یا بدباطن دوست سے ملنا نہیں چاہتی ہے تو اس کو مجبور نہ کر، اس قسم کے دوستوں سے بیوی کو بے تکلف کرنا بعض دفعہ اقسام کی غلط فہمیوں کا سبب ہوتا ہے۔

(۸) دولت کی خاطر کسی کو اپنی بیوی نہ بنا، جو لوگ روپیہ حاصل کرنے کی غرض سے بیاہ کرتے ہیں وہ کبھی خوش نہیں رہتے انہیں اکثر بیویوں کے طعنے سننے پڑتے ہیں، دولت سے زیادہ ذاتی جوہر اور فطری خوبیوں کو تلاش کر۔ خاندانی شرافت اور نسل کی زیادہ چھان بین کر، دولت چلتی پھرتی چھاؤں ہے۔ اگر تو آج کسی سے محض روپے کی خاطر بیاہ کرلے، اور اس کی برائیوں پر نظر نہ کرے تو کل تیرے لئے وبال ہو جائے گی اپنی زبان کے نشتروں اور نظر کی برچھیوں سے تیرے دل و جگر کو ایسا چھلنی کر ڈالے گی کہ تیرے لئے جینا دوبھر ہو جائے گا، چونکہ تو نے اس کا بہت سارا روپیہ اپنے پر صرف کیا ہے اس لئے اگر تجھ میں کچھ غیرت ہے تو تجھ کو اپنی بیوی کی بری بھلی سننی پڑے گی اور عمر بھر اس کا غلام بنا رہنا ہوگا۔

(۹) یہ ضروری نہیں ہے کہ ہر معاملے میں تیری بیوی تیری ہم خیال ہو، اسی طرح مذہبی اور دنیوی معاملوں میں بھی تجھ میں اور تیری بیوی میں اختلاف ہو سکتا ہے، تجھ کو چاہئے کہ نہایت صلاحیت اور سنجیدگی سے ایسے اختلاف کو بتدریج مٹانے کی کوشش کرے۔ تو اگر چاہے کہ ایک ہی دن میں تیری بیوی تیری ہم خیال ہو جائے تو یہ بالکل ناممکن ہے، عورت کی عقل ناقص ہوتی ہے، اس لئے کوئی اچھی بات اس کی سمجھ میں فوراً نہیں آسکتی، عورت کی تربیت بڑا مشکل کام ہے، اگر یہ ہنر تجھ میں آجائے تو بس بیڑا پار ہے۔

تیرا گھر جنت کا نمونہ ہو سکتا ہے، جہاں چین ہی چین اور آرام ہی آرام کا دور دورہ ہوگا، اگر کبھی مصیبت کے بادل بھی چھا جائیں تو دونوں کی محبت اور ایک دلی گھر کو سکھ، چین کی کرنوں سے روشن کر سکتی ہے۔

(۱۰) جہاں تو اپنی بیوی سے یہ توقع رکھتا ہے کہ وہ تیرے جذبات کو ٹھیس نہ لگائے وہاں تیرا بھی فرض ہے کہ بیوی کے احساسات کو پژمردہ نہ ہونے دے، عورت کا دل بہت نازک ہوتا ہے، اس کے آبگینہ کو ٹھیس نہ لگنے دے اگر وہ کبھی ٹوٹ جائے تو اس کے جوڑنے میں بڑی دشواری ہوگی، ٹوٹے ہوئے دل بڑی مشکل سے جڑتے ہیں اور جڑنے کے بعد بھی بال باقی رہ جاتا ہے۔ اگر تو اپنی بیوی کے احساسات کو سمجھ کر تھوڑی بہت رواداری سے عمل کرے تو بڑی خانہ جنگیوں سے تجھ کو نجات حاصل ہو سکتی ہے۔ اگر تیری بیوی باولی ہے تو دوسری سمجھ دار بیویوں کو دیکھ کر رشک نہ کر، کوشش کر کہ تیری بیوی بھی ویسی ہی ہو جائے اور اس میں بھی وہی خوبیاں پیدا ہوں، مثل مشہور ہے!

"کوشش کرے انسان تو کیا ہو نہیں سکتا"!!

"باغبان"

نئی کتابیں

۱۔ پاکستان از بابو راجندر پرشاد صدر انڈین نیشنل کانگریس۔ قیمت ۸ر۔ عالمگیر بک ڈپو۔ لاہور

۲۔ کالج گرل کے خطوط (افسانے) از منشی گوہر سیلانی قیمت ۸ر " " "

۳۔ آشرم (ناول) از ایم۔ اسلم۔ قیمت عاؔ " " "

۴۔ جنگی افسانے (موجودہ جنگ کے افسانے) از گوپال متل بی۔ اے قیمت عہ " " "

۵۔ شاہ جہاں (سوانح) از رفیق خاور ایم۔ اے قیمت عہ " " "

۶۔ روشن چراغ قرآن مجید (اُردو قرآن) ہدیہ ۸ر۔ ملک سراج الدین اینڈ سنز کشمیری بازار۔ لاہور

۷۔ ماہر کے سلام۔ از حکیم محمود علی خاں ماہر اکبرآبادی۔ ۳۲ صفحے۔ محمود منزل۔ روشن آرا روڈ۔ دہلی

۸۔ ثروت آرا بیگم (ناول) از حمیدہ سلطانہ ۳۳۲ صفحے۔ قیمت عاؔ۔ دفتر ادیب۔ دہلی

۹۔ مذاکیوں کریلے (موجودہ صورت حال کا نقشہ) مرتبہ کامریڈ ایسوسی ایشن قیمت ۶ر۔ ماڈرن بک ڈپو۔ سلطان بازار۔ حیدرآباد دکن۔

۱۰۔ دانائے راز (سر اقبال مرحوم کی شخصیت پر اظہار خیال) از آغا شیر احمد خاں خاموش۔ ۵۶ صفحے قیمت ۱۲ر۔ دائرہ ادب اُردو۔ لودھیانہ پنجاب

۱۱۔ ناصر جنگ شہید باتصویر (سوانح) مرتبہ معین الدین فاروقی۔ ۲۰۰ صفحے قیمت عاؔ۔ سن برج ہاؤس۔ عابد روڈ۔ حیدرآباد دکن۔

۱۲۔ آفتاب تازہ (افسانے) از احسان بی۔ اے۔ ۱۱۲ صفحے قیمت عہ۔ نصرت بک ڈپو۔ پٹن بازار۔ خزنگ لاہور

۱۳۔ دل کی باتیں (افسانے) از سید کاظم دہلوی ۲۰۰ صفحے قیمت عا۔ دفتر رسالہ کہکشاں۔ گلی شاہ تارا۔ دہلی۔

۱۴۔ چند افسانے۔ از خواجہ محمد شفیع قیمت عہ۔ کتب خانہ عزیزیہ۔ دہلی۔

۱۵۔ نغمات ماہر۔ (مجموعۂ کلام) از ماہر القادری قیمت ۃ۔ ادارۂ اشاعت اُردو۔ عابد روڈ۔ حیدرآباد

۱۶۔ سیر کائنات (سر جیمس جینس کی کتاب تھرو اسپیس اینڈ ٹائم کا ترجمہ) از حفیظ احمد خاں مجسٹریٹ عثمان آباد ۲۷۸ صفحے قیمت عہ مکتبۂ جامعہ دہلی

۱۷۔ ہماری مفید غذا۔ از ڈاکٹر مرزا غوث بیگ میڈیکل آفیسر دواخانہ چینا پور (دکن) ۹۰ صفحے۔ مرتب سے مل سکتی ہے۔

۱۸۔ کلام الشعراء (۶۶ شعرا کا کلام) مرتبہ دارالادب قیمت عہ۔ دارالادب محبوب بلڈنگ۔ اُردو بازار۔ حیدرآباد۔

۱۹۔ ہوس (ناول) از عزیز احمد۔ قیمت عا۔ پتہ۔ مکتبۂ جدید۔ چوک انارکلی۔ لاہور

۲۰۔ زندگی اور عمل (ڈاکٹر مارڈن کی کتاب کا ترجمہ) " " " "

۲۱۔ ناگ رانی (افسانہ) مترجمہ ایم۔ ڈی تاثیر۔ قیمت عا " " "

۲۲۔ سنگ و خشت (طنزیہ و مزاحیہ مضامین) از کنہیا لال کپور قیمت عا۔ مکتبۂ جدید۔ چوک انارکلی۔ لاہور

۲۳۔ دروازہ۔ (ڈراما) از۔ سرکشن چندر۔ قیمت عہ۔ پتہ " " "

۲۴۔ شگوفے (مزاحیہ) از شفیق الرحمٰن " عاؔ " " " "

۲۵۔ مشک و عود (افسانے) از محمودہ رضویہ۔ حجم ۱۶۴ صفحے۔ قیمت عہ۔ پتہ۔ انجمن ترقی اُردو۔ کراچی

مرزا سیف علی خاں

تنقید و تبصرہ

رنگ بست - از نواب مرزا جعفر علی خاں اثر لکھنوی۔ حجم ۸۶ صفحے
قیمت عہ - پتہ اردو اکیڈیمی - لاہور -

نظموں کے اس مجموعہ میں جناب اثر کی مترجمہ مغرب اور مشرق کی کئی نظمیں شامل ہیں، مغربی نظموں میں یونانی، اطالوی روسی، جرمن، فرانسیسی اور انگریزی نظموں کے آزاد منظوم ترجمے ہیں۔ مشرق کی نظموں میں سنسکرت، بنگالی اور عربی نظمیں اردو کے خوبصورت منظوم لباس میں جلوہ گر ہیں۔ ڈانٹے کے شاہکار "ڈیوائن کامیڈی" کے حصہ سیر دوزخ کے پہلے باب کا منظوم ترجمہ پڑھنے کے قابل ہے۔ مغربی شعرا میں انیا کریان، گیٹے، ورڈز ورتھ، لانگ فیلو وغیرہ کی مشہور نظمیں شریک ہیں۔ مشرق کی نظموں میں سنسکرت دوہوں کے ترجمے، بھرتری ہری، قاضی نذر الاسلام ابن العربی، حاجی ابو علی کی نظمیں ان کے علاوہ کئی عربی اور سنسکرت نظموں کے ترجمے درج ہیں۔ نظم معرا "بلینک ورس" کا بھی ایک عمدہ نمونہ اس میں موجود ہے، غرض کہ ہر نظم کا ترجمہ اپنے اندر ایک خاص کشش رکھتا ہے، جناب اثر کی زبان کا اثر اس کے پڑھنے والے کو بے حد متاثر کرتا ہے، آپ کے کلام میں شستگی زبان، سلاست بیان، روانی نازک خیالی، شگفتگی سب ہی کچھ موجود ہے، یہ مجموعہ اس قابل ہے کہ ہر کتب خانہ میں اس کی ایک کاپی رکھی جائے۔ اس تصنیف لطیف پر جناب اثر کی خدمت میں ہم ہدیۂ مبارک باد پیش کرتے ہیں۔

۱۹۴۱ء کی بہترین نظمیں - مرتبہ حلقہ ارباب ذوق حجم ؟ صفحے
قیمت ۸ر پتہ حلقہ ارباب ذوق۔ لاہور۔

ارباب ذوق نے ۱۹۴۱ء کی ۴۴ بہترین نظموں کا انتخاب کرکے یہ مجموعہ شائع کیا ہے۔ یہ وہ نظمیں ہیں جو ۱۹۴۱ء میں ہندوستان کے مشہور اخباروں اور رسالوں خصوصاً ساقی، نگار، جامعہ، ادب لطیف، ہمایوں، ادبی دنیا، شاہکار، داستان، ہندوستان وغیرہ میں چھپی ہیں۔ اس مجموعہ میں جن شعرا کی نظمیں درج ہوئی ہیں ان میں احمد ندیم قاسمی، مختار صدیقی، ن۔ م راشد، جوش ملیح آبادی، قیوم نظر، اختر شیرانی، عدم، سلام مچھلی شہری مخمور جالندھری، شاد عارفی، میراجی، اختر الایمان، وشوامتر عادل، تخت سنگھ قابل ذکر ہیں۔

مقام اعراف اور اقبال - از احمد اللہ خاں منصور
حجم ۳۰ صفحے قیمت ۱ر پتہ شمس المطابع قانونی بک ڈپو۔
نظام شاہی روڈ۔ حیدر آباد دکن۔

جناب منصور کو تالیف و تصنیف کا بے حد شوق ہے، اب تک تقریباً دو درجن نظم و نثر کی کتابوں کے آپ مولف و مصنف ہو چکے ہیں، ان کتابوں میں ناول، افسانے، سوانح، تذکرے، اصلاحی نظمیں وغیرہ شامل ہیں۔ زیر نظر مختصر سی کتاب میں نظم و نثر دونوں موجود ہیں، نظموں کے عنوان ہیں یاد اقبال، یاد مصطفےٰ کمال، یاد سر سید، تصویر و تصور عمر خیام اور نثر میں جناب منصور کا ایک دلچسپ "خواب" مقام اعراف اور سر اقبال کے عنوان سے درج ہوا ہے۔ نظمیں کافی موثر ہیں اور جن کی یاد میں لکھی گئی ہیں ان کے لئے روح کو تڑپا دیتی ہیں۔

اتھارک - از عثمان صحرائی حجم ۱۶ صفحے پتہ ادارۂ ادبیات اُردو
گلبرگہ۔ دکن

اردو کے شعبۂ تالیف و ترجمہ کے سلسلے کی یہ پہلی کڑی ہے "اتھارک" حبشیوں کی قومی زبان کا نام ہے۔ ایک حبشی اپنی زبان کو کس حد تک عزیز رکھتا ہے اس جذبے سے متعلق یہ افسانہ لکھا گیا ہے۔ اس نفسیاتی افسانے کو عثمان صحرائی نے اُردو کا خوش نما لباس پہنایا ہے۔

"س"

مقام محمود - مرتبہ عبدالمالک آروی۔ حجم ۹۰ صفحے قیمت ۱۲ر
ملنے کا پتہ۔ منیجر طاق بستاں آرہ (بہار)

"مقام محمود" ایک اسم بامسمیٰ تصنیف ہے۔ یہ جناب عبدالمالک کے منتشر و مطبوعہ تاریخی، ادبی اور انتقادی مضامین و مقالات کا ایک مفید و دلچسپ مجموعہ ہے۔ بہ حیثیت مجموعی اس کی حیثیت ایک مفید تحقیقی و علمی کارنامہ کی ہے۔ یوں تو ہر مضمون اپنی انفرادی نوعیت سے اچھا ہے۔ لیکن قابل قدر مضامین یہ ہیں۔ "دہلی و لکھنؤ اسکول کی شاعری" بہت ہی دلچسپ مفید تحقیقی مقالہ ہے۔ "غالب کی اخلاقی کمزوریاں" بھی اس مجموعہ کی شان بڑھاتی ہیں! جن سے غالباً کوئی فرد بشر خالی نہیں۔ اس مضمون کو پڑھ کر غالب کے اس شعر کا فلسفہ اور اس کی نفسیاتی تاویل، جس میں انھوں نے فرشتوں کے لکھے پر ناحق پکڑے جانے کا رونا رو دیا تھا اور جس میں وہ ایک حسرت و یاس سے پوچھتے ہیں ع آدمی کوئی ہمارا دم تحریر بھی تھا؟ ادھورا اور بے معنی رہ جاتا ہے۔ کیونکہ انسان بھی انسان کی غلطیوں کو پکڑتا ہے۔ فرشتوں کا لکھا تو فرشتے جانے، اللہ جانے لیکن انسان جب کسی کا نکتہ چیں بن جاتا ہے تو اس کو غلطیاں ہی غلطیاں نظر آتی ہیں۔ غرض دنیا میں مرنے کے بعد بھی چین نہیں۔

صفیر بلگرامی پر ایک محققانہ دلچسپ مضمون ہے۔

تاریخی مضامین بھی ادبی شان لئے ہوئے اس مجموعے کی زینت بڑھاتے ہیں۔ اچھا ہی ہوا کہ یہ بکھرے ہوئے انمول جواہر یکجا ہو گئے۔ 'مقام محمود' کو "سبد گل" کہیں تو زیادہ مناسب ہوگا۔

صحت عامہ :- بابت جون ۱۹۴۳ء پیش نظر نمبر چونکہ "اطفال نمبر" ہے۔ اس میں زچہ اور بچہ سے متعلق بہت سی مفید معلومات ملتی ہیں۔ سالانہ چندہ للعہ - پندرہ روزہ رسالہ ہے۔ ایڈیٹر حکیم لئیق احمد صاحب نعمانی۔ ترپ بازار حیدرآباد سے نکلتا ہے۔ اس کا ہر مضمون مفید و کارآمد ہے۔ خصوصاً نفسیاتی نوعیت کا مضمون "کیا آپ کے بچے کو ذہنی بدہضمی ہے" بہت دلچسپ ہے۔ عموماً بچوں کی صحت کی طرف جو لاپروائی کی جاتی ہے اور اس کو ایک زائد از ضرورت سی چیز سمجھ لیا جاتا ہے اس بدظنی کا حل 'اطفال نمبر' میں مل جاتا ہے۔ بہر کیف صحت عامہ کے مقاصد امید افزا اور حوصلہ بڑھانے والے ہیں۔

آج کل - بابت یکم جون و ۱۵ جون ۱۹۴۳ء - پندرہ روزہ رسالہ۔ سالانہ چندہ (صہ) - حجم ۵۲ صفحے۔ قیمت فی پرچہ ۴ر - ملنے کا پتہ ۱۵ - راجپور روڈ - دہلی۔

"آج کل" آج کل کے ادبی و سماجی مفاد کے لئے موزوں و مناسب معلوم ہوتا ہے۔ کاغذ و طباعت کے لحاظ سے بھی بہت اچھا رسالہ ہے۔ افسانے 'تنقیدیں' غزلیں اور نظمیں سب ہی کچھ موجود ہے "عورت اور گرہستی" مفید و دلچسپ ترین مقالہ ہے جاں نثار اختر کی "حسرت" ایک دل نشیں، دل دوز ہوک ہے۔

"اقبال کا نظریۂ شعر و شاعری" بہت ہی کارآمد سی چیز۔ اس میں غالب کی ایک غزل دیکھی جو غیر مطبوعہ ہے۔ ایڈ لکھا ہے کہ یہ غالب کا بہت آخری کلام ہے۔ اس نئی غزل کو غالب سے منسوب کرنے میں ہم کو تو پس و پیش ہوتا ہے۔ نہ جانے کہاں تک صحیح ہے کہ یہ غالب کا کلام ہے! جس کی بلندی نظر اچھے اچھے دماغوں کو الجھنوں میں ڈال دیتی ہو اس کا کلام اتنا پست ہو جائے اس کا یقین کرنا اپنے بس کا تو روگ نہیں۔

بہرصورت "آج کل" ایک مصور رسالہ ہے۔ اس کے باتصویر اوراق پر تمام عبارت ٹائپ میں چھپتی ہے اور باقی صفحات نستعلیق خط میں۔

عکس لطیف - از صوفی۔ ناشر "ادارہ ادب جدید" حیدرآباد قیمت ندارد۔ ۳۲ صفحے کا ایک مختصر پاکٹ سائز اڈیشن۔ غزلوں، فارسی تشبیب، نظموں اور دوبیتیوں کا مجموعہ۔ وقت گزارنے یا جی بہلانے کے لئے اچھی چیز بھی ہے۔ "م ج"

حسنِ ظن

اگر میں ہوں تو سب کچھ ہے، جو سب کچھ ہے تو جھگڑا ہے
اسی 'میں' کی خبر لینا ہے کچھ ہے بھی کہ دھوکا ہے (اکبرؔ)

آج ہم آپ کو علم الید (Palmistry) کا اہم گُر بتلاتے ہیں۔ یوں بھی یہ ایک مرغوب مشغلہ ہے اس پر طرفہ یہ کہ اس کے جاننے پر آپ اپنے ہر ملنے جلنے والے سے تعریف کے پھول سمیٹ سکتے ہیں۔ یہ وہ منتر ہے جو ہر وہم کے مارے انسان کو حیات آفریں مسرت عطا کر سکتا ہے۔ ایسا بےضرر مگر مجرب نسخہ ہے جسے آپ ننانوے فی صدی آدمی پر بےکھٹکے استعمال کر سکتے ہیں اور ہم آپ کو اس کے صد فی صد صحیح نتائج کی ضمانت دیتے ہیں۔

لیجئے! اب ہم آپ کے لئے ضروری راہ عمل تجویز کرتے ہیں۔ سب سے پہلے آپ کو یہ کرنا ہوگا کہ اپنے کو۔ حلقۂ احباب میں۔ علم الید کا عالم Palmist مشہور کر دیں، اور جیسے ہی کوئی طالب تعبیر آپ کو اپنا ہاتھ دکھائے، نہایت بےباکی سے یوں گویا ہو جائیں "جناب! آپ نے اپنے ہاتھ میں حسن کی لکیر پائی ہے۔ اس کی رو سے آپ کو ایک حسین انسان ہونا چاہئے۔ کم از کم آپ اس لکیر کے ہوتے ہوئے، بدصورت اور بدشکل تو نہیں ہو سکتے" اپنی تعبیر کو جاری رکھتے ہوئے "دیکھئے! حسن کے معنی صرف یہی نہیں کہ انسان رنگت میں سرخ و سفید ہو۔ پورا پورا گلفام اور گل اندام ہی ہو۔ بلکہ ایک متناسب الاعضا جسم اور ایک سڈول بدن بھی حسن کی تعریف میں داخل ہے۔ چاہے وہ چیچک رُو اور سیاہ فام ہی کیوں نہ ہو۔ اجی صاحب! بعض صورتوں میں تو حسن کے سارے لوازم سے عاری انسان کے چہرے پر بھی کچھ ایسی دلکشی ہوتی ہے کہ لامحالہ ہمیں اس کو قبول صورت ماننا ہی پڑتا ہے۔ بات کچھ ہی ہو آپ کا یہ ہاتھ کہہ رہا ہے کہ آپ کو حسین ہونا چاہئے اور اگر ہماری سنئے تو آپ واقعی ...... ہیں بھی"

اب آپ طالب تعبیر کے چہرے پر اس کی نفسیات کا مطالعہ کیجئے اور دیکھئے کہ آپ کی الٹی سیدھی توجیہہ اس پر کیا رنگ لاتی ہے۔ بلا لحاظ اس کے کہ وہ پیدائشی طور پر 'حبش' کا ملکی معلوم دیتا ہو یا لِلّی پٹ کا باشندہ۔ آپ دیکھیں گے کہ وہ آپ کے بیانات کا خیر مقدم مسکراہٹ کے ساتھ کر رہا ہے۔ اس کے بظاہر انکار میں اقرار کے معنی ہوں گے۔ اخلاقی قید و بند کا خیال اس سے 'نہ نہ' کہلوائے گا لیکن ع تیری نگاہ سے تیرا بیاں نہیں ملتا

انسان میں اپنے لئے حسن ظن کا یہ مرض صرف اس کی صورت و شکل ہی تک محدود نہیں ہے اس کا اثر اس سے بھی آگے اس کی عادات و اطوار، خصائل اور اخلاق میں بھی نمایاں ہوتا ہے۔ چنانچہ وہ اپنے آپ کو نہ صرف جسمانی طور پر پری پیکر خیال کرتا ہے بلکہ بہ لحاظ کیرکٹر کے بھی خود کو فرشتہ صفت سمجھتا ہے۔ پس اب آپ اس کی اس کمزوری سے پورا پورا فائدہ اٹھا سکتے ہیں۔ تعبیر خواہ کی لکیریں پڑھنے کا بہانہ کئے جائیے اور آپ کو علم الاخلاق کے باب میں جس قدر نیکیاں یاد ہوں، یکے بعد دیگرے، ان سب کو اپنے مخاطب سے منسوب کرتے جائیے۔ لیکن نہایت ہوشیاری اور سنجیدگی کے ساتھ۔ ساتھ ہی اُسے تمام انسانی عیوب اور گندگیوں سے پاک قرار دیجئے۔ ایسا پاک و صاف جیسے کنول کیچڑ میں غیر آلود اور اَن بھیگا ہوتا ہے۔ آپ دیکھیں گے کہ مستفسر کا تمتماتا چہرہ زبانِ حال سے آپ کی دست شناسی کی داد دے رہا ہے۔ آپ کے سمدرک شاستر کو خندہ پیشانی سے خوش آمدید کہہ رہا ہے، چاہے وہ چھٹا ہوا بدمعاش اور شہدا ہی کیوں نہ ہو۔

جہاں آپ کو مخاطب کے گُن گانے کے سوا کچھ اور کہنے کی ضرورت داعی ہو، اپنے بیان میں کافی ابہام اور لوچ پیدا کیجئے مثلاً آپ سے کوئی پوچھے "میری اولاد کتنی ہے؟" تو کہہ دیجئے "اولاد ایک نر بچہ (وحدہ لاشریک) ہوتی ہے۔ آپ کو دو کا سکھ چین حاصل ہے۔ تین سے شہرت ملنی ہے۔ قسمت میں چار اولادیں لکھی ہیں۔ لکیریں (اولاد کی) پانچ ہیں۔ پھر مستفسر سے پوچھئے "بتائیے آپ کے کتنی اولاد ہے؟"

آپ نے ایک سے پانچ تک گنہا نقش رکھ چھوڑی ہے۔ ضرور ایک نہ ایک ہندسہ اس کی بتائی ہوئی تعداد سے مطابقت کرے گا۔ کوچہ گرد جوتشی (نجومی) اسی طرح کی لچکدار تعبیروں کے ذریعہ عوام کی جہالت سے کھیلتے ہیں اور ان سے استحصال ناروا کرتے ہیں۔ ملک میں آئے دست شناس نجومیوں کی گرم بازاری اس امر کا کھلا ثبوت ہے کہ ان کے آگے اپنا اُلو سیدھا کرنے کے لئے میدان وسیع ہے۔ اتنا ہی نہیں وقتاً فوقتاً پڑھے لکھے حضرات کا اس فن کو اپنانا شاہد ہے کہ وہم و گمان کی یہ آباد دنیا (پامسٹری) ایک حاصل خیز سرزمین ہے جو دل افزا مواقع فراہم کرتی ہے۔

شکسپیر کے مشہور کردار، جولیس سیزر، کو خوشامد سے سخت نفرت تھی۔ وہ چاپلوسوں کا کٹر دشمن تھا۔ جب ایک چالاک چاپلوس نے اس سے کہا "دنیا کے پردے پر صرف آپ ہی کی ایک شخصیت ہے جس کے آگے خوشامدیوں کی ایک نہیں چلتی"، تو وہ اس تنقید سے، جو بجائے خود خوشامد ہے، بے حد خوش ہوا اور جھانسے میں آگیا۔ ایڈیسن، کہتا ہے کہ بھونڈی سے بھونڈی صورت عورت سے کہا جائے کہ تم آج ستم ڈھارہی ہو، تو وہ نہایت صاف دلی اور سادہ لوحی کے ساتھ مسکرا دیتی ہے۔ غرض یہ کہ ع دیکھو جسے دنیا میں خوشامد کا ہے بندہ

اپنے لئے حسن ظن کہئے یا خوشامد پسندی، انانیت کہئے یا خود پسندی ایک ہی تصویر کے مختلف رخ ہیں۔ حسن ظن کی یہ وبا روئے زمین پر ایسی پھیلی ہوئی ہے جیسے ہوا۔ ہندوستان کے عوام الناس میں تو یہ ہوا، آندھی بن کر چھا گئی ہے۔

انسان اگر اپنے گریبان میں منہ ڈال کر دیکھے تو اس کی وضعداری اور پارسائی کی صحیح صحیح گہرائی معلوم ہوگی۔ اپنی قابلیتوں اور صلاحیتوں کی ٹھیک ٹھیک حد نظر آئے گی جس کی وسعت کا اندازہ وہ دل کھول کر لگاتا ہے اور یہاں بھی 'میں' وہاں بھی 'میں'، ہر جگہ "میں میں" کہے جاتا ہے۔ ع اسی 'میں' کی خبر لینا ہے کچھ ہے بھی کہ دھوکا ہے۔ درحقیقت پاک طینت رشیوں، اور صوفیائے کرام کا قول 'خود کو جانو' اپنے میں خود شناسی پیدا کرو کا بڑی حد تک منشا یہی ہے کہ انسان بہروپیے کی طرح روپ بھرنا چھوڑ دے۔ سچ پوچھئے تو یہی احساس انسان کی ہمہ جہتی ترقی کا نقطۂ آغاز ہے۔

پی۔ انجیا

غزل

کتابِ عشق کا ہوں حرفِ مبہم　　بہت سوچا گیا سمجھا گیا کم
خبر ہے تجھ کو ہو جاتا ہے برہم　　اشارے سے مرے نظمِ دو عالم
یہ کیوں ہونے لگیں بے مہریاں کم　　ابھی کامِ وفا تھا تشنۂ غم
پھر آتا ہے پیامِ غیر واضح　　پھر اٹھتا ہے جگر میں دردِ مبہم
رہے کیوں چشمِ پُرنم سے نمایاں　　تمناؤں کی مجروحی کا عالم
خوشا جذبِ وفا وہ آرہے ہیں　　سراپا شوق، ایمائے مجسم
طلسمِ نازِ خوباں ٹوٹتا ہے　　زہے اوجِ نیازِ چشمِ پُرنم
سرِ منزل غمِ مرگِ تمنا　　معاذ اللہ مآلِ سعئ پیہم
وہ خورشید تک رسائی ان کی معلوم　　اڑے جاتے تو ہیں ذراتِ شبنم
خرد کا نُور طولانی زمانہ!
جنوں کے ایک لمحہ سے بھی ہے کم

سید نور محمد نُور (اکیلوی)

نتیجۂ امتحان اردو دانی بابت ۱۹۴۳ء

حسب ذیل امیدواروں نے علی الترتیب
سب سے زیادہ نشانات حاصل کئے۔

۲۰۶- کریم النساء بیگم اول (چتیا لیہ)
۲۰۷- عظیم النساء بیگم دوم "
۲۰۹- کلیم النساء بیگم سوم (نظام آباد)

مرکز بلدہ فوج

کامیاب بدرجۂ امتیاز

۴۴- کریم الدین خاں (مرکز میں اول)
۲- عبدالرحیم
۳- محمود علی خاں
۴- نصیب بن عنبر
۸- موسیٰ خاں
۱۰- غلام جیلانی
۱۱- کریم الدین خاں
۱۸- غلام اسد خاں
۱۹- سلیمان خاں
۲۲- معین الدین
۲۴- عبداللہ حسینی
۲۵- عبدالغفور
۲۸- علی قرموشی
۳۱- سالم باکوبن
۳۲- محمد کشیری
۳۸- شیخ احمد باکمیل
۳۹- عبداللہ قریشی

۱۴۴- شیخ علی بافضل
۱۴۸- عمر قرموشی
۴۰- مرزا سردار علی بیگ
۴۱- عبدالستار خاں
۴۵- بسم اللہ خاں
۴۶- سید احمد
۴۷- شیخ محبوب
۴۸- محمد حسام الدین
۵۰- سید قاسم
۵۱- جگدیش پرشاد
۵۳- صاحب حسین
۶۳- شیخ داؤد
۶۶- حاجی خاں
۷۱- حبیب عمر
۷۳- شیخ احمد
۸۳- سید میر
۸۴- محمد اسمٰعیل
۸۵- منصور خاں
۸۸- عزیز الدین
۹۴- محمد افضل حسین
۱۰۹- گنپت راؤ
۱۱۹- محمد محبوب علی

— کامیاب —

۵- میر یوسف علی
۶- محمود غوری
۷- شیخ نور
۹- سعید محمد خاں
۱۲- زاہد حسین
۱۳- میر تراب علی
۱۴- محمد عثمان
۱۵- سبحان خاں
۱۶- سید عباس
۱۷- حسام الدین
۲۰- عبدالشکور خاں
۲۱- جنگیا
۲۶- محمد عبدالحمید
۲۷- محمد بامقدار
۲۹- عمر قرموشی
۳۰- سید محمد بغدادی
۳۳- طاہر بابکین
۳۴- سید عبداللہ باعقیل
۳۵- محمد قندوان
۱۴۵- سعید بن طالب
۱۴۶- عبداللہ المجی
۱۴۹- خوش محمد خاں
۴۲- سید حسین
۴۹- سرینواس راؤ
۵۲- تاتار خاں

۵۴- میر قربان علی
۵۵- عبدالحی
۵۶- سید احمد
۵۷- عبدالوہاب
۵۸- انجیلو
۵۹- شیخ محی الدین
۶۰- میر اسد علی
۶۱- عبدالخالق
۶۲- محمد قاسم
۶۴- شیخ احمد
۶۵- محمد عباس
۶۷- شیخ مرتضیٰ
۷۰- محمد سراج الدین
۷۲- محمد عبدالرحمن
۷۵- شیخ محبوب
۷۶- یٰسین بیگ
۷۷- سید غفور
۷۸- سید افتخار علی
۸۰- سید جعفر علی
۸۲- محمد عبدالرحیم
۸۶- حفیظ احمد
۸۹- سید زین العابدین
۹۰- سید علی
۹۱- عبدالستار

۹۸۔ محمد عثمان
۱۰۰۔ بشیر بیگ
۱۰۲۔ سید محبوب علی
۱۰۳۔ محمد عبدالرحیم
۱۰۵۔ فتح محمد
۱۰۶۔ سبا راؤ
۱۰۷۔ سید عبدالحی
۱۰۸۔ جمال شریف
۱۱۱۔ محمد عثمان علی
۱۱۳۔ محبوب خاں
۱۱۴۔ شرف الدین
۱۱۸۔ شیخ داؤد
۱۲۱۔ سید حسین
۱۲۲۔ غلام جیلانی
۱۲۴۔ محمود علی
۱۲۵۔ عبدالجبار
۱۳۵۔ اسمٰعیل قریشی
۱۳۶۔ شیخ عبدالرحمٰن

مرکز پوسے گاؤں

کامیاب بدرجۂ امتیاز

۱۴۹۔ محمد عثمان (مرکز میں اول)
۱۵۸۔ شنکر لال
۱۶۵۔ عبداللہ خاں
۱۶۶۔ محمد عثمان
۱۶۷۔ دلاور خاں
۱۶۸۔ سید احمد
۱۷۰۔ محمد یعقوب
۱۷۱۔ شمشیر خاں
۱۷۳۔ بشارت خاں
۱۷۶۔ شیخ امیر
۱۷۸۔ لکشمن
۱۸۷۔ گل خاں
۱۸۸۔ دیوجی

کامیاب

۱۵۶۔ عبدالمعز
۱۵۷۔ محمد عبدالعزیز
۱۵۹۔ کاشی ناتھ راؤ
۱۶۰۔ گنگا دھر
۱۶۱۔ کنڈلک
۱۶۲۔ دوارکا داس
۱۶۳۔ شام راؤ
۱۶۴۔ عبدالرحیم
۱۶۹۔ سید علی
۱۷۲۔ محمد حفیظ اللہ
۱۷۴۔ عبدالعزیز
۱۷۵۔ سید کریم
۱۷۷۔ محمد یوسف
۱۸۰۔ نیکیا
۱۸۱۔ محمد اسمٰعیل
۱۸۲۔ کیشو
۱۸۳۔ پرہلاد
۱۸۴۔ اسرا آپا
۱۸۵۔ جگن لال
۱۸۶۔ عبدالحمید
۱۸۹۔ سکھیا
۱۹۰۔ نارائن
۱۹۱۔ موسیٰ خاں
۱۹۳۔ لکشمن
۱۹۴۔ موہن
۱۹۵۔ رتن

مرکز پوسے گاؤں (اناث)

بدرجۂ امتیاز

۱۵۰۔ معصوم بی (مرکز میں اول)
۱۵۴۔ اطہر النساء بیگم

کامیاب

۱۵۱۔ سرو بائی
۱۵۲۔ میمونہ خاتون
۱۵۳۔ زیب النساء بیگم
۱۵۵۔ بی بی

مرکز ویجاپور (ذکور)

کامیاب

۱۹۶۔ حافظ محمود بیگ
۱۹۷۔ غلام دستگیر خاں (مرکز میں اول)
۱۹۸۔ غلام ربانی
۱۹۹۔ محمد ارشد
۲۰۰۔ غلام صمدانی
۲۰۱۔ شیخ محمد
۲۰۴۔ اکرام الدین
۲۰۶۔ شیخ جمال
۲۰۸۔ شیخ چھوٹے

مرکز ویجاپور (اناث)

کامیاب

۲۱۰۔ رابعہ خاتون

مرکز بلولی (ذکور)

۲۱۵۔ احمد عبداللہ (مرکز میں اول)
۲۱۶۔ سید ظفر محمود
۲۲۸۔ محمد حاجی

کامیاب

۲۱۲۔ محمد امیر الدین
۲۱۳۔ اکبر احمد
۲۱۴۔ عبدالبصیر
۲۱۷۔ محمد فیاض الدین
۲۱۸۔ مرزا یٰسین بیگ
۲۱۹۔ غلام نصیر الدین
۲۲۰۔ راجیا
۲۲۲۔ مرزا امیر بیگ
۲۲۳۔ مرزا قاسم بیگ
۲۲۴۔ محمد عبدالقیوم
۲۲۶۔ محمد اسمٰعیل
۲۲۷۔ شیخ فرید
۲۲۹۔ محمد امیر الدین

مرکز بلولی (اناث)

کامیاب بدرجۂ امتیاز

۲۳۶- ششی کلابائی (مرکز میں اول)
۲۳۲- انوری بیگم

— کامیاب —

۲۳۰- اشرف النساء بیگم
۲۳۱- قیصر النساء بیگم
۲۳۳- پاشاہ بیگم
۲۳۵- افسر النساء بیگم

مرکز گدوال (ذکور)

کامیاب بدرجۂ امتیاز

۲۴۱- جی ناگپا
۲۴۵- محمد علی
۲۴۷- حافظ محمد عبدالغنی (مرکز میں اول)

— کامیاب —

۲۳۷- درویش علی
۲۳۸- رام راؤ
۲۳۹- محمد عبدالغفار
۲۴۰- ایرنا
۲۵۰- محمد حنیف
۲۷۰- غوث محی الدین

مرکز گدوال (اناث)

کامیاب

۲۵۱- ملیحہ مریم (مرکز میں اول)
۲۵۲- زینب خاتون
۲۵۳- جمیلہ مریم

مرکز کلیانی (ذکور)

کامیاب

۲۵۹- محمد معین الدین
۲۶۰- سید عبدالخالد
۲۶۲- مشیت اللہ
۲۶۳- محمد اطہر اللہ
۲۶۴- محمد ثناء اللہ
۲۶۵- نور محمد معین الدین (مرکز میں اول)
۲۶۷- محمد امان اللہ
۲۷۱- محمد کاظم علی
۲۷۲- محمد عبدالرحمن بگ
۲۷۳- معین الدین
۲۷۴- لعل محمد
۲۷۹- رگھوناتھ راؤ
۲۸۱- جہاروتی راؤ
۲۸۲- پھول چند

مرکز کلیانی (اناث)

کامیاب

۲۸۳- عابدہ بیگم
۲۸۴- ارشد بیگم
۲۸۶- رشیدہ بیگم
۲۸۷- نورجہاں بیگم
۲۸۸- نورجہاں بیگم
۲۸۹- کنیز سیدہ خاتون
۲۹۰- اختر النساء بیگم
۲۹۱- مہر النساء بیگم
۲۹۲- طیب النساء بیگم (مرکز میں اول)

مرکز چیتاپور (ذکور)

کامیاب بدرجۂ امتیاز

۲۹۵- محمد ظہیر الدین
۲۹۸- عبدالعزیز
۲۹۹- شیخ محبوب
۳۰۰- مرزا ابراہیم بیگ (مرکز میں اول)
۳۰۳- مرزا رحمت اللہ بیگ

— کامیاب —

۲۹۳- سید محمد احسن رضوی
۲۹۴- شیخ حسین
۲۹۶- عبدالرحیم
۳۰۱- محمد نصیر الدین صدیقی
۳۰۲- محمد ظہیر الدین
۳۰۴- محمد علی

مرکز چیتاپور (اناث)

کامیاب بدرجۂ امتیاز

۳۰۵- بلقیس سلطانہ
۳۰۷- عظیم النساء بیگم
۳۰۸- ذاکرہ بیگم
۳۰۹- کریم النساء بیگم (مرکز میں اول)
۳۱۰- رحیم النساء بیگم

مرکز ہمنا آباد (ذکور)

کامیاب بدرجۂ امتیاز

۳۱۸- سید رشید محمد (مرکز میں اول)

— کامیاب —

۳۱۱- محمد امیراں
۳۱۴- محمد رحمت اللہ خاں
۳۱۵- محمد عبدالحکیم
۳۱۶- محمد عبدالستار خاں
۳۱۷- سید عبدالماجد
۳۱۹- مرزا مہتاب بیگ

مرکز ہمنا آباد (اناث)

کامیاب بدرجۂ امتیاز

۳۲۱- امتہ اللہ بیگم
۳۲۲- صغرا بیگم (مرکز میں اول)

— کامیاب —

۳۲۰- امتہ العزیز بیگم
۳۲۳- شمس النساء بیگم
۳۲۴- شریفہ بیگم

مرکز پربھنی (ذکور)

کامیاب

۳۲۶- ممتاز احمد صدیقی
۸۶۵- وٹھل
۸۶۶- پنڈت
۸۶۷- پربھا
۸۶۸- ششنکر
۸۶۹- دتاترے
۸۷۰- شیخ بادشاہ
۸۷۱- شیخ حبیب
۸۷۲- کانہا

۸۷۳۔ ناگو

۸۷۴۔ یادو

۸۸۲۔ بالیا

۸۸۳۔ نعیم الدین (مرکز میں اول)

مرکز پربھنی (اناث)

کامیاب

۳۲۹۔ نجم النساء بیگم

۳۳۰۔ ستیا بائی

۳۳۱۔ حسن جہاں بیگم (مرکز میں اول)

۳۳۲۔ فسر بیگم

۳۳۵۔ مہر النساء بیگم

۸۶۴۔ رحیم النساء بیگم

۸۸۴۔ اختر خاتون

مرکز بسمت (اناث)

کامیاب بدرجۂ امتیاز

۳۳۹۔ منظور النساء بیگم

۳۴۲۔ اقبال النساء بیگم

۳۴۷۔ عائشہ خاتون

۳۵۳۔ عابدہ بیگم

۳۵۴۔ آصفہ بی

۳۶۱۔ رفیع النساء بیگم

۳۶۷۔ قدرت جانی

۳۶۸۔ بدر النساء بیگم

۳۶۹۔ رحمت جانی (مرکز میں اول)

کامیاب

۳۳۶۔ آمنہ بیگم

۳۳۷۔ ضیاء النساء بیگم

۳۳۸۔ زینب بی

۳۴۰۔ انور خاتون

۳۴۱۔ خدیجہ بی

۳۴۳۔ قمرو بی

۳۴۵۔ وحید النساء بیگم

۳۴۶۔ رضیہ بی

۳۴۸۔ فاطمہ بی

۳۴۹۔ صابرہ بی

۳۵۰۔ صغرا بی

۳۵۱۔ احمدی بیگم

۳۵۲۔ الفت بی

۳۵۶۔ حفیظ بی

۳۵۷۔ افضل النساء بیگم

۳۵۸۔ محمودہ بیگم

۳۵۹۔ عزیزہ بیگم

۳۶۰۔ نذیرہ بیگم

۳۶۴۔ صابرہ بی

۳۶۵۔ مرتضیٰ بی

۳۷۱۔ نورجہاں بیگم

۳۷۲۔ محبوب بی

۳۷۳۔ آمنہ بی

۳۷۴۔ شمس النساء بیگم

۳۷۵۔ رحیمہ بی

۳۷۶۔ صالحہ بیگم

مرکز بھوم (ذکور)

کامیاب

۳۸۰۔ عبدالغنی

مرکز بھوم (اناث)

کامیاب بدرجۂ امتیاز

۳۹۳۔ اقبال بیگم

مرکز نظام آباد (ذکور)

کامیاب

۳۹۴۔ شوکت علی

۳۹۵۔ محمد عبدالوحید

۳۹۶۔ سید نصیرالدین

۳۹۸۔ محمد عبدالغفار (مرکز میں اول)

۳۹۹۔ احمد حسین

۴۰۰۔ شیخ محبوب

۴۰۱۔ یم لنگپ

مرکز نظام آباد (اناث)

کامیاب بدرجۂ امتیاز

۴۰۷۔ فاطمہ بیگم

۴۰۹۔ کلیم النساء بیگم (مرکز میں اول)

۴۱۲۔ زیب النساء بیگم

۴۱۳۔ سیدہ بلقیس بانو

۴۱۴۔ عابدہ بیگم

۴۱۶۔ غوثیہ بیگم

۴۱۷۔ غوثیہ بیگم

۴۱۹۔ اختر بانو

۴۲۰۔ خیر النساء بیگم

۴۲۲۔ صابرہ بیگم

۴۲۳۔ مریم النساء بیگم

۴۲۶۔ کماری کسوم

۴۲۷۔ لکشمی بائی

۴۲۵۔ کرشنا بائی

۴۳۰۔ وچھلا بائی

۴۴۴۔ وحیدہ بی بی صدیقہ

۴۴۱۔ محمدی بیگم صدیقہ

۴۴۷۔ بلند اختر پاشا

۴۴۸۔ صغرا بیگم

۴۴۹۔ بلقیس بیگم

کامیاب

۴۱۱۔ آمنہ بیگم

۴۱۵۔ محبوب بی

۴۱۸۔ آفتاب النساء بیگم

۴۲۱۔ آمنہ بیگم

۴۲۴۔ رینوکا

۴۳۱۔ کماری درگا بائی

۴۳۴۔ کملا

۴۳۶۔ کماری سروجنی

۴۳۷۔ کماری سودن لتا بائی

۴۳۸۔ ویلا بائی

۴۳۹۔ لیلا دیبائی

۴۴۳۔ کماری کلاوتی بائی

۴۴۵۔ احمدی بیگم صدیقہ

۴۵۱۔ رحیم النساء بیگم

مرکز رینا پور (ذکور)

کامیاب

۴۵۸۔ نرہری
۴۵۹۔ بھوجنگ
۴۶۲۔ اپو
۴۶۴۔ امین صاحب (مرکز میں اول)
۴۶۶۔ شیولنگ
۴۶۷۔ بابو
۴۶۸۔ بنڈو
۴۷۰۔ اتم
۴۷۲۔ مظفر علی

مرکز رینا پور (اناث)

کامیاب بدرجۂ امتیاز

۴۷۶۔ سندرا بائی (مرکز میں اول)

کامیاب

۴۷۷۔ مینا بائی
۴۷۸۔ شریف النساء بیگم

مرکز کاماریڈی (ذکور)

کامیاب بدرجۂ امتیاز

۴۸۴۔ ویریا
۴۹۰۔ بابو راؤ
۵۰۳۔ محمد عبدالواحد
۵۰۵۔ وت راؤ
۵۰۷۔ راج لنگم
۵۱۸۔ شیخ حیدر (مرکز میں اول)
۵۲۰۔ محمد بخش اللہ خاں
۵۲۵۔ محمد عباس غوری
۵۳۶۔ سید خواجہ معین الدین
۵۴۰۔ غیاث الدین
۵۴۱۔ اننت نارائن
۵۴۳۔ جاتانی وینکٹ نرسیا
۵۴۴۔ اپل ستنکریا

کامیاب

۴۷۹۔ رنگاریڈی
۴۸۳۔ وینکٹ راج ریڈی
۴۹۱۔ محمد نصیر الدین
۴۹۲۔ بالوجی
۴۹۴۔ مانک راؤ
۴۹۷۔ محمد ابراہیم
۴۹۹۔ رام راؤ
۵۰۶۔ محمد عبدالکریم
۵۱۰۔ محمد عبدالحمید
۵۱۲۔ شیخ میراں
۵۱۳۔ بشیر احمد
۵۱۵۔ شیخ حیدر
۵۲۱۔ محمد رفیع الدین
۵۲۲۔ مرزا احسن بیگ
۵۲۳۔ مرزا اسحق بیگ
۵۳۳۔ ترملیا
۵۳۴۔ شیخ محمد
۵۴۲۔ بالکشٹو
۵۴۵۔ پدی لنگیا
۵۴۶۔ کنڈا رمنیا
۵۴۷۔ اوپل بھگوان
۵۴۸۔ اوپل ملیشم
۵۴۹۔ جاتانی سرینواس
۵۵۱۔ گلہ نرسلو

مرکز کاماریڈی (اناث)

کامیاب

۵۳۵۔ سوشیلا بائی

مرکز شاہ آباد (ذکور)

کامیاب

۵۵۴۔ عبدالباری
۵۵۵۔ عبدالبشیر
۵۵۸۔ شرنپا
۵۶۲۔ انباجی
۵۶۷۔ اننت راؤ (مرکز میں اول)
۵۷۰۔ محمد منصور
۵۷۱۔ غلام نبی

مرکز شاہ آباد (اناث)

کامیاب بدرجۂ امتیاز

۵۵۵۔ صغرا بیگم (مرکز میں اول)

کامیاب

۵۷۵۔ محمودہ بیگم
۵۷۶۔ زلیخا بیگم
۵۷۷۔ مہر النساء بیگم
۵۷۸۔ بشیر النساء بیگم
۵۷۹۔ محبوب بی
۵۸۰۔ بدر النساء
۵۸۱۔ رحیم النساء
۵۸۳۔ حسینہ بیگم
۵۸۴۔ خیر النساء
۵۸۷۔ ضامن صغرا خاتون

مرکز سائے گاؤں (ذکور)

کامیاب

۵۸۸۔ شیخ احمد
۵۸۹۔ محمد حنیف خاں (مرکز میں اول)
۵۹۰۔ سید امیر
۵۹۱۔ سید اکبر علی
۵۹۲۔ سید حسام الدین
۵۹۳۔ سید نواب الدین
۵۹۴۔ سید یونس علی
۵۹۵۔ سید رضا حسین

مرکز جولہ نظام الدین (ذکور)

کامیاب بدرجۂ امتیاز

۵۹۶۔ شیو رام (مرکز میں اول)
۵۹۹۔ بھاگوت

کامیاب

۵۹۷۔ کند
۵۹۸۔ پنڈھری
۶۰۰۔ رام

۶۰۱۔ بابو
۶۰۲۔ بھادو
۶۰۳۔ ترمبک
۶۰۴۔ محمد گلاب
۶۰۵۔ محمود
۶۰۷۔ ارتنڈ
۶۰۸۔ بابو
۶۰۹۔ نام دیو
۶۱۰۔ ذنایک راؤ
۶۱۱۔ مرزا امیر بیگ
۶۱۳۔ مرلی دھر
۶۱۹۔ ہری
۶۲۰۔ دھنراج
۶۲۱۔ روئی داس
۸۸۶۔ ناگناتھ
۸۸۷۔ دتاترے
۸۸۸۔ وینا ندیو

مرکز ہنگولی (اناث)
کامیاب بدرجۂ امتیاز
۶۳۹۔ زیتون بی (مرکز میں اول)
۶۴۱۔ گوری بیگم
— کامیاب —
۶۳۳۔ سارا بیگم
۶۳۴۔ بی جانی بیگم
۶۳۵۔ بشیر النساء بیگم
۶۳۶۔ طاہرہ بیگم
۶۳۷۔ فہمیدہ بیگم
۶۳۸۔ حفیظ النساء بیگم
۶۴۰۔ احمدی بیگم
۶۴۲۔ کوسی بائی
۶۴۳۔ شکیلا بیگم

مرکز ہنگولی (ذکور)
کامیاب
۶۲۳۔ محمد مصطفیٰ خاں
۶۲۴۔ سید قاسم علی
۶۲۵۔ پیر خاں
۶۲۶۔ سید غالب
۶۲۷۔ محمد حسین (مرکز میں اول)
۶۳۰۔ محمد قاسم

مرکز پٹن (ذکور)
— کامیاب —
۶۴۴۔ عبدالوہاب
۶۴۵۔ محمد یوسف (مرکز میں اول)
۶۴۶۔ رفیع الحسن
۶۴۸۔ اجمل حسین
۶۴۹۔ عبدالغنی

مرکز پٹن (اناث)
— کامیاب —
۶۵۴۔ سعیدہ بیگم (مرکز میں اول)
۶۵۵۔ رئیسہ بیگم

مرکز پرلی (ذکور)
— کامیاب —
۶۵۶۔ شیر محمد
۶۵۷۔ رام راؤ
۶۵۸۔ محمد جی
۶۵۹۔ ویجناتھ سیٹھی
۶۶۰۔ سید ساجد حسین
۶۶۱۔ کشن راؤ
۶۶۳۔ لعل خاں
۶۶۵۔ ناگیش
۶۶۶۔ مانک راؤ
۶۶۷۔ شیخ اسمٰعیل (مرکز میں اول)
۶۶۸۔ سید اسمٰعیل
۶۶۹۔ سید نظیر
۶۷۰۔ محمد فیاض الدین
۶۷۱۔ سید حبیب
۶۷۲۔ محمد ریاض الدین
۶۷۴۔ محمد عبدالقدیر خاں
۶۷۵۔ محمد عبدالرزاق
۶۷۸۔ وسنت
۶۷۹۔ امیر خاں
۸۸۵۔ احسن احمد صدیقی
۸۸۹۔ سید شمس الحسن
۸۹۰۔ سید مظہر حسین

مرکز پرلی (اناث)
— کامیاب —
۶۸۰۔ رابعہ بی
۶۸۱۔ چھوٹی بی
۶۸۲۔ اصغری بیگم
۶۸۳۔ شہنشاہ بیگم
۶۸۴۔ نورجہاں بیگم
۶۸۵۔ زہرہ بیگم
۶۸۶۔ رابعہ بی
۶۸۷۔ رحیم النساء بیگم (مرکز میں اول)
۶۸۸۔ موتی بی
۶۸۹۔ سلیمہ بی
۸۷۵۔ زیتون بی
۸۷۶۔ تانو بائی
۸۷۷۔ کملا بائی
۸۷۸۔ کسوم بائی

مرکز پربھنی (ذکور)
کامیاب بدرجۂ امتیاز
۶۹۱۔ عبدالغفار (مرکز میں اول)
۶۹۲۔ شیخ رحیم
— کامیاب —
۶۹۰۔ محمد مصطفیٰ
۶۹۳۔ محمد قاسم
۶۹۵۔ ممتاز علی
۶۹۶۔ عبدالستار خاں
۶۹۷۔ محمد حسین

۶۹۸۔ شیخ کریم الدین
۶۹۹۔ محمد یوسف
۷۰۰۔ شیخ چاند
۷۰۱۔ محمد امام
۷۰۲۔ محمد قاسم
۷۰۳۔ گوبند سنگھ
۷۰۴۔ مہادیو
۷۰۵۔ بھاگوت
۷۰۶۔ نام دیو
۷۰۷۔ ابھی مان راؤ
۷۱۰۔ منوہر
۷۱۱۔ نیورتی

مرکز پرینڈہ (اناث)

کامیاب

۷۱۳۔ اصغری بیگم
۷۱۵۔ بسم اللہ بی
(مرکز میں اول)

مرکز میدک (اناث)

کامیاب بدرجۂ امتیاز

۷۲۶۔ جم النساء بیگم (مرکز میں اول)

کامیاب

۷۱۶۔ صغرا بیگم
۷۱۷۔ قمر النساء بیگم
۷۱۸۔ محمودی بیگم
۷۱۹۔ محمود النساء بیگم
۷۲۰۔ حلیم النساء بیگم
۷۲۱۔ عظیم النساء بیگم
۷۲۲۔ سعید النساء بیگم
۷۲۳۔ زاہرہ بیگم
۷۲۴۔ محمودی بیگم
۷۲۵۔ عظیم النساء بیگم
۷۲۷۔ یٰسین بیگم
۷۲۸۔ عزیز بی
۷۲۹۔ خواجہ بیگم
۷۳۰۔ رقیہ بیگم
۷۳۱۔ کلاوتی بائی
۷۳۲۔ رحمت النساء
۷۳۳۔ اختر النساء بیگم
۷۳۴۔ فاطمہ بی
۷۳۵۔ حمیدہ بیگم
۷۳۶۔ بشیر النساء بیگم
۷۳۷۔ ظہور النساء بیگم
۷۳۸۔ غوثیہ بیگم
۷۳۹۔ حلیمہ بی
۷۴۰۔ معین النساء بیگم
۷۴۱۔ عابدہ بیگم
۷۴۲۔ رابعہ بیگم
۷۴۳۔ سعید النساء بیگم
۷۴۴۔ قمر النساء بیگم
۷۴۵۔ فاطمہ بی
۷۴۶۔ صدیقہ بیگم
۷۴۷۔ قطب النساء بیگم
۷۴۸۔ طاہرہ بیگم

مرکز اورنگ آباد (ذکور)

کامیاب

۷۵۰۔ میر محمد علی
۷۵۲۔ محمد عثمان
۷۵۳۔ سید یوسف
۷۵۴۔ سید یعقوب
۷۵۵۔ ریاست خاں
۷۵۶۔ سید قطب الدین
۷۵۷۔ احمد خاں
۷۵۹۔ عظیم الدین
۷۶۰۔ غلام غوث
۷۶۱۔ غیاث الدین
۷۶۵۔ سید غلام محی الدین
۷۶۶۔ مدن لال
۷۶۷۔ بارکو
۷۶۸۔ غلام غوث خاں
۷۷۱۔ بابو راؤ
۷۷۲۔ لکشمن راؤ
۷۴۹۔ سید مظفر مہدی
(مرکز میں اول)

مرکز گلبرگہ (ذکور)

کامیاب بدرجۂ امتیاز

۷۷۷۔ محمد عبدالرحمن
(مرکز میں اول)

کامیاب

۷۷۸۔ محمد اعظم علی خاں
۷۷۹۔ محمد لاڈلے
۷۸۱۔ سید محبوب

مرکز بلدہ (اناث)

کامیاب بدرجۂ امتیاز

۷۸۳۔ امۃ اللطیف
۷۸۸۔ محمودہ بیگم
۷۹۰۔ فاطمہ بیگم
۷۹۲۔ شجاعت النساء بیگم
۷۹۴۔ عزیز النساء بیگم
۷۹۷۔ کریم النساء بیگم
۸۰۳۔ سیدہ اختر النساء بی بی
۸۰۶۔ امۃ القدیر
۸۰۷۔ پتلی بیگم
۸۰۸۔ محبوب بیگم
۸۱۳۔ عابدہ بیگم
۸۱۴۔ بادشاہ بیگم
۸۱۵۔ شریفہ بی
۸۱۷۔ حشمت بیگم
۸۱۸۔ غوثیہ سلطانہ
۸۱۹۔ جیلانی بیگم
۸۲۰۔ مریم بی
۸۲۱۔ غوثیہ بیگم
۸۲۲۔ اقبال بیگم
(مرکز میں اول)

کامیاب

۷۸۲۔ صدیقہ بیگم
۷۸۴۔ آمنہ بیگم
۷۸۵۔ اقبال بیگم

۷۸۶۔ محبوب النساء بیگم
۷۸۸۔ عظیم النساء بیگم
۷۸۹۔ فریدہ بیگم
۷۹۴۔ اقبال بیگم
۷۹۵۔ آمنہ بی
۷۹۶۔ رحیم النساء بیگم
۸۰۲۔ حبیب النساء بیگم
۸۱۰۔ حسینی بیگم
۸۱۱۔ رشیدہ بیگم
۸۱۶۔ حشمت بی

۸۲۳۔ یوسف النساء بیگم

مرکز بلدہ (ذکور)

کامیاب بدرجۂ امتیاز

۸۲۴۔ سید احمد
۸۲۵۔ محمد ندیم اللہ
۸۲۶۔ جلال الدین محمد
۸۲۸۔ ولی اللہ حسینی
۸۳۳۔ پیر نذیر احمد
۸۳۴۔ محمد قاسم
۸۳۵۔ محمد مخدوم

۸۳۹۔ محمد عبداللہ خاں
۸۵۳۔ خواجہ سمیع اللہ (مرکز میں اول)
۸۵۴۔ کریم بیگ
۸۵۹۔ دلاور علی
۸۶۱۔ محسن علی خاں

کامیاب

۸۳۰۔ محمد امیر الدین
۸۳۱۔ وائی ناگندر راؤ
۸۴۰۔ عبدالرحمن

۸۴۱۔ غلام چشتی
۸۴۲۔ محمد ابراہیم
۸۴۳۔ محمد عثمان
۸۴۴۔ شیخ محبوب
۸۴۵۔ محمد شریف
۸۴۶۔ محمد شمس الرحمن
۸۴۷۔ شیخ المم
۸۵۸۔ مانیکم

نتیجہ امتحان اردو زباندانی بابت ۱۹۴۳ء

ناموں کی ترتیب بلحاظ نشانات محصلہ کی گئی ہے۔

۲۹۴۔ زہرہ بیگم (جواز نظام الدین) دوم
۲۱۴۔ محمد عبدالحمید (مرکز گلبرگہ) دوم

امیدواروں کے نام بلحاظ رول نمبر درج ذیل ہیں۔

مرکز بلدہ فوج

۱۔ سید علی بغدادی دوم (مرکز میں اول)

۲۔ محمود یافعی سوم
۴۔ عبدالرحمن بن سلیم سوم
۵۔ محمد قریشی سوم
۶۔ محمد صاعری سوم
۸۔ عبدالرحمن سوم
۹۔ رضا علی سوم
۱۰۔ محمد مراد سوم
۱۱۔ محمد حسن علی سوم
۱۲۔ حسن الدین سوم
۱۳۔ حسن خاں سوم
۱۴۔ محمد محی الدین احمد سوم

مرکز ویجاپور

۱۷۔ ایکناتھ راؤ سوم

۱۸۔ گوپی لال سوم
۲۰۔ معین الدین دوم (مرکز میں اول)
۲۲۔ شیخ لعل دوم
۳۰۔ حمید النساء سوم
۳۱۔ افضل خاتون سوم
۳۲۔ بی بی فخر النساء عرف حاجی بیگم دوم (مرکز میں اول)

مرکز گدوال

۳۴۔ سالم العیدروسی شاہین دوم (مرکز میں اول)
۳۶۔ احمد حسین سوم
۳۷۔ محبوب علی سوم

۴۲۔ محمد عبدالباسط سوم
۴۳۔ محمد عطاء الرحمن دوم
۴۴۔ سید محبوب سوم
۴۵۔ مرزا رحیم بیگ سوم
۴۶۔ رزاق محی الدین قاضی سوم
۴۷۔ محمد دولت نایک سوم
۴۸۔ وینکٹ رتنپا سوم
۴۹۔ رتنپا سوم
۵۰۔ ایم نارائن سوم
۵۶۔ واسنا سوم
۵۷۔ اقبال احمد دوم
۶۳۔ سعید النساء بیگم دوم (مرکز میں اول)

۲۲۱۔ بدرالنساء بیگم سوم

مرکز کلیانی

۶۶۔ شیخ احمد سوم
۶۷۔ خواجہ ابوالحسن سوم
۶۸۔ محمد اللہ بخش سوم
۶۹۔ سید یوسف سوم
۷۱۔ محمد عبدالرحیم سوم
۷۴۔ محمد فخرالدین سوم
۷۶۔ محمد عبدالحمید دوم
(مرکز میں اول)
۸۲۔ ملیا سوم
۸۴۔ گنڈیراؤ سوم
۸۵۔ زیب النساء بیگم دوم
(مرکز میں اول)
۸۶۔ رابعہ بیگم سوم
۸۷۔ نجم النساء بیگم سوم
۸۸۔ وزیرالنساء بیگم دوم
۸۹۔ زاہدہ بیگم دوم

مرکز چیتاپور

۹۰۔ محمد عظیم الدین حسینی جنیدی سوم
۹۱۔ شیخ محبوب دوم
۹۲۔ محمد عبدالحی سوم
۹۳۔ محمد محبوب علی ٹرلی سوم
۹۷۔ عبدالستار خاں یوسف زئی دوم
(مرکز میں اول)
۹۸۔ محمد نصیرالدین دوم
۹۹۔ محمد موسیٰ رضا دوم
۱۰۰۔ غلام محی الدین سوم
۱۰۱۔ چندہ حسین دوم
۱۰۲۔ عبدالرحیم خاں سوم
۱۰۳۔ شاہ محمد سوم
۱۰۴۔ محبوب علی سوم
۱۰۶۔ کریم بی دوم
۱۰۷۔ عزیز بانو عرف حسن پاشا دوم
(مرکز میں اول)
۱۰۸۔ رابعہ خانم دوم
۱۱۰۔ اقبال النساء بیگم دوم

مرکز ہمنا آباد

۱۱۲۔ امین الدین سوم
۱۱۳۔ محمد عبدالعلیم سوم
۱۱۴۔ محمد صلاح الدین دوم
(مرکز میں اول)
۱۱۵۔ عبدالرحمٰن دوم
(مرکز میں اول)

مرکز پربھنی

۱۱۷۔ خورشید احمد خاں سوم
۱۱۸۔ محمد ابراہیم سوم
۱۱۹۔ وارث حسین دوم
(مرکز میں اول)
۱۲۰۔ ترمبک راؤ رنگراؤ سوم
۱۲۱۔ سید مظفر حسین سوم
۱۲۲۔ غلام یزدانی دوم
۱۲۳۔ محمد اسحاق علیخاں سوم
۲۵۹۔ نیرالنساء بیگم دوم

مرکز بھوم

۱۲۹۔ تلجا پرشاد سوم
۱۳۲۔ سید ہارون سوم
۱۳۳۔ اسد اللہ خاں دوم
(مرکز میں اول)
۱۳۴۔ اسمٰعیل خاں سوم

مرکز رینا پور

۱۴۱۔ محمد عباس سوم
۱۴۲۔ الٰہی بخش دوم
(مرکز میں اول)
۱۴۴۔ پنڈھری سوم

مرکز کاماریڈی

۱۴۶۔ بالپوراؤ سوم
۱۵۴۔ احمد عبدالصمد دوم
(مرکز میں اول)
۱۵۵۔ شیخ حمید سوم
۱۵۶۔ محمد اعظم سوم
۱۵۷۔ پدی راجیا سوم

مرکز شاہ آباد

۱۵۸۔ شیخ چاند دوم
(مرکز میں اول)
۱۶۱۔ غلام رسول سوم
۱۶۲۔ محمد ابراہیم سوم

مرکز سائیگاؤں

۲۶۲۔ چراغ محی الدین سوم
(مرکز میں اول)
۲۶۳۔ سید عظیم الدین سوم
۲۶۹۔ سید ظفر علی سوم
۲۷۱۔ سید نوازالدین عسکری سوم
(مرکز میں اول)
۲۷۲۔ فرید بیگ سوم

مرکز جولہ نظام الدین

۲۸۱۔ بنکٹ دوم
۲۸۲۔ سید عبدالرحمٰن سوم
۲۸۴۔ عبدالغفور خاں سوم
۲۸۵۔ گرو داس دوم
(مرکز میں اول)
۲۸۸۔ سید غلام دستگیر سوم
۲۸۹۔ سید بشیر احمد سوم
۲۹۱۔ کیشو وٹھل راؤ دوم
۲۹۳۔ لطیفہ بیگم دوم
۲۹۴۔ زہرہ بیگم دوم
(مرکز میں اول)

مرکز ہنگولی

۲۹۵۔ حضور احمد سوم
۲۹۸۔ مرزا ارشاد بیگ سوم
(مرکز میں اول)
۲۹۹۔ عبدالرحیم خاں سوم

مرکز پٹن

۳۰۲۔ حسین میاں سوم

۲۰۴۔ الطاف حسین سوم
۲۰۵۔ عبدالخالق سوم
۲۰۶۔ محمد تمیز الدین دوم
۲۰۷۔ شیخ پیارے سوم
۲۰۹۔ چاند خاں سوم
۲۱۱۔ عبدالجبار سوم
۲۱۲۔ عبدالواحد سوم
۲۱۳۔ عبداللہ حسینی سوم
۲۱۵۔ سید یوسف سوم
۲۱۶۔ سید رحیم الدین دوم
(مرکز میں اول)
۲۱۷۔ محمد یٰسین سوم
۲۱۹۔ زینب بی سوم
۲۲۱۔ مجیب النساء بیگم سوم
۲۰۳۔ بشیر النساء بیگم سوم
(مرکز میں اول)

مرکز پرلی

۲۲۳۔ سید غلام مرتضیٰ دوم
(مرکز میں اول)
۲۳۱۔ عبدالکریم (مرکز میں اول) دوم
۲۲۴۔ محمد غوث سوم
۲۹۶۔ اظہر الدین صدیقی سوم
۳۳۵۔ اقبال النساء بیگم دوم
۳۳۶۔ اقبال النساء بیگم صدیقی دوم
۳۳۷۔ بسم اللہ بی دوم
۳۳۸۔ محمودہ بیگم دوم
۳۳۹۔ فرخ بیگم دوم
۳۴۰۔ غوثیہ بیگم دوم
(مرکز میں اول)
۳۴۱۔ فیروزہ بیگم سوم
۳۴۳۔ اقبال النساء بیگم سوم
۳۴۴۔ مظہر النساء بیگم سوم
۳۴۵۔ بدر النساء بیگم سوم
۳۴۶۔ اقبال النساء بیگم دوم
(مرکز میں اول)

مرکز پرینڈہ

۱۶۸۔ رحیم النساء بیگم سوم
۱۷۱۔ خاتون بی دوم
(مرکز میں اول)
۱۷۲۔ محمد عبدالرحمٰن دوم

مرکز میدک

۱۷۵۔ محبوب النساء بیگم سوم
۱۷۶۔ مظہر النساء بیگم سوم
۱۷۷۔ سلیم النساء بیگم سوم
۱۷۸۔ شیخہ سلطانہ سوم
۱۷۹۔ قدسیہ بیگم سوم
۱۸۰۔ قمر النساء بیگم (مرکز میں اول) سوم
۱۸۱۔ زہرہ بیگم سوم
۱۸۲۔ غوثیہ بیگم سوم

مرکز اورنگ آباد

۱۸۷۔ صفی احمد غازی سوم
(مرکز میں اول)
۱۹۴۔ بھیم راؤ سوم
(مرکز میں اول)
۱۹۷۔ صالحہ بیگم سوم
۱۹۹۔ حور جمال خاتون سوم
۲۰۰۔ خورشید بیگم سوم
۲۰۱۔ ساجدہ بیگم سوم
(مرکز میں اول)
۲۰۲۔ طیبہ خاتون سوم

مرکز گلبرگہ

۲۰۶۔ شیخ محبوب دوم
۲۰۸۔ گربسپا سوم
۲۰۹۔ لنگپا دوم
۲۱۰۔ شرنپا سوم
۲۱۱۔ ایپا سوم
۲۱۲۔ ملی ناتھ شرما سوم
۲۱۳۔ محمد عثمان خاں سوم
۲۱۴۔ محمد عبدالحمید دوم
(مرکز میں اول)

اناث

۲۱۶۔ خیر النساء بیگم سوم
۲۱۷۔ رحمت النساء بیگم دوم
(مرکز میں اول)
۲۱۸۔ عطیہ نصرت سوم

مرکز بلدہ

۳۴۸۔ خواجہ خورشید محی الدین احمد سوم
۳۴۹۔ محمد خیر المبین خیر سوم
۳۵۵۔ سید فضل اللہ حسینی دوم
۳۵۶۔ غلام جیلانی دوم
۳۵۷۔ محمد اسلم دوم
۳۵۸۔ مصباح الدین دوم
۳۶۰۔ محمد شریف سوم
۳۶۳۔ سید عبدالحی دوم
۳۶۷۔ محمد احمد محی الدین قادری دوم
(مرکز میں اول)
۳۷۸۔ سید بشیر احمد دوم
۳۷۹۔ سری نواس راؤ دوم
۳۸۳۔ سید عبدالکریم سوم
۳۸۷۔ محمد حفاظت علی صدیقی سوم

اناث

۲۱۹۔ غوث النساء بیگم سوم
۲۲۳۔ نکہت النساء بیگم سوم
۲۲۴۔ کریم النساء بیگم سوم
۲۲۵۔ امۃ النور عرف صالحہ سوم
۲۲۸۔ اصغری بیگم سوم
۲۳۰۔ خواجہ بیگم سوم
۲۳۱۔ سیدہ کنیز فاطمہ سوم
۲۳۲۔ سیدہ ملاحت فاطمہ سوم
۲۳۳۔ تراب النساء بیگم دوم
۲۳۵۔ رضیہ سلطانہ سوم
۲۳۶۔ اخیانہ بیگم سوم
۲۳۷۔ یٰسین بیگم سوم
۲۴۰۔ اظہر النساء بیگم سوم

۲۴۹۔ حفیظ النساء بیگم دوم
(مرکز میں اول)
۲۵۱۔ امۃ القیوم شرف النساء سوم
۲۵۲۔ امۃ المومن عصمت النساء بیگم
۲۵۴۔ نعیم النساء بیگم سوم
۲۵۵۔ حبیب النساء بیگم سوم
۲۵۶۔ نور النساء بیگم دوم
۲۵۷۔ تاج النساء سعیدہ بیگم سوم

(خوش نویسی)

مرکز بلدہ فوج

۲۔ شیخ عبدالعزیز سوم

مرکز ویجاپور

۴۔ قادر محی الدین سوم

مرکز گدوال

۶۔ سالم سدوسی شاہین دوم
(امتحان میں اول)
۷۔ شیخ عمر سوم

مرکز چیتاپور

۱۱۔ محمد یعقوب سوم

مرکز پربھنی

۱۴۔ محمد نصیر الدین فاروقی دوم

مرکز بلدہ

۱۶۔ محمد فضیل الدین فاروقی سوم

(اردو عالم)

۲۱۹۔ بی وی گوپال راؤ دوم طاول

ناموں کی ترتیب بلحاظ رول نمبر کی گئی ہے۔

مرکز بلدہ فوج

۱۔ محمد خلیل الرحمٰن دوم
۲۔ محمد عبدالباسط سوم
۳۔ شیخ کالو دوم
۷۔ محمد سلیمان دوم
۸۔ صالح بن عبود سوم
۹۔ محمد عبدالوہاب سوم
۱۰۔ مقبول حسین سوم
۱۲۔ حسین بن بریک دوم
۱۷۔ سید نصرت اللہ دوم
(مرکز میں اول)
۲۶۔ غلام حیدر علیخاں سوم

مرکز پوسیگاؤں

۳۰۔ عبدالغفار خاں سوم
(مرکز میں اول)
۳۱۔ اکبر خاں سوم
۳۲۔ سید موسیٰ سوم

اناث

۳۴۔ محبوب بی دوم
(مرکز میں اول)
۳۵۔ آمنہ بی سوم

مرکز ویجاپور

۳۶۔ نارائن راؤ دوم

۳۸۔ خالد دوم
۴۱۔ محمد خاں دوم
۴۲۔ شمس الدین سوم
۴۳۔ حبیب احمد دوم
(مرکز میں اول)
۴۵۔ رام چندر راؤ دوم
۴۸۔ گنگادھر راؤ سوم

اناث

۵۰۔ زبیدہ بیگم سوم

مرکز بلولی

۵۳۔ غلام معین الدین دوم
(مرکز میں اول)
۵۴۔ سید بشیر احمد سوم

مرکز گدوال

۶۲۔ محمد عبدالکریم سوم

اناث

۲۱۶۔ رحمت النساء بیگم سوم

مرکز کلیانی

۶۵۔ محمد کفایت حسین سوم

مرکز چیتاپور

۷۱۔ محمد عبدالجبار خاں سوم
۷۲۔ سید فرید علی دوم
۷۳۔ محمد اللہ بخش سوم
۷۵۔ محمد نثار الدین دوم
۷۶۔ محمد شریف الدین احمد دوم
(مرکز میں اول)

۷۷۔ محمد اسمٰعیل سوم

مرکز ہمناآباد

۷۹۔ سید محبوب حسن سوم
۸۱۔ محمد معین الدین سوم
۸۲۔ غلام رسول سوم
۸۵۔ محمد اسمٰعیل خاں سوم
۸۶۔ سید غیاث الدین دوم
۸۸۔ میر کاظم علی دوم
(مرکز میں اول)
۸۹۔ محمد عبدالقیوم سوم

مرکز پربھنی

۹۴۔ راجہ خاں دوم
(مرکز میں اول)
۹۶۔ پنڈت راؤ طرفدار سوم
۱۰۲۔ لکشمی نارائن سوم
۱۰۵۔ رنگناتھ راؤ سوریشانمہ دوم

مرکز بسمت

۱۱۶۔ محمد سجاد صدیقی دوم
(مرکز میں اول)
۱۱۷۔ غلام محمود سوم
۱۳۲۔ رام راؤ کھوت سوم
۱۳۴۔ سید جعفر علی سوم

اناث

۱۳۸۔ سعیدالنساء بیگم سوم
۱۳۹۔ عزیزالنساء بیگم دوم
(مرکز میں اول)

مرکز بھوم

۱۴۵۔ محمد نظام الدین سوم
۱۴۷۔ شیخ حبیب سوم
(مرکز میں اول)

مرکز نظام آباد

۱۴۸۔ محمد معین الدین سوم
(مرکز میں اول)
۱۵۱۔ محمد محبوب علی سوم

مرکز شاہ آباد (اناث)

۱۵۴۔ سلطانہ نجم النساء بیگم سوم

مرکز ہنگولی

۱۵۵۔ محمد عبدالرحمن دوم

اناث

۱۵۹۔ رضیہ بیگم رضی سوم
۱۶۰۔ عائشہ بیگم شمیمہ سوم و
۱۶۵۔ رضیہ بیگم (مرکز میں اول)
۱۶۱۔ صاحب بی سوم
۱۶۴۔ شاہ جہاں بیگم سوم

مرکز پٹن

۱۶۶۔ سید عبدالرشید حسینی دوم
(مرکز میں اول)
۱۶۷۔ محمد عبدالحفیظ مثنی سوم
۱۶۸۔ محمد عبیداللہ سوم
۱۶۹۔ سید معین الدین خطیب سوم

مرکز پرلی

۱۷۰۔ شامراؤ سوم
۱۸۱۔ محمد عبدالحمید صدیقی سوم
۱۸۲۔ سید نبی سوم
(مرکز میں اول)

مرکز پرینڈہ

۱۸۰۔ محمد اسالم سوم

مرکز اورنگ آباد

۱۸۹۔ ابوالخلق محمد عبدالخالق خلیق سوم
(مرکز میں اول)
۲۴۴۔ کرشنا راؤ جوشی دوم
(مرکز میں اول)
۲۴۲۔ لبن لال سوم
۲۵۰۔ سید سلطان محی الدین شطاری سوم
۲۵۱۔ بسم اللہ خاں سوم
۲۵۳۔ شیخ احمد صدیقی سوم
۲۵۴۔ ہنمنت راؤ ڈبیر سوم

اناث

۱۸۷۔ رابعہ بیگم سوم
۱۸۹۔ رابعہ بانو دوم
(مرکز میں اول)

مرکز گلبرگہ

۱۹۰۔ محمد فاروق حسین دوم
(مرکز میں اول)
۱۹۷۔ گنڈپا دوم
۱۹۹۔ ملا محمد ابراہیم دوم

اناث

۲۰۱۔ بیگم پاشا سوم

مرکز بلدہ

۲۱۹۔ بی وی گوپال راؤ اول
(مرکز میں اول)
۲۲۱۔ محمد بدرالدین سوم
۲۲۳۔ محمد عبدالستار دوم
۲۲۵۔ غازی الدین احمد سوم
۲۳۳۔ سید فیاض الدین سوم
۲۳۴۔ محمد عبدالمقتدر سوم
۲۳۶۔ سید محمد علی سوم
۲۳۷۔ عبدالستار دوم
۲۳۸۔ محمد عبدالرزاق سوم
۲۴۰۔ محمود اعظم شریف محمود سوم

اناث

۲۰۲۔ نعیم النساء بیگم سوم
۲۰۵۔ نذیر بیگم سوم
۲۰۸۔ لطف النساء بیگم دوم
(مرکز میں اول)
۲۱۲۔ امتہ الرؤف دوم
۲۱۳۔ معراج النساء دوم
۲۱۴۔ ہاجرہ بانو سوم
۲۱۵۔ تاج سلطان سوم

(اردو فاضل)

ناموں کی ترتیب بلحاظ نشانات محصلہ کی گئی ہے۔

۲۵۔ سید عباس علی جعفری دوم
۱۶۔ صغرا ماہر دوم

ناموں کی ترتیب بلحاظ رول نمبر کی گئی ہے۔

مرکز گدوال

۱۔ محمد عبداللطیف سوم

مرکز پربھنی

۳۔ سید داؤد ہاشمی سوم
۳۰۔ کبیر احمد خاں صوفی سوم
۳۱۔ وجاہت علی دوم
(مرکز میں اول)

مرکز بھوم

۵۔ محمد علی خاں علی سوم

مرکز ہنگولی

۶۔ احمد خاں ندیم سوم
۷۔ محمد عبدالرؤف اختر سوم
۸۔ محمد مصطفی خاں طالب سوم
۹۔ محمد ابراہیم شارق دوم
(مرکز میں اول)
۱۰۔ محمد اسمٰعیل خاں شارق سوم

اناث

۱۱۔ حمیدہ بیگم خورشید سوم

مرکز بلدہ

۲۱۔ محبوب علی زار سوم
۲۳۔ محمود خاں سوم

اناث

۱۳۔ پروین جہاں سوم
۱۴۔ عاشورہ بیگم سوم

امتحانات کے مرکزوں کی روئدادیں

(سلسلہ گزشتہ)

مرکز پٹن ضلع اورنگ آباد

حسب ایمائے معتمد صاحب ادارہ ادبیات اردو شاخ اورنگ آباد میں ۶ رمہر کو شام کی چھ بجے کی بس سے پٹن روانہ ہوا۔ ۸ رمہر سے امتحانات کا آغاز ہوا۔ مدرسہ وسطانیہ پٹن کی عمارت میں امتحان کا انتظام کیا گیا تھا۔ امتحان اردو دانی میں (۸) اردو زبان دانی میں (۱۰) اور اردو عالم میں چار امیدوار ذکور حاضر تھے۔ طالبات کے لئے علحدہ نشستوں کا انتظام کیا گیا۔ ان کی نگرانکاری کے فرائض محترمہ صدر معلمہ مدرسہ تحتانیہ پٹن نے انجام دیے۔ ہدایات مجوزہ صدر ادارہ کے مطابق تین روز ۸ تا ۱۰ رمہر امتحان جاری رہا۔ اردو دانی اور زبان دانی کے زبانی امتحانات ذکور کی حد تک خود میں نے لئے اور اناث کا زبانی امتحان صدر معلمہ صاحبہ نے لیا۔ انتظامات کے سلسلہ میں میں نے مقامی عہدہ داروں کی بے نیازی محسوس کی۔

۹ رمہر کو جناب منصرم تحصیلدار صاحب پٹن اور دیگر مقامی معززین نے معائنہ فرمایا اور اپنے تاثرات کو جن الفاظ میں قلمبند فرمایا ہے ان کی ایک ایک نقل باہذا منسلک ہے۔

مرکز پٹن میں میں نے ایک خاص امر یہ محسوس کیا کہ امیدواروں میں طلبائے مدرسہ کی تعداد بہت ہی کم تھی۔ زیادہ سے زیادہ ۱۰ فیصد طلبہ تھے اور بقیہ تمام خانگی طور پر کام کرنیوالے یا ایسے امیدوار تھے جو کسی سرکاری ادارے کے باقاعدہ طالب علم نہیں تھے۔ مقامی صدر ادارہ مسٹر ظفر مہدی معتمد ادارہ مسٹر احمد بن حسن اور مولوی غلام جیلانی صاحب ہاشمی مددگار مدرسہ وسطانیہ کی انتھک کوششوں کا اعتراف از بس ضروری ہے۔

حسب ہدایت صدر ادارہ پرچہ ہائے سوالات کے کھولتے کے وقت دو دو امیدواروں کی شہادت لی گئی اور یہ پرچہ شہادت باہذا مرسل ہے۔

ولی محمد خاں

مرکز پرینڈہ

۱۲ راگست روز جمعہ ۶ بجے شام نامپلی سے روانہ ہوکر دوسرے روز شنبہ ۵ بجے شام مرکز پرینڈہ پہونچا۔ یہاں مولوی قدرت اللہ صاحب قادری اور دیگر اصحاب نے استقبال کیا۔

میرے قیام کے لئے مدرسہ تحتانیہ میں انتظام کیا گیا تھا۔

۱۵ راگست کو ٹھیک ۱۰ بجے بموجب ہدایات ادارہ دو شرکاء کے روبرو مہر شدہ لفافہ جات چاک کئے گئے اور پرچہ جات تقسیم کرنے کے بعد امتحانات شروع کروائے گئے اور بعد ختم امتحان جوابی بیاض ۲ شرکاء کے روبرو لفافہ میں بند کرکے مہر کروا دیے گئے۔

اس طرح ۱۷ راگست کو امتحانات ختم ہوئے۔ بعد ختم امتحانات مولوی عبدالشکور صاحب شیدا نے اپنے پرجوش اشعار سنائے جو کہ جلسہ سالانہ تقسیم اسناد ادارہ ادبیات اردو پرینڈہ کے موقع پر پڑھے گئے تھے۔

۱۹ راگست ۵ بجے شام براہ لاری پرینڈہ سے روانہ ہوا اور صبح ۹ بجے اسٹیشن نامپلی پہونچا۔

امتحانات، قیام اور طعام کا انتظام معقول رہا۔ کسی قسم کی بدعنوانی پیش نہیں آئی۔

اناث کا انتظام بسم اللہ بیگم صاحبہ صدر معلمہ مدرسہ نسواں پرینڈہ اور مسز قدرت اللہ صاحب قادری کے سپرد رہا۔ حسب ذیل اصحاب نے نگرانی اور دیگر امور میں کافی دلچسپی اور مدد کی جو قابل تشکر ہیں۔

۱۔ مولوی سید قدرت اللہ صاحب قادری صدر مدرس مدرسہ تحتانیہ پرینڈہ
۲۔ " زین العابدین صاحب قریشی مددگار مدرسہ مذکور
۳۔ " سید مرتضیٰ حسین صاحب پیروکار پولیس۔
۴۔ مسٹر ہریشچندر راؤ مددگار مدرسہ او پالی
۵۔ بسم اللہ بیگم صاحب صدر معلمہ مدرسہ نسواں پرینڈہ۔
۶۔ مسز قدرت اللہ صاحب قادری۔

عبدالرزاق

مرکز چیتاپور

۸ر مہر ۱۳۵۲ف کو شب کے ۱۱ بجے اسٹیشن چیتاپور اترا۔ مولوی محبوب خاں صاحب معتمد شاخ چیتاپور مع طلبہ اسٹیشن پر تشریف فرما تھے۔ مسافر بنگلہ میں قیام کا انتظام کیا گیا تھا۔ ۹ر مہر کو امتحان شروع ہوا۔ امتحان کا انتظام مدرسہ وسطانیہ میں کیا گیا تھا۔ انتظام نہایت ہی بہتر تھا۔ ۹ر مہر کو عالیجناب تحصیلدار صاحب، جناب ڈاکٹر صاحب جاگیر، جناب اوورسیر صاحب جاگیر و جناب صدر مدرس صاحب مدرسہ معتمد صاحب اتحاد المسلمین بغرض معائنہ تشریف لائے تھے۔

۹ر مہر ۱۳۵۲ف کو ایک جلسہ منعقد کیا گیا جس میں عہدہ داران چیتاپور کو مدعو کیا گیا۔ اغراض و مقاصد ادارہ بیان کئے گئے۔ ۱۰ر مہر کو امتحان ختم ہوا۔

زنانہ مرکز کا امتحان مدرسہ تحتانیہ اناث میں لیا گیا تھا۔ صدر معلمہ صاحبہ مدرسہ اس کی صدر تھیں۔ مولوی محبوب خاں صاحب معتمد بڑی دلچسپی اور سرگرمی سے ادارے کے کام انجام دیتے ہیں۔ صاحب موصوف ہی کی برکت سے ادارے کے کاروبار بہترین حالت پر چل رہے ہیں۔

عالیجناب تحصیلدار صاحب جاگیر جو بڑے ذی اخلاق علم کے قدرداں ہیں اس ادارہ کی ہر طرح مدد فرما رہے ہیں۔

سید کلیم اللہ حسینی

مرکز شاہ آباد

اسٹیشن پر مولوی محمد ابراہیم صاحب معتمد، محمد سعید الدین صاحب اور عظیم الدین صاحب نے استقبال کیا اور پھول پہنائے۔ اس کے کچھ دیر بعد گلبرگہ سے مولوی نور الحسن صاحب بھی آگئے۔ ڈاک بنگلہ میں قیام کا انتظام کیا گیا تھا۔ ان حضرات سے مقامی حالات اور دیگر ضروری امور پر گفتگو ہوتی رہی اور تقریباً ۲ ½ بجے ان اصحاب کو خدا حافظ کہا۔

۸ر مہر ۱۳۵۲ف کو امتحان شروع ہوا۔ مدرسہ وسطانیہ شاہ آباد میں امتحان کے لئے باضابطہ انتظام کیا گیا تھا۔ صدر مدرس صاحب کی مہربانی اور اعانت سے امتحانات کی نگرانی اور انعقاد میں بہت سی سہولتیں بہم پہنچیں۔ امیدواروں کی کچھ تعداد غیر حاضر بھی رہی۔ اناث کے لئے علحدہ انتظام کیا گیا تھا۔ صدر معلمہ صاحبہ اور معلمہ صاحبہ نے اس خصوص میں اپنی ذاتی دلچسپی کا اظہار کیا اور امتحانات کے ختم ہونے تک نہایت ہی خوش اسلوبی سے مرکز اناث کی نگرانی کے فرائض انجام دیتی رہیں۔

۹ر مہر ۱۳۵۲ف مولوی عماد الدین صاحب اول تعلقدار، مولوی میر گوہر علی صاحب تحصیلدار، سول سرجن صاحب اور دیگر مقامی معززین سے ملاقاتیں کی گئیں۔ گفتگو کے دوران میں امتحانات کی تشہیر، تعلیم کا انتظام اور دیگر مقامی دشواریوں پر روشنی ڈالی گئی۔ مولوی عماد الدین صاحب اول تعلقدار کی ذاتی دلچسپیوں کے باعث شاہ آباد کے کارکنوں کو بہت سی سہولتیں حاصل ہیں۔ صاحب موصوف کے علاوہ مولوی میر گوہر علی صاحب تحصیلدار اور دیگر مقامی عہدہ داران و معززین کی اعانت و دلچسپی کو شاخ کی ترقی میں خاص دخل ہے۔ اس سلسلے میں مولوی نور الحسن صاحب اور انکے والد مولوی سید یحییٰ صاحب کا تذکرہ کرنا نہایت ضروری ہے جن کی بدولت شاخ کا قیام عمل آیا۔ یہ نوجوان طالب علم ہر چند گلبرگہ میں تعلیم کی غرض سے ٹھیرے ہوئے ہیں لیکن اس کے باوجود وقت بوقت ہر طرح شاخ کے کاموں میں برابر شریک ہوتے ہیں۔ ان کے علاوہ دوسرے نوجوان کارکنوں کی مستعدی بھی ہر طرح قابل ستائش ہے جنہوں نے نہ صرف اردو امتحانات کی تکمیل کی بلکہ اب وہ نہایت ہی خوش اسلوبی سے تعلیم و تدریس کے فرائض بھی انجام دے رہے ہیں۔

۱۰ر مہر ۱۳۵۲ف کو اول تعلقدار صاحب نے تحصیلدار صاحب کی معیت میں امتحان گاہ کا معائنہ کیا اور اپنے تاثرات قلمبند کر کے عنایت کئے۔ ان اصحاب سے بڑی دیر تک اردو امتحانات اور اضلاع میں ان کی ترویج و اشاعت کے امکانات پر گفتگو ہوتی رہی۔

شاہ آباد میں اردو عالم کے امتحان کی تعلیم کا انتظام بہت دشوار تھا۔ خاص کر اناث کی تعلیم کے لئے دو طرح کی دشواریاں حائل تھیں۔ اول تو تعلیم دینے والے افراد نہیں تھے اور دوسرے آمد و رفت کے لئے گاڑی کا انتظام بھی نہیں ہوا تھا۔ میں نے اس سلسلہ میں جناب اول تعلقدار صاحب سے گفتگو کی۔ صاحب موصوف نے وعدہ فرمایا ہے کہ تعلیم پانے والی خواتین کی آمد و رفت کے لئے گاڑی کا انتظام فرما دیں گے۔ اس کے علاوہ صاحب موصوف کی بیگم صاحبہ نے بھی اردو عالم کی خواتین کو تعلیم دینے پر آمادگی ظاہر فرمائی ہے۔ توقع ہے کہ اس موقع سے مقامی خواتین فائدہ اٹھائیں گی۔ خصوصیت کے ساتھ معلمات مدرسہ نسواں کو اس طرف متوجہ کیا گیا ہے تاکہ اس طرح نہ صرف ان کو اپنی معلومات کو ترقی دینے کا موقع ملے گا بلکہ ان کے ساتھ دوسری خواتین بھی استفادہ کریں گی۔

میں نے محسوس کیا کہ تدریس کے کام میں بہت زیادہ باضابطگی کی ضرورت ہے۔ چنانچہ اس مقصد کے پیش نظر مولوی ابراہیم علی صاحب معتمد شاخ جن کی محبت ایثار اور دلچسپی سے شاخ آئے دن ترقی کر رہی ہے ایک حلقۂ تدریس بھی قائم کیا ہے جس کے دائمی صدر مدرس صاحب مقرر کئے گئے ہیں۔ صدر مدرس صاحب کی امانت کی وجہ سے یہ توقع کی جاتی ہے کہ تدریس میں بھی باضابطگی پیدا ہو جائے گی۔ اس حلقۂ تدریس میں مقامی معتمد صاحب شاخ بھی شریک رہیں گے تاکہ وہ اس کی تدریسی کارروائیوں سے واقف ہو کر مرکزی ادارہ کو مطلع کرتے رہیں۔

۱۰ مہر ۱۳۵۲ف بعد نماز مغرب ایک عام جلسہ مولوی عماد الدین صاحب اول تعلقدار کی صدارت میں منعقد ہوا جس میں مولوی نور الحسن صاحب کی تعارفی تقریر کے بعد میں نے اردو امتحانات کے اغراض و مقاصد، اردو کی اہمیت اور ان پڑھوں کی تعلیم کے فوائد پر روشنی ڈالتے ہوئے شاخ شاہ آباد سے متعلق اپنے خیالات ظاہر کئے اور اس کے علاوہ بعض تجاویز بھی پیش کیں۔ جناب صدر نے اپنی اختتامی تقریر میں اپنی گہری دلچسپی کا اظہار کرتے ہوئے ان تجاویز کو عملی جامہ پہنانے کا وعدہ فرمایا۔

۱۰ مہر ۱۳۵۲ف کو تقریباً ۸ ساعت شام دار المطالعہ و دفتر شاخ ادارہ کا معائنہ کیا گیا جو مولوی نور الحسن صاحب کے مکان میں ہے۔ اس کے لئے ایک حصہ مختص کر دیا گیا ہے۔ میری رائے میں دار المطالعہ اور شاخ کو کسی ایک مرکزی مقام پر منتقل کرنا ضروری تھا چنانچہ میں نے اپنی تقریر کے دوران میں اس کی طرف بھی توجہ دلائی تھی۔ جلسہ ختم ہونے کے بعد مولوی عماد الدین صاحب اول تعلقدار اور مولوی میر گوہر علی صاحب و دیگر مقامی معززین کی معیت میں سرکاری کلب کے پچھلے حصہ کا معائنہ کیا گیا میری رائے میں دار المطالعہ کے لئے اس سے بہتر کوئی اور مقام نہیں ہو سکتا۔ چنانچہ اول تعلقدار صاحب نے بھی اجازت مرحمت فرمائی ہے۔ اس حصہ میں نہ صرف مطالعہ کے لئے وسیع دالان موجود ہے بلکہ کتب وغیرہ محفوظ رکھنے کے لئے ایک علحدہ کمرہ بھی ہے۔

رحیم الدین کمال

مرکز کلیانی

۱۲ مہر ۱۳۵۲ف روز شنبہ تقریباً ساڑھے پانچ بجے کلیانی پہنچا۔ معزز کارکنان شاخ ادارہ منتظر کھڑے پانی میں بھیگ رہے تھے۔ یہیں سے مجھے ان کے خلوص اور محبت کا آہستہ آہستہ اندازہ ہونے لگا اور اپنی واپسی تک میں نے قطعی رائے قائم کر لی کہ ان حضرات کی مہمان نوازی اور بے لوث جذبۂ خدمت صرف انہی کا حصہ ہے۔ مساف
میں میرا قیام رہا جہاں میرے لئے ساری سہولتیں مہیا کی گئی تھیں
اور میں نے محسوس کیا کہ بعد اوقات امتحان بھی میں کبھی بیکار نہیں رہ

ان تمام نوجوان حضرات نے جو اپنے پہلو میں ایک تڑپتا ہوا دل رکھتے ہیں اور عمل و حرکت میں زندگی کا راز پاتے ہیں مجھے کسی وقت بھی بیکار رہنے کا موقع نہ دیا۔

مورخہ [illegible] کی صبح امتحانات کا آغاز ہوا۔ مدرسہ سلطانیہ کے کھلے ہالوں میں نشستوں کا انتظام باقاعدگی کے ساتھ کیا گیا تھا اور یہی اصول پیش نظر رکھا گیا تھا جو عموماً جامعاتی امتحانات میں ہوتا ہے۔ اردو عالم کے آٹھ امیدواروں نے بڑی دلچسپی کا اظہار کیا اور سوالاتی پرچوں سے نہایت مطمئن نظر آئے۔ اسی روز خوشنویسی کا بھی پرچہ دیا گیا۔ خوشنویسی کا ایک پرچہ دراصل اردو عالم کے "اختیاری خوشنویسی" کا پرچہ ہوتا ہے جس کا اعلان اگر ادارہ کی جانب سے ہو جائے یا کم از کم نظام الاوقات یا ہال ٹکٹ میں اس کی صراحت کر دی جائے تو مناسب ہے۔ امتحانات کی تنظیم اور شاخ کے سارے کاروبار سے متعلق جن حضرات کی سعی و کوشش قابل ذکر ہے وہ مولوی عطا اللہ صاحب عطاؔ اور مولوی عبدالکریم صاحب وکیل ہیں۔ مولوی عطاء اللہ صاحب عطاؔ خود اچھے شاعر اور بلند پایہ رباعی گو ہونے کے علاوہ زبان و ادب اردو کے ان خیر خواہوں میں ہیں جنھیں کلیانی میں ہمیشہ یاد کیا جاتا رہے گا۔ ان کو ادارہ کے مقاصد اور اردو کی ہمہ گیری سے بڑی دلچسپی ہے اور جن طریقوں پر وہ اردو کی تبلیغ اور زبان کو عام فہم بنانے کی کوشش کرتے ہیں، وہ قابل ستائش ہے۔ اسی طرح مولوی عبدالکریم صاحب ایک جوان صالح ہیں۔ خود شاعر تو نہیں لیکن شعر فہمی کا مادہ ضرور رکھتے ہیں۔ نہایت خلیق اور منکسر المزاج اردو کی خدمت اور تبلیغ کو اپنا نصب العین قرار دیا ہے۔ امتحانات کی تنظیم میں ان کا بڑا حصہ رہا ہے، مستعدی سے کام کرتے ہیں اور ہمیشہ ہر کام کے افادی پہلو کو پیش نظر رکھتے ہیں۔ یہ دو حضرات شاخ کلیانی کے روح رواں ہیں۔ دیگر نوجوان حضرات میں مولوی معین الدین صاحب معینؔ، مولوی خیر الدین صاحب منتظم دارالمطالعہ، مولوی محمد علی خان صاحب معتمد شعبہ طلبہ، مسٹر بابو راؤ اور مسٹر مہادیو راؤ کے سامی قابل ذکر ہیں۔ مولوی سبحانی صاحب منصف، مولوی نظام علی خاں صاحب نگران کار تعلقدار، مسٹر واسن راؤ مددگار تعلقدار اور مولوی اسمٰعیل خان صاحب وکیل بھی قابل ذکر ہیں۔ خصوصاً منصف صاحب کا تعاون کارکنان شاخ کے لئے ہمت افزائی کا موجب ہے۔ انھوں نے اپنی صاحبزادیوں کو امتحان اردو دانی میں شریک کرا کے عملی تعاون کا بھی کافی ثبوت دیا ہے۔ متذکرہ بالا حضرات نے دوران امتحان، تشریف لا کر معائنہ فرمایا اور اپنے تاثرات کا اظہار بھی تحریراً کیا ہے جو رپورٹ کے ساتھ منسلک ہے۔

اسی شام کتب خانہ شاخ کے معائنہ کا مجھے موقع ملا۔ میں ان حضرات کی علمی جستجو اور شوق مطالعہ سے بہت متاثر ہوا۔ اس کتب خانہ کی بنیاد ۱۹۳۵ء میں رکھی گئی تھی اور اس وقت تک کتابوں کی تعداد ۱۲۱۴ تک پہونچ چکی ہیں۔ جس کا معتدبہ حصہ ادارہ کی مطبوعات پر مشتمل ہے۔ تاہم ادارہ کی دیگر مطبوعات یہاں موجود نہیں۔ میں مہتمم ادارہ سے درخواست کرونگا کہ بعجلت ممکنہ ادارہ کی وہ کتابیں جو کلیانی کے کتب خانہ میں موجود نہیں روانہ فرماویں تاکہ ان کے ہاں ان مطبوعات کا مکمل سٹ رہے۔ سال کے آغاز سے اس وقت تک مطالعہ کنندگان کی تعداد چار ہزار سے اونچی ہی ہے جو عوام کے شوق کا پتہ دیتی ہے۔ اخبار و رسائل بھی کافی تعداد میں موجود ہیں۔ روزناموں میں "رہبر دکن" ہفتہ واری اخباروں میں "دین و دنیا" پندرہ روزہ اخباروں میں "ہماری زبان" اور ماہناموں میں "سب رس" "کامیاب" اور "کہکشاں" جاری ہیں۔ یہ اعداد و شمار کلیانی کے عوام کے شوق کے علاوہ کارکنان شاخ کی محنت اور مستعدی پر دلالت کرتے ہیں۔ دارالمطالعہ کے لئے ایک مکان کرایہ پر لیا گیا ہے، لیکن ایسا مکان ڈھونڈ لیا جائے جو مرکزی ہو تو زیادہ مناسب ہے۔ بہتر قسم کے فرنیچر کی بھی ضرورت ہے جس کے لئے معزز کارکنوں کی سعی جاری ہے۔ بہر حال کتب خانہ اور دارالمطالعہ ضروریات کے لحاظ سے کافی ہیں۔ (باقی آئندہ)

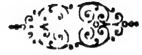
[illegible]

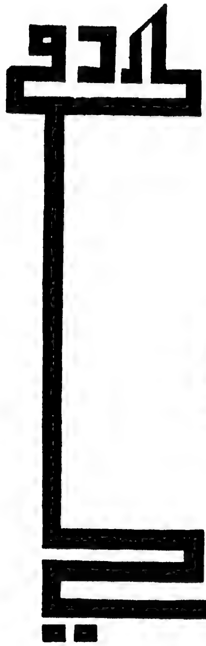
ادارۂ ادبیات اردو کی کتابیں

نام کتاب	صفحات	روپیہ	آنہ	پائی
من کی بیتا ...	۸۰	۰	۸	۰
سرگزشت غالب ...	۶۴	۰	۸	۰
نظام الملک ...	۴۰	۰	۴	۰
تاریخ گولکنڈہ ...	۳۳۰	۳	۸	۰
ربکبو نمبر (۸ تصاویر)	۱۶۰	۱	۰	۰
ارمغان جذب ...	۱۲۰	۰	۱۲	۰
سوتیلی ماں ...	۴۸	۰	۴	۰
سر سید احمد خاں ...	۱۶	۰	۲	۰
سر سالار جنگ ...	۴۸	۰	۶	۰
مغربی تصانیف کے اردو تراجم	۱۴۵	۱	۴	۰
محبت کی چھاؤں ...	۱۳۲	۱	۴	۰
اقبال نمبر ...	۱۶۸	۱	۴	۰
سائنس کے کرشمے ...	۱۱۲	۱	۰	۰
شعرائے عثمانیہ ...	۲۳۰	۲	۱۲	۰
مکتوبات شاد عظیم آبادی	۳۰۰	۲	۸	۰
دادا بھائی ...	۱۶	۰	۲	۰
اردو نامہ ...	۲۰۰	۲	۰	۰
ارسطو جاہ ...	۶۵	۰	۶	۰
عماد الملک ...	۴۰	۰	۶	۰
اردو دانی کی پہلی کتاب	۵۶	۰	۵	۰
دوسری کتاب	۵۶	۰	۵	۰
محمد حسین آزاد ...	۲۰۰	۲	۰	۰
کاغذ کی ناؤ ...	۱۲۰	۱	۴	۰
فن تقریر ...	۹۲	۰	۸	۰
مقدمہ تاریخ دکن ...	۱۴۴	۱	۰	۰
ہندستانی تمدن ...	۳۴۰	۳	۸	۰
پودوں کی کہانی	۸۰	-	۱۰	۰
مہ لقا ...	۱۰۰	۱	۰	۰
پانی کی کہانی ...	۴۸	۰	۶	۰
سر سایل طلبہ ...	۳۱۲	۲	۸	۰
سلک گوہریں ...	۴۰	۰	۴	۰
تاریخ ادب اردو ...	۱۷۶	۱	۴	۰
ورڈس ورتھ اور اسکی شاعری	۱۸۴	۱	۴	۰
ہوش کے ناخن	۹۴	۱	۰	۰
یوسف ہندی قید فرنگ میں	۸۹	۱	۰	۰
شاد اقبال	۱۷۶	۲	۸	۰
آریائی زبانیں ...	۱۰۴	۱	۰	۰
نظام علی خاں ...	۳۲	۰	۴	۰
عرب اور عربستان ...	۵۶	۰	۱۰	۰
سچ کا جادو ..	۴۸	۰	۴	۰
ٹیگور اور ان کی شاعری	۱۲۸	۱	۴	۰
متاع سخن ...	۲۲۴	۰	۱۲	۰
کیف سخن ...	۱۲۲	۰	۱۲	۰
بادۂ سخن ...	۱۲۷	۰	۱۲	۰
سراج سخن ...	۱۵۲	۰	۱۲	۰
ایمان سخن ..	۱۲۰	۰	۱۲	۰
فیض سخن ...	۱۴۴	۰	۱۲	۰
مرقع سخن جلد اول (۵۵) تصاویر	۵۰۰	۵	۰	۰
دوم (۵۰)	۴۳۲	۵	۰	۰
نقد سخن ...	۱۷۵	۱	۰	۰
نذر ولی ...	۲۴۸	۲	۸	۰
گریہ و تبسم ...	۱۹۲	۲	۰	۰
مشاہیر قندھار دکن	۱۸۴	۱	۰	۰
من کی دنیا ...	۱۴۵	۱	۰	۰
مدراس میں اردو	۱۹۶	۱	۸	۰
محرم نامہ ...	۱۱۲	۱	۰	۰
نذر دکن ...	۱۰۴	۱	۴	۰
روح غالب ...	۲۴۰	۲	۸	۰
عاصم ...	۲۰۰	۱	۴	۰
دفتری معلومات ...	۵۶	۰	۶	۰
آبدوز کشتیاں اور سرنگ	۴۸	۰	[illegible]	۰
اردو مثنوی کا ارتقاء	۱۴۳	۱	۱۲	۰
نمود زندگی ...	۲۱۶	۱	۸	۰
سرگذشت ادارہ	۳۰۴	۰	۱۲	۰
میر محمد مومن (۳۴) تصاویر	۳۱۲	۲	۸	۰
بلقان	۳۲	۰	۳	۰
خطابیات	۱۱۲	۰	۱۲	۰
علم خانہ داری ...	۱۵۰	۱	۰	۰
چیونٹی (۱۶) تصاویر	۱۱۸	۱	۸	۰
انوار ...	۱۹۸	۱	۸	۰
کشمش ثانی (۴) تصاویر	۸۰	۰	۱۰	۰
گارساں دتاسی ...	۱۲۸	۱	۴	۰
رات کا بھولا	۱۹۸	۱	۰	۰
سکندر جاہ ...	۲۴	۰	۴	۰
بلاغت ...	۵۹	۰	۸	۰
ادارہ سفر ۱۹۳۲ء میں	۲۰۰	-	۸	۰
ناصر الدولہ ...	۳۴	۰	۴	۰

مطبوعہ اعظم اسٹیم پریس حیدرآباد دکن

سب رس







حیدرآباد دکن

سنہ ۱۹۴۲ع

ادارۂ ادبیات اُردو حیدرآباد دکن کا ماہ نامہ

نشان پتہ آصفیہ ۱۵۳
نشان پتہ برطانیہ ایم - ۳۹۵۰
ٹیلی فون نمبر ۲۲۰۹
چندہ سالانہ چار روپے آٹھ آنے
بچوں کا سب رس ایک روپیہ آٹھ آنے
قیمت فی پرچہ ۸/

سب رس

زیرنگرانی
ڈاکٹر سید محی الدین قادری زورؔ
مجلس ادارت
خواجہ حمید الدین بی اے
سکینہ بیگم
عبدالحفیظ صدیقی بی ایس سی

جلد ۶ بابت ماہ نومبر ۱۹۴۳ء شمارہ ۱۱

(نوٹ - صفحات ۳۳ تا ۴۰ بعض ناگزیر طباعتی دقتوں کی وجہ سے شریک نہ ہو سکے)

خواجہ حمید الدین بی اے (عثمانیہ) کے اہتمام سے اعظم اسٹیم پریس میں طبع ہو کر خیریت آباد سے شائع ہوا

کلامِ وجد

شمیمِ زلفِ یار آئے نہ آئے
مرے دل کو قرار آئے نہ آئے

ابھی آیا ہے ہوش اے یادِ جاناں!
نہ تڑپا بار بار آئے نہ آئے

چراغِ زندگانی بجھ رہا ہے
وہ جانِ انتظار آئے نہ آئے

کیا جو تم نے اپنے دل سے پوچھو
ہمارا اعتبار آئے نہ آئے

نگاہِ اہلِ گلشن کہہ رہی ہے
خزاں جائے، بہار آئے نہ آئے

بڑھے گا کارواں منزل بہ منزل
غبارِ رہگزار آئے نہ آئے

("نوترنگ" کا ایک صفحہ)

سکندر علی وجد

ساقی

وہ ساقی ہے مرا جس کا تصور دل کی جنت ہے
اسی کی یاد سے اب زندگی میری عبارت ہے

اداہیں دلنوازی اور نظر سے بادہ افشانی
لبوں سے گل فروشی اللہ اللہ کیا لطافت ہے

وہ چلتا ہے تو فتنے چومتے ہیں اس کے قدموں کو
خرامِ ناز کا انداز کیا ہے اک قیامت ہے

جمالِ سحرکار اس کا غرور آشکار اس کا!
کہیں رازِ محبت ہے کہیں عینِ محبت ہے

چمن میں رُت کی رُت بدلی جو وہ فتنہ خرام آیا
ہوا سنکی، سحاب اٹھا، مسرت کا پیام آیا

نظامِ رنگ و بُو نے اک حیاتِ جاوداں پائی
اِدھر پھولوں نے کروٹ لی اُدھر گردش میں جام آیا

مسرت کے ترانے دل کے چھیڑے عندلیبوں نے
چمن میں شور اٹھا پیکرِ حسنِ دوام آیا

وہ شوقِ دید کا عالم وہ بے تابی وہ حیرانی
چمن کا ذرہ ذرہ اٹھ کے جب بہرِ سلام آیا

کچھ اس انداز سے ہونے لگی پھر بادہ پیمائی
نگاہوں میں خودی اور بے خودی کا ہر مقام آیا

نئی اک آگ بھڑکادی دلوں میں بادہ نوشوں کے
مرا ساقی جب آیا بزم میں آتش بہ جام آیا

علی اشرف

تکمیل

(ایک ریڈیائی ڈراما)

مصور۔ پنڈت جی (دور کی آواز)

نوکر۔ کون ہے بھائی۔

مصور۔ پنڈت جی سے کہو مصور ملنا چاہتا ہے۔

نوکر۔ آپ اوپر تشریف لے آیئے پنڈت جی تو ابھی پوجا سے نہیں اٹھے۔

(چاپ۔ سیڑھیاں چڑھتا ہے)

پنڈت۔ رادھے شیام! میری بینتی سنو تم
رادھے شیام! میری بینتی سنو تم
تو میری جھولی بھر دے سئیاں
تو میری جھولی، تو میری جھولی

ہے درگے ماتا سب کے من کی بھاؤ نا پوری کر۔ جیسی مراد لے کو کوئی تیرے پاس آئے اُسے ویسا ہی پھل دے۔ اپنے داس کے پشپ سوکیار کر۔ درگے! درگے!! درگے!!!

(چاپ)

مصور۔ پرنام پنڈت جی۔

پنڈت۔ کہئے آج صبح صبح کیونکر آنا ہوا۔

مصور۔ سوچا پنڈت جی کے درشن کر آؤں۔ اور خواب

پنڈت۔ خواب کی تعبیر پوچھنے آئے ہو۔ ذرا ٹھیرو۔ میں کنڈلی بنالوں۔

(سلیٹ پنسل کی آواز)

وقفہ

ہاں اب فرمائیے۔

مصور۔ رات میں نے خواب میں دیکھا کہ ایک سنگ تراش۔

سنگ تراش۔ مستقبل کا یہ ہیبتناک بت۔ جسے تراشنے کی میں سعی کر رہا ہوں۔ آہاہا۔ حرص کا اندھا طوفان ہے۔ مورخ!

مورخ! یکھو کی شاخیں محبت کے خاموش پجاریوں سے لپٹ لپٹ کر روہی ہیں۔

مورخ۔ تمہاری آنکھوں میں وحشت کی تحریریں جھلملا رہی ہیں

سنگ تراش۔ میری آنکھیں دیکھنے کی تاب نہیں لاسکتیں۔

سنگ تراش۔ لیکن یہ سب کچھ تمھیں دیکھنا ہی ہوگا۔

مورخ۔ اخلاق کی تضحیک؟

سنگ تراش۔ ابلیس اور انسان کے دماغ کا ملاپ۔ انسانیت کا خون۔ یقینی اور لازمی ہے۔ آہاہا..........

مورخ۔ او نابکار! یہ کیا بنا دیا تو نے۔

سنگ تراش۔ مسجد کا محراب تیار ہو چکا ہے۔ جھکی ہوئی ہزارہا جبینوں کو دیکھا؟

مورخ۔ ہاں دیکھا۔

سنگ تراش۔ وہ دیکھو۔ میناروں سے دور۔ آفتاب عالمتاب زیست کی آخری ہچکیاں لے رہا ہے۔

مورخ۔ یہ سب کس لئے۔ لشکر جرار۔ تنی ہوئی تلواریں۔ سوار پیادے، نیزے، توپیں، تلواریں، جنگ کے جملہ سامان آخر کس لئے۔

سنگ تراش۔ ایمان اور کفر کا سودا چکانے کے لئے اور کس لئے ماؤں کی گود میں بھوک سے بلکتے ہوئے بچوں کو دیکھو مورخ! اڑتی ہوئی چیلوں کی چونچوں میں انسانوں کی کھوپڑیوں پر بھی غور کرو۔ کہو! محبت ایسے المناک ماحول میں پرورش پاسکتی ہے؟

مورخ۔ سنگ تراش۔

سنگ تراش۔ یہ وہ بھیانک تصویر ہے جسے دیکھتے ہی نوجوانوں کے دل دہل جائیں گے۔ روحیں کانپ اٹھیں گی۔ دنیا لرزہ براندام ہو جائے گی۔ سمندر کی سطحوں پر لاشوں کے انبار، ان پر منڈلاتے ہوئے گدھ، چیل کے غول۔ سرعت سے

بڑھتے ہوئے خونخوار گرجے ۔ تباہی ! تباہی !!

مورخ ۔ یہ نہ ہوگا ۔

سنگ تراش ۔ ہوگا، ضرور ہوگا ۔ اب یہ بوسیدہ نظام بدل کر ہی رہے گا ۔ آنے والی نسلیں اسے ہرگز ہرگز برداشت نہ کریں گی ۔ یہ ہے انسانی دماغ کے ساتھ قوت ابلیس کے گٹھ جوڑ کا نتیجہ ۔

(وقفہ)

پنڈت ۔ پھر کیا ہوا ۔

مصور ۔ پھر میں نے گرجتی ہوئی توپوں کی آوازیں سنی ۔ فولادی ٹینکوں کو ایک دوسرے سے ٹکراتے دیکھا ۔ مردوں سے اٹی ہوئی خندقیں، تڑپتے ہوئے لاشے، خون کی بہتی ہوئی ندیاں ۔ آہ ! شکستہ مساجد، مندر اور گرجے ۔ دو مورخ کی آنکھیں یہ سب کچھ دیکھ رہی تھیں ۔ دفعتاً اس نے (سنگ تراش نے) مورخ کو للکارا ۔

سنگ تراش ۔ دیکھی شیطان کے ہاتھوں قدرت کی شکست، یوں لوگ منزل سے بھٹک جاتے ہیں ۔

(وقفہ)

کس فکر میں ہو ۔ مورخ ! ؟

مورخ ۔ کتنا غلط استعمال ہے دماغ کا یہی سوچ رہا ہوں ۔

سنگ تراش ۔ میرے اچھے دوست ۔ خداوند کریم نے حضرتِ انسان کو دماغ عطا کر کے اشرف المخلوقات بنایا ۔ دماغوں کے ٹکرانے کا لازمی نتیجہ یہی ہوا کرتا ہے ۔

مورخ ۔ یوں تو لوگ ابلیس کے پجاری ہو جائیں گے ۔

سنگ تراش ۔ ہو جائیں گے ۔ مستقبل سے متعلق ہے ۔ حال کی بات کرو مورخ ۔ مستقبل کے متعلق بعد میں سوچا جائے گا ۔ ہو رہے ہیں کہو، ہو رہے ہیں ۔

مورخ ۔ یوں تو دنیا تباہ ہو جائے گی ۔

سنگ تراش ۔ تو پھر دکھا دو نا ۔ لوگوں کو صحیح راستہ تاکہ مذہب کی آڑ میں لڑی جانے والی لڑائیاں ہمیشہ ہمیشہ کے لئے ختم ہو جائیں ۔

مورخ ۔ مذہب کے جھگڑے مٹ گئے تو مذہبی پیشواؤں کو حلوا مانڈا کیونکر نصیب ہوگا ۔

سنگ تراش ۔ تاریخ کے اوراق کو الٹ دو مورخ ۔ یا خدا کو عزیز رکھو یا پھر خدا کے ان اجارہ داروں کو ۔

پنڈت ۔ رام، رام، رام، رام ۔

مصور ۔ اور پھر اس نے مورخ کو مذہب کی تشریح بھی لکھوائی پنڈت جی ۔

پنڈت ۔ کیا ——— ؟

سنگ تراش ۔ لکھو مورخ ۔

مورخ ۔ کیا لکھوں ؟

سنگ تراش ۔ مذہب ایک رشتہ ہے واحد انسان اور اس کے خدا کے مابین ایک روحانی رشتہ ہے ۔ اس رشتے میں کسی بھی دوسرے انسان کو دخل نہیں ۔ مداخلت کرنے والا خواہ اس کا باپ ہی کیوں نہ ہو ۔

مورخ ۔ بھلا اس سے فائدہ ۔

سنگ تراش ۔ اگر سادہ لوح انسان اس نکتے کو سمجھ لیں تو پھر کوئی کسی کو خدا کے نام پر جنگ کے لئے آمادہ نہ کر سکے ۔

مورخ ۔ ٹھیک، آگے ؟

سنگ تراش ۔ آگے جو تمہارے جی میں آئے وہ لکھو، میں سنگ تراش ہوں مورخ نہیں، تاریخ لکھنا تمہارا کام ہے جو جی میں آئے وہ لکھو ۔

مورخ ۔ تو اختتام کیونکر ہوگا ؟

سنگ تراش ۔ یوں ۔۔۔ (بتوں کے گرنے کی بلند آواز)

مصور ۔ یہ ہے وہ ادھوری کہانی پنڈت جی ۔ اور پھر جب میری آنکھ کھلی، تو دل بڑے زور سے دھک دھک کر رہا تھا ۔

پنڈت ۔ واقعی بہت بھیانک خواب دیکھا تم نے لیکن خیر ساتویں منگل اور پانچویں چندرما، شگون اچھے ہیں ۔ حسن کے دربار میں عزت پاؤ گے ۔ البتہ ایک رکاوٹ ہے ۔

مصور ۔ کیا فرمایا آپ نے ؟

پنڈت ۔ مصوری کو ختم کرنا ہوگا ۔ ورنہ یہ شادی نہ ہو سکے گی ۔

مصور ۔ اور کوئی اوپائے ؟

پنڈت ۔ چوتھے گھر شنی ہے ۔

مصور ۔ تو پھر شنی کی پوجا کر دیجئے نا مہاراج !

پنڈت ۔ ہت تیرے کی، ہوئی نا وہی بات ۔ میں کہتا ہوں میرا نجوم کبھی غلط نہیں ہوتا اچھا اچھا تو پھر پوجا کے روپے دیتے جاؤ میں کل سے درگا کا جاپ شروع کر دوں گا ۔ ایک ہزار ایک منتر ۔ مطلب ہوا باسٹھ روپے نو آنے پاٹ کے ۔ دو روپے سامگری اور دھوپ کے ۔ تیرہ آنے پشپ اور کیسر کے اور پانچ روپے متفرق کل میزان ہوا بہتر روپے چھ آنے ۔

مصور ۔ میں تو غریب مصور ہوں پنڈت جی ۔ میرے پاس اتنی رقم کہاں سے آئی ۔

پنڈت ۔ درگا ماتا کو پرسن کرنا آسان کام نہیں چترکار ۔ برش اور روغن سے یہاں کام نہیں چلنے کا ۔ سمجھے ؟

مصور ۔ ہاں مہاراج ۔

پنڈت ۔ اچھا اچھا تو یوں کام کرو ۔ ایک سو ایک جاپ کراؤ ۔ میں ماتا کو پرسن کرنے کی کوشش کروں گا ۔ تو نکالو ۔ چھ روپے پانچ آنے پاٹ کے اور سات روپے تیرہ آنے متفرقات ۔ جلدی کرو ۔ جلدی کرو ۔ میرے پاس وقت بہت کم ہے بھائی

مصور ۔ پنڈت جی آپ تو اتنے بڑے جیوتشی ہیں ۔ ابھی تک آپ کے نجوم نے آپ کو یہ نہیں بتایا ۔ کہ میری جیب میں اس وقت صرف نو پیسے ہیں ۔

پنڈت ۔ نو پیسے ؟ پھر یہ کھیل ادھورا ہی رہے گا ۔

مصور ۔ بہت اچھا مہاراج آپ ابھی اِسے نامکمل ہی رہنے دیجئے ۔ میں کہیں سے پیسے پیدا کرنے کی کوشش کروں گا ۔

پنڈت ۔ تو پھر جاتے کیوں نہیں ۔ میرے منہ کی طرف کیا دیکھتے ہو ۔ مردود کہیں کے ! میں کہتا ہوں ۔ میرا نجوم کبھی غلط نہیں ہوتا ۔ میں تو پہلے سے ہی جانتا تھا کہ ہوتا ہواتا کچھ نہیں ۔

(چاپ ۔ وقفہ)

مصور ۔ تعبیر اس طرح ہوگی ۔ میں اس طرح ۔ جان دے کر فن کی تکمیل ہوتی ہے ۔ دنیا دیکھے گی ۔

(کھٹ کھٹ کھٹ ۔ دروازے کا کھٹکنا)

افسانہ نگار ۔ مصور ! مصور !!

مصور ۔ کون ؟ افسانہ نگار تم ۔ صبح تک تمہارا پلاٹ مکمل ہوگا ۔

افسانہ نگار ۔ بھئی دروازہ تو کھولو ۔

مصور ۔ اس وقت دروازہ نہیں کھل سکتا ۔ فن کی تکمیل ہو رہی ہے ۔ سمجھے !

افسانہ نگار ۔ سنو تو ۔ میں ایک نکتے پر پہنچ گیا ہوں ۔ شاید اس سے کوئی مدد مل سکے ۔

مصور ۔ میں خود فیصلہ کر چکا ہوں ۔ اب یہ کہانی ادھوری نہ رہے گی ۔ صبح تک مسودہ تیار ہوگا ۔ آج میں اسے مکمل کر کے ہی دم لوں گا ۔

افسانہ نگار ۔ دروازہ نہیں کھولو گے ۔ جاؤں ؟

مصور ۔ بڑے شوق سے

افسانہ نگار ۔ اچھا ۔

مصور ۔ تمہاری تصویر کے آنچل میں میری روح کی شعاعیں رقص کر رہی ہیں ۔ ملکہ !

محبوبہ ۔ (خیالی آواز) مگر اب یہ سب کچھ بے کار ہے ۔

مصور ۔ عورتیں رحم دل ہوتی ہیں ۔ اے میرے شاہکار ! میں تجھ سے رحم کی بھیک مانگتا ہوں ۔ میرے دل میں محبت کی چنگاریاں بدستور سلگ رہی ہیں ۔ تیری نکہتِ محبت سے آج بھی میرے دل کی دنیا مہکی مہکی سی ہے ۔

محبوبہ ۔ تم نے کبھی آئینہ میں اپنا چہرہ دیکھا ہے ؟

مصور ۔ روز دیکھتا ہوں ۔

محبوبہ ۔ تمہیں کوئی تبدیلی دکھائی نہیں دیتی ۔

(کھٹ کھٹ کھٹ)

مصور ۔ کون ؟

آواز ۔ موت

مصور ۔ جاؤ مجھے اس وقت فرصت نہیں ۔ میں اپنے خدا سے باتیں کر رہا ہوں ۔ (کھٹ کھٹ کھٹ) میں کہتا ہوں چلے جاؤ سنا، تھوڑی دیر بعد آنا ۔

(وقفہ)

میری محبوبہ ! خاموش ہو گئی ۔ بولو ! بولو !!

محبوبہ ۔ مصور ۔ یہ سعیٔ لاحاصل ہے ۔

مصور ۔ میرے کشکول کی طرف دیکھو ۔

محبوبہ ۔ تم میرا تمسخر اڑا رہے ہو ۔ ؟

مصور ۔ پجاری دیوی کا تمسخر نہیں اڑایا کرتے ۔ آج تک امیدوں پر زندہ رہا ہوں ۔ اب ۔

محبوبہ ۔ ماضی کی لہروں سے حال کو دھو ڈالو ۔ مستقبل سامنے آجائے گا ۔

مصور ۔ میں نہیں سمجھا تمہارا مطلب ۔

محبوبہ ۔ نہیں سمجھے ۔ حسن مرچکا ۔

مصور ۔ لیکن عشق زندہ ہے ۔ محبوبہ !

محبوبہ ۔ اسے کسی حسین یادگار میں منتقل کر دو ۔

(پردے پھاڑ دیتا ہے فریم گرنے کی آواز)

مصور ۔ مصور گنگناتا ہے ۔

نوک مژہ پر آکر ہی آنسو کی قیمت ہوتی ہے
سیپ کے اندر جو پانی ہے سیپ کے باہر موتی ہے
میرے منہ سے ہوش کی باتیں سن کر تم کیوں ہنستے ہو
دیوانو ! تکمیل جنوں کی ہوتے ہوتے ہوتی ہے
جب تک دیوانہ زندہ تھا دنیا اس پر ہنستی تھی
دیوانے کے مرجانے پر اب دنیا کیوں روتی ہے

(ساتھ ساتھ برش اور پیالے کی آواز پردے کا ارتعاش)

تو تم عشق کی بھینٹ چاہتی تھیں نا ۔

(گرتا ہے)

(ایک طویل وقفے کے بعد)

ناقوس کی ہلکی ہلکی آواز کسی پرندے کی آواز تاکہ سحر کا پتہ چلے

(کھٹ کھٹ کھٹ)

افسانہ نگار ۔ مصور ! مصور ! ! صبح ہو چکی ۔ اٹھو نا کب تک سوئے رہو گے ۔ اٹھو بھئی

(پاؤں کی چاپ)

خریدار ۔ میری تصویر ۔ آج کا وعدہ ہے ۔ مجھے تو شام کی گاڑی سے جانا ہے

افسانہ نگار ۔ کوئی تصویر بننے دے رکھی ہے ؟

خریدار ۔ جی ہاں ۔

افسانہ نگار و خریدار بیک زبان۔

مصور۔ مصور۔

افسانہ نگار۔ ہیں۔ ہیں۔ ارے شگاف سے دیکھو تو۔ مصور زمین پر بے ہوش پڑا ہے۔

خریدار۔ دروازہ توڑ دو۔

(دروازہ ٹوٹنے کی آواز)

یہ تصویریں ٹوٹی ہوئیں۔ پردے پھٹے ہوئے

افسانہ نگار۔ ہیں! نبض بند۔

خریدار۔ مرگیا؟

افسانہ نگار۔ آہ! میں سمجھا یوں ہو رہی تھی فن کی تکمیل۔

آخری تصویر عشق کا شاہکار حسن کا مجسمہ۔ یہ کیا۔ دیوی کے چرنوں میں جان کی بھینٹ۔

بدنصیب مصور! یہ ہے تیرے فن کا کمال

خریدار۔ افسانہ نگار! یہ دیکھو۔ پیڈ پر کیا لکھا ہے۔

افسانہ نگار۔ نجومی کہتا تھا۔ کہانی ادھوری رہے گی۔ اس سے کہنا۔ مصور ختم ہو جاتا ہے۔ مصوری ختم نہیں ہوتی۔

افسر آذری

(لاہور)

نئی کتابیں

۱۔ بیماری سے بچو (متعدی امراض کے علاج) از [illegible] حجم ۲ ے صفحے قیمت ۸ر مکتبہ جامعہ دہلی۔

۲۔ کیا کانگریس ناکام رہی (کانگریس کی سیاسی زندگی کے چار دور) حجم ۱۳۰ 〃 〃 ۸ر جید برقی پریس۔ دہلی۔

۳۔ نغمۂ فردوس (مجموعۂ کلام) از چودھری خوشی محمد ناظر۔ زمیندار کالج۔ گجرات۔

۴۔ نئی راہیں (افسانے) مرتبہ قمر تسکین۔ حجم ۱۲۸ صفحے۔ قیمت عہ۔ حلقۂ احباب ترقی پسند۔ موہنی روڈ۔ لاہور۔

۵۔ طوفان تبسم۔ دوسرا ایڈیشن (مزاحیہ) از شوکت تھانوی۔ قیمت عا۔ صدیق بک ڈپو۔ لکھنؤ۔

۶۔ دل پھینک (مزاحیہ افسانے) از شوکت تھانوی قیمت عا ۔ 〃 〃 〃 〃

۷۔ بھوت (ڈراما) از مظہر عزیز قیمت عہ۔ اردو اکیڈمی۔ لاہور۔

۸۔ دل کی آواز (ناول) از قیسی رام پوری قیمت عہ کتابستان پوسٹ بکس (۴) ۳۱۶ بمبئی ۴

۹۔ سماج کے ستون (سوشل ڈراما) مترجمہ قیسی رام پوری قیمت ۸ر 〃 〃 〃 〃 〃

۱۰۔ ضرورۃ القرآن۔ از قاضی زاہد الحسینی حجم ۱۷۶ صفحے۔ دار الاشاعت و التبلیغ شمس آباد ضلع اٹک (پنجاب)

۱۱۔ سچی کہانیاں۔ از ڈاکٹر عندلیب شادانی حجم ۲۰۷ صفحے قیمت سے۔ کتب خانہ علم و ادب دہلی۔

۱۲۔ مسافر (افسانے) از بابو پریم چند قیمت عہ۔ عالم گیر بک ڈپو۔ لاہور۔

۱۳۔ ماسٹر صاحب (افسانہ) از ڈاکٹر ٹیگور قیمت ۱۰ر 〃 〃 〃 〃

۱۴۔ پھانسی (تین لڑکیوں کی سرگزشت) از تسکین قیمت عا۔ عالم گیر بک ڈپو۔ لاہور۔

۱۵۔ سیاست جاپان۔ از علی امام بلگرامی قیمت ۱۰ر ادارۂ اشاعت اردو، عابد روڈ۔ حیدرآباد دکن۔

۱۶۔ جنگ اور روپیہ از امتیاز حسین خاں بی۔کام قیمت ۱۰ر 〃 〃 〃 〃

۱۷۔ اردو کا سب سے بڑا شاعر (مصحفی کے حالات) از قاضی عبد الصمد صارم۔ حجم ۱۶۱ صفحے قیمت عہ۔ مکتبۂ ابراہیمیہ حیدرآباد۔

۱۸۔ سوامی (افسانے) از شرت چندر چٹرجی قیمت عا .... 〃 〃 〃 〃

۱۹۔ میرا پسندیدہ افسانہ (مشہور افسانہ نگاروں کے پسندیدہ افسانے) قیمت ۲ے .... 〃 〃 〃 〃 〃

۲۰۔ حسن کی عیاریاں (افسانے) از نیاز فتحپوری .... ۲ے 〃 〃 〃 〃 〃

۲۱۔ شیش محل (مشاہیر ادب کے حالات) از شوکت تھانوی .... ۲ے 〃 〃 〃 〃 〃

۲۲۔ رنگین لفافہ (مزاحیہ افسانے) از سید ابو تمیم فرید آبادی ..... ۱۲ر 〃 عہ۔ انجمن ترقی اردو۔ دہلی

۲۳۔ گدھوں میں بیداری (مزاحیہ) 〃 عہ 〃 〃 〃 〃 〃 〃

۲۴۔ واردات لاہور (ناول) 〃 عا 〃 〃 〃 〃 〃 〃

مرزا سیف علی خاں

سماج سدھار (سلسلہ گزشتہ)

شام کے وقت حسبِ معمول لیلاؔ ہیڈ ماسٹر صاحب کے پاس آئی اور کہا "کیوں، آج تفریح نہیں جائیں گے ہیڈ ماسٹر صاحب؟" ——"چلیں گے" —— ہیڈ ماسٹر صاحب نے اپنا کوٹ پہن لیا اور دونوں مکان کے باہر نکلے اور سیدھا اسی جگہ پہنچ گئے جہاں کہ وہ گزشتہ شام بیٹھے تھے —— "کیوں آپ بہت اداس نظر آرہے ہیں؟" —— لیلاؔ نے دریافت کیا "نہیں تو" "آپ کا چہرہ خود آپ کی پریشانی کا مظہر ہے" —— "بات یہ ہے لیلاؔ دیوی —— مجھے...... آپ کی حالت پر رحم آتا ہے۔" "اوہو! —— آپ میری وجہ سے پریشان ہیں —— مجھ بدنصیب کے لئے آپ کیوں خواہ مخواہ اپنا دل بھاری کر لیتے ہیں ——" لیلاؔ کا چہرہ جو اب تک ایک پھول کی طرح شگفتہ تھا اب زرد پڑتا گیا۔ ہیڈ ماسٹر صاحب نے جب یہ دیکھا کہ لیلاؔ اداس ہو گئی ہے تو انھوں نے فوراً باتوں کا رخ بدل دیا اور لائبریری کے متعلق باتیں کرنے لگے ——

کچھ دیر بعد لیلاؔ کے چہرہ کا رنگ آہستہ آہستہ واپس آنے لگا۔ وہ آہستہ —— کچھ گنگنانے لگی۔ ہیڈ ماسٹر صاحب خاموش تھے —— نہ معلوم کس سوچ میں تھے —— کچھ دیر یوں ہی بیٹھے رہے۔ یکایک ان کے سلسلۂ خیال کو ایک میٹھے اور دلنشیں گیت نے توڑ دیا —— لیلاؔ ندی کے پانی میں اپنے پیر لٹکائے ہوئے بیٹھی تھی —— وہ گیت لیلاؔ ہی الاپ رہی تھی —— ہیڈ ماسٹر صاحب نے اب تک لیلاؔ کو گاتے ہوئے نہیں سنا تھا۔ اس کی میٹھی آواز نے ان کے دل پر گہرا اثر کیا اور وہ آواز کی طرف کان لگا کر بیٹھ گئے ——

لیلاؔ نے گانا ختم کر دیا —— "لیلاؔ!" —— پہلی دفعہ ہیڈ ماسٹر صاحب کی زبان سے صرف "لیلاؔ" نکلا ورنہ وہ ہمیشہ لیلاؔ دیوی کہا کرتے تھے۔ "تم نے گانا کیوں بند کر دیا —— گاتی تو خوب ہیں آپ —— ایک گیت اور سنا دیجئے۔"

—— لیلاؔ نے بالپس وہیں گانا شروع کر دیا ——

"تڑپت ہے من میرا" —— لیکن یہ گانا پہلے کا سا نہ تھا۔ لیلاؔ نے اپنی آواز میں اب بلا کا درد پیدا کر دیا تھا۔ ایسا معلوم ہو رہا تھا کہ قدرت کا ذرہ ذرہ اس دل دوز گانے سے متاثر ہو گیا ہے۔ گاتے گاتے وہ رک گئی —— اس کی آنکھیں نمناک ہو گئیں۔ وہ سِسک سِسک کر رونے لگی —— ہیڈ ماسٹر صاحب کا دل تڑپ اٹھا —— وہ لیلاؔ کے پاس بھاگتے ہوئے گئے۔ لیلاؔ اٹھ کھڑی ہوئی "لیلاؔ! —— روؤ نہیں، مجھے بیحد صدمہ ہوتا ہے۔ آہ! —— پرمیشور نے تم پر بڑا ظلم کیا ہے ——" "نہیں —— یہ میرا ہی قصور ہے۔ پرمیشور کسی پر ظلم نہیں کرتے ——" لیلاؔ نے آنسو پونچھتے ہوئے کہا —— "ہیڈ ماسٹر صاحب...... اب چلئے۔ گھر جائیں گے۔" ——

ایک عرصے کے بعد لیلاؔ کے دل میں اس کے شوہر کی یاد پھر تازہ ہو گئی —— اس دن رات میں وہ بالکل نہ سو سکی —— صبح جب وہ بیدار ہوئی تو بیمار معلوم ہو رہی تھی۔ اس کا پھول سا چہرہ زرد پڑ گیا تھا۔ اس کی آنکھیں جاگنے کی وجہ سے اندر کو دھنس گئی تھیں۔ زمیندار صاحب نے اپنی بیٹی کی حالت کو دیکھا۔ انھیں اس کا سبب معلوم تھا۔ وہ دل ہی دل میں اپنی ہمدردی کا اظہار کر رہے تھے۔ نرملا دیوی نے دریافت کیا "بیٹا! —— کیا بات ہے۔ تم بہت اداس نظر آ رہی ہو؟" —— "کچھ نہیں ماں سر میں درد ہے۔" لیکن یہ سر کا درد نہیں تھا بلکہ دل کا درد تھا۔ ایسا

جس کا کوئی علاج نہ تھا۔ ان نے غور سے لیلا کی طرف دیکھا اور لیلا نے اپنی آنکھیں اس کی آنکھوں میں ڈال دیں ـــــ بے اختیار کی آنکھوں میں آنسو آ گئے اور وہ دونوں لپٹ کر رونے لگے ـــــ

آہ! ـــــ زمیندار صاحب دو دن کے مہمان تھے۔ ان سے بھی نہ رہا گیا اور آنسوؤں کے دو بڑے بڑے قطرے فرش پر گرے۔

لیلا پھر سے کوشش کرنے لگی کہ اپنے غم کو غلط کر دے۔ اور اس لئے کتابوں میں گم رہنے کی کوشش کرنے لگی۔ وہ دن بھر اپنے مطالعہ خانہ میں رہتی تھی۔ وہ کتاب پڑھنے کی کوشش کرتی تھی مگر نہ معلوم کیوں اس کا جی نہیں لگتا تھا۔ وہ کتاب کو میز پر رکھ کر کچھ سوچنے لگتی۔ غرض اس طرح چند دن بیت گئے۔ اس دوران میں وہ کتاب کو میز پر رکھ کر کچھ سوچنے لگتی۔ غرض اس طرح چند دن بیت گئے۔ اس دوران میں وہ ہیڈ ماسٹر صاحب کے ساتھ کہیں نہ گئی۔ وہ اپنے گھر کے باغ ہی میں شام کے وقت ٹہلا کرتی تھی۔

نہ معلوم اسے ہیڈ ماسٹر صاحب سے ملنے میں کیوں شرم محسوس ہو رہی تھی۔ وہ گھر میں بھی ان سے کھنچی کھنچی رہنے لگی ـــــ چند دن گزرنے کے بعد وہ پھر پہلی کی حالت پر آ گئی ـــــ اس نے اپنے شوہر کی یاد کو بھلانے میں کامیابی حاصل کر لی ـــــ

ہیڈ ماسٹر صاحب بھی چند دن بہت پریشان رہے اس لئے کہ انھیں لیلا میں ایک بڑی تبدیلی نظر آ رہی تھی۔ اس کا چہرہ پہلے کا سا شگفتہ نہ تھا۔ وہ کسی ذہنی کشمکش میں معلوم ہو رہی تھی۔ مگر اب یہ دیکھ کر کہ لیلا پھر سنبھل گئی ہے اور آہستہ آہستہ اس کا چہرہ کھلتا جا رہا ہے تو ہیڈ ماسٹر صاحب کو دلی خوشی ہوئی۔ کیونکہ انھوں نے ہی لیلا کو رنج پہنچایا تھا ـــــ

(۹)

اب لیلا کی طبیعت میں پھر رنگینی آ گئی تھی ـــــ اور ساتھ ہی ایک ہلکا اور مبہم سا احساس بھی اس کے دل میں پیدا ہو گیا تھا ـــــ اور یہ احساس دھیرے دھیرے درد میں تبدیل ہو رہا تھا ـــــ مگر یہ درد کچھ اور ہی قسم کا تھا۔ درد جو انسان کو تکلیف دینے کی بجائے مست و مدہوش بنا دیتا ہے ـــــ لیلا جب کبھی کسی کتاب کو پڑھنے کے لئے بیٹھتی ـــــ تو کسی کا چہرہ اس کی آنکھوں کے سامنے آ جاتا ـــــ وہ کچھ بے قرار سی ہو جاتی ـــــ مگر اسے اس بے قراری میں لطف آتا تھا ـــــ وہ بار بار اپنے دل سے سوال کرتی "کہیں میں کسی سے محبت تو نہیں کرنے لگ گئی"۔ اور اس سوال کے ساتھ اس کی گردن اور رخساروں میں سرخی دوڑ جاتی۔ لیکن کچھ ہی دیر بعد اس کا چہرہ پھر زرد پڑ جاتا ـــــ اس کے مرمریں لبوں پر ایک پھیکا اور یاس آلود تبسم کھیلنے لگتا۔ اس کی آنکھوں میں مایوسی چھا جاتی ـــــ اسے اپنی غلطی کا احساس ہو جاتا ـــــ اور وہ بے قرار ہو کر پلنگ پر جا گرتی ـــــ اور رونے لگتی ـــــ

جب وہ ہیڈ ماسٹر صاحب کے سامنے جاتی تو بہت دیر تک ان کے چہرہ کی طرف دیکھتی ـــــ نہ معلوم اس کا دل کیوں یہ چاہتا تھا ـــــ اور ہیڈ ماسٹر صاحب پریشان تھے کہ آخر لیلا ان سے دور دور کیوں رہا کرتی ہے۔ انھوں نے سمجھا کہ شاید وہ ان سے خفا ہو گئی ہے وہ چاہتے تھے کہ اس سے معافی مانگیں لیکن انھیں اس کا موقع ہی نہیں ملتا تھا۔ لیلا کبھی انھیں اکیلے میں نہیں ملتی تھی ـــــ آخر کار انھوں نے فیصلہ کر لیا کہ وہ بھی لیلا سے دور رہیں گے۔ جب خود اسے ان کی قربت درکار نہیں ـــــ مگر نہ معلوم کیوں ان کا دل بار بار اس سے بات کرنا چاہتا تھا۔ وہ ہر وقت بہانے ڈھونڈتے مگر کامیابی کی صورت نظر نہ آتی تھی ـــــ لیلا انھیں دیکھتی اور شرما جاتی ـــــ ہیڈ ماسٹر صاحب سوچنے لگتے کہ پہلے تو وہ مجھ سے شرماتی نہ تھی لیکن اب ـــــ یہ کیا معاملہ ہے ـــــ وہ بھی عجیب کشمکش میں پڑ گئے ـــــ ہیڈ ماسٹر صاحب کا دل رفتہ

بروز لیلا کے لئے بے قرار ہونے لگا۔ وہ لیلا سے ملتے بھی تو صرف نمستے کہنے کے سوا اور کچھ نہ کہتے اور کہنے کی کوشش بھی کی تو لیلا موقع نہ دیتی ——— غرض ہیڈ ماسٹر صاحب کے دن بہت بے قراری میں کٹنے لگے اور راتیں بھی سوچنے میں گزار دیتے ———

ایک دن ——— شام کا وقت تھا۔ آسمان پر بادل چھا گئے تھے۔ سرد ہوا کے تیز و تند جھونکے چل رہے تھے ——— شائد دور کہیں بارش ہو رہی تھی ——— ہیڈ ماسٹر اپنے دوست زمیندار کے گھر سے آ رہے تھے۔ یکایک ہوا زور سے بہنے لگی۔ اور مینہ برسنے لگا ——— وہ بھیگنے لگے۔ کچھ دیر بعد وہ بھاگنے لگے ——— زمیندار صاحب کا گھر نزدیک ہی تھا۔ چار، پانچ منٹ میں وہ وہاں پہنچ گئے۔ وہ گھر کے سامنے کے باغ میں گزر ہی رہے تھے کہ کسی سے ٹکر ہو گئی ——— لیلا گھبرا گئی۔ ہیڈ ماسٹر صاحب بہت نادم ہوئے۔ لیلا ٹکر کی وجہ سے زمین پر آ ہی رہی تھی کہ ہیڈ ماسٹر صاحب نے بچا لیا ——— لیلا خود کو ایک غیر مرد کے ہاتھوں میں محسوس کر کے شرما گئی ——— اور "اوہو!" ——— کہہ کر مکان میں بھاگ گئی ——— لیلا کو باغبانی کا شوق بھی تھا اور آج کی شام وہ چند پھولوں کے درختوں کو درست کرنے گئی تھی ——— کہ یکایک بارش ہونے لگی ——— اور وہ بھی مکان میں داخل ہونا چاہتی تھی کہ متذکرہ بالا واقعہ پیش آیا ——— زمیندار صاحب سیڑھیوں کے پاس ہی کھڑے تھے۔ ہیڈ ماسٹر صاحب کو دیکھ کر انھوں نے کہا ——— "اوہو ——— آپ تو پورے بھیگ گئے ———" اتنے میں نرملا دیوی بھی باہر آ گئیں ——— "ہاں ہاں ——— ہیڈ ماسٹر صاحب جلد کپڑے بدل دیجئے ———" ہیڈ ماسٹر صاحب کو نرملا دیوی اور زمیندار صاحب کی ہمدردی دیکھ کر دلی مسرت حاصل ہوئی تھی۔

مگر کپڑے اتارنے سے پیشتر ایک کام کرنا وہ ضروری سمجھ رہے تھے۔ اور وہ کام لیلا سے معافی چاہنا تھا ——— لیلا اپنے کمرے کے دروازے کے پاس کھڑی تھی ——— ہیڈ ماسٹر کو اس حالت میں دیکھ کر اسے ہنسی آ گئی ——— ہیڈ ماسٹر صاحب بھی ہنس پڑے۔ "معاف کرنا لیلا ——— میں بھاگتا ہوا آ رہا تھا ——— کہ یکایک تم سے ٹکر ہو گئی ———" "تو اس میں آپ کی کیا غلطی ہے میں بھی تو بھاگی آ رہی تھی ———" "اچھا ——— جائیے پہلے کپڑے تو اتار دیجئے۔ کوٹ تو پورا بھیگ گیا ہے۔" لیلا نے کہا۔ ہیڈ ماسٹر صاحب اس کے بعد اپنے کمرے میں چلے گئے۔

دوسرے دن جب لیلا اور ہیڈ ماسٹر صاحب چائے کے وقت ملے تو دونوں کی عجیب حالت تھی ——— ہیڈ ماسٹر صاحب نے کل کی رات خواب رنگین دیکھنے میں کاٹی، اور اب خوابوں کی تعبیر کو سامنے دیکھ کر ان کی بے قراری میں اضافہ ہوا ——— دونوں ایک دوسرے کی نظر چھپا کر ——— ایک دوسرے کو ——— دیکھا کرتے تھے ——— اب وہ پھر ایک دوسرے سے آزادی سے بولنے لگے ——— اس طرح چند دن بیت گئے۔

چونکہ موسم بدل رہا تھا ——— اس لئے ہر شخص کچھ سستی محسوس کر رہا تھا۔ ہیڈ ماسٹر صاحب چونکہ رام پور کے لئے ابھی نئے آدمی تھے اس لئے انھیں ہلکا سا بخار آ گیا ——— لیکن پھر بھی وہ اس دن مدرسے کو گئے ——— اور اپنا کام برابر کیا ——— جب وہ شام کے وقت گھر لوٹ رہے تھے ان کے سر میں بلا کا درد تھا ——— آنکھیں جل رہی تھیں، طبیعت سست ہو گئی تھی۔ وہ مکان جاتے ہی پلنگ پر لیٹ گئے ——— انھیں بخار آ گیا تھا۔

چار بجے کی چائے پر ہیڈ ماسٹر صاحب کو نہ دیکھ کر زمیندار صاحب کو تشویش ہوئی اور انھوں نے لیلا کو دیکھنے کے لئے بھیجا ———

لیلا نے ہیڈ ماسٹر صاحب کے دروازے پر دستک دی۔ دروازہ اندر سے کھلا ۔۔۔ "اندر آجائیے" ہیڈ ماسٹر صاحب نے دھیمی آواز میں کہا ۔۔۔ "آپ سو گئے ہیں ۔۔۔ اس وقت!؟" لیلا نے دریافت کیا" ہاں ۔۔۔ طبیعت ناساز ہوگئی ہے" "تو کیا ہوا ۔۔۔ چلیے نا چائے پیجئے۔ سب ٹھیک ہو جائے گا" لیلا نے معصومانہ انداز میں کہا: "معاف کرو لیلا ۔۔۔ مجھے چائے وائے کی ضرورت نہیں ۔۔۔ آرام کی ضرورت ہے ۔۔۔ آہ! ۔۔۔ اُف! ۔۔۔ سر میں بلا کا درد ہو رہا ہے ۔۔۔" "اچھا ۔۔۔ تو میں چائے یہیں لاتی ہوں۔ تب تو پئیں گے نا آپ" ۔۔۔ "اب تمھاری مرضی"۔ لیلا چلی گئی اور اپنے والدین سے کہہ دیا کہ ہیڈ ماسٹر صاحب کو بخار آگیا ہے۔ زمیندار صاحب بہت پریشان ہوئے اور اپنے پاس کی چند کونین کی گولیاں لیلا کے ہاتھ بھیجیں ۔۔۔ کچھ دیر بعد لیلا چائے اور کونین کی گولی کے ساتھ ہیڈ ماسٹر صاحب کے کمرے میں نمودار ہوئی۔ ہیڈ ماسٹر صاحب سر پکڑے ہوئے سو رہے تھے۔ "ہیڈ ماسٹر صاحب! ۔۔۔ لیجئے یہ کونین کی گولی۔ پتا جی نے آپ کو دینے کے لئے کہا ہے ۔۔۔ اور یہ چائے ۔۔۔ ٹھنڈی ہو جائے گی ۔۔۔ جلدی پی لیجئے ۔۔۔" ہیڈ ماسٹر صاحب کو طوعاً و کرہاً چائے پینی پڑی ۔۔۔ "شکریہ" انھوں نے کہا اور پھر پلنگ پر دراز ہو گئے ۔۔۔ لیلا نے ہیڈ ماسٹر صاحب کے پلنگ کے پاس جا کر کہا ۔۔۔ "کیا سر میں بہت درد ہو رہا ہے؟ ۔۔۔" اس کے لفظوں سے حقیقی ہمدردی ظاہر ہو رہی تھی۔ "ہاں" ہیڈ ماسٹر صاحب نے جواب دیا ۔۔۔ "تو امرت انجن لادوں؟ ۔۔۔" "ضرورت نہیں اس سے درد کم نہیں ہو سکے گا ۔۔۔ کیوں تکلیف کرتی ہیں آپ" ۔۔۔ "تو کیا زندہ طلسمات کی شیشی لاؤں؟" ۔۔۔ "میں نے سب کچھ لگایا ہے ۔۔۔ مگر ابھی درد کم نہیں ہوا ہے"

۔۔۔ "کیا میں سر دباؤں؟" لیلا نے پلنگ کے قریب جاتے ہوئے کہا ۔۔۔ ہیڈ ماسٹر صاحب نے جواب دینے میں تھوڑی دیر کی" ہاں ۔۔۔ اگر آپ کو تکلیف نہ ہو ۔۔۔" "تکلیف کاہے کی" کہہ کر لیلا نے ایک کرسی ہیڈ ماسٹر صاحب کے پاس کھینچ لی ۔۔۔ اور اپنے نازک و نرم ہاتھوں سے ہیڈ ماسٹر صاحب کا سر دبانے لگی ۔۔۔ "ایک عرصہ ۔۔۔ ایک طویل عرصے کے بعد ہیڈ ماسٹر صاحب ایک عورت کے ہاتھوں کو اپنی پیشانی پر محسوس کر رہے تھے ۔۔۔ آج سے کئی سال پہلے جب وہ بہت چھوٹے تھے تو ان کی ماں ان کا سر دباتی تھی ۔۔۔ ہیڈ ماسٹر صاحب کچھ سوچنے لگے ۔۔۔ شاید انھیں اپنے بچپن کا زمانہ یاد آ رہا تھا ان کی آنکھوں میں آنسو آنے لگے۔ لیکن انھوں نے آنسوؤں کو باہر نکلنے نہ دیا ۔۔۔ کچھ دیر بعد انھیں ایسا معلوم ہوا کہ کوئی گرم پانی کے قطرے ان کی پیشانی پر ڈال رہا تھا ۔۔۔ انھوں نے اپنا چہرہ اوپر کی طرف اٹھایا ۔۔۔ لیلا کی آنکھیں آنسوؤں میں تیر رہی تھیں ۔۔۔ وہ رو رہی تھی ۔۔۔ کیوں ۔۔۔ یہ اسے بھی معلوم نہ تھا۔ ہیڈ ماسٹر صاحب نے لیلا کا ہاتھ اپنے ہاتھ میں لے لیا ۔۔۔ لیلا نے ان کی طرف دیکھا۔ ہیڈ ماسٹر صاحب کو لیلا کی آنکھوں میں غم و یاس کا طوفان نظر آیا ۔۔۔ اور بے اختیار ان کی زبان سے ایک آہ نکل گئی ۔۔۔ "لیلا!" انھوں نے کہا ۔۔۔ "جی" لیلا نے کہا ۔۔۔ پھر دونوں خاموش ہو گئے۔ ہیڈ ماسٹر صاحب کے ہاتھوں میں لیلا کا ہاتھ ابھی تک تھا ۔۔۔ وہ اسی حالت میں کچھ دیر رہے ۔۔۔ اور پھر ان کی آنکھ جھپک گئی ۔۔۔ جب وہ بیدار ہوئے تو لیلا ان کے کمرے میں موجود نہ تھی ۔۔۔

دو تین دن میں ہیڈ ماسٹر صاحب کی طبیعت سدھر گئی ۔۔۔ اور پھر وہ اپنے کام میں مصروف ہو گئے ۔۔۔

خوش قسمتی سے انھیں نرینہ جیسا قابل اور محنتی شخص مل گیا تھا۔ اس لئے انھیں اب زیادہ تکلیف اٹھانے کی ضرورت نہیں پڑتی تھی ـــــ ہیڈ ماسٹر صاحب لیلا کے ممنون تھے۔ اس نے رات دن ان کی خدمت کی ـــــ اب ہیڈ ماسٹر صاحب کو اپنی بے قراری کا سبب معلوم ہونے لگا تھا۔

ہیڈ ماسٹر صاحب اور لیلا پھر پہلے کی طرح مل کر تفریح کرنے جاتے تھے اور گھنٹوں باتیں کیا کرتے تھے۔ ہیڈ ماسٹر صاحب کی وسیع معلومات سے لیلا فائدہ اٹھاتی تھی۔ ناظرین کو یہ بتا دینا ضروری ہے کہ اس دوران میں وہ ایک دوسرے سے کافی بے تکلف ہو گئے تھے۔ ایک دوسرے کو بجائے "آپ" کے "تم" کہا کرتے تھے ـــــ ہر روز جب ہیڈ ماسٹر صاحب لیلا کے ساتھ ندی کنارے جاتے تو کہتے "لیلا! ـــــ آج بھی تم کو ایک گیت سنانا ہوگا" ـــــ "نہیں ہیڈ ماسٹر صاحب مجھے گانا وانا نہیں آتا" ـــــ "یہ ٹھیک نہیں لیلا۔ تم کو گانا پڑے گا۔" کچھ دیر اور "نہیں" ـــــ اور "گاؤ" کے بعد وہ گانے لگتی۔ غرض روزانہ یہ سین دہرایا جاتا۔ جب لیلا گانے لگتی تو ہیڈ ماسٹر صاحب مدہوش ہو جاتے۔ لیلا کی شیریں اور سریلی آواز فضائے بسیط میں پھیل کر چند لمحوں کیلئے پرندوں کو بھی خاموش کر دیتی! ـــــ ایسا معلوم ہونے لگتا کہ وہ بھی اس کے گانے کو شوق سے سن رہے ہیں ـــــ جیسے جیسے دن گزرتے گئے، ہیڈ ماسٹر صاحب اور لیلا کی دوستی گہری ہوتی گئی۔ ہنسی کھیل میں اضافہ ہوتا ہو گیا ـــــ اور پایانِ کار یہ دوستی محبت میں تبدیل ہو گئی۔ اب وہ ایک دوسرے سے ایک لمحے کے لئے بھی جدا ہونا نہیں چاہتے تھے۔

ایک دن ہیڈ ماسٹر صاحب نے کہا ـــــ "لیلا! ـــــ نہ معلوم مجھے تم سے باتیں کرنے میں لطف کیوں آتا ہے۔ ایک منٹ بھی دل تم سے جدا ہونا نہیں چاہتا" ـــــ "اور میرا دل بھی یہی چاہتا ہے ـــــ ہیڈ ماسٹر صاحب" ـــــ ہیڈ ماسٹر صاحب نے لیلا کا ہاتھ اپنے ہاتھ میں لے لیا ـــــ دونوں نے ایک دوسرے کی طرف دیکھا ـــــ ہیڈ ماسٹر صاحب کی آنکھیں دعوت محبت دے رہی تھیں ـــــ اور لیلا کی آنکھیں شرم سے جھک گئیں۔

"لیلا! ـــــ ہم کب تک اس طرح ایک دوسرے کے جذبات کو دبائے رکھیں گے؟ ـــــ بارہا ـــــ میرے دل میں آیا کہ زمیندار صاحب سے تمہاری شادی کے متعلق کہہ دوں۔ لیکن نہ کہہ سکا۔ تمہاری ماں تو بہت قدامت پسند ہیں" ـــــ لیلا خاموش تھی ـــــ "لیلا! ـــــ تمہیں یاد ہے ـــــ آج سے بہت دن پہلے تم نے مجھ سے شادی نہ کرنے کا سبب پوچھا تھا؟" ـــــ "ہاں!" ـــــ "آج ـــــ میں اس کا جواب دے رہا ہوں ـــــ لیلا! ـــــ میری طرف دیکھو" ـــــ "میں ـــــ تم سے شادی کروں گا" ـــــ "ہیڈ ماسٹر صاحب" ـــــ بس لیلا کی زبان سے اتنا ہی نکلا اور وہ ان کے آغوش میں گر گئی ـــــ اپنے دل کی خواہش کو یوں خود بخود ظاہر ہوتے دیکھ کر لیلا کو بڑی خوشی ہوئی ـــــ اس کی حسین و تبسم ریز آنکھوں سے آنسو نکل آئے۔ یہ خوشی کے آنسو تھے ـــــ "مگر...... پتاجی اور سماج ـــــ؟" لیلا نے دھیمی آواز میں کہا ـــــ "میں نے سماج کو سدھارنے کا بیڑا اٹھایا ہے ـــــ دیکھوں کیا نتیجہ نکلتا ہے" ـــــ کچھ دیر دونوں پر خاموشی مسلط رہی ـــــ "چلئے ـــــ اب دیر ہو گئی" لیلا نے کہا ـــــ

(۱۰)

دیوالی کے موقع پر راجہ ہال میں مسلسل تین چار دن تک جلسے جلوس لوگوں کی تقاریر ہوا کرتی تھیں۔ تقاریر یا تو مذہبی

ہوتی تھیں یا سماج کی اصلاح کے متعلق۔ ان جلسوں میں کرسیٔ صدارت ہمیشہ زمیندار صاحب ہی کو دی جاتی تھی ـــــ اب کی مرتبہ مہاشئے ویریندر، مسٹر رمیش چندر، اور ہیڈ ماسٹر صاحب کی تقاریر ہونے والی تھیں ـــــ مہاشئے ویریندر جو ایک کامیاب وکیل تھے دیوالی کی اہمیت پر، مسٹر رمیش چھوت چھات اور ہیڈ ماسٹر صاحب پنر وواہ پر تقریر کرنے والے تھے ـــــ

ہر شخص دیوالی کا منتظر تھا ـــــ دیوالی آگئی۔

اور پورا گاؤں جگمگا اٹھا ـــــ ہر ایک مکان بقعۂ نور بن گیا۔ ہر طرف خوشی و شادمانی کی حکمرانی نظر آنے لگی۔ بچے، بڑے، بوڑھے غرض سب ہی خوش نظر آرہے تھے ـــــ یوں تو سب دیوالی کی خوشیاں منا رہے تھے لیکن چند ایسے بھی تھے جو آج حد درجہ اداس تھے ـــــ اور یہ لوگ غریب اور بھکاری تھے جن کی جھونپڑیاں پہاڑ کے دامن میں تھیں۔ چراغ جلانے کے لئے ان کے پاس تیل کہاں؟ چراغ کے بدلے ان کے دل جل رہے تھے۔ ان میں سے چند ایسے بھی تھے جو یوں کہہ کر اپنے دل کو تسلی دے رہے تھے "اونہہ! ـــــ یہ لوگ تو مصیبت اٹھا کر مکان کی چھتوں پر شمع جلا رہے ہیں لیکن ہماری چھت (آسمان) پر قدرتی چراغ (تارے) جل رہے ہیں جو ان چراغوں سے چمک دار اور تعداد میں بڑھ کر ہیں" ـــــ خیر، یہ لوگ تو اس طرح اپنے دل کو تسکین دے رہے تھے لیکن ان معصوم بیواؤں کا کیا حال تھا ـــــ وہ اپنے دلوں کو کیسے سمجھائیں؟ سب سہاگنیں اپنے شوہروں کی "آرتی" کر رہی تھیں اور خوشی سے ناچتی جا رہی تھیں لیکن آہ! ـــــ ان بچاریوں کی حالت ابتر تھی۔ وہ کس کی آرتی کریں؟ ـــــ کس کو اپنا کہیں؟ ـــــ آہ! وہ سب کچھ کھو بیٹھی تھیں ـــــ وہ زندہ درگور ہوگئی تھیں۔

کیا پچھلے جنم میں انھوں نے کچھ پاپ کیا تھا جو اس طرح ستائی جا رہی تھیں؟ ـــــ یہ کسی کی سمجھ میں نہیں آسکتا ـــــ لیکن آخر ان کی اس ابتر حالت کا ذمہ دار کون ہے؟ ـــــ کیا سماج؟ ہاں، بے شک۔ سماج ہی ان بچاریوں کی اس حالت کا ذمہ دار ہے۔ اسی نے ان کی زندگیوں کو تلخ بنا دیا ہے ـــــ اور لیلا بھی ان ہی بدقسمتوں میں سے ایک تھی۔ اس کی شادی شدہ سہیلیاں خوشی سے ناچ رہی تھیں اور لیلا خاموش اپنی قسمت پر آنسو بہا رہی تھی۔ لیلا کی ماں اس کی اس حالت کو دیکھ کر رونے لگی ـــــ مگر کبھی اس نے لیلا کا پنر وواہ کرنے کا خیال نہ کیا ـــــ کیونکہ اسے سماج کا ڈر تھا ـــــ زمیندار صاحب نے اپنی بیٹی کو دیکھا وہ اداس تھی۔ انھیں اس کی حالت پر رحم آیا گو کہ ان کی آنکھوں میں آنسو نہ تھے لیکن ان کا دل رو رہا تھا ـــــ

شام کے وقت زمیندار صاحب ٹاؤن ہال کی طرف روانہ ہوئے۔ جہاں تقاریر ہونے والی تھیں ـــــ آج ہیڈ ماسٹر صاحب کا بھاشن تھا کل کے دن مہاشئے ویریندر اور مسٹر رمیش تقریر کر چکے تھے۔ ان میں موخرالذکر نے قدامت پسند ہندوؤں کو بتایا کہ اگر وہ اب بھی پرانے طریقوں سے کام لیں گے تو قوم کا بہت نقصان ہوگا اور یہ امید ظاہر کی کہ لوگ چھوت چھات ترک کر دیں گے۔ انھوں نے یہ بھی کہا کہ غریب کسانوں اور مزدوروں کو نیچ نہیں سمجھنا چاہئے ـــــ اگر غریب نہ ہوتے تو امیر بھی نہ ہوتے ـــــ

"جناب صدر و معزز حاضرین! ـــــ" ہیڈ ماسٹر نے اپنا بھاشن شروع کیا۔ "آج میں جس وشئے پر تقریر کر رہا ہوں اس پر اب تک کئی قابل اشخاص تقریر کر چکے ہیں۔ تاہم میں بھی چند باتیں کہنا چاہتا ہوں۔ گو کہ میں یہ جانتا ہوں کہ میری تقریر سامعین

کوئی اثر نہ ہو گا — کیونکہ اگر ان کے سینہ میں دل ہوتا۔ اور اس دل میں درد تو یقیناً ان پر پیشتر کی تقریروں کا اثر ہوا ہوتا۔ مجھے ایسا معلوم ہو رہا ہے کہ یہاں کے سب لوگ ابھی قدامت پسند ہیں۔ لیکن یہ یاد رہے کہ زمانہ کے ساتھ ساتھ قوانین و رسوم میں بھی تبدیلیاں ہوتی ہیں۔ اس لئے ضرور ہے کہ ایک دن ان قدامت پسند پنڈتوں اور مہاجنوں کو ہماری تجاویز کے آگے سرِ تسلیم خم کرنا پڑے گا۔ اس مجمع میں بھی کئی نوجوان ایسے ہیں جو اصلاح پسند ہیں مگر سماج کے ڈر، پنڈتوں کی دھمکیوں اور مہاجنوں کی ڈانٹ نے ان کی زبانوں پر مہریں لگا دی ہیں۔ وہ سماج کے خلاف آواز بلند کرنا چاہتے ہیں لیکن یہ آواز حلق تک آکر رک جاتی ہے۔ لیکن ایک نہ ایک دن ضرور سب مل کر آواز بلند کریں گے آج کا وِشئے ہی ایسا ہے کہ چند معصوم ہستیاں یہاں پر آنے سے قاصر ہیں اور وہ ہیں معصوم و کمسن بیوائیں — آہ! — لفظ "بیوہ" خود کس قدر تکلیف دہ اور بھیانک ہے۔ حقیقی معنوں میں اگر کوئی انسان ہے تو اس کا دل اس لفظ کو سنتے ہی مغموم ہو جائے گا۔ کیا کوئی باپ اپنی عزیز لڑکی کو مصیبت میں پھنسا پسند کرے گا؟ — کیا کوئی بھائی اپنی بہن کی آنکھوں میں آنسو دیکھتے ہوئے بھی خاموش رہ سکتا ہے؟ — اس وقت یہ سوال پیدا ہو سکتا ہے کہ خاموش نہ رہیں تو کیا ہم بھی دن رات رویا کریں؟ — میرا مطلب یہ نہیں ہے بلکہ میں یہ کہنا چاہتا ہوں کہ جو معمہ آسانی کے ساتھ حل ہو سکتا ہے تو اس کے حل کرنے سے جو مصیبتیں پیدا ہوتی ہیں ان سے دوچار کیوں ہوں — اس کا حل "پُنر وِواہ" ہے۔ سب سے پہلے بچپن کی شادی کا انسداد قانونی طور پر ہو جانا چاہیئے۔ کیونکہ بچپن کی شادی ہی ایسی مصیبتوں کے پیدا ہونے کا باعث ہوتی ہے۔ ایک چھ سالہ لڑکی کی شادی ہو جاتی ہے۔ بھلا اس کو شادی کا مفہوم کیا معلوم؟ وہ تو شائد شادی کو کھیل سمجھتی ہوگی۔ اس میں بھلے اور برے کی پہچان کہاں — سنِ بلوغ کو پہنچنے کے بعد ہی کوئی لڑکا یا لڑکی شادی کا مفہوم اچھی طرح سمجھ سکتی ہے۔ شادی کوئی کھیل نہیں وہ ایک زبردست بندھن ہے۔ مرد اور بیوی کو زندگی کے اس ساگر میں اپنی مشترکہ کشتی کو ڈال دینا پڑتا ہے اور اسے ایک دوسرے کی مدد سے چلانا پڑتا ہے — بچپن ہی میں کسی کی شادی کر دینے سے آئندہ چل کر ان کی زندگی تلخ اور بے کیف بن جانے کا اندیشہ رہتا ہے۔ اگر کسی لڑکی کا شوہر جلد اس دارِ فانی سے کوچ کر جائے تو اس میں اس بچاری کا کیا قصور۔ نہ معلوم کس بنا پر سماج اسے قصوروار ٹھیراتی ہے — ادھر بیوہ بنی — اور سب کی نظروں سے گر گئی۔ بڑی تعجب کی بات ہے۔ کیا وہ انسان نہیں؟ — کیا اس کا دل بھی ہماری طرح تمناؤں اور آرزوؤں سے بھرا نہیں ہے؟ — تو پھر کیا وہ اپنے ارمانوں اور آرزوؤں کا خون ہوتے ہوئے دیکھنا پسند کرے گی؟ — ہاں — اسے پسند کرنا ہی پڑتا ہے کیونکہ سماج نے اسے ڈرا دیا ہے۔ مگر یہ سماج ہے کیا چیز؟ — یہ آپ ہی جیسے سجنوں کے مجموعہ کا نام ہے۔ یہاں پر تو آپ سب صاحبین ہمارے خیالات سے متفق نظر آتے ہیں لیکن معلوم نہیں جب عمل کرنے کا وقت آتا ہے تو کیوں گھبرا جاتے ہیں۔ اب رہا ان پنڈتوں اور مہاجنوں کا سوال — آپ انہیں نظر انداز کر دیجئے۔

جے آر۔ ویپائی

(باقی آئندہ)



رابرٹ سوے، برطانوی شاعر، مورخ اور مصنف نے ایک سو سال قبل مارچ ۱۸۴۳ء میں انتقال کیا۔ وہ ایک باکمال مصنف ہے اس کی سوانح "نلسن" بہترین تصانیف میں شمار ہوتی ہے۔ سر ہمفری ڈیوی کی رائے میں یہ "ایک لافانی یادگار ہے جسے ذہانت نے شجاعت کی یاد میں قائم کیا ہے"۔ ۱۸۱۳ء میں سوے برطانیہ کے قومی شاعر کی حیثیت سے ملک الشعراء بنا۔



برطانیہ میں آکسفورڈ کی از سر نو تعمیر کا مسئلہ زیر غور ہے۔ جنگ چھڑنے سے قبل آکسفورڈ کی مشہور "بوڈلین لائبریری" کی توسیع کا مسئلہ درپیش ہوا چنانچہ اس کے لئے برطانیہ کے مشہور ماہرین تعمیر جائلس اسکاٹ کے تیار کردہ نقشے کے مطابق ایک مزید عمارت قدیم عمارت کے قریب تعمیر کی گئی۔ سر ٹامس بوڈلے نے جس کے نام سے یہ کتب خانہ موسوم ہے، اس کی ابتدا اپنے ذاتی ذخیرہ کتب سے کی جس کی قیمت کا اندازہ دس ہزار پونڈ کیا گیا ہے۔ اس کتب خانہ کا افتتاح ۱۶۰۲ء میں ہوا اور بوڈلے کی نئی عمارت کا [illegible] شہزادی [illegible] کے [illegible] افتتاح کیا۔ یہ [illegible] گلس اسکاٹ کی [illegible] تصنیف ہے۔

جنگ کے بعد جدید تعمیری کام

(سڑکوں کی تیاری کا پروگرام)

چونکہ ہر مسئلے کی چھان بین علمی اور اصولی ہونی چاہئے اس لئے سڑک کا مسئلہ اس سے مستثنیٰ نہیں ہوسکتا جس کو تنظیم مابعد جنگ میں اولیت کا درجہ حاصل ہونا چاہئے۔ علمی اور اصولی چھان بین کا مقصد یہ ہوتا ہے کہ مسئلے کی پیچیدگیاں سمجھ میں آجائیں۔ اس سلسلے کی پہلی کڑی باقاعدہ مواد کا اکٹھا کرنا ہے جس کی بنیاد دلائل پر ہوتی ہے یہی وجہ ہے کہ علمی چھان بین میں مربوط معلومات کا فراہم کرنا بہت اہم پہلا قدم ہے۔ اس مواد کے اکٹھا کرنے کے بعد دوسرا قدم اس مسئلہ کی باقاعدہ تقسیم ہے تاکہ اس کے مختلف اجزاء کے باہمی تعلقات معلوم ہوسکیں۔ وہ باہم متعلق اجزاء سبب اور اثر کے حامل ہونے چاہئیں جن سے یہ واضح طور پر معلوم ہوسکے کہ کون سبب کیا اثر پیدا کرتا ہے۔

۱۔ سڑک کا مسئلہ حمل و نقل کی قسم میں داخل ہے۔ یہ ایک ناقابل انکار حقیقت ہے کہ بغیر وسیع اور تیز ذرائع حمل و نقل کے کوئی ملک متمدن ہونے کا دعویٰ نہیں کرسکتا۔ اس کے علاوہ ہر حکومت کا بہت ہی اہم فریضہ یہ ہے کہ وہ اندرونی امن کو بحال رکھے اور بیرونی حملوں کی روک تھام کرے جو بغیر بہتر اور تیز تر ذرائع حمل و نقل کے ممکن نہیں ہے۔ اس لئے بہترین ذرائع حمل و نقل فی الحقیقت ایک فوجی ضرورت ہیں۔

۲۔ ہم کو یہ بھی یاد رکھنا چاہئے کہ بہترین ذرائع حمل و نقل کے نہ ہونے سے سامان تجارت ان جگہوں پر نہیں لے جایا جاسکتا جہاں معقول منافع پر اس کو بیچا جاسکے۔ ایک سوداگر کو بہترین ذرائع کی صرف اسی لئے ضرورت نہیں ہوتی ہے کہ وہ اپنا سامان ایک جگہ سے دوسری جگہ پر آسانی سے پہنچا سکے بلکہ وہ مختلف جگہوں کی منڈیوں کے حالات اور چیزوں کے بھاؤ کی معلومات کا بھی محتاج ہوتا ہے۔ اس سے معلوم ہوا کہ یہ ذرائع تجارتی اغراض کے لئے بھی اہم اور ضروری ہیں۔

۳۔ پرانے زمانے میں جب کہ موجودہ ذرائع معدوم تھے، لوگ بہت کم سفر کرسکتے تھے۔ ایک صوبے کے باشندے کو دوسرے صوبے یا صوبوں کے رہنے والوں کے متعلق بہت ہی کم معلومات ہوسکتی تھیں، جس کا نتیجہ یہ تھا کہ ان میں باہمی معاشی یا تمدنی ربط ہو ہی نہیں سکتا تھا۔ کیا یہ حقیقت نہیں ہے کہ ایک شخص اگر وہ مثلاً لکھنؤ سے مدراس کے لئے روانہ ہوتا تو نہ صرف اس کو کم از کم تین مہینے لگ جاتے تھے بلکہ ان مشکلات کے علاوہ جن سے اس کو راستے میں دوچار ہونا پڑتا تھا کبھی کبھی مال و جان سے بھی ہاتھ دھونا پڑتا تھا۔ اس قسم کے لمبے اور تکلیف دہ سفر کا اس زمانے میں تخیل بھی اس وقت تک کوئی نہیں کرسکتا تھا جب تک کہ وہ راستے کی حفاظت کا مناسب انتظام نہ کرلے۔ یہی وجہ تھی کہ مذہب کے پرستار اور باخدا لوگ مقدس مقامات کا سفر کرتے ہوئے ڈرتے تھے۔ اب چونکہ نسبتاً ذرائع آمد و رفت بہتر ہوچکے ہیں لہٰذا وہ حالات بدل گئے اور ملک کے ہر صوبے کے لوگ ایک دوسرے سے بآسانی مل سکتے ہیں۔ یہ وہ ذرائع ہیں جو لوگوں کو ایک دوسرے سے وابستہ کرکے متحدہ قومیت کی بنیاد ڈالتے ہیں اور سیاسی تمدنی اور سماجی حیثیت سے ایک دوسرے سے قریب تر کرتے ہیں۔ اس لئے یہ ذرائع سیاسی، تمدنی اور سماجی حیثیت سے بھی ضروری ہیں۔

۴۔ معاشی اور اقتصادی نقطۂ نظر سے بھی سڑک کا مسئلہ بہت ہی اہم ہے، جس کو لڑائی کے اختتام سے پہلے ہی

حل کرنا چاہیئے۔ کاشتکاروں کی قرضہ داری محض اس طور پر دور نہیں ہوسکتی ہے کہ ان کو بہتر اور کافی کھاد مہیا کردی جائے بلکہ بہترین دیہی سڑکوں کی تیاری سے دور ہوسکتی ہے تاکہ وہ اپنی پیداوار کو بآسانی تمام نفع بخش منڈیوں میں بھیج سکیں۔ کاشتکار کی زبوں حالی کے دو اسباب ہیں ایک ضروری سامان کی کمی دوسرے منڈیوں میں سامان پہونچانے کے انتظامات کی خرابی۔ ملک کے مختلف حصوں میں مال کے مبادلہ کا انحصار دو ہی صورتوں پر ہے ایک حمل ونقل کی معقول آسانیاں دوسرے منڈیوں کا مناسب انتظام۔ جدید طریقہ حمل ونقل کی آسانیوں میں ترقی ملک کی معاشی ترقی کا جزو اعظم ہے۔ اندرون اور بیرون ملک کے سفر و تیز اندرونی و بیرونی تجارت کے فروغ کے لئے ہم کو معقول ذرائع حمل ونقل کی ضرورت ہے۔ دوسرے ملکوں بالخصوص یورپ اور امریکہ کے مقابلے میں ہماری حالت اس معاملہ میں قطعاً اطمینان بخش نہیں ہے۔ اس وسیع ملک میں جہاں کم و بیش چالیس کروڑ نفوس بستے ہیں صرف چودہ۱۴ ہزار میل ریلوے ہے اس کے معنی یہ ہیں کہ ۲۸ ہزار آدمیوں میں صرف ایک میل یا ۴۲۶ میل فی ایک سو مربع میل رقبہ میں ریلوے ہے۔

ملک میں سڑکیں ۶۵ ہزار میل سے کم ہیں جس کے معنی یہ ہوئے کہ صرف ایک میل سڑک جس میں کچا راستہ بھی شامل ہے ۳ مربع میل کے رقبہ میں ہے۔ برطانیہ عظمیٰ میں ہم دیکھتے ہیں کہ نصف مربع میل میں ایک میل اعلیٰ قسم کی سڑک ہے اور اسی طرح امریکہ میں ایک مربع میل میں ایک میل سڑک ہے۔ ان اعداد سے یہ ظاہر ہے کہ جہاں تک اس قسم یا دوسری قسم کے ذرائع حمل ونقل کا تعلق ہے ملک کو فروغ دینے کا بہت بڑا میدان موجود ہے۔ اگر معقول سڑکیں ملک میں بنوائی جاکر اندرونی اور دور افتادہ بستیوں کو ریلوے سے ملا دیا جائے تو ریل کی کمی کی تلافی ہوسکتی ہے۔ موجودہ موٹر رانی جو یقیناً لڑائی کے بعد بڑی تیزی کے ساتھ بڑھے گی اندرون ملک کے کاموں میں خوبی اور آسانی پیدا کردے گی۔ اس کے ساتھ ہی دیہاتیوں کو موجودہ ذرائع حمل ونقل سے زیادہ سے زیادہ استفادہ کا موقع دے کر ان کی اقتصادی، معاشرتی اور سیاسی زندگی کو سدھار دے گی۔ لیکن اس ملک میں جس کو بے سڑک کہنا درست ہے عام طور پر موٹر رانی کو پھیلانا اس وقت تک ممکن نہیں ہے جب تک کہ اچھی سڑکیں تیار نہ کردی جائیں۔ یہ کون نہیں جانتا ہے کہ ہمارے ملک کے بڑے حصے میں وہ کچے راستے ہیں جو دیسی سواریوں کے لئے موزوں ہوسکتے ہیں اور جن پر موٹروں کا چلانا ممکن ہی نہیں ہے۔ سڑکوں کے نہ ہونے کی وجہ سے ملک کے بڑے بڑے رقبے شہری مرکزوں سے بالکل الگ تھلگ ہیں جس کی وجہ سے تجارت متاثر ہوتی ہے۔ اور اسی وجہ سے کاشتکار کی حالت افسوسناک ہے حتیٰ کہ پکی سڑکیں بھی کچھ تو نگہداشت کی خرابی اور کچھ عدم نگہداشت کی وجہ سے موٹر رانی کے لئے موزوں نہیں ہیں۔ ریل اور سڑک کے لئے مکمل پالیسی کی ملک کے لئے شدید ضرورت ہے۔

۵۔ سڑکوں کی توسیع نہ صرف کاشتکار کی جو ملک کی ریڑھ کی ہڈی ہے۔ اقتصادی حالت سدھارے گی بلکہ دیہاتی رقبہ کی علمیت کو بھی ترقی دے گی۔ وہ دیہاتی رقبہ جو شہری رقبوں سے جہاں کے رہنے والے تمام قسم کی ضروریات زندگی سے استفادہ کرتے ہیں بالکلیہ منقطع ہے۔ سڑکیں ایک حد تک اس بے روزگاری کے مسئلہ کو بھی حل کردیں گی جس سے ملک کو لڑائی کے بعد خصوصیت سے دوچار ہونا پڑے گا۔ فتح کے بعد جو یقیناً ہوگی تمام مشینی فوجیں بحالہٖ باقی نہیں رکھی جائیں گی بلکہ ان کا بڑا حصہ

توڑ دیا جائے گا اور اس طرح سے ملکی حمل و نقل کے لئے موٹر سیکھے ہوئے ڈرائیور اور مشینوں کے کاریگر کافی تعداد میں مہیا ہو جائیں گے۔ اس وقت سڑکوں کی توسیع مشین اور مشین والوں دونوں کو کام میں لگا دے گی اور یہ لوگ کرایہ پر موٹریں چلا کر اپنی روزی کما لیں گے۔

۶۔ صنعتی ترقی کا خواہ وہ کسی قسم کی ہو انحصار بھی اچھی سڑکوں کے وجود پر ہے۔ اس ملک میں جس میں موٹر رانی کے قابل سڑکوں کا جال بچھا ہوتا ہے وہاں فلاح اور صنعت سازی کا دروازہ کھل جاتا ہے۔ قدیم طریقۂ حمل و نقل مثلاً بیل گاڑی وغیرہ ملک کی تجارت اور صنعت کے لئے شدید رکاوٹ ہے۔ برطانیہ اور امریکہ میں صنعتی ترقی بہترین ذرائع حمل و نقل کی وجہ سے ہوئی ہے۔ ذرائع حمل و نقل و آمد و رفت خواہ ریل ہو یا سڑک ہوائی جہاز ہوں یا سمندری جہاز ملک کی صنعتی ترقی کے لئے جزو اعظم ہیں۔ فی الحقیقت سڑک اور ریلوے ایک دوسرے کے معاون ذرائع ہیں نہ کہ مسابق و مقابل۔ جو ملک بیشتر کاشتکاری ہو اور جس کا صنعتی ہو جانا یقیناً لابدی ہے اور جہاں دیہاتی زندگی کا انحصار (۷) لاکھ (۵۰) ہزار مواضعات اور غیر منظم منڈیوں پر ہو بہترین سڑکوں کا وجود نہ صرف بہا ضروری ہے بلکہ قومی اہمیت ہے۔ جسم انسانی کی نالیوں کی طرح سڑکیں قومی زندگی کے خون یعنی تجارت کو چلائیں گی۔ چونکہ شہری رقبوں کو ہر ایک قسم کی آسانی حاصل ہے اس لئے دیہاتی رقبے انحطاط پذیر ہیں حتیٰ کہ دیہاتی زندگی ان لوگوں کے لئے بھی ناقابل برداشت ہوگئی ہے جو وہیں پیدا ہوئے اور بڑھے وجہ بالکلیہ ظاہر ہے۔ دیہاتی آبادی تین قسموں پر منقسم ہے۔ زمیندار یا جاگیردار، کاشتکار، کاریگر یا دستکار۔ زمیندار کے پاس چونکہ کافی رقم ہوتی ہے اس لئے وہ اپنے بیشتر دن ان شہروں میں گزارتا ہے جو تعیشات سے پُر ہیں۔ اس کو سجا ہوا مکان رہنے کے لئے اعلیٰ قسم کی درس گاہ تعلیم کے لئے بہترین ڈاکٹر علاج کے لئے اور عمدہ سینما گھر تفریح کے لئے چاہئیں تاکہ نہ صرف وہ خود آرام کی زندگی بسر کر سکے بلکہ اس کی اولاد بھی اعلیٰ تعلیم حاصل کر سکے اور بوقت ضرورت اعلیٰ طبی امداد پا سکے۔ ان ضروریات زندگی نے بیشتر زمینداروں کو گاؤں چھوڑنے پر مجبور کر کے ان شہروں میں لا کر بسا دیا جہاں ان کی ضرورتیں بآسانی پوری ہوتی ہیں۔ اور راحت میسر آتی ہے اس ترک وطن کا قدرتی انجام یہ ہوا کہ مصیبت زدہ مزدوروں اور پیشہ وروں کو بھی جو زندگی کی حقیقی ضروریات سے محروم ہو چکے تھے گاؤں کو خیرباد کہہ کر شہروں میں جا کر بسنا پڑا۔ نتیجہ اس کا یہ ہوا کہ شہری آبادی ضرورت سے زیادہ بڑھ گئی اور دیہی آبادی کم ہوتی گئی۔ گزشتہ زمانے کے آباد اور خود مکتفی دیہات تباہ حالت میں ہوگئے۔ کیونکہ وہ موجودہ زمانے کی آسانیوں اور آسائشوں سے محروم ہیں۔ بے کس اور غریب کاشتکاروں حتیٰ کہ معمولی حیثیت کے زمینداروں کو جب مناسب طبی امداد نہیں پہونچتی ہے تو وہ نہ صرف موت کا شکار بن جاتے ہیں بلکہ اپنے رشتہ داروں اور عزیزوں سے بھی محروم رہتے ہیں جو ذرائع آمد و رفت کے فقدان کی وجہ سے ان تک وقت پر نہیں پہونچ سکتے اس لئے اہل دہ کی حالت سدھارنے کی کوشش کی جائے۔ تاکہ وہ جدید آسائشوں سے کم از کم حسب ضرورت استفادہ کر سکیں اور یہ صرف اسی صورت میں ہو سکتا ہے جب کہ ان کے لئے بہتر سڑکیں بنا دی جائیں۔ ان دور دراز دیہاتوں میں جو بالخصوص برسات کے موسم میں عموماً تمام دنیا سے منقطع ہو جاتے ہیں، وبائی امراض اور ملیریا وغیرہ کے انسداد اور روک تھام کی تدبیریں بھی بہترین سڑکوں ہی کے ذریعہ سے اختیار کی جا سکتی ہیں۔

۷۔ دیہی تعلیم پھیلانے کی کوشش اس وقت تک کامیاب نہیں ہو سکتی جب تک کہ گاؤں والوں کے لئے اچھی سڑکیں نہ مہیا کی جائیں۔ علم جسمانی اور اقتصادی ترقی کے ساتھ ساتھ اس سیاسی وسعت النظری کو بھی فروغ دیتا ہے جو اس ڈیموکریٹک عہد میں

اور چیزوں سے زیادہ ضروری ہے۔ ہمارے مواضعات میں بے علمی کا یہ عالم ہے کہ غریب گاؤں والا معمولی سی معمولی بات بھی سمجھنے سے قاصر ہے جس کا اندازہ اس واقعہ سے ہو سکتا ہے کہ ایک گاؤں میں ایک شخص طاعون سے مرگیا کسی شخص نے اس گھرانے میں یہ خبر پھیلادی کہ "چالیس کے مرنے کا حکم آگیا ہے جو تھانہ میں ہے اب انتالیس اور مریں گے"۔ اس کنبہ کے عورت اور مرد سب جمع ہو کر روتے پیٹتے تھانہ میں پہنچے اور افسر سے جا کر فریادی ہوئے اور ان سے اپنی نجات چاہی۔ انہوں نے ہرچند یہ سمجھانے کی کوشش کی کہ نہ تو ایسا حکم آسکتا ہے اور نہ آیا ہے کسی نے تم لوگوں کو بہکایا ہے لیکن یہ تفہیم کچھ مفید نہ ہوئی بلکہ اس سے ان کی فریادیں اور شدت ہو گئیں اور آخر کار تھانہ کے ایک ماتحت رکن نے افسر سے یہ عرض کیا کہ ان لوگوں کو "میں ابھی سمجھائے دیتا ہوں آپ سے نہیں سمجھ سکتے ہیں" چنانچہ ان لوگوں کو لے جا کر کہا گیا کہ "بے شک تھانہ میں حکم آگیا ہے یہ بتاؤ کہ تم لوگ کیا چاہتے ہو"۔ سب نے ایک زبان ہو کر کہا کہ "ہم کو بچائیے" چنانچہ ان سے کہا گیا کہ "ہر شخص اپنے بچاؤ کے لئے دس روپے داخل کرے۔ جو یہ رقم داخل کرتا جائے گا اس کا نام رجسٹر سے خارج کر دیا جائے گا"۔ ہر شخص کے لئے دس روپے کا داخل کرنا مشکل تھا اس لئے فی کس پانچ روپے پر معاملہ طے ہوا چنانچہ فی کس پانچ روپے داخل ہوتے گئے اور نام رجسٹر...... سے کٹتا گیا حتیٰ کہ نہ صرف وہ سب گویا بچ گئے بلکہ باقی ماندہ اور جتنے تھے انھوں نے بھی بطور حفظ ماتقدم رقم نام داری داخل کر کے گویا اپنا بچاؤ کر لیا۔ محض اس لئے کہ انتالیس کی تعداد میں کہیں وہ نہ آجائیں۔ یہ جہل کا مشتے نمونہ ہے جو دیہی زندگی پر مسلط ہے۔

۸۔ گاؤں والوں کو سیناؤں، لکچروں اور گشتی کتب خانوں وغیرہ کے ذریعہ سے تعلیم دی جا سکتی ہے بشرطیکہ بہترین سڑکوں سے اس کو شہری مرکزوں کے ساتھ وابستہ کر دیا جائے۔ اگر دیہی رقبہ جات اپنے مرکزوں سے محروم رہ کر منقطع رہیں گے تو دیہات سدھار کی کامیابی کا امکان بظاہر کم ہے۔ جو دیہات اپنے مرکزوں سے سڑکوں کے نہ ہونے کی وجہ سے منقطع رہتے ہیں ان کا جاہل رہنا مسلم ہے۔ دیہاتی رقبہ جات جن میں لاکھوں دور افتادہ دیہات شامل ہیں۔ چھوٹی چھوٹی اور معاون سڑکوں کے ذریعہ سے ریلوے اسٹیشنوں اور بڑی سڑکوں سے متعلق ہو جانے چاہئیں۔ یہ معاون سڑکیں خام پیداوار کو بآسانی بڑی بڑی منڈیوں میں لے جا سکیں گی۔ سڑکیں اگر بن گئیں تو جس قدر تیزی سے سڑکیں تیار ہوں گی اسی تیزی سے ملک کی صنعت ترقی کرے گی۔ صرف سڑکیں ہی دیہات میں تعلیم، تمدن دولت اور تندرستی پیدا کر سکتی ہیں۔

۹۔ قبل اس کے کہ میں یہ بتاؤں کہ کس قسم کی سڑکیں ہندوستان کی آئندہ حمل ونقل کی متنوع ضروریات کو پورا کرنے کے لئے ضروری ہیں میں ہندوستان کے برطانوی عہد کی سڑک سازی کی ایک مختصر تاریخ بیان کر دینی ضروری سمجھتا ہوں۔ ذرائع آمد و رفت کی ضرورت کو اولاً لارڈ ہارڈنگ کی گورنمنٹ نے سوچ کر ۱۸۴۶ء میں ریلوے کے لئے پہلی پیمائش کرائی۔ اس کے علاوہ سررشتہ ڈاک خانہ کی اصلاح کی جو ۱۸۴۳ء میں قائم کیا گیا تھا۔ سڑکوں کی تیاری اور تاروں کی تنصیب پر بھی اسی گورنمنٹ نے اچھی طرح سوچ بچار کیا لیکن اس وقت ان منصوبوں پر عمل نہ ہو سکا۔ البتہ اس کے جانشین لارڈ ڈلہوزی کے عہد میں یہ بیل منڈھے چڑھی اور ان خیالات اور منصوبوں نے عملی جامہ پہنا۔ بڑی شاہی سڑک کے، جس کو عام طور پر بانی کے نام کی مناسبت سے شیر شاہی سڑک کہتے ہیں۔

...... از سر نو تعمیر اور اس کی توسیع کا آغاز ڈلہوزی کے عہد میں ہوا۔ اس سے

قبل جو سڑکیں کہ اس وقت موجود تھیں اس کا انتظام ایک فوجی مجلس کے ہاتھ میں تھا جس کا فریضہ یہ تھا کہ وہ ان کی نگہداشت کرتی رہے۔ لارڈ ڈلہوزی نے اس مجلس کو برخاست کرکے ہر ایک صوبہ میں اس کی جگہ ایک سررشتہ تعمیرات قایم کیا اس وقت سے سڑک سازی کی پالیسی نے ایک عملی شکل اختیار کی قطع نظر ان سڑکوں کی نگہداشت کے جو اس وقت موجود تھیں نئی سڑکیں بنائی گئیں اور اس طرح سے ملک کے کچھ حصہ میں سڑکوں کا جال پھیلایا گیا لیکن یہ سڑکیں صرف فوجی مقاصد کے لئے تھیں تاکہ اندرونی امن میں خلل نہ پڑسکے اس وقت تک حکومت ہند ہی سڑکوں کی تیاری اور ان کے نگہداشت کی ذمہ دار تھی۔ لیکن ۱۸۷۱ء میں یہ کام صوبے کی حکومتوں کی طرف منتقل کیا گیا جو حکومت ہند کے زیر نگرانی اس کی ہدایات پر عمل کرتی تھیں۔

لیکن اب سڑک سازی کے کام کو حکومت ہند سے کچھ واسطہ نہیں ہے بلکہ یہ قطعاً صوبہ واری مسئلہ ہوگیا ہے۔ ہر ایک صوبہ پرانی سڑکوں کی نگہداشت اور نئی سڑکوں کی تیاری کا ذمہ دار ہے۔ اضلاع میں سڑکوں کی نگہداشت اور تیاری مجالس اضلاع کے جن کو ڈسٹرکٹ بورڈ کہتے ہیں ذمہ ہے لیکن یہ افسوس سے کہنا پڑتا ہے کہ جہاں تک کہ سڑکوں کی تعمیر کا تعلق ہے ان مجالس نے اپنی خدمت کو خاطر خواہ انجام نہیں دیا۔ ہزاروں مواضعات ایسے ہیں جو معاون سڑکوں کے نہ ہونے کی وجہ سے اپنے مرکزوں سے منقطع ہیں، جس کا نتیجہ یہ ہے کہ دیہاتی لوگ اپنی روزانہ زندگی میں مختلف مشکلات سے دوچار ہوتے ہیں۔ تاوقتیکہ ہر ایک مجلس ضلع اس قومی تعمیر کے مسئلہ پر سنجیدگی سے غور کرکے اور تمام دوسری تجویزوں پر ترجیح دیتے ہوئے سڑک سازی کا ایک مکمل پروگرام تیار نہیں کرے گی اس وقت تک کاشتکاروں کی حالت درست نہیں ہوسکتی ہے۔

۱۰۔ پکی سڑک کی تاریخ سے اس بات کا پتہ چلتا ہے کہ اس قسم کی سڑکیں عرصہ سے استعمال میں ہیں اور اس قسم کی پختہ سڑکیں جن میں چھوٹے بڑے پل بھی تھے آہستہ چلنے والی سواریوں کے لئے کافی موزوں تھیں مثلاً گھوڑا گاڑیاں، اونٹ گاڑیاں، بیل گاڑیاں وغیرہ۔ لیکن اس زمانے میں جس کو موٹر کا عہد کہنا چاہئے اور جو تیز رفتار عہد ہے، جب کہ تیز رفتاری آئے دن بڑھ رہی ہے، سڑک سازی کا پورا طریق ہی بدل جانا چاہئے تھا یہی سبب ہے سڑک کے ماہرین اس معاملہ پر اچھی طرح سے غور کرکے اس صحیح نتیجہ پر پہونچے کہ مانع غبار سڑکیں تیار کی جانی چاہئیں تاکہ تیز رفتار سواریاں سڑک پر چلنے والوں کی تندرستی کو متاثر نہ کرسکیں۔ چنانچہ ملک کے بڑے بڑے شہروں میں تارکول کی سڑکیں بنائی گئیں جن سے خاطر خواہ نتیجہ نکلا اور سڑک کے استعمال کرنے والے خاک کی مصیبت سے محفوظ ہوسکے۔ بعض صوبہ واری اور ضلع واری سڑکیں بھی تارکول کی کردی گئیں۔ لیکن چونکہ تارکول کی سڑکوں میں بھی کچھ خرابیاں پائی گئیں اس لئے اس معاملہ پر بھی غور کیا گیا اور اس کی بجائے سمنٹ کی سڑکوں کی تجویز کی گئی لیکن یہ زبردست خرچ کا معاملہ تھا اس لئے اس پر عمل کرنا آسان نہیں تھا۔ اس کے آغاز کا سہرا اغلباً سررشتہ تعمیرات دولت آصفیہ کے سر ہے جس نے سب سے پہلے بطور تجربہ بڑھتے ہوئے شہر حیدرآباد کی بعض سڑکیں سمنٹ کی بنائیں۔ یہ تجربہ کامیاب رہا اور باستثنا بعض سڑکوں اور گلیوں کے پورے شہر میں سمنٹ کی سڑکیں بنوادی گئیں۔ اب سوال یہ ہے کہ آیا تیز رفتار سواریوں کو مد نظر رکھتے ہوئے جو یقیناً بعد ختم جنگ لا تعداد ہو جائیں گی، ہندوستان کے پورے ملک میں سمنٹ کی سڑکیں ہوسکیں گی؟ ہم کا جواب نفی میں ہے، اس لئے کہ اس کے لئے کثیر رقم کی ضرورت ہے۔ جس کو ہندوستان کا خزانہ برداشت نہیں کرسکتا ہے درحالیکہ

اس کو اسی محدود آمدنی میں سے بہت سے اہم کام [illegible] یا کرنے پڑیں گے۔ اس لئے میں یہ تجویز کروں گا کہ اس وقت تک جب تک کہ ملک کے ذرائع آمدنی میں ترقی نہ ہو اور [illegible] اقتصادی حالت سدھر نہ جائے اس وقت تک سررشتۂ تعمیرات کی طرف سے تمام سڑکیں تارکول کی کردی جائیں۔ جیسا کہ بعض حصۂ ملک میں کردیا گیا ہے۔ اسی طرح سے چھوٹے چھوٹے شہروں کی بلدیہ یا مجالس صفائی یعنی میونسپل کارپوریشن یا میونسپلیٹوں سے کہا جائے کہ وہ اپنی اپنی شہری سڑکوں کو سمنٹ کی سڑکوں میں تبدیل کردیں اس طرح سے شہری اور بڑی سڑکیں نہ صرف مانع یا دافع غبار ہو جائیں گیں بلکہ مضبوط اور مستحکم بھی۔ دیہی رقبہ جات کی سڑکوں کی تعمیر کے معاملہ پر بھی اچھی طرح سے غور کیا جائے تاکہ کوئی گاؤں چھوٹا ہو یا بڑا بغیر اچھی اور قابل استعمال سڑک کے باقی نہ رہے۔ ہر ایک مجلس ضلع ڈسٹرکٹ بورڈ پانچ یا زیادہ سے زیادہ دس سالہ پروگرام سڑک سازی کا تیار کرے اور اگر مالیہ اجازت دے تو تارکول کی سڑکیں سردست بنا کر تمام دیہاتوں کو مرکزوں سے ملا دیا جائے۔ لیکن اگر فی الحال کافی فنڈ موجود نہیں ہے تو تارکول کے بجائے "جھاگ" کو استعمال کیا جائے جیسا کہ ریاست میسور نے اپنے دیہی رقبہ جات میں کامیاب تجربہ کیا ہے۔ جن کو ریاست میسور کے دیکھنے کا اتفاق ہوا ہے وہ اس سے بخوبی واقف ہیں کہ ایک حد تک کوئی موضع ریاست میں ایسا نہیں ہے جہاں اچھی سڑک اور بجلی کی روشنی نہ ہو۔ ۱۹۳۶ء / ۱۹۳۷ء میں صوبہ جات متحدہ صنعتی و زراعتی نمائش منعقدہ لکھنؤ کے موقع پر ریاست میسور کا بھی ایک مکان تھا جس میں ریاست نے "جھاگی سڑک" اور "جھاگی پٹرول" کا مفید مظاہرہ کیا تھا۔ سردست جب تک کہ ہم بہتر اور معیاری سڑکیں دیہی رقبہ جات میں تیار کرنے کے قابل نہ ہوں اس وقت تک کیوں ہم میسور کی پیروی کرکے سستی سڑکیں تیار نہ کرلیں۔ ہندوستان میں جہاں متعدد شکر سازی کے کارخانے موجود ہیں جھاگوں کا کافی مقدار میں بالخصوص دیہی سڑکوں کے استعمال کے لئے مل جانا کچھ دشوار نہیں ہے۔ اس کے نقص اور خرابی گو اگر کچھ ہے یا اس کی مضبوطی کو فنی رائے ہی بتا سکتی ہے لیکن اس سے کسی کو انکار نہیں ہوسکتا کہ یہ سڑکیں بہت سستی رہیں گی اس کے ساتھ ہی سررشتۂ انتظامی اور دیہاتیوں کے لئے یکساں معاون ہوں گی حتیٰ کہ یہ معمولی سڑکیں بھی ان لوگوں کے لئے رحمت ہو جائیں گی جو آرام و آسائش کی زندگی سے محروم ہیں میرا خیال ہے کہ یہ "پانچ سالہ سڑک پروگرام" بشرطیکہ اس پر سختی سے پابند رہا جائے تو ہر ایک محکمۂ تعمیرات اور مجلس ضلع سے ملک کے گوشہ گوشہ میں موٹر رانی کے قابل سڑکیں تیار کرادے گا۔

اب سوال صرف پل کی تیاری کا باقی رہتا ہے جو سڑک پروگرام میں نہ صرف اہم بلکہ قیمتی مد ہے۔ اس سے کچھ فائدہ نہیں ہے کہ سڑک تو بنادی جائے لیکن رقم کے نہ ہونے کی وجہ سے پل چھوڑ دیا جائے۔ سڑک کی بجائے پل کا ہونا بہتر ہے تاکہ مسافر ندیوں کو پار کرتے ہوئے اپنی زندگی کو خطرے میں ڈالے بغیر اپنے اپنے گھروں پر پہونچ جائیں۔ یہ صحیح ہے کہ سڑک کی تیاری اتنی قیمتی نہیں ہے جتنی پل کی تعمیر لیکن اس مشکل کو بھی یوں حل کیا جاسکتا ہے کہ گہری لیکن کم چوڑی ندیوں پر اگر ستانی پل Submersible Bridge اور پایاب ندیوں پر (Cause Ways) پختہ اونچا راستہ بنادیا جائے۔ اس طریقہ سے پل کی تعمیر کی رقم میں یقیناً کمی ہو جائے گی۔

کسی اسکیم یا منصوبے کا تیار کرنا اس کے نافذ کرنے کے مقابلے میں زیادہ آسان ہے اس لئے کہ ہر ایک منصوبہ چھوٹا ہو یا

بڑا جب اس کو عمل میں لایا جاتا ہے تو اپنی وسعت کے اعتبار سے رقم کا متقاضی ہوتا ہے۔ ایسے ملک میں جس کو "ملک بے سڑک" کہا جاسکتا ہے کالاٗ و کملاً سڑک کی تعمیر کے منصوبے کا نافذ کرنا تا وقتیکہ کافی رقم جس سے ملک بے بہرہ ہے خرچ کرنے کے لئے نہ ہو آسان کام نہیں ہے۔ یہ مقابلۃً بہت ہی اہم ہے جو فوری توجہ کا محتاج اور کثیر خرچ کا طالب ہے تاکہ لڑائی ختم ہونے پر ایک طرف ایک خاص طبقہ کی بے روزگاری کے مسئلہ پر آسانی اور کامیابی سے قابو پالیا جائے اور دوسری طرف ملک کے ذرائع آمدنی کو ترقی دی جاسکے۔ لیکن اس کی تکمیل میں سب سے بڑی دشواری رقم کی ہے اور اس وسیع اسکیم کے لئے جو پورے ملک سے متعلق ہے روپیہ کی کیا سبیل ہونی چاہئے۔ یہ سوال پیچیدہ اور پریشان کن ہے جس کو وہی لوگ حل کرسکتے ہیں جو اس معاملہ کو اپنے ہاتھ میں لیں گے۔ لیکن میں اس مسئلہ میں صرف ایک امرکین کے الفاظ میں یہ عرض کروں گا کہ "اچھی سڑکوں کے لئے رقم دو خواہ وہ ہوں یا نہ ہوں کیونکہ نہ ہونے پر تم زیادہ رقم ادا کرتے ہو" اس کے صاف معنی یہ ہیں کہ جو کچھ آپ اچھی سڑکوں کے لئے دیں گے وہ سڑکیں آخر میں آپ کو اس سے زیادہ دیں گی ورنہ آپ اس طرح سے ادا ہی کرتے رہیں گے۔ اس سے آبادیوں کی فلاح ہوگی۔ سڑکوں کے پاس کی زمینوں کی قیمتیں بڑھ جائیں گی۔ موٹر ٹکس زیادہ وصول ہوگا اور صنعت پھیلے گی۔ ملک کے ذرائع آمدنی کو فروغ دینے کا واحد ذریعہ یہی ہے کہ پہلے روپیہ لگایا جائے لیکن چونکہ یہ ممکن نہیں ہے کہ ملک کا سارا مالیہ یا اس کا بیشتر جزو اس مقصد کے حاصل کرنے کے لئے صرف کردیا جائے اور نہ یہ مناسب و ممکن ہے کہ لوگوں پر بلا واسطہ ٹکس لگایا جائے۔ اس لئے مناسب یہ ہے کہ قرض کے اصول کو اختیار کیا جائے جیسا کہ امریکہ، آسٹریلیا اور دوسرے ملکوں میں کیا گیا ہے۔

ہندوستانی ریلوے اس قرض کے اصول کی پیداوار ہے جس پر آٹھ ارب روپیہ خرچ ہوا ہے۔ یہ کہا جاسکتا ہے کہ ریلوں اور سڑک میں بہت فرق ہے کیونکہ ریلوے سے بخلاف سڑک کے ایسی کوئی براہ راست آمدنی نہیں ہوسکتی جس سے اس کا قرض ادا کیا جاسکے۔ میرے خیال میں اس قرض کی ادائیگی کے لئے راست آمدنی کی ضرورت نہیں ہے بلکہ قرض کی ادائیگی مالیہ کی بچت اور بڑھتے ہوئے موٹر ٹکس وغیرہ سے ہوسکتی ہے۔ بہرحال ذرائع آمد و رفت کی ترقی ایک قومی ضرورت ہے جس کو بہرصورت پورا کیا جانا چاہئے۔ اگر میرا اندازہ غلط نہیں ہے تو میں یہ کہوں گا کہ سردست ایک ارب روپے سے تمام ملک کے طول و عرض میں سڑکوں کا جال پھیلایا جاسکتا ہے۔

محمد ابرار حسین

تاریخ تمدن ہند ۔ از ڈاکٹر ایشورا صاحب ٹوپا ایم اے ۔ پی ایچ ڈی ۔ پروفیسر تاریخ و تمدن جامعۂ عثمانیہ

اس کتاب میں ہندوستان کے مختلف تمدنوں کو وضاحت کے ساتھ قلمبند کیا گیا ہے۔ اس وقت اس کی پہلی جلد طبع ہوچکی ہے۔ جس میں دراویڈیوں اور آریاؤں کے تمدن کو نہایت تحقیق کے ساتھ درج کیا گیا ہے۔ اس موضوع پر انگریزی یا کسی اور زبان میں بھی کوئی کتاب اس وسعت کے ساتھ شائع نہیں ہوئی قیمت ہے

آریائی زبانیں ۔ یہ کتاب اردو کی ابتدائی تاریخ اور اس کے ماخذوں کا مستند تذکرہ ہے جس کو ادارہ کے لئے ڈاکٹر سید مشیوسما ایم اے ۔ ڈی لٹ پروفیسر سنسکرت و لسانیات و صدر کل ہند انجمن لسانیات نے خاص طور پر مرتب کیا ہے۔ صفحات ۱۰۰ قیمت عہ

گاؤں کی باتیں

کیوں نارائن اچھے ہو؟ کیا حال ہے گاؤں کے لوگوں کا
ہیں؟ - پرسوں آیا لیکن دل مُردہ ہے جی بیٹھا سا
تنہائی سے اُکتا کر جب گھر سے نکل جاتا ہوں میں
کیا جانے کیا یاد مجھے آتا ہے مچل جاتا ہوں میں
ہاں یہ بتاؤ! ارجن و مانک کیسے ہیں؟ ملتے ہی نہیں
اور، سنا ہے گِردھاری نے ٹکے لگا دی اپنی زمیں!
کہتے ہیں سب، یہ جو نیا پٹواری ہے کچھ اچھا ہے!
اچھا ہوگا بوڑھا ہے، دنیا کو سمجھا بوجھا ہے
خیر، یہ باتیں چھوڑو، کچھ اپنی بھی کہو! کیا کرتے ہو؟
اب بھی پڑھتے ہو؟ یا کام اپنی کھیتی کا کرتے ہو؟
وہ بھی زمانہ کیا تھا، جب دنیا کی ہمیں پرواہ نہ تھی
ساتھی تھے، اور یہ جنگل تھا، اور کسی سے چاہ نہ تھی
بستر سے اٹھتے ہی اکثر کھیلوں میں کھو جاتے تھے
"ساون آیا تم نہیں آئے" برساتوں میں گاتے تھے
اِملی کے پیڑوں کے تلے تھا گھر اپنا، مسکن اپنا
ندی نالے اپنے تھے، تالاب اپنا اور بَن اپنا
مونگ، چنے دوپہروں کو کھیتوں سے جو چرایا کرتے تھے
جھاڑی میں یا باڑوں میں چھپ چھپ کر کھایا کرتے تھے
وہ جو گھنا سا بڑ ہے، اس کے آگے ہی پیپل کے قریب
پیلے دھان نظر آتے تھے، کتنے دلکش کتنے عجیب

یاد ہے؟ - اک دن اُس گوری رادھا کو کتنا ستایا تھا
بیچاری پر گندہ پانی سب نے لے کے اڑایا تھا
پھر شاید اس کے چھوٹے سے بھائی گنپت نے آکر
ہم پر اینٹیں، پتھر برسائے تھے طیش میں لہرا کر!
شکلا ہم سے گھبراتی تھی، لچھمن بھی تو ڈرتا تھا
اور وہ کملا کی باتوں پر اندر کتنا مرتا تھا
کھیلتے تھے ہم آنکھ مچولی سیتا دیکھا کرتی تھی
پاربتی کی بھاوج سب کی آنکھیں میچا کرتی تھی
اُس پگڈنڈی والے ویرانے سے ہم گھبراتے تھے!
لیکن، شنکر اور چندرا ہر بار ادھر ہی جاتے تھے
کتنے اچھے دن تھے وہ، اور کتنی سہانی راتیں تھیں
کتنی سادہ ملاقاتیں تھیں، کیسی الھڑ باتیں تھیں

تحسین سروری

کتب خانۂ آصفیہ

فرخندہ بنیاد حیدر آباد میں قابلِ دید تاریخی مقامات دو قسم کے ہیں ایک تو وہ قدیم عالی شان عمارتیں جو قطب شاہی دور سے تعلق رکھتی ہیں مثلاً قلعہ گولکنڈہ، چارمینار، مکہ مسجد، بادشاہی عاشور خانہ، چارکمان وغیرہ اور دوسری وہ فلک بوس اور مہتم بالشان عمارتیں جو آصفی عہدِ میمنت مہد کی یادگار ہیں مثلاً عیدگاہ، چومحلہ مبارک، فلک نما، خلوت مبارک، دواخانہ عثمانیہ، عدالت العالیہ، صدر شفاخانہ، سٹی کالج، جامعہ عثمانیہ اور کتب خانۂ آصفیہ وغیرہ۔ یوں تو خوبصورت عمارتوں، خوش نما بازاروں اور دلچسپ تفریح گاہوں کی وجہ سے شہر حیدر آباد کا عام منظر ہی نہایت دلکش ہے لیکن دریائے موسیٰ کے دونوں کناروں پر خوب صورت اور شان دار عمارتوں اور خوش نما تفریح گاہوں کی جو قطاریں چلی گئی ہیں وہ رودِ موسیٰ کے نیلگوں پانی کے مقابلے میں بہت دلفریب معلوم ہوتی ہیں اور جن کے دیکھنے سے طبیعت کبھی سیر نہیں ہوتی۔ ان ہی عمارتوں میں سے ایک علم و ادب کا بہترین مرکز ہے جہاں مطالعہ کرنے والوں کا ہر وقت ہجوم رہتا ہے اس سے میرا مقصد حیدر آباد کا شاہی کتب خانہ ہے جو کتب خانۂ آصفیہ کے نام سے موسوم ہے۔ اس کا شمار ہندوستان کے مشہور کتب خانوں میں ہوتا ہے۔

اکثر حضرات کو مطالعہ کا ذوق ہوتا ہے۔ شوقین اور باہمت افراد بے شمار کتابیں خریدتے بھی ہیں لیکن پھر بھی ہر شخص جتنی کتابیں پڑھنا چاہتا ہے اتنی خرید نہیں سکتا۔ اس لئے تعلیم کی توسیع و اشاعت کی خاطر تعلیم یافتہ ممالک میں آئے دن کتب خانوں کی ضرورت محسوس ہوتی گئی اور صرف چند دردمند علمی خدمت گزاروں کی محنت و کوشش سے کتب خانے قائم ہو گئے جن کا آج دنیا کے بڑے بڑے کتب خانوں میں شمار ہوتا ہے۔ آصفجاہی سلاطین کی فیاضی اور علم پروری سے یہ امر بہت بعید تھا کہ ہندوستان کی سب سے بڑی اسلامی ریاست میں سرکاری کتب خانہ نہ ہو چنانچہ فروردی ۱۳۰۰ف م فبروری ۱۸۹۱ء میں بعہد اعلیٰ حضرت میر محبوب علی خاں آصفجاہ سادس ملک اور مالک کے سچے خدمت گزار مولوی سید حسین بلگرامی نواب عماد الملک مرحوم نے اس کو قائم کیا اور مولوی سید علی حیدر نظم طباطبائی نواب حیدر یار جنگ کتب خانے کے مہتمم مقرر ہوئے۔ پہلے پہل اس کتب خانے میں بہت ہی محدود ذخیرۂ کتب تھا۔ یعنی اردو فارسی عربی انگریزی کی چند مطبوعہ کتابیں تھیں اور چند قلمی بیاضیں۔ لیکن قابل مہتمم کتب خانہ مولوی سید علی حیدر نظم طباطبائی (جو تقریباً پانچ سال یعنی ۳۰ شہریور ۱۳۰۵ف تک اس خدمت پر مامور رہے) کی علمی دلچسپیوں اور بانیٔ کتب خانہ نواب عماد الملک مرحوم کی پر خلوص خدمت گزاری کا نتیجہ یہ ہوا کہ اس کتب خانے میں آئے دن قابل قدر نئی کتابوں کا اضافہ ہونے لگا اور آخر کار گزشتہ پچاس سال کی قلیل مدت کے اندر ہی اس نے وہ عظیم الشان ترقی کر لی کہ اس کا شمار بلاشبہ ہندوستان بھر کے چند مشہور کتب خانوں میں ہونے لگا۔

یکم مہر ۱۳۰۵ف سے کتب خانہ آصفیہ کے ابتدائی دور کی دوسری منزل اور مولوی سید تصدق حسین کی مہتمی کا آغاز ہوتا ہے۔ صاحب موصوف نے نواب عماد الملک کے جانشین نواب مہدی یار جنگ بہادر کی نگرانی میں جس انہماک اور غیر معمولی دلچسپی سے کتب خانہ کے کاموں مثلاً تنظیم کتب، ترتیب فہرست اور تقسیم فنون وغیرہ میں باقاعدگی پیدا کی وہ فراموش نہیں کی جا سکتی اور اسی طرح تقریباً بائیس سال یعنی ۲ خورداد ۱۳۲۶ف تک صاحب موصوف اس علمی خدمت کو انجام دیتے رہے۔

۲ خورداد ۱۳۲۶ف سے کتب خانۂ آصفیہ کے ابتدائی دور کی

تکمیل کا زمانہ اور مولوی سید عباس حسین کی مہتممی کا عہد شروع ہوتا ہے۔ صاحب موصوف کی ہی دلچسپی اور پرخلوص سرگرمی کا نتیجہ تھا کہ ۱۳۴۵ف ۱۹۳۶ء میں کتب خانہ کی وسعت اور ترقی کے مد نظر موجودہ جدید مستقل عمارت کی ضرورت لاحق ہوئی ورنہ اس سے قبل یہ کتب خانہ عابد روڈ پر اس عمارت میں تھا جس میں آج کل صدر ٹپہ خانہ سرکار عالی ہے۔ باوجودیکہ اس عمارت میں بہت کچھ ترمیم کی جاکر وسعت دی گئی تھی لیکن پھر بھی ناکافی ثابت ہونے پر ایک جدید مستقل عمارت کی ضرورت پیش آئی چنانچہ دریائے موسیٰ کے کنارے بصرفہ سوا پانچ لاکھ روپیہ موجودہ دو منزلہ عمارت تعمیر کی گئی جو اپنی خوب صورتی و نفاست اور طرز تعمیر کی وجہ سے اپنی آپ نظیر ہے اور جس کا افتتاح اعلیٰحضرت بندگان عالی شہریار دکن سلطان العلوم آصفجاہ سابع اوام اللہ اقبالہ نے بنفس نفیس فرماکر اپنی علم پروری کا ثبوت دیا۔ غرض یہ کہ مولوی سید عباس حسین صاحب نے اکیس سال تک خدمت مہتممی کو جس عمدگی سے انجام دیا اس کا مختصر خاکہ یہ ہے کہ ۱۳۴۳ف میں کتب خانہ میں جملہ کتب کی تعداد تقریباً چالیس ہزار تک پہنچ چکی تھی۔ قلمی ذخیرہ میں بھی کافی اضافہ ہوا کتب خانہ کے لئے اخبارات و رسائل ۸۴ کی تعداد میں جاری تھے۔ اوقات مطالعہ مخصوص تھے۔ صبح ۸ سے ۱۱ بجے تک کا وقت اخبارات و رسائل کے لئے مخصوص تھا۔ فہرست کتب کی مطبوعہ جلدیں بلحاظ فنون مرتب ہوئیں۔ نیز اسی زمانے میں ایک جائداد مددگار مہتمم کی بھی قائم ہوئی تھی جو تقریباً دس سال بحال رہ کر فروری ۱۳۴۳ف میں تخفیف کر دی گئی۔ اس زمانے میں کتب خانہ کے جملہ مصارف مع افسر و عملہ و دیگر لوازمہ چالیس ہزار چھ سو اکاسی سالانہ شاہی خزانہ پر عائد ہوتے تھے۔ صرف ۱۳۴۳ف کے ایک سالہ دوران میں جس قدر کتب داخل کتبخانہ ہوئیں ان میں سے (۱۰۹) کتب قلمی السنہ شرقیہ (۴۰۴)

کتب مطبوعہ السنہ شرقیہ اور ۶۹۴ کتب السنہ مغربیہ کے ہیں۔

۱۸ فروری ۱۳۴۳ف کو سید عباس حسین صاحب مہتمم کا انتقال ہوگیا۔ مرحوم کی جگہ بروقت کوئی مستقل انتظام نہ ہونے کی وجہ سے مولوی حمید المظفر صاحب مددگار، ۸ ماہ تک بحیثیت نگران کار مہتمم کار گزار رہے۔ بالآخر ۱۹ آبان ۱۳۴۵ف کو خدمت مہتممی پر جامعہ عثمانیہ کے ایک ہونہار سپوت ڈاکٹر محمد راحت اللہ خاں صاحب ایم اے ڈی فل (لائپزگ) کا تقرر عمل میں آیا اور یہیں سے کتب خانہ آصفیہ کا وسطی دور جسے عہد شباب کہنا چاہیے شروع ہوتا ہے۔ کتب خانہ کے کاروبار کی باقاعدگی اور موجودہ رفتار کے لحاظ سے یہ اندازہ قائم کیا جاسکتا ہے کہ وہ دن دور نہیں ہے کہ کتب خانہ آصفیہ دنیا کے ممتاز کتب خانوں میں شمار کیا جائے گا۔

کتب خانہ آصفیہ کے موجودہ انتظامات ایک مجلس انتظامی کے تحت ہیں جو کئی ارکان پر مشتمل ہے، اس کے صدر نواب صاحب چھتاری سر صدر اعظم بہادر دولت آصفیہ اور نائب صدر نواب مہدی یار جنگ بہادر صدر المہام تعلیمات سرکار عالی ہیں۔ کتب خانہ کے جملہ انتظامات اور کاروبار اسی مجلس انتظامی سے متعلق ہیں۔ کتب خانہ کی ترقی افادیت اور عوام کے ذوق مطالعہ کا سرسری اندازہ اس سے ہو سکتا ہے کہ ۱۳۵۰ف م ۱۹۴۱ء میں ۹۸۸۸۰ ناظرین نے جن کا اوسط روزآنہ ۲۶۱ ہوتا ہے، سال تمام میں ۹۶۳۱۰ کتب کا مطالعہ کیا اور ۱۳۵۱ف م ۱۹۴۲ء میں ۱۰۳۹۶۲ ناظرین نے بلحاظ اوسط روزآنہ ۳۰۴ اشخاص ۱۱۵۵۴۴ کتب کا مطالعہ کیا اور یہ تعداد ان کتب کے سوا ہے جو سرکاری دفاتر، ارکان مجلس انتظامی اور دیگر ممبران کتب خانہ کے پاس روانہ کیجاتی ہیں۔

میں نے ابھی بیان کیا ہے کہ حکومت آصفیہ کا یہ کتب خانہ

ہندوستان بھر میں مشہور ہے اور یہ بات میں نے بلا سوچے سمجھے نہیں کہی ہے۔ بلکہ اس وقت اس عظیم الشان کتب خانہ میں آج کل کی چھپی ہوئی کتابوں سے لیکر ساڑھے نو سو سال پہلے کی لکھی ہوئی کتابیں موجود ہیں مثلاً فقہ حنفی میں مختصر الکافی بہت ہی نایاب نسخہ ہے۔ اس کو امام ابو عبداللہ محمد بن الحسن الشیبانی الکوفی نے سنہ [illegible]ھ میں لکھا ہے۔ اسی طرح دوسری کتاب مختصر المزنی ہے فقہ شافعی کی یہ سب سے پہلی کتاب امام اسمٰعیل بن یحییٰ المزنی الشافعی نے سنہ ۲۶۶ھ میں تصنیف کی ہے۔ غرض اسی قسم کی اور بیسیوں کتابیں ہیں جن کی تفصیل کی چنداں ضرورت نہیں۔ فی الوقت اس کتب خانہ میں کتب کی مجموعی تعداد ساڑھے چھپن ہزار ہے۔ ان میں سے ۱۱،۴۴۳ نادر روزگار اور کمیاب قلمی ذخیرہ السنۂ مشرقیہ ۱،۹۵۱ مطبوعہ کتب السنۂ مغربیہ اور باقی علوم مشرقیہ کی مطبوعہ کتابیں ہیں اور ہر سال حکومت کی طرف سے بیس ہزار روپیہ کی نئی کتابوں کا اضافہ ہوتا ہی جاتا ہے جس سے اس کتب خانہ کے شاندار مستقبل کا اندازہ کیا جاسکتا ہے۔ کتبخانۂ آصفیہ میں زمانۂ قدیم کے عربی، فارسی اور اردو مخطوطات اس قدر زیادہ ہیں کہ شائد ہی اس کی نظیر ہندوستان بھر کے کتبخانوں میں مل سکے گی۔ اس علمی ذخیرہ کے مطالعہ اور استفادہ کے لئے دہلی، کلکتہ، بمبئی اور مدراس سے محققین اور مبصرین حیدرآباد آتے رہتے ہیں۔ ان قدیم مخطوطات کی حفاظت کے لئے حکومت سرکار عالی نے سال گذشتہ آہنی ریکیں اور آہنی الماریوں کی تیاری میں ساٹھ ہزار روپیہ سے زائد مصارف برداشت کئے۔ اسی طرح سنہ ۱۳۵۲ف میں جملہ مصارف کتب خانہ مع مشاہرہ عملہ وغیرہ بجائے انتیس ہزار تین سو اکتالیس تیرہ آنے نو پائی کے ننانوے ہزار تین سو اکہتر پندرہ آنے گیارہ پائی ماہانہ ہوئے۔ ظاہر ہے کہ یہ مصارف کچھ معمولی نہیں ہیں۔ مثال کے طور پر لندن کی برٹش میوزیم لائبریری کو پیش کیا جاسکتا ہے جو دنیا کا سب سے عظیم الشان کتب خانہ ہے اور جس میں اس وقت بحیثیت مجموعی بیس لاکھ سے کچھ زیادہ کتابیں فراہم ہیں۔ محض ساری قوم کی اکیاسی سالہ لگاتار کوشش اور بے انتہا صرفہ کا نتیجہ ہے مزید برآں ناظرین سے مقررہ چندہ بھی وصول کیا جاتا ہے۔ جب ہماری ہمدرد حکومت کی جانب سے ہمارے ہی مفاد کی خاطر اس کتب خانہ پر بے دریغ روپیہ صرف کیا جارہا ہے اور ناظرین سے کسی قسم کا چندہ بھی نہیں لیا جاتا ہے تو وہ حضرات جن کے پاس قلمی کتابیں ہوں انھیں چاہیے کہ وہ دوسروں کو بھی استفادہ کا موقع دیں اور ان نایاب نسخوں کی سلامتی کا بہترین طریقہ یہی ہے کہ بجائے ذاتی حفاظت کے انھیں سرکاری حفاظت میں تحفتاً نہ سہی قیمتاً ہی حوالے کردیں۔ ایسا کرنے سے کتب خانۂ آصفیہ میں کم از کم ایک لاکھ قلمی کتابوں کا جمع ہونا کوئی بڑی بات نہیں ہے۔ ورنہ آئندہ عدم احتیاط کی وجہ سے ان قلمی کتابوں کو یا تو کیڑے کھا جائیں گے یا جاہل اولاد انھیں ردی میں بیچ ڈالے گی۔

حیدرآباد میں امدادی اور قومی کتب خانے اگرچہ کہ بہت ہیں لیکن کتب خانۂ آصفیہ میں جو بات پائی جاتی ہے وہ کسی دوسرے کتب خانہ میں نظر نہیں آتی۔ یہاں دن بھر میں سیکڑوں شائقین علم کتابیں پڑھنے کے لئے آتے ہیں۔ رجسٹر مطالعہ کنندگاں کے دیکھنے سے اندازہ ہوگا کہ کتنے لوگوں کو شوق مطالعہ ادھر کھینچ لاتا ہے۔ دن میں کسی وقت بھی یہاں چلے جائیں تو کم و بیش ڈیڑھ سو بوڑھے اور نوجوان اس کے ہال میں کتب بینی میں مصروف نظر آئیں گے۔ ان میں سے کوئی تو پرانی کتابیں اس لئے پڑھتا ہے کہ کوئی نئی کتاب لکھے۔ کسی کی غرض یہ ہوتی ہے وہ اخباروں اور رسالوں میں مضامین لکھنے کے لئے مواد تلاش کرے

اور کوئی محض اپنے شوق کی آگ کو علم کے پانی سے بجھاتا ہے۔ کہیں ایک نوجوان کسی جادو بیان مقرر کی تقریر سے فقرے نقل کر رہا ہے تو کہیں ایک مصنف بادۂ کہن اور جام نو کے اصول کے تحت پرانے خیالات کو نیا لباس پہنانے کی فکر میں لگا ہوا ہے۔ ایک طرف جفاکش مورخ مختلف بیانات کو میزانِ عقل میں تول رہا ہے تو دوسری طرف بوڑھا پروفیسر اپنے شکوک کو دور کر رہا ہے۔ مختصر یہ کہ ان پڑھنے والوں میں سائنس داں، ریاضی داں، شاعر، ادیب ہر فرقے اور ہر عمر کے پہلو بہ پہلو بیٹھے ہوئے اپنے علمی شوق کو پورا کر رہے ہیں۔

سہولت کار اور ناظرین کی افادیت کے مد نظر السنۂ مشرقیہ کے کتب ۴۴ فنون اور السنۂ مغربیہ کی کتابیں ۲۸ فنون پر تقسیم کر دی گئی ہیں۔ مطالعہ کا عالی شان کمرہ اپنے خوبصورت فرنیچر، برقی قمقموں اور پڑھنے والوں کی دائرہ نما نشست کے ساتھ بہت دلچسپ معلوم ہوتا ہے۔ علاوہ اس عام کمرے کے بعض شعبوں مثلاً مشرقی قلمی نسخوں وغیرہ کے متعلق ناظرین کے لئے خاص کمرہ مقرر ہے۔ ان کے جدول مطلا اور پر تکلف بیل بوٹوں سے آراستہ ہیں۔ اور ان کے اطراف بڑے بڑے حاشیے چھوڑے گئے ہیں۔ اخباروں کے مطالعہ کے کمرے میں بلاد ہند کے تمام مشہور اخبار اور بلند پایہ رسالے موجود رہتے ہیں چنانچہ روزآنہ اخبار ۲۴، ہفتہ وار ۱۷، ماہوار ۳۹، سہ ماہی ۱۷، سالانہ ایک اور دو گزٹ آتے ہیں۔

آغاز سال ۱۳۴۲ف م ۱۹۳۲ء سے ناظرین کی سہولت اور افادیت کی خاطر کتب خانہ کے اوقات مطالعہ صبح آٹھ بجے سے رات کے آٹھ بجے تک مقرر کئے گئے ہیں ورنہ اس سے پہلے کتب خانہ ہر روز صرف آٹھ گھنٹے کھلا رہتا تھا اور اسی طرح تعطیلات بھی مثل دیگر دفاتر کے ملا کرتی تھیں لیکن اب کتب خانہ آصفیہ کی تعطیلات بھی بہت مختص اور محدود کر دی گئی ہیں چنانچہ سال تمام میں صرف نو دن اور ہر جمعہ کو نصف یوم بند رہا کرتا ہے۔ ۹ یوم جن میں کتب خانہ بالکل بند رہتا ہے یہ ہیں۔

(۱) تخت نشینی اعلیٰ حضرت بندگان عالی (۲) سالگرہ مبارک اعلیٰحضرت بندگانعالی (۳) خود مختاری سلطنت دکن (۴) عید الفطر دو یوم (۵) عید الضحیٰ دو یوم (۶) عاشورۂ محرم (۷) دوازدہم شریف۔

۱۶ بہمن ۱۳۵۱ف م ۱۹ ڈسمبر ۱۹۴۱ء یوم جمعہ کو زیر صدارت نواب صاحب چھتاری سر صدر اعظم بہادر کتب خانہ آصفیہ کی پچاس سالہ جوبلی شاندار پیمانہ پر منائی گئی اور اس سلسلہ میں ایک ہفتہ تک مخطوطات کی نمائش جاری رہی۔ بسلسلۂ نمائش انعامی مضمون بعنوان "دکن کے کتب خانے" مقرر کیا گیا تھا جس کا پہلا انعام ایکسو روپیہ اور دوسرا انعام پچاس روپیہ مقرر تھا۔ نیز سال گزشتہ سے کتب خانہ کی جامعیت کو پورا کرنے کے لئے ملکی زبانوں مثلاً تلنگی، مرہٹی اور کنڑی کی کتابیں بھی خریدی جا رہی ہیں۔

کتب خانہ کے موجودہ مہتمم و معتمد مجلس انتظامی ڈاکٹر محمد راحت اللہ خاں صاحب ایم اے (عثمانیہ) ڈی فل (لائپزگ) بہت ہی خوش اخلاق اور سادگی پسند، فرض شناس اور ایک مستعد نوجوان ہیں۔ جامعہ عثمانیہ کے اس قابل رشک سپوت نے کتب خانوں کی تشکیل و تنظیم سے متعلق لندن یونیورسٹی سے ڈپلوما بھی حاصل کیا ہے۔ اگرچہ کہ آپ کو اس خدمت کا جائزہ لئے ہوئے ساڑھے تین سال ہوئے ہیں لیکن اس قلیل عرصے میں آپ نے اپنی ہمہ جہتی قابلیت اور سرگرمی سے کتب خانے کے کاروبار مثلاً تنظیم اور انتخاب کتب، اوقات مطالعہ اور تعطیلات وغیرہ میں بہت کچھ اصلاحیں کی ہیں جو لائق ستائش اور قابل شکریہ ہیں۔

سید مراد علی طالع

گل بوٹے

"انجمن انسداد بے رحمی بر نسواں" کے دفتر میں اس انوکھی انجمن کی کارروائی دیکھنے کا شوق ہمیں دوبارہ کھینچ لے گیا ۔ سیکڑوں خواتین اس انجمن کی رکن بن گئی ہیں۔ فیس رکنیت صرف ایک روپیہ سالانہ ہے۔ انجمن کی معتمد صاحبہ نے مظلوم بیویوں کے کئی خط ہمیں دکھائے، یہ خطوط انجمن کی عدالت ثالثی میں پیش کئے جائیں گے جہاں سے بے رحم شوہروں کے نام نوٹس جاری کرکے انھیں ان کی تردید پیش کرنے کا صرف ایک موقع دیا جائے گا۔ تاریخ پیشی پر اگر کوئی شوہر غیر حاضر رہے اور تردید پیش نہ کرے تو مظلوم بیوی کی شکایت صحیح تصور کی جائے گی، دوسری بڑی عدالتوں اور حکموں کی طرح پیشیوں کی تاریخیں قطعاً تبدیل نہیں کی جائیں گی۔ اور نہ اس عدالت کو سال میں سات مہینوں کی چھٹیاں ملیں گی۔

مظلوم بیویوں کے چند دلچسپ خطوط انجمن کی مجلس عاملہ کی اجازت کے بعد ذیل میں درج کئے جاتے ہیں۔

ایک بدمزاج اور جاہل شوہر کی قابل رحم بیوی لکھتی ہیں ۔

"میرے شوہر کا مزاج اس قدر تیز ہے کہ میں بیان نہیں کرسکتی، ذرا ذرا سی بات پر برہم ہو کر مجھے طلاق دینے آمادہ ہو جاتے ہیں، طلاق دینا تو ان کے پاس بچوں کا کھیل ہے اور مجھ کو تو وہ ایک گڑیا سمجھتے ہیں، جب جی چاہا اپنا جی بہلایا اور جب طبیعت اکتا گئی نکال باہر کیا۔ جب غصہ آتا ہے (اور آتا کب نہیں ہے) اس قدر چیختے اور چلاتے ہیں کہ محلے والے سمجھتے ہیں ہمارے گھر میں کوئی غیر معمولی حادثہ ہوگیا ہے۔ ایک دفعہ کسی نوکر پر بگڑ کر ایسا شور و غل مچایا کہ ہماری پڑوسن کے میاں نے آگ بجھانے کے انجن کو ٹیلیفون کردیا۔ ہماری وجہ سے محلہ والوں کا ناک میں دم آگیا ہے، آدھی رات تک ہمارے مکان میں سائرن بجتا رہتا ہے کیونکہ نصیب دشمناں انھیں آدھی رات سے پہلے نیند نہیں آتی۔ کبھی نوکروں پر گالیوں کی بوچھاڑ ہو رہی ہے، کبھی کسی بچے کی مرمت کی جارہی ہے اور کبھی یہ ناچیز ہدف ملامت بن رہی ہے، کیا بتاؤں کس عذاب میں جان زار ہے! یہ بھی کوئی زندگی ہے؟

کوئی زندگی ہے یہ زندگی نہ ہنسی رہی نہ خوشی رہی!

ابا جان نے مجھ بدنصیب کو اعلیٰ تعلیم دلا کر زیادہ حساس بنا دیا، جہاں اعلیٰ تعلیم دلائی تھی وہاں اعلیٰ صفات کا بر بھی انتخاب کیا ہوتا۔ روپے کی خاطر بہشت نصیب ابا جان نے مجھ کو ایک حیوان کے حوالے کر دیا، ایسی دولت پر لعنت ہے جس کے کارن میں بے موت مر رہی ہوں۔ کاش میں جاہل ہی رہتی تو شاید اپنے میاں کے یہ عیب مجھ کو کم محسوس ہوتے اور ان کو "خدائے مجازی" سمجھ کر ان کی ہر حرکت اور ہر بات پر آمین کہتی ــــــ! اے روشنی طبع تو برمن بلا شدی!!

تعطیل کے دن تو صبح سے شام تک ایک ہنگامہ برپا رہتا ہے، چھٹی کے دن ہمارے اکثر پڑوسی بیوی بچوں کو لئے "پکنک" کرنے باہر کر جاتے ہیں، مگر یہ بدنصیب، جسے مدت سے بھی گھر سے باہر نہیں لے جاتے، کنج قفس میں در کھل کر رہ جاتی ہے!

نہ تڑپنے کی اجازت ہے نہ فریاد کی ہے
گھٹ کے مر جاؤں یہ مرضی مرے صیاد کی ہے

ایک سینما کے شوقین میاں کی بیوی لکھتی ہیں ــــ میرے صاحب کو سینما دیکھنے کا مرض ہے، ہفتہ میں سات دن سینما جاتے ہیں۔ کبھی یہ جنون اس قدر بڑھ جاتا ہے کہ کسی دن دو مرتبہ یعنی پہلے اور دوسرے "شو" میں بھی آپ رونق افروز رہتے ہیں، تعطیل کے دن تو "میٹنی" اور پہلے "شو" میں جانا لازمی ہے، جو ظلم زیادہ پسند آتا

ہے اس کو آپ ایک ہی شام میں دو مرتبہ ملاحظہ فرماتے ہیں، یعنی پہلے اور دوسرے "شو" لیکن جس دن ایسا ہوتا ہے رات کا کھانا آپ کسی ہوٹل میں تناول فرماتے ہیں اور یہاں میری اور بچوں کی آنتیں "قل ہو اللہ" پڑھا کرتی ہیں، کیونکہ آپ کا "حکم" ہے کہ جب تک آپ نہ آئیں ہم سب بھوکے رہیں۔ آپ کے اس حکم کی دس بجے تک میں تعمیل کرتی ہوں، اس وقت تک بچوں کو بھوکا رکھنا ان پر کس قدر ظلم کرنا ہے! مہینے کے پہلے ہفتے میں جب کہ آپ کی جیب گرم رہتی ہے ایک دو دوستوں کو بھی سینما دیکھنے اور ہوٹل میں کھانے کی دعوت دی جاتی ہے۔ غرض یہ کہ ہر مہینہ سو سوا سو روپے سینما کی بھینٹ ہو جاتے ہیں۔

ہمارے صاحب کا روزآنہ پروگرام یہ ہے۔ صبح ساڑھے نو بجے بیدار ہوتے ہیں، ضروریات سے فارغ ہو کر ساڑھے دس بجے ناشتہ کرتے ہیں اور کوئی بارہ بجے دفتر تشریف لے جاتے ہیں۔ چونکہ آپ لباس بڑی نفاست اور نزاکت سے پہنتے ہیں اس لئے کم از کم ڈیڑھ گھنٹہ لباس کی نذر ہو جاتا ہے۔ دفتر کو دو ڈھائی گھنٹے دیر سے جانے میں غالباً کوئی ہرج نہ ہوتا ہوگا۔ ہمارے صاحب کی واپسی ساڑھے تین اور چار کے درمیان ہوتی ہے۔ دفتر گھر سے دور ہونے کی وجہ سے وہ ایک گھنٹہ پہلے ہی دفتر سے نکل جاتے ہیں، گھر آ کر منہ ہاتھ دھوتے ہیں اور چائے نوش کر کے ٹینس کا بلا لے کر چلتے پھرتے نظر آتے ہیں، پھر آپ کا دیدار کبھی دس بجے اور کبھی آدھی رات کے بعد ہوتا ہے۔

تعطیل کے دن محفلِ مشاعرہ گرم ہوتی ہے، آپ خیر سے تخلص سے شاعر بھی ہیں۔ آپ کے کلام میں خوبی یہ ہے کہ پوری غزل کی ایک ہی "بحر" نہیں ہوتی، کئی "بحریں" آپ کی غزل میں داخل ہو جاتی ہیں۔ یہ آپ کے شاعر دوستوں کی رائے ہے۔ مجھ کو نہ شاعری سے تعلق نہ "بحر" سے واسطہ! ہر مشاعرے میں آپ کے کلام کے اس "حسن" پر خوب گرما گرم بحث ہوتی ہے اس لئے اس وقت یہ بات یاد آگئی۔

مشاعرے کے دن عجیب آفت آتی ہے، آٹھ دس شاعر جمع ہو جاتے ہیں، دوپہر کا کھانا مجھ کو تیار کرنا پڑتا ہے کیونکہ ہمارے باورچی کا پکایا ہوا شاعروں کو پسند نہیں آتا۔ باہر سے آرڈر پہ آرڈر آتا ہے کہ مچھلی تلی جائے، دم کے کباب بنائے جائیں، نرگسی کوفتے تیار ہوں، مرغ پلاؤ، مٹن چاپ تلے جائیں، مرغ مسلم دم دیا جائے، بادام کی جالیاں بنیں، گاجر کا حلوہ پکے، کدو کی کھیر بھی ہو غرض کہ فرمائشوں کی ڈاک لگ جاتی ہے اور صبح سے شام تک ایک دھما چوکڑی رہتی ہے۔

شام کے چھ بجتے ہی شاعروں کا یہ قافلہ سینما گھر کی طرف کوچ کرتا ہے، اسی طرح دنوں سے ہفتے اور ہفتوں سے مہینے ہو جاتے ہیں مگر مجھ کو ان سے جی بھر کر باتیں کرنے کا موقع نہیں ملتا! بس یہی زندگی ہماری ہے!!

زندگی اپنی جب اس شکل سے گزری غالبؔ
ہم بھی کیا یاد کریں گے کہ خدا رکھتے تھے!"

باغبان

عصرِ نو

ولولے سرنگوں، حوصلے پست — شعلہ ساماں انگیں تہی دست
نوعِ انساں کا یاں ذکر ہی کیا — مائلِ شر ہے سب بود و ہست

جاگ اے شورشِ انقلابی

رنگِ شام الم ہے سحر میں — روحِ ظلمت ہے غلطاں قمر میں
زندگانی کے محجوب جلوے — سسکیاں لے رہے ہیں نظر میں

جاگ اے شورشِ انقلابی

الاماں یہ بھیانک نظارے — کانپتے ہیں امیدوں کے تارے
جن سے روشن ہے بزمِ دو عالم — وقفِ حسرت ہیں وہ ماہ پارے

جاگ اے شورشِ انقلابی

منتظر ہیں نگاہیں، عیاں ہو — بے زباں زندگی کی زباں ہو
اے تمنائے روحِ جوانی — جلوہ آرائے بزمِ جہاں ہو

جاگ اے شورشِ انقلابی

آگ دنیائے دوں میں لگا دے — مشعلیں تیرگی کی بجھا دے
معصیت کوش شدادیوں کو — بے اماں ٹھوکروں سے مٹا دے

جاگ اے شورشِ انقلابی

لطیف ساجد



مسٹر فلپ گوے ڈالا ہمارے معاصرین میں سب سے زیادہ مشہور مصنف ہیں۔ ان کی حالیہ تصانیف میں ایک سوانح حیات موسوم بہ "ونسٹن چرچل" بڑی مقبول عام ہو رہی ہے۔



ٹی۔ ایس۔ ایلیٹ گزشتہ ۲۰ سال سے انگریزی ادب میں ایک سربرآوردہ شخصیت کے حامل ہیں۔ وہ اپنی نظموں اور ڈراموں کے باعث کافی مشہور ہیں۔ ان کی مشہور نظموں میں "دی ہالو مین (شائع شدہ ۱۹۲۵ء) جس میں انھوں نے بیکاری و ناکامی کے جذبات کی جو ۱۹۱۸ء سے ۱۹۳۰ء تک بہ دوران جنگ عام تھے ترجمانی کی ہے۔ ان کے ڈراموں میں "دی مرڈر ان دی کیتھیڈرل" جس میں سینٹ ٹامس بیکٹ کے قصہ کو پیش کیا گیا ہے۔ غالباً بہت زیادہ مشہور ہے یہ متعدد مرتبہ پیش اور نشر کیا گیا ہے۔ مسٹر ایلیٹ عصر جدید کے شعراء کے نمائندہ ہیں۔

محمد عبدالقادر صدیقی مرحوم

ادارۂ ادبیاتِ اُردو کے ایک موسس مولوی محمد عبدالقادر صاحب صدیقی ایم اے کی وفات کی خبر پہلے شایع ہو چکی ہے۔ مرحوم حیدرآباد کے اُن تعلیم یافتوں میں سے تھے جن کی زندگی دوسروں کی خدمت کے لیے وقف تھی۔ چنانچہ ان کی اس قسم کی تڑپ اور ایثار و خلوص کا ایک نتیجہ ادارۂ ادبیاتِ اُردو ہے جو اپنے وجود و ترقی میں ان کی خاموش امداد و مخلصانہ مشوروں کا بڑی حد تک مرہونِ منت ہے۔

آج سے تقریباً ۳۴ سال قبل جب اس ادارے کے قیام کے لیے راقم الحروف نے اپنے مخلص دوستوں سے مشورہ کیا تو مرحوم عبدالقادر صدیقی نے سب سے پہلے ہمت افزائی کی اور اپنی قلیل آمدنی کے باوجود سب سے اول اپنے رقمی عطیے سے اس کے قیام کو امکانات کی دنیا سے نکال کر ایک واقعہ کی صورت میں تبدیل کر دیا۔

قیامِ ادارہ کے بعد شاید ہی کوئی مجلس انتظامی ایسی ہو جس میں مرحوم شریک نہ ہوئے ہوں۔

۱۹۳۶ء میں جب ادارے نے اُردو انسائیکلوپیڈیا کی ترتیب کا آغاز کیا تو مرحوم نے علوم اسلامی کا کام اپنے ذمے لے لیا اور طویل محنت و مشقت کے بعد قابلِ اندراج مضامین کی فہرستیں مرتب فرمادیں۔ انسائیکلوپیڈیا کی مجلس انتظامی میں بھی مرحوم آخر تک شریک ہوتے اور اپنے ٹھوس مشوروں سے مستفید کرتے رہے۔ چنانچہ آخری علالت کے زمانے میں بھی انسائیکلوپیڈیا کی مجلس انتظامی میں شرکت کی اور اس کے بعد ایسے لیٹے کہ پھر اٹھنے کا نام نہ لیا۔

ان کی وفات سے ادارے کو جو نقصان پہنچا ہے اس کی تلافی کسی طرح ممکن نہیں افسوس ہے کہ انھوں نے بے وقت وفات پائی۔ اس جواں مرگ نے اپنے بعد حیدرآباد کے علمی حلقوں میں جو جگہ خالی کی ہے وہ شاید ہی پُر ہو سکے۔ وہ جامعۂ عثمانیہ کے شعبۂ دینیات کے پہلے ایم اے تھے اور علوم دینیہ کے علاوہ انگریزی میں بھی بڑی مہارت رکھتے تھے۔

حضرت مولانا سید مناظر احسن الگیلانی صدر شعبۂ دینیات جامعۂ عثمانیہ سے بہتر کوئی ہستی ان سے زیادہ قریب اور واقف نہ تھی اس لئے ان سے خواہش کی گئی تھی کہ مرحوم کے متعلق اپنے تاثرات قلمبند فرمادیں۔ خدا کا شکر ہے کہ مولانائے محترم نے اپنی عدیم الفرصتی کے باوجود اس درخواست کو قبول فرما کر ایک ایسا مقالہ قلمبند فرمادیا جس کے باعث یقین ہے کہ مرحوم عبدالقادر صدیقی جیسی گمنام ہستی کی اہمیت اُن لوگوں پر بھی واضح ہو جائے گی جو محض نام کے لیے کام کرنا چاہتے ہیں۔

مولانا کے اس مضمون میں ایک واقعہ کا ذکر نہیں ملا جس کا اظہار میرے لئے ضروری ہے اور وہ یہ ہے کہ مرحوم مولوی عبدالقادر اپنی طالب علمی کے زمانے میں جامعۂ عثمانیہ کے اُن طلبہ کو جن کا مضمون عربی نہ تھا عربی پڑھنے کی طرف رغبت دلاتے اور خود اپنا قیمتی وقت پڑھانے میں صرف کرتے تھے۔ چنانچہ مجھ کو بھی اس کا شرف حاصل ہے کہ

کئی ماہ تک حیدر آباد کی مسجد چوک میں مرحوم سے عربی کی کئی کتابیں پڑھی تھیں۔ لیکن یہ بات عجیب معلوم ہوگی کہ ہم جیسے جاہل شاگردوں سے جب کبھی وہ ملتے تو اس طرح جھک کر ملتے کرتے ہیں گویا وہ خود ہمارے شاگرد ہیں۔

ادارۂ ادبیاتِ اُردو مولانا مناظر احسن کا خاص طور پر شکر گذار رہے گا کہ انھوں نے اس کے ایک ہوس کے متعلق ایسا گرانقدر مضمون تحریر فرما دیا۔

سید محی الدین قادری زور

اَلْحَمْدُ لِلّٰہِ وَکَفٰی وَالصَّلٰوۃُ وَالسَّلَامُ عَلٰی عِبَادِہِ الَّذِیْنَ اصْطَفٰی

۱۳۲۹ف خورداد کا مہینہ تھا، اس کی ۱۱ تاریخ نائب شیخ الحدیث کی جگہ جامعۂ عثمانیہ کے شعبۂ دینیات میں میرا تقرر ہوا، غالباً اس وقت میری عمر بھی تیس اُنتیس ہی کے قریب ہوگی۔ کسی یونیورسٹی میں پڑھانے کا یہ پہلا موقع تھا، درس کے کمرہ میں داخل ہوا۔ دو آدمی تھے جن میں ایک کے چہرے پر ابتدائی طور پر نکلنے والی ڈاڑھی کے کچھ بال بھی جھانک رہے تھے، اور دوسرے صاحب کی داڑھی غالباً نکل چکی تھی، لیکن وہ اس سے اور اس کے نکلنے والے بالوں سے کش کش میں مصروف تھے، وہ باہر نکل کر ان کی عمر کا جتنی کہ وہ واقع میں تھی اعلان کرنا چاہتے تھے اور یہ مسلسل اس اعلان کی آواز کو دبانے کے لئے گویا ان کے منہ میں کپڑا ٹھونسنا چاہتے تھے، دن کو وہ اسے دباتے تھے اور رات کو چھاتی پر چڑھ بیٹھنے کے ارادہ سے وہ زور لگاتے تھے۔ خیر درس کے کمرے میں یونیورسٹی کے درس کے کمرے میں یہی دو آدمی ڈاڑھی والے بے ڈاڑھی والے موجود تھے: طلبہ کہاں ہیں؟ میں نے سوال کیا، طلبہ شعبۂ دینیات کے؟ انھوں نے کہا، میں نے کہا ہاں، وہ تو ہم ہی دونوں ہیں، کیا جامعہ میں آپ دو صاحبوں کی تعلیم کا کام مجھے کرنا پڑے گا، میرے اس سوال کے جواب میں مسکرائے اور بولے جی ہاں! میں ایک اندرونی کشمکش میں مبتلا ہوگیا، اور اسی کش کش سے تنگ آکر طلبہ شعبۂ فنون کی بھیڑ میں گھس گیا، اور تقریباً پندرہ سولہ سال گھسا رہا۔ لیکن شعبۂ دینیات کی جو کش کش دل میں پیدا ہوگئی تھی وہ برابر اس پر مسلسل مسلط رہی تا آنکہ بائیس تیئیس سال کے بعد بحمد اللہ اب جب کہ شعبۂ دینیات میں بجائے دو لڑکوں کے ستر اسی تا اینکہ اس سال ۹۲ تک تعداد پہنچ گئی ہے اس کشمکش کی کلفتیں گو نہ کمی ہوئی فالحمد للہ الذی بعزتہ وجلالہ تتم الصالحات

بہرحال پڑھانے کی کرسی غالباً وہ ''برخود گرداں'' یا ''رقاص'' کرسی تھی اس پر بیٹھ گیا، سامنے کی میز پر ان دونوں طالب علموں نے کتابیں رکھیں، غالباً امام محمد بن الشیبانی کی موطا تھی، سبق شروع ہوا، ختم ہوا، رجسٹر حاضری میں دو ہی نام تھے، جمیل محمود۔ عبدالقادر صدیقی، ان دو ناموں میں کس نام کو ڈاڑھی والے پر اور کس کو بے ڈاڑھی پر منطبق کروں۔ اس کا جواب پوچھنے کے بغیر حل نہیں ہوسکتا تھا، پوچھا، بے ڈاڑھی والے صاحب جو نسبتاً زیادہ متحرک تھے، انھوں نے اپنا نام ''جمیل محمود'' بتایا۔ اس لئے بے پوچھے متعین ہوگیا، کہ ڈاڑھی والے صاحب ہی کا نام عبدالقادر صدیقی ہوگا۔ عبدالقادر صدیقی آپ ہی کا نام ہے، میں نے عرض کیا، جی ہاں! دبلے پتلے، کچھ فکر مند، چہرہ پر نیکی اور سنجیدگی کے علامات نمایاں تھے، دریافت کے بعد بولے، میرا تعلق قاضیوں کے خاندان سے ہے، بڑی مسرت ہوئی کہ دکن کے جن خاندانوں میں کابراً عن کابرٍ خلفاً عن سلفٍ

علم متوارث چلا آرہا تھا، الحمدللہ پھر ان ہی گھرانوں تک علم کی موجوں کو واپس کرنے کی خدمت قدرت نے میرے سپرد کی ہے۔

یہ پہلی ملاقات تھی آہ اس ملکوتی الصفات، مرنجاں مرنج، باہمہ بے ہمہ شخصیت سے جس کی معیت اور رفاقت میں تقریباً پچیس سال حیدرآباد میں نے گزارے۔ میرے مرحوم دوست، وفادار رفیق، سعادت مند تلمیذ مولوی عبدالقادر صاحب ایم اے صدیقی جن کے نام کے ساتھ مرحوم کا لفظ قلم سے نکلتا ہے، اور اسی کے ساتھ دل ہاتھوں سے نکل جاتا ہے۔ "پچیس سال کی طویل مدت" تھوڑی نہیں ہوتی۔ اس دراز زمانے میں کچھ دن وہ مجھ سے پڑھتے بھی رہے، پڑھنے کے بعد پھر شعبۂ دینیات کے استاد بن کر میرے ساتھی اور رفیق بنے، کچھ دن ان کو میرا ساتھ اس طور پر دینا پڑا، کہ میں نے ہمیشہ اپنے آپ کو انہی کی احسانوں کا زیر بار محسوس کیا، اور انھوں نے بھی ایک وفادار ہمکار کی حیثیت سے زندگی کے آخری دنوں تک میری آرزوؤں کی تکمیل کو اپنا فرض قرار دے رکھا تھا، وہ یقیناً اب ہنس رہے ہیں، اور میں رو رہا ہوں، میری کمزوریوں میں زور پہونچانے کو اس لئے سعادت خیال کرنا کہ کسی زمانے میں ان کے سامنے بھی کتاب کھولی تھی، اب اس کی توقع کس سے کرسکتا ہوں۔

ما شاء اللہ مرحوم اور ان کی باتیں، ان کا وہ ابتدائی زمانہ جب محکمۂ امور مذہبی نے "ارباب خدمات شرعیہ" کے امدادی مدسے تعلیمی وظیفہ دے کر ان کو جامعۂ عثمانیہ کے شعبۂ دینیات میں شریک کیا تھا۔ اس زمانے کے صدرالصدور امور مذہبی سرکار عالی مولانا حبیب الرحمن خاں شروانی المخاطب بہ نواب صدر یار جنگ بہادر جو جامعۂ عثمانیہ کے بھی اس زمانے میں پہلے معین امیر جامعہ تھے، ان کی مشفقانہ نگرانیاں، مجھ سے، حضرت مولانا شیر علی صاحب مرحوم (امام الفلسفۃ والکلام) سے، مولوی عبدالقادر مرحوم کے متعلق بار بار تاکیداً یہ کہنا کہ قاضیوں کے خاندان کے اس نوجوان کی طرف خاص توجہ رکھیے گا۔ حضرت مولانا شیر علی صاحب کا مرحوم کے اندر اسلامی علم کلام کے ساتھ فطری لگاؤ کو محسوس کرکے اپنا خاص شاگرد بنانا، صرف کالج ہی میں نہیں بلکہ گھر پر بھی ان کو معقولات کی غیر نصابی کتابیں پڑھاتے رہنا، "حجۃ اللہ البالغہ" کے متعلق مرحوم کی اس فقیر کے متعلق یہ بیجا خوش اعتقادی کہ اس کتاب کا مطلب مجھ سے زیادہ بہتر طریقے سے کوئی نہیں بیان کرتا۔ اور اس خواہ مخواہ بلا وجہ کی عقیدت کے زیر اثر، نہ صرف پڑھنا بلکہ مختلف اوقات میں اس عجیب و غریب اچھوتی کتاب کی مشکلات پر بحث و مباحثہ سوال و جواب کرنا اور اس قسم کی انتہائی مشغولیت کے ساتھ انٹر سے ایم اے تک ان کا مسلسل پڑھتے چلے جانا، ہر اوپر کی جماعت میں نیچی جماعت سے امتیازی نشانات حاصل کرتے ہوئے ان کا بڑھتے چلے جانا تا اینکہ ایم اے علم کلام میں اول درجہ کے نشانات کے ساتھ ان کا کامیاب ہونا، اس کامیابی پر لوگوں کی نگاہوں کا ان کی طرف اٹھنا، حتی کہ نواب صدر یار جنگ بہادر کا فرط مسرت میں غیر معمولی پیمانہ پہ ایک عصرانے کے ارادے کو طے کرکے نہ صرف شعبۂ دینیات کے اساتذہ و طلبہ ہی کو بلکہ ان کے سوا بھی حکومت کے والا مقام حکام کو مدعو کرکے شعبۂ دینیات کے ایک "گل شگفتہ" کی شکل میں مرحوم صدیقی کو ناز کے ساتھ پیش کرنا، شروانی صاحب کے لان (سبزہ زار) میں عصر کے بعد میزوں اور کرسیوں کے ایک جنگل میں معزز مہمانوں کا جمع ہو کر ماکولات و مشروبات سے لذت گیر ہونے کے بعد اکٹھے ہونا اور صدر یار جنگ بہادر کا مولوی عبدالقادر صدیقی

مرحوم کے ہاتھ کو ہاتھ میں پکڑے ہوئے لوگوں کے سامنے پیش کرتا، خود اپنے ہاتھ سے پھول کے ایک موٹے گجرے کو عبدالقادر صاحب کے گلے میں ڈالنا، شروانی صاحب کا اس کے بعد شعبۂ دینیات کے مقاصد عالیہ پر تقریر کرنا! فرماتا کہ صرف اسلامی اور مشرقی علوم کے جاننے والوں کی بھی کمی نہیں، اور ویسے ان کا قحط ہی نہیں ہے اسی طرح صرف مغربی فنون کے تعلیم یافتوں کی ارزانی کا جو حال ہے وہ کسی پر پوشیدہ نہیں ہے، کمی کے ساتھ جس چیز کی اشد ضرورت ہے یعنی مشرق میں رہنے والوں کے لئے مشرقی علوم مشرقی السنہ، اور زبان کی تعلیم کے ساتھ مغربی علوم اور زبانوں کی تعلیم دے کر ان نقائص کی تلافی کی جائے جن میں مشرق عموماً اور اسلام و مسلمین خصوصاً مبتلا ہیں، شعبۂ دینیات بر اعظم ہند ہی میں نہیں، بلکہ غالباً تمام اسلامی ممالک میں پہلا ادارہ ہے جس کے سامنے اس نوعیت کے طلبہ کا پیدا کرنا ہے، اس کا پہلا نتیجہ بھی اب آپ کے سامنے ہے۔ مولوی عبدالقادر مرحوم پھول پہنے ہوئے آگے کھڑے ہوئے تھے۔ گویا ایک تماشا تھا، جسے اٹھ اٹھ کر لوگ دیکھتے، اور حیرت کرتے، انھوں نے قرآن بھی پڑھا ہے، حدیث بھی پڑھی ہے فقہ بھی پڑھی ہے اور فلسفہ و کلام میں تو ایم اے ہی کیا ہے اور اسی کے ساتھ بی۔اے۔تک انھوں نے انگریزی بھی پڑھی ہے وہی انگریزی جو شعبۂ فنون میں پڑھائی جاتی ہے اور جو اپنی نصابی کتابوں کے لحاظ سے تقریباً ہندوستان کی دوسری یونیورسٹیوں سے کم ہی نہیں بلکہ زیادہ اور بہت زیادہ ہے !

مغرب کی نماز ہوئی جلسہ برخواست ہوا۔ شروانی صاحب اسی خیال میں اس وقت سے تھے، کہ شعبۂ دینیات کے اس پہلے پھول سے خود شعبۂ دینیات ہی کو استفادہ کا موقع لنا چاہیے، کچھ دنوں کے بعد ایک بوڑھے مولوی صاحب۔ جو دارالعلوم کے تبرکات کی حیثیت سے شعبۂ دینیات کے سایہ میں جامعۂ عثمانیہ کے اندر داخل ہو گئے تھے ان کا وقت پورا ہو گیا۔ جگہ خالی ہوئی، مقابلے کا ایک اچھا خاصہ میدان گرم ہوا۔ عبدالقادر مرحوم منصرمانہ طور پر کئی دفعہ شعبہ میں کام کر چکے تھے غالباً اب تھے منصرم ہی تھی کہ مقابلے کے میدان میں اترے، انتخاب کی مجلس کو فیصلہ کرنا پڑا کہ ہر لحاظ سے عبدالقادر مرحوم ہی اس خالی شدہ جائداد کے مستحق ہیں، منصرم تھے مستقل ہو گئے، پھر اس کے بعد تقریباً پندرہ سال تک عبدالقادر مرحوم کا یہ رویہ رہا کہ ٹھیک اپنے وقت پر کلاس میں آنا، طلبہ کو پڑھانا، کام کو ختم کر کے خاموشی کے ساتھ گھر چلے جانا، کچھ دن ان کو مولٰنا عبدالقدیر صدیقی سابق صدر شعبۂ دینیات اور اس کے بعد مفتی عبداللطیف صاحب انچارج صدر شعبۂ دینیات کی ماتحتی میں کام کرنا پڑا۔ اس زمانے میں بھی کام کے بہت سے شعبے شعبۂ دینیات میں ان ہی کے ذمہ تھے تا اینکہ وہ وقت بھی آ ہی گیا۔ جس میں مولوی عبدالقادر مرحوم کا زیر منت و احسان ہونا اس فقیر کے لئے مقدر تھا۔ تقریباً چھ سات سال سے اب وہ میرے قوت بازو کی حیثیت سے میری اعانتوں میں مصروف تھے۔ میرے ساتھ ان کی مہربانیوں کا ایک طویل سلسلہ ہے، جس کی فہرست کا پیش کرنا مشکل ہے۔ نہ صرف سرکاری حیثیت سے، بلکہ ذاتی طور پر بھی، لیسا اوقات انھوں نے میرا ہاتھ پکڑا، مجھے سنبھالا دیا اور دیتے رہتے تھے۔ اپنا جو اعتماد میرے دل میں انھوں نے قائم کر دیا تھا اس کا نتیجہ تھا کہ علاوہ

درس وتدریس کے ۲ شعبۂ دینیات کا سمی ناری کتب خانہ ۳ شعبۂ دینیات کا وقت نامہ ۴ شعبۂ دینیات کے طلبہ کی ضروریات کی نگرانی خود بھی ان کی تکمیل میں مصروف رہنا اور مجھے بھی اس بات میں بار بار متوجہ کرتے رہنا ۵ جامعہ کے سالانہ امتحانات کی اشاعت کے وقت شعبۂ دینیات کی نمائندگی ۔ ۶ غریب طلبہ کے لئے جب کبھی شعبۂ دینیات میں کوئی فنڈ قائم ہوا اس کی خزانہ داری اور تقسیم کی ذمہ داری، بلا شرکتِ غیرے میں نے ہمیشہ ان ہی کے حوالے رکھی، تعلیمی ذمہ داریوں کے سوا جن سے عہدہ برآ ہونے میں کوشش کا کوئی دقیقہ وہ اٹھا نہیں رکھتے تھے، شعبۂ دینیات کے ان کاموں کو بھی مسلسل وہ انجام دیتے رہے، اور ان ہی کے ساتھ میں نہیں بتا سکتا کہ گرما کی تعطیلوں میں انھوں نے جامعہ عثمانیہ کے کتب خانے کی ترتیب وتنظیم اور کارڈ نویسی میں ارباب کتب خانہ کا کتنا ہاتھ بٹایا ۔ اس کا ثبوت ان کارڈوں سے مل سکتا ہے، جو محض مولوی عبدالقادر مرحوم کی نگرانی میں تیار ہوئے ہیں، تقریباً ہزار ہا ہزار تک ان کی تعداد پہنچ جائے تو کچھ تعجب نہیں۔

میں اپنی اس شہادت میں متّہم نہیں کیا جا سکتا، اگر اس کی گواہی دوں کہ ان گوناگوں کاروباری تعلقات جن میں ان کو جامعہ کے اساتذہ اور کتب خانے کے دائرۂ اہتمام کے اراکین سے مسلسل سابقہ رکھنا پڑا، شاید ہی ایسا کوئی شخص زندوں یا مردوں میں ہوگا، جو مولوی عبدالقادر مرحوم کے متعلق کسی قسم کی شکایت کا احساس اپنے دل میں رکھتا ہو، حیرت انگیز کردار ایسا کردار جس کی نظیر مشکل ہی سے دستیاب ہو سکتی ہیں، یہ نہیں تھا کہ ان کا دل جذبات سے خالی تھا ۔ سرکار آصفیہ کے وابستوں میں چند خاص خصوصیتوں کا حامل جو طبقہ ہے، میری مراد قضاۃ اور محتسبین سے ہے، نواب صدر یار جنگ بہادر اس طبقے کے متعلق اپنے دوازدہ سالہ تجربے کی تعبیر ان الفاظ میں کرتے تھے کہ لپٹ جانے والے چمٹ جانے والے اس طرح لپٹنے والے اس طرح چمٹنے والے کہ جس معاملے میں ہاتھ ڈال دیا، تخت اور تختہ کے درمیان اور کسی تیسری بات کا سوال ہی ان کے سامنے نہیں رہتا ۔ فرماتے تھے، اسی کا نتیجہ ہے کہ ایسے مقدمات جن کا تعلق اس طبقے کے کسی فرد سے ہو، ختم ہونے کا امکان اس کے ساتھ ختم ہو جاتا ہے، دس سال بیس سال اس سے بھی زیادہ مدت صرف ہو جائے تو ہو جائے لیکن اڑنے والے جس دعوے پر اڑ چکے ہیں، اب اس سے نہیں ہٹ سکتے، ستر بار ہار جانے کے بعد بھی اکہترویں بار جیتنے کی امید کو جلا جلا کر گر گر پڑنے کے بعد اٹھ کھڑا ہونا اور ابتدائی جوش کے ساتھ پھر اسی مقدمہ کو آگے بڑھانے چلانے کی کوشش میں منہمک ہو جانا، شروانی صاحب کا بیان ہے کہ میں نے ایسی جیوٹ رکھنے والے لوگ اپنی زندگی میں نہیں دیکھے ۔ ان کو افسوس تھا کہ کیا قیمتی نایاب جوہر تھا، اور خدا ہی جانتا ہے کہ سلاطین اسلامیہ کی مردم شناس نگاہوں نے کہاں کہاں کے لوگوں کو کتنے غور و فکر کے بعد انتخاب کر کے اپنی حکومت کا ان کو جزو بنایا تھا ۔ لیکن جس قوت سے ہاتھی شکار کیا جا سکتا ہے بلکہ کیا جاتا تھا فیروز بہمنی کے عہد کے قاضی سراج الدین ہی اس کی ایک اچھی مثال ہیں، وقت پر ان کی سوجھ، ان کی بے پناہ ہمت و جراءت، اگر فیروز کی دستگیری نہ کرتی تو سنہرے حروف میں بیجا نگر کی حکومت قاہرہ کے مقابلے میں فیروز کی فتح و کامرانی کے جس واقعہ کو مورخین اپنی تاریخوں میں درج کر رہے ہیں کیا درج کر سکتے تھے ؟

مگر ان ہی ہاتھیوں کے شکار کرنے والوں کو آج چیونٹیوں پر چھوڑ دیا گیا ہے تاکہ کسی چیونٹی کو مار کر اپنی کامیابی کا نقارہ بجائیں۔ ان کا خیال تھا کہ دکن کے یہ خانوادے اب بھی اُسی کی [illegible] نامدر رکھتے ہیں لیکن بجائے سنگین قلعوں کے جن کی توپیں کوہ گرد کہے جاتے ہوئے ان گھروندوں پر لگا دینے والوں نے لگا دیا ہو، جنھیں بچے بنایا کرتے ہیں، تو یہ قصور کس کا ہے توپوں کا ہے یا ان کا ہے جنھوں نے ان کے دہانوں کو قلعوں سے پھیر کر گھروندوں کی طرف لگا دیا ہے، لمبی سانس کھینچ کر ان لوگوں کا ذکر کرتے تھے جنھوں نے حکومت آصفیہ کے رئیس اعضاء کو مفلوج کر کے سلطنت کا جوا ان کمزور کندھوں پر ڈال دیا جن کے متعلق نہیں کہا جا سکتا، کہ کب اور کہاں (لا فعل اللہ) اس جوے کو پٹک کر بھاگ جائیں ، خیر میں کیا کہنے لگا، ذکر مرحوم اور ان کے جذبات کا تھا، میں لوگوں کو کیسے یقین دلاؤں کہ ان کی جھکی ہوئی گردن، بیمار نما چہرے، پتلے پتلے اعضاء باریک ہڈیوں کے سینے کے درمیان جو دل تھا وہ کن عالیہ جذبات اور فاضلہ عواطف سے معمور تھا، وہ نرم تھے اور بڑے نرم اتنے نرم کہ بیس پچیس سال کے اس طویل عرصے میں کم از کم میں نہیں جانتا کہ کسی کو ان سے جیسا کہ عرض کر چکا ہوں کوئی شکایت پیدا ہوئی ہو، کسی کو کسی قسم کی ٹھیس لگی ہو، لیکن اس نرمی میں گرمی کے شرار بھی پوشیدہ تھے، اور وہ پوشیدہ ہی تھے، سیدھے میں بھی ایک ٹیڑھ تھی، سادگی میں بانکپن کے اجزا بھی جذب تھے کہ لوگوں کو ان کی صرف نرمی اور سیدھ ہی نظر آتی تھی ان کا شمار اس لئے سادوں میں کیا گیا، لیکن جو اُن کے قریب تھے ذرا زیادہ قریب، اتنے قریب جن کے سامنے کھلنے میں وہ مضائقہ نہیں محسوس کرتے تھے وہ جانتے ہیں کہ پرانے قاضیوں کے خانوادہ کا یہ اڑیل آدمی جب اڑ جاتا تھا، تو اڑ ہی جاتا تھا، بعض واقعات کا ذکر کرتا لیکن اب اس کے ذکر سے کیا فائدہ، میری بات وہ کبھی نہیں ٹالتے تھے، بہت اچھا کے سوا میرے کانوں نے کسی فرمائش کے بعد کوئی دوسری آواز نہیں سنی، الا اُس ایک بات میں جس میں لاکھ ہلنے کی اور ہلانے کی میں نے کوشش کی، لیکن چونکہ انھوں نے طے کر لیا تھا کہ نہیں ہلوں گا۔ نہ میں ہلا سکا نہ میری استادی ہلا سکی، نہ میری رفاقت اور نہ میرا وہ تعلق جس نے خدمت کر کے ان کو میرا مخدوم بنا دیا تھا۔ رحمۃ اللہ علیہ

مولوی عبدالقادر مرحوم درس و تدریس کے عام مشغلہ کے سوا کچھ لکھنے پڑھنے کا کام بھی کرتے تھے، اس کا پتہ مجھے اس وقت تک نہ چل سکا جب تک کہ ڈاکٹریٹ کی ڈگری حاصل کرنے کے لئے انھوں نے "ہندوستان میں تصوف کے ارتقا" پر تحقیقی مقالہ تیار کرنے کا ارادہ ظاہر نہ کیا۔ جامعہ نے جب اس مقالے کے پیش کرنے کی ان کو اجازت دے دی، اور منجملہ دوسرے حضرات کے اس فقیر کا بھی نام ان لوگوں میں رکھا گیا جن سے مشورہ لینے کی ان کو ہدایت کی گئی تھی۔

"تب وہ اس مسئلہ میں وقتاً فوقتاً گفتگو کرنے لگے، تب مجھ پر اُن کا یہ مخفی پہلو بھی ایک حد تک واضح ہونے لگا، میں نے جن کتابوں کی طرف اشارہ کیا ڈھونڈ ڈھونڈ کر انھیں اکٹھا کرنے لگے، اپنے مطالعہ کے نتائج سے وقتاً فوقتاً مجھے واقف کرتے رہتے تھے، اس وقت ان کی تصنیفی اور تالیفی صلاحیتوں کے اندازہ کرنے کا مجھے موقع ملا، اس سلسلہ میں انھوں نے مواد کا کافی ذخیرہ جیسا کہ ان کا بیان تھا جمع کر لیا تھا۔ مگر اُس خاص وجہ سے جو ان کے اور میرے درمیان ایک "راز" تھا

مواد کو مرتب کرنے سے ہچکچاتے ہی رہے، میں نہیں جانتا کہ مواد کا وہ ذخیرہ کیا ہوا، کس کے پاس ہے، اس سلسلہ میں مطبوعہ غیر مطبوعہ سیکڑوں کتابوں کا انھوں نے مطالعہ کیا تھا، نتائج اخذ کئے تھے۔ لیکن خدا کی مرضی نہ تھی، کام پورا نہ ہو سکا، اور ان کی زندگی پوری ہو گئی۔ ان کی خاموشی نام و نمود کے سفیہانہ جذبات سے الگ تھلگ رہنے کا ایک ادنیٰ ثبوت یہ ہے کہ انھوں نے اپنے ایام ملازمت ہی میں "فلسفۃ الاسلام" لطفی جمعہ مصری کی ایک مفید کتاب کا غالباً ہمارے ہم پیشہ و ہم مشرب ڈاکٹر ولی الدین صاحب مدظلہ اللہ تعالیٰ ودقاہ ما یتمناہ کی رفاقت میں ترجمہ بھی کیا تھا، صرف ترجمہ یا اس کے ساتھ کچھ تشریحی اضافے بھی؟ واللہ اعلم لیکن آپ کو سن کر حیرت ہو گی۔ کہ ایک طرف لوگوں کا جہاں یہ دستور ہے کہ قلم اگر کہیں انھوں نے تراشا ہے، تو اس کے ذکر سے بھی آسمان و زمین کو بھر دیتے ہیں۔ کہیں ایک آدھ تقریر یا ان کی چند سطروں کو چھاپ کر کسی اخبار نے اگر ان پر احسان کیا ہو، تو ان سب کا شمار علمی مناقب اور فضل و کمال کی شہادتوں میں کیا جاتا ہے، جو جیسے گواہ بنانے کی ضرورت ہو، ان کو بھی، اور جن کی گواہی سے کوئی فائدہ نہیں پہنچ سکتا ان کو بھی، ہر مجلس ہر سوسائٹی، ہر کوچہ، ہر گلی میں گواہ بناتے پھرتے ہیں، لیکن مجھے بالکل یاد نہیں ہے کہ ترجمہ کی اس خدمت کا تذکرہ میں نے کبھی ان کی زبان سے سنا ہے، غالباً ڈاکٹر صاحب نے مجھے مطلع کیا کہ عبد القادر مرحوم یہ کام کر رہے ہیں۔

ان کی زندگی کا ایک مخفی پہلو

اس سے بھی زیادہ حیرت انگیز، ہوش ربا، اعجوبہ طراز ان کی زندگی کا ایک اور پہلو ہے جس کا علم بلا مبالغہ عرض کرتا ہوں۔ ان کے مرنے کے بعد یا اس وقت ہوا جب یاد کر لیا گیا کہ اب وہ جانبر نہیں ہوں گے۔ اگرچہ تصوف پر، اس کے مسائل پر، کبھی کبھی مجھ سے بطور استفادہ کے گفتگو کیا کرتے تھے، خصوصاً "عبقات" جو نظری تصوف کی ایک بے مثال کتاب ہے اور علم کلام کے ایم اے کے نصاب میں داخل ہے، بجائے اپنے میں نے ایک دفعہ انہیں کو پڑھانے کے لئے دے دی۔ میرے لکھائے ہوئے نوٹ جو طلبہ کے پاس تھے، ان کے چند اوراق پر ان کی اتفاقاً نظر پڑ گئی، دوڑے ہوئے میرے پاس آئے مسکراتے ہوئے ہنستے ہوئے کیا ہے مولوی عبد القادر صاحب میں نے عرض کیا بولے کتنا مشکل مقام تھا آپ نے عجب طریقہ سے مثال دے کر اس کو حل کر دیا۔ جو کتاب کسی طرح گرفت میں نہیں آ رہی تھی، اب میرے لئے پانی ہو گئی، اعتراف کرتے رہے، خلاف دستور دیر تک اعتراف کرتے رہے، پھر اطمینان سے "عبقات" کو پڑھاتے رہے، حالانکہ اس کی شہادت، مولانا سید سلیمان ندوی دے سکتے ہیں کہ میری تحریک سے دار العلوم ندوۃ العلماء (لکھنو) اور مدرسہ شمس الہدیٰ (پٹنہ) کے نصاب میں عبقات بھی نصاب میں داخل ہوئی، تو اچھے اچھے معقولی مولویوں نے اس کتاب کے پڑھانے سے انکار کیا۔ تصوف بھی پڑھانے کی چیز ہے، یہ مجذوبوں کی بڑ ہے؟ صوفی خدا جانے کہاں کہاں کی ہانکتے ہیں، ان کے شطحیات کو کون سمجھ سکتا ہے، ان ہی فقیروں کی گرد اچھال اچھال کر اس کتاب کے پڑھانے سے جو معذوری تھی چھپاتے رہے، دیوانہ ہے جس نے اس کتاب کو نصاب میں شریک کیا۔ بڑے فاضل ہیں تو خود ہی چند سطریں پڑھا کر دکھا دیں۔ میں نے سنا ہے کہ ان الفاظ کے ساتھ فقیر بھی کوسا گیا، یا یاد کیا گیا۔ لیکن بایں ہمہ مولوی عبد القادر مرحوم نے پہلے سال جب اطمینان سے اس کتاب کو پڑھا لیا تو پھر ہر سال پڑھانے کے لیے تیار ہو گئے

اگرچہ ہر سال کی ابتدا میں ان کا اصرار یہی ہوتا تھا کہ جب تک تو ہے اس کتاب کو پڑھاتا رہ۔ لیکن میں نے یہی کہہ کہہ کر کہ میں کب تک ہوں؟ آپ کو کیا معلوم؟ پھر آپ ہی کو پڑھانا ہوگا۔ ابھی سے اس کو قابو میں کر لیجئے۔ بغیر کسی دغدغہ کے میں یہ عرض کر سکتا ہوں کہ اس پوری کتاب میں مشکل ہی سے ایک دو مقامات ایسے آئے ہوں گے، جن کے متعلق ان کو مجھ سے گفتگو کرنے کی ضرورت پیش آئی، ورنہ اپنے مطالعہ سے اس نہ پڑھے ہوئے فن کے ادق مسائل پر انھوں نے خود عبور حاصل کیا۔

ہاں! تو میں یہ کہہ رہا تھا، کہ تصوف کے متعلق میرا علم ان کے متعلق صرف اسی حد تک تھا کہ ذہنی اور فکری طور پر اس فن کے مسائل سے ان کو لگاؤ پیدا ہو چکا ہے، بس۔ لیکن کیا عملاً بھی اس راہ میں وہ چل پڑے ہیں، خدا شاہد ہے کہ جب تک آخر دفعہ بیمار پڑ کر وہ ہسپتال نہیں گئے تھے انھوں نے کچھ ایسے حال میں اپنے آپ کو رکھا کہ میں بھانپ بھی نہ سکا کہ اس زندگی سے آگے بڑھ کر ان کا دماغ اتنی بلندی حاصل کر چکا ہے جس کے بعد دوسری زندگی کے واقعات کا نگاہوں کے سامنے آجانا ناگزیر ہے۔

شائد جب وہ بیمار ہوئے، زیادہ بیمار ہوئے۔ افسوس اور حسرت کے ساتھ جب لوگوں نے ان کا ذکر شروع کیا تب بعضوں نے مجھ سے کہا کہ وہ راتوں کو جاگا کرتے تھے، آہیں مارا کرتے تھے، رویا کرتے تھے۔ ہائے اس کے آگے رویا کرتے تھے جس کے قدموں پر سر رکھ کر رونے ہی کے لئے آدم زاد پیدا ہوا ہے، وہ روتے تھے حالانکہ ہمارے سامنے تو وہ ہمیشہ ہنستے رہے، میں نے کہنے والوں سے حسرت کے لہجہ میں سنا، صرف روتے تھے، رات ہی ان کے لئے دن تھی، دیوانہ وار گھر سے نکل کر اس وقت جب کہ سارا عالم سوتا ہے، وہ کسی کی تلاش میں سڑکوں پر گھوما کرتے تھے، بیابانوں میں، جنگلوں میں، ویرانوں میں پکارا کرتے تھے، زندگی کا یہ عجیب پہلو، مجھے اس وقت بتایا گیا جب دنیا اور دنیا والوں کو اپنی زندگی کے اس پہلو کو بتا بتا کر لوگ اپنا دین بیچ کر ان کی دنیا خریدتے ہیں۔ نمازیں بھی پڑھتے تھے، وظیفوں کا بھی شغل تھا، اور اوراد و اذکار میں بھی لگے رہتے تھے، لیکن ان میں تو ان کو بھی مشغول پایا گیا ہے، جن کا دل ہمیشہ روپوں میں ڈوبا رہتا ہے، ان کا دماغ دل کو اور دل دماغ کو جھٹلاتا رہتا ہے، بظاہر دوسروں کو وہ شائد دھوکہ دیتے ہیں، لیکن درحقیقت وہ خود اپنے آپ کو دھوکہ دیتے ہیں، یا اپنے دھوکوں سے خود دھوکہ کھا جاتے ہیں۔ لیکن۔ مرحوم عبدالقادر پہلے سنایا گیا، کہ کالج ان کو جو کچھ دیتا تھا، ڈھائی سو بھی دیتا رہا، تین سو بھی، اور بالآخر چار سو بھی پاتے رہے۔ لیکن جو کچھ ان کا حال ڈھائی سے پہلے تھا، ڈھائی سو، تین سو، چار سو، ہر منزل میں دیکھنے والوں نے دیکھا کہ ایک حال میں ہیں، دنیا میں جب آئے تھے جب بھی ان کے پاس کچھ نہ تھا، کالج میں جب داخل ہوئے اور مذہبی محکمہ نے ان کو وظیفے سے سرفراز کیا، اس وقت بھی انھوں نے اپنے پاس کچھ نہ رکھا، اور کالج نے جب خطیر رقوم سے ان کی ماہوار خدمت کی، تو میں نے سنا ہی نہیں، بلکہ قریب قریب دیکھنے کے دیکھا کہ خاندان کی بیوہ اور مسکین عورتیں، لاولد مرد، ضعیف اور کمزور رشتہ داروں کا ایک گروہ تھا جو روتا جاتا تھا، ان کے جنازے کے ساتھ روتا جاتا تھا، جب قبر کے دہانے پر ان کے جنازے کا تختہ آیا اس وقت بھی روتا جاتا تھا۔ روتا جاتا تھا اور کہتا جاتا تھا، جو کچھ ملتا تھا سب دے دیا۔ انہی کو دے دیا جو اب رو رہے ہیں کہ اب ان کو کون دے گا۔ انہی میں جامعہ کے طلبہ کی بھی ایک معقول تعداد تھی قبر کے سرہانے

ایک پیرِ مرد گیروے لباس میں بیٹھا تھا، ہر تھوڑی دیر بعد اس کے سینے سے آہ کا ایک شعلہ نکلتا تھا جو سامنے کھڑے تھے ان کے دلوں کو جلاتا تھا۔ جب وہ کہتا تھا۔ ہمیں مرنا تھا لیکن تم مر گئے، تم مر گئے جس کے مرنے کے بعد کتنوں کو مرنا پڑے گا، ہائے تم مر گئے! اس نہ بھولنے والے نظارہ کو تو سب نے دیکھا، میں بھی ان ہی دیکھنے والوں میں تھا۔ لیکن کہاں تک باشا ہو گا۔ کچھ تو ہو گا۔ ان ہی وسوسوں میں گھر آیا، گھر سے کالج آیا، ان کے نسبتی بھائی ان کی تیمار داری کے زمانے میں میں نے ان کو پہچانا تھا، آب دیدہ میرے کمرے میں داخل ہوئے۔ کیا ہے بھائی؟ انھوں نے کاغذ پیش کیا۔ سناٹا چھا گیا، قطعاً سناٹا چھا گیا، وہ کہہ رہے تھے کہ۔

"صرف بیماری کے ایام کی تنخواہ ان کی رگھوناتھ بنک میں جمع ہو گئی ہے اس کے برآمد کرنے میں دستگیری کیجئے، ان کی بیوہ تین بچوں کی ماں کے پاس کھانے کے لئے بھی کچھ نہیں"

پندرہ سولہ سال تک سیکڑوں کی ماہوار پانے والا، اور بنک میں صرف بیماری کے زمانے کی تنخواہ! انا للہ وانا الیہ راجعون آنکھوں میں آنسو ڈبڈبا گئے، دل کو تھاما۔ رگھوناتھ بنکر کے نام کچھ لکھ کر دیا۔ ہوش اُڑ گئے، جب اس کے ساتھ یہ بھی معلوم ہوا کہ جس نو تعمیر مکان کو وہ اپنی طرف منسوب کرتے تھے دراصل وہ بھی ان کے سرمایہ سے نہیں بنا تھا، کوئی ان کے چچازاد بھائی ہیں ان ہی سے لے کر بنوایا تھا۔ کرایہ دیتے تھے۔ وعدہ کیا تھا کہ بچا بچا کر اپنی تنخواہ سے ادا کرتا رہوں گا لیکن جسے خدا دوسروں کے بچانے کے لئے پیدا کیا کرتا ہے وہ بھی کچھ بچا سکتا ہے؟ جہاں تک معلوم ہے اب تک مشکل ہی سے کرایہ کے سوا وہ کچھ ادا کر سکے تھے؟ بانکوں ترچھوں کی شکل انھوں نے کبھی نہیں بنائی، فیشن کا شوق اس وقت بھی نہیں ہوا، جب اٹھتی جوانیوں میں بہرحال ہر اس شخص پر یہ شوق سوار ہوتا ہے جو جوانی کے جنون میں مبتلا کیا جاتا ہے، قیمتی کھانوں، قیمتی لباس، قیمتی پوشاک، قیمتی سواریوں، میں سے کسی چیز نے ان کو اپنی طرف نہیں گھسیٹا، زندگی محتاط تھی، مگر جو ملتا تھا ان کے واسطے سے دوسروں کو مسلسل ملتا رہا، خالی ہاتھ آئے تھے اور خالی ہاتھ چلے گئے، جیسے خالی ہاتھ ان کو بھی بہرحال چلنا ہی پڑے گا، جو اپنی مٹھیوں کو بھرے ہوئے جی رہے ہیں۔ دینے کا یہ حال تھا اور لینے کے متعلق میں جانتا ہوں۔ غالباً صرف ان ہی کو جانتا ہوں کہ مانگنے کے لئے کبھی زبان تو کیا کھولتے، یہ واقعہ ہے کہ اشارہ ہو یا کنایہ قطعاً کسی زمانہ میں کبھی انھوں نے اس کی شکایت بھی نہیں کی جیسے سب کرتے ہیں کہ امتحان کے پرچوں میں بھی میرا حصہ کیوں نہ رکھا گیا، حالانکہ امتحانی مجالس کے اوپر اور نیچے تمام مدارج میں میرا ان کا ہمیشہ ساتھ رہا۔ رحمۃ اللہ علیہ جس وقت کے لئے جیتے تھے وہ وقت ان پر آ گیا اور جو بھی جی رہے ہیں ان پر آئے گا، لیکن بڑا فرق ہے ان لوگوں میں جو مرنے کے لئے جیتے ہیں، اور ان میں جو جینے کے لئے جیتے ہیں لیکن بہرحال انھیں مرنا ہی پڑتا ہے۔ سلام ہو میرے دوست اور رفیق تمہاری زندگی دوسروں کے لئے عبرت ہے، آنکھوں کی پتلیاں ان شعاعوں سے کھلیں، جو تمہاری تابناک حیات سے تمہارے بعد نکل نکل کر تمہارے جاننے والوں کے دلوں کو جگمگا رہی ہیں، وآخر دعوانا ان الحمد للہ رب العالمین۔

آخر کشش منزلِ ما و ادبِ خاموشاں ست ٭ حالیا غلغلہ در گنبدِ افلاک انداز

۲۵ر اکتوبر ۱۹۵۳ء م ار ذیقعدہ ۱۳۷۲ھ الجامعۃ العثمانیہ (شعبۂ دینیات) (حیدرآباد دکن)

العبد الکئیب المحزون الجانی
مناظر احسن الگیلانی
غفر اللہ لہ ولمن دعا

ادارے کی خبریں

امتحانات کے مرکزوں کی روئدادیں

مرکز گدوال ہر ہر گیارہ بجے صبح میں گدوال پہنچا۔ جناب معتمد صاحب گدوال معہ اپنے اسٹاف کے اسٹیشن پر موجود تھے۔ مجھے نہایت آرام کے ساتھ جناب مولوی سید خالق حسین صاحب اول تعلقدار کے مکان پر پہنچایا گیا جہاں میرا قیام رہا۔ جناب تعلقدار صاحب نے خوش اخلاقی سے کھانے پینے میں میری مرضی کا بڑا لحاظ رکھا۔ پہلے روز شام میں، معتمد صاحب ادارہ کے ساتھ میں نے اس عمارت کا معائنہ کیا جہاں امتحان منعقد ہونے والا تھا۔ یہ نہایت کشادہ اور موزوں جگہ پر واقع تھی۔ زنانہ کے لئے پردہ کا خاص انتظام تھا۔ گیٹ پر چپراسی کو متعین کر دیا گیا۔ مرکز نسواں کی نگران کار یہاں کے زنانہ اسکول کی صدر معلمہ عائشہ بی صاحبہ تھیں۔ میز اور کرسیوں کا انتظام تھا اور سختی سے نگرانی کی گئی کسی کو شکایت کرنے کا موقع نہ ملا۔ مولوی عبدالرحمن صاحب صیغہ دار تحصیل نے ادارۂ ادبیات اُردو سے اپنی غیر معمولی دلچسپی کا اظہار کیا۔ ان کی وجہ سے یہاں کے تاریخی آثار کے دیکھنے میں بڑی مدد ملی۔

۸ ہر ہر اُردو دانی کا امتحان وقت مقررہ پر شروع ہوا۔

۱۱ ہر ہر صبح اناث کا پرچہ ختم ہو گیا۔ دوپہر میں ان کا کوئی پرچہ نہ تھا۔ اس لیے میں نے صدر معلمہ اور نگران کار صاحبہ اور ان کے ساتھی کا شکریہ ادا کیا۔ ۱۰ ہر ہر صبح زبان دانی کا زبانی امتحان تھا۔ میں نے ہر امیدوار کی معیار قابلیت کا لحاظ کرتے ہوئے نشانات دیئے۔ کسی امیدوار کو بھی جوابات کے دینے میں پریشان نہ پایا۔ یہ ادارۂ ادبیات اُردو کی جہت سے بڑی کامیابی ہے۔ ان امیدواروں میں بعض پڑھے لکھے اور عمر رسیدہ لوگ تھے۔ بعض نے تو صرف ادارہ [illegible] خاطر شرکت کی تھی۔ میں یہاں چند ایسے

اصحاب کا ذکر کرنا مناسب سمجھتا ہوں جن کی دلچسپیاں ادارہ کے ساتھ بہت زیادہ ہیں۔ ان اصحاب کے دلوں میں علم اور خصوصاً ادارۂ ادبیات اردو کی ایک تڑپ ہے وہ چاہتے ہیں کہ ملک کے اس گراں قدر علمی ادارہ سے اپنی بے لوث دلچسپی اور عقیدت مندی کا اظہار کرتے رہیں، مناسب سمجھتا ہوں کہ فرداً فرداً تھوڑا سا تعارف ہمارے ادارہ سے کراؤں :-

سرپرست :- راجہ سومیشور راؤ صاحب والی اسٹیٹ دوم کنٹہ
داماد مہارانی صاحبہ اسٹیٹ

نائب سرپرست :- راجہ سردار ریڈی صاحب کپتان مہارانی صاحبہ اسٹیٹ
مولوی سید خالق حسین صاحب اول تعلقدار
" محمد علی خاں صاحب اول مددگار مال۔
" بشیر اللہ صاحب دوم " "
مسٹر شیش ریڈی صاحب منصف
پنڈت گنڈے راؤ صاحب ناظم عدالت ضلع

یہ حضرات ضلع کے معزز عہدوں پر فائز ہونے کے باوجود اس ادارہ سے اپنی پوری عقیدت مندی کا اظہار فرمارہے تھے۔ راجہ صاحب امتحان میں اول آنے والے طلبہ کو تمغے عطا کرتے ہیں۔ تاکہ ادبیات اُردو کی طرف ان کی زیادہ توجہ اور دلچسپی برقرار رہے۔ راجہ صاحب ہمارے شکریہ کے مستحق ہیں۔

جناب اول مددگار صاحب ضلع نے اپنے تحقیق کی یہ بات پر مجبور کیا ہے کہ جب تک وہ ادارۂ ادبیات اُردو کا امتحان کامیاب کر کے سند حاصل نہ کر لیں [illegible] سمجھے جائیں گے [illegible]

جناب دوم مددگار صاحب نے دوران امتحان میں ایک دفعہ ہال میں تشریف لا کر اپنی علمی دلچسپی کا ثبوت دیا۔

عدالت کے معزز عہدہ دار جن کی دلچسپی ادارہ سے کسی طرح کم نہیں تعطیلات ہونے کی وجہ سے باہر گئے ہوئے تھے۔ مجھے ان سے ملاقات کا موقع نہ ملا۔ جناب اول تعلقدار صاحب بحیثیت مجموعی ہمارے شکریہ کے زیادہ مستحق ہیں کیونکہ صاحب موصوف نے مجھے اپنے ساتھ ٹھیرا کر اور میری ساری ضروریات کا خیال فرما کر ادارہ کا حق دوستی ہی ادا نہیں کیا بلکہ امتحانی سوالات کا ایک ایک پرچہ مجھ سے مانگ کر اپنی بے پناہ علم دوستی کا اظہار کیا۔ انہوں نے ان پرچہ جات کو پڑھ کر خوشنودی کا اظہار کر کے اپنے ملنے جلنے والوں سے اس ادارہ کے معیاری سوالات کے متعلق تعریف کی۔ مجھے اس سے زیادہ کیا خوشی ہو سکتی ہے کہ انہوں نے بطور یادداشت کے امتحانی سوالات کی ایک ایک نقل اپنے فائل میں رکھ لی ہے تاکہ ہمیشہ یادگار رہے اور مجھ سے کہا ہے کہ میں ادارہ کے جملہ عہدہ داروں اور بالخصوص اس کے سرگرم کارکن ڈاکٹر زور صاحب کو ان کی دیرینہ عقیدت مندی کا سلام پہنچا دوں۔

حکیم منصور علی صاحب وکیل ناگر کرنول کی محبت اس ادارے کے ساتھ عشق کی حد تک پہنچ گئی ہے۔ صاحب موصوف ہر سال اپنے خاندان کے کسی نہ کسی امیدوار کو ادارہ کے امتحان میں شریک کراتے ہیں اس سال بھی انہوں نے اپنی ایک لڑکی کو گدوال مرکز سے شریک کروایا اور دوسرے خاندان کی لڑکیوں کو حیدرآباد مرکز سے شریک کرا کر ادارے سے تعلق کا بین ثبوت دیا۔ مجھے یہ بھی سن کر بڑی حیرت ہوئی کہ وکیل صاحب کسی ... [illegible] ... سال [illegible]

انتہائی مسرت کا اظہار ادارہ کی ہر دل عزیزی پر کرتا ہوں اور امید رکھتا ہوں کہ آئندہ ادارۂ ادبیات اردو عزیز سے عزیز ترین ہوتا جائے گا۔ ادارہ قابلِ مبارکباد ہے جو اس نے قلیل عرصہ میں ملک کے طول و عرض میں ایسے عزیز ترین بہی خواہ اور علم دوست حضرات پیدا کر لئے ہیں۔

میں اپنی رپورٹ ختم کرنے سے پیشتر گدوال کے ان نوجوان جوشیلے کارکنوں کو کبھی نہیں بھول سکتا جن کی خاموش طبیعت بے لاگ محبت آہستہ آہستہ یہاں کے ہر انسان کو ادارۂ ادبیات اردو کا ہمدرد بنانے میں ہمہ تن منہمک ہے۔ گدوال میں ادارۂ ادبیات اردو کی شاخ کے جو کارکن ہیں ان حضرات کا نام بنام تعارف کرانا میں زیادہ مناسب نہیں سمجھتا کیونکہ ہر کارکن کی کوشش دوسرے سے کم نہیں اور بحیثیت مجموعی ہر کارکن ادارہ کا پرچار اپنوں اور غیروں میں کرنا اپنا اخلاقی فرض سمجھتا ہے۔ یہاں ایک کتب خانہ شرقیہ بھی ہے جس کے بانی معتمد صاحب ادارہ ہیں۔ جس میں مختلف رسائل و اخبارات اردو و انگریزی آتے ہیں۔ دو تین سو کتابیں ہیں جو مشتمل ہیں انگریزی، اردو، فارسی و عربی پر مجھے کتب خانہ کو دیکھ کر بڑی خوشی ہوئی۔ صبح چھ بجے سے لے کر شام کے دس بجے تک کھلا رہتا ہے۔ ہر علم دوست اس بے بہا دولت سے سیراب ہوتا ہے اس کتب خانہ کے بانی اور ان کے شرکائے کار وہ ہستیاں ہیں جو آج ادارہ کی ہر آواز پر پیش پیش نظر آتی ہیں ان کی پیشانیوں پر ادارہ کی بے لوث محبت کندہ ہے۔

میں جناب مولوی سید حسین صاحب معتمد گدوال کا شکریہ ادا کرتا ہوں کہ صاحب موصوف نے اپنی گوناگوں مصروفیتوں ... [illegible]

بہترین جذبات پیدا کئے ہیں۔ مولوی صاحب کو ادارۂ ادبیات اُردو کا بہترین دوست، بہی خواہ اور خاموش کارکن سمجھتا ہوں۔ مولوی صاحب کی خواہش ہے کہ ادارۂ ادبیات اُردو دائمی طور پر گدوال کو اپنا مرکز قرار دے۔

سید محی الدین احمد

مرکز گلبرگہ شریف

[illegible] رہبر ۱۳۵۲ف شب کے ۲ بجے گلبرگہ پہونچا۔ اسٹیشن پر مولوی نصیر الدین صاحب نظامی و مسٹر مسعود انصاری موجود تھے۔ مولوی علی الدین صاحب انصاری وکیل ہائی کورٹ کے دولت خانہ پر بربرے قیام و طعام کا انتظام تھا۔ جہاں مجھے آرام و اطمینان رہا۔

امتحان میں مولوی نصیر الدین صاحب نظامی و مخیر حضرات کے اشتراک عمل سے مناسب نگرانی رہی۔ طبقہ اناث کی نگرانی، سواری و پردہ کا اچھا انتظام رہا۔ کوئی بات قابل شکایت پیش نہ آئی۔

محمد عبدالواحد

مرکز نظام آباد

۷ رہبر ۱۳۵۲ف شب کے ۱۱ بجے نظام آباد پہونچا اور ڈاک بنگلے میں مقیم رہا۔ ۸ رہبر ۱۳۵۲ف کو مولوی غلام احمد صاحب وکیل کے مکان پر اپنے آنے کی اطلاع دینے گیا۔ معتمد صاحب ادارہ، نظام آباد سے ملاقات ہوئی۔ وکیل صاحب موصوف کی ہمراہی میں وقت مقررہ پر مدرسۂ فوقانیہ نظام آباد گیا جہاں امتحان کا انتظام کیا گیا تھا۔ امتحان گاہ میں پہلے دن مولوی مولوی محمد حسین خاں صاحب معتمد ادارہ نظام آباد کے علاوہ مولوی غلام احمد صاحب وکیل و مسٹر کاشی ناتھ راؤ کمپالکر وکیل اور مولوی اعجاز اللہ خاں صاحب اول مددگار مدرسہ فوقانیہ نظام آباد و محمود عالم صاحب نائب معتمد ادارہ تشریف لاکر بہت دیر تک ٹھیرے رہے اور امتحانات سے متعلق اپنی دلچسپی کا اظہار فرماتے رہے۔ معتمد صاحب شاخ مقامی آخر وقت تک ٹھیرے رہے۔ دوسرے دن اُردو دانی کے امتحان میں ۱۴ طالبات شریک تھیں۔ ان کے امتحان کے جملہ انتظامات مولوی غلام احمد صاحب وکیل و [illegible] حسین خاں صاحب معتمد شاخ مقامی نے بڑی محنت و دلچسپی کے ساتھ نہایت عمدہ طریقے پر فرمائے تھے۔ طالبات کی نگرانی کے لئے مولوی غلام احمد صاحب وکیل نے اپنی ذاتی دلچسپی اور کوشش کو کام میں لاکر محل مولوی ابو طاہر عبدالقادر سول سرجن نظام آباد و مسز ڈاکٹر کلکرنی و محل سرتاج عالم صاحب مہتمم پولیس کو امتحان گاہ تک تشریف لانے کی زحمت دی تھی۔ محل مولوی ابو طاہر عبدالقادر صاحب نے متذکرہ صدر تینوں خواتین کی مدد سے اردو دانی کے امتحان کی نگرانی فرمائی اور ان کا زبانی امتحان بھی لیا۔ پردہ کا معقول انتظام تھا اس سلسلہ میں خاص طور پر میں اس کا ذکر ضروری خیال کرتا ہوں کہ اصل مولوی غلام احمد صاحب کی ذاتی سعی و کوشش اور دلچسپی کی بدولت اُردو دانی کے امتحان اناث میں اکثریت ایسی ہندو طالبات کی تھی جن کی مادری زبان اردو نہیں ہے۔ طالبات نے نہایت خوشی سے امتحان دیا۔ اس خصوص میں مسٹر کاشی ناتھ راؤ کمپال کر وکیل بھی غلام احمد صاحب کی اس کوشش میں برابر کے شریک رہے ہیں۔ اُردو دانی کے جملہ امیدواران اناث و ذکور کو مولوی حسین خاں صاحب نے خاص طور پر بڑی محنت سے تعلیم دے کر امتحان میں شرکت کے قابل بنایا تھا جس کے لئے ادارہ کو ان کا خاص طور پر مشکور ہونا چاہئے۔ حقیقت یہ ہے کہ نظام آباد میں ادارہ کے مقاصد کی اشاعت کے لئے صاحب موصوف کا وجود نہایت غنیمت ہے۔ ان کی ذاتی دلچسپی، محنت، کام کرنے کی امنگ اور خدمت کرنے کا جذبہ نوجوانوں کے لئے قابل تقلید ہے اور ایسے مخلص اور سرگرم کارکن ادارہ کی خوش قسمتی کا باعث ہیں۔ مولوی غلام احمد صاحب وکیل کی رہنمائی، دلچسپی و ہمدردانہ مشورے قابل ذکر ہیں۔ موصوف نظام آباد کی ایک ذی اثر، علم دوست اور ہر دلعزیز ہستی ہیں۔ ادارہ کے مقاصد کی تکمیل اور اشاعت میں وہ خاص طور پر دلچسپی لیتے اور معتمد صاحب مقامی کی رہنمائی و امداد فرمایا کرتے ہیں۔ توقع ہے کہ آئندہ سال نظام آباد مرکز سے زیادہ

تعداد میں امیدوار شریک امتحان ہوں گے۔

سید عبد الفتاح

مرکز دیجاپور مولوی عارف الدین حسن صاحب رفیق ادارہ (جن کے شغف سے ہی یہ مرکز قائم ہوا) کے ہمراہ ۷ر مہر ۱۳۵۲ف بروز شنبہ رات کی ٹرین سے ۱۱ بجے اورنگ آباد سے دیجاپور پہونچا۔ مندرجۂ ذیل احباب نے اسٹیشن پر خیر مقدم فرمایا:۔

مولوی پیر حسن علی صاحب صدر ادارہ شاخ دیجاپور وظیفہ یاب امین کروڑگیری۔ مولوی عیسیٰ خاں صاحب وکیل۔ مولوی بدر الدین صاحب تحصیل دار اول الذکر ادارہ کی اس شاخ کے کہنہ سال لیکن جوان ہمت کارکن ہیں۔ موصوف اور مولوی نصیر الدین صاحب ہنری منصف کی گہری دلچسپی سے مدرسہ وسطانیہ کی عمارت میں نشستوں کا اطمینان بخش انتظام تھا۔ نشستوں کے تمام ضروری جدول عمارت کے ضروری خاکہ کے ساتھ خوش اسلوبی سے تیار تھے۔ جن پر ایک نظر ڈالتے ہی پورا نقشہ ذہن میں آجاتا تھا۔

۸ر مہر کو مولوی عارف الدین حسن صاحب کی معیت میں قبل از وقت مدرسہ پہونچا۔ ٹھیک وقت پر یعنی ۹-۵۰ پر پہلی گھنٹی ہوئی۔ حسب ہدایات صدر ادارہ ضروری پرچوں کے بنڈل کھلوائے اور بروقت تقسیم عمل میں آئی۔

بعض شرکاء ۱۰، ۱۵ منٹ دیر سے پہونچے۔ شرکاء کی تعداد حسب ذیل تھی:۔

(i) امتحان اُردو عالم اُناث (۲) ۔ دونوں حاضر تھے۔
(ii) " " ذکور (۱۴) ۔ جن میں سے ۱۱ حاضر اور ۳ غیر حاضر۔
(iii) " خوش نویسی (۱) ۔ حاضر۔

اناث کے لئے مدرسہ کی عمارت کا ایک متصل کونا قناتوں سے الگ کر لیا گیا تھا۔ صدر معلمہ صاحبہ مدرسہ اناث اس حصہ کی صدر نگران تھیں ان کے علاوہ ایک اور خاتون مددگار نگران۔ انتظام اطمینان بخش تھا۔

حسن اتفاق سے مہتمم صاحب تعلیمات (مولوی مہدی حسن صاحب زبیری) بھی ۱۱ بجے پہونچ گئے انتظامات کا معائنہ کیا۔

دوسرا پرچہ پروگرام کے مطابق بروقت شروع ہوا۔ انتظامات اطمینان بخش تھے۔

۹ر مہر کو بروقت تمام امتحانات شروع ہوئے۔ آج شرکاء کی تعداد زیادہ تھی کیونکہ اُردو عالم، اُردو دانی اور زباں دانی کے آج تین امتحان تھے۔ امتحان زباں دانی میں ایک شریک مسمی سعید عمر ۳۲ سالہ چپراسی عدالت ایک گھنٹہ دیر سے آیا آدمی غریب اور شوقین معلوم ہوتا تھا۔ قسمیں کھائیں کہ کسی سے نہیں ملا۔ اس حصہ کے ۸ شریک تھے جس میں سے باقی کے سات اس وقت تک کمرہ ہی میں موجود تھے۔ اس لئے مسمی سعید کو اجازت دی گئی۔ لیکن جوابی بیاض پر نوٹ دے دیا گیا کہ ادارہ چاہے اس کی جانچ کرائے یا نہ کرائے۔

چونکہ تعلیم بالغان سے بھی اس امتحان کا تعلق ہے اس لئے تشویق اور مصلحت کے مدنظر اجازت دی گئی۔

۱۰ر مہر کو زباں دانی کا زبانی اور اُردو عالم کا تیسرا اور آخری پرچہ تھا۔ بروقت تمام امتحانات حسن وخوبی سے ختم ہوئے۔

۱ تا ۲ تمام شرکاء (معہ شرکاء اناث) کو شاخ ادارہ نے جمع کیا۔ مقامی معززین و وکلا بھی تھے۔ جناب مولوی نصیر الدین صاحب منصف اور جناب مولوی عیسیٰ خاں صاحب اور ایک ہندو شریک نے تقاریر کیں۔ راقم نے آخر میں ادارہ کے مقاصد پر چند منٹ روشنی ڈالنے کے بعد شاخ ادارہ کے حسن انتظام اور معاونین کی کارگزاری کی داد دیتے ہوئے ادارہ کی جانب سے شکریہ ادا کیا۔

محمد شرف الدین

مرکز ہمناباد میں بتاریخ ۸ر مہر ۱۳۵۲ف بروز شنبہ صبح ۱۰ بجے بذریعہ ریل نام پلی اسٹیشن سے روانہ ہوا۔ کچھ فاصلہ ریل کے ذریعہ اور کچھ فاصلہ بس کے ذریعہ طے کرکے اسی روز رات میں ۹ بجے ہمناباد

پہونچ گیا اور بمکان مولوی سید اسمٰعیل صاحب وکیل ہائی کورٹ صدر شاخ ہمناباد قیام کیا جہاں قیام و طعام کا انتظام بہت اچھا تھا۔ دوسرے دن سے حسب پروگرام امتحانات ہوئے۔

مرکز نسواں کی نگران کار جناب محترمہ قمرالنساء بیگم صاحبہ دختر جناب ڈاکٹر محمد داؤد خاں صاحب میڈیکل افسر دواخانہ ہمناباد تھیں جن کی نگرانی میں اردو دانی کے تحریری و تقریری امتحانات بھی لئے گئے۔

ذکور کے لئے مولوی سید اسمٰعیل صاحب وکیل ہائی کورٹ صدر مرکز ہمناباد کا مکان مرکز مقرر کیا گیا تھا۔ اردو عالم کے امیدوار نصف کچہری و تحصیل کچہری کے سررشتہ دار و صیغہ دار و اہل کار تھے۔

مولوی محمد جمال خاں صاحب غوری منصف ہمناباد نے اپنا قیمتی وقت اور تعطیلات امتحان کی نگرانی میں صرف کئے۔ تین روز تک مسلسل امتحان گاہ میں صبح و دوپہر ٹھیک وقت پر تشریف لاتے تھے اور بعد برخاست امتحان تشریف لے جاتے تھے۔ زبانی امتحانات میں خود ہی سوالات مندرجہ پرچہ جات پوچھتے تھے۔ جناب نے یہ بھی فرمایا کہ آئندہ سال اس مرکز سے سو ڈیڑھ سو امیدواروں کو شریک کراؤں گا۔ یہ پہلا وقت ہے اس لئے خاطر خواہ کوشش نہ ہو سکی۔

رعایا کی ایک درخواست ہے کہ امتحانات سال میں ایک دفعہ لینے کے بجائے دو دفعہ لئے جائیں تو ہمارے لئے بے حد مفید ثابت ہوں گے۔ چنانچہ ان کی درخواست منسلک ہذا ہے۔

شیشیا

مرکز ہنگولی میں ۱۷ مہر یوم شنبہ کی صبح ہنگولی پہونچا۔ معتمد صاحب شاخ سے ملاقات ہوئی۔ معتمد صاحب نے تمام انتظامات مکمل کر دئے تھے۔ مقامی مدرسہ کے اساتذہ صاحبان کو بھی نگرانی کے لئے زحمت دی گئی تھی۔ مرکز نسواں کا انتظام جناب قمرالنساء بیگم صاحبہ صدر معلمہ مدرسہ فوقانیہ نسواں کے تفویض کیا گیا تھا۔

شرکاء اور کارکنان ادارہ کی خواہش ہے کہ یہ امتحانات بجائے مہر کے تیر کے اواخر میں ہوا کریں کیونکہ وہ تیر کی چھٹیوں میں تعلیم دے سکیں گے۔ اور زیادہ سے زیادہ طلبہ کو شریک امتحان کر سکیں گے۔

نیز بارش اور کچے راستوں کی خرابی کی وجہ سے عبور و مرور میں جو بے حد دشواریاں پیش آتی ہیں ان سے وہ محفوظ رہیں گے۔ مثلاً ہنگولی سے قریب کے دیہات کے اکثر شرکاء نے پربھنی کو اپنا مرکز منتخب کیا تھا۔ حالانکہ ہنگولی قریب ترین مقام تھا۔ اس کی وجہ یہ تھی کہ اس دیہات سے پربھنی تک بس کے ذریعہ سفر کیا جا سکتا تھا اور ہنگولی تک بنڈی یا پیدل سفر کرنا ہوتا تھا۔ راستے میں دو ندیاں بھی ملتی ہیں اگر بارش ہو جائے تو ان کا عبور کرنا او رمشکل ہو جاتا ہے ان دقتوں کے باعث اور بالخصوص درس و تدریس کی سہولت کے لئے مناسب یہی ہے کہ تیر کے اواخر میں یہ امتحانات لئے جائیں۔

مقامی عہدہ داروں سے کلب میں روزانہ گفتگو کا موقع ملتا رہا۔ ادارہ سے ان کی دلچسپی قابل تشکر ہے۔ کلب میں بھی ادارہ کے امتحانات کو تسلیم کئے جانے کے متعلق گفتگو ہوتی رہی۔

صدر شاخ جناب نجم الدین صاحب انصاری اور ان کی بیگم صاحبہ ہمارے خاص شکریہ کے مستحق ہیں۔ جناب نجم الدین صاحب کو ادارہ سے گہری دلچسپی اور محبت ہے وہ اس کام کو آگے بڑھانے میں نمایاں حصہ لیتے رہتے ہیں۔ روزانہ امتحان میں بھی آپ دوسرے عہدہ داروں کے ساتھ تشریف لا کر انہیں ادارہ کے کاموں سے تفصیلی طور پر واقف کروایا۔

جناب محمد عثمان خاں صاحب کمالی معتمد شاخ کا شکریہ کسی طرح بھی ادا نہیں کیا جا سکتا یہ تقریباً تمام اخراجات اپنی ذات سے ادا کرتے ہیں۔ ادارہ کا دفتر بھی انہی کے گھر میں ہے ایک چھوٹا سا کتب خانہ اور دارالمطالعہ بھی دفتر ہی کے ساتھ ہے ان کی کوشش اس چھوٹے سے قصبہ میں قابل تحسین ہے۔ [illegible]

جناب شیخ عبداللہ صاحب مدرس و مصطفیٰ خاں صاحب طالب کی مساعی بھی شکریہ کے لائق ہیں۔

میں اسے اپنی خوش قسمتی سمجھتا ہوں کہ ادارہ کے اس ٹھوس اور خاموش کام کو دیکھ سکا جو ملک میں ذہنی انقلاب کی تعمیر میں مصروف اور علم و ادب کا صحیح ذوق پیدا کر رہا ہے۔

محبوب حسین جگر

مرکز بسمت ذکور کے امتحان کے لئے کلب میں انتظام کیا گیا تھا اور اناث کے لئے مدرسہ نسواں میں۔

میں نو بجے کلب پہنچا مولوی عبدالحی صاحب منصف معروف انتظام تھے میز اور کرسیاں بچھا دی گئی تھیں۔ وقت پر پرچہ کھولا گیا اور تقسیم کیا گیا۔ جملہ امیدواران امتحان میرے سامنے تھے اور دوسرے نگران کار کی ضرورت نہیں تھی تاہم بھی محاسب صاحب تحصیل اور سررشتہ دار صاحب عدالت منصفی نے میرا بہت ہاتھ بٹایا۔ منصف صاحب تشریف لے گئے اور تحصیلدار صاحب تشریف لائے اور بہت دیر تک موجود رہے۔ دو روز امتحان ادارہ کے مقررہ اوقات پر لیا گیا لیکن تیسرے دن چونکہ گاڑی ایک بجے نکلتی تھی اس لئے امتحان کا وقت ۸ تا ۱۱ مقرر کیا گیا تھا امیدوار بروقت آئے اور پرچہ بھی تقسیم کر دیا گیا۔ منصف صاحب اور تحصیلدار صاحب بھی تشریف لائے تھے اور آخر تک ٹھیرے رہے۔ پرچوں پر مہریں وغیرہ لگانے کے بعد منصف صاحب اور دیگر حضرات نے ہمیں خدا حافظ کہا۔ بیگم فرید مرزا صاحب نے نگرانی کے فرائض انجام دئے۔ معلوم ہوا کہ منصف صاحب اور تحصیلدار صاحب ہی کی کوششیں تھیں کہ بسمت اب کی دفعہ مرکز قرار پایا۔ اناث میں نور النساء بیگم صاحبہ اور سعید النساء بیگم صاحبہ معلمات مدرسہ نے کوشش کی اور مولوی مظہر الدین صاحب نے ان کا ہاتھ بٹایا۔ انھیں کی سعی تھی کہ چالیس لڑکیاں اردو دانی کے امتحان میں شریک رہیں۔

اکبر

شاخ اورنگ آباد ۱۳۵۳ف کے لئے شاخ ادارۂ ادبیات اُردو اورنگ آباد کی مجلس انتظامی کے لئے حسب ذیل اصحاب عہدہ دار و ارکان منتخب ہوئے۔

۱۔ مولوی ساجد علی صاحب صدر مہتمم تعلیمات .... صدر
۲۔ رائے چھوٹے لال صاحب .... نائب صدر
۳۔ مولوی محمد یحییٰ صاحب منتظم محکمۂ صوبہ داری .... معتمد عمومی
۴۔ قاضی معین الدین صاحب وکیل .... معتمد امتحانات
۵۔ مولوی عبداللہ صاحب قریشی .... معتمد دارالمطالعہ
۶۔ " عارف الدین حسن صاحب دوم تعلقدار . .. خازن
۷۔ " محمد ابراہیم صاحب لکچرار .... رکن
۸۔ " مہدی حسن صاحب زبیری مہتمم تعلیمات "
۹۔ " شرف الدین صاحب صدر مدرس وسطانیہ "
۱۰۔ " ولی محمد خاں صاحب مددگار اورنگ آباد کالج "

شاخ کلیانی مجلس انتظامی کا ایک اجلاس بتاریخ ۱۸؍ آذر ۱۳۵۳ف بمقام رحمت منزل منعقد ہوا۔ حسب ذیل اصحاب نے شرکت کی مولوی محمد عطاء اللہ صاحب معتمد۔ مسٹر ترل راؤ صاحب بی اے رکن۔ مولوی مرزا محمود بیگ صاحب معتمد شعبۂ تقریر۔ مولوی سید تاج الدین صاحب منشی فاضل نائب معتمد شعبۂ تقریر۔ مولوی محمد علی خاں صاحب معتمد شعبہ طلبہ۔ محمد عبدالرحمن نائب معتمد شعبہ طلبہ۔ دیگر اراکین شعبہ طلبہ نے بھی جلسہ میں شرکت کی۔ حسب ذیل امور طے پائے۔

۱۔ چونکہ مولوی میر الدین صاحب منتظم دارالمطالعہ لا کلاس کی شرکت کے لئے حیدرآباد میں سکونت پذیر ہیں اس لئے دارالمطالعہ کے انتظام کے لئے کسی منتظم کا انتخاب ضروری ہے چنانچہ بالاتفاق آرا مولوی میر احمد علی صاحب دلد وغیرہ امراس کو منتظم منتخب کیا گیا موصوف نے بھی اس خدمت کی انجام دہی کے لئے اپنی رضامندی کا اظہار کیا۔
۲۔ طے پایا کہ اخبارات کے فائل سنین گزشتہ اس کثرت کے ساتھ جمع ہو گئے ہیں کہ ان کی حفاظت ممکن نہیں اس لئے ان کو فروخت کر دیا جائے۔

اُردو امتحانات کے چار سالہ نتائج

ذیل کے نقشے سے اردو امتحانات (سنہ ۱۹۴۰ء تا سنہ ۱۹۴۳ء) کے شرکاء اور کامیاب امیدواروں کی تعداد ظاہر ہوتی ہے

سنین	اُردو دانی					اردو زباندانی					اردو عالم					اردو فاضل					خوش نویسی				
	شرکائے امتحان	حاضر	کامیاب			شرکائے امتحان	حاضر	کامیاب			شرکائے امتحان	حاضر	کامیاب			شرکائے امتحان	حاضر	کامیاب			شرکائے امتحان	حاضر	کامیاب		
			ذکور	اناث	میزان			ذکور	اناث	میزان			ذکور	اناث	میزان			ذکور	اناث	میزان			ذکور	اناث	میزان
سنہ ۱۹۴۰ء	۱۲۵	۱۳۴	۱۰۵	۲۳	۱۲۸	۰	۰	۰	۰	۰	۷۴	۶۸	۳۹	۵	۴۴	۱۱	۱۱	۴	۲	۶	۹	۹	۵	۰	۵
سنہ ۱۹۴۱ء	۴۳۵	۴۴۳	۲۰۸	۱۰۹	۳۱۷	۰	۰	۰	۰	۰	۱۱۵	۹۹	۵۳	۱۲	۶۵	۸۵	۴۷	۳۴	۲	۳۶	۲۲	۱۹	۱۱	۰	۱۱
سنہ ۱۹۴۲ء	۸۳۹	۷۱۸	۴۸۶	۱۶۷	۶۵۳	۲۲۶	۱۹۴	۵۵	۴۱	۹۶	۱۹۵	۱۸۰	۸۱	۱۹	۱۰۰	۵۵	۴۹	۳۱	۳	۳۴	۸	۷	۳	۰	۲
سنہ ۱۹۴۳ء	۸۹۵	۷۴۸	۴۱۰	۲۲۲	۶۳۲	۴۰۰	۳۳۵	۱۳۲	۶۹	۲۰۱	۲۵۶	۲۱۳	۷۸	۲۲	۱۰۰	۳۱	۲۷	۱۳	۴	۱۷	۱۷	۱۴	۷	۰	۷

ذیل کے نقشے سے اردو امتحانات (سنہ ۱۹۴۰ء تا سنہ ۱۹۴۳ء) کے کامیاب امیدواروں کی درجہ وار تفصیل واضح ہوتی ہے

سنین	اردو دانی		اردو زبان دانی			اردو عالم			اردو فاضل			خوش نویسی			تعداد کامیاب امیدواران	تعداد شرکائے امتحان	فیصدی اوسط کامیابی
	امتیاز	معمولی	اول	دوم	سوم	اول	دوم	سوم	اول	دوم	سوم	اول	دوم	سوم			
سنہ ۱۹۴۰ء	۱۵	۱۱۳	۰	۰	۰	۳	۲۷	۱۴	۰	۳	۳	۱	۱	۳	۱۸۳	۲۲۲	۸۳
سنہ ۱۹۴۱ء	۷۸	۲۳۹	۰	۰	۰	۱	۲۴	۴۰	۰	۱۴	۲۲	۴	۲	۵	۴۲۹	۵۰۸	۸۴
سنہ ۱۹۴۲ء	۱۷۰	۴۸۳	۲	۱۵	۷۹	۴	۴۶	۵۰	۲	۱۴	۱۸	۰	۰	۲	۸۸۵	۱۱۴۸	۷۷
سنہ ۱۹۴۳ء	۱۶۹	۴۶۳	۰	۶۳	۱۳۸	۱	۳۴	۶۵	۰	۴	۱۳	۰	۲	۵	۹۵۷	۱۳۳۷	۷۲

مجلس انتظامی اُردو امتحانات

اردو امتحانات کی مجلس انتظامی کا اجلاس بتاریخ ۱۴ اکتوبر ۱۹۴۳ء مطابق ۲۰ آبان ۱۳۵۲ف صبح ۹ بجے محکمۂ نظامت تعلیمات میں منعقد ہوا۔ حسب ذیل اصحاب نے شرکت فرمائی۔

۱۔ مولوی سید علی اکبر صاحب ایم اے (کنٹب) صدر مجلس۔

۲۔ " نصیر الدین ہاشمی صاحب

۳۔ ڈاکٹر سید محی الدین صاحب قادری زورؔ

۴۔ خواجہ حمید الدین شاہدؔ مہتمم ادارہ

مولوی سید محمد صاحب معتمد مجلس نے بوجہ علالت اور مولوی عبدالمجید صاحب صدیقی نے بوجہ سفر بجواڑہ شرکت سے معذرت کی اطلاع دی۔

۱۔ طے پایا کہ امتحان اردو فاضل بابت ۱۹۴۲ء و ۱۹۴۳ء مطابق ۱۳۵۱ف و ۱۳۵۲ف کے پرچۂ پنجم (اختیاری مصنف) کے لئے حسب ذیل دو مصنفوں کا اعلان کیا جائے۔

(۱) پریم چند (۲) حالی

۲۔ مولوی غلام رسول صاحب کی رپورٹ امتحان کی مندرجہ تحریک پیش ہوئی کہ:۔

"اردو دانی اور اردو زباں دانی کے زبانی امتحان کے لئے ۱۰۰ کی بجائے ۵۰ نشانات مقرر کئے جائیں۔"

بعد غور و خوض طے پایا کہ اُردو دانی اور اُردو زباں دانی کے زبانی امتحان کے سلسلے میں آئندہ ہر ممتحن کو ہدایت کی جائے کہ پرچۂ نشانات پر ہر سوال کے نمبر درج ہوں۔ اور زبان اور مواد کے لحاظ سے بھی نمبروں کا اندراج عمل میں آئے۔

۳۔ آئندہ سال سے ہر ضلع کے مہتمم تعلیمات یا مدارس فوقانیہ و وسطانیہ کے صدر مدرسین کو صدر نگران کار امتحان اور زبانی امتحان کا ممتحن بنانے کی کوشش کی جائے۔ اس سلسلے میں بشرط ضرورت مزید تفصیلات پر ذیلی کمیٹی غور کرے۔

۴۔ اردو امتحانات کے نصاب کی تبدیلیوں سے متعلق صدر صاحب مجلس ناظم صاحب تعلیمات سے تبادلۂ خیال کے بعد ذیلی مجلس کو توجہ دلائیں گے۔

۵۔ امتحانات اُردو فاضل، اُردو عالم، اُردو زباں دانی، اُردو دانی اور خوش نویسی کے نتائج بابت ۱۳۵۲ف م ۱۹۴۳ء پیش کئے گئے اور زیر غور امیدواروں کے نمبروں پر غور کیا گیا۔

۶۔ ممتحنین کی رپورٹیں پیش ہوئیں اور طے پایا کہ ذیلی مجلس ان پر غور کرے۔

۷۔ اُردو دانی کا ماہ ڈسمبر میں دوسرا امتحان لینے کی منظوری دی گئی۔

۸۔ چونکہ مولوی کمال رضا صاحب رکن مجلس کا تبادلہ ورنگل پر عمل میں آچکا ہے اس لئے ان کی جگہ نئے رکن کے انتخاب کا مسئلہ پیش ہوا اور باتفاق طے پایا کہ مولوی محمد عالم صاحب مددگار معتمد مجلس تعلیم ثانوی کو مجلس انتظامی کا رکن منتخب کیا جائے۔

اجلاس دس بجے برخاست ہوا۔

اطلاع

جنوری ۱۹۴۴ء میں ادارہ کی گزشتہ سال کی علمی و ادبی سرگرمیوں کی مکمل رپورٹ شائع ہوگی۔

مہتمم ادارہ

مجلس انتظامی ادارہ

ادارۂ ادبیات اُردو کی مجلس انتظامی کا اجلاس دوشنبہ ۱۸ اکتوبر ۱۹۴۳ء مطابق ۱۴ آذر ۱۳۵۲ف شام کے پانچ بجے دفتر ادارہ میں منعقد ہوا۔
حسب ذیل اصحاب نے شرکت فرمائی :۔

نواب لیاقت جنگ بہادر معتمد فینانس و نائب صدر ادارہ ۔
" معین نواز جنگ بہادر معتمد سیاسیات و باب حکومت ...رکن
مولوی سید محمد اعظم صاحب ایم اے۔ ناظم تعلیمات .... "
" عبد المجید صاحب صدیقی ایم اے ۔ ایل ایل بی ...... "
" نصیر الدین صاحب ہاشمی .... "
ڈاکٹر سید محی الدین قادری زورؔ ...... معتمد اعزازی

مولوی سید علی اکبر صاحب ایم اے نے بذریعۂ تحریر عدم شرکت کی معذرت چاہی ۔

(۱) گزشتہ اجلاس کی روئداد پڑھ کر سنائی گئی اور اس کی توثیق عمل میں آئی ۔

(۲) نواب لیاقت جنگ بہادر نائب صدر ادارہ اور نواب معین نواز جنگ بہادر رکن مجلس انتظامی ادارہ کی سرفرازی شاہانہ اور خطاب یابی پر معتمد نے منجانب ادارہ تحریک تہنیت پیش کی اور پھول پہنائے ۔

(۳) مولوی سید محمد اعظم صاحب رکن مجلس انتظامی کے نظامت تعلیمات پر مستقل ہونے کی مسرت میں نواب لیاقت جنگ بہادر صدر اجلاس نے منجانب ادارہ تحریک تہنیت پیش کی اور صاحب موصوف کو منجانب ادارہ پھول پہنائے گئے ۔

(۴) مولوی عبد القادر صدیقی موسس ادارہ کی وفات کی وجہ سے مجلس انتظامی میں جو جگہ خالی ہوئی ہے اس پر بالاتفاق آرا نواب زین یار جنگ بہادر چیف آرکیٹکٹ سرکار عالی و نائب صدر مجلس عمارت ادارۂ ادبیات اردو کا انتخاب عمل میں آیا۔

(۵) موسسین ادارہ کی جانشینی کے مسئلہ سے متعلق معتمد نے ایک تحریری یادداشت پیش کی جو بعد ترمیم منظور ہوئی۔

(۶) پروفیسر عبد القادر سروری اور ڈاکٹر سید ہ جعفر ورما نے ادارہ کے شعبۂ زبان کی خواہش پر جو فرہنگ لسانیات مرتب کی ہے اس کی طباعت کے لئے معتمد کی تحریک پر طے پایا کہ

"یہ لغت پروفیسر سروری اپنی نگرانی میں میسور ہی میں چھپوائیں اور اس کے اخراجات کے سلسلہ میں مبلغ دو سو روپے صاحب موصوف کے یہاں ایصال کئے جائیں ۔"

(۷) ادارہ کے مختلف شعبہ جات کی مرتب کرائی ہوئی حسب ذیل کتب کی اشاعت کی اجازت دی گئی ۔

۱۔ تعلیم کا مسئلہ از ڈاکٹر رضی الدین صدیقی
۲۔ زہریلے پودے " محمد عبد السلام ایم ایس سی
۳۔ مرقع نثر مرتبۂ عظیم الدین محبت ایم اے
۴۔ رفیق اُردو داں " مرزا عصمت اللہ بیگ
۵۔ مسئلہ تعلیم بالغاں از زاہد حسین بی اے۔ ایم ایڈ

(۸) شعبہ جات ادارہ میں تبدیلی سے متعلق "مجلس معتمدین شعبہ جات" کی تحریکات شریک ایجنڈا تھیں اور ان کے متعلق طے پایا کہ آئندہ اجلاس میں غور کیا جائے گا ۔

(۹) اراضی قلعۂ گولکنڈہ پر حصول قبضہ کی معتمد نے اطلاع دی جس کے متعلق صدر صاحب مجلس کی یہ تحریک منظور ہوئی کہ

"اس کامیابی اور ادارہ کے لئے جائداد حاصل کرنے میں معتمد صاحب اعزازی نے جو کامیاب کوشش کی ہے اس کے لئے منجانب ادارہ اُن کا شکریہ ادا کیا جاتا ہے ۔ اس زمین پر ادارہ کی طرف سے ایک تاریخی نمائش گھر اور ایک ایکڑ زمین پر قلعۂ گولکنڈہ کا نمونہ نواب زین یار جنگ بہادر کی نگرانی میں

بنانے کا تصفیہ کیا گیا۔"

(۱۰) ادارہ کے لئے عارضی اور مستقل عمارتوں کی فراہمی میں اس وقت تک جو کارروائی ہوئی ہے معتمد ادارہ نے اس کی وضاحت کی۔ اور اس سلسلے میں طے پایا کہ اگر وہ سرکاری مکان جس میں اب علی برادرس کا ہراج خانہ ہے ادارہ کو کرایہ پر حاصل ہو جائے تو اس میں ادارہ کی منتقلی عمل میں آئے۔

اقتباس رپورٹ شاخ کلیانی

جس کو بتاریخ ۲۰ ہر تیر ۱۳۵۲ف معتمد شاخ نے جلسۂ تقسیم اسناد بابتہ ۱۹۴۲ء میں پڑھ کر سنایا۔

کلیانی میں ادارۂ ادبیات اردو کی شاخ ۹ ہمن ۱۳۴۹ف مطابق نومبر ۱۹۳۹ء میں قائم کی گئی اس تین سال کے عرصہ میں اس نے اردو کی خدمات میں اپنی بساط سے زیادہ حصہ لیا اردو امتحانات کی ترویج، دارالمطالعہ اور شعبۂ طلبہ کا قیام اس کی کارگزاریوں کا عملی ثبوت ہے۔

امتحانات ۱۹۴۰ء میں جب پہلے پہل امتحانات لئے گئے تو شرکاء کی تعداد صرف (۴۰) تھی مگر ۱۹۴۲ء میں یہ تعداد یکصد تک پہنچ گئی گویا یہ نتیجہ ہے اس امر کا کہ شاخ ہذا نے مقامی اشخاص کو امتحانات کی شرکت اور اس کی افادیت کی جانب بیش از بیش راغب کیا۔ شرکاء کو حسب ذیل اصحاب نے تعلیم دی:۔

مولوی عبدالکریم صاحب، مولوی غلام معین الدین صاحب، مولوی سید قادر صاحب

" منظور احمد صاحب، " محبوب علی صاحب مدرس۔

اس سال امتحانات کے شرکاء کی تعداد (۱۰۰) اور کامیابوں کی تعداد بہ شمول اناث حسب تفصیل ذیل رہی۔

اردو عالم۔ شریک (۵) کامیاب (۳)

زبان دانی۔ " (۱۸) غیر حاضر (۲) کامیاب (۱۲)

اردو دانی میں (۷۵) شریک (۵۲) کامیاب

گویا بہ حیثیت مجموعی جملہ امتحانات میں کامیابوں کی تعداد (۶۷) رہی۔

حسب سالہائے ماسبق اس سال بھی امتحانات مدرسۂ وسطانیہ اسٹیٹ کلیانی میں لئے گئے۔ مولوی عبدالحفیظ صاحب صدیقی بی اے ایس سی بہ حیثیت صدر نگران بلدہ سے تشریف لائے تھے اور بہ حیثیت رفیق کار مولوی عبدالصمد صاحب صدیقی بھی آپ کے ساتھ تھے مقامی نگرانوں میں حسب ذیل حضرات قابل ذکر ہیں:۔

(۱) مولوی خلیل احمد صاحب نوری صدر مدرس (۲) مولوی عبدالکریم صاحب وکیل و شریک معتمد شاخ ہذا (۳) مولوی غلام معین الدین صاحب معین رکن تشہیر (۴) مولوی قاضی الدین صاحب قاضی مددگار مدرس مدرسہ وسطانیہ (۵) مولوی منیرالدین صاحب منتظم دارالمطالعہ شاخ ہذا (۶) مولوی محبوب علی صاحب مدرس انجمن اسلامیہ۔

یہ امر باعث مسرت ہے کہ ان امتحانات سے طبقۂ اناث بھی دلچسپی لے رہا ہے۔ کلیانی میں تعلیم نسواں کا معیار بہت گرا ہوا ہے۔ ان امتحانات کے قیام نے لڑکیوں کو بھی زیور علم سے آراستہ ہونے کا موقع فراہم کرکے ایک اہم کمی کی تلافی کردی ہے ۱۹۴۱ء میں اردو دانی میں صرف (۲) طالبات شریک تھیں مگر ۱۹۴۲ء میں یہ تعداد بڑھ کر (۱۹) تک پہنچ گئی جس کی مزید تفصیل یہ ہے:۔

اردو زباں دانی میں شریک (۱۰) غیر حاضر (۱) کامیاب (۳)

اردو دانی میں " (۹) کامیاب (۹)

دارالمطالعہ شاخ کے تحت ایک دارالمطالعہ قائم ہے جس سے کلیانی کی پبلک استفادہ کرتی ہے اس میں حسب ذیل اخبارات و رسائل آتے ہیں:۔

رہبر دکن، دین دنیا، سب رس، ہماری زبان

کتب کی تعداد (۱۸۳) ہے ان میں کچھ تو مرکزی ادارۂ ادبیات اردو کی عطیہ ہیں اور کچھ مقامی علم دوست حضرات کے۔ عالیجناب نواب سید محمد جمال الدین حسین خاں بہادر دام اقبالہ والی اسٹیٹ کلیانی و سرپرست شاخ ہذا نے دارالمطالعہ کو شہرستان تا جی گلدستہ مرحمت

فرماتے ہوئے اس کو باب الفیض سے یاد فرمایا دارالمطالعہ کے منتظم مولوی منیرالدین صاحب ہیں ناظرین کی تعداد سال ۱۳۵۱ف میں (۵۶۲۳) رہی۔

شعبہ طلبہ اس شعبہ کے معتمد مولوی منظور احمد صاحب اردو عالم ہیں اس کے تحت ایک دارالتقریر قایم ہے جس میں طلبہ مختلف عنوانات پر اظہار خیال کرکے قوت تقریر بڑھاتے ہیں اس وقت تک کئی تقاریر ہو چکی ہیں بعض لڑکے اچھا بولنے لگے ہیں۔ اگر یہی سلسلہ جاری رہا تو یہ شعبہ کلیانی میں اچھے مقرر پیدا کردے گا۔

مجلس انتظامی شاخ کلیانی کی مجلس انتظامی حسب ذیل اشخاص پر مشتمل ہے :-

معتمد۔ محمد عطاء اللہ عطا منتظم پیشی نواب صاحب کلیانی

شریک معتمد۔ مولوی عبدالکریم صاحب وکیل

منتظم دارالمطالعہ۔ مولوی منیرالدین صاحب

رکن تشہیر۔ مولوی غلام معین الدین صاحب معینؔ

رکن مراسلات۔ مولوی تمیزالدین صاحب صیغہ دار دفتر پیشی اسٹیٹ کلیانی

دیگر اراکین۔ مولوی قاضی الدین صاحب۔ مسٹر ترل راؤ صاحب عبدالرحمن صاحب اہلکار پیشی۔

یہ امر موجب فخر ہے کہ اس شاخ کو عالیجناب نواب صاحب بہادر کی سرپرستی کی عزت حاصل ہے۔ اور قبل ازیں تقسیم اسناد کے ۲ جلسوں کی صدارت آپ نے بہ نفس نفیس فرمائی خوشی کی بات ہے کہ یہ تیسرا جلسہ بھی جناب مولوی خلیل اللہ شریف صاحب تعلقدار کی زیر صدارت منایا جارہا ہے۔ شاخ ہذا کو مولوی سید سبط نبی صاحب بی اے۔ ال ایل بی۔ منصف کی خصوصی ہمدردیاں بھی حاصل ہیں۔ توقع ہے کہ ہماری یہ شاخ مقامی عہدہ دار اور معززین اور علم دوست حضرات کے تعاون و توجہات سے شاہ راہ ترقی پر گامزن ہوتی جائیگی اور اس کا مستقبل ماضی سے شاندار ہوتا جائے گا۔ اللہم زد فزد

اس سال ماہ مہر میں امتحانات منعقد ہوں گے اور کلیانی کو مرکز قرار دیا جائے گا۔ علم دوستوں سے توقع ہے کہ وہ اپنے اعزہ و احباب کو ادارہ کے امتحانات میں شریک ہونے کی ترغیب دیں گے فیس کے داخلہ کی آخری تاریخ ۵ امرداد ۱۳۵۱ف ہے جو بالکل قریب آچکی ہے۔ اردو امتحانات کی ترویج ہر محب اردو کا فرض ہونا چاہئے۔

محمد عطاء اللہ

اُردو انسائیکلوپیڈیا کا کام ادارے کا یہ شعبہ خاموشی کے ساتھ مسلسل کام کرتا چلا آرہا ہے اور اس کا کام ایسا نہیں ہے جس کا نتیجہ جلد برآمد ہوسکے۔ فی الحال پہلی جلد کی طباعت کا کام دارالطبع سرکار عالی میں شروع ہو چکا ہے۔ اب تک طباعت اور کتابت کا مسئلہ پیچیدہ ثابت ہو رہا تھا۔ خدا کا شکر ہے کہ یہ مشکل اب آنریبل مولوی غلام محمد صاحب سی آئی ای صدرالمہام فینانس کی ذاتی دلچسپی کی وجہ سے حل ہوگئی ہے اور ابتدائی تقریباً پچاس صفحات کا مسودہ پریس کو جا چکا ہے اور توقع ہے کہ دیر سویر اُردو دنیا کی یہ دیرینہ آرزو پہلی جلد کی مطبوعہ صورت میں تکمیل پاسکے گی۔

اس اثنا میں دوسری جلدوں کے متعلق ضروری کام برابر ہو رہا ہے اور دقت طلب مسائل رفتہ رفتہ آسان بنتے جارہے ہیں۔

طب مغربی کے اسماء و مصطلحات کا کام عرصے سے جاری تھا۔ چنانچہ ڈاکٹر محمد عثمان خاں صاحب رکن دارالترجمہ جامعہ عثمانیہ اس کے لئے اپنا بڑا وقت صرف کرتے رہے ہیں۔ خوشی کی بات ہے کہ یہ کام بھی اب مکمل ہو چکا ہے۔

انجینیری کے اسماء و مصطلحات کی ترتیب و تشکیل کا کام کئی سال سے مولوی سید عارف الدین صاحب چیف انجینیر و معتمد تعمیرات سرکار عالی کے زیر نگرانی تکمیل پاتا رہا۔ اور مولوی ضیاء الدین صاحب ایم اے۔ بی ایس سی آنرز انجینیر و پروفیسر عثمانیہ انجینیرنگ کالج نے اس کام میں ادارے کا ہاتھ بٹایا۔ اور جب انجینیری کے جملہ شعبہ جات کی فہرستیں مکمل ہو چکیں تو نظر ثانی کے لئے مولوی اسداللہ صاحب معتمد محکمۂ سمنٹ و فولاد سرکار عالی نے اس پر

بڑی محنت کے ساتھ نظر ثانی کی۔

تعلیمیات کا کام مولوی محمد سجاد مرزا صاحب ایم اے (کینٹب) پرنسپل عثمانیہ ٹریننگ کالج کے زیر نگرانی تکمیل کو پہنچ رہا ہے۔ اور صاحب موصوف نے مختلف اصحاب سے مقالہ نگاری کا کام بھی شروع کرا دیا ہے۔

یونانی اور رومی دیومالا۔ یا صنمیات کی فہرستیں مولوی خواجہ یوسف الدین صاحب ایم اے۔ پروفیسر عثمانیہ ٹریننگ کالج نے مرتب کی تھیں جس پر پروفیسر حسین علی خاں صاحب صدر شعبۂ انگریزی و پرووسٹ جامعۂ عثمانیہ نے نظر ثانی کر لی ہے۔

ہندو عقائد اور دیومالا کی تفصیلی فہرستیں پنڈت گنڈے راؤ صاحب ناظم سمستان گدوال نے مرتب کر کے روانہ فرمائی تھی جن پر نظر ثانی کا کام قریب الختم ہے

مشاہیر سرحد سے متعلق بعض ہستیوں پر مقالہ نگاری کا ذمہ خان شاہ عالم خاں صاحب ناظم تعلیمات صوبۂ سرحد اپنی نگرانی میں مکمل کرا رہے ہیں۔ اور توقع ہے کہ پہلی جلد سے متعلقہ مقالے قریب میں وصول ہو جائیں گے۔

شعبۂ اردو انسائیکلوپیڈیا کے معتمدین مولوی فیض محمد صاحب صدیقی اور مولوی سید بادشاہ حسین صاحب لائق مبارک باد ہیں کہ ان کی کوششیں بار آور ہو رہی ہیں۔

ادارے کی جدید مطبوعات پہلے اطلاع دی گئی تھی کہ ہندستانی تمدن، سچ کا جادو اور باتیں زیر طبع ہیں.

اس اثناء میں یہ کتابیں چھپ چکی ہیں اور ان کے علاوہ اور بھی کتابیں ادارے نے باوجود کاغذ کی گرانی اور طباعت کی مشکلات کے چھپوا کر شائع کی ہیں۔ ان میں سے ہر ایک کا مختصر تذکرہ درج ذیل ہے۔

ہندستانی تمدن۔ جلد اول یعنے قدیم ہند کی زندگی کے تمدنی محرکات۔ از۔ ایشوا ٹوپا۔ ڈی فل (فرائبرگ) ریڈر تاریخ تمدن ہند جامعۂ عثمانیہ۔ صفحات ۲۴۰۔ قیمت ۸؎

اس کتاب میں حسب ذیل دس باب ہیں۔

۱۔ قدیم ترین تمدن۔ ۲۔ آریا اور ان کا تمدن۔ ۳۔ پروہت کا تمدن۔ ۴۔ روحانیت کا فلسفہ۔ ۵۔ سماجی نظام کا آغاز۔ ۶۔ انسان کی تہذیب۔ ۷۔ سیاست اور تمدن۔ ۸۔ بدھی فن کاریت۔ ۹۔ دنیادار عقیدت مند انسان اور اس کا زمانہ۔ ۱۰۔ تمدن کا احیاء۔

سچ کا جادو۔ ایک تعلیمی و اخلاقی سبق آموز ڈراما۔ از علی بن عبد الجیب الحضرمی صاحب مدرس مدرسۂ فوقانیہ زرل۔ صفحات ۷۴ قیمت ۴ر

اس میں گیارہ مناظر ہیں جن میں ایک طالب علم کی سچائی اور اس کی وجہ سے زندگی میں کامیابی دکھائی گئی ہے۔ یہ کتاب ادارے کے مجلس ادبیات اطفال کی طرف سے شائع ہوئی ہے۔

باتیں۔ از مولوی شجاع احمد صاحب قائد صفحات ۴۸ قیمت ۲ر

سچ کے جادو کی طرح یہ کتاب بھی ادارے کی مجلس ادبیات اطفال کی طرف سے شائع کی گئی ہے اور اس میں مولوی شجاع احمد صاحب قائد نے بچوں اور طلبہ کے لئے بات چیت کے انداز میں ضروری معلومات اور دلچسپ باتیں بیان کی ہیں۔ اس میں حسب ذیل چھے مضمون ہیں۔

۱۔ طلسمی آدمی۔ ۲۔ مشینیں۔ ۳۔ کھانا پانی۔ ۴۔ دادا جان کی نقل۔ ۵۔ فقیر۔ ۶۔ دعائیں۔

نواب افضل الدولہ بہادر آصف جاہ پنجم۔ از مولوی سید مراد علی صاحب طالع۔ صفحات ۳۲۔ قیمت چار آنے۔

یہ سلاطین آصفیہ کی سوانح عمریوں کے سلسلے کی کتاب ہے جس میں حضرت آصف جاہ پنجم کے بارہ سالہ دور حکمرانی کے واقعات اجمال کے ساتھ حسب ذیل عنوانات کے تحت بیان کئے گئے ہیں۔

۱۔ پیدائش اور بچپن ۲۔ تعلیم و تربیت ۳۔ تخت نشینی۔ ۴۔ انتظام سلطنت۔ ۵۔ رعایا پروری۔ ۶۔ سخاوت۔ ۷۔ ہمدردی۔ ۸۔ علمی سرپرستی۔ ۹۔ سیرت۔ ۱۰۔ انتقال۔ ۱۱۔ اولاد۔ ۱۲۔ اس عہد کے بعض مشہور واقعات۔

طبیعیاتی کائنات - از پروفیسر سید محمد علی خاں صاحب بی اے - اے آر سی ایس - بی ایس سی - آنرز (لندن) صدر شعبۂ طبیعیات نظام کالج حیدرآباد۔ صفحات ۷۶ قیمت آٹھ آنے۔

یہ کتاب ادارے کے شعبۂ سائنس کی طرف سے شائع ہوئی ہے۔ جس میں سائنس کے اعلیٰ مسائل کو عام فہم انداز میں پیش کیا گیا ہے۔ اور اس کا پیش لفظ ملک کے مشہور ماہر سائنس مولوی محمد عبدالرحمٰن خاں صاحب سابق صدر کلیۂ جامعۂ عثمانیہ نے قلمبند کیا ہے۔ یہ کتاب چار حصوں میں تقسیم کی گئی ہے جن کی تفصیل یہ ہے۔

حصہ اول۔ ۱۔ طبیعیات۔ ۲۔ زمین۔ ۳۔ سورج۔ ۴۔ چاند۔ ۵۔ ستارے۔ ۶۔ آسمان۔

حصۂ دوم۔ ۱۔ حرارت۔ ۲۔ حرحرکیات۔ ۳۔ مادہ۔ ۴۔ نظریۂ تحرک ۵۔ نور۔ ۶۔ برقی مقناطیسی نظریہ۔ ۷۔ ایتھر۔ ۸۔ نظریۂ اضافیت۔

حصۂ سوم۔ ۱۔ آواز۔ ۲۔ طیف نمائی۔ ۳۔ منفی اور مثبت شعاعیں۔ ۴۔ لاشعاعیں۔ ۵۔ تاب کار شعاعیں۔ ۶۔ کائناتی شعاعیں۔

حصۂ چہارم۔ ۱۔ جوہر۔ ۲۔ الکٹرون۔ ۳۔ پروٹون۔ ۴۔ جوہری نظریہ۔ ۵۔ طیوف کی توجیہہ۔ ۶۔ کوانٹم نظریہ۔ ۷۔ موجی میکانیات ۸۔ نئے ذرات۔

تعلیم کا مسئلہ - از ڈاکٹر رضی الدین صاحب صدیقی ایم اے پی ایچ ڈی۔ ڈی ایس سی۔ پروفیسر ریاضی جامعۂ عثمانیہ۔ صفحات ۹۶۔ قیمت ۸/۔

اس کتاب میں مسئلہ تعلیم کے متعلق حسب ذیل عنوانات کے تحت مفید معلومات درج ہیں۔

۱۔ تعلیم و تربیت کا مقصد۔ ۲۔ تعلیم کی مدت۔ ۳۔ موجودہ نظام تعلیم کے نقائص۔ ۴۔ اعلیٰ تعلیم کا صحیح نصب العین۔ ۵۔ علم کی وحدت۔ ۶۔ انسانی وحدت کی تعلیم ۷۔ ایمان اور علم۔ ۸۔ ابتدائی اور ثانوی تعلیم ۹۔ فنی تعلیم ۱۰۔ تعلیمی منزلیں اور نصاب۔ ۱۱ جامعہ کے شعبہ جات۔ ۱۲۔ طالب علم اور عملی سیاسیات۔

زیر طبع کتابیں ادارے کی طرف سے حسب ذیل کتب زیر طبع ہیں۔ (۱) "مغربی یورپ کے تاثرات"۔ از پروفیسر ہارون خاں صاحب شروانی ایم اے۔ بار ایٹ لا صدر شعبۂ تاریخ جامعۂ عثمانیہ۔ (۲) "زہریلے پودے"۔ از مولوی محمد عبدالسلام صاحب ایم ایس سی لکچرار نباتیات جامعۂ عثمانیہ۔ (۳) "رفیق اُردو داں"۔ از مرزا عصمت اللہ بیگ صاحب۔ (۴) "تعلیم بالغاں"۔ از مولوی زاہد حسین صاحب بی اے۔ ایم ایڈ۔ صدر مدرسۂ مشتی خیرت آباد۔ (۵) "اشوک اعظم"۔ از سید مہدی جعفری صاحب۔ (۶) "تذکرۂ اردو مخطوطات (جلد اول)" از ڈاکٹر سید محی الدین صاحب قادری زورؔ (۷) "میر محبوب علی خاں غفراں مکاں آصف جاہ سادس"۔ از مولوی سید مراد علی صاحب طالعؔ اردو فاضل۔

ادارے کی شاخیں ادارۂ ادبیات اردو کی جو شاخیں اضلاع کے مختلف مقامات میں اردو کی خدمت انجام دے رہی ہیں ان کے مساعی خدا کے فضل سے بہت اچھے نتائج پیدا کر رہے ہیں۔ چنانچہ ان کی مصروفیتوں کی روئدادیں پابندی کے ساتھ ادارے کو وصول ہوتی رہتی ہیں۔ لیکن افسوس ہے کہ چند ماہ سے عدم گنجائش کی بناء پر ان کو سب رس میں شائع نہیں کیا جا سکا۔ آئندہ تلافی کی کوشش کی جائے گی۔ امید ہے کہ ہمارے اضلاع کے احباب ہماری اس مجبوری کو پیش نظر رکھ کر ہمیں معاف فرما دیں گے۔ ان کی کوششوں اور جذبۂ خدمت گزاری کی ہم دل سے قدر کرتے ہیں۔

نئی شاخیں اس اثناء میں حسب ذیل مقامات میں ادارے کی نئی شاخیں قائم ہوئی ہیں اور باضابطہ قیام شاخ کے اجازت نامے منجانب ادارہ روانہ کئے جا چکے ہیں۔

۱۔ جولہ نظام الدین تعلقہ پرینڈہ: صدر۔ سید کریم الدین صاحب معتمد محمد معین الدین صاحب صدیقی صدر مدرس۔ ارکان۔ سید رفیع الدین صاحب۔ منوہر راؤ صاحب۔ کو ٹھنڈرلو صاحب۔

پربھاو راؤ صاحب ۔ سکھا رام صاحب۔

۲۔ کریم نگر۔ اس شاخ کے کام میں رفیع الزماں صاحب پرائز کنٹرول انسپکٹر ۔ محبوب خاں صاحب منتظم پولس۔ سید عبدالرزاق صاحب انسپکٹر آبکاری وغیرہ دلچسپی لے رہے ہیں۔

۳۔ ناگر کرنول ۔ اس شاخ کے کام احمد اللہ حسینی صاحب جاگیردار ۔ حکیم شیخ منصور علی صاحب وکیل اور شفاق حسین صاحب مستاجر جنگلات کی دلچسپی سے انجام پا رہے ہیں۔

۴۔ ایوت محل (برار) جس کی مجلس انتظامی حسب ذیل اصحاب پر مشتمل ہے :۔

صدر ۔ مولوی نور محمد صاحب ایم اے ۔ ایل ایل بی وکیل۔

نائب صدر ۔ مولوی محمد ظفر اللہ صاحب رئیس ایوت محل ۔

معتمد ۔ محمد خلیل الرحمن صاحب۔ نائب معتمد۔ مولوی عبدالغنی صاحب قریشی ۔

ارکان ۔ مولوی نعیم اللہ خاں صاحب ۔ مولوی عظیم بخش صاحب ۔ مولوی محمد عبدالسمیع صاحب ۔ مولوی عبدالحکیم صاحب۔ مولوی حفیظ الرحمن صاحب ۔ مولوی حفیظ اللہ خاں صاحب ۔

۵۔ کھام گاؤں (برار) حسب ذیل علم دوست اصحاب کی دلچسپی سے شاخ کا قیام عمل میں آچکا ہے ۔ اور اردو کی ترقی وترویج ہو رہی ہے۔

مولوی مشتاق احمد خاں صاحب بی ایس سی ۔ بی ٹی ۔ مولوی شیخ محمد رمضان صاحب بی اے ۔ مولوی محمد خلیل اللہ صاحب بی اے ۔ مولوی محمد زین الحق صاحب ندوی مولوی فاضل، دبیر کامل ۔ مولوی محمد حفیظ اللہ خان صاحب بی اے ۔

ادارۂ ادبیات اردو کا کام دوسروں کی نظر میں

الہ آباد سے ڈاکٹر سید محمود کی نگرانی میں ایک موقر رسالہ نئی زندگی شائع ہوتا ہے جس کے شمارے بابت اگست ۱۹۴۳ء میں ادارے کی روداد بابت ۱۹۴۲ء پر جو ضخیم تبصرہ شائع ہوا ہے اس کے فردی اقتباسات درج ذیل ہیں :۔

"ادارۂ ادبیات اردو حیدرآباد دکن نے حال میں اپنی سالانہ روداد شائع کی ہے جس میں اپنی مختلف جلسوں، شعبوں اور شاخوں کی ان خدمات کا مجمل خاکہ پیش کیا ہے ۔ جو ۱۹۴۲ء میں اس ادارے کے ذریعہ انجام پائی ہیں ۔

یہ روداد اس ادارے کے بارھویں سال کی ہے جس سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ ادارے نے اپنی زندگی کا ایک مجگ گزار لیا ہے ۔

اگرچہ اس ادارے کا دائرۂ عمل ممالک محروسہ حیدرآباد کے اندر محدود ہے پھر بھی اس امر سے انکار نہیں کیا جا سکتا کہ اس ادارے نے زبان اردو کی چند نہایت ہی بنیادی خدمات انجام دی ہیں ۔

اس وقت اس ادارے کو حیدرآباد کے چوٹی کے عائدین کی حمایت حاصل ہے ۔ اور ایک حد تک حکومت کی سرپرستی بھی ۔ پھر قدرت نے بھی ادارے کی اس معاملے میں بڑی فیاضی سے مدد کی ہے ۔ یعنی جامعۂ عثمانیہ نے جو ہر فن کے یگانۂ روزگار لوگوں کو جمع کر رکھا ہے وہ سب کے سب ادارہ کو مفت مل گئے ہیں اور جناب زورؔ ان سبھوں سے بیگاری لیتے رہتے ہیں ۔ ہمارے خیال میں کام کرنے سے زیادہ مشکل دوسروں سے کام لینا ہے اور یہ سلیقہ بہت کم لوگوں میں ہوتا ہے ۔ لیکن ڈاکٹر محی الدین زور صاحب کام کرنا اور کام لینا دونوں ہی فنون سے آگاہ ہیں ۔

ادارۂ ادبیات نے اپنا کام بارہ مختلف شعبوں پر تقسیم کیا ہے۔ ان میں سے ہر ایک شعبہ کسی نہ کسی ماہر فن کے زیر نگرانی ہے اور اپنے فرائض انجام دے رہا ہے ۔

ادارہ اس سال کاغذ کی دقتوں کے باوجود آٹھ مفید کتابیں شائع کر سکا ہے ۔

(۱) نگارستان فارسی (۲) بلاغت (۳) نظام علی خاں آصف جاہ ثانی

(۴) سکندر جاہ آصف جاہ ثالث (۵) کشمش نانی ۔

(۶) عرب اور عربستان (۷) آریائی زبانیں اور (۸) شاد اقبال

رسالہ سب رس اور بچوں کا سب رس بھی برابر نکلتا رہا اور ان میں بدستور مفید مضامین شائع ہوتے رہے۔

اس وقت ساری ریاست میں ادارے کی ۴۲ شاخیں قائم ہیں جن کا دائرہ عمل فی الحال پڑھے لکھے لوگوں کی خواندگی کو برقرار رکھنے کے لئے کتب خانے اور دارالمطالعے قائم کرنے تک محدود ہے ۔

زبان کی ترقی کے لئے جو انجمن قائم ہو اس کے لئے کتابیں چھاپنے سے زیادہ ضروری ان کتابوں کے پڑھے جانے کے لئے مناسب فضا پیدا کرنا ہے ۔

بہرحال ہمیں مسرت ہے کہ ادارۂ ادبیات اُردو ۔ انجمن ترقی اُردو (ہند) کے برخلاف نہ صرف کتابیں چھاپتا ہے بلکہ ان کے لئے مناسب فضا پیدا کرتا ہے۔ شعبۂ امتحانات نے ایک کورس مقرر کردیا ہے اور اس کورس پر وہ اپنے باقاعدہ قانون کے مطابق اُردو دانی ' اردو زبان دانی ' وغیرہ کے امتحانات لیتا ہے۔ اور لوگوں کو سندیں دیتا ہے ۔

رپورٹ مذکور سے معلوم ہوتا ہے کہ ادارے نے اس قسم کے امتحانات میں شامل ہونے والے طلبہ کو سندیں تقسیم کیں جو بجائے خود ایک بہت بڑا کام ہے ۔

ہمارے خیال میں ادارۂ ادبیات اُردو کا سب سے بڑا کارنامہ اُردو انسائیکلو پیڈیا کی تدوین و تکمیل ہوگی ۔ بشرطیکہ یہ کام پورا ہوگیا ۔ کیونکہ ہمیں اس کام کی تکمیل ہی میں شک ہے ۔ یہ اس لئے نہیں کہ اس کی تکمیل کے لئے مناسب اہلیت موجود نہیں بلکہ اس لئے کہ اتنے بڑے عظیم الشان کام کے لئے جس قدر سرمایہ کی ضرورت ہے وہ شاید مہیا نہ ہوسکے ۔

سب سے آخر میں مجھے ادارۂ ادبیات اُردو کی جس امر میں تعریف کرنی ہے وہ یہ کہ حیدرآباد کی روایات کے برخلاف اس نے اپنی تحریروں کی زبان نسبتاً کم سخت اغلام رکھی ہے ۔ حیدرآباد اس معاملے میں اب کافی بدنام ہوچکا ہے اور وہ دن دور نہیں جب ہندستان کی فہرست میں حیدرآبادی اُردو بھی شامل کردی جائے ''۔

اُردو دانی کا امتحان متعدد امیدواروں اور ارباب ذوق کی استدعا کو پیش نظر رکھ کر اور ملک میں تعلیم بالغان کی مہم کو آگے بڑھانے کی خاطر ادارہ کی مجلس اردو امتحانات نے طے کیا تھا کہ سال حال سے صرف اردو دانی کا امتحان سال میں دو بار لیا جائے ۔

چنانچہ بروقت اس کا اعلان کردیا گیا تھا اور درخواستیں وصول ہونے کی آخری تاریخ ، دی ۱۳۵۳ف م ۱۲ر نومبر ۱۹۴۳ء مقرر کی گئی تھی ۔

خوشی کی بات ہے کہ اب تک (۱۰۹) امیدواروں کی درخواستیں اور فیس وصول ہوچکی ہے ۔ نیز توقع ہے کہ حیدرآباد ' اورنگ آباد ' نظام آباد اور بمبئی کے علاوہ اور دوسرے مقامات پر بھی ۲۴ یا ۲۵ ڈسمبر کو اُردو دانی کا دوسرا امتحان لیا جائے ۔ ٹھیک تاریخ کا ابھی تعین نہیں ہوا ہے بعد میں اطلاع دی جائے گی ۔

جلسۂ تقسیم اسناد چونکہ اس سال اردو دانی کا دوسرا امتحان ماہ ڈسمبر میں لیا جارہا ہے اور ۱۹۴۳ء کے دونوں امتحانوں کے کامیاب امیدواروں کی اسناد کا ایک ساتھ تقسیم کیا جانا مناسب ہے اس لئے تقسیم اسناد کا جلسہ بعد ایام عید یعنے ماہ ربیع الاول ۱۳۶۳ھ مطابق ماہ مارچ ۱۹۴۴ء میں منعقد کیا جائے گا ۔

ادارہ

دلچسپ تاریخی کتابیں

تاریخ گولکنڈہ حیدرآباد کے مشہور مورخ اور جامعہ عثمانیہ کے معلم تاریخ پروفیسر عبدالمجید صاحب صدیقی ایم اے۔ ایل ایل بی نے سلاطین قطب شاہیہ کی نہایت مستند اور مبسوط تاریخ قلمبند کی ہے جس میں گولکنڈہ اور اس کے آس پاس کی سلطنتوں کے تعلقات، دکن کا تمدنی ارتقاء، بادشاہوں اور امیروں کے حالات، لڑائیاں، علم وفضل کی سرپرستی غرضکہ ہر پہلو پر قدیم نادر اور قلمی تاریخوں کی مدد سے روشنی ڈالی ہے۔

بڑی سائز ۳۲۵ سے زیادہ صفحات قیمت ہیر

مقدمۂ تاریخ دکن پروفیسر عبدالمجید صاحب صدیقی نے نہایت تحقیق اور محنت سے مرتب کی ہے اس میں سرزمین دکن کے پچیس حکمران خاندانوں کے آغاز، ارتقاء عروج اور زوال کے متعلق تعارفی معلومات کے علاوہ حکمرانوں کا پورا شجرۂ نسب اور حکمرانوں کی تاریخیں بھی قلمبند کردی گئی ہیں۔

متوسط تقطیع ۱۴۴ صفحات۔ قیمت عہ

میر محمد مومن عہد محمد قلی قطب شاہ و سلطان محمد قطب شاہ میں پیشوائے سلطنت اور وزیر مطلق تھے۔ دنیوی عروج کے علاوہ ان کی مذہبی سیادت و فضیلت بھی بہت مشہور ہے۔ انھوں نے ہزارہا روپے کے صرفے سے ایک دائرہ بنایا تھا جس میں خاک کربلائے معلیٰ بچھادی تھی۔ اور یہ دائرہ اب تک "دائرہ میر مومن" کے نام سے حیدرآباد میں مشہور و معروف ہے۔ میر محمد مومن صاحب اعلیٰ پایہ کے فارسی شاعر بھی تھے اور حیدرآباد آنے سے قبل شاہ ایران کے استاد بھی رہ چکے تھے۔ ان کے نہایت تفصیلی اور تحقیقی حالات زندگی اس کتاب میں جناب ڈاکٹر سید محی الدین قادری صاحب زورؔ نے اپنے دلچسپ اور مقبول عام اسلوب میں تحریر فرمائے ہیں۔ تقریباً تین سو صفحات مع تصاویر قیمت عالہ

ریاض مختاریہ حیدرآباد کے بیدار مغز مدارالمہام۔ نواب مختار الملک سر سالارجنگ اول کے حالات زندگی اور کارناموں کو نہایت تفصیل کے ساتھ بیان کیا گیا ہے۔ خاندان، تعلیم و تربیت، دیوانی کا ذکر، مشہور واقعات، تعلیمی و سیاسی خدمات، نظم ونسق سلطنت، غرض حیدرآباد کے گزشتہ حالات پر تفصیلی روشنی ڈالی گئی ہے۔ اس کتاب کے مصنف مولوی میر دلاور علی دانش مرحوم ہیں۔ یہ کتاب اب تک قلمی مسودے کی صورت میں تھی لیکن اب ادارہ کی طرف سے شایع ہو چکی ہے۔ کتابت و طباعت دیدہ زیب صفحات (۴۰۲) قیمت للعہ

ہندوستانی تمدن از پروفیسر ڈاکٹر ایشورا ٹوپا ڈی فل ریڈر تاریخ تمدن ہند جامعہ عثمانیہ۔ یہ تقریباً پانچ سو صفحات کی ایک ضخیم کتاب ہے جس میں فاضل پروفیسر صاحب نے ہندستان کے قدیم تمدن کو دس ابواب میں شرح و بسط اور تحقیق کے ساتھ بیان کیا ہے۔ اس موضوع پر اردو تو کجا کسی اور زبان میں بھی ایسی عالمانہ کتاب اب تک نہیں لکھی گئی تھی۔ جو لوگ قدیم ہندستان سے واقف ہونا چاہتے ہیں اس کو ضرور پڑھیں صفحات (۴۴۰) قیمت ہیر

مشاہیر قندہار دکن اس تذکرہ میں مولوی اکبرالدین صاحب صدیقی ایم اے نے دکن کے مشہور و معروف اور مردم خیز خطۂ قندہار شریف کے معزز خاندانوں اور ان کے باکمال و مایۂ ناز افراد کا اجمالی خاکہ کھینچا ہے۔ پروفیسر عبدالمجید صاحب صدیقی استاد تاریخ جامعۂ عثمانیہ کا بصیرت افروز مقدمہ اس کے ساتھ شائع ہوا ہے۔

قندہار شریف دکن کا بلگرام سمجھا جاتا ہے اور محمد تغلق کے زمانے سے آج تک وہاں کی سرزمین سے بڑے بڑے اولیاء، علماء، شعرا اور

مشاہیر پیدا ہوتے رہے ہیں۔ دکن کے مختلف شہروں اور قصبوں میں قاضیوں، خطیبوں، محتسبوں اور دیگر اہلِ خدمات شرعیہ کے جو خاندان آباد ہیں ان میں سے اکثروں کا تعلق قندھار شریف ہی کے بزرگوں سے ہے اس لئے یہ کتاب دکن کے شرفا اور بزرگوں کا ایک مستند اور مبسوط تذکرہ بھی جا سکتی ہے اور اس کے مطالعہ سے یہاں کی علمی و ادبی چہل پہل کا اندازہ ہو سکتا ہے۔

صفحات ۱۸۴۔ تعداد تصاویر ۹ قیمت عہ۔

نذرِ دکن ادارے کے شعبۂ نسواں کی معتمد محترمہ سکینہ بیگم صاحبہ نے اس مجموعہ کو مرتب کر کے اپنی خوش مذاقی اور ادبی ذوق کا ثبوت دیا ہے، اس مجموعے میں دکن سے متعلق صنفِ نازک کے مضامین اور نظمیں شائع کی گئی ہیں۔ اگرچہ اپنی نوعیت کی پہلی کوشش ہے لیکن بہت کامیاب رہی۔ خواتینِ دکن کا یہ گلدستۂ رنگ و بو تعلیم یافتہ گھرانوں کی زینت بننے کے لایق ہے (۱۰۴) صفحات قیمت ۱۲ر۔

تاریخ ادب و زبان کی کتابیں

تاریخ ادبِ اُردو اردو زبان اور ادب کی کوئی اچھی تاریخ اب تک نہیں لکھی گئی۔ یہ تاریخ صرف طلبہ اور عوام کے لئے لکھی گئی ہے۔ اردو صحافت اور ادب سے دلچسپی رکھنے والے جملہ اصحاب کے لئے تاریخی معلومات کا بہترین ذریعہ ثابت ہوگی۔ چھوٹی تقطیع ۱۷۶ صفحات۔ قیمت ۱۲ر

مدراس میں اُردو مولوی نصیر الدین صاحب ہاشمی نے مدراس میں اُردو کے نشو و نما اور اس کے ارتقاء کی تاریخ پیش کی ہے۔ ہر دور کے شاعروں اور نثر نگاروں کے سوانح حیات اور نمونۂ کلام تفصیل سے درج ہے۔ تاریخ ادب اُردو سے دلچسپی رکھنے والوں کے لئے اس کا مطالعہ بے حد ضروری ہے۔ صفحات ۲۰۰ قیمت مجلد ۱۲ر

اُردو مثنوی کا ارتقاء بڑی عالمانہ و محققانہ کتاب ہے جس کے افادہ اور معیار کے اظہار کے لئے صرف اس کے مصنف پروفیسر عبدالقادر صاحب سروری کا نام ہی کافی ہے اردو شاعری کی تاریخ سے دلچسپی رکھنے والوں کے لئے یہ کتاب ایک نعمت غیر مترقبہ ہے جو اپنے موضوع اور اہمیت کے لحاظ سے نہایت کامیاب کوشش ہے۔ یہ کتاب دس ابواب پر مشتمل ہے جن سے اس کی اہمیت اور تلاش و جستجو کا اندازہ ہو سکے گا۔ بڑی سائز (۲۴۳) صفحات قیمت ۱۲ر

مغربی تصانیف کے اُردو تراجم اس میں مولوی میر حسن صاحب ایم اے نے ان تمام انفرادی اور اجتماعی کوششوں کو ایک جگہ جمع کر دیا ہے جو صدیوں سے اردو زبان کو مالا مال کرنے کے لئے دوسری زبانوں کی کتابوں کو اردو میں منتقل کرنے کے سلسلے میں کی جاتی رہی ہیں۔ یہ تذکرہ نہایت ہی محنت اور تحقیق سے لکھا گیا ہے اس لئے مستند بھی ہے اور مفید بھی نقد ادب اور تاریخی طریقۂ تنقید کے علاوہ ماخذوں کے متعلق معلومات حاصل کرنے میں ایسی کتابوں کی خاص اہمیت ہوتی ہے۔ چھوٹی تقطیع ۱۸۴ صفحات قیمت مجلد عہ

آریائی زبانیں یہ کتاب اردو کی ابتدائی تاریخ اور اس کے ماخذوں کا مستند تذکرہ ہے جس کو خاص ادارہ کے لئے ڈاکٹر سدھیشور ورما صاحب ایم اے ڈی لٹ پروفیسر سنسکرت و لسانیات و صدر کل ہند انجمن لسانیات نے خاص طور پر مرتب کیا ہے۔ صفحات ۱۰۲ قیمت عہ۔

بلاغت یہ کتاب فن شعر و انشاء کے محاسن سے متعلق ضروری معلومات پر مشتمل ہے جس کا پہلا حصہ معانی دوسرا بیان اور تیسرا علم بدیع سے بحث کرتا ہے۔ یہ کتاب اردو ادب سے دلچسپی رکھنے والوں اور خاص کر اردو کے طلبہ کے افادے کے لئے

مولوی سید کلیم اللہ حسینی صاحب، منشی فاضل، مولوی فاضل، اردو فاضل سے مرتب کرائی گئی ہے۔ صفحات (۱۰۵) قیمت مرف عہ

سرگزشت غالب اردو فارسی کے مشہور شاعر و ادیب مرزا اسد اللہ خاں غالب کی حیات، کارناموں اور اعزہ و احباب کا ایک مجمل تذکرہ ہے جس کو ڈاکٹر سید محی الدین صاحب قادری زور ایم اے۔ پی ایچ۔ ڈی (لندن) نے نہایت تحقیق اور محنت سے مرتب کیا ہے۔ طلبہ اور ادب کا مطالعہ کرنے والوں کے لئے بے حد مفید ہے۔ غالب کی تصویر اور خاندانی شجرے بھی شائع کئے گئے ہیں۔ بڑی سائز۔ صفحات ۶۲ کتابت و طباعت و کاغذ اعلیٰ۔ قیمت ۸ر۔

محمد حسین آزاد اردو کے اس بڑے شاعر اور انشا پرداز کے مکمل حالاتِ زندگی اب تک شایع نہیں ہوئے تھے۔ اس کتاب کو محترمہ جہاں بانو بیگم صاحبہ ایم اے لکچرار اردو کلیہ اناث جامعہ عثمانیہ نے نہایت شرح و بسط اور تحقیق کے ساتھ قلمبند کیا ہے یہ کتاب سات ابواب میں تقسیم کی گئی ہے جن میں آزاد کی زندگی، شاعری اور تصانیف سے متعلق مکمل معلومات شامل ہیں۔ مع تصویر آزاد (۲۰۰) صفحات قیمت عال

یوسف ہندی قید فرنگ میں اس کتاب میں محسن بن خبیر صاحب بی اے ایل ایل بی نے غالب کی قید کے واقعہ پر محققانہ نظر ڈالی ہے۔ اس کے مطالعہ سے اس زمانہ کے قیدیوں کی حالت آنکھوں کے سامنے پھر جاتی ہے۔ آخر میں غالب کا ترکیب بند اسیری بھی نقل کیا گیا ہے صفحات ۸۰ قیمت ۸ر

اردو نامہ اس میں اردو ادب سے متعلق ہندوستان کے بہترین انشا پردازوں اور تنقید نگاروں کے معلومات آفریں مضامین اور مقالے درج ہیں جو خاص طور پر لکھوائے گئے۔ اکثر و بیشتر مشہور شاعروں کی غیر مطبوعہ غزلیں اور نظمیں بطور خاص حاصل کرکے شائع کی گئیں۔ ان میں قدیم اور جدید شاعری کے جو نمونے ہیں ان سے اردو شاعری کے مختلف رجحانات کا پتہ لگایا جاسکتا ہے۔ ہندوستان کی مختلف جامعات کے اردو کے پروفیسروں کے حالات زندگی اور علمی خدمات سے اہلِ زبان کو روشناس کرایا گیا ہے، جن کی دماغی محنت اور ایثار سے نوخیز ادیبوں، انشا پردازوں اور شاعروں کی صحت بخش تربیت ہوتی ہے۔ مشاہیر اردو کے غیر مطبوعہ خطوط کو پہلی دفعہ منظر عام پر لایا گیا ہے۔ یہ خطوط اردو ادب میں قابلِ قدر اضافہ ہیں۔ اس میں کئی تصویریں بھی ہیں جو یا تو اردو کے شاعروں، ادیبوں اور محسنوں کی ہیں یا اردو سے تعلق رکھتی ہیں۔ اردو ادب کی تاریخ اور ارتقاء پر ایک جامع اور مفید کتاب ہے صفحات (۲۰۰) قیمت عال

روح غالب اردو اور فارسی کے مشہور شاعر و ادیب مرزا اسد اللہ خاں غالب کی حیات اور کارناموں کی ایک مجمل سرگزشت اور ان کے اردو خطوط کے دلچسپ ادبی حصوں کا انتخاب جس کو جناب ڈاکٹر سید محی الدین صاحب قادری زور نے نہایت محنت اور جانفشانی سے مرتب کیا ہے۔ اس کتاب کا پیش لفظ نواب مہدی یار جنگ بہادر ایم اے (کیمبرج) صدر المہام تعلیمات و معین امیر جامعہ عثمانیہ نے تحریر فرمایا ہے۔

اس کتاب میں سب سے پہلی دفعہ غالب کے خاندان و اعزہ اور ان کے سسرالی اعزہ و اقارب کے دو تفصیلی شجرے بھی شایع کئے گئے ہیں۔

غالب کی فارسی اور اردو تصنیفات کی تفصیل، ان کی نوعیت زمانۂ تصنیف ان کی اشاعت کی تاریخیں غرض تمام ضروری معلومات اس میں شامل ہیں۔ تاریخ ادب کا مطالعہ کرنے والوں کے لئے

یہ کتاب بہت مفید ثابت ہوگی۔

اس میں غالب کے خطوط کے ادبی حصوں کا نہایت نفیس انتخاب کیا گیا ہے تاکہ جو لوگ علمی بحثوں میں الجھنا نہیں چاہتے اور غالب کے شگفتہ اور پاکیزہ اسلوب سے لطف اندوز ہونا چاہتے ہیں وہ بے تکلف ان ادب پاروں سے محظوظ ہوسکیں۔ صفحات (۲۴۰) تعداد تصاویر (۳) کتابت و طباعت نفیس کاغذ اعلیٰ قیمت عاہر

مکتوبات شاد عظیم آبادی

پٹنہ کے مشہور شاعر اور ادیب شاد عظیم آبادی کے غیر مطبوعہ خطوط کا مجموعہ ہے جس کو ڈاکٹر سید محی الدین قادری زور نے نہایت سلیقہ سے مرتب کیا ہے۔ شاد کا زمانہ اردو ادب میں اس لحاظ سے معرکۃ الآرا تھا کہ اس وقت حالی اور سرسید کی تحریکیں شروع ہوگئی تھیں۔ ان تحریکوں کا اندازہ تاریخ سے اس قدر واضح نہیں ہوتا جتنا کہ ادب اور خاص طور پر ایسے خطوط سے ہوسکتا ہے۔ اسی وجہ سے اس کتاب کو غیر معمولی اہمیت حاصل ہے۔ اردو ادب سے دلچسپی رکھنے والوں کے لئے یہ ایک بیش بہا تحفہ ہے چھوٹی تقطیع (۲۰۰) صفحات قیمت عاہر۔

شاد اقبال

اقبال اور شاد دونوں کی ہستیاں محتاج تعارف نہیں البتہ اس خبر سے اردو دنیا میں مسرت کی ایک لہر دوڑ جائے گی کہ علامہ اقبال مرحوم اور مہاراجہ سر یمین السلطنۃ کے درمیان پچیس تیس سال تک جو مسلسل مراسلت ہوتی رہی ہے اس کو اہتمام سے مرتب کیا گیا اور یہ پوری مراسلت ادارۂ ادبیات اردو کی طرف سے شائع ہوچکی ہے۔ اس کے مطالعہ سے اقبال کی زندگی اور کردار کے ایسے پہلوؤں پر روشنی پڑتی ہے جن کے متعلق دوسرے ذرائع سے کوئی علم حاصل نہیں ہوسکتا۔ ان گراں مایہ خطوط کو جناب ڈاکٹر زور صاحب نے اپنے بسیط مقدمہ کے ساتھ مرتب کرکے شائع کیا ہے۔ شاد و اقبال کی نایاب تصاویر بھی شامل ہیں۔ صفحات ۱۷۶ قیمت عاہر

نذرِ ولی

اس میں دکن کی چار ایم۔اے کامیاب خواتین انشا پرداز محترمہ جہاں بانو بیگم صاحبہ محترمہ لطیف النسا بیگم صاحبہ محترمہ نعیم النسا بیگم صاحبہ اور محترمہ نجم النسا بیگم صاحبہ کے دلچسپ مضامین ہیں جو بابائے ریختہ حضرت ولی اورنگ آبادی کے حالاتِ زندگی اور خصوصیاتِ کلام پر نہایت دلچسپ اسلوب میں اور جدید ترین نقطہ نگاہ سے لکھے گئے ہیں۔ ان مضامین میں ولی کی معلومات، ان کے تخیل، ان کے فن شعر اور ذوقِ عرفان کے علاوہ ان کے اسلوب، زبان اور انتخاب الفاظ کے متعلق بھی نہایت مفید اور دلچسپ بحث کی گئی ہے۔ ولی کے متعلق یہ پہلی مستقل اور جامع کتاب ہے۔ اس کا مطالعہ تشنگانِ ادب کی تسلی کا باعث ہوگا۔

صفحات ۲۸۰ طباعت و کتابت نفیس کاغذ اعلیٰ قسم جلد پر دو جگہ سنہری نام قیمت مجلد عاہر

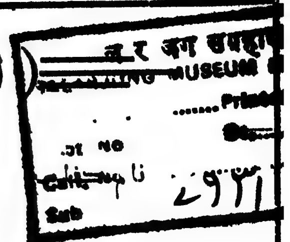
گارساں دتاسی

اردو کے پہلے پروفیسر فرانس کے مشہور مستشرق اور ہندستانیوں کے سچے بہی خواہ کے علمی و ادبی کارناموں، طریقۂ تعلیم، تلامذہ، کتب خانہ، اردو کی حمایت اور تبلیغ کی کوششوں اور اس کے عہد کی یورپ کی درس گاہوں، اردو کے پروفیسروں اور بہی خواہوں کا ایک اجمالی تذکرہ ہے۔ اس کتاب کو جناب ڈاکٹر زور صاحب نے نہایت تحقیق اور جانفشانی سے تالیف کیا ہے۔ طباعت و کتابت دیدہ زیب صفحات (۱۲۸) قیمت عہ

نقدِ سخن

نواب عزیز یار جنگ بہادر عزیز نے حضرت فانی بدایونی کے کلام پر فنی نقطۂ نظر سے سخن ورانہ تنقید کی ہے۔

تعداد صفحات (۱۷۶) قیمت عہ۔



(ادارۂ ادبیات اردو کی کتابیں)

نام کتاب	صفحات	قیمت روپیہ	آنہ	
من کی بینا ...	٨٠	٠	٨	٠
سرگزشت غالب ...	٦٤	٠	٨	٠
نظام الملک ...	٤٠	٠	٤	٠
تاریخ گولکنڈہ ...	٣٣٠	٣	٨	٠
ریڈیو نمبر (٨ تصاویر)	١٦٠	١	٠	٠
ارمغان جذب ...	١٢٠	٠	١٢	٠
سوتیلی ماں ...	٤٨	٠	٤	٠
سرسید احمد خاں ...	١٦	٠	٢	٠
سرسالار جنگ ...	٤٨	٠	٦	٠
مغربی تصانیف کے اردو تراجم...	١٤٥	١	٤	٠
محبت کی چھاؤں ...	١٣٢	١	٤	٠
اقبال نمبر ...	١٦٨	١	٤	٠
سائنس کے کرشمے ...	١١٢	١	٠	٠
شعرائے عثمانیہ ...	٢٣٠	٢	١٢	٠
مکتوبات شاد عظیم آبادی ...	٣٠٠	٢	٨	٠
دادا بھائی ...	١٦	٠	٢	٠
اردو نامہ ...	٢٠٠	٢	٠	٠
ارسطو جاہ ...	٦٥	٠	٦	٠
عماد الملک ...	٤٠	٠	٦	٠
اردو دانی کی پہلی کتاب ...	٥٦	٠	٢	٦
" دوسری کتاب ...	٥٦	٠	٤	٦
محمد حسین آزاد ...	٢٠٠	٢	٠	٠
کاغذ کی ناؤ ...	١٢٠	١	٤	٠
فن تقریر ...	٩٦	٠	٨	٠
مقدمہ تاریخ دکن ...	١٤٤	١	٠	٠
پانی کی کہانی ...	٤٨	٠	٦	٠
رسایل طبیہ ...	٣١٢	٢	٨	٠
سلک گوہریں ...	٤٠	٠	٤	٠
تاریخ ادب اردو ...	١٧٦	١	٤	٠
ورڈس ورتھ اور اسکی شاعری...	١٨٤	١	٤	٠
ہوش کے ناخن ...	٩٤	١	٠	٠
یوسف ہندی قید فرنگ میں ...	٨٩	١	٠	٠

نام کتاب	صفحات	قیمت روپیہ	آنہ	
ٹیگور اور ان کی شاعری ...	١٢٨	١	٤	٠
متاع سخن ...	١٢٤	٠	١٢	٠
کنف سخن ...	١٢٢	٠	١٢	٠
بادۂ سخن ...	١٢٧	٠	١٢	٠
سراج سخن ...	١٥٢	٠	١٢	٠
ایمان سخن ...	١٢٠	٠	١٢	٠
فصص سخن ...	١٤٤	٠	١٢	٠
مرقع سخن جلد اول (٥٥) تصاویر...	٥٠٠	٥	٠	٠
" دوم (٥٠) " ...	٤٣٢	٥	٠	٠
نقد سخن ...	١٧٥	١	٠	٠
نذر ولی ...	٢٤٨	٢	٨	٠
گریہ و تبسم ...	١٩٢	٢	٠	٠
مشاہیر قندھار دکن ...	١٨٤	١	٠	٠
من کی دنیا ...	١٤٥	١	٠	٠
مدارس میں اردو ...	١٩٦	١	٨	٠
محرم نامہ ...	١١٢	١	٠	٠
نذر دکن ...	١٠٤	١	٤	٠
روح غالب ...	٢٤٠	٢	٨	٠
عاصمہ ...	٢٠٠	١	٤	٠
دفتری معلومات ...	٥٦	٠	٦	٠
آبدوز کشتیاں اور سرنگ ...	٤٨	٠	٦	٠
اردو مثنوی کا ارتقاء ...	١٤٣	١	١٢	٠
نمود زندگی ...	٢١٢	١	[illegible]	[illegible]
سرگذشت ادارہ ...	٣٠٤	٠	١٢	٠
میر محمد مومن (٣٤) تصاویر ...	٣١٢	٢	٨	٠
بلقان ...	٣٢	٠	٣	٠
خطابیات ...	١١٢	٠	١٢	٠
علم خانہ داری ...	١٥٠	١	٠	٠
چیونٹی (١٦) تصاویر ...	١١٨	١	٨	٠
انوار ...	١٦٨	١	٨	٠
کشمش ثانی (٤) تصاویر ...	٨٠	٠	١٠	٠
گارساں دتاسی ...	١٢٨	١	٤	

اعظم اسٹیم پریس حیدرآباد دکن



ادارۂ ادبیات اردو حیدرآباد دکن کا ماہ نامہ

نشان ٹپہ آصفیہ ۱۵۳
نشان ٹپہ برطانیہ ایم ۳۹۵۰
ٹیلیفون نمبر ۲۲۰۹
چندۂ سالانہ چار روپے آٹھ آنے
بچوں کا سب رس ایک روپیہ آٹھ آنے
فی پرچہ ۸ ؍

سب رس

جلد ۶ بابت ماہ ڈسمبر ۱۹۴۳ء شمارہ ۱۲

خواجہ حمید الدین بی۔ اے اہتمام سے اعظم اسٹیم پریس میں چھپ کر دفتر ادارہ رفعت منزل خیریت آباد سے شائع ہوا۔

دیسیوں کی جلی بھنی باتیں

ہندو مسلماں دونوں کے دونوں آپس میں تھے بھائی بھائی
پھوٹ نے ان کے بیچ میں پڑ کر آگ لگائی اور بھڑکائی
ایک ہی دیس کے راج دلارے، ایک ہی دیس کے آنکھوں کے تلے
اپنی سمجھ کی پونجی ہارے کرتے ہیں دونوں ہاتھا پائی
کیسی چھچھوری باتیں ہیں ان کی، پھسپھسی ساری گھاتیں ہیں انکی
ایسی اندھیری راتیں ہیں جن میں کچھ بھی نہیں دیتا ہے سجھائی
کہتے ہیں ہندو، یاں کے مسلماں پردیسی، اور دیسی ہمیں ہیں
اپنی سکت کے بل پہ ہمیں نے دیس کی نیّا پار لگائی
ان کے نہیں او سان ٹھکانے، ڈھونڈتے ہیں لڑنے کے بہانے
کہتے ہیں اوروں کو ستانے دیس کی ہے اس میں ہی بھلائی
سب پردیسی جائیں یہاں سے جو بھی ہوں وہ جہاں جہاں کے
بوتے رہتے ہیں ہی کانٹے انکلیں یہ تو ہو ستھرائی
جب سے پرچھاواں پڑا ان کا سارا دیس ہے ہکّا بکّا
لگتی بندھ گئی دیکھ کے ان کو دیس کی مت ایسی بولائی
عرب، عجم میں یہ چلے جائیں، اپنی بستی وہیں بسائیں
بھول کے بھی پھر ادھر نہ آئیں وہیں کمائیں اپنی کمائی
کہتے ہیں یہ سن کے مسلماں، اچھا، پھر تم بھی تو نکلو
آریا بھی تو پردیسی تھے یاں پہ جنھوں نے چھاؤنی چھائی
پودا انہی کی تو تم سب ہو بن گئے کیسے پھر نرے دیسی
اپنے منہ میاں مٹھو بنا کس نے تمھیں یہ چال بتائی
آئے بڑے دیسی یہ کہیں کے ہم سے کہتے ہیں ہم ہیں یہیں کے
جیجوں، سیحوں پہ پہنچی پوچھے تو ان سے کس نے چلائی
دیس کے دیسی سارے کے سارے گونڈ ہیں اور بھیل اور لمبانے
ہم تم دونوں آگے پیچھے آئے یہاں اور دھاک بٹھائی

آپ ہی آپ بنے ہو دیسی، ہم کو سمجھتے ہو پردیسی
ایسوں کی تو ایسی تیسی، جن کے جی میں ہو ایسی بُرائی

کرتے ہیں ایسی ہی تن پھن، آٹھوں پہر ہے ان کی یہی دھن
برسوں سے ان کو لگا ہے وہ گھن، جس سے ہے دیس میں رام دہائی

آپس میں جو کسی نے لتاڑا، جھٹ سے اس نے اس کو پچھاڑا
دیس بنا ہے ایسا اکھاڑا، ہوتی ہے جس میں مار کٹائی

چھوٹی چھوٹی باتوں پہ اڑنا، باتوں باتوں میں لڑ پڑنا
اپنے کرتوتوں پہ اکڑنا کیسی بُری گت اپنی بنائی

دیس کے کونے کونے میں ہے لمبا تڑنگا بگاڑ کا بھوت اب
ہڈیوں کو وہ چبا تا ہے ایسے جیسے کسی نے ککڑی چبائی

کھوپریوں کے مالے ڈالے، دانت نکالے ہنستا ہے ٹھٹھی
اس نے دیس کی سوچ سمجھ بھی اپنی انگلیوں پر ہے نچائی

مسجدیں، مندر پہلے بھی تھے بجتا تھا باجا دونوں کے آگے
رہتے تھے کیسے سب مل جل کے اب ہے اسی پر کیسی لڑائی

کیسی ہوئی ہے ان میں کھٹ پٹ، کیسی لڑاتے ہیں یہ اٹے
ہلڑ کی چھڑیوں کی ٹھاسٹھ ہی نے ان کی سٹی بھلائی

لپاڈکی، دھینگا دھینگی، چھینا جھپٹی، توڑا مروڑی
کوئی بات انھوں نے نہ چھوڑی، میل ملاپ کی ریت مٹائی

مسلم لیگ اور کانگریس ایسی دونوں سبھائیں دیس کی ہیں
راج سے جو بھی مانگ ہے یاں کی اس کی لے ہے انھیں نے بڑھائی

یوں تو دونوں کی ایک ڈگر ہے پھر بھی ادھر اور کوئی ادھر ہے
رتی بھر ایکا ان میں نہیں ہے رہتی ہے دونوں میں چترائی

ایک ہے پورب، ایک ہے پچھم، ایک ہے اُتر، ایک ہے دکھن
دونوں کے جب ایسے ہوں لچھن کیسے ملے پھر ان کو بڑائی

کانگرس اٹھی تھی آندھی بن کے بڑھ نہ سکی تو رہ گئی تھم کے
دھول اڑائی تھی کیسی اس نے جس میں ہے اب تک اٹی اٹائی

الگ الگ جو اَنگ رہے ہیں راج سے دیسی وہ سب سُن کے
کہتا ہے اپنی رام کہانی اک اک نے اب تک جو سنائی
ٹھیک نہیں یہ، سب مل جُل کے جو بھی مانگتا ہو وہ مانگو
دیکھنا پھر تم، ہم نے اپنی دیا کی گنگا کیسی بہائی
ایک ہی بات کہیں وہ کیسے پھوٹ سے ہوں جو ایسے ویسے
راج کے سامنے ہیں سب پیسے گنتا ہے ان کی اک اک پائی
جتنے منہ ہیں اتنی باتیں آتی نہیں ایکے کی گھاتیں
ان کے دن ہیں اور نہ راتیں کالی گھٹا ہے ان پر چھائی
سب کے پھوٹے بھاگ ہیں اب تک کھیلے لگھوئی میں بھاگ ہیں آپ
گا کے دیپک راگ انھوں نے سارے دیس میں آگ لگائی
مانگنے وانگنے سے کیا اب تک راج کسی کے ہاتھ آیا ہے
مانگنا کیسا، ایکا کریں اس کی ڈگر ہے بنی بنائی
تیل اور تیل کی دھار ابھی تک دیکھ رہا ہے راج یہ کب سے
دینا دلانا بھی کبھی ہوگا اب تو بڑھی ہوئی بات دبائی
اور جو ابھی وہ دے بھی دے سب کچھ جب بھی اُٹھا نہ سکے وہ کیسے
ایسے بھاری بوجھ اٹھانے کی سکت ان میں کہاں سے آئی
دیس جو ہے برسوں سے بروگی، دیکھیے کب اچھا ہو یہ رُوگی
مانگتا رہتا ہے ہی جوگی دیسیوں سے ایکے کی ٹھنڈائی
ایکے ہی میں ایسی سکت ہے لوہا لاٹھ جو کر دیتی ہے
اس سے پہاڑ بھی ٹکر کھا کر ہو جاتا ہے رائی رائی
ایکا نہ ہونے ہی سے کیسے بھوکے، کنگلے، ننگے ہیں سب
ایکا نہ ہونے ہی سے ان کی آس کی پھلواری مرجھائی
ایکا نہ ہونے ہی سے ان کی کھیتی باڑی روندی پڑی ہے
ایکا نہ ہونے ہی سے ان کی ہے نہ کمائی اور نہ بٹائی
ایکا نہ ہونے ہی سے کیسے ڈانوا ڈول پڑے پھرتے ہیں
ایکا نہ ہونے ہی سے انھوں نے اپنی سکت کی گھتی گنوائی

آڑ پکڑ کے دھرم کی بھی پاکھنڈ جو پھیلاتے ہیں لوگ
پوچھے تو کوئی ان سے کس نے ایسی پٹی انھیں پڑھائی
اس ڈھب کے جھگڑا لو ہیں سب ایک ہی تھیلی کے چٹے بٹے
یوں تو ہیں وہ ہٹے کٹے، آتما ہے پر گھلی گھلائی
بھید دھرم کا سب سے چھپانا، الگل پچو باتیں بنانا
گلچھرے نئے ڈھب سے اڑانا چال ہے ان کی منجھی منجھائی
جی کا میل کچیل چھڑا کر من کو ستھرا، اجلا بنانا
کلنک کا ٹیکا پھر نہ لگانا ٹھیٹ دھرم کی ہے یہ پڑھائی
جتنے دھرم ہیں، سب ہیں یہ ڈگریں ایک ہی تک پہنچا دینے کی
دھیان کا ہاتھ بھی پہنچے نہ جس تک جگ میں ہے اس کی ایسی اونچائی
دیکھنا بھالنا، سننا، چھونا، سونگھنا، چکھنا، سوچتے رہنا
ساری ہماری پونجی یہی ہے اس سنسار میں جو ہاتھ آئی
یہ سکتیں ہیں ایسی اپاہج کچھ بڑھ سکتیں ہی نہیں آگے
کیا بھلا ناپ سکیں گی اس کے راج کی یہ کچھ بھی اگنائی
آنکھ جھپکنے سے بھی پہلے سب سنسار اسی نے بنا نے
جس نے سوچ سمجھ کی بجلی پھرتی سے ہم میں دوڑائی
مٹی کے پتلوں میں بھر دی گھڑیوں کی سی کوک اسی نے
سانس کی دہری کنجی دے کر ہڈیوں کی یہ گھڑی چلائی
سیکڑوں سنسار اسے نہ مانیں کچھ نہ بگاڑ سکیں گے اس کا
لاکھوں سنسار اسی کو مانیں کچھ نہ بڑھے گی اس کی بڑائی
کیا بڑی بات تھی اس کے آگے سب کو کرتا جو ایک دھرم کا
پر نہ کیا اور سوچ سمجھ ہی اس کی کسوٹی ہے ٹھیرائی
پوچھا پاچھی کے لئے اس نے ایسا اک دن رکھ دیا جس میں
سامنے آجائے گی سب کے ہوگی جو اچھائی برائی
یہ نہیں پوچھا جائے گا، تم کون ہو، پوچھا جائے گا یہ
کیا کیا اب تک کیا لائے ہو، من کی بستی کیسے بسائی

ایک ہی بیڑا سب ہوں اٹھائے، ایک ہی سے جب لو ہوں لگائے
اسی کے پیچھے دھونی رمائے، سب ہوں تو پھر کیسی لڑائی
جو بھی جس کا دھرم ہو اس کا برا سمجھنا ٹھیک نہیں ہے
ٹھیک نہیں کیا، پاپ یہ وہ ہے جس کی بھیانک ہے گہرائی
راجہ، پنڈت، پاپی، بھکاری ایک ڈگر سے آئے ہیں جیسے
ایسے ہی جائیں گے ایک ڈگر سے ٹانڈا لدنے کی جب گھڑی آئی
اس نے تو ایک سا ہم کو بنایا دھیان نے پھر کیسا بھکایا
سیدھی پگڈنڈی سے ہٹ کر اونچی نیچی ڈگر بنائی
آنے دن، ایسی ہی بولی پر بھی بولی ٹھولی ہونے لگی ہے
چیخم چارخ نے اردو، ہندی کی ساری بستی سر پہ اٹھائی
اک بولی میں جتنے ملیں گے بولیوں کے بول آکے بہت سے
اتنی ہی بڑھتی جائے گی اس بولی کی پونجی اور کمائی
رہے گی وہ ٹٹ پونجیا بولی جس کے بول ہوں کچھ گنتی کے
پڑی رہے گی اک کونے میں اپنے جینے سے اکتائی
کوئی بھی ٹھیٹ نہیں رہ سکتی آگے بڑھنے والی بولی
ٹھیٹ وہی رہ سکتی ہے جو بیٹھی رہے سمٹی ممٹائی
اردو ہی دیس کی بولی ہے ایسی جس کے ٹکے کی کوئی نہیں ہے
اسی کی آہٹ سن لو گے تم جہاں کہیں بھی ہانک لگائی
اردو میں جتنی بولیوں کے بول آکے پورے گھلے ملے ہیں
انہی مٹھاسوں کے ملنے سے بن گئی یہ جو چمیل مٹھائی
اس کا یہ چمیل ہی ہونا اسے بڑھاتا ہے اور آگے
بڑھنے کا ڈھب جان گئی ہے جبھی تو ہے اس کی یہ ڈھٹائی
بڑی سکت کی بولیوں سے بھی آنکھ لڑاتی رہتی ہے یہ
بھر کے سپاٹے انہی کے سے یہ ناچتی پھرتی ہے گہرائی
بڑی کٹھن لکھتوں کو پہناتی رہتی ہے کپڑے یہ ایسے
جن کی اسی کے گھر میں ہوتی رہتی ہے دن رات سلائی

گھلے ملے جو بول ہیں اس کا وہی جڑاؤ گہنا ہے سب
بوجھل بولوں کی جھلکی اس نے دیکھی ادھر اور یہ کترائی
دیس کی بولیاں ہیں جتنی بھی اردو ہی مہارانی ہے ان کی
ٹولی میں بولیوں کی ہے اس کی کوئی چھوپھو کوئی کھلائی
اس کا سنگار اور اس کی بھڑک کا نٹا سی کھٹکتی رہتی ہے جاب
اسی کے توڑ پہ اک نئی بولی بننے لگی بگڑی بگڑائی
سنسکرت کی پوتھیوں میں سے دیکھ دکھا کے بوجھل بول اب
ٹھونسے جاتے ہیں اردو میں ان کے جی میں یہ کیا آئی
بھولے بسرے بولوں کی بھرمار لگاتار ایسی ہوئی ہے
جس سے اردو کو چلی آتی ہے اُبکائی پر اُبکائی
پہلے عربی، فارسی بولوں ہی کو نکالا کرتی تھی یہ
اب تو پرانے ہندی بولوں ہی سے نئی ہندی ٹکرائی
"دھوموشلا کا" کیپ؛ بوجھل بول ہے اس نئی ہندی کا
اب کہا جاتا ہے یہی بولو اور نہ بولو دیا سلائی
ایسے بہت سے بول بنائے جاتے ہیں نئی ہندی کے
بیٹھے بٹھائے کیا سوجھی جو نئی اُپج نے لی انگڑائی
ہندی سے کوئی بیر نہیں ہے یہ تو ہے اردو کی ریڑھ کی ہڈی
بیر اسی نئی ہندی سے ہے جس نے ایسی دھول اڑائی
آشا، دشا، سمبندھ، شکشا، ویاکرن، ہردے اور پانی
شکتی، سمپتی، ہتوں، کلاہل، تتھا، ہووے اور کٹھنائی
کنکر پتھر، پیپے میں بھر کر، کھڑ کھڑ جیسے کرتے ہیں لڑکے
ایسے ہی ہندی والوں نے نئی ہندی کی کنڈی کھڑکائی
سوچ سمجھ کے پتلے تھے کیسے اپنی کے وہ اگلے بڑے بوڑھے
ساتھ مسلمانوں کے جنھوں نے اردو کی پوری نیو جمائی
آشرم اس اردو کا کیسے دونوں نے مل کے اونچا بنایا
اردو کی پیت کی پھر جنسی ان دونوں نے کیسے ساتھ بجائی

بڑوں کے کہنے پہ چلنے ہی سے پھولتے پھلتے رہتے ہیں چھوٹے
ان کی ڈگر سے ہٹتے ہی ان کے آگے آتی ہے گہری کھائی

پھوٹ کا بھوت اسے جب سے چمٹا دیس نہیں اپنے آپے میں
اس کی سمجھ پر پڑ گئے پتھر اس کی آنکھیں ہیں پتھرائی

ٹونا کر کے، منتر پڑھ کے، دیس کے سر سے بھوت اتارو
اس کے اترتے ہی نہ رہے گی دیس کی سوچ سمجھ چکرائی

جھگڑے ٹنٹے کا سانپ چھپا ہے جی کے کس کونے کھدرے میں
سب سے پہلے ڈھونڈ نکالو سانپ کی بانبی چھپی چھپائی

بس پھر ناگ کو پھر یوں مارو سانپ مرے اور لاٹھی نہ ٹوٹے
ایکے کی لاٹھی ایک گھڑی میں کرے گی ناگ کو رائی کائی

کر چکے جو اس پر پچھتاؤ، کسی کے بہکاوے میں نہ آؤ
میل ملاپ آپس میں بڑھاؤ ہے یہی جینے کی ٹھیٹ کمائی

گڑ ایکے کا ڈالو گے جتنا میٹھا پن اتنا ہی بڑھے گا
جتنی مٹھاس اس گڑ کی گھٹے گی ڈالے گی پھوٹ اتنی ہی کھٹائی

میل ملاپ ہی سارے جگ میں ایسا چلتا ہوا منتر ہے
گھورا بھی جس سے بن جاتا ہے پھلواری مہکی مہکائی

آس کے پھول اسی سے ہیں کھلتے چین پہ چین اسی سے ہیں ملتے
چونپ امنگ اسی سے بڑھ کر لاتی ہے ساتھ اپنے راجائی

ایک کے دکھ سکھ کو جب اپنا دکھ سکھ دوسرا جی میں سمجھ لے
سُبھ گھڑی دیس کے آگے بڑھنے کی وہی ہو گی کھلی کھلائی

بولی ٹولی، دھرم ورم اور دیسی پردیسی کی جھنجھٹ
پھرتی سے چھوڑو اور نہ توڑو اپنی سکت کی آپ کلائی

ابوالقاسم سرور

اصلاحِ معاشرت!

معاشرت کی تعریف، ہندوستانی معاشرت کی ترکیب

معاشرت کے معنی آپس میں مل جل کر زندگی بسر کرنے کے ہیں۔ اس طرح حیاتِ انسانی کا کوئی شعبہ ایسا نہیں جس پر یہ لفظ حاوی نہ ہو۔ ہمارے موضوع میں اس کی کوئی تحدید نہیں کی گئی ہے کہ معاشرت سے کس ملک یا کس قوم کی معاشرت مراد ہے۔ اس لئے ابتداء ہی میں اس کی صراحت کر دینا ضروری ہے کہ یہاں معاشرت سے ہماری مراد صرف ہندوستان کی معاشرت ہے۔ لیکن خود ہندوستان اتنا وسیع ملک ہے اور اس میں اتنی مختلف قومیں آباد ہیں کہ اس مختصر سے مضمون میں ان سب سے بحث نہیں کی جا سکتی۔ اس لئے ہمیں اپنا دائرہ تنقید ہندوستان کی صرف دو بڑی قوموں یعنی ہندوؤں اور مسلمانوں تک محدود رکھنا پڑے گا اور حقیقت میں دیکھا جائے تو ہندوستانی معاشرت کے اجزائے ترکیبی بڑی حد تک انہی دو قوموں کے رہینِ منت ہیں۔ آج ایک ہزار سال سے یہ دونوں یہاں بس رہے ہیں۔ اس عریض مدت میں غیر محسوس طور پر انھوں نے ایک دوسرے کی بہت سی رسمیں اور عادتیں اختیار کیں اور انہی رسموں اور عادتوں کے امتزاج کا نتیجہ ہندوستانی معاشرت ہے۔ برطانوی تسلط سے جس طرح ہندوستان کی سیاسی تاریخ میں نئے دور کا آغاز ہوا اسی طرح یہاں کی معاشرت میں بھی انقلابِ عظیم ہو گیا۔ اورنگ زیب کی وفات سے لے کر بہادر شاہ کے عہد تک جو مسلمانوں کا دورِ انحطاط ہے، مسلمان اپنی قومی معاشرت کے شدت سے پابند رہے ہیں۔ اور اس میں کسی طرح کی ترمیم کو گناہِ کبیرہ سمجھتے تھے۔ اس جمود کا نام انھوں نے وضعداری رکھا۔ اور غدر ۱۸۵۷ء تک اس پر سختی سے قائم رہے۔ غدر کے طوفانِ حوادث میں جب سلطنتِ مغلیہ کا آخری نشان مٹ گیا تو مسلمانوں کی یہ وضعداری بھی متزلزل ہونا شروع ہوئی اور اس میں روز بروز مغربی تہذیب کا اثر بڑھتا گیا۔

موجودہ زمانہ ہماری معاشرت کا انقلابی دور ہے۔ اس میں مشرقی تہذیب کا اثر گو گھٹتا جا رہا ہے۔ لیکن ابھی مٹا نہیں اور مغربی تہذیب کا رنگ گو بڑھتا جا رہا ہے لیکن ابھی جما نہیں۔ اگر ایک طرف ہماری قدامت پسندی اگلی تہذیب کے منتشر اجزاء کو سمیٹنے کی فکر میں ہے تو دوسری طرف اندھی تقلید مغربی تہذیب کو جوں کی توں منتقل کرنا چاہتی ہے۔ رسم و رواج کی آہنی زنجیریں ہمیں قدیم معاشرت کا پابند رکھنا چاہتی ہیں تو فاتح اقوام کا مقناطیسی اثر ہمیں ان کی ہر ادا کی طرف کھینچتا ہے۔ غرض یہ معاشرتی بدنظمی اور انتشار کا ایسا تاریخی دور ہے جو فاتح اور مفتوح قوموں کے اتصال کے موقع پر دنیا کے اکثر حصوں میں گزر چکا ہے۔ لیکن ایک ایسی معاشرت کو رواج دینے کے لئے جو "خذ ما صفا دع ما کدر" کے زریں اصول پر مشرقی اور مغربی محاسن کے امتزاج سے مرتب کی جائے۔ یہ فضا بہت مساعد ہے۔ کیونکہ ہر نئی عمارت بنانے کے لئے پرانی عمارت کا ڈھانا ضروری ہوتا ہے۔ لیکن جب کسی قوم کی معاشرتی عمارت پہلے ہی کھنڈر ہو رہی ہو تو اس کے ڈھانے کی زحمت سے خود بخود بچ جاتے ہیں۔

دنیا کی کوئی معاشرت کبھی تکمیل کا دعویٰ نہیں کر سکتی۔ عقلِ انسانی جتنی ترقی کرتی جائے گی اتنا ہی ضروریاتِ زندگی بدلتی جائیں گی اور قوانینِ معاشرت میں ترمیم کی ضرورت پیش آئے گی۔ اسی لئے زندہ قوموں کی قوتِ غور و فکر ان کی ضروریاتِ زندگی اور قوانینِ معاشرت کو جلد جلد بدلتی رہتی ہے اور یہ تبدیلی ہمیشہ ان کی ذاتی رائے اور اجتہاد پر مبنی ہوتی ہے۔ اس کے برخلاف مردہ قوموں کی معاشرت پر

ان کی عقلوں کی طرح سخت جمود طاری ہوتا ہے ۔ وہ اپنے رسم و رواج، آئین و عادات اور عقائد و خیالات میں ماضی کے شدت سے پابند ہوتے ہیں ۔ گویا ان کے بزرگوں کی ہڈیاں قبروں سے ان کے افعال و اعمال کی نگرانی کرتی ہیں اور وہ حقیقی معنوں میں "زندہ بدست مردہ" ہوتے ہیں ۔ لیکن جب یہ رو بہ انحطاط قومیں کسی بیرونی فاتح کے زیر اثر آتی ہیں تو ان کا یہ جمود و قدامت پرستی بتدریج کورانہ تقلید سے بدل جاتی ہے ۔ فاتحین کی ہر ادا جس سے انہیں سخت نفرت تھی رفتہ رفتہ بھانے لگتی ہے اور بالآخر وہ اپنی معاشرت کی بنیاد محض اپنے فاتحین کی نقالی پر رکھ دیتے ہیں ۔

(۲) **اصلاح معاشرت کس طرح کی جائے؟ اور اس میں کن امور کا لحاظ رکھا جائے** حقیقت یہ ہے کہ زمانہ معاشرت کا سب سے بڑا مصلح ہے، جو بڑے بڑے گردن کشوں کو بھی نیچا دکھاتا ہے ۔ لیکن اس سے انکار نہیں کیا جا سکتا کہ انفرادی کوششیں رفتار زمانہ کے گھٹانے اور بڑھانے میں بڑا دخل رکھتی ہیں ۔ پس زمانے کی رفتار کے ساتھ قوم کے سربرآوردہ اصحاب کی ذاتی مثال جدوجہد، تعلیم و تلقین اصلاح معاشرت کی ہر کوشش مستحسن نگاہوں سے دیکھی جانی چاہئے اور اس میں ہمیشہ تین امور کو پیش نظر رکھنا چاہئے ۔ ایک صحت جسمانی، دوسرے کفایت شعاری، تیسرے ضروریات زمانہ ۔

(۳) **ہماری معاشرت کے امور اصلاح طلب** میں پہلے عرض کر چکا ہوں کہ معاشرت کا لفظ اس قدر وسیع ہے کہ زندگی کا کوئی شعبہ اس سے باہر نہیں ۔ ظاہر ہے کہ اس مختصر سے مضمون میں ان سب امور کو زیر بحث نہیں لایا جا سکتا ۔ اس لئے ہم صرف چند ضروری باتوں پر اکتفا کریں گے ۔ جن میں سب سے مقدم ہماری سوسائیٹی کی مختلف رسمیں ہیں ۔

مختلف ضروریات زندگی کو انجام دینے کے لئے ہر قوم میں چند خاص طریقے مقرر ہیں جن کی پابندی گو قانون کی رو سے نہیں لیکن باہمی مفاہمت کی بنا پر تمام افراد قوم کے لئے ضروری ہوتی ہے، اسی کا نام رسم و رواج ہے ۔ ہمارا ملک بھی اس سے مستثنیٰ نہیں اور یہاں بھی پیدائش سے لے کر موت تک جتنے مرحلے انسان کی زندگی میں پیش آتے ہیں ان سب کے لئے کچھ نہ کچھ رسمیں ضروری قرار دی گئی ہیں اور ان میں یہ شدت ہے کہ ایک بار ہم تعزیرات کے مجرم کو معاف کر سکتے ہیں ۔ لیکن رسم و رواج کے مجرم کو کہیں پناہ نہیں مل سکتی ۔ اس کا نتیجہ یہ کہ ہر شخص کو مجبوراً وہی کرنا پڑتا ہے جو دوسرے کرتے ہیں ۔ خواہ اس کے ذاتی حالات اس کی اجازت دیں یا نہ دیں ۔ اور خواہ اس کے نزدیک وہ فعل کیسا ہی جہل، مضر اور مضحکہ خیز ہو ۔ حالانکہ آزادی خواہ وہ انفرادی ہو یا اجتماعی، اور خواہ فکری ہو یا عملی تمام خوبیوں اور نیکیوں کا سرچشمہ ہے ۔ اس لئے جہاں تک ممکن ہو اس سے کسی کو محروم نہ کرنا چاہئے ۔ بجز اس کے کہ اس آزادی سے دوسروں کو مضرت پہنچنے کا اندیشہ ہو ۔ اس اصول کے مد نظر ہمیں چاہئے کہ رسوم کی تعداد اور شدت کو جہاں تک ہو سکے کم کریں اور اس کی سب سے موثر تدبیر یہ ہے کہ سوسائیٹی کا اعلیٰ طبقہ جو ساری قوم کے لئے نمونہ ہوتا ہے، تمام ایسی رسموں کو ترک کر دے جو مضر صحت، مخرب اخلاق یا فضول خرچی کا باعث ہوں ۔ اس طرح جس قدر رسمیں کم ہوتی جائیں گی اتنے ہی انفرادی آزادی اور قومی خوش حالی بڑھتی جائے گی ۔ لیکن اس سے انکار نہیں کیا جا سکتا کہ چند رسمیں اور ضرورتیں بلاشبہ ایسی ہیں جو کسی طرح بند نہیں ہو سکیں اور جو در اصل تمام رسوم اور ضروریات کی جڑ ہیں ۔ تجزیہ کیا جائے تو معلوم ہوگا کہ یہ رسوم ازدواج، ولادت، بیماری اور موت ہیں ۔

ا (الف) - ازدواج کی رسمیں شادی کی رسمیں خواہ وہ کسی صورت میں ہوں جب تک دنیا قائم ہے ضرور باقی رہیں گی ۔ البتہ وہ تمام ذیلی رسمیں جو نکاح سے پہلے یا بعد کم و بیش ہر قوم میں پائی جاتی ہیں بہت کچھ بدلی جا سکتی ہیں ۔ شادی کا اسلامی طریقہ حقیقت میں بہت سیدھا سادہ اور

آسان ہے۔ دو گواہوں کے سامنے فریقین میں ایجاب و قبول ہوا اور چند کھجوروں پر دعوت ختم ہوئی۔ لیکن ہندوستان میں آکر اس کی ایسی ہیئت بدلی کہ پہچاننا مشکل ہوگیا۔ چھوارے گو اب تک باقی رہے لیکن اس کے ساتھ تکلفات لایعنی کا ایسا انبار جمع ہوگیا جس نے روپے، وقت، صحت اور آرام سب کا خون کر دیا۔ ہمارے ملک میں نکاح کے ہفتوں پہلے سے رسوم کا ایک ایسا جال پھیلتا ہے جس کا سلسلہ کسی طرح ختم نہیں ہوتا اور اس میں ایک سے بڑھ کر ایک بے ہودہ اور مہمل، اس لئے میری رائے میں تو ایک منگنی کی رسم کے سوا شادی کی تمام ذیلی رسمیں اس قابل ہیں کہ یک قلم موقوف کر دی جائیں۔ البتہ منگنی ایک مفید رسم ہے بشرطیکہ اس کے صحیح مفہوم کو سمجھا جائے۔ اس کی اصل غرض یہ ہے کہ نکاح سے قبل فریقین ایک دوسرے سے منسوب ہو جائیں اور انہیں باہمی تحقیق حال اور تبادلۂ خیال کا موقع ملے۔ گویا یہ مغربی کورٹ شپ کی ایک معقول اور معتدل صورت ہے۔ لیکن ہم لوگوں نے اس مفید رسم کا ایسا ناس کیا کہ اس کا اصل مقصد ہی فوت ہوگیا۔ آج کل ہوتا یہ ہے کہ جو لڑکا اور لڑکی ایک دوسرے سے منسوب ہوں اگر ان میں پہلے پردہ نہ بھی تھا تو نسبت کے بعد سخت پردہ کرا دیا جاتا ہے اور اس کا قطعاً موقع نہیں دیا جاتا کہ ایک دوسرے کی صورت شکل، عادات و اطوار، مذاق و طبیعت کے دیکھنے بھالنے کی نوبت آئے۔

۲۔ جہیز: فضول رسموں کے بعد جو چیز ہماری توجہ کی محتاج ہے وہ جہیز اور مہر کا سوال ہے۔ یہ مسئلہ ہماری خاص توجہ کا محتاج ہے۔ شرع محمدی کی رو سے مہر عورت کا ایک مسلمہ حق ہے، جس سے اسے محروم کرنے کی کوئی وجہ نہیں لیکن موجودہ صورت حال نے اس کو اس کے حق میں سم قاتل بنا دیا ہے۔ زوجہ کے متعلقین ہمیشہ یہ چاہتے ہیں کہ مہر زیادہ سے زیادہ باندھا جائے، تاکہ شوہر پر ساری عمر ایک طرح کا دباؤ رہے اور شوہر یہ سمجھ کر کہ وہ محض ایک رسمی چیز ہے، اپنی استطاعت سے زیادہ رقم قبول کر لیتا ہے، جو اس سے کبھی نہیں ادا ہو سکتی۔ شرعی پہلو سے قطع نظر یہ صورت حال معاشرت کے اعتبار سے اکثر اوقات دونوں کے لئے انتہائی تکلیف دہ ہو جاتی ہے۔ اس سے ازدواجی تعلقات میں ایسی گتھیاں پڑ جاتی ہیں جن کا سلجھانا عدالت کے ناخن تدبیر کے بغیر ممکن نہیں ہوتا۔ اس لئے ہمیں اس بارے میں بڑی احتیاط کرنی چاہئے اور مہر کبھی اپنی حیثیت سے زیادہ نہ باندھنا چاہئے۔

۳۔ جہیز کا مسئلہ ہماری معاشرت میں روز بروز ایسا پیچیدہ ہوتا جارہا ہے کہ اگر بروقت انسداد نہ کیا گیا تو خدا جانے اس کی انتہا کیا ہو۔ اقتصادی کساد بازاری اور معاشی مشکلات نے آج کل ایسی شرمناک ذہنیت پیدا کر دی ہے کہ لوگ بیوی کے جہیز کو اپنی آمدنی کا ایک ذریعہ سمجھنے لگے ہیں اور شادی کے وقت سب سے اہم سوال یہی ہوتا ہے کہ کیا جہیز ملے گا؟ یہ انتہائی بے غیرتی ہی نہیں بلکہ سوسائٹی کے لئے ایک مصیبت عظیم ہے۔ کیونکہ جو لوگ آج داماد بنتے وقت یہ سوال کرتے ہیں کل سسرے بنتے وقت ان سے بھی یہی سوال کیا جائے گا اور جب کئی کئی دفعہ انھیں اپنی حیثیت و حالت سے بڑھ کر جہیز مہیا کرنا پڑے گا تو ان پر اس بیہودہ رسم کی حقیقت پوری طرح واضح ہوگی۔

روزمرہ ہم اخباروں میں دیکھتے ہیں کہ والدین اس ناقابل برداشت بار سے تنگ آکر خودکشی کر رہے ہیں اور لڑکیاں والدین کو اس جانگاہ مصیبت سے بچانے کے لئے اپنی جانیں دے رہی ہیں۔ لیکن ہم پر اس کا کوئی اثر نہیں ہوتا اور یہ منحوس رسم بدستور جاری ہے۔ اس لئے کہ ابھی ہماری باری نہیں آئی۔ جب قوم کے تمام صاحب ثروت دیوالیہ ہو جائیں گے اور ان کی جائدادیں بک جائیں گی اس وقت ہمیں ہوش آئے گا اور مجبوراً وہ کریں گے جو اب خوشی سے کر سکتے ہیں۔

آنچہ دانا کند کند ناداں　　لیک بعد از خرابیٔ بسیار

جہیز کی صرف یہی خرابیاں نہیں بلکہ اس سے بھی کچھ بڑھ کر ہیں اور یہ رسم صرف مسلمانوں میں ہی نہیں بلکہ ہندوستان کی اکثر و بیشتر قوموں میں رائج ہے۔ اس کی بدولت کئی گھر اجڑ گئے اور کئی خاندانوں کی عزت پر پانی پھر گیا۔ قوانین فطرت کبھی ہمارے بنائے ہوئے قانون کے پابند نہیں ہوا کرتے اس لئے ہمارے قوانین معاشرت کو قوانین فطرت کا تابع ہونا چاہئے۔ جب انسان اپنی فطری خواہشات کو جائز اور فطری ذرائع سے پورا نہیں کرسکتا تو تسلی کے لئے ناجائز اور غیر فطری ذرائع تلاش کرتا ہے۔ اس میں عورت اور مرد کی کوئی تخصیص نہیں۔ قوانین فطرت سب پر اپنا عمل یکساں کرتے ہیں۔ پس لڑکیوں کو بٹھا رکھنے کے جو تلخ نتائج بسا اوقات ظاہر ہوتے ہیں وہ معاشرت کے ایسے شرمناک داغ ہوتے ہیں جن پر پردہ پڑا رہنا ہی بہتر ہے۔ ایک اور خرابی اس رسم کی وجہ یہ پیش آرہی ہے کہ لوگ اپنی لڑکیوں کی تعلیم و تربیت اور ان کے تجربہ اور معلومات کی وسعت میں جو روپیہ صرف کرسکتے تھے وہ بجائے اس کے اس رقم کو اس مبارک رسم کی قربان گاہ پر بھینٹ چڑھانے کے لئے محفوظ رکھتے ہیں اس طرح یہ دو دھاری تلوار ہماری سوسائیٹی کے محاسن کو دونوں طرف سے کاٹ رہی ہے۔ یعنی ایک طرف تو روپیہ زیور میں برباد ہوتا ہے دوسری طرف لڑکیاں زیور علم سے عاری رہتی ہیں۔ پھر لطف یہ کہ جو جہیز دیا جاتا ہے اکثر و بیشتر بے کار ثابت ہوتا ہے۔ زیور اور لباس کا رواج آج کل جلد جلد بدل رہا ہے۔ جو چیز آج سَو روپے میں خریدی جاتی ہے وہ کل دس روپے میں بھی نہیں پوچھی جاتی۔ روزمرہ کے برتنے کا جو سامان دلہن لے جاتی ہے سسرال پہنچ کر غیر ضروری ثابت ہوتا ہے اور کسی آکشن ہال کی نذر ہو جاتا ہے۔ غرض ہر اعتبار سے یہ رسم اس قابل ہے کہ اس کی گردن مار دی جائے اور ظاہر ہے کہ یہ خدمت آپ ہی لوگ بخوبی انجام دے سکتے ہیں۔

۴۔ <u>شادی فریقین کی مرضی سے ہونا چاہئے</u> شاید دنیا کی کسی قوم میں یہ دستور نہ ہوگا کہ شادی تو ہو ایک کی اور انتخاب کرے دوسرا۔ لیکن ہمارے ملک میں یہی ہوتا ہے کہ نہ دولھا نے کبھی دلہن کی صورت دیکھی نہ دلہن نے دلہا کی۔ نہ اس کو اس کے مزاج و طبیعت کا کچھ حال معلوم ہے اور نہ اس کو اس کے چال چلن کا، لیکن دونوں ایک دوسرے کے ساتھ عمر بھر کے لئے جوت دئے جاتے ہیں صرف اس لئے کہ ان کے والدین کی خواہش یہی تھی اور ان کے والدین نہیں ہوتے تو عزیز واقارب، دوست، آشنا یہ خدمت بجا لاتے ہیں۔ اور جن بے چاروں کو یہ بھی میسر نہیں آتے تو کچھ عورتیں، مشاطائیں، دلاّل اس منصب کو انجام دیتے ہیں۔ بھلا ذرا غور تو فرمائیے کہ معاملہ دو چار دن کا نہیں، دو چار مہینے کا نہیں عمر بھر کا ساتھ ہے، موت و حیات کا معاملہ ہے۔ کیونکہ ہمارے رسم و رواج کے لحاظ سے جو عورت ایک دفعہ آپ سے بیاہ دی گئی بس وہ گلے کا ہار ہو گئی۔ جس سے آپ انتہائی دشواریوں اور بدنامیوں کے بغیر قطع تعلق نہیں کرسکتے۔ اور اس عورت کے متعلق آپ کو معلومات کیا حاصل ہیں؟ بس اس قدر کہ وہ فلاں بنت فلاں ہے۔ میں سمجھتا ہوں کہ اس قدر کم علم و اطلاع پر آپ چار پیسے کی ایک صراحی نہ خریدیں گے لیکن ایک ایسی ذمہ داری قبول کرنے میں آپ کو تامل نہیں ہوتا جو زندگی کی اہم ترین ذمہ داری اور معاشرت کا سب سے مقدم مسئلہ ہے۔

پس اگر ہم اپنی ازدواجی زندگی خوش گوار بنانا چاہتے ہیں اور اپنی معاشرت کے سنگِ بنیاد کو ٹھیک بٹھانا چاہتے ہیں تو چاہئے کہ سب سے پہلے اس اندھے کی لاٹھی کی اصلاح کرلیں

۵۔ <u>کمسنی کی شادی</u> اس سے بڑھ کر ستم یہ ہے کہ ہم ان معصوم اور بے گناہ ہستیوں کی ساری زندگی برباد کر دیتے ہیں جن کی

کفالت ہمارے سپرد کی گئی ہے اور جو ہمارے پاس قدرت کا ایک بہترین عطیہ ہے۔ سارد ا ایکٹ کے نفاذ سے ہندوستان کے طول وعرض میں جو ہنگامہ بلند ہوا وہ کسی سے مخفی نہیں۔ اور بات کیا تھی؟ صرف یہ کہ تیرہ سال سے کم عمر بچوں کی شادی نہ کی جائے۔ اگر دنیا کے کسی اور حصے میں یہ قانون پاس ہوتا تو وہاں کی آبادی اپنے مقننین کی اس بیکار زحمت پر ہنستی کیونکہ اس کے تصور میں بھی یہ بات نہ آسکتی تھی کہ تیرہ برس سے کم عمر کے بچے بھی اس قابل ہوتے ہیں کہ کوئی ذی ہوش انھیں ازدواج کی زنجیروں میں جکڑ دے۔ لیکن ہماری ذہنیت ملاحظہ فرمایئے کہ اس بات پر ہمارے ملک میں ایک طوفان بپا ہو گیا اور اب تک سیکڑوں لوگ اس قانون کی عمداً خلاف ورزی کرنے پر تلے ہوئے ہیں۔ اس قبیح رسم کے زبوں اثرات پر جتنا ماتم کیا جائے بجا ہے۔ یہ انسان کو جسمانی اور ذہنی، اخلاقی اور عمرانی اعتبار سے کسی کام کا نہیں رکھتی اور قوم میں ایسے کمزور، ناکارہ اور مفلس افراد کا اضافہ کرتی ہے جو سوسائٹی کے لئے ایک بلائے عظیم ہوتے ہیں۔ پس ہم میں سے ہر شخص کا یہ فرض ہے کہ وہ نہ صرف اپنی اولاد کو اس اندھے کنوئیں میں گرنے سے بچائے بلکہ اپنے حلقۂ اثر میں اس کی ممکنہ کوشش کرے کہ لوگ اس مذموم رسم کے مضر اثرات سے بخوبی واقف ہوں اور اس سے باز آئیں۔

۶۔ عقد بیوگان جس طرح کمسنی کی شادی ہماری جہالت اور ناعاقبت اندیشی کی ایک انتہا ہے، اسی طرح بیواؤں کا عقد ثانی نہ کرنا دوسری انتہا۔ اب اگرچہ اس بارے میں وہ احمقانہ سختیاں باقی نہیں رہیں جو کسی زمانے میں تھیں پھر بھی ایسے لوگ موجود ہیں جو عقد بیوگان کو پسندیدہ نگاہوں سے نہیں دیکھتے۔ خصوصاً ہمارے ہندو بھائیوں نے تو بے چاری بیوہ کی وہ درگت بنا رکھی ہے کہ خدا کسی دشمن کو نہ نصیب کرے۔ سمجھ میں نہیں آتا کہ آخر اس بے چاری نے ایسا کون گناہ کیا ہے جس کی پاداش میں وہ اس قدر منحوس اور مردود ہو گئی۔ مسلمانوں کے مذہب میں اگرچہ نصوص صحیح کی رو سے بیواؤں کا عقد ثانی ثابت بلکہ واجب ہے۔ لیکن رسم ورواج کی بندشوں نے اس حکم ربانی کے اثر کو بھی کم کر دیا ہے۔ اور ہندوؤں کی تقلید میں وہ عقد بیوگاں کے کچھ زیادہ حامی نہیں ہیں۔ اس بارے میں انھیں اپنے ہندو بھائیوں سے سبق حاصل کرنا چاہیے جو باوجود مذہبی مخالفت کے اس بات کے درپے ہیں کہ بیواؤں کے عقد ثانی کو جائز قرار دیا جائے۔ اس کے برخلاف ہمارے مذہب میں اس کی سخت تاکید کی گئی ہے لیکن اس پر عمل بہت کم ہوتا ہے ؎

وائے بر ما وائے بر احوال ما　　عار دارد کفر از اسلام ما

بیواؤں کا عقد ثانی نہ کرنے کے مضر نتائج محتاج بیان نہیں اور اس کی چنداں ضرورت نہیں ہے کہ اس پر زیادہ زور دیا جائے۔ اس قدر کہنا کافی ہوگا کہ ؎

پند گیر از مصائب دگراں　　تا نگیرند دیگراں ز تو پند

۷۔ تعداد ازدواج تعداد ازدواج مذہب عیسوی میں ناجائز ہے اور یورپ میں اس کا بالکل رواج نہیں لیکن ہندوستان کے تقریباً تمام خطوں اور فرقوں میں یہ بکثرت رائج ہے۔ مذہب اسلام نے بھی گو اجازت دی ہے لیکن سخت قیود و شرائط کے ساتھ۔ مسلمانوں نے اجازت کو تو یاد رکھ لیا اور قیود و شرائط بھلا دئے۔ نتیجہ یہ ہوا کہ اس کی وجہ سے ہماری گھریلو زندگی میں سخت انتشار اور ازدواجی تعلقات میں نہایت بے لطفی پیدا ہو گئی ہے۔ حالانکہ اس کی اجازت کا اصل مقصد یہی تھا کہ معاشرت کی مشکلات کو رفع کیا جائے اور ازدواجی زندگی کو امتناعی احکام کے شکنجہ میں کسنے کے بجائے خاص صورتوں کے لئے وسعت وگنجائش رکھی جائے کیونکہ تعداد ازدواج کا امتناع مطلق بھی ایسا ہی

مفر ہے جیسا کہ عام اجازت چنانچہ اس کے زبون نتائج ہم کو روزمرہ مغربی ممالک کے واقعات میں ملتے ہیں۔ لیکن شارع کی اس اجازت سے ناجائز فائدہ اٹھا کے ہم اپنی زندگی میں طرح طرح کی مختلف دشواریاں اور بے لطفیاں پیدا کر رہے ہیں جس کی وجہ سے بعض اسلامی ممالک میں تعداد ازدواج کی رسم کو قانوناً بند کرنا پڑا۔ ہندوستان میں اس کی نوبت نہیں آئی لیکن ہماری خیر اسی میں ہے کہ اس کا غلط استعمال نہ کریں اور اپنے حیوانی جذبات کی تسلی کے ساتھ غریب عورت کے نازک جذبات کا بھی خیال رکھیں جسے سوسائٹی کے قوانین نے بالکل بے بس بنا کے ہمارے قبضے میں دے دیا ہے۔

طلاق طلاق کے لئے اور مذاہب کی طرح شارع اسلام نے اس کی ضرورت نہیں رکھی کہ اس کے وجوہ بتائے جائیں یا اس کے لئے عدالت کا دروازہ کھٹکھٹایا جائے۔ لیکن اسے جائز چیزوں میں سب سے زیادہ ناپسندیدہ قرار دے کر اس کی ایسی اچھی حد مقرر کر دی ہے جس سے بہتر تصور میں نہیں آسکتی۔ طلاق کے راستے میں غیر معمولی رکاوٹیں پیدا کرنا سخت غلطی ہے، کیونکہ کسی وجہ سے جب فریقین ایک دوسرے کے ساتھ رہنے پر رضامند نہ ہوں تو کسی قانون کی رو سے انھیں مجبور کرنا گویا خواہ مخواہ اس قانون کی خلاف ورزی کی صورتیں سکھانا ہے۔ اس لئے شارع نے مرد کو اس بارے میں پورا اختیار دیا ہے کہ جب چاہے بلا اظہار وجوہ عورت کو طلاق دے دے۔ لیکن عورت کے حق کو کسی قدر محدود کر دیا۔ اس کے بہت سے وجوہ فقہا نے بیان کئے ہیں لیکن ہمیں اس تفصیل میں جانے کی ضرورت نہیں۔ ان وجوہ سے قطع نظر عورت کے طلاق لینے کا حق جسے شرعی اصطلاح میں خلع کہتے ہیں صرف اس حد تک محدود کیا گیا ہے کہ وہ مرد کی طرح بطور خود طلاق لینے کی مجاز نہیں بلکہ اسے چاہئے کہ اپنے وجوہ حاکم وقت کے سامنے پیش کرے اور جو صورتیں ازدواجی تعلقات میں خرابیاں پیدا کرنے والی ہو سکتی تھیں وہ سب عورت کے خلع کے لئے کافی قرار دی گئی ہیں۔ لیکن موجودہ زمانے میں جہاں اور مذہبی احکام کی تاویلیں اور توجیہیں کی گئی ہیں عورت کے اس حق میں بھی طرح طرح کی دشواریاں پیدا کر دی گئی ہیں۔ تعبیر و اطلاق قوانین میں (خواہ وہ قوانین مملکت ہوں یا قوانین مذہب) ہمیشہ عملی پہلو اور نتائج کو پیش نظر رکھنا چاہئے۔ کیونکہ قانون کا مقصد ہی یہ ہوتا ہے کہ اس سے عملی زندگی میں مدد کی جائے نہ یہ کہ وہ صرف کتابوں کے اوراق میں محفوظ رہے۔ ہماری اس ذہنیت کا نتیجہ یہ ہوا کہ غریب عورتیں جو صرف انتہائی ناگزیر اور تکلیف دہ صورتوں میں اس حق سے استفادہ کے لئے چارہ جوئی کرتی ہیں وہ بھی طرح طرح کی تاویلوں اور لفظی گورکھ دھندے میں پھنس کر اس کے حاصل کرنے سے محروم ہو جاتی ہیں۔ ہماری یہ ہٹ دھرمی اور ستم ظریفی انتہائی افسوس کی ہے اور اس کی وجہ سے عورتوں پر جو مظالم ہو رہے ہیں ان کی خونچکاں داستانیں ہماری معاشرت کے دامن پر نہایت شرمناک داغ ہیں جن کا رفع کرنا ہم میں سے ہر فرض شناس آدمی کا فرض ہے۔ بڑی خوشی کی بات ہے کہ ہمارے ملک کے بعض دردمند حضرات نے اس طرف توجہ فرمائی ہے اور سنا جاتا ہے کہ یہ مسئلہ تمام ہندوستان کے علمائے کرام کی خدمت میں تصفیہ کی غرض سے بھیجا جائے گا۔ گو مجھ سے ہیچمدان کا علماء کو توجہ دلانا چھوٹا منہ بڑی بات ہے لیکن "انظر الی ما قال ولا تنظر الی من قال" کے مصداق مجھے یقین ہے کہ اس مسئلہ کے تصفیہ کے وقت ہمارے علمائے کرام اس کے عملی نتائج کو نظر انداز نہ فرمائیں گے۔

(ب) ولادت (۱) زچگی خانے ہمارے ملک کے زچہ خانوں کے عینی مشاہدات اور ذاتی تجربات جو امریکہ کی مطرود و بدنام خاتون مس میو نے اپنی کتاب میں بیان کئے ہیں وہ ایسے دردناک ہیں کہ ان کے پڑھنے سے رونگٹے کھڑے ہوتے ہیں۔ اس خاتون پر ہندوستان میں بہت سے اعتراضات ہوچکے ہیں۔ لیکن اس عربی مقولے کے بموجب جو اوپر بیان ہوا' دانشمندی یہ ہے کہ اس کی اصلاح کی فکر کی جائے۔ ہمارے ملک میں پہلے تو زچگی کے دواخانے اور دیگر سہولتیں ہی بہت کم اور جو کچھ ہیں بھی تو ہماری عورتیں اپنے تعصبات اور توہمات کی وجہ سے ان سے خاطر خواہ فائدہ نہیں اٹھاتی ہیں چنانچہ ہندوستان میں زچاؤں اور نومولود بچوں کی اموات کے جو اعداد و شمار بیان کئے جاتے ہیں وہ دل ہلادینے والے ہیں۔ یہاں اس کا موقعہ نہیں کہ میں تفصیل سے ان دردناک واقعات اور افسوسناک اعداد و شمار کا اعادہ کروں جو ہندوستان کے زچہ خانوں کے متعلق مختلف کتابوں اور رپورٹوں میں بیان کئے گئے ہیں۔ مختصراً اتنا عرض کرنا کافی ہوگا کہ ساٹھ فیصدی (۶۰%) بچے پیدائش کے پہلے مہینے میں ہلاک ہوجاتے ہیں اور ان کی مجموعی تعداد ہر سال بیس کروڑ بیان کی جاتی ہے۔ اس دردناک صورت حال کو بدلنے کے لئے کیا ہمارے امرا اور اصحاب کرم یہ نہیں کرسکتے کہ تعیشات کو کچھ گھٹا کر اضلاع اور دیہات میں زچگی خانے قائم کرائیں اور نوع انسانی کی تکالیف رفع کرنے میں حکومت اور عیسائی مشنریوں کا ہاتھ بٹائیں جو ہزاروں میل کے فاصلے سے آن کر ہمارے ملک میں خدمت خلق کررہے ہیں۔ اس کے ساتھ ہی اس کی بھی بڑی ضرورت ہے کہ عوام و جہلائے دلوں میں ان دواخانوں کے نام سے جو وحشت اور غلط فہمیاں پھیلی ہوئی ہیں انھیں تقریر و تحریر اور خصوصاً نشرگاہ لاسلکی کے ذریعہ جہاں تک ہو رفع کیا جائے۔

۲۔ ولادت کے رسوم شادی کا معمولی اور فطری نتیجہ ہے ولادت لیکن اس معمولی نتیجے کو وہ غیر معمولی اہمیت اور شہرت دینے کی کوئی وجہ نہیں معلوم ہوتی جو ہمارے گھروں میں عام طور پر دی جاتی ہے۔ اگر کسی مذہب کی رو سے بچے کی کوئی رسم ادا کرنا ضروری ہو تو سیدھے سادہ طریقے پر ادا کردی جائے لیکن ایسا طومار باندھنا جس کا سلسلہ کبھی ختم نہ ہو کیا ضروری ہے۔ وہی رقم جو ہم بچے کی چھٹی' چلہ' عقیقہ' سال گرہ' دودھ بڑھائی' کھیر چٹائی' بسم اللہ' گل پوشی اور خدا جانے کن کن فضولیات میں اڑاتے ہیں اگر جمع کرادی جائے تو آگے چل کر وہ اس کی تعلیم و تربیت اور کتنے اور ضروری کاموں میں صرف کی جاسکتی ہے۔ لیکن کوئی آل اندیشی سے کام نہیں لیتا اور سب ایک دوسرے کی اندھی تقلید کئے جاتے ہیں۔

۳۔ تربیت اطفال اس کے بعد تعلیم و تربیت اطفال کا سوال پیش آتا ہے جو بجائے خود ایک مستقل عنوان ہے اور جس پر قوم کی آئندہ فلاح منحصر ہے۔ یہاں ہم اس بحث کی طوالت میں پڑنے کے لئے بالکل تیار نہیں ورنہ ہمارا وقت اسی عنوان کے نذر ہوجائے اور پھر بھی بحث نامکمل رہے۔ صرف اتنا لکھنا ضروری ہے کہ ہمارے ملک میں چھوٹے بچوں کے لئے نرسری اسکولوں کا بالکل رواج نہیں۔ بچوں کو گھروں میں دن رات جاہل اور ناحہذب لوگوں کی صحبت میں رہنے کا اتفاق ہوتا ہے۔ والدین کو بالعموم ان کی تعلیم و تربیت کی نہ فرصت ہوتی ہے اور نہ تجربہ۔ گھروں میں ان کے ساتھ یا تو بے جا لاڈ پیار کیا جاتا ہے یا غیر معمولی جبر و تشدد اور ان دونوں کا اثر ان کے اخلاق و سیرت کی تعمیر پر بہت برا پڑتا ہے۔ موجودہ زمانے میں بچوں کی نفسیات کا مطالعہ کرکے ان کے لئے مناسب فضا بہم پہنچانا ایک خاص فن بن گیا ہے۔ جس کے لئے بڑی

مہارت اور تجربہ کی ضرورت سمجھی جاتی ہے اس لئے مغربی ممالک میں نرسری اسکولوں کی تعداد روز بروز بڑھ رہی ہے ۔ جہاں ابتدا ہی سے بچے ماہرین فن کی نگرانی میں رکھے جاتے ہیں۔ لیکن ہمارے ملک میں جہاں تعلیم یافتہ آبادی کا تناسب اتنا کم ہے جتنا آٹے میں نمک، جہاں تعلیم نسواں اب تک عیب سمجھی جاتی ہے، جہاں بچے روشن خیال ماؤں کی رہنمائی سے بالکل محروم رہتے ہیں، جہاں ان کی ذہنی، اخلاقی اور جسمانی تربیت کی کوئی صورت نہیں ہوتی، جہاں انتہا درجے مہلک اور مخرب اخلاق نمونے بروقت ان کے پیش نظر رہتے ہیں ۔ ہم اس کی بالکل ضرورت نہیں سمجھتے کہ ان نونہالان قوم کے لئے خاص ادارے قائم کئے جائیں جہاں انھیں باہمی میل جول، کھیل کود اور سماجی زندگی کے مواقع حاصل ہوسکیں۔ ہمارے ملک کی ایک اوسط عورت اپنے بچے کو کمزور، بزدل، جاہل، نالائق اور عیار ، بدمعاش سب کچھ دیکھنا گوارا کرے گی لیکن یہ گوارا نہیں کرسکتی کہ اس کا ننھا سا لخت جگر اس کی نگاہوں سے اوجھل ہو ۔ (باقی)

اعظم خاں

اطلاع :۔ رسالہ نہ پہنچنے کی اطلاع ہر انگریزی مہینے کی ۲۰ تاریخ تک دفتر ہذا کو کردینی چاہئے ۔ کیونکہ رسالے ختم ہوجانے کے سبب مکرر اجرائی نہیں ہوسکتی ۔ نیا سال شروع ہو رہا ہے ۔ براہ کرم چندہ روانہ فرماکر شکریہ کا موقع عطا فرمائیے :۔

مہتمم

غزل

وہ چپ سے ہوگئے، احساسِ مشکل اور کیا ہوگا
نگاہ و دل کی حیرانی کا حاصل اور کیا ہوگا!

مجھے تنہائیوں میں آہ رونا بھی نہیں آتا !
تری مجبوریوں سے ربطِ کامل اور کیا ہوگا !

بھٹکتی آرزوئیں، بولتے آنسو، دبی آہیں !
"محبت میں محبت کے مقابل" اور کیا ہوگا !!

میں اپنے حال پر حیراں وہ میرے حال پر خنداں
کمالِ ربط و ضبطِ موج و ساحل اور کیا ہوگا !

نشانِ راہ بن جاتے ہیں انجم جس کی ہمت کو
کوئی اس کی طرح آگاہِ منزل اور کیا ہوگا!

خلا سا ہے طبیعت میں، نہ روتا ہوں نہ ہنستا ہوں
اب اس کے بعد آ دل، آہ اے دل، اور کیا ہوگا !!

بہی بجھی سی کچھ شمعیں یہی کچھ اونگھتے تارے،
بتائے کوئی اب انجامِ محفل اور کیا ہوگا!!

بہارِ باغ[1] ہوں میں، روشنیٔ قلبِ اختر[2] ہوں
نظر کیا دیکھتا ہے، رنگِ محفل اور کیا ہوگا!!

نظر

[1] میرے جد امجد مولانا باغ مرحوم تلمیذ مرزا داغ
[2] میرے والد محترم مولانا علی اختر مدظلہ

سراج اورنگ آبادی

گولکنڈہ اور بیجاپور کی سلطنتیں ختم ہو چکی تھیں۔ قطب شاہی اور عادل شاہی سلاطین و امرا کی علمی و ادبی سرپرستیاں خواب و خیال ہوتی جا رہی تھیں۔ خواجہ بندہ نواز اور شاہ میراں جی شمس العشاق نے علم و فضل اور شعر و سخن کے جس قافلہ کی قیادت کی تھی اور محمد قلی قطب شاہ اور ابراہیم عادل شاہ ثانی نے جس میں مدی خوانی کے فرائض انجام دیئے تھے وہ دکن کے کوہساروں سے عدم کی طرف کوچ کر چکا تھا۔ شہنشاہ اورنگ زیب نے دکن کی ہر قسم کی دولت سمیٹ لی تھی، جس میں شاہی زر و جواہر کے ساتھ ساتھ کتب خانے بھی شامل تھے۔ ایسا معلوم ہوتا تھا کہ اب جنوبی ہند میں صدیوں شعر و سخن کی محفلیں آباد نہ ہوں گی۔ سپاہیوں کا راج تھا اور شہنشاہی صوبہ دار اور خود شہزادے آپس میں دست و گریبان تھے۔ اس افراتفری میں مرہٹوں نے ایسا سر اٹھایا کہ خود مغل سلطنت پر حاوی ہو گئے۔ ان کے دستے قرب و جوار کے بڑے بڑے شہروں اور قلعوں پر حملہ کرتے اور وہاں کی رہی سہی تمدنی اور ثقافتی دولت کو لوٹ مار کر کے اپنی پہاڑیوں میں واپس ہو جاتے۔ ان کی ہمتیں اتنی بڑھ گئی تھیں کہ خود بیجاپور جیسے عظیم الشان شہر اور مغل صوبہ دار کے پایۂ تخت پر بھی انھوں نے بارہا حملے کئے اور اس کے محلات اور قدیم شاہی آثار کے دروازے اور چوکھٹ تک اکھاڑ کر لے گئے۔ اس پریشانی اور طوائف الملوکی میں شاعروں اور ادیبوں کا پنپنا محال تھا۔ چنانچہ قطب شاہی اور عادل شاہی فضا میں نشو و نما پائے ہوئے جو باقیات الصالحات قاضی محمود بحری، ولی ویلوری، اور ولی اورنگ آبادی کی طرح باقی رہ گئے تھے انھوں نے اپنی عمریں سرگردانی اور سفر میں گزار دیں اور کوئی توقع نہ تھی کہ پھر اس سرزمین میں علم و فضل اور شعر و سخن کی روشنی پھیلے گی۔

سلطنت قطب شاہیہ کے آخری چشم و چراغ ابوالحسن قطب شاہ کو تخت چھوڑے ہوئے صرف تیس سال گزرے تھے اور ولی کو دنیا سے منہ موڑے ہوئے صرف چند ہی سال ہوئے تھے کہ اس کے مدفن سے قریب ہی ملک عنبر کے بسائے ہوئے اس قدیم تاریخی شہر میں جہاں سے اورنگ زیب عالمگیر غازی پہلے اپنے عالم شہزادگی میں اور بعد کو تمام ہندستان کے مطلق العنان بادشاہ کی حیثیت سے گولکنڈہ اور بیجاپور کی افسانوی دولتوں اور قوتوں کو اپنے قابو میں لانے کے منصوبے باندھ رہے تھے، علم و ادب کا ایک چراغ روشن ہوتا ہے جس کی روشنی نے بڑھتے بڑھتے سرزمین دکن کی عمیق تاریکیوں میں روشنی پھیلا دی۔ یہ سراج کی ہستی تھی جو صحیح معنوں میں ظلمات دکن کے لئے سراج ثابت ہوئی۔

اگرچہ سراج خود کو ولی کا جانشین سمجھتے تھے اور اس کا اعلان بھی کیا تھا کہ

تجھ مثل اے سراج بعد ولی
کوئی صاحب سخن نہیں دیکھا

لیکن سراج نے ایک نقطۂ نظر سے ولی پر بھی فضیلت حاصل کر لی۔ انھوں نے ولی سے ولایت کا ذوق حاصل کر کے اس کو اس درجہ تک پہنچایا، جہاں تک شاید ولی بھی اپنے تخلص کی مناسبت کے باوجود نہ پہنچ سکے۔ ولی کی رندمزاجی اور عشق مجازی کی نقشہ کشی نے ان کی افتاد طبع کی جو غمازی کی ہے اس کی بنا پر بعض لوگ ان کی ولایت میں شبہ کر سکتے ہیں۔ لیکن سراج کا پورا کلام ان کی فقیر منشی اور متصوفانہ رنگ میں رنگا ہوا ہے۔ گویا انھوں نے ولی کے سوز و گداز اور صوفیانہ رنگ کو اپنے لئے منتخب کیا اور اس میں وہ عروج حاصل کیا جو ولی کے لئے بھی باعث رشک ہے۔

تصوف و عرفان اور شعر و سخن کا جتنا اچھا امتزاج سراج کے کلام میں ملتا ہے نہ ان سے پہلے کے کسی دکنی شاعر کے کلام میں

موجود ہے اور ان کے بعد کسی دکنی شاعر نے یہ درجہ حاصل کیا۔ اور دکن تو کجا خود شمالی ہند میں بھی اس خصوصیت میں کوئی اردو شاعر سراج کا ہم پلہ پیدا نہیں ہوا۔ دلی میں خواجہ میر درد نے بھی سراج کے بعد یہی رنگ اختیار کیا تھا لیکن ان کا مجموعۂ کلام بہت مختصر ہے اور انھوں نے صرف ایک ہی صنف سخن میں طبع آزمائی کی اس کے برخلاف سراج نے غزلوں کے ضخیم دیوان کے علاوہ جو "دیوانِ درد" سے ضخامت میں دوگنا ہے بارہ مثنویاں اور دیگر اصناف سخن میں چھے طویل نظمیں بھی لکھیں۔ ان کا اردو اور فارسی کلام اور مکتوبات کے انتخابات پروفیسر عبد القادر صاحب سروری نے ایک ضخیم کلیات میں شائع کر دیے ہیں جو ... ، سے زیادہ صفحات پر مشتمل ہے۔ اس کلیات پر خود مرتب نے سوا سو سے زیادہ صفحات کا ایک مقدمہ بھی قلمبند کیا ہے جو بجائے خود ایک اچھی تنقیدی کتاب ہے۔

کلیات سراج کی اشاعت سے قبل ہی اورنگ آباد کا یہ شاعر اردو دنیا میں معروف تھا اور اکثر تذکرہ نویسوں نے اس کے کمال کو خراج عقیدت ادا کیا ہے۔ ان کی مثنوی بوستان خیال بہت مشہور ہوئی اور کئی بار چھپی اور ان کی یہ غزل تو اردو زبان کے ادب عالیہ میں شامل ہو گئی ہے اور سراج کی اسی زمین میں بعد کے کئی شاعروں نے طبع آزمائی بھی کی۔ اس غزل کے چند شعر یہ ہیں ؂

خبر تحیر عشق سن نہ جنوں رہا نہ پری رہی
نہ تو تو رہا نہ تو میں رہا جو رہی سو بے خبری رہی
شہ بے خودی نے عطا کیا مجھے اب لباس برہنگی
نہ خرد کی بخیہ گری رہی نہ جنوں کی پردہ دری رہی
چلی سمت غیب سے کیا ہوا کہ چمن ظہور کا جل گیا
مگر ایک شاخ نہال غم جسے دل کہو سو ہری رہی
نظر تغافل یار کا گلہ کس زباں سے بیاں کروں
کہ شراب صد قدح آرزو خم دل میں تھی سو بھری رہی
وہ عجب گھڑی تھی میں جس گھڑی لیا درس نسخۂ عشق کا
کہ کتاب عقل کی طاق میں جوں دھری تھی تیوں ہی دھری رہی
کیا خاک آتش عشق نے دل بے نوائے سراج کو
نہ خطر رہا نہ حذر رہا مگر ایک بے خطری رہی

اس ضخیم کلیات کی اشاعت سے چند سال قبل ادارۂ ادبیات اردو کی طرف سے سراج کے کلام کا ایک انتخاب بعنوان "سراج سخن" بھی چھپ چکا تھا اور یہ کام بھی پروفیسر سروری ہی نے انجام دیا ہے۔ لیکن ضرورت تھی کہ سراج کا پورا کلام منظر عام پر آتا اور اردو دنیا اپنے اس قدیم صاحب دل شاعر سے پوری طرح واقف ہوتی۔ چونکہ یہ ایک بہت ضخیم کلیات ہے کوئی علمی و ادبی ادارہ اس کی اشاعت کا بار نہیں اٹھا سکتا تھا لیکن مسرت کا مقام ہے کہ نواب سالار جنگ بہادر نے اپنی مجلس اشاعت دکنی مخطوطات کی جانب سے بصرف کثیر اس کو شائع کرا دیا ہے اور اس طرح وہ اردو دنیا کے شکریے کے مستحق قرار پائے۔

سراج اورنگ آباد کے ایک مقدس خاندان سادات میں سنہ ۱۱۲۵ھ میں پیدا ہوئے۔ ان کے والد سید درویش نے اپنے گھر کی روایات کے مطابق مذہبی تعلیم و تربیت کا خاص خیال رکھا لیکن بارہ سال کے بھی نہ ہونے پائے تھے کہ جذب کا عالم طاری ہو گیا۔ اور حضرت شاہ برہان الدین غریب کے مزار پر بیٹھے رہنے لگے۔ سات سال تک یہی حالت رہی والد چاہتے تھے کہ علوم ظاہری سے مزین کریں۔ وہ نہیں جانتے تھے کہ ان کا فرزند فیض باطنی کے لئے بے چین اور سرگرداں ہے۔ اسی ناواقفیت کی بنا پر سراج کو پابہ زنجیر بھی کر دیا گیا تھا۔ جب حالت جذب میں کچھ افاقہ ہوا تو انھوں نے شاہ عبد الرحمن چشتی کے ہاتھ پر بیعت کی۔ ان کے اور دوسرے فقراء کے فیض صحبت سے سراج کا دل روشن ہو گیا۔ جب سنہ ۱۱۶۱ھ میں ان کے مرشد شاہ عبد الرحمن نے وفات پائی تو

اس کے کچھ عرصہ بعد ہی سراج نے ترک لباس کرکے فقیرانہ زندگی بسر کرنی شروع کی۔

شاہ سراج کو اوائل عمری سے شعر و سخن کا چسکا لگ چکا تھا۔ چنانچہ جب وہ عالم بے خودی میں صحرا نوردی کیا کرتے تھے اسی زمانہ میں فارسی شعر موزوں ہونے لگے تھے۔ اس واقعہ کو خود سراج نے اپنی کتاب "منتخب دیوانہا" میں درج کیا ہے۔ اردو شاعری کی طرف وہ شاہ عبدالرحمٰن کے ہاتھ پر بیعت کرنے کے بعد سے متوجہ ہو گئے تھے۔ اس وقت ان کی عمر ۲۰، ۲۲ سال سے زیادہ نہ تھی۔ لیکن طبیعت میں جو استغنا اور بے پروائی ودیعت تھی اس کی وجہ سے ان کا بہت کچھ کلام قلم بند نہ ہو سکا۔ تاہم جب ان کے برادران طریقت پر یہ حقیقت منکشف ہوئی کہ سراج ایک جوہر قابل ہے اور اس کا کلام ضایع نہیں ہونا چاہیے تو ان میں سے ایک عبدالرسول خاں نے ان کے نتائج فکر کو قلمبند کرنا شروع کر دیا اور ۱۱۵۲ھ تک پانچ ہزار اشعار کا ایک دیوان اس طرح سے مرتب ہو گیا۔ دیوان سراج کے یہ مرتب بعد کو شاہ عبدالرسول چشتی کے نام سے مشہور ہوئے اور ان کے متعلق تذکرہ قاق سال اورنگ آبادی میں لکھا ہے کہ وہ سراج کے منظور نظر تھے۔

سراج کی درویشی کے ساتھ ساتھ ان کے شعری کمالات کی شہرت ہونے لگی اور ان کے ہمعصر ان کے ذاتی اوصاف اور شاعرانہ محاسن دونوں کا احترام کرنے لگے۔ رفتہ رفتہ انھوں نے ایک استاد سخن کا مرتبہ حاصل کر لیا اور بیسیوں نوجوان شعرا نے ان سے فیض حاصل کیا۔ قاق سال کے علاوہ افتخار دولت آبادی اور لچھمی نارائن شفیق نے اپنے تذکروں میں سراج کی شاعری کی بڑی تعریف کی ہے۔ سراج کے کچھ عرصہ بعد بھی شمالی ہند میں میر تقی میر کا نکات الشعرا اور فتح علی حسینی گردیزی کا تذکرۂ ریختہ گویاں لکھا گیا اور ان دونوں میں بھی سراج کا ذکر موجود ہے حالانکہ اس وقت تک سراج کا دیوان اور ان کی شہرت شمالی ہند تک پہنچ نہ سکی تھی۔

سراج نے آخر عمر میں اپنے مرشد کی ہدایت پر شعر و سخن کا مشغلہ ترک کر دیا تھا۔ لیکن ان کے شاعری کے ذوق نے اپنے لئے ایک دوسرا راستہ نکال لیا۔ چنانچہ اس زمانے میں سراج نے فارسی اساتذۂ سخن کے کلام کا مطالعہ شروع کیا اور ۱۱۶۹ھ میں اپنی پسند کا کلام "منتخب دیوانہا" کے نام سے مرتب کر لیا جس کا ایک نامکمل مخطوطہ کتب خانۂ آصفیہ حیدرآباد میں موجود ہے۔ یہ ان کا آخری ادبی کارنامہ تھا اس کے بعد سوائے خطوط کے انھوں نے غالباً کچھ اور نہ لکھا۔ حسن اتفاق سے ان کے یہ خطوط بھی جو انھوں نے اپنے شاگردوں اور دوستوں کو لکھے تھے محفوظ رہے اور پروفیسر سروری نے ان کو بھی شایع کر دیا ہے۔

یوں تو شاہ سراج کے کئی مرید اور شاگرد تھے لیکن ان میں ضیاء الدین پروانہ۔ شاہ تاج الدین، شاہ چراغ، لالہ جے کشن بیجان مرزا مغل کمتر، میر مہدی تمکین اور محمد عطا ضیا خاص کر قابل ذکر ہیں۔

ضیاء الدین پروانہ نے شاہ عبدالرسول چشتی کے مرتبہ دیوان سراج کی جو پاکیزہ اور خوش خط نقل خود سراج ہی کی زندگی میں کرائی تھی وہ پروفیسر حسین علی خاں صاحب پروسٹ جامعہ عثمانیہ کے کتب خانے میں موجود ہے۔ یہ "دیوان سراج" کا قدیم ترین نسخہ ہے جس پر اپنے شاگرد پروانہ کی فرمائش پر سراج نے چند غزلیں اپنے قلم سے بھی لکھی ہیں۔ پروانہ کا ذکر چمنستان شعرا مولفہ لچھمی نارائن شفیق اور گل عجائب مولفہ اسد علی خاں تمنا میں بھی درج ہے۔ اور ان دونوں سے پتہ چلتا ہے کہ پروانہ، سراج کے کتنے معتقد اور سعادت مند شاگرد تھے اور یہ تخلص سراج نے اپنے تخلص کی مناسبت ہی سے ضیاء الدین پروانہ کو عطا کیا تھا۔

میر مہدی تمکین برہان پور کے رہنے والے تھے اور اورنگ آباد

میں سراج سے فیضِ سخن حاصل کیا تھا۔ غریبوں کے علاوہ اس عہد کے امرا بھی سراج کے معتقد اور شاگرد تھے چنانچہ نواب توارش خاں جو دیانت خاں کے فرزند اور امانت خاں کے پوتے تھے سراج کے اچھے شاگردوں میں شمار ہوتے تھے۔ ان کا نام مرزا محمد خاں تھا اور غالباً سراج نے شار تخلص رکھا تھا۔ ان کے کلام اور سخن فہمی کا تذکرہ شفیق نے تفصیل سے لکھا ہے۔ انھوں نے اپنے مرشد کی مشہور مثنوی بوستانِ خیال کی تضمین اپنی ایک مثنوی میں کی تھی۔

اسی طرح سراج کے ایک اور شاگرد محمد عطا ضیا دہلوی الاصل تھے لیکن اورنگ آباد میں شاہ سراج کے ایسے معتقد ہوئے کہ جب شفیق نے اپنے تذکرہ کے لئے ان کا کلام طلب کیا تو ضیا نے اپنے استاد شاہ سراج کے یہاں اپنا کلام بھیج کر استدعا کی کہ جتنے شعر آپ منتخب فرمائیں وہی درجِ تذکرہ کئے جائیں گے۔

سراج نے اپنے شاگردوں کو جو خطوط اپنی وفات سے قبل لکھے ہیں ان سے معلوم ہوتا ہے کہ آخر عمر میں ان کی زندگی تنہائی اور بے بسی میں گزری۔ ضیاء الدین پروانہ بیجاپور میں شاہ چراغ احمد نگر میں اور شاہ عبدالرسول لشکر میں مقیم تھے۔ ان کا کوئی چہیتا شاگرد آخر وقت ان کی خدمت کے لئے نہ آسکا۔ ضعفِ معدہ اور اسہال کی تکلیفیں اٹھا کر جمعہ کے دن ۴ شوال ۱۱۷۷ھ کو سراج کی زندگی کا چراغ بجھ گیا۔ وہ جس تکیہ میں رہا کرتے تھے اسی میں ان کی تدفین عمل میں آئی۔ ضیاء الدین پروانہ جب اپنی ملازمت بیجاپور سے واپس اورنگ آباد ہوئے تو اپنے استاد کے مزار پر گنبد تعمیر کرا دیا اس گنبد پر بعد میں سراج کے ایک اور شاگرد شاہ چراغ نے جو احمد نگر میں اپنے مرشد کی مرضی کے خلاف رونق شاہ کے لقب سے رنگ جما رہے تھے قبضہ کر لیا۔ اور یہ گنبد اور تکیہ ۱۳۵۵ھ تک انہی کے نام سے مشہور تھا اور گنبد بوسیدہ ہو کر گر رہا تھا کہ ادارۂ ادبیاتِ اردو کی کوششوں سے از سرِ نو بنا دیا گیا۔

سراج کی شاعری پر اب تک بہت کچھ لکھا جا چکا ہے اور آیندہ اور بھی لکھا جائے گا۔ وہ اردو کے ان شاعروں میں سے ہیں جو اپنے زمانہ سے جتنا دور ہوتے جائیں گے اتنا ہی زیادہ ان کی عظمت اور شہرت میں اضافہ ہوگا۔

سید محی الدین قادری زور

زندگی

(افسانہ)

خالو جان حقہ پیتے پیتے تھک گئے تو پان کھانے اندر چلے آئے۔ خالہ جان چھالیہ کترتی بیٹھی تھیں۔ میں بازو کے کمرے میں لیٹا ہوا تھا۔ میری نظریں دیوار پر ٹنگے ہوئے کیلنڈر کی تصویر پر جمی تھیں۔ ایک لڑکی بڑی بڑی آنکھوں والی، کتابوں کا بستہ بغل میں دابے کلائی پر بندھی ہوئی گھڑی میں وقت دیکھتی کھڑی تھی۔ دالان میں سے گھڑیال کی "ٹک ٹک" خالہ جان کے سروتہ کی "کٹ کٹ" کے ساتھ سُر ملا رہی تھی۔ مجھے ان آوازوں کو سننے اور سوچنے کے سوا کچھ کام نہ تھا۔ میں سوچنے لگا وقت کی پابندی اور تحصیل علم کا خیال اب لڑکیوں میں بھی پیدا ہو چلا ہے۔ مردوں کی لاج اب خدا ہی کے ہاتھ ہے۔ اس لڑکی کے چہرے کو غور سے دیکھنے لگا تو شگفتگی اور بشاشت کے رنگ میں بلند ہمتی کی بجلیاں سی کوندتی دکھائی دیتیں اور اس کی مسکراہٹ تو گویا کہہ رہی تھی کہ زندگی کے ہر مرحلہ میں کامیاب اور فتحمند رہوں گی۔ اسی طرح مسکراتی رہوں گی اور جو چاہوں گی کروں گی۔ کسی رکاوٹ کو، کسی طاقت کو خاطر میں نہ لاؤں گی۔ علم کے میدان میں قدم رکھا ہے تو دیکھ لینا مردوں کے بھی کان کتروں گی۔ مرد تو خواہ مخواہ آسمان پر جا بیٹھے ہیں۔ ہم کو تو کچھ سمجھتے ہی نہیں۔ انھیں نیچا دکھانا پڑے گا اور میں دکھاؤں گی۔" بس۔ بس رہنے بھی دیجئے اپنی تعلیاں"۔ میں اس تصویر سے مخاطب ہو کر کہتا ہوں۔ "جائیے جائیے۔ کالج کا وقت ہو رہا ہے۔" اور دھیمے لہجہ میں کہہ ڈالتا ہوں۔ "ہم سے مقابلہ پڑ جائے تو ساری شیخی کر کری ہو جائے۔" میں فوراً سوچنے لگتا واقعی اگر قسمت سے ایسی ہی کسی سے سابقہ پڑ جائے تو میں کیا کروں گا۔ میں کیا کر سکتا ہوں۔ الگزنڈر ڈوما کا قول یاد آتا ہے۔ "عورتیں اپنی کمزوری کے بھروسے پر شہزوری دکھاتی ہیں۔" اور میں مطمئن ہو جاتا ہوں۔

خالو جان پان کے لئے باتیں بنانے لگتے ہیں: "جی مگر آپ کے ہاتھ کے پان کی بات کہاں آتی ہے۔ صرف ایک پان عنایت ہو جائے پھر رات کے کھانے کے بعد ہی تکلیف دی جائے گی۔" خالہ جان خاموش رہتی ہیں۔ البتہ سروتہ کی کٹ کٹ تیز ہو جاتی ہے اور غصہ سے دانت پیسنے کی آواز سے ملتی جلتی آواز سنائی دیتی ہے۔ خالو جان کہتے ہیں "ارے صاحب پان بنانا بھی کچھ مشکل ہے۔ پاندان کھسکا لیا چونا کتھہ لیپ دیا اور لیجئے" اوں ہوں۔ یہ ترکیب بھی کارگر نہیں ہوتی۔ خالو جان مایوس ہو کر پاندان کی طرف ہاتھ بڑھاتے ہیں۔ "لائیے میں ہی بنا لیتا ہوں"۔ خالہ جان کی آواز سنائی دیتی ہے "بھئی یہ حقہ ہی پان بھی کل سے افیون بھی شروع کر دو شوق بھی ہیں تو کس ڈھنگ کے۔ باز آئی۔ میں ایسے......" خالہ جان اتنا کہہ کر چپ ہو جاتی ہیں۔ خالو جان سمجھ جاتے ہیں کہ باز آئی میں ایسے کے آگے "مردوے سے" محذوف ہے.... ذرا تیز لہجہ میں پوچھتے ہیں۔ "اور وہ آپ کا بھتیجا جو پیتا ہے۔ کس مزے سے گڑ گڑ گڑ گڑ کرتا رہتا ہے۔ وہ تو شاید اچھا کرتا ہے؟" "وہ تو سب آپ کی کرامت ہے۔ وہ پینے سے انکار کرتا ہے تو کہتے ہو کہ دو دم سے کیا ہوتا ہے۔ حقہ پھیپھڑوں کے لئے مفید ہے اور کیا کیا۔' اجی آپ تو مجھے بھی پینے کو کہتے ہیں نا؟" بہر حال خالہ جان چھالیہ کترنا بند کر دیتی ہیں اور پاندان کھول کر کچھ ڈھونڈتی رہتی ہیں۔ خالو جان پان سے ہاتھ دھو کر وہاں سے اٹھنے ہی کو ہوتے ہیں کہ "ذرا ٹھیریے پان لیتے جائیے"۔

خالو جان پان چباتے، مسکراتے میرے کمرے میں آتے ہیں۔

"کہیئے جناب آپ بھی پان کھائیں گے۔ میں مسکرانے لگتا ہوں۔"

"دیکھیئے" خالو جان لہجہ کو بلند کر کے کہتے ہیں" ہندوستانی بیوی سے یہی مصیبت ہوتی ہے۔ آج کوئی میم ہوتی تو پاندان اور حقہ لیئے بس پیچھے پیچھے پھرتی رہتی۔" جواب ملا

"اب بھی کچھ نہیں گیا لالو" خالو جان نے بیحد سنجیدہ لہجہ میں پوچھا۔ دیکھیئے آپ خود اپنی زبان سے کہہ رہی ہیں، پھر جھگڑے نکلیں گے تو ہم ذمہ دار نہیں۔ سن رہی ہیں آپ" اور خالو جان میری طرف دیکھ کر کہنے لگے "میاں وہ تمہارے ماسٹر کی سالی ہے نا۔ ہم کو پسند ہے۔ چلو یوں تو یوں ہی سہی۔" خالہ جان اٹھکر دروازہ کے قریب آگئیں تو خالو جان نے مسکراتے ہوئے کہا" ذرا اپنے بھانجے کو بھی سنا دیجئے کہ آپ میم سے راضی ہیں۔ اور یہ کہ بعد میں آپ کو شکایت نہ ہوگی۔ کہہ دیجئے" خالہ جان نے کہا" واہ میں کیوں کہوں"۔ خالو جان نے اشارے سے مجھے دروازہ کے قریب بلایا اور خود اس طرف جھانکتے ہوئے کہنے لگے۔" نیک کام میں دیر کیا ہے کہہ دیجئے نا۔" اور خالو جان نے میرا ہاتھ پکڑ کر اپنی طرف کھینچا۔ میں آگے بڑھ گیا اور خالو جان کے شانوں کا سہارا لیکر دالان میں نظر دوڑاتا ہوں تو۔ خالہ جان مسکراتی کھڑی ہیں اور اپنے داہنے ہاتھ کو اس طرح حرکت دے رہی ہیں جیسے پنکھا جھل رہی ہوں۔ نہیں۔ نہیں نہیں۔" جانے دیجیئے نہیں لاتے میم کو۔" خالو جان کہتے ہیں اور میں ہنستا ہوا پھر اپنی جگہ بیٹھ جاتا ہوں۔

خالو جان کی گھریلو زندگی میرے لئے ایک دلکش اور پر لطف خواب ہے۔ اس ماحول میں مجھے زندگی پھولوں کی طرح مسکراتی نظر آتی ہے اور مجھ جیسا شادی کا منکر بھی تھوڑی دیر کے لئے شادی کو زندگی کی سب سے بڑی آرزو بنا لیتا ہے۔ اور سچ پوچھئے تو شادی کے بعد زندگی اسی طرح ایک دوسرے کے خلوص اعتماد اور ایثار کی آغوش میں بسر ہو تو کیا کہنے ہیں۔ جگر کہتا ہے،

ع۔ اس طرح بسر ہو تو بہت خوب بسر ہو

اب رہا رنجشوں کا سوال تو اسے بھی ایک چھیڑ سمجھ لیجیئے۔ اتنی سی بات ہوتی ہے۔ بڑھتے بڑھتے اتنی بڑھتی ہے کہ ادھر خالو جان چپ تو ادھر خالہ جان۔ یا بہت ہوا تو کھانے سے انکار۔" نہیں بھوک نہیں ہے۔" ان جھگڑوں کا حال تو یہ ہے کہ دن کو لڑائی رات میں سمجھوتہ اور صبح میں بالکل صفائی۔ اور یہ صورت بھی مہینوں میں ایک آدھ دفعہ پیدا ہوتی ہے ورنہ وہی دن رات۔ وہی محبت اور مسرت اور وہی زندگی کا راستہ جیسے یہ دونوں ایک دوسرے کا سہارا لیتے ہوئے طے کرتے رہتے ہیں۔ زندگی کا راستہ پر خطر سہی۔ لیکن ان مسافروں کے لئے ہر کانٹا پھول اور ہر مصیبت راحت بن جاتی ہے۔ وقت گزرتا جائے گا اور ان کی زندگیاں دامن باندھے مسرت کے پھولوں میں تلتی رہیں گی۔ میں اپنے متعلق بھی سوچتا ہوں کہ آخر میرا کیا حشر ہونے والا ہے میری آئندہ زندگی کو قسمت نے کس اسلوب پر ڈھالا ہے۔ کچھ سجھائی نہیں دیتا۔ رہ رہ کر وہی بڑی بڑی آنکھوں والی لڑکی کی تصویر نظروں میں پھرنے لگتی ہے۔" کیا سوچ رہے ہو" خالو جان پوچھتے ہیں۔

"کچھ نہیں طبیعت افسردہ سی ہے۔ وقت کسی طرح کٹتا نظر نہیں آتا۔"

"وقت گزارنے کی ایک بہت اچھی ترکیب بتاتے ہیں۔" میں خالو جان کو تکتا رہ جاتا ہوں۔" تم چپکے سے اس دروازے سے اپنی خالہ کے کمرے میں پہنچ جاؤ۔ میں اس طرف سے آتا ہوں لیکن

میں نے کچھ پس و پیش کیا تو کہنے لگے "تم جاؤ تو سہی"۔

میں دبے پاؤں خالہ جان کے کمرے میں چلا گیا۔ تھوڑی دیر بعد خالو جان بھی آ گئے۔ کمرے کے اندر داخل ہو کر انھوں نے دروازہ بند کر دیا اور زنجیر چڑھا دی۔ "ہاں اب تم اطمینان سے بیٹھ جاؤ۔ اور اس کھڑکی کے پٹ کھول دو۔" یہ کہہ کر خالو جان نے الماری کھول کر اس میں سے کنجیوں کا ایک گچھا نکالا اور تھوڑی دیر الٹ پلٹ کر کے ان میں سے ایک کنجی نکال لی۔ میز کے خانہ کو اس کنجی سے کھولا گیا۔ اور خالو جان اپنے ہاتھ میں تصویر کا البم سنبھالے میری طرف مسکراتے ہوئے دیکھنے لگے۔ میں نے پوچھا "یہ کیا؟" "تم دیکھو تو" خالو جان میرے قریب ہی فرش پر بیٹھ گئے اور تھوڑی دیر سوچ کر البم پر ہاتھ پھیرنے لگے۔ اس وقت ان کے چہرے پر وہ خاص جذبہ اپنی پرچھائیاں ڈال رہا تھا جو گزرے ہوئے دنوں کو یاد کرنے سے چمک اٹھتا ہے۔ ایک ٹھنڈی آہ بھر کر انھوں نے البم کھولا۔

میری نظروں کے سامنے خالو جان دھاری دار سوٹ پہنے کھڑے تھے۔ چہرے سے معصومی اور جوانی کی کرنیں پھوٹ رہی تھیں۔ "یہ کون ہے پہچانتے ہو؟" میں نے جواب دیا "شکل سے پہچانتا ہوں نام یاد آتا نہیں۔" ہنستے ہوئے کہنے لگے: "خالو جان" اتنے میں آسمان پر ابر خوب گھر کر آ گیا شائد۔ کھڑکی کے کھلے رہنے کے باوجود کمرے میں اندھیرا چھا گیا۔ ہم تصویر دیکھنے میں ایسے محو تھے کہ کھڑکی کی طرف دیکھنے کا خیال بھی نہ آیا۔

خالو جان تصویر کو بہت غور سے دیکھ رہے تھے۔ "سچ کہنا تمھیں اس تصویر میں کوئی خاص بات نظر آتی ہے؟" میں بھلا اس سوال کا کیا جواب دیتا۔ "جی خاص بات تو یہی دکھائی دیتی ہے کہ آپ دکھائی دیتے ہیں۔" خالو جان مسکرانے لگے۔ "جانتے ہو یہی تصویر تھی جو ہم سے پہلے ہماری سسرال کو گئی..... مگر.....؟" میں پوری دلچسپی کے ساتھ سن رہا تھا..... "وہ ناپسند ہوئی یہ تصویر۔" "کیوں؟" میں نے پوچھا۔ "بھئی اب کیا کہہ سکتے ہیں۔ ہر ایک کی پسند ہے ہر ایک کی نظر ہے۔" "مگر خالہ جان تصویر ناپسند ہوئی تو کیا آپ تو پسند آ گئے نا۔" میں نے ڈرتے ڈرتے کہا۔ "اور خالہ جان کا کیا خیال ہے؟" "ارے ان کا چھوڑو وہ تو کہتی ہیں کہ تصویر ابھی یوں نظروں کے سامنے تھی۔ اور ابھی کہاں تو دل میں۔ بس نقش ہو گئی۔ بھئی یہ ان کا کہنا ہے۔ مجھے جھوٹ کہنا تو آتا نہیں۔ مگر میاں ہم ہیں تو بہی خوش قسمت۔ ایسی سلیقہ شعار محبت کرنے والی بیوی قسمت ہی سے تو ملتی ہے۔" میں نے آہستہ سے کہا "مگر خالو جان خالہ جان بھی خوش قسمت ہیں کہ آپ جیسا شوہر ملا۔" "بس بس مجھے منہ دیکھی باتیں اچھی نہیں معلوم ہوتیں۔" خالو جان نے البم کا صفحہ الٹا۔ "دیکھو یہ ہیں ہم اور ہماری بیوی صاحبہ۔ یہ تصویر کچھ ٹھیک نہیں اتری۔ دیکھ رہے ہو نا۔ کمبخت فوٹو گرافر نے ہم کو تو بالکل افریقی بنا دیا ہے اور ان کی تصویر تو جیسے نور کے پانی میں دھوئی گئی ہے۔ بابا یہ عجیب بات دیکھنے میں آئی ہے کہ مرد چاہے کتنا ہی خوبصورت کیوں نہ ہو۔ تصویر کھنچواؤ تو بس یونہی معمولی آئے گی اور عورت کیسی بھی ہو۔ تصویر دیکھو تو چندے آفتاب چندے ماہتاب۔" خالو جان نے دوسری تصویر دکھلائی۔

"یہ تصویر" خالو جان نے کہا "یہ تصویر دنیا کے حسین ترین مقام کی ہے اونچی نیچی پہاڑیاں ہیں۔ ندی ہے جنگل ہے۔ ایک خوبصورت بنگلہ ہے۔" میں نے پوچھا "سوئزرلینڈ کا کوئی مقام ہے کیا؟" کہنے لگے: "یہ میری جاگیر کا ایک مقام ہے۔ تمھیں بھی بھیجیں گے۔ مگر تم شادی کر لو پہلے وہاں اکیلے جانے کی اجازت نہیں۔"

خالو جان مسکرانے لگے۔ میں نے گردن جھکائی اور تصویر کو دیکھتے ہوئے کہنے لگا۔ "واقعی مقام تو بہت پر فضا اور دلچسپ دکھائی دیتا ہے۔" "ہاں" خالو کے منہ سے نکلا "شادی سے پہلے مجھے یہاں جانے کا اتفاق ہوا تھا لیکن یقین مانو نام کو رونق نہ تھی۔ دوبارہ جو گئے تو کچھ نہ پوچھو۔ ندی سے راگوں کے آبشار ابلنے لگے۔ جنگلوں پر بہاریں چھا گئیں۔ شادابی، دلکشی امنگ۔ چاروں جھومتی کافی نظر آتیں۔ دن بھر سوتے رہتے اور رات بھر جاگتے رہتے۔ ایک رات کا واقعہ سناتا ہوں۔" خالو جان ایک رات کا واقعہ سنائیں اور میں دلچسپی سے نہ سنوں۔ خالو جان سوچتے لطف اٹھاتے اور مزے لے لے کر سناتے رہتے۔

ایک رات بڑی سہانی تھی۔ چاندنی رات تھی۔ آسمان پر چاند اپنے پورے نکھار پر تھا۔ ہوا میں پھولوں کی خوشبو بسی ہوئی تھی۔ ہر جھونکا خوشبو کی پھوار سی برساتا۔ منظر کی دلکشی روح پر وجد کا سماں باندھ رہی تھی۔ ساری دنیا کا سناٹا ہم دونوں کی باتوں کو سن رہا تھا۔ ایسا معلوم ہو رہا تھا۔ جیسے ہر چیز ہمارے لئے اپنی دلکشیوں کے خزانے لٹا رہی ہے۔ آسمان پر چاند تارے چمک رہے تھے۔ ہمارے لئے ہوا چل رہی تھی۔ ہمارے لئے۔ درخت جھوم رہے تھے پرندگا رہے تھے ہمارے لئے...... ساری فضا پر ہم ہی چھائے ہوئے تھے۔ اتنے میں تمھاری خالہ کی نظر سامنے کے ٹیلے کے درختوں پر پڑی کہنے لگیں: "ذرا دیکھئے تو وہ پھول" ایک بڑا سفید پھول ڈالی پر اس طرح چمک رہا تھا جیسے دھوپ میں کنول۔ میں نے اپنی پھرتی دکھانی چاہی۔ وہ کوئی پھول دکھائیں اور میں نہ توڑوں۔ جھپٹ کر میں ٹیلے پر چڑھ گیا۔ ایک بڑی سی چٹان بیضوی

شکل کی۔ زمین سے آٹھ نو فٹ بلند کھڑی تھی۔ اس کی سطح پہلے ہوئے لوہے کی طرح چمکدار تھی اور چاندنی میں وہ چاندی کی طرح چمک رہی تھی۔ میں تیزی میں چٹان کے اوپر چڑھ گیا۔ پھول کا درخت میرے سامنے تھا۔ میں نے پلٹ کر دیکھا تو وہ نیچے کھڑی منتظر تھیں کہ اب پھول ڈالی سے ان کے ہاتھ میں آیا اور اب...... میں نے پھول کی طرف ہاتھ بڑھایا تو وہ کافی دور تھا۔ میں نے قدم آگے بڑھایا اور خدا کی پناہ سنبھلتے سنبھلتے تک ایک گڑھے میں گر پڑا۔ درخت کی شاخوں کو پکڑ کر بچنا چاہا تو وہ بھی چرچر کرتی میرے ساتھ نیچے آ رہیں۔ کہنی اور پسلیوں پر کافی خراشیں آ گئی تھیں۔ سانس پھول رہی تھی اور دہشت سے پسینے چھوٹ رہے تھے.... چاندنی ہو تو کیا رات پھر رات ہوتی ہے۔ میں نے قدم تو بڑھا دیا لیکن یہ نہ دیکھا کہ چٹان میں شگاف ہے اور اچھا خاصا کنواں منہ کھولے میرا منتظر ہے۔ اتنے میں تمھاری خالہ بھی اوپر آ گئیں "میں یہاں ہوں۔" میں نے پکار کر کہا۔ "تو پھر اوپر آیئے نا" انھوں نے گلوگیر آواز میں جواب دیا۔ اب میں جو اس گڑھے کو دیکھتا ہوں تو پتھروں سے گھرا ہوا اور ان کی سطح ایسی چکنی کہ چڑھائی قطعی ناممکن تھی۔ ٹھنڈی ہوا چل رہی تھی۔ پھر کیڑوں کے شور سے رہی سہی ہمت بھی جواب دیتی جا رہی تھی۔ ان آوازوں میں کوئی سانپ یا بچھو کی آواز ہو تو۔ مارے سردی کے میں کانپنے لگا "آپ اوپر آیئے۔ نہیں تو میں بھی گرتی ہوں نیچے۔" میں نے جواب دیا "کوشش تو کر رہا ہوں یہ دیکھئے۔" میں نے پتھر پر ہاتھ جما لئے اور اوپر چڑھنے لگا لیکن تھوڑی دور جا کر پھسل کر گر پڑا۔ تمھاری خالہ نے اپنا ہاتھ میری طرف بڑھا کر کہا "چلئے اب آ جایئے اوپر۔" "جی" میں نے ہنستے ہوئے کہا۔

اس پرانھوں نے اپنی ساڑی کا پلو لٹکایا۔ میں نے کہا اس سے کیا ہوتا ہے۔ یہی ہوگا آپ بھی اور میں بھی دونوں اسی گڑھے میں صبح تک مقید رہیں گے۔" انھوں نے کہا۔" دیکھئے میں اس درخت کی پیڑ کو مضبوط پکڑ لیتی ہوں۔ آپ کسی طرح اوپر آجانے چلئے تیار ہوجائیے۔ میں "ہوں" کہوں تو سمجھ لینا کہ میں نے درخت کو پکڑ لیا ہے۔" مگر سنو تو خواہ مخواہ تکلیف ہوگی" مگر وہ اپنی ساڑی کو میرے لئے رسی کی طرح لٹکا کر چلی گئیں۔ میں نے پلو تھام لیا۔ بہت قیمتی ساڑی تھی۔ انھیں بہت پسند تھی۔ اتنے میں آواز آئی "ہوں"۔ میں نے جھٹکا دے کر اندازہ کرلیا کہ میرا وزن تھام سکیں گی یا نہیں۔ "دیکھئے مضبوطی سے دیکھئے ...... اور میں نے بسم اللہ کہہ کر جو پاؤں اٹھایا تو ایک، دو، تین اوپر پہنچ کر ہی دم لیا۔ یہ حال تھا جیسے دنوں کا بھوکا پیاسا ہوں۔ زبان خشک حلق خشک اُف بڑی تباہ حالت تھی۔ اور ان کی ساڑی کا ایک کونہ تو کانٹوں میں الجھ کر بالکل چھلنی ہوگیا تھا۔ اور خود ان کا حال یہ تھا کہ درخت کی پیڑ سے لپٹی کھڑی ہیں۔ ساڑی ان کی کمر اور درخت کی پیڑ کو اس طرح لپٹی ہوئی تھی۔ جیسے کسی نے انھیں باندھ دیا ہو۔ میں جو قریب پہنچا تو دیکھتا کیا ہوں کہ آنکھیں بند ہیں۔ میں نے ان کا شانہ جھنجوڑا تو آنکھیں کھلیں۔ میری طرف دیکھ کر مسکرانے لگیں اور آہستہ سے زمین پر بیٹھ گئیں۔ تھوڑی دیر آرام لے چکیں تو میں نے کہا "ذرا ہاتھ تو دکھائیے ادھر" گھسنے کی وجہ سے کہنی تک زخم تھے ...... ہا ...... خون بہہ رہا تھا۔ اور وہ میری طرف دیکھ کر ہنس رہی تھیں اس کے بعد میں وہاں سے اٹھا۔ اس پھول کے درخت کے پاس گیا۔ ایک دوسری ڈالی کی مدد سے اسے جھکایا اور توڑنے سے پہلے ان کی طرف پلٹ کر دیکھا۔

وہ مسکراتی بیٹھی تھیں۔ ہم دونوں کی نظریں آسمان پر بہنے والے چاند کی طرف اٹھ گئیں۔ میں نے وہ پھول توڑ لیا۔ اس وقت مجھے ایسا محسوس ہو رہا تھا جیسے میں نیچے گرنے کی بجائے بلند ہوتا جارہا ہوں۔ چاند کی کرنیں مجھے اوپر اچھال رہی ہیں اور گاتی ہوئی ہوائیں مجھے پر لگا رہی ہیں۔ اس وقت میرے پاس دو پھول تھے۔" ارے بھئی یہ اندھیرا تو بڑھتا ہی چلا" خالو جان کھڑکی کی طرف دیکھنے لگے۔" ارے آپ" ان کے منہ سے نکلا۔ میں بھی کھڑکی کی طرف دیکھنے لگا۔ کھڑکی سے لگی ہوئی خالہ جان کھڑی تھیں۔ دھوپ میں ان کے بال چمک رہے تھے اور پیشانی پر پسینے کے قطرے جگمگا رہے تھے۔

" آپ اندھیرا کئے کب سے کھڑی ہیں" خالو جان نے پوچھا۔ لیکن خالہ جان اس وقت نہ جانے کہاں تھیں ان کی آنکھوں میں آنسو جھلک رہے تھے۔ ہمارے دیکھتے ہی دیکھتے دو بڑے بڑے قطرے ڈھلک کر ان کے رخساروں پر بہنے لگے۔ خالو جان دم بخود کبھی خالہ جان کو اور کبھی اس تصویر کو دیکھتے۔ میں آہستہ سے اٹھا اور دبے پاؤں دروازہ کا رخ کیا۔ جانے سے پہلے خالو جان کی طرف دیکھتا ہوں تو ان کی آنکھیں بھی ڈبڈبا رہی تھیں۔ وہ خالہ جان کی طرف دیکھ رہے تھے۔ میں بغل میں البم دابے اپنے کمرہ میں چلا آیا ...... اور لیٹنے سے پہلے دیوار پر ٹنگے ہوئے کیلنڈر کی تصویر کو غور سے دیکھنے لگا۔ اس لڑکی کے ہونٹوں کی مسکراہٹ اور وہ بڑی بڑی آنکھیں مجھے ایک ایسی دنیا میں چلنے کی دعوت دے رہی تھیں جہاں اونچی نیچی پہاڑیاں ہیں ندی ہے، جنگل ہے اور ایک خوبصورت بنگلہ ہے۔

(دکن ریڈیو کی ایک تقریر)　　**رشید قریشی**

گل بوٹے

انجمن انسداد بیرحمی برنسواں کے دفتر میں مظلوم بیولوں کے جو سیکڑوں خط وصول ہوئے ہیں ان میں سے دو دلچسپ خط انجمن کی مجلس عاملہ کی اجازت اور معتمد صاحبہ کے شکریہ کے بعد ذیل میں درج کئے جاتے ہیں۔

ایک "جواری" کی بیوی اپنی کہانی یوں سناتی ہیں ــــ

"سنتی ہوں کہ "ان" کو بچپن سے جوا کھیلنے کی عادت ہے۔ انٹرنس پاس کرنے کے بعد اعلیٰ تعلیم کے لئے انھیں کلکتہ بھیجا گیا تھا۔ کلکتہ نے تو انھیں پکا جواری بنا دیا۔ گھوڑ دوڑ میں دوسروں کو روپے بناتے دیکھ کر انھیں بھی قسمت آزمانے کا شوق ہوا۔ کھاتے پیتے گھر کے تھے، سو روپے ماہوار جیب خرچ کے لئے ملا کرتے تھے گھوڑ دوڑ کے موسم میں یہ سو روپے منٹوں میں وارے نیارے ہو جاتے تھے، اس منحوس شوق نے صرف روپیہ ہی تباہ نہیں کیا ایمان اور اخلاق بھی اس کے ہاتھوں برباد ہو گئے۔ جھوٹ بولنا، دھوکا دینا، دغا کرنا، جھوٹی قسمیں کھانا، اقسام کی چالبازیوں سے روپے وصول کرنا!

ــــ یہ ہیں وہ ہنر جن میں انھوں نے اعلیٰ ڈگریاں حاصل کیں!! ان ڈگریوں کے ساتھ گرتے پڑتے بی۔ اے کی ڈگری بھی مل گئی!

ــــ خدا خدا کر کے ادھر آپ نے بی۔ اے کا امتحان پاس کیا اور ادھر مجھ نصیبوں جلی کا ناس ہوا!!

بڑی آرزوؤں اور تمناؤں کے ساتھ ابا جان نے اس بی۔ اے پاس جواری سے میرا بیاہ کیا، بیاہ کے بعد دو تین مہینے بھی خیر سے گزرے نہ تھے کہ ایک دن آپ یکایک رفو چکر ہو گئے، دو چار دن کے بعد آپ کے ایک دوست سے معلوم ہوا کہ آپ پر گھوڑ دوڑ کا جن سوار ہو گیا تھا، وہ کشاں کشاں کلکتہ لے گیا ہے، چوتھے روز کلکتہ سے تار آیا کہ پانچ سو روپے کی شدید ضرورت ہے فوراً تار کے ذریعہ بھیجے جائیں اگر یہ روپے نہ ملیں تو خدانخواستہ آپ "خودکشی" کرلیں گے۔ یہ تار پڑھ کر میرے ہاتھوں کے طوطے اڑ گئے، "ایک" جواری "کے گھر میں اتنی رقم کہاں نکلتی ہے! اپنے زیور پر قرض لے کر بھیجدی۔

پندرھویں دن کلکتہ سے خالی ہاتھ شاندار مراجعت ہوئی!

وہ گھڑی بھی بڑی منحوس تھی کہ میں نے پہلی دفعہ اپنے زیور پر قرض لیا تھا!! اس کے بعد آہستہ آہستہ میرے کل زیور کا صفایا ہو گیا، زیور کے بعد برتن اور فرنیچر کی باری آئی، جب یہ بھی سب ختم ہو گیا تو میری بنارسی ساڑیاں، اور بلوز بھی جوئے کی نذر ہو گئے، قیمتی کپڑوں کے بعد گھر میں استعمال کرنے کا معمولی لباس بھی جوئے کی زد سے نہ بچ سکا ــــ! یہ ساری خانہ بربادی کے بعد بھی میرے جواری کو عقل نہ آئی۔ اب اپنی تھوڑی بہت جو کچھ بھی آمدنی ہے سب کی سب جوئے کی بھینٹ ہو جاتی ہے۔ جوئے بھی بہ فضل شیطان آپ کو اقسام کے آتے ہیں۔ کبھی پانی اور روئی کے سٹہ پر ہار جیت ہو رہی ہے، کبھی گھوڑ دوڑ میں دیوالہ نکل رہا ہے، کبھی برج، پوکر، رمی، فلش، اسکاٹل اور بلیرڈ پر بازی لگ رہی ہے، کبھی شطرنج پر شرط ہو رہی ہے اور گھر میں کڑے فاقے گزر رہے ہیں!! کیا عجب ہے کہ کسی دن مجھ کو بھی کسی جوئے میں ہار جائیں!!!

میری یہ خانہ بربادی ابا جان سے دیکھی نہ گئی، مجھ کو اپنے گھر لے آئے ہیں، میرے ساتھ برخوردار داماد صاحب بھی تشریف لائے ہیں، داماد کے ساتھ قرض خواہوں کی ڈگریاں بھی آرہی ہیں اور ابا جان بدنامی سے ڈر کر ان ڈگریوں کی ادائی کی ذمہ داری اپنے سر لے رہے ہیں۔ کیا بتاؤں کس عذاب میں مبتلا ہوں!! ابا جان نے سیکڑوں مرتبہ داماد صاحب کو نصیحت کی کہ "بیٹا جوئے پر

کبھی کسی نے نہیں کمایا، کیوں اس کے پیچھے دیوانے ہو رہے ہو؟ مگر دامادصاحب کا ایک ہی جواب ہے! فرماتے ہیں "کسی دن تو قسمت مہربان ہوگی، اب تک جتنا گیا ہے سب مل جائے گا"!!

...... جس کی یہ سمجھ ہو اور جس کی عقل پر پتھر پڑ گئے ہوں اس کو کس طرح سمجھایا جائے! میری قسمت پھوٹ گئی تھی جو ایسے جواری کے پالے پڑی!! آبجان بھی آخر کب تک ساتھ دیں گے اور کہاں تک ہمارے قرضے ادا کرتے رہیں گے! موت بہتر ہے ایسے جینے سے!! خودکشی کرنا حرام نہ ہوتا تو اب تک میری ہڈیاں بھی قبر میں باقی نہ رہتیں ——!

کس سے محرومیٔ قسمت کی شکایت کیجیے
ہم نے چاہا تھا کہ مرجائیں سو وہ بھی نہ ہوا"

ایک شکاری میاں کی بیوی لکھتی ہیں "میرے صاحب کو شکار کا "جنون" ہے، ہر وقت شکار کا بھوت ان کے سر پر سوار رہتا ہے، ان کے عزیزوں اور دوستوں میں چند ایسے نکلے ہیں جو ان کو اکساتے رہتے ہیں، اس لغو شوق کے پیچھے سیکڑوں روپے تباہ ہو رہے ہیں، بندوق پہ بندوق خریدی جارہی ہے، کارتوس منگوائے جارہے ہیں، شکاری لباس تیار کرایا جارہا ہے، شکار کے متعلق لٹریچر جمع ہو رہا ہے، غرض یہ کہ اس عالمگیر قحط کے زمانے میں اس منحوس شکار کے کارن ہماری خوب حجامت ہو رہی ہے۔

جب کبھی شکار کے لئے جاتے ہیں میرا ساتھ رہنا لازمی ہے، یہ ناچیز نخچیر بنی ان کے فتراک میں لگی رہتی ہے، شکار کھیلتے وقت صاحب کے ساتھ درختوں پر بھی میرا بیٹھنا ضروری ہے، اس تقریب میں ایک دفعہ تو مرتے مرتے بچی! واقعہ یہ ہوا کہ بڑے شکار کے لئے ہم ایک بڑے جنگل میں گئے۔ ایک بڑے اور گھنے درخت پر مچان باندھا گیا تھا۔ سیڑھی پر سے جب میں اچک کر اس پر بیٹھنے گئی تو اتفاق سے پھسل پڑی، خدا کا ہزار ہزار شکر ہے کہ نیچے کچھ آدمی موجود تھے انھوں نے اپنے ہاتھوں پر مجھ کو تھام لیا، میرا جسم فربہ اور بھاری ہونے کی وجہ سے کئی ہاتھوں میں موچ آگیا مگر میں تو بچ گئی ورنہ نیچے گر پڑتی تو معلوم نہیں یہ واقعہ لکھ بھی سکتی۔ ایسے خطرناک طور پر میرے گرنے سے صاحب پر کچھ اثر نہیں ہوا اوپر سے آپ چیخ رہے تھے!

"گرتے ہیں شہسوار ہی میدان جنگ میں"!!

میری آنکھوں میں تو اس وقت موت پھر گئی، مگر وہ ٹس سے مس نہیں ہوئے! آگ لگے اس موے شکار کو!! جنگلوں اور پہاڑوں میں پھرتے پھرتے ناک میں دم آگیا ہے! اقسام کی سواریوں پر اب تک بیٹھ چکی ہوں، گھوڑا، خچر، بیل، گدھا یہ سب ہماری سواری میں آچکے ہیں، چھکڑوں پر تو سیکڑوں میل پھر چکی ہوں، شکار سے جب واپس ہوتی ہوں دنوں طبیعت خراب رہتی ہے۔ متلی، چکر، درد سر کے علاوہ چول چول ڈھیلی ہو جاتی ہے، تارپین تیل، زندہ طلسمات، امرت دھارا، اور ٹیل بام، امرت انجن وغیرہ وغیرہ اقسام کی دوائیں جسم اور جوڑوں پر لگاتی ہوں اور مالش کراتی ہوں تب کہیں دو چار روز کے بعد کچھ آرام ہوتا ہے۔

ایک دن ہمارے صاحب کے ایک پرانے دوست ملنے آئے سلام علیک کے بعد شکار کا ذکر خیر شروع ہوا۔ ہمارے صاحب نے کہا "یار! ایک عرصہ ہوتا ہے کہ تم ہم ملکر شکار کھیلنے نہیں گئے۔ چلو کسی دن کسی اچھے جنگل میں جائیں گے"؟ دوست نے جواب دیا "اگر تم تیار ہو تو کل سویرے ہم تمھیں ایک نئے جانور کے شکار کے لئے لے چلتے ہیں" صاحب فوراً رضا مند ہو گئے مسکرا کر کہا "نیکی اور پوچھ پوچھ"! میری طرف دیکھ کر ارشاد ہوا "تم کو بھی ضرور چلنا پڑے گا تمھیں ہم ایک نئے اور بڑے —— بہت بڑے

جانور کا شکار دکھائیں گے۔" میں حیران تھی کہ وہ کون بڑا جانور ہوگا جس کو میں نے اب تک نہیں دیکھا ہے۔ خیال آیا کہیں "اژدھا" تو نہیں ہوگا! خیر با دل ناخواستہ چلنے تیار ہوگئی۔ درخت پر سے نیچے گرنے کا سین آنکھوں میں پھر گیا۔ ہمارے صاحب کو شکار کے بھوت نے ساری رات بے چین رکھا۔ میری آنکھ جب کھلی تو صاحب شکاری لباس میں تیار کھڑے تھے اور گھڑی میں چار بج رہے تھے۔ میں منہ ہاتھ دھو کر لباس بدل رہی تھی کہ دوست آگئے۔ ہم تینوں دو چار بندوقیں اور کچھ کھانے پینے کا سامان لے کر "بڑے اور نئے شکار" کے لئے چل پڑے۔

شہر سے کوئی پچیس میل پر ایک جنگل کے کنارے ہم نے اپنی موٹر چھوڑ دی اور سب کے سب جنگل میں گھس گئے۔ میرے ہاتھ میں بھی ایک بندوق پکڑا دی۔ بندوق چلانا تو مجھ کو آ گیا ہے مگر نشانہ دو چار فٹ ادھر ادھر پڑ جاتا ہے۔ تھوڑی دور جانے کے بعد ہمیں دو چار ہاتھی پھرتے دکھائی دیے۔ ہمارے صاحب نے آؤ دیکھا نہ تاؤ دُن سے ایک ہاتھی کو گرا دیا! اس کے گرتے ہی دوسرے ہاتھی بھاگ نکلے اس کے ساتھ ہی دو تین آدمی چیختے چلاتے ہماری طرف دوڑتے آ رہے تھے۔ ہم سب حیران تھے کہ یہ ماجرا کیا ہے! جب وہ نزدیک آئے تو ان سے معلوم ہوا کہ وہ سب ہاتھی "سرکس" کے تھے! اتنے میں سرکس کا منیجر بھی آ گیا اور لگا ہمیں انگریزی میں صلواتیں سنانے! صاحب نے دوست کی طرف دیکھا تو وہ زمین کی طرف دیکھنے لگے! اس "بڑے اور نئے شکار" کا خمیازہ ہمیں پانچ سو روپے دینا پڑا۔ یہ ہاتھی کے بچے کی قیمت تھی اگر بڑا ہاتھی ہوتا تو شاید ہزار بارہ سو روپے دینے پڑتے یہ "بڑا اور نیا شکار" تو عذاب جان نکلا! ایک مہینہ کی تنخواہ اس کی نذر کرنی پڑی! صاحب کو ان کے دوستوں سے خدا بچائے۔ مجھ کو تو وہ دیوانہ سمجھتے ہیں میں بکے جاتی ہوں مگر وہ اپنی کرتے ہیں، ہزار طرح سمجھانے کی کوشش کی! مگر سمجھے تو یہ سمجھے کہ اب تک کچھ نہیں سمجھے"!!

"باغبان"

غزل

جان بھی ہے قتیلِ شوق، دل ہی میں کیا اتر گیا
ان کا خدنگ ناز تھا کام تمام کر گیا

ذوقِ فنائے ذات کا دور کہاں گزر گیا
عشق کی بیکسی سے اور نقش وفا ابھر گیا

تیری نگاہ پر فدا، تیرے جمال پر نثار
نکہتِ گل رواں ہوئی، رنگ چمن نکھر گیا

مجھ پہ بڑا کرم کیا کاوشِ ہجر یار نے
شوق کی آنکھ کھل گئی، ذوقِ نہاں سنور گیا

اشرفِ نامراد کے ذکر سے فائدہ ہے کیا
رندِ خراب حال تھا وقت سے پہلے مر گیا

علی اشرف

نئی کتابیں

۱۔ لعل وگوہر (بڑے آدمیوں کے اقوال) مرتبہ رضیہ سلطانہ قیمت عہ۔ پتہ نیا کتاب گھر۔ اردو بازار۔ دہلی۔

۲۔ شاہی دسترخوان (مشرقی ومغربی کہانیوں کا مجموعہ) از رضیہ سلطانہ قیمت عاں۔ " " " "

۳۔ مشرقی مغربی کشیدہ کاری از رضیہ سلطانہ قیمت عاں۔ پتہ نیا کتاب گھر " "

۴۔ رضیہ کے خطوط (زنانہ خط وکتابت) از رضیہ سلطانہ قیمت عاں۔ پتہ نیا کتاب گھر "

۵۔ چاند سورج کی چوری (ناول) از محمد رحیم مین قیمت عاں۔ پتہ نیا کتاب گھر "

۶۔ باغی لڑکی (افسانے) از شفیق بانو قیمت عاں۔ " " " "

۷۔ پنکھڑیاں (افسانے) از محمد رحیم مین قیمت عاں۔ " " " "

۸۔ پتھر سے ہیرا (ناول) از ڈاکٹر سعید احمد قیمت عاں۔ " " " "

۹۔ ادب اور انقلاب از ڈاکٹر اختر حسین رائے پوری قیمت ہے پتہ سید عبدالرزاق تاجر کتب عابد روڈ۔ حیدرآباد دکن۔

۱۰۔ لہریں (افسانے) از ڈاکٹر شفیق الرحمٰن حجم ۲۰۰ صفحے قیمت ہے۔ " "

۱۱۔ اسوۂ حسنہ (احادیث) تیسرا اڈیشن از سید محمد اسحاق دہلوی حجم ۱۰۸ صفحے قیمت عہ انجمن ترقی اسلام سکندرآباد دکن۔

۱۲۔ کیا کانگریس ناکام رہی؟ قیمت ۳ پتہ پاپولر بک ڈپو۔ گرانٹ روڈ۔ بمبئی۔

۱۳۔ ہندوستانی تمدن جلد اول (قدیم تمدن) از اشیوراٹو پا ریڈر تاریخ تمدن ہند جامعہ عثمانیہ ۲۴۰ صفحے قیمت ہے سب رس کتاب گھر حیدرآباد

۱۴۔ سچ کا جادو (ڈراما) از علی بن عبدالحبیب مدرس مدرسہ فوقانیہ نرمل ۷۴ صفحے قیمت ۴ر " " "

۱۵۔ باتیں (ضروری معلومات) از شجاع احمد قائد ۴۸ صفحے قیمت عہ۔ " "

۱۶۔ نواب افضل الدولہ آصفجاہ پنجم از سید مراد علی طالع ۳۲ صفحے قیمت ۴ر " " "

۱۷۔ طبیعیاتی کائنات از پروفیسر سید محمد علی خاں ۶۰ صفحے قیمت ۸ر " "

۱۸۔ تعلیم کا مسئلہ از ڈاکٹر رضی الدین صدیقی پروفیسر ریاضی جامعہ عثمانیہ ۹۶ صفحے قیمت عہ۔ " "

۱۹۔ آفتاب تازہ (افسانے) از احسان بی اے ۱۱۲ صفحے قیمت عہ۔ نصرت بک ڈپو۔ شرنگ۔ لاہور۔

۲۰۔ دل کی باتیں (افسانے) از سید کاظم ۲۰۰ صفحے قیمت عاں۔ دفتر رسالہ کہکشاں۔ دہلی۔

۲۱۔ چند افسانے از خواجہ محمد شفیع قیمت عہ۔ کتب خانۂ عزیزیہ۔ دہلی۔

۲۲۔ سیر کائنات۔ مترجمہ حفیظ احمد خاں منصف عثمان آباد ۲۷۸ صفحے قیمت عاں۔ مکتبہ جامعہ۔ دہلی۔

۲۳۔ لغات ماہر (مجموعۂ کلام) از ماہر القادری قیمت ہے۔ ادارۂ اشاعت اردو۔ عابد روڈ۔ حیدرآباد دکن۔

۲۴۔ ہماری مفید غذا از ڈاکٹر مرزا غوث بیگ میڈیکل افسر دواخانہ چینتاپور۔ دکن حجم ۹۰ صفحے۔

مرزا سیف علیخاں

تنقید و تبصرہ

پیام ادب ماہنامہ۔ بابتہ ماہ ستمبر ۱۹۴۳ء چندہ سالانہ (ـلـے) روپے مینیجنگ ڈائرکٹر چودھری اقبال سلیم گاہندری ادارۂ اشاعت اردو۔ عابد روڈ حیدرآباد دکن سے نکلتا ہے۔ اس میں اچھے اچھے لکھنے والے ہیں جس سے پرچہ کا مستقبل شاندار معلوم ہوتا ہے۔

تعلیمی خطبات:۔ از ڈاکٹر ذاکر حسین۔ قیمت عسہ مجلد ملنے کا پتہ۔ مکتبہ جامعہ دہلی۔ حجم ۱۶۸ صفحات۔

یہ ڈاکٹر صاحب کے ۹ خطبات کا ایک دلچسپ اور مفید مجموعہ ہے۔ زبان کی روانی، صفائی اور گھلاوٹ، قدرت بیان کی چابک دستی نے ان خطبات میں چار چاند لگا دیے ہیں۔ خشک موضوع کو رنگین اور دلچسپ بنا، ان کے پڑھنے کے بعد مشکل نہیں معلوم ہوتا۔ ان کو پڑھنے کے بعد اس نظام تعلیم کے خاکے ہم کو مل جاتے ہیں جو علم کے نور کو گھر گھر پھیلانے میں ہمارے مدد و معاون ہو سکتے ہیں۔

اردو کا سب سے بڑا شاعر اور محسن:۔ مصنفہ ابوالکمال قاضی عبدالصمد صاحب صارم قیمت فی جلد علاوہ محصول ڈاک عسہ حجم ۱۴۴۔ انتظامی پریس شنکر باغ حیدرآباد دکن۔

صارم صاحب کی یہ تحقیقی کاوش قابلِ ستائش ہے۔ غلام ہمدانی مصحفی پر گویا ایک مقالہ لکھا ہے۔ کتاب بہت دلچسپ اور کام کی چیز ہے۔ ادبی گھما گھمیوں میں اگر یہ سودا ادبی نہ ہو تو جناب ڈاکٹر زور کے الفاظ ہی اس کے نقید و نظر کو کافی ہیں۔ "مصحفی کی فضیلت سے متعلق انہوں نے جو مباحث پیش کئے ہیں وہ ادب اردو کے مورخ کے لئے گراں قدر ثابت ہوں گے۔ مجھے توقع ہے کہ یہ کتاب شعرا، طلبہ اور ناقدین کے لئے دلچسپ ثابت ہوگی۔" مشاہیر ملک کی رائے خود ایک زبردست تنقید ہوتی ہے۔

ہم کیسے پڑھائیں:۔ از سلامت اللہ ایم اے بی ٹی (علیگ) قیمت عہ مجلد۔ مکتبہ جامعہ دہلی۔ حجم ۲۲۴ صفحے۔

یہ موجودہ اور ہونیوالے استادوں کے لئے ایک مفید اور کارآمد سی چیز ہے۔ اس کو پڑھ کر واقعی وہ ایک حقیقی معلم بن سکتا ہے۔ صحیح معنوں میں معلم ایک مزدور ہے جو اپنے دست و بازو سے نہیں بلکہ اپنی دماغی و روحانی کاہشوں اور کاوشوں سے اپنے ابنائے ملک کی خدمت کرتا ہے۔ محض روٹی کمانا ہی اس کا مقصد نہیں۔ بلکہ اس کا نصب العین بہت ہی بلند ہے۔ یہ کتاب گیارہ باب پر مشتمل ہے۔ آسان اور سلیس زبان، نیز عام فہم انداز میں تعلیمی موضوع کے ہر پہلو پر روشنی ڈالی ہے۔ کتاب کیا ہے ایک دلچسپ ذہنی مشغلہ ہے۔ "ج"

مشک و عود:۔ از محمودہ رضویہ حجم ۱۶۴ صفحے قیمت عہ پتہ انجمن ترقی اردو۔ کراچی۔

یہ مجموعہ ہے پندرہ نفسیاتی، اصلاحی، اخلاقی اور سماجی افسانوں کا۔ قابل مصنفہ نے ان مختصر افسانوں میں زندگی کے مختلف پہلوؤں پر روشنی ڈالی ہے۔ بعض افسانے نہایت بصیرت افروز ہیں اور اس قابل ہیں کہ ان سے سبق لیا جائے نوخیز لڑکیوں کے لئے اکثر افسانے درس اخلاق ہیں۔ مزدور اور سرمایہ دار کے متعلق بھی چند افسانوں میں بحث کی گئی ہے۔ مزدور کی کس مپرسی اور سرمایہ دار کی چیرہ دستی عبرت انگیز ہے۔ غرض کہ ان افسانوں سے نوخیز لڑکے، لڑکیاں، جوان، بوڑھے سب ہی استفادہ کر سکتے ہیں۔ ٹیگوری رنگ کے "ادب لطیف" سے زیادہ اس قسم کے افسانوں کی ضرورت ہے۔ "س"

سب رس کے متعلق

مولانا خواجہ حسن نظامی کی رائے

"نام بھی اچھا ہے اور کام بھی اچھا ہے"

تعلیم لازمۂ زندگی ہے

ایک جان دار ہستی اور بےجان شئے میں فرق یہ ہے کہ اول الذکر اپنے ماحول سے متاثر بھی ہوتی ہے اور پھر اس کو مطیع کر کے اپنی بقا کا ذریعہ بھی بنا لیتی ہے۔ مثلاً روشنی، پانی، ہوا اور دیگر اجزائے ارضی کو وہ اپنی بقائے حیات کے لئے استعمال کرتی ہے۔ اس سے یہ نتیجہ نکلا کہ ایک جاندار ہستی وہ ہے جو فطرت کی ان طاقتوں کو، جن سے وہ گھری ہوئی ہے، مطیع و منقاد بنا کر اپنے مسلسل جہد و عمل کے لئے ان کو استعمال کرے۔ اور اگر وہ اس قسم کا جارحانہ اقدام نہ کرے تو یہی قوتیں اس کے لئے بربادی کا سامان بن جائیں گی، اس لئے ہر انسان پر لازم ہوا کہ وہ قوانین فطرت کو معلوم کر کے ان پر تصرف حاصل کرے اور ان سے اپنے مقاصد کی تکمیل میں مدد لے۔ کیونکہ زندگی ایک "خود تجدیدی" طریقہ کا نام ہے جو ماحول پر عمل کرنے سے حاصل ہوتی ہے۔ بے عملی، جمود، پیغام فنا بلکہ فنا کے مترادف ہیں۔

ہستی کے اعلیٰ انواع میں خاص طور سے مذکورۂ بالا طریقے پر زندگی کا سلسلہ دیرپا نہیں ہوتا یعنی ایک معینہ عرصہ کے بعد ماحول کی قوتیں اس پر حاوی ہو جاتی ہیں۔ اس کشمکش میں اس کے اعضا جواب دے دیتے ہیں اور وہ فنا ہو جاتی ہے۔ لیکن اس سے یہ لازم نہیں آتا کہ زندگی ختم ہو گئی کیونکہ کسی ایک ہستی کے فنا ہو جانے سے زندگی کا خاتمہ نہیں ہو جاتا، بلکہ وہ اپنی جیسی دوسری ہستیوں کو پیدا کر کے چھوڑ جاتی ہے تاکہ وہ ماحول کا اس سے زیادہ قابلیت اور کامیابی کے ساتھ مقابلہ کر سکے۔ اس طرح کشمکش حیات کا سلسلہ جاری رہتا ہے۔ طبقات الارض کے مطالعہ سے ہمیں اس بات کا پتہ چلتا ہے کہ اس طرح نہ صرف افراد بلکہ بعض انواع کی ہستی بھی مٹ گئی، لیکن ان کی جگہ ان سے زیادہ بہتر طور پر مقابلہ کرنے کی اہلیت رکھنے والے انواع کا وجود عمل میں آیا۔ اس سے ثابت ہوتا ہے کہ تسلسلِ زندگی کے معنی، کسی ذی حیات کا از سر نو زیادہ قابلیت کے ساتھ اپنے ماحول کو بہترین طریقہ پر اپنے اغراض و مقاصد کی تکمیل کے لئے استعمال کرنا ہے۔

یہ تو زندگی کا ایک رخ یعنی جسمانی یا مادی پہلو تھا لیکن یہاں زندگی سے ہماری مراد انفرادی یا نسلی تجربہ کی وسعت کے ہیں جب کسی شخص کے سوانح حیات کا مطالعہ کرنا چاہتے ہیں تو ہم اس بات کی توقع نہیں رکھتے کہ اس کتاب میں علم الاعضا کی تفصیلات ہوں گی۔ بلکہ ہم اس میں ان سماجی تعلقات اور ان حالات و کیفیات کے بیان کی توقع رکھتے ہیں جن کے درمیان اس شخص کی پرورش و تربیت ہوئی ہے۔ یعنی وہ ماحول جس میں اس کے کردار اور اس کی سیرت کی تشکیل ہوئی۔ یا یوں کہئے کہ ماحول کے ساتھ اس کی کشمکش اور کامیابیاں، اس کی انفرادی امیدیں، مذاق، رنج و راحت وغیرہ کا بیان ہوگا۔ غرض زندگی رسم و رواج، روایات، عقائد، کامیابیاں ناکامیاں اور مصروفیات سب پر حاوی ہے۔

اور ہم لفظ "تجربہ" سے عموماً یہی مراد لیتے ہیں کہ جس طرح جسمانی زندگی پر قانون تسلسل کا اطلاق ہوتا ہے اسی طرح نفسی زندگی پر بھی وہ حاوی ہے یعنی حیات جسمانی کی تجدید نوع انسانی میں عقائد و اعمال، انبساط و انقباض اور توقعات وغیرہ کی بھی تجدید ہے۔ سماجی گروہ کی حیات نو میں کسی تجربہ کے تسلسل کا پایا جانا ایک ناقابل تردید حقیقت ہے۔ وسیع تر معنوں میں تعلیم سماجی زندگی کے تسلسل کا نام ہے کیونکہ گروہ کا ہر رکن چاہے اس کا تعلق متمدن قوم سے ہو یا

ہم وحشی گروہ سے عالمِ طفولیت میں زبان، عقائد، رجحانات اور اپنے سماجی معیار سے نہ صرف نابلد بلکہ دوسروں کا محتاج ہوتا ہے اور اگر سماج کا وہ فرد جس کو اپنے گروہ کی زندگی کا تجربہ ہوتا ہے کچھ عرصہ بعد فنا ہوجائے تو سماجی زندگی کا سلسلہ منقطع نہیں ہوتا۔ البتہ اگر فنا ہونے والی ہستیاں اپنے تجربہ سے نومولود افرادِ گروہ کو آگاہ نہ کرتے رہیں تو کچھ عرصہ بعد جب اس گروہ کے تمام تجربہ کار افراد فنا ہوجائیں گے اس وقت اس گروہ کی زندگی کا بھی خاتمہ ہوجائے گا۔ پس معلوم ہوا کہ تعلیم زندگی کے قیام و بقا کے لئے کس قدر ناگزیر شئے ہے۔

محمد نصیر الدین

تعلیم کا مسئلہ

از ڈاکٹر رضی الدین صاحب صدیقی پروفیسر جامعہ عثمانیہ۔ قیمت ۸ؔ

ادارۂ ادبیات اردو کی طرف سے پروفیسر ڈاکٹر رضی الدین صدیقی صاحب کی ایک جدید کتاب "تعلیم کا مسئلہ" شائع ہوئی ہے جس میں حسب ذیل عنوانات پر مفید اور ضروری معلومات درج ہیں۔

(۱) تعلیم و تربیت کا مقصد (۲) تعلیم کی مدت (۳) موجودہ نظام تعلیم کے نتائج و نقائص (۴) اعلیٰ تعلیم کا صحیح نصب العین (۵) علم کی وحدت و (۶) انسانی وحدت کی تعلیم (۷) ایمان اور علم (۸) ابتدائی اور ثانوی تعلیم (۹) اعلیٰ تعلیم (۱۰) تعلیمی منزلیں اور نصاب (۱۱) جامعہ کے شعبہ جات (۱۲) طالب علم اور علمی سیاسیات۔ ملنے کا پتہ: سب رس کتاب گھر خیریت آباد

بچوں کی آنکھوں کی احتیاط میں والدین کی ذمہ داری کی نسبت انگلستان و امریکہ میں نشر صوت

والدین اپنے بچوں کے لئے لکھنے پڑھنے کی نگرانی کے ذریعہ بعض وہ خطرہ کی علامتیں دریافت کرسکتے ہیں کہ جن سے ان کی جانب رہبری ہوسکتی ہے کہ ان کا فوری امتحان کرائیں اور ڈاکٹر کی رائے سے دس روپے والی عینک ضرور دلوائیں۔

(۱) آنکھوں میں یا ان کے اطراف اکثر درد کی شکایتوں کا ہونا۔
(۲) پڑھتے یا کام کرتے ہوئے سر کو ایک جانب ڈھلکائے رکھنا۔
(۳) آنکھوں کا ناک یا کنپٹیوں کی جانب سے پلٹنے کا میلان۔
(۴) ناک سے قریب کتابیں رکھنے کی ممانعت۔
(۵) دیکھنے کی غرض سے تختۂ سیاہ کے قریب بیٹھنے کی خواہش۔
(۶) مطالعہ میں سر افتادگی کہالت گھبراہٹ۔
(۷) کم نظر بچوں کا گھبرا کے باہر کے کھیلوں سے اغماض کا میلان

سماج سُدھار

(بسلسلہ گزشتہ)

ان کی پروا نہ کیجئے۔ وہ حقیقی معنوں میں پنڈت اور مہاجن کہلاتے کے قابل نہیں۔ وہ خود اپنی اصلاح نہیں کرسکتے تو سماج کی اصلاح کو کیسے پسند کریں گے۔ جب آپ تیار ہوجائیں گے تو ان پنڈتوں کو بھی آپ کا ساتھ دینا پڑے گا۔ —— کہئے کیا آپ پنرو واہ کے لئے تیار نہیں۔ شائد آپ نے بھی چند ایسی معصوم ہستیوں کو دیکھا ہوگا جنھوں نے جوانی میں بیوہ ہوجانے کی وجہ سے اور سماج کے ظلم سے تنگ آکر عصمت فروشی یا رقاصہ کا پیشہ اختیار کرلیا —— حال ہی کا ایک واقعہ میں آپ کو سناتا ہوں اس سے آپ ایک بیوہ کے دل کی حالت کا اندازہ کرسکیں گے۔

سردی کا موسم تھا —— ایک دن' رات کے وقت میں اپنے ایک دوست کے ہاں سے آرہا تھا —— چاندنی رات تھی —— میرے دل میں آیا کہ چلو تفریح کرلیں —— اور میں گاؤں سے کچھ دور نکل گیا —— میں نے دیکھا —— کہ ایک سایہ نہایت تیزی سے آگے کی جانب درختوں کی آڑ میں حرکت کر رہا ہے —— جب میں بھی جلد جلد قدم بڑھا کر اس کے قریب تر ہوگیا تو معلوم ہوا کہ وہ ایک دوشیزہ ہے۔ میں کچھ دیر کے لئے جہاں تھا وہیں کھڑا رہ گیا تاکہ دیکھوں وہ کدھر جارہی ہے —— وہ بھاگنے لگی —— شائد وہ بے خودی کی حالت میں تھی۔ سردی کافی تھی —— لیکن ایسا معلوم ہورہا تھا کہ وہ دوشیزہ سردی کو بالکل محسوس نہیں کررہی ہے۔ وہ بار بار رک جاتی —— تاکہ پاؤں میں چبھے ہوئے کانٹوں کو نکال پھینکے۔ آخر کار وہ ایک نو تعمیر قبر کے پاس رک گئی —— برقعہ الٹ دیا —— اور اس قبر سے لپٹ کر رونے لگی —— آہ! —— وہ ایک بیوہ تھی —— کم سن وحسین بیوہ۔ مرد کو تو

اپنی بیوی کی موجودگی میں بھی چار چار شادیاں کرنے کی اجازت ہے مگر ایک کم سن بیوہ دوبارہ شادی نہیں کرسکتی! —— آج کل کی عورتیں اتنی بھولی بھالی نہیں ہیں جیسے کہ پہلے زمانے کی ہوا کرتی تھیں۔ وہ بیدار ہوگئی ہیں —— وہ لڑیں گی سماج کے خلاف —— اور اپنے حقوق لے کر رہیں گی۔ یہ شادی کا مسئلہ آپ لوگوں کو حل کرنا چاہئے —— ورنہ ضرور ایک وقت ایسا آئے گا کہ تمام بیوائیں متحد ہوکر سماج کے خلاف علم بغاوت بلند کردیں گی۔ اب یہ سوال پیدا ہوسکتا ہے کہ صاحب! —— ہم تو اپنی بہو بیٹیوں کی شادی دوبارہ کرنے کو تیار ہیں مگر ان سے شادی کرے گا کون ؟ —— اس کے لئے میں نوجوانوں سے اپیل کرتا ہوں —— نوجوانو! —— آپ پڑھے لکھے ہیں۔ روشن خیال ہیں آپ اپنی قوم کی بھلائی اور برائی سمجھ سکتے ہیں۔ تو پھر کیا کم سن بال ودھوان کی زندگی برباد ہوتی ہوئی دیکھ سکتے ہیں ؟ —— کہئے بال ودھوان سے شادی کرنے میں کون پاپ ہیں۔ مجھے امید ہے کہ میرے نوجوانان وطن اتنے سنگ دل نہیں بنیں گے۔ ایک بار پھر میں ان والدین سے کہتا ہوں جو اپنی بیوہ بیٹی یا بہو کی دوسری شادی کرنا گناہ سمجھتے ہیں —— کہ وہ اس خیال کو ترک کردیں۔ پنرو واہ تو گناہ ہے لیکن اپنے ہوتے ہوئے اپنی بہو بیٹیوں کی زندگی برباد ہوتے ہوئے دیکھنا گناہ نہیں ؟! —— مجھے امید ہے کہ پنڈت اور مہاجن بھی اس مسئلہ پر غور کریں گے۔ اور ایک دن ایسا آئے گا جب کہ کوئی کم سن بیوہ نہ رہے گی —— کوئی کم سن لڑکی بیوہ نہیں بن سکتی ——" اس کے بعد ہیڈ ماسٹر صاحب نے اپنی تقریر ختم کی۔ ان کی تقریر کے دوران میں زمیندار صاحب بہت بے قرار اور پریشان ہورہے تھے —— ان کی پریشانی کا سبب تو آپ جانتے ہیں۔ وہ سر کے درد کا بہانہ کرکے گھر چلا جانا چاہتے تھے —— لیکن یہ خیال کرکے کہ تمام لوگ متوجہ ہوکر سن رہے ہیں —— اور

ان کا یکایک اس طرح چلا جانا خلاف تہذیب ہوگا ' وہ خاموش بیٹھے رہے ۔ زمیندار صاحب کے پیچھے چند پنڈت لوگ بیٹھے تھے ۔ ان کے چہرے مارے غصے کے سرخ ہوئے جارہے تھے ـــــ ان کی آنکھوں سے وحشت برس رہی تھی ۔ اور ایسا معلوم ہو رہا تھا کہ وہ ہیڈ ماسٹر صاحب کو کاٹ کھانا چاہتے ہیں ـــــ ہیڈ ماسٹر صاحب نے ان کی طرف دیکھا ـــــ اور انھوں نے دانت پیسنے شروع کر دئے ! ---

لیکن ہیڈ ماسٹر صاحب نے ان کی کوئی پروا نہ کی -- ہیڈ ماسٹر صاحب کو معلوم ہوگیا کہ زمیندار صاحب پر ان کی تقریر کا اثر بہت ہوا ہے اور وہ بہت پریشان نظر آرہے ہیں ۔ زمیندار صاحب اٹھے اور گھر کی طرف جانے لگے ـــــ ہیڈ ماسٹر صاحب نے بھی ان کا ساتھ دیا ـــــ دونوں پر خاموشی مسلط تھی ۔ ـــ دونوں کسی گہری سوچ میں معلوم ہو رہے تھے ہیڈ ماسٹر صاحب بار بار زمیندار صاحب کی طرف دیکھ رہے تھے ۔ اور ایسا معلوم ہو رہا تھا کہ وہ ان سے کچھ باتیں کرنا چاہتے ہیں مگر زمیندار صاحب نے ان کی طرف دیکھا تک نہیں .. وہ بہت تیز تیز قدم اٹھاتے ہوئے چلے جارہے تھے ۔ ہیڈ ماسٹر صاحب سوچنے لگے کہیں زمیندار صاحب مجھ پر خفا تو نہیں ہوگئے ـــــ لیکن ان کا خیال غلط تھا ۔ زمیندار صاحب بہت کم غصہ میں آتے تھے اور یہاں تو غصہ میں آنے کی کوئی وجہ نہ تھی ۔ ہیڈ ماسٹر صاحب کی ساری باتیں سچی تھیں ـــــ البتہ انھیں بے حد صدمہ ہو رہا تھا ـــــ اب انھیں لیلا کا اصلی پوزیشن نظر آنے لگا تھا ـــــ ---

(۱۱)

زمیندار صاحب اس رات بالکل نہ سو سکے ۔ صبح جب وہ بیدار ہوئے تو بہت اداس نظر آرہے تھے ـــــ ان کی آنکھیں اندر کو دھنس گئی تھیں ۔ وہ بیمار معلوم ہو رہے تھے ۔ "کیوں ـــــ طبیعت ناساز ہے کیا ؟" نرملا دیوی نے دریافت کیا ۔ "ہاں ۔ ہلکا سا بخار ہے" "کل رات میں آپ بہت دیر تک جاگتے رہے ۔ کیا سوچ رہے تھے ؟" ـــــ نرملا دیوی نے دریافت کیا ـــ "کچھ نہیں کچھ نہیں ـــــ اب تم جاؤ ۔ ذرا مجھے آرام کرنے دو ـــــ ہاں لیلا کے ہاتھ چائے یہیں بھیج دینا" ـــ "اچھی بات ہے" لیلا اپنے پتا جی کے پاس چائے لے کر گئی ---

" آؤ بیٹیا ! ـــــ تم نے پی لی ؟" ـــــ "نہیں ـــــ پی لوں گی ـــ آپ پہلے پی لیجئے" ـــ زمیندار صاحب نے چائے پی اور اس کے بعد لیلا سے کوئی کتاب پڑھنے کے لئے کہا ۔ لیلا پڑھنے لگی ـــــ رات میں بہت دیر جاگے تھے ۔ اس لئے کچھ دیر بعد انھیں نیند آگئی ـــ لیلا اٹھ کر اپنے کمرے میں چلی گئی ـــــ

شام کے وقت ہیڈ ماسٹر صاحب نے لیلا سے دریافت کیا " زمیندار صاحب کی کیسی حالت ہے ؟" ـــ "ہلکا سا بخار ہے ۔ اب وہ کوئی کتاب پڑھ رہے ہیں" ـــــ زمیندار صاحب سے ہیڈ ماسٹر صاحب ملنا چاہتے تھے ۔ لیکن نہ معلوم وہ کیوں نہ جا سکے ـــــ "لیلا ! ـــ باہر چلو گی" ـــ "ہاں ۔ چلوں گی" ـــ "لیکن زمیندار صاحب کے پاس کسی کو رہنا چاہئے ـــ" "ماتا جی ہیں" ـــ "اچھا تو چلو" ـــ وہ دونوں پھر اسی جگہ یعنی ندی کنارے چلے گئے ـــ اور اسی جگہ بیٹھ گئے جہاں وہ ہر شام بیٹھا کرتے تھے ـــــ کچھ دیر وہ دونوں خاموش بیٹھے رہے ـــ "آہ ! ـــ کتنا سندر پھول ہے" ـــــ لیلا نے ایک جنگلی پھول کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا ـــ

"لادوں؟" ہیڈ ماسٹر صاحب نے دریافت کیا۔ لیلاؔ نے کچھ سوچا اور کہا —— "نہیں —— میں خود جاؤں گی ——" اور اپنی جگہ سے کود کر چلی گئی۔ ہیڈ ماسٹر صاحب اس کی طرف دیکھ رہے تھے —— لیلا نے "اوف!" کہہ کر اپنا ہاتھ نکال لیا —— بے چاری کی نازک انگلیوں میں کانٹے چبھ گئے تھے۔ اور خون باہر آنے لگا تھا۔ ہیڈ ماسٹر صاحب بھاگتے ہوئے اس کے پاس گئے اور اپنے رومال سے اس کی زخمی انگلی کو باندھ دیا —— اور وہ پھول کو خود توڑ لیا —— "یہ لو" —— ہیڈ ماسٹر صاحب نے لیلا کی طرف پیش کرتے ہوئے کہا —— "شکریہ!" —— لیلا نے کہا "جنگل میں پیدا ہونے کے باوجود یہ کس قدر خوبصورت ہے!" لیلا نے پھول کو چومتے ہوئے کہا۔ "ہاں" ہیڈ ماسٹر صاحب نے جواب میں کہا —— اور پھر وہ دونوں اپنی اپنی جگہ بیٹھ گئے۔

لیلا خاموش تھی —— شائد پھر وہ مغموم ہوگئی تھی

ہیڈ ماسٹر صاحب نے لیلا کی طرف دیکھا اس کی آنکھوں میں داستان پنہاں ہوتی تھی۔ "لیلا! —— تم خاموش کیوں ہو؟ منو —— پریشور کے لئے ہو تمہیں اداس دیکھ کر میرا دل رونے لگتا ہے۔ تم جانتی ہو —— کہ ......" ہیڈ ماسٹر صاحب کا جملہ ختم ہونے سے پہلے لیلا نے کہا "میں اداس نہیں ہوں —— ہیڈ ماسٹر صاحب" —— "لیلا! —— کل کی تقریر میں میں نے پنڈتوں اور مہاجنوں کو بہت برا بھلا کہا ہے۔ تمہارے پتاجی پر بھی میری تقریر کا بہت اثر ہوا۔ وہ شاید مجھ سے خفا ہوگئے ہیں ——" "نہیں نہیں —— میرے خیال میں وہ آپ سے خفا نہیں ہیں —— البتہ کل سے بہت اداس اور پریشان معلوم ہو رہے ہیں —— اور میری طرف دکھ بھری نگاہ سے دیکھتے ہیں ——" اس کے بعد لیلا خاموش ہوگئی۔ کچھ دیر بعد پھر اس نے کہا "ہیڈ ماسٹر صاحب! —— مجھ ابھاگن کے لئے آپ کیوں خواہ مخواہ اداس ہوتے ہیں ——"

"لیلا! —— کیا بتاؤں؟ —— تمہیں رنج ہوتا ہے تو مجھے بھی رنج ہوتا ہے —— شائد ہم الگ الگ نہیں بلکہ ایک ہوگئے ——" لیلا کے رخساروں میں سرخی دوڑ گئی —— "لیلا! تمہارے پتاجی نے کچھ کل کی تقریر کے بارے میں تم سے کہا؟" "نہیں —— کچھ نہیں کہا" —— "نہ معلوم کب تک یہ لوگ پرانے لوگوں کے بتائے ہوئے راستوں پر چلتے رہیں گے۔ کبھی وہ یہ سوچنے کی کوشش نہیں کرتے کہ بزرگوں نے جو باتیں انھیں بتائی ہیں —— اس میں کچھ غلطیاں بھی ہیں کہ نہیں —— بس لکیر کے فقیر بنے ہوئے ہیں" —— "انھیں سدھرنے کے لئے بہت عرصہ لگے گا" —— کچھ دیر بعد ہیڈ ماسٹر صاحب نے کہا "کاش زمیندار صاحب تمہاری شادی دوبارہ کرنے پر تیار ہو جائیں"۔

—— لیلا نے کچھ نہ کہا، وہ خاموش تھی —— بت کی طرح —— اس کا چہرہ کملانے لگا —— ہیڈ ماسٹر صاحب نے لیلا کی طرف دیکھا —— اور پھر باتوں کا رخ بدل دیا —— اور موسم کے متعلق باتیں کرنے لگے —— تاریکی چاروں طرف پھیل چکی تھی —— اس لئے وہ گھر کی طرف روانہ ہوگئے ...... ——

لیلا اپنے کمرے میں چلی گئی۔ اور کسی کتاب کے مطالعہ میں مصروف ہوگئی۔ تھوڑی دیر بعد وہ اپنے پتاجی کو دیکھنے کے لئے ان کے کمرے میں گئی۔ زمیندار صاحب کو اب بخار زیادہ آگیا تھا وہ بہت بے قرار معلوم ہو رہے تھے۔ "لیلا تم آگئیں —— ذرا اپنی ماں کو تو بلا لو ——" زمیندار صاحب نے کہا۔ لیلا نے جا کر اپنی ماں سے کہہ دیا "پتاجی انہیں بلا رہے ہیں" (نرملا دیوی) زمیندار صاحب کے پاس گئیں "طبیعت کیسی ہے؟" "ویسی ہی ہے —— بے قراری بڑھ رہی ہے" —— "تو ہیڈ ماسٹر صاحب سے کہدوں کہ کسی ڈاکٹر کو بلا لائیں ——" "نہیں۔ ڈاکٹر کی

ضرورت نہیں"۔۔۔۔ زمیندار نے کہا "زرملا! معلوم ہیں کیوں
ایسا محسوس کرتا ہوں کہ میرے پر ایک بہت بھاری پتھر رکھ دیا
گیا ہے میرا دل ہمیشہ اداس رہتا ہے۔۔۔۔ ہاں مجھ پر ایک
بہت بڑا بوجھ ہے۔ اور وہ بوجھ لیلا ہے!"۔۔ "کیا کہہ رہے
ہیں آپ؟۔۔ لیلا کیسے ہم پر بوجھ ہو سکتی ہے ہم ہی نے تو
اسے پالا پوسا ہے۔ وہ ہمارے ہاں نہ رہے گی تو کس کے
ہاں جائے گی؟۔۔۔" "میرا مطلب یہ نہیں تھا زرملا!....
تم نہیں سمجھیں...... ایک نوجوان بیوہ کا اس طرح زندگی
گزارنا۔ کتنا تکلیف دہ ہے۔۔۔ ہم اس کے ماتا پتا ہیں۔
اسے رنج ہو تو...... کیا ہم خوش رہ سکتے ہیں؟...... اف!
۔۔۔ بیچاری لیلا!۔۔ کاش کہ وہ اپنے شوہر کے مرنے سے
پہلے مرجاتی۔۔ آہ!۔۔ پیاری لیلا"۔۔ "یہ آپ آج کیسی
باتیں کر رہے ہیں...... آپ کی طبیعت اچھی نہیں ہے....
خاموش سو جائیے...... زیادہ کہنے سے آپ کو تکلیف ہو گی
۔۔" زرملا دیوی نے پریشان ہو کر کہا "زرملا!۔۔ تم ہی بتاؤ
مجھے کوئی ایسا راستہ... کہ میری عزت بھی بچے اور
لیلا سکھ پائے......"۔۔۔ "پرمیشور کے دھیان کے
سوا کوئی ایسی چیز نہیں جو ہمارے دلوں کو شانتی دے سکے"
"یہ تو میں بھی جانتا ہوں۔۔۔ لیکن"۔۔۔ اتنے میں لیلا
بھی ان کے کمرے میں آگئی۔۔۔۔ زمیندار صاحب خاموش
ہو گئے۔ "بیٹا!۔۔ آج تم اکیلی گئی تھیں تفریح کے لئے؟"
"جی نہیں۔۔ ہیڈ ماسٹر صاحب بھی ساتھ تھے"۔۔ "اچھا
۔۔ تمہاری ماں تو میرے پاس رہے گی۔۔ تم جاؤ اور
ہیڈ ماسٹر کے لئے کھانے کا انتظام کر دو"۔۔۔ "اچھی بات ہے
پتا جی" کہہ کر لیلا چلی گئی۔۔۔ زمیندار صاحب نے پھر کہنا
شروع کیا۔ "وہ کب تک اپنے جذبات، اُمنگوں اور آرزوؤں
کو دبائے رکھے گی...... آخر وہ بھی انسان ہے......؟"
۔۔۔ "جو اس کی قسمت میں لکھا تھا ہوا۔۔ ہم کیا کر سکتے
ہیں"۔ "کیا اس کی دوسری شادی کر دوں؟" "ام!......
دوسری شادی!!...... کیسی باتیں کر رہے ہیں آپ؟......
پنروواہ!۔۔ ایک برہمن کی لڑکی...... اور دوسری شادی!
۔۔۔ سماج کیا کہے گا۔ ہماری تو برادری میں ناک کٹ جائے گی
۔۔۔" زمیندار صاحب کچھ دیر خاموش رہے۔ زرملا دیوی
ان کے قریب کرسی پر بیٹھی ہوئی تھیں۔۔۔ "آہ!۔۔
کتنی اچھی...... بھینی بھینی خوش بو ہے...... ان گلاب
کے پھولوں کی...... تم نے تو انھیں اپنے بالوں میں لگالیا ہے
...... لیکن لیلا ان سے محروم ہے۔ وہ لگا نہیں سکتی!
۔۔۔ سماج نے اسے منع کر دیا ہے۔ سماج!" "ہاں۔ ہاں۔
ایک بیوہ کا بالوں میں پھول لگانا پاپ ہے"۔ زمیندار صاحب
کے لبوں پر ایک پھیکا تبسم کھیلنے لگا۔۔ شائد وہ سماج کو
کوس رہے تھے۔۔۔ ان کی آنکھوں سے آنسوؤں کے
دو بڑے بڑے قطرے نکل کر ان کے رخساروں پر ڈھلک
گئے۔۔ اور پھر رخساروں سے ڈھلک کر ان کی قمیص میں
جذب ہو گئے۔۔۔ زرملا کا دل بھی بھر آیا اور وہ بھی رونے
لگی۔۔ اس کے دل میں بھی یکایک یہ خیال آگیا۔۔ کہ لیلا کی
شادی کیوں نہ کر دی جائے۔۔۔ آخر وہ ماں تھی۔ وہ لیلا کو
رنجیدہ نہیں دیکھ سکتی تھی۔ لیکن معاً اسے سماج کا خیال آجاتا
۔۔۔ اور وہ پھر مغموم ہو جاتی۔۔۔ ناتھ!۔۔ کیا یہ ممکن
ہے کہ ہم سماج سے بے نیاز ہو جائیں"۔ "کوئی بات ناممکن
نہیں"۔۔۔ "تو پھر...... لیکن......"۔۔۔ زرملا دیوی
رک گئیں۔۔۔ "تو پھر...... کیا؟۔۔ بولو۔۔ بولو۔ کیا لیلا
کی شادی کر دیں گے؟۔۔۔"۔۔۔ "مگر ناتھ!۔۔ سب ہمارے

دشمن بن جائیں گے۔ پنڈت ہمارے پاس کھانا پاپ سمجھیں گے۔ ہمیں خارج از ملت کر دیا جائے گا ــــــ" "اف!" زمیندار صاحب نے ایک لمبی سانس لی۔ "ناتھ!ــــ آپ اب آرام فرمائیے۔ میں آپ کے لئے کھانا لاتی ہوں ـــــ" یہ کہہ کر نرملا دیوی اٹھ کر چلی گئیں ــــ زمیندار صاحب تنہائی پا کر پھر خیالات کے سمندر میں غوطے لگانے لگے۔

دوسرے دن ـــــ شام کے وقت پانچ بجے ہیڈ ماسٹر صاحب جب مدرسے سے واپس ہوئے تو لیلا ان کے کمرے کے پاس کھڑی تھی ــــ "ہیڈ ماسٹر صاحب! آج صبح میں آپ مدرسے کو بہت جلدی چلے گئے ــــ ایسا کون ضروری کام تھا؟ ــــ" "ہاں کچھ کام تھا۔ آؤ بیٹھیں" ـــــ "نہیں۔ چائے کا وقت ہو گیا ہے۔ میں یہاں بیٹھی رہوں گی تو کام کیسے چلے گا۔ آپ کوٹ وغیرہ اتار دیجئے۔ میں پھر آتی ہوں ــــ" لیلا جانے لگی ـــــ "او لیلا!" ہیڈ ماسٹر صاحب نے پکارا۔ "کیا ہے" ــــــ "اب زمیندار صاحب کی طبیعت کیسی ہے" "کچھ ٹھیک ہے ۔ سو گئے ہیں" لیلا نے جواب دیا ۔ "پرمیشور کی کرپا ہے" ــــ ہیڈ ماسٹر صاحب نے اپنا کوٹ اتار دیا ۔ اور ایک کرسی پر بیٹھ گئے ــــ کچھ دیر بعد لیلا پھر آ گئی ــــ اور اس کے پیچھے نوکر نے چائے لائی ۔ "لیلا!ــــ میں تمہارا بہت ہوں ـــــ" "کیوں؟" ــــ اس لئے کہ تم میرا اتنا خیال رکھتی ہو اور وقت پر مجھے ہر چیز مل جاتی ہے" ــــ "آپ ایسا کہہ کر مجھے شرمندہ کر رہے ہیں ــــ اوہو!ــــ آپ کو تو شکر کے صرف دو چمچے چاہئے ۔ میں نے بھول کر چار ڈال دئے ــــ خیر اس پیالی کو میں لے لوں گی ـــــ" "مناسب ہے" ـــــ دونوں نے چائے پی لی ۔ کچھ دیر بعد لیلا نے کہا

"ہیڈ ماسٹر صاحب! ــــ نہ معلوم چند روز سے میری طبیعت ہر وقت بے قرار کیوں رہتی ہے ۔ نہ پڑھنے میں دل لگتا ہے اور نہ کسی اور کام میں ۔ سچ پوچھئے تو مجھے یہ سب چیزیں ــــ میز، کرسی، پلنگ، ہارمونیم اور ریڈیو وغیرہ سے نفرت ہو گئی ہے ــــ نہ معلوم کیوں ــــ" ہیڈ ماسٹر صاحب لیلا کے دل کی کیفیت کو سمجھ رہے تھے ۔ اتنے میں نرملا دیوی نے لیلا کو پکارا اور وہ اٹھ کر چلی گئی ـــــ

"لیلا!ــــ ذرا ہیڈ ماسٹر کو بلاؤ۔ ان کی طبیعت یکایک پھر خراب ہو گئی ہے" نرملا دیوی نے کہا۔ لیلا بھاگتے ہوئے ہیڈ ماسٹر صاحب کے پاس گئی ـــــ اور کہا "ہیڈ ماسٹر صاحب! ماں بلا رہی ہیں آپ کو۔ پتا جی کی طبیعت پھر خراب ہو گئی ہے" ہیڈ ماسٹر صاحب زمیندار صاحب کے کمرے میں گئے۔ زمیندار صاحب کچھ بڑبڑا رہے تھے ۔ "میں جا کر حکیم کو بلا لاتا ہوں ۔ آپ یہیں رہئے" ہیڈ ماسٹر صاحب نے کہا اور باہر چلے گئے ــــ

کچھ دیر بعد ہیڈ ماسٹر صاحب حکیم صاحب کے ساتھ زمیندار صاحب کے کمرے میں داخل ہوئے۔ حکیم نے زمیندار صاحب کی نبض دیکھتے ہوئے کہا "فکر نہ کیجئے ۔ انھیں کوئی ذہنی صدمہ پہنچا ہے۔ اور بار بار کسی خیال سے ان کی طبیعت خراب ہو جاتی ہے جلد اچھے ہو جائیں گے ـــــ" اس کے بعد انھوں نے کچھ دوا دیتے ہوئے کہا "اسے آپ ہر دو گھنٹے کے بعد پلا دیئے" ـــــ "میں کل پھر آؤں گا" ــــ حکیم صاحب چلے گئے۔ ــــ حکیم صاحب کے جانے کے دو گھنٹے بعد زمیندار صاحب کی حالت پھر سدھر گئی ۔ "اب آپ کی طبیعت کیسی ہے" ہیڈ ماسٹر صاحب نے دریافت کیا "ٹھیک ہے ۔ تاہم اٹھ کر چلنے کو جی نہیں چاہتا" ـــــ

(۱۳)

ہیڈ ماسٹر صاحب زمیندار صاحب کے کمرے سے اٹھ کر اپنے کمرے میں آ گئے۔ اور ایک آرام کرسی کھینچ کر بیٹھ گئے۔ لیلا ان کے کمرے کے سامنے سے گزر رہی تھی۔ ہیڈ ماسٹر صاحب نے اسے بلا لیا "بیٹا! —— ذرا ادھر تو آؤ —— کچھ دیر باتیں کریں کہ طبیعت اداس ہو گئی ہے ——" لیلا ان کے پاس گئی اور خود بھی ایک کرسی کھینچ کر بیٹھ گئی —— "پرمیشور کی کرپا ہے کہ اب پتا جی کی طبیعت ٹھیک ہے" لیلا نے کہا —— "لیکن بیٹا! حکیم صاحب نے کہا کہ زمیندار صاحب ذہنی کشمکش میں پڑ گئے ہیں۔ آخر کون ایسی بات ہے جو انہیں پریشان کر رہی ہے —— ہاں مجھے تو شاید یہ معلوم ہے کہ ان سب مشکلات کا سبب ہے۔ کیا زمیندار صاحب کے پاس جا کر ان سے معافی مانگوں؟ —— "مگر آپ پوچھتی نہیں میں" ہیڈ ماسٹر صاحب [illegible] معاف کر دو لیکن آپ [illegible] شادی کیوں نہیں کر لیتے [illegible] آپ کا بوجھ ہلکا ہو جائے گا —— لیکن پھر نہیں کہا ——" لیلا خاموش تھی شاید وہ کچھ سوچ رہی تھی۔ تھوڑی دیر تک ادھر ادھر کی باتیں کرنے کے بعد لیلا نے کہا "ہیڈ ماسٹر صاحب آپ کب تک اس طرح اکیلے رہیں گے۔ شادی کر لیجئے نا ——" "لیکن میری دلہن ابھی تیار نہیں ہے" ہیڈ ماسٹر صاحب نے مذاق کے انداز میں کہا —— "کیوں؟ —— کون دلہن ہے ——" "تم —— لیلا! تم میری دلہن ہو کیا نہیں؟ —— ذرا اپنے دل سے پوچھو" —— "مگر آپ کو معلوم ہے ——" "ہاں مجھے سب کچھ معلوم ہے۔ اور پھر بھی تم میری دلہن ہو۔ میں زمیندار صاحب کو تمہاری شادی کر دینے کے لئے راضی کر لوں گا ——" کچھ دیر وہ اسی قسم کی باتیں کرتے رہے۔ نرملا دیوی نے لیلا کو پکارا اور وہ چلی گئی ——

دوسرے دن ہیڈ ماسٹر صاحب مدرسے کو جانے کی تیاری کر ہی رہے تھے کہ لیلا ان کے کمرے میں آئی اور کہا۔ "پتا جی آپ کو یاد فرما رہے ہیں ——" ہیڈ ماسٹر صاحب زمیندار صاحب کے پاس اسی وقت چلے گئے۔ اور لیلا باورچی خانہ میں چلی گئی، جہاں اس کی ماں تھی۔

"آئیے ہیڈ ماسٹر صاحب! — آپ سے چند ضروری باتیں کرنی ہیں ——" "فرمائیے" ہیڈ ماسٹر صاحب نے کہا۔ "ہیڈ ماسٹر صاحب! — یوں تو لیلا کی حالت دیکھ کر مجھے پہلے سے افسوس ہوتا تھا لیکن آپ کی تقریر سننے کے بعد [illegible] اور بڑھ گئی ہے" —— ہیڈ ماسٹر صاحب کچھ کہنا چاہتے تھے لیکن انہیں موقع نہ ملا۔ زمیندار صاحب نے کہنا شروع کیا —— "میں نہیں چاہتا کہ لیلا اس طرح اپنی زندگی برباد کرے۔ لیکن سماج اور صرف سماج کے [illegible] نے مجھے لیلا کی دوسری شادی کرنے سے روک رکھا ہے۔ کئی بار اس کی شادی کا ارادہ کیا لیکن پھر بھی اس خیال کو ترک کر دینا پڑا —— کیا آپ مجھے کوئی رائے دے سکتے ہیں؟ ——" ہیڈ ماسٹر صاحب یوں اپنے مطلب کو خود بخود نکلتے دیکھ کر بول اٹھے "آپ بلا خوف لیلا کی شادی کر دیجئے۔ سماج کا ڈر فضول ہے ان پنڈت اور مہاجنوں کی ڈانٹ اور دھمکی سے نہ ڈریئے۔ وہ خود بخود راستے پر آ جائیں گے ——" "ہاں —— میں نے ارادہ کر لیا ہے کہ لیلا کی شادی کر دوں گا۔ اب مجھ سے اس کی حالت دیکھی نہیں جا سکتی —— اور میری بیماری کی بھی یہی وجہ ہے ہیڈ ماسٹر صاحب! ... مگر ... ایک اور

مشکل درپیش ہے“ ـــــ ”وہ کیا ؟“ ـــــ ”شادی کرے گا کون ؟ ـــــ کوئی نہیں کرے گا ـــــ ودھوا سے شادی کرنا لوگ پاپ سمجھتے ہیں۔ اُف ! ـــــ بڑی مصیبت میں پھنس گیا ہوں۔ میرا دماغ معطل ہوا جارہا ہے۔ ہاں ! ـــــ کون کرے گا شادی ؟ ـــــ کوئی ایسا نوجوان ہے جو سماج کو ٹھکرا دے۔ ہے کوئی ایسا نوجوان جو بچاری لیلاؔ کو سکھ دے سکے ؟ ـــــ کاش کوئی نکل آئے“ ـــــ ہیڈ ماسٹر صاحب کے لئے اس سے بہتر کون موقع تھا۔ ”کیوں نہیں۔ ـــــ زمیندار صاحب ! ـــــ میں کروں گا لیلاؔ سے شادی۔ اگر آپ مناسب سمجھیں“ ـــــ ”کیا ؟ ـــــ یہ آپ سچ کہہ رہے ہیں ؟“ ـــــ ”ہاں بالکل سچ کہہ رہا ہوں زمیندار صاحب“ ـــــ ”اوہو ! ـــــ میرے ہیڈ ماسٹر صاحب !“ ـــــ کہہ کر وہ بستر سے اٹھے اور ہیڈ ماسٹر صاحب کو گلے لگا لیا۔ ”آپ نے میری جان بچائی۔ ورنہ اسی فکر میں گھل گھل کر مرجاتا ـــــ آہ ! ـــــ میں تمہارا کس قدر ممنون ہوں ـــــ ”مدرسہ کو دیر ہورہی ہے ـــــ میں جاسکتا ہوں ؟ ـــــ“ ہیڈ ماسٹر صاحب نے دریافت کیا ”جاسکتے ہیں ـــــ لیکن جاتے جاتے ذرا نرملا کو میرے پاس بھیج دیجئے“ ـــــ ”بہت اچھا“

نرملا دیوی بھاگ کر زمیندار صاحب کے پاس گئی اور پوچھا ”کیا ہے ناتھ ! ـــــ کیسی ہے طبیعت“ ـــــ ”اب بالکل ٹھیک ہے ہاں بالکل ٹھیک“ ـــــ ”پرمیشور کی کرپا ہے“ نرملا نے کہا ـــــ ”نرملا ! ـــــ میری فکر دور ہوگئی ـــــ میں لیلاؔ کی شادی کردوں گا ـــــ سمجھیں ؟ ـــــ“ ”ہیں ! . . . . . مگر سماج . . . .“ ـــــ ”سماج ، سماج ! ـــــ سماج کو مارو گولی ـــــ“ ”مگر یہ بھی سوچا ہے ودھوا سے کون شادی کرے گا ؟ ـــــ“ ”ہیڈ ماسٹر صاحب“ ـــــ ”ہیڈ ماسٹر صاحب ! ـــــ لیلاؔ سے شادی کریں گے !! ؟“ ـــــ ”ہاں ہاں ـــــ میں سچ کہہ رہا ہوں۔ ابھی میں نے ان سے بات چیت کی۔ انھوں نے وعدہ کرلیا ہے۔ اب تاریخ مقرر کرنے کی دیر ہے“ ”کتنے اچھے آدمی ہیں ہمارے ہیڈ ماسٹر صاحب“ نرملا کے منہ سے بے اختیار نکل گیا ـــــ اور وہ بھاگتی ہوئی لیلاؔ کے پاس گئیں اور اس کے رخساروں کو چوم لیا۔ لیلاؔ پریشان ہوگئی۔ اسے کچھ سمجھ میں نہ آیا ”لیلاؔ ! ـــــ تمہارے پتاجی نے کہا ہے کہ وہ تمہاری شادی کردیں گے۔ ہیڈ ماسٹر صاحب کے ساتھ ! ـــــ خوش ہونا ـــــ ؟“ ـــــ لیلاؔ کا چہرہ خوشی اور شرم سے لال ہوگیا ـــــ نرملا دیوی پھر زمیندار صاحب کے پاس گئیں۔ ہیڈ ماسٹر صاحب کی شادی چار مہینے بعد ہونی طے پائی ـــــ

ایک ، دو ، تین ـــ اور چار مہینے گزر گئے۔ آج ہیڈ ماسٹر صاحب کی شادی کا دن ہے۔ ان کے تمام دوست مدعو ہیں ہر ایک شخص خوش نظر آرہا ہے۔ زمیندار صاحب اور نرملا دیوی کی خوشی کی تو انتہا نہ تھی ـــــ اور لیلا ـــ وہ بھی بے حد خوش تھی اس لئے کہ اس کی مراد پوری ہوگئی تھی۔ لوگ ہیڈ ماسٹر صاحب کی تعریف کررہے تھے۔ انھوں نے نہ صرف تقریر کی بلکہ اس پر خود عمل بھی کیا ـــــ تمام پنڈت لے چون وچرا شادی کے رسوم ادا کر رہے ہیں ـــــ آج انھیں پنڈ ودھا کے آگے سر جھکانا پڑا۔ ادھر شادی کے رسوم ادا ہورہے تھے اور ادھر ریڈیو سے یہ گانا سنائی دے رہا تھا۔

”سماج کی بندشوں سے دور ... سمجھی ... کے

ایلا اپنی نئی نگریا بسائیں گے“

جے آر۔ ڈیسائی

گمراہی

بڑھی جا رہی ہے چلی جا رہی ہے ترقی کی رو میں بہی جا رہی ہے
ہوائیں بھی پیچھے رہی جا رہی ہیں نگاہوں سے اوجھل ہوئی جا رہی ہے
خدا جانے دنیا کہاں جا رہی ہے

فلک پر ستاروں کے جھرمٹ سے آگے جزیروں میں اڑتے ہوئے بادلوں کے
سمندر کی امواج کے پیچ و خم میں زمیں میں کہیں پستیوں کے بھی نیچے
خدا جانے دنیا کہاں جا رہی ہے

فقط اک بہیمانہ لذت کے پیچھے خیالی و بے سود عشرت کے پیچھے
پریشان پریشان بھٹکتی بھٹکتی! اذیت سے لبریز راحت کے پیچھے
خدا جانے دنیا کہاں جا رہی ہے

اجالے سے ہٹ کر سیاہی کی جانب بہ ایں ہوشمندی تباہی کی جانب
بہ فیضِ تمدن، خود اپنی خوشی سے خداوندی و کج کلاہی کی جانب
خدا جانے دنیا کہاں جا رہی ہے

خرد کی جنوں کاریوں کے سہارے عمل کی زبوں کاریوں کے سہارے
محبت کے جلوؤں سے دامن بچا کر ہوس کی فسوں کاریوں کے سہارے
خدا جانے دنیا کہاں جا رہی ہے

مساوات کو بیخ و بن سے ہلا کر دلوں کے سکوں کو دلوں سے مٹا کر
بہ صد عیش کوشی بہ صد بے نیازی حقیقت کو رنگیں فسانہ بنا کر
خدا جانے دنیا کہاں جا رہی ہے

جہنم کی تپتی ہواؤں کی زد میں گرجتی کڑکتی گھٹاؤں کی زد میں
بلاؤں میں گھر کر بلاؤں سے غافل اجل کی دہکتی فضاؤں کی زد میں
خدا جانے دنیا کہاں جا رہی ہے

سلیمان اریب

حیدرآباد ایجوکیشنل کانفرنس

(خطبۂ صدارت)

حیدرآباد ایجوکیشنل کانفرنس کے سال حال کے سالانہ اجلاس بمقام نظام آباد بتاریخ ۱۳ و ۱۴ ذیقعدہ ۱۳۶۲ھ منعقد ہوئے۔ اسکی صدارت ملک کے ایک قابل اور روشن خیال فرد مولوی غلام احمد خاں صاحب سابق صوبہ دار اورنگ آباد نے فرمائی۔ اس کانفرنس اور اس قسم کے دیگر اجتماعوں میں ایک روایت سی پڑ گئی ہے کہ اپنے اجلاسوں کی صدارت کے لئے بالعموم ملک کے امرا یا اعلیٰ عہدہ داروں ہی میں سے کسی کو منتخب کیا جاتا ہے خواہ وہ امیر یا عہدہ دار اس کا اہل بھی ہوں یا نہ ہوں۔ اس ایجوکیشنل کانفرنس نے اس سال اس روایت کو توڑ کر بڑا اچھا اقدام کیا اور اخلاقی جرأت سے کام لیا ہے اس نے ایک ایسے ملک دوست کو اپنا صدر منتخب کیا جو ذہنی آزادی کے ساتھ تعلیمی مسائل پر روشنی ڈال سکتا ہے۔ اگرچہ مولوی غلام احمد خاں صاحب کا پورا خطبہ اس قابل تھا کہ اسکو سب رس کے صفحات پر نقل کیا جاتا لیکن کاغذ کی مجبوری کے باعث صرف چند اجزا بطور نمونہ درج کئے جاتے ہیں۔ "ادارہ"

یہ عریاں حقیقت ہے کہ اس وقت تک ہم بغیر کسی پلان کے۔ بغیر کسی منصوبے کے اور بغیر کسی نقشہ کے چلے جا رہے ہیں۔

عزم سفر مغرب و رو در مشرق
اے راہ رو پشت بہ منزل ہشدار

حکومت ہند کی اب یہ پالیسی ہے کہ ریاستیں بھی اپنے صنایع میں ترقی کریں۔ اب میں آپ کے غور و فکر کے لئے چند فنی اور عام تعلیم کے متعلق تجاویز پیش کرتا ہوں۔

انجینیرنگ اس شعبہ میں مختلف قابلیت کے نوجوان کام کے ذیل کے لئے تیار کرائے جاسکتے ہیں۔ تعمیر و درستی تالاب، کنٹہ جات، باؤلیات، عمارات، سڑک، برقابی، معاون، میکانی کام، آرکیٹیکچر (تعمیر کاری) بہر حال یہ شعبہ نہایت وسیع ہے اور تعلیم یافتہ نوجوانوں کا بڑا حصہ اس میں کارآمد ہو سکتا ہے۔

تجارت ہمارے ملک میں بنکوں کے کاروبار میں کافی وسعت ہو رہی ہے اور آیندہ صنایع کے لحاظ سے اور بھی زیادہ امکانات ہیں اس لئے تجارتی کالج کا قیام نہایت ہی مفید ثابت ہوگا۔

طبابت موجودہ تعلیم اور نظام العمل از سرِ نو تنظیم کے لائق ہے۔ دیہاتوں میں طبی امداد مفقود ہے اور جو کچھ بھی قصبات میں ہے وہ غریبوں کیلئے کارآمد نہیں ہے۔ انگریزی ادویات اس قدر گراں ہیں کہ ہندوستان کا افلاس کا متحمل نہیں ہو سکتا۔ دیسی ادویہ سے کس حد تک کام لیا جاسکتا ہے اس کی تحقیق کی ضرورت ہے۔ حیدرآباد کو اکثر کاموں میں اقدامِ عمل کا فخر ہے۔ ایک میٹریا میڈیکا اور ایک انڈین فارماکوپیا کی ترتیب عمل میں لائی جائے تو یہ ایک نمایاں کام ہوگا۔

اسی ضمن میں حفظان صحت میں عورت اور مرد نرسوں اور دایہ کی ٹریننگ کو بھی شامل کیا جاسکتا ہے۔

کمسٹری کے طلبہ طبی نباتات کی کاشت کیمیائی ایرو اور رنگ سازی کے کارخانوں میں کام کرسکتے ہیں اور ان کا میدانِ عمل کافی وسیع ہو سکتا ہے۔

زراعت اس کی تعلیم کی دو شقیں کی جانی چاہئیں ایک تو تحقیقاتی اور دوسری فنی۔ متعلقہ صنعتوں کو کافی اہمیت دیجانی چاہیے۔ مثلاً میوہ اور ترکاری کی کاشت۔ مرغی خانے، مچھلی کی پرورش، شیر خانے، مویشی اور بکروں کی پرورش وغیرہ۔ اس شعبہ کی تعلیم میں دو بڑی ضروریات ہیں ایک تو یہ کہ اس میں عملیت زیادہ ہو اور دوسرے یہ کہ اس کے فوائد اور اثرات دور دور ہر موضع تک پہنچنے چاہئیں۔

قانون اس شعبہ میں اتنی کثرت ہو رہی ہے کہ اندیشہ ہے کہ اس کے وقار کو صدمہ پہونچے۔ گزشتہ تین سال سے قانون کے طیلسانین کا سالانہ اوسط پچاس رہا ہے۔ اس مسئلہ پر غور کیا جاسکتا ہے کہ ان میں دو قسمیں کی جائیں۔ ایک تو وہ جو

عدالتوں میں پیروی کریں اور دوسری وہ جو دستاویزات اور بریف کی تیاری کریں موجودہ حالات میں اس طریقۂ عمل سے مقدمہ بازی کو اور گراں کرتا ہے۔ لیکن اس کے ساتھ ہی پنچایتوں کے قیام سے عدالتی کاروبار میں کمی ہونے کی امید ہے اور جو تجاویز پیش کی گئیں ان سے ملک کی مرفہ الحالی میں لازماً اضافہ ہونے والا ہے۔

متفرق شعبہ جات۔ مثلاً صحافت، حساب، کاروبار بیمہ کی تعلیم دلائی جانے سے مزید ذرائع معیشت حاصل ہو سکتے ہیں۔

صنعت و حرفت

اس کی تعلیم کے لئے ابتداء ہی سے سہولت مہیا کی جانی چاہیے عام تعلیم کے ساتھ اس کے رجحانات کو بھی شامل رکھا جانا چاہیے۔ بڑے کارخانوں سے یہ سمجھوتہ ضروری ہے کہ طلبہ وہاں عملی کام سیکھیں۔ بڑے کارخانوں کے قریب اس قسم کے مدارس کا قیام زیادہ مفید ہوگا۔

تعلیم جسمانی

کا مسئلہ بھی نہایت اہم ہے جب تک ہماری جسمانی حالت درست نہ ہو۔ ہمارے دماغی قویٰ بیکار ہیں۔ کافی غذا کے ساتھ ہر مدرسہ میں اس کا باقاعدہ طریقہ پر انتظام رہنا چاہیے کہ ہمارے افراد جسمانی اعتبار سے بھی ناقص نہ رہیں۔

عام تعلیم۔ ابتدائی تعلیم کا موجودہ طریقہ ہمارے حالات کے لئے بالکل مطابقت نہیں رکھتا ہے۔ میرے علم میں ایسے واقعات ہیں کہ تعلیم کے بعد چونکہ نوشت و خواند کا سلسلہ قائم نہیں رہتا ہے اس لئے جو کچھ لڑکوں نے پڑھا تھا وہ سب بھول گئے! ابتدائی تعلیم کے ساتھ ہی زرعی اور صنعتی تعلیم شروع کی جانی چاہئے۔

لازمی اور مفت تعلیم کے بغیر کوئی ملک ترقی نہیں کر سکتا۔ اس لئے ابتدائی تعلیم لڑکے اور لڑکیوں کے لئے ایک خاص عمر لازمی اور ساتھ ہی مفت ہونی چاہیے۔

جب ہمارے پاس ایک جامعہ موجود ہے تو تعلیم نسواں کے لئے بھی ایک خاص نصاب مقرر کیا جانا چاہیے۔

تعلیم بالغان

اس خصوص میں بہت زیادہ وسیع پیمانہ پر کام کی ضرورت ہے۔ ادارۂ ادبیات اردو اچھا کام کر رہا ہے لیکن بالآخر اس کے وسائل اور ذرائع محدود ہیں۔ یہ کام حکومت کا ہے کہ وسیع پیمانے پر اس کا انتظام قائم کرے۔

"تعلیم بالغان کا کام اس ادارہ نے ضمناً کیا ہے اور اس کو کامیابی سے یہ ادارہ انجام دے رہا ہے اس کا واقعی کام تو تاریخ دکن کی معلومات کا فراہم کرنا ہے اس خصوص میں جو تحقیقات کی گئی ہے وہ ایک نمایاں کام ہے۔"

ثانوی تعلیم کو حالیہ ضروریات میں نہایت اہم جگہ دی گئی ہے۔ ثانوی تعلیم ختم کرنے کے بعد طالب علم کے سامنے دو راستے آتے ہیں ایک تو اعلیٰ تعلیم کا اور دوسرے کسی فن یا پیشہ کے اختیار کرنے کا حالات حاضرہ میں طالب علم کو کوئی اندازہ نہیں رہتا کہ وہ اس مقام پر پہونچنے کے بعد کیا کرے گا۔ ثانوی تعلیم کا نصاب ایسا ہونا چاہئے اور اساتذہ کو اس کا خیال رکھنا چاہیے کہ طالب علم اس درجہ کو ختم کرنے کے بعد ایک کامیاب راستہ اختیار کرے۔

جامعاتی تعلیم

تعلیم کا یہ آخری اور نہایت اہم درجہ ہے ملک کا دماغ اور ملک کی قوت اس سے حاصل ہوتی ہے۔ اسی کے طیلسانین ملک کی صنعت اور تجارت کو چلانے والے ہوتے ہیں۔ یہی طیلسانین ہوں گے جو اپنی تعلیم ختم کرنے کے بعد تحقیقات کا کام کریں گے۔ ایسے طالب علم جو تحقیقات میں مصروف ہوں ان کو فکر معیشت سے آزاد رکھا جانا چاہیے تاکہ وہ پورے انہماک سے اپنے کام میں مشغول رہیں۔

جامعہ میں قدیم ثقافتوں کی تعلیم HUMANITIES کم نہ کی جائے لیکن زیادہ زور سائنٹفک اور پیشہ جات کی تعلیم پر دیا جانا چاہیئے۔ ہندوستان کی جامعات کا ایک دوسرے سے ایسا رابطہ قائم کیا جائے کہ تحقیقات کے معاملہ میں ایک دوسرے سے امداد حاصل کریں اور اس وقت جو تواردو تکرار ہے وہ رفع کی جائے۔ ہر ایک یونیورسٹی کو کسی نہ کسی مضمون میں مہارت خصوصی حاصل کرنی چاہیئے تاکہ تحقیقات کے معاملہ میں مدد ملے تحقیقات کا مسئلہ ہندوستان کے لئے نہایت اہم ہے۔ ہم یہ سنتے رہتے ہیں کہ دنیا میں اختراعات ہو رہی ہیں نئی چیزیں بنائی جا رہی ہیں۔ لیکن کبھی بیچارے ہندوستان کے کسی طالعلم کی نسبت یہ خوش خبری سننے میں نہیں آتی یہ مسلمہ ہے کہ ہندوستان کا دماغ دیگر ممالک سے کم نہیں ہے لیکن ماحول نے ان کو اس پستی میں ڈال رکھا ہے۔ ہمارے نظام تعلیم میں عملیت مفقود ہے۔

غزل

دل ہے بے کل آنکھیں پُر نم
مول لیا ہے آج نیا غم !

سوزِ دروں کا نام نہیں ہے
درد بھی کم کم لطف بھی کم کم !

پھر نہ کسی نے یاد کیا ہو
آج سکونِ دل ہے برہم

دل کا فسانہ پیچاں پیچاں
تیرے اشارے مبہم مبہم

کس سے چھپائیں یاس تمنا
قلب بھی محرم آنکھ بھی محرم

دونوں آنکھیں آگ کے شعلے
لرزاں لرزاں مدہم مدہم

ہائے عرق آلود وہ چہرہ
یکجا دیکھئے شعلہ و شبنم

کیا ہوا اب تک یاد نہیں کچھ
دل میں ہے بس اب ہلکا سا اک غم

دل کو دیکھوں ؟ تجھ کو سمجھوں ؟
سوز مکمل ! درد مجسم !

سوزِ جگر بھی سازِ سکون بھی
ذوقِ طلب کا میرے یہ عالم !

احسان (عثمانیہ)

بد پرہیز بیوی

ہر چیز کو الٹے رخ سے دیکھنے، سمجھنے، تولنے، جانچنے، پرکھنے، بھانپ لینے اور تاڑ جانے کی توفیق اگر سب کو مل جاتی تو اس زمانے کے خواہ مخواہی قسم کے "ترقی پسند صاحبزادے" "بیوی کے "مساویانہ حقوق" اور عورت کے "شانہ بشانہ کام کرنے" کے جوش سے توبہ کر لیتے، مگر اہم علمی اور فلسفیانہ نکات کے سمجھ لینے کی علمی توفیق چونکہ چالیس برس کی عمر کے بعد ہی عطا ہوتی ہے اس لئے ان بیچاروں کی کیا خطا ہے جو سینما اور فلموں کے پیدا کئے ہوئے "عورت مرد کے مساویانہ حقوق" کے پیچھے پڑے ہوئے ہیں قصہ کوتاہ مرض کے مقابلہ میں ڈاکٹر اور حکیم بعض اعمال اور بعض غذاؤں سے چند دن کے لئے پرہیز اور احتیاط کا مشورہ ضرور دیتے ہیں، اور شائد وہ علاج ہی نہیں جس میں مریض اور مریضہ کو پرہیز سے نہ گزارا جائے، اس لئے دوسروں کے گھروں کا حال تو جانیں وہ دوسرے گھر والے مجھے تو نکاح سے کوئی پندرہ برس بعد معلوم ہوا کہ میری چار بیویوں میں سے ایک بیوی غضب کی بد پرہیز واقع ہوئی ہیں۔

پس اس اطلاع اور تصدیق کے بعد میں فوراً تاڑ گیا کہ عقل سلیم کی یہ ایک ایسی ہین کسر اور کلفت سے پیدا ہوتی ہے جس کو بد پرہیز انسان بقلم خود بھی محسوس نہیں کر سکتا لیکن اس بد پرہیز مریض کے ساتھ اور تو کچھ نہیں ہوتا صرف اس کے بیمار دار کولھو کا بیل اور گھن چکر ہو کر رہ جاتے ہیں، چنانچہ عرصہ دراز سے جب میری یہ بیوی صاحبہ علیل ہوتی تھیں تو میں شرع اسلامی کی رو سے ان کی خدمت گزاری، علاج معالجے اور دوا دارو کے لئے غضب کی مستعدی پابندی، حاضر باشی، پرسش، نگرانی، تسلی اور تشفی دینے کے تمام فرائض بجا لاتا تھا حتیٰ کہ محض ان کے بیمار ہونے کی تکلیف کو کم کرنے کے لئے میں شوہر ہو کر بعض اوقات ان کے زرخرید غلام کی طرح ان کے احکام کی تعمیل کرتا تھا، حد یہ ہے کہ گو میں مبلغ چار بچوں کا باپ ہوں مگر میں "نیاز مند" اور "پروانہ چار قسم کا والد" ہونا اپنی بلندیوں کی توہین سمجھتے ہوئے بھی ان بیمار صاحبہ کے بچے کو اپنی گود میں لیکر گھر سے باہر کھلاتا اور گھماتا پھرتا تھا اور چونکہ میں خدا کے کرم سے بقلم خود محقق فلسفی اور نیم حکیم بے خطر ہوں اس لئے میں اصل والدہ کے عوض آج کل کی نقالی اور یورپی تحقیق کی مفید سے مفید خادمہ اور آیا کو اپنے بچوں کے پاس تک نہیں آنے دیتا، اس لئے اس کمی کی وجہ سے میرے بچوں کو پرورش کرے یا کھیل تماشوں میں لیجائے تو ان کی اصل والدہ یا ملازم موزی بقلم خود اس لئے اس اللہ کی بد پرہیز بندی کے علیل ہوتے ہی میں آتا مشہور و معروف شوہر اس کے بچوں کو سڑکوں سڑکوں اور گلیوں گلیوں کھلاتا پھرتا تھا محض اس ہمدردی سے کہ میری بیمار بیوی کو قدرے آرام مل جائے لہٰذا اب جو میں بیوی کی ہمدردی میں بچوں کو گود میں یا کاندھے پر یا ساتھ لیکر نکلتا تو اتفاق سے ابھی تک ان چاروں بیویوں میں سے کسی ایک کا بچہ بھی نہ بالغ و عاقل ہے نہ بی۔اے پاس اس لئے ان کو لیکر نکلتا تو اچھا خاصا فلسفی اور مہذب انسان ہو کر ان بچوں کے ساتھ دیر تک گدھا بنا رہتا مثلاً یہ چھ، چھ سات، سات اور تین تین برس کی عمر کے بچے بین الاقوامی مسائل یا لیگ اور کانگریس کے مسائل پر توجہ سے گفتگو کر نہیں سکتے تھے بجز اس نوع کی گفتگو کے کہ

ابا میاں اللہ اللہ پڑھنے کیوں جاتے ہو؟

مطلب تو خیر میں سمجھ گیا کہ یہ دریافت کر رہا ہے کہ نماز پڑھنے مسجد میں کیوں جاتے ہو لیکن اس کو جواب دینے میں مجھے ہزاروں زحمتیں اور الجھنیں گھیر لیتی تھیں چنانچہ کبھی توجی

چاہتا کہ مسجد میں نماز پڑھنے کے تمام سیاسی اور اجتماعی فوائد کو تفصیل وشرح سے سمجھا دوں تاکہ ان کے ذہن میں ابھی سے نماز کی اہمیت روشن ہو جائے مگر اس معاملہ میں تکلیف دہ رکاوٹ ان کا بچہ پن اور میرا سیاسی آدمی ہونا ہے، مثلاً ممکن ہے کہ معمولی درجہ کا باوا اپنے بچے کو نماز کی اہمیت کو چند جملوں میں سمجھا دیتا مگر میرا دماغ تو ہٹلر کا مشہور "نیشنل ڈوڈیلن" ہے جو عظیم منافع و مصالح کو پل بھر میں گھیر لیتا ہے اس لئے مختصر سے مختصر کرنے پر بھی میں نماز باجماعت کی مصلحت کو چند منٹ میں نہیں سمجھا سکتا خواہ وہ میرا بیٹا مجھ سے سمجھے یا کوئی تعلقانے والا۔

اچھا تو اب یہ آسان تھا کہ میں بھی اپنے بچے کی برابر کی عمر اور عقل کے موافق کوئی اول فول سا جواب دیکر ٹال دیتا تو دماغ اس کے لئے بھی تیار نہیں ہوتا کہ بچہ کے ایک عمدہ، مفید، مہذب، اور شائستہ سوال کو ٹال کر اس کے دماغ کو لغویات کی طرف مائل کرے مگر قیمتی لمحات میں اس کے جواب کو معقول اور موزوں بنانے میں صرف کرتا یہ اتنے عرصہ میں تابڑتوڑ اتنے سوالات کر لیتا کہ میں اس کے سوالوں کی ابتدا کو بھول کر اس کے آخری سوال کا جواب دینا شروع کرتا کہ یہ معاً کچھ اور فرمانے لگتا نتیجہ یہ ہے وہ تو معصوم بچہ ہی رہتا مگر میں لکھا پڑھا باپ ہو کر الو کا رشتہ دار محسوس ہونے لگتا مگر محض بیمار بیوی کی ہمدردی میں بچوں کے کھلانے کی یہ بیوقوف کر خدمت بجا لاتا رہتا۔

اب ظاہر ہے کہ بچے کھلانے کی اس یکسر کڑوی اور توہین والی خدمت سے مقصد صرف ایک ہی تھا اور کتنا نیک مقصد تھا کہ جس طرح بھی ہو بیمار بیوی کو آرام مل جائے اور میرے تجربے میں میں نے بچوں کو بنفس خود کھلا کر اپنی بیوی کو جو آرام پہنچایا اس طرح کا آرام تو اس زمانے کے وہ نیم خام صاحبزادے اور کوتاہ فہم ہندوستانی بھی نہیں پہنچاتے جو یورپ والوں کی نقالی میں عورت کے بڑے زمانے کے ہمدرد بنے ہوئے ہیں کیونکہ یہ یورپ زدہ تو عورتوں کو اسی وقت برابری کے حقوق عطا فرماتے ہیں جب یہ خود بی۔ اے پاس ہوں، نصف ڈپٹی کلکٹر ہوں سرکار یا والد کی کوٹھی میں رہتے ہوں نیلام ہی کی سہی مگر موٹر کار کے مالک ہوں آیا یا خادمہ کو ملازم رکھ سکتے ہوں تب کہیں جاکر ہندوستانی بیوی کو سیدھے ہاتھ کی طرف موٹر میں بٹھا کر سینما لیجاتے ہیں اور مدراس کی طرف کی ایک آدھ سیاہ رنگ کی خادمہ کو ملازم رکھتے ہیں، لیکن میں نے تو بنفس خود بچوں کو کھلا کر دکھا دیا کہ بتاؤ عورت کے تم زیادہ ہمدرد ہو یا ہم تاریک خیال ہندوستانی، کیونکہ تمہارے ہاں تو جب تک ڈپٹی کلکٹری کی سی زندگی نہ ہو تم نہ بیوی کو ڈانس کی تفریح کرا سکتے نہ ریلوے پلیٹ فارموں پر کشیدہ کاڑھتے ہوئے گھومنے اور ٹہلنے کا موقع دے سکتے نہ محلے کی تاریک گلیوں میں ان کے بچوں کو کاندھے پر لاد کر کھلا سکتے مگر ہم ملاٹے تو زندگی کی ہر منزل میں عورت کو برابر کا حصہ عطا کرتے رہتے ہیں۔

بارے اس خدمت کے بعد گھر میں مستند سے مرد ملازم اور خادمہ کے نہ ہونے کی وجہ سے رات کے ہر لمحہ میں بنفس خود مریض بیوی کی چارپائی پر حاضری کے لئے تیار رہتا، حتیٰ کہ جب میں گہری اور میٹھی نیند میں ہوتا اس وقت بھی مریض بیوی کی ادنیٰ آہ اور اوہ پر تڑپ کر اٹھتا اور حاضر ہو کر گو اپنی نیند اور اپنی غنودگی میں مبتلا ہوتا مگر مریض بیوی کی اس طرح امداد اور دلجوئی کرتا رہتا کہ

نہیں نہیں تم تو وہمی ہو گئی ہو وہمی،

انشاء اللہ اس نسخے سے ضرور فائدہ ہوگا،

لاحول ولا قوۃ، یہ بھی کوئی شکایت میں شکایت ہے!

اچھا اب تم تو لاحول پڑھو لاحول! اور سو جاؤ انشاء اللہ صبح میں حکیم صاحب کو پھر لا کر تمہاری نبض دکھا دوں گا۔

غرض اس طرح کی تمام وہ تسلی بخش باتیں بیمار بیوی کے سرہانے بیٹھا کرتا رہتا جن کا میں کبھی عادی نہ تھا اور نہ ایک وسیع النظر اور قائد دماغ کا انسان ایسی واہی تباہی گھریلو باتوں کا عادی ہو سکتا، مگر محض "شوہرانہ مروت" کے تحت میں بیمار بیوی کے لئے اپنی راحت کی ایسی خدا جانے کتنی راتیں گزار چکا یا جھیل چکا،

اس کے بعد حکیم صاحب اور دوا فروشوں کے اللہ واسطے کے ناز اٹھاتے اٹھاتے مرگیا محض اس جذبے سے کہ اگر حکیم صاحب اور دوا فروشوں سے تعلقات کو خوش گوار رکھوں گا تو بیوی کا علاج صحت بخش ہوتا رہے گا ورنہ ڈپٹی کلکٹر تو تھا نہیں کہ حکیم صاحب اور دوا فروش میرے دولت کدہ پر بقلم خود حاضر ہونے پر مستعد رہتے، پھر اس عرصہ میں حکیم اور دوا فروش بھی بدلتے رہتے اور ان میں سے جس نوع اور جس قسم کے حکیم اور دوا فروش سے سابقہ پڑا ان کے اسی انداز اور برتاؤ کو برداشت کرتا رہا جن میں متعدد باتونی حکیموں اور مراقی دوا فروشوں سے بھی معاملہ ہوا مگر ان کی تمام بے اصولیوں بے ہوشیوں اور بے اعتنائیوں کو بھی بیمار بیوی کے لئے برداشت کرتا رہا حتیٰ کہ چار و ناچار کی منزل میں ایک آدھ ہندوستانی ڈاکٹر کو بھی برداشت کرنا پڑا درانحالیکہ میں ہندوستان کے حق میں ڈاکٹری علاج کو مالی نقطۂ نظر سے بعید نقصان رساں علاج اس لئے سمجھتا ہوں کہ ڈاکٹری علاج کا ہر جزو یورپ ہی سے خرید ہو کر آتا ہے اور کروڑوں روپیہ ڈاکٹری علاج آلات اور ادویہ کے نام سے یورپ جاتا رہتا ہے، مگر بیمار بیوی کے صدقہ مجھے اور تو جو نقصان بھی پہنچا وہ پہنچا مگر جو ناقابلِ برداشت نقصان پہنچا وہ یہ تھا کہ ڈاکٹر نہ ہونے کی وجہ سے مجھے چونکہ خوش اخلاقی سے کام نکالنا پڑا جس کا تباہ کن نتیجہ یہ نکلا کہ بیوی کے صحت پا لینے کے بعد بھی مجھے بعض خاص ڈاکٹروں کا دوست رہنا پڑا، اور بغیر علاجی سلسلے کے کوئی بتائے کہ ملا رموزی اور ڈاکٹر کے درمیان خوش گوار تعلقات کس طرح قائم رہ سکتے ہیں جب کہ میں ٹھیرا بین الاقوامی تحریکات اور معلومات کا انسان اور لوگوں کے پاس بجز نصف انگریزی ملی ہوئی اردو اور دفتری قسم کی گفتگو کے نہ برطانوی سیاسی حکمت عملی کے نکات کا علم نہ روس میں "سہ دولتی مجلس" کے انعقاد کے نتائج کی تیز پھیر اور پرے ہندوستانی ڈاکٹروں کا یہ قاعدہ تو آج تک کسی طرح سمجھ میں نہیں آیا کہ یہ لوگ تمام عمر ہندوستانیوں ہی کا علاج فرماتے ہیں مگر لباس پہنے رہتے ہیں یورپ والوں کا، آخر کیوں ؟

القصہ ایسے بے شمار صدمات ہیں جن کو میں محض بیمار بیوی کے فائدہ کے لئے اس طرح برداشت کرتا رہا گویا میں بیوی کا شوہر بھی ہوں اور علالت کے زمانے میں زر خرید نوکر بھی، لیکن میری اس طویل خدمت گزاری کا جو صلہ کئی برس کے بعد مجھے کل پرسوں خفیہ طور پر ملا ہے اس کو آپ بھی غور سے پڑھ لیجیے تاکہ آئندہ را احتیاط والا معاملہ درست ہو جائے اور وہ صلہ یہ تھا کہ مجھے معلوم ہوا کہ وہ جو بیوی صاحبہ اس طویل عرصے میں کئی بار بیمار ہوئیں اور طویل عرصے تک بیمار رہیں تو اس کا سبب یہ تھا کہ وہ بظاہر تو علاج کے معاملے میں بڑی مستعد تھیں لیکن در پردہ طور پر نہ وہ پابندی سے دوا استعمال فرماتی تھیں نہ پرہیز کرتی تھیں، نتیجہ میں وہ بیماری کی چارپائی پر پڑی رہتی تھیں اور میں حکیموں کے دربدر،

اس لئے تمام شوہروں کو تنبیہ کرتا ہوں کہ یا تو وہ علالت کے زمانے میں اپنی مریض بیوی سے پرہیز کا حلف شروع ہی سے لے لیں ورنہ آئندہ را احتیاط کے طور پر ان کے علاج کا معاملہ سسرال کے سپرد کر دیں، کیونکہ ایک بد پرہیز بیوی سو بیمار عاملہ کے حق میں حتیٰ کہ حکیم صاحب اور دوا فروشوں تک کے حق میں مالیت کے عذاب اور جنگ کی بیماری کا کام کرتی ہے، اور روپیہ کے خرچ کا معاملہ مزید نعمت!

ملا رموزی

فریبی

رمیش کو ہراج سے دلی نفرت تھی۔ وہ یہاں کی ہر چیز کو حقارت سے دیکھتا اور کوشش کرتا کہ اس کے دوست بھی وہاں نہ جانے پائیں ایک قول تھا کہ ہراج کی ازکار رفتہ چیزوں پر پیسہ خرچنا دولت کو کنوئیں میں جھونکنا ہے۔

کسی نے رمیش کو ہراج خانے سے کچھ لیتے نہ دیکھا تھا لیکن آج "ثریا آکشن ہال" میں اس کی موجودگی بہتوں کے لئے باعث حیرت تھی۔ وہ اس کی طرف اشارے کرتے جاتے اور آپس میں چہ میگوئیاں کر رہے تھے۔

رمیش ایک صوفے پر بیٹھا پہلو بدل رہا تھا۔ اس کی بگڑی ہوئی صورت دلی حقارت کی ترجمان تھی۔ خم دار ہونٹ تنفر کے مظہر۔ کڑی نظریں غصہ کی آئینہ دار۔ وہ بھویں چڑھائے وہاں کے ہنگامے میں حصہ لینے والوں کو گھورے جا رہا تھا۔ بڑی بڑی توند والے مارواڑیوں میں گھرا ہونے سے اس کو وحشت سی ہو رہی تھی۔ ان کی بدتمیزیاں ناقابل برداشت تھیں جن پر وہ دانت پیس پیس کر رہ جاتا۔ دل پر جبر کئے وہ سب کچھ سہے جا رہا تھا۔ ان کی ریل پیل۔ گھما گھمی میں اس کے پالشیں بوٹ روندے اور مسلے جا رہے تھے اس کو روحانی اذیت ہو رہی تھی۔ لیکن خون کا گھونٹ پیکر خاموش ہو رہنے کے سوا کوئی چارہ نہ تھا۔ وہ خاموش تھا۔ اپنی موجودہ بے بسی پر غایت درجہ متاسف۔

شیلاوتی کی خاطر اس کو عزیز تھی۔ وہ اس کے لئے سب کچھ برداشت کرنے پر تیار تھا۔ بڑی سے بڑی قربانی پیش کرنے پر آمادہ۔ اور۔ خوش۔ ! شیلا کے خوبصورت چہرے اور اس کی بھولی بھالی شرارت آمیز حرکات نے رمیش کے دل کو موہ لیا تھا اس پر وہ دیوانہ وار مفتون تھا۔

شیلا ثریا آکشن والی ہاتھی دانت کی پتلی چاہتی تھی۔ آکشن کے نام سے بھاگنے والا رمیش ۔۔۔ وہاں موجود تھا۔ ہراج شروع ہوا ۔۔۔ کچھ دیر بعد پتلی پر بولیاں شروع ہوئیں۔ ہراج کنندہ پتلی کو ہاتھ میں لئے اس کی بیجا تعریف کے پل باندھے جا رہا تھا ۔۔۔ اس کی مشاق نگاہیں شائقین کی پیشانیوں پر شوق و تجسس کی عبارت پڑھنے میں محو تھیں۔

"کوئی معمولی چیز نہیں صاحب ۔۔۔ نایاب تحفہ! ایک نادر چیز ہے ۔۔۔ ہاتھ سے نہ جانے پائے ۔۔۔" رمیش کی طرف پتلی کو دکھاتے ہوئے اس نے کہا۔ "کتنی حقیر ہے یہ چیز ۔۔۔ بھولی شیلاوتی تو ناحق اس کے لینے پر مصر ہے ۔۔۔" اس نے اپنے دل میں خیال کیا ۔۔۔

"دس روپے!" کسی نے پیچھے سے بولی لگائی تھی ۔۔۔

"ایں ۔۔۔ اتنی زیادہ قیمت ۔۔۔ اس حقیر پتلی کے لئے ۔۔۔!" رمیش کو حیرت ہوئی ۔۔۔ اس کی نگاہیں ایک خوب رو نوجوان پر پڑیں جو مسکرا رہا تھا ۔۔۔ "پندرہ روپے" رمیش نے پتلی کو جاتے ہوئے پا کر کہا ۔۔۔ "بیس روپے" رمیش نے بولی دی بھی نہ تھی کہ پہلے شخص نے سودے کو اپنانے کے لئے کہا ۔۔۔

"تیس روپے" "چالیس" "پچاس" "اسی" "اور!" "سو!" "سو روپے" رمیش نے لگائے تھے ۔۔۔ خوب رو نوجوان لال پیلا ہو رہا تھا ۔۔۔ پتلی رمیش کے نام چھٹی ۔۔۔

رمیش اور شیلا کی دوستی ہوئے بہت دن نہ ہوئے تھے ۔۔۔ وہ اس کا گھر بھی نہ جانتا تھا ۔۔۔ ملاقات اکثر خود اس کے اپنے مکان پر ہوتی ۔۔۔ شیلاوتی اکثر خود ملا کرتی ۔۔۔ اور یہ باہر جایا کرتے۔ رمیش کو صرف اتنا معلوم تھا کہ وہ آرٹ کالج میں آخری سال کی طالبہ ہے۔

شیلا نے رمیش کے گھر پر ملنے کا وعدہ کر رکھا تھا۔ وہ پتلی کو سامنے والی میز پر رکھے ۔۔۔ اس کی آمد کا بے چینی سے منتظر تھا ۔۔۔ بہت دیر گزر گئی ۔۔۔ لیکن وہ نہ آئی۔ انتظار رمیش کے لئے ناقابل برداشت تھا ۔۔۔ "نخفہ کیوں نہ شیلا کو

اس کے ہاسٹل میں پہنچا دیا جائے ۔۔۔" اس نے سوچا۔

"میں مس شیلا وتی سے ملنا چاہتا ہوں ۔۔۔ کیا وہ موجود ہیں ۔۔۔؟" اس نے اپنا وزیٹنگ کارڈ نوکر کو دیتے ہوئے کہا ۔۔۔ اور اپنی محبوبہ کی دلآویز ملاقات کے تصور میں کھویا سا جا کر ایک رسالے کی ورق گردانی میں محو ہو گیا۔ "کیا آپ مجھ سے ملنا چاہتے ہیں ۔۔۔؟" کسی کی آواز نے رمیش کو جیسے چونکا دیا ہو ۔۔۔ اس کے آگے مس شیلا وتی کھڑی تھی ۔۔۔ "جی ہاں ۔۔۔! ۔۔۔ ارے آپ کو زحمت ہوئی ۔۔۔ میں مس شیلا ۔۔۔ وتی سے ملنا چاہتا ہوں" اس نے کہا ۔۔۔

"تو فرمائیے ۔۔۔ مجھ کو شیلا وتی کہتے ہیں" "لیکن ۔۔۔! شائد کچھ بھول ہوئی ہے ۔۔۔ مجھے شیلا وتی سے ملنا ہے ۔۔۔ جو ایم اے کی طالبہ ہیں ۔۔۔" "فرمائیے آپ کیا کہنا چاہتے ہیں۔ میرا نام شیلا وتی ہے ۔۔۔ میں یہاں ایم اے میں پڑھتی ہوں"

کالے رنگ والی گول مٹول لڑکی جس نے سیاہ فریم کا بھدا سا چشمہ لگا رکھا تھا۔ رمیش سے بول رہی تھی ۔۔۔ دو دانت ناگوار طور پر باہر نکلے ہوئے تھے ۔۔۔ کیا یہ حسین خط و خال والی شیلا وتی تھی ۔۔۔!" "دیکھئے ۔۔۔ کچھ غلط فہمی ہوئی ہے ۔۔۔ معاف کرنا ۔۔۔ وہ بہت خوبصورت ۔۔۔ اس کا چہرہ ۔۔۔ گول۔ آنکھیں نرگسی ۔۔۔ اس کے دانت ۔۔۔" "آپ مجھ سے مذاق کرتے ہیں ۔۔۔ چلے جائیے یہاں سے ۔۔۔ اس وضع کی کوئی شیلا وتی یہاں نہیں ۔۔۔" لڑکی نے تلخی سے جواب دیا۔ "مگر ۔۔۔ کچھ عرصہ قبل انھوں نے یہیں سے تو فون کیا تھا ۔۔۔" "یہ دوسری جھوٹ ہے ۔۔۔ سفید جھوٹ! ۔۔۔ یہاں فون ہی نہیں ہے" لڑکی نے سخت برہم ہو کر کہا ۔۔۔ "نکلیے بس یہاں سے ۔۔۔ ملازم! ۔۔۔ نارائن ۔۔۔!"

کلرک کا چپراسی رمیش کو ہٹا رہا تھا ۔۔۔ یہ ذلت اس سے ناقابل برداشت تھی۔ خون اس کی آنکھوں میں اتر آیا ۔۔۔ نہ آؤ دیکھا نہ تاؤ ۔۔۔ اس نے چانٹا چپراسی کے جڑ دیا ۔۔۔ جواب میں جاہل آدمی نے جو دھکا دیا ۔ تو مسٹر رمیش سیڑھیوں سے نیچے ۔۔۔ کپڑے جھاڑ رہے تھے ۔۔۔ شرم اور غصہ کی گہری دھند اس کی نگاہوں کے آگے چھا رہی تھی ۔۔۔ غیر ارادی طور پر وہ چلنے لگا ۔۔۔ قیمتی سوٹ سے گرد جھاڑتا ہوا ۔۔۔ ایک طرف ۔۔۔ "ارے ۔۔۔ یہ آپ نے کیا حالت بنا رکھی ہے ۔۔۔ کیا کوئی حادثہ ہو گیا ۔۔۔؟" ہراج خانے والا رقیب رمیش کو حیرت سے تک رہا تھا ۔۔۔ اس نے راستہ کترا کر نکل جانا چاہا ۔۔۔ لیکن: "حادثہ ہوا ہو گا ۔۔۔ یا اور کچھ ۔۔۔ آپ کی بلا سے ۔۔۔ آپ اپنا راستہ نپیئے!" رمیش نے جھنجلاہٹ کے ساتھ جواب دیا ۔۔۔ اور آگے کی راہ لی ۔۔۔ "آہ ۔۔۔ ان صاحب نے بالآخر پتلی لے لی ۔۔۔ انھیں کیا حاصل ہو گا۔ اب میں اس کو کیا جواب دوں گا ۔۔۔ مجھے چاہیے کہ اب اسکو منہ بھی نہ دکھاؤں۔ شیلا!" رمیش چلتے چلتے رک سا گیا۔ "کون؟ ۔۔۔ کس کو؟ ۔۔۔ کس کو منہ نہ دکھانا چاہیے ۔۔۔ کون شیلا؟" "آپ اس کو کیا جانیں! ۔۔۔ خیر چھوڑیئے ان باتوں کو ۔ میری غربت نے مجھے شکست دی ہے ۔۔۔ ورنہ پتلی میری ہوتی ۔۔۔" "صاحب! آپ اس کو نہیں جانتے!" "کونسی شیلا۔ وہ جو حسین چہرہ ۔۔۔ اور جس کے ۔۔۔ دانت ۔۔۔" "ہاں ہاں۔ جس کے دانت ہیرے کی طرح چمکدار ہیں ۔۔۔ وہی شیلا۔ آہ ۔۔۔ آپ تو اس کو جانتے ہیں ۔۔۔" "آئیے تب ہم دونوں دوست ہیں" "ہاں میں اس کو ۔۔۔ جانتا ۔۔۔ نہیں بلکہ چاہتا ہوں ۔۔۔ مگر ۔ اُف ۔۔۔ کیا اس نے آپ کو بھی پتلی لینے پر اکسایا تھا ۔۔۔" "ہاں ۔۔۔ لیکن جس کی پیاری خواہش کو میں پورا نہ کر سکا ۔۔۔ آہ بھولی شیلا ۔۔۔" "بھولی نہیں ۔۔۔ فریبی ۔۔۔!" رمیش نے سرد آہ کھینچی۔

"پتلی کے کیا دام آئے ہیں ۔۔۔؟" مصنوعی شیلا نے ہراج کنندہ سے سوال کیا۔ "جی سو روپے مس صاحبہ۔" "سو روپے ۔۔۔! اُف ۔۔۔!" اس نے نوٹ کو پاکٹ میں رکھتے ہوئے کہا۔ "لیکن ۔۔۔ مس صاحبہ ۔۔۔ پتلی کی اتنی قیمت ۔۔۔ آخر اس میں کیا انوکھی بات تھی!" ہراج خانے والے نے کمیشن کے پیسے گنٹ کرتے ہوئے کہا۔ "کوئی انوکھی بات نہیں ۔۔۔ رہی قیمت ۔۔۔! سو یہ ان شوقین مزاج نوجوانوں سے پوچھو ۔۔۔ جو مجھ جیسی لڑکیوں کے پیچھے پڑے پھرتے ہیں۔" [illegible]

ادارے کی خبریں

اُردو انسائیکلوپیڈیا کی مجلس انجینرنگ اردو انسائیکلوپیڈیا کے شعبۂ انجینیری کا اجلاس یکم دی ۱۳۵۳ف مطابق ۵ نومبر ۱۹۴۳ء روز شنبہ شام کے ساڑھے چار بجے دفتر ادارہ میں منعقد ہوا حسب ذیل اصحاب نے شرکت کی :۔

۱۔ مولوی سید عارف الدین صاحب سابق چیف انجینیر و معتمد تعمیرات سرکار عالی

۲۔ " محمد اسد اللہ صاحب معتمد محکمۂ کنٹرول سمنٹ و فولاد ۔

۳ " دلدار حسین صاحب انجینیر۔

۴۔ ڈاکٹر سید محی الدین صاحب قادری زور معتمد اعزازی ادارہ ۔

۵۔ مولوی سید بادشاہ حسین صاحب } معتمدین اردو انسائیکلوپیڈیا

۶۔ " فیض محمد صدیقی صاحب }

پروفیسر ضیاء الدین صاحب انصاری انجینیر نے ایک اہم مصروفیت کی بنا پر شرکت سے معذرت کی اطلاع دی ۔

اردو انسائیکلوپیڈیا کے سلسلے میں گزشتہ اجلاسوں میں جو مضمون واری خاکے تدوین اصطلاحات کے لئے بنائے گئے تھے ان کے مطابق اس اثنا میں مولوی سید عارف الدین صاحب ۔ پروفیسر ضیاء الدین انصاری اور مولوی اسد اللہ صاحب انجینیر کی مدد سے اسماء و مصطلحات کی جو فہرستیں ادارے نے تیار کی تھیں ان کی خواندگی عمل میں آئی اور تقریباً ڈھائی گھنٹے کی نشست میں انجینیری کے مختلف شعبہ جات کے جملہ اسماء و مصطلحات پر نظر ڈال کر تصفیہ لیا گیا کہ ان میں سے کون کون سے اسماء و مصطلحات پر اردو انسائیکلوپیڈیا میں مقالے اور مضامین کا اندراج ضروری ہے ۔

طے پایا کہ تصفیہ شدہ اسماء و مصطلحات کی فہرستیں ارکان مجلس کے یہاں بغرض توثیق و نظر ثانی روانہ کی جائیں ۔

طے پایا کہ اردو اصطلاحات انجینیری پر بھی فنی اور لسانی نقطۂ نظر سے کسی قطعی تصفیہ پر پہنچنے کی ضرورت ہے اس لئے آئندہ ہفتے میں ایک اور اجلاس منعقد کر کے اصطلاحات کی توثیق اور کام کی تقسیم کی جائے ۔

شعبۂ نسواں شعبۂ نسواں کی مجلس عاملہ کا اجلاس بتاریخ ۲۲ اکتوبر ۱۹۴۳ء جمعہ ساڑھے دس بجے ادارہ کے دفتر میں منعقد ہوا جس میں حسب ذیل خواتین شریک تھیں ۔

۱۔ محترمہ رابعہ بیگم صاحبہ

۲۔ " بشیر النساء بیگم صاحبہ

۳۔ " جہاں بانو بیگم صاحبہ

۴۔ " تصدق فاطمہ بیگم صاحبہ

۵۔ " محل ڈاکٹر زور صاحب

۶ اور معتمد ادارہ

دوسرے ارکان نے اپنی شرکت سے معذوری کے پیام روانہ کئے۔

شعبہ کے سابقہ اجلاس کی روداد کی توثیق کے بعد اس سے متعلق امور کا تصفیہ کیا گیا ۔ جس میں ۔

(۱) ارکان سے سال ۱۹۴۴ء کے لئے غیر مستطیع طالبات کی خاطر چندے طلب کئے گئے جو اسی وقت ادا کر دئے گئے اور جس کو شعبہ کے فنڈ میں جمع کر دیا جائے گا ۔

(۲) معتمد نے مسز صوفی سے دوبارہ ملنے اور اپنے مقصد کی وضاحت کرنے کا اظہار کیا۔ اس کے بعد حسب ذیل امور پر غور کیا گیا :۔

۱۔ شعبہ کی مالی حالت کی سقاہت کا لحاظ کرتے مدرسے کے لئے روپے کی فراہمی ۔

۲۔ مدرسے کے سرکاری نصاب کے متعلق دوبارہ غور۔

۳۔ بزم ادب کے دوسرے جلسے کے لئے پروگرام۔
۴۔ معتمد و شریک معتمد کے فرائض اور تقسیم کار کا مشورہ۔
۵۔ دیگر امور۔

(۱) شعبے کے دونوں مدرسوں کے اخراجات کا لحاظ کرتے مشکل سے چھے ماہ صرفہ پورا ہوتا ہے۔ بقیہ چھے ماہ کے اخراجات کے لئے کچھ ایسے تدابیر اختیار کرنے چاہئے کہ ان کی تکمیل ہو سکے۔

خواتین کا چندۂ رکنیت چونکہ شعبۂ نسوان کے مصارف کے لئے وقف کردیا گیا ہے اس لئے یہ تجویز ہوئی کہ ان کی ادائی کا باقاعدہ انتظام کیا جائے۔ نیز ارکان شعبہ اس بات کی سعی کریں کہ ہر ایک کم از کم ایک رکن بنائے۔

ایک کانسرٹ جس میں رفیعہ سلطانہ کا فیچر "حالی" اور چند دوسرے ڈرامے اور گانے ہوں بشرط فرصت و سہولت ڈسمبر میں ترتیب دیا جائے۔ محرم سے قبل یا بہر حالات اجازت نہ دیں تو بعد اربعین۔ اس کانسرٹ کو دو دن دونوں شہزادیوں کی سرپرستی میں پیش کریں۔ ایک دن کے محاصل مدرسۂ بالغات کے لئے اور دوسرے دن کے مقامی اداروں یا قلت گرانی کی انسدادی انجمن کو بطور امداد دیئے جائیں۔

(۲) مدرسے کے سرکاری انصاب کے متعلق جن دقتوں سے دوچار ہونا پڑتا ہے اس کے لحاظ سے رابعہ بیگم صاحبہ نے سرکاری امداد سے دست برداری کی رائے دی۔ یہ طے پایا کہ اس کے متعلق معتمد شعبہ ناظم صاحب تعلیمات سے گفتگو کریں اور اپنی مشکلات کا اظہار کریں اور بعد میں دوسرے اجلاس پر اس کا تصفیہ کیا جائے۔

(۳) بزم ادب کا دوسرا جلسہ اواخر شوال میں مقرر کیا گیا تھا۔ لیکن محبوبیہ اسکول کی داعی لطیف النساء بیگم چونکہ علیل ہیں اس لئے بجائے شوال کے ذیقعدہ کا مہینہ مقرر کیا گیا۔ پروگرام کے متعلق یہ طے پایا کہ ہماری طرف سے اقبال پر ایک نظم بشیر النساء بیگم صاحبہ سنائیں گی۔ مکالمہ "ابلیس و جبریل" کلیۂ اناث کی لڑکیاں سنائیں گی اور اقبال کی ایک نظم سعیدہ مظہر ترنم کے ساتھ سنائیں گی۔ ان کے علاوہ لطیف النساء بیگم صاحبہ اپنا پروگرام تیار کرسکتی ہیں۔

(۴) معتمد کی تحریک پر معتمد و شریک معتمد میں تقسیم کار کا مسئلہ پیش ہو۔ معتمد نے تحریک کی تھی کہ چونکہ اور کاموں کی زیادتی اور صحت کی خرابی کی وجہ سے شعبہ کے کام پر اثر پڑ رہا ہے اس لئے وہ حساب کتاب اور اجرائی اخراجات کا کام سرانجام دیں گی۔ اور شریک معتمد بقیہ تمام کام اپنے ذمہ لیں۔ سب ارکان نے اس رائے سے اتفاق کیا لیکن شریک معتمد کو اس میں کچھ پس و پیش رہا اس لئے کچھ تصفیہ نہ ہوسکا۔

(۵) ششماہی اردو دانی کے امتحانات کے متعلق ادارہ سے استفسار کے جواب میں رابعہ بیگم صاحبہ نے بیان کیا کہ مدرسۂ بالغات کی لڑکیاں شریک نہ ہوں گی۔

نگرانی کے متعلق یہ تصفیہ ہوا کہ بشیر النساء بیگم صاحبہ، بلقیس بانو بیگم صاحبہ، بیگم صاحبہ ڈاکٹر زور صاحب اور سعیدالنساء بیگم صاحبہ سے انتظامات اور نگرانی کے لئے درخواست کی جائے۔ اسی ضمن میں معتمد کی یہ تحریک کہ سعیدالنساء بیگم صاحبہ (محل مولوی عبدالرحمن صاحب مدیر وقت) کو رکنیت شعبہ کی دعوت دی جائے۔ باتفاق آراء قبول کی گئی۔ ایک اعتراض کا جواب دیتے ہوئے معتمد نے اس بات کی صراحت کردی کہ پیٹرول راشننگ اور دیگر وجوہ سے مجلس عاملہ کے اجلاس ضرور نہیں کہ ہر ماہ ہوا کریں۔ اس لئے سردست حسب ضرورت مجلس عاملہ کے اجلاس ہوا کریں گے۔ جس سے سب نے اتفاق کیا۔

قیام شاخ ناگرکرنول بتاریخ ۳۰ر آذر ۵۳ف بمقام کلب عثمانیہ بہ صدارت عالی جناب مولوی توقیر مرزا صاحب رزاقی ایم اے۔ ایل ایل بی منصف ناگرکرنول، عام جلسہ منعقد کیا گیا جس میں اکثر وکلاء مقامی و عہدہ داران و معززین آبادی شریک تھے اور منشی، منشی فاضل ادارۂ منصوریہ کے طلبہ نے بھی شرکت کی۔ مولوی حکیم شیخ منصور علی صاحب منصور مولوی فاضل، منشی فاضل، اردو فاضل وکیل ہائی کورٹ و معتمد ادارہ نے اردو کی اہمیت اور اس کی تاریخ پر مختصر سا تبصرہ کیا اور ادارۂ ادبیات اردو حیدرآباد دکن کے مساعی جمیلہ اور جناب ڈاکٹر زور صاحب کی کوششوں پر اجمالی نظر ڈالی۔ من بعد عہدہ داران شاخ کا انتخاب عمل میں آیا چنانچہ اس شاخ کے صدر بہ غلبۂ آراء جناب مولوی توقیر مرزا صاحب رزاقی منصف ناگرکرنول اور نائب صدر مولوی محمد انوار الدین خاں صاحب وکیل ہائی کورٹ مقرر ہوئے۔ اور مولوی معین الدین صاحب وکیل، مولوی احمد بن علی صاحب وکیل ہائی کورٹ، مولوی محمد شاہ علی خاں صاحب وکیل ہائی کورٹ و عالی جناب پنڈت بی۔ ایس نارائن صاحب ڈاکٹر دواخانہ ناگرکرنول اور جناب مولوی غلام رسول صاحب صدر مدرس مدرسہ تحتانیہ ناگرکرنول و پنڈت نرسنگ راؤ صاحب وکیل، پنڈت راما ریڈی صاحب وکیل ارکان انتظامی مقرر ہوئے۔ اور منشی فاضل و منشی کے طلبہ نے بھی ارکان ادارہ میں اپنا نام شریک کرایا اور سبھوں نے چندہ دینے پر آمادگی ظاہر کی۔

شعبۂ طلبہ ہنگولی کا دورہ اونڈہ بتاریخ ۵۔ آذر ۱۳۵۳ف بروز سہ شنبہ چار افراد پر مشتمل وفد تقریباً ۳ بجے شب ہنگولی سے نکل کر ٹھیک ۸ بجے دن قصبۂ اونڈہ تعلقہ ہنگولی بغرض ترویج و اشاعت اردو و قیام ادارہ وارد ہوا۔

۹ بجے شب بہ صدارت مولوی سراج الحق صاحب صدر مدرس قصبۂ اونڈہ جلسۂ عام ترتیب دیا گیا۔ صاحب موصوف نے صدارت کو بڑی خوشی سے قبول فرمایا اور وفد کی حوصلہ افزائی فرمائی۔ آپ ایک درد مند دل رکھتے ہیں نیز آپ کو قصبہ مذکور میں ہر دل عزیزی حاصل ہے۔ صاحب موصوف اور مولوی منیر الدین صاحب، سرفراز خاں صاحب، مرتضیٰ صاحب، محمد ابراہیم صاحب پٹیل، قاسم میاں صاحب، علی خیر خاں صاحب، شرف الدین صاحب، فیاض الدین صاحب، ظہور الحق صاحب نے وقتاً فوقتاً وفد کی مدد فرمائی و نیز قصبۂ مذکور کے تفصیلی حالات و واقعات سے روشناس کیا۔ خصوصاً مولوی منیر الدین صاحب پیش امام مکتب تعلیم بالغاں کے لئے آمادگی اور ادارۂ ادبیات اردو سے دلچسپی لی، سرفراز خاں صاحب منتخبہ صدر کی اس تحریک سے دلچسپی، محمد ابراہیم صاحب پٹیل کی خدمت معتمدی کی قبولیت مولوی شرف الدین صاحب و فیاض الدین صاحب زمیندار و نیز مولوی قاسم میاں صاحب قسیم کی تحریک کو کامیاب بنانے کی کوشش سے وفد بہت زیادہ متاثر ہوا۔

مولوی منیر الدین صاحب پیش امام کی قرات سے جلسے کا افتتاح ہوا جس میں احمد عارف معتمد شعبہ طلبہ کے خوش گلو ترنم و تقریر و نیز مولوی قاسم میاں صاحب قسیم کی نظم، محمد اسمٰعیل خاں مشتاق، محمد ابراہیم شارق کی نظم و جامع تقریر، محمد مصطفےٰ خاں طالب کی تقریر بہ عنوان "سرسری نظر اونڈہ پر" سے اہلیان قصبہ بہت زیادہ متاثر ہوئے اور عرصہ تک ان کے دل اس سے متاثر رہیں گے۔ اور امید ہے کہ ان تقاریر سے اردو کی خدمت کے لئے کمربستہ رہیں گے۔

جلسے کے اختتام پر جناب صدر نے ایک پُرزور تقریر کی۔

شعبۂ طلبہ اونڈہ حسب ذیل انتخابات عمل میں آئے:۔

صدر۔ جناب مولوی سرفراز خاں صاحب۔ معتمد۔ محمد ابراہیم صاحب پٹیل قصبۂ اونڈہ

نائب صدر۔ محمود میاں صاحب۔ شریک معتمد۔ قاسم میاں صاحب۔

ارکان

علی خیر خاں صاحب۔ غلام مرتضیٰ صاحب۔ شرف الدین صاحب۔ فیاض الدین صاحب شیخ داؤد صاحب۔ ظہور الحق صاحب۔ شیخ توکل صاحب۔ محمد شفیع صاحب

شہاب الدین صاحب۔ سید عزیز صاحب ۔ عبدالقیوم صاحب
مندرجۂ بالا اصحاب سے ہم قوی امید رکھتے ہیں کہ وہ اپنی ذی اثر شخصیت سے اردو کی ہمہ جہتی ترقی کے لئے کوشاں ہوں گے۔ نیز محمد اسمٰعیل خاں مشتاق اردو فاضل اونڈھوی ہنگولی سے ہر ہفتہ وعشرہ آکر وقتاً فوقتاً مدد کرتے رہیں گے۔

شعبۂ طلبہ نارائن کھیڑ | بتاریخ ۱۰ رآذر ۵۳ف بروز جمعہ بوقت چار ساعت روبرو جامع مسجد دارالمطالعہ شعبۂ طلبہ کا افتتاح کیا گیا دارالمطالعہ ہٰذا میں درسی، ادبی و تاریخی کتب کا ذخیرہ (۲۵۰) اعداد پر مشتمل ہے فی الحال ماہواری رسالوں کا بھی انتظام کیا گیا ہے اور مجلس انتظامی شعبۂ طلبہ اردو کی خدمت میں مصروف بہ کار ہے۔ چنانچہ اب تک اردو عالم کے لئے تین امیدوار اردو فاضل کے لئے ایک اردو دانی کے لئے چھ، زباں دانی کے لئے دو امیدواروں کی تعلیم کا انتظام کیا گیا ہے اور آئندہ امیدواروں میں اضافہ کی توقع ہے۔

مجلس انتظامی شعبۂ طلبہ میں یہ تحریک پاس کی گئی ہے کہ سال حال شعبۂ طلبہ کے جملہ معتمدین و ارکان ادارۂ ادبیات اردو کے امتحانات میں شرکت ہوں۔ سال ۵۳ف کے لئے معتمد و صدر کا انتخاب عمل میں آیا جو درج ذیل ہے:۔

صدر۔ مولوی نذیر احمد صاحب
نائب صدر۔ رر غلام دستگیر صاحب
معتمد۔ رر خواجہ خلیل الرحمٰن صاحب
نائب معتمد رر قدرت اللہ بیگ صاحب

شعبۂ طلبہ رینا پور | بتاریخ ۲۵ رامرداد ۵۲ف بہ صدارت مسٹر گوبند راؤ صاحب صدر مدرس و صدر ادارہ ادبیات اردو شاخ رینا پور بمقام مدرسہ شعبۂ طلبہ کا ماہانہ جلسہ منعقد ہوا جس میں تمام ارکان شعبۂ طلبہ اور معززین حضرات قصبہ موجود تھے۔ معتمد صاحب ادارہ شاخ رینا پور اپنی ضروریات خانگی کے تحت شریک جلسہ نہ ہوسکے۔ چونکہ معتمد شعبۂ طلبہ و نائب معتمد و بعض ارکان بوجہ کامیابی امتحان اعلیٰ تعلیم کے لئے دوسرے مقامات کو جاچکے ہیں اس لئے اس جلسے میں انتخابات عہدہ داران شعبہ بھی کرنے تھے۔ بشیر الدین کی حمد سے جلسہ کا آغاز ہوا الٰہی بخش نائب صدر نے گزشتہ جلسہ کی روئداد پڑھی اس کے بعد بندھیری، شیو لنگ، شفیع الدین، مہالنگ، مظفر علی وغیرہ نے ورزش کے فوائد پر تقریریں کیں۔ مولوی رؤف الدین صاحب مدرس مولوی احمد محی الدین صاحب مدرس و صدر شعبہ نے بھی ورزش کے فواید کی توضیح کی۔ حسب ذیل انتخابات باتفاق آرا عمل میں آئے۔

صدر۔ مولوی احمد محی الدین صاحب۔ نائب صدر۔ الٰہی بخش۔
معتمد۔ شفیع الدین قریشی۔ نائب معتمد۔ اتم شنکر راؤ، ہمبرے۔
معتمد کتب خانہ۔ شیو لنگ پروت اپا اور گنڈے۔
معتمد فروختگی کتب۔ عشرت اللہ۔
ارکان۔ مہالنگ، وشوناتھ، شیخ احمد، عبدالحمید، اسمٰعیل، مظفر علی امین صاحب، وامن، وشوناتھ شنکر۔

شاخ پربھنی | ادارۂ ادبیات اردو شاخ پربھنی مولوی غلام افضل صاحب بیابانی ایچ سی۔ ایس، مولانا محمد ابرار حسین صاحب ایم اے فاضل مصر صدر فوقانیہ کی سرپرستی اور رہبری میں برابر سرگرم عمل ہے اردو امتحانات کی تیاری کرائی جارہی ہے رمضان شام مارکٹ ہوٹلیں ہال میں درس ہورہے ہیں جن میں خاص طور پر مولوی اسمٰعیل شریف صاحب انزلی مددگار فوقانیہ مولوی غلام حسن صاحب صدیقی مددگار فوقانیہ مولوی اشرف الدین صاحب خفی، مولوی محمد حسین صاحب جلالی، حمید اللہ خاں رشید معتمد شاخ درس دے رہے ہیں۔

اس سے پہلے شاخ پربھنی کے زیر اہتمام جلسہ تقسیم اسناد ۴۲ء زیر صدارت عالی جناب مولوی ولی حسن صاحب اول تعلقدار ضلع پربھنی نہایت اعلیٰ پیمانے پر منایا گیا جس میں تمام عہدہ داران مقامی نے

شرکت فرمائی جن میں جناب مولوی غلام افضل صاحب بیا بانی ایچ سی ایس مہتمم کوتوالی، مولوی ابرار حسین صاحب ایم اے فاضل مصر صدر مدرسہ فوقانیہ و صدر ادارۂ ادبیات اردو شاخ پربھنی، مولوی غلام دستگیر صاحب جھکری مددگار ناظم امداد باہمی و مسٹر بال کشن راؤ صاحب بی اے تحصیلدار مسٹر مدہوسدن صاحب ایم اے مددگار مہتمم آبکاری مولوی قاضی سلطان محی الدین صاحب اسسٹنٹ انسپکٹر، مولوی مظہر علی خاں صاحب وکیل ہائیکورٹ نائب صدر بزم رہبراں قابل ذکر ہیں ان کے علاوہ خوش باش وکلاء و تاجران کی کثیر تعداد شریک جلسہ تھی جلسہ گاہ کے انتظامات مولوی افتخار احمد خاں صاحب سحر حمید اللہ خاں صاحب شیدا معتمد ادارہ اور مولوی تاج محی الدین صاحب رکن ادارہ اور مولوی خواجہ خاں صاحب کی کاوشوں کا نتیجہ تھے۔

مولوی حمید اللہ خاں صاحب شیدا معتمد شاخ پربھنی نے اپنی رپورٹ سنائی اور آخر میں صدر جلسہ سے اسناد تقسیم کرنے کی درخواست کی اس کے بعد صدر جلسہ نے تمام کامیاب طلبہ کو اسناد عطا کئے اور نصیحت آمیز تقریر فرمائی مولانا ابرار حسین صاحب نے اپنے خاص انداز میں تقریر فرمائی اس کے بعد مولوی عبداللہ صاحب نیر منظم مال اور مولوی قیام علی خاں صاحب عیش نے اپنی نظمیں سناکر خراج تحسین حاصل کیا۔ آخر میں مولوی حمید اللہ خاں صاحب شیدا نے شکریہ ادا کیا اور دعائے سلامتی اعلیٰ حضرت بندگان عالی کے بعد نہایت کامیابی کے ساتھ جلسہ ختم ہوا۔

شاخ بسمت نگر | مولوی عبدالحی صاحب منصف اور مولوی فرید مرزا صاحب تحصیلدار و صدر ادارۂ ادبیات اردو شاخ بسمت نگر اور مولوی عنایت اللہ خاں صاحب سوداگر بارچہ معتمد شاخ کی کوششوں سے بسمت کو ۱۳۵۲ء کے اردو امتحانات کا مرکز قرار دیا گیا اور پچاس سے زائد طلبہ شریک امتحان ہوئے جن کے مدرس مولوی افضال احمد صاحب مددگار مدرس و مولوی فخر الحسن صاحب کے سپرد تھے۔ دارالمطالعہ کی جدید تنظیم بھی عمل میں آئی۔ مولوی فخر الحسن صاحب مہتمم دارالمطالعہ منتخب ہوئے اور شاخ کے سرگرم معتمد مولوی عنایت اللہ خاں صاحب نے اپنی تمام کتابیں بغرض استفادۂ عام دارالمطالعہ میں دے دی ہیں جس کے لئے ادارہ مشکور ہے۔

شاخ کلیانی | دارالمطالعہ کے لئے مولوی سید نجم الدین حسن صاحب قادری سررشتہ دار عدالت کلیانی نے حسب ذیل کتب مرحمت فرمائی ہیں (۱) تاریخ مسلم لیگ مصنفہ مرزا اختر حسن صاحب (۲) ثانی عشق مصنفۂ علامہ راشد الخیری مرحوم (۳) شہادت نامہ مصنفہ محمد عبدالسلام ذکی (۴) فخر قوم ملا عبدالقیوم کی یاد میں (۵) رسالہ مولوی بابت ربیع الثانی ۱۳۶۱ھ (۶) سب رس ستمبر ۱۹۴۲ء (۷) تنظیم میلاد نمبر بابت ۲۷ ربیع المنور ۱۳۶۱ھ (۸) عالمگیر بابت ماہ مارچ ۱۹۴۱ء و جولائی ۱۹۴۱ء۔

مولوی شیخ حسن صاحب چودھری نے دارالمطالعہ کے نام کہکشاں دہلی اور کامیاب دہلی جاری کروائے اور ان کے علاوہ حسب ذیل کتب بھی دارالمطالعہ کو عنایت کیں۔ (۱) سراج الشہادتین (۲) حجۃ الاسلام (۳) انشائے خلیفہ فارسی (۴) قصہ گل با صنوبر (۴) ہزار مسائل ہندی (۵) جنگ نامہ حضرت علیؓ (۶) لیلیٰ مجنوں اردو (۷) یوسف زلیخا اردو (۸) طوطا کہانی۔

مولوی میر احمد علی صاحب داروغۂ اعراس نے بھی حسب ذیل دو کتب عنایت کیں:۔

(۱) آداب النبیؐ (۲) وینس کا سوداگر۔

کتب معطیہ مولوی محمد نظام علی خاں صاحب مددگار تعلقدار مستقر کلیانی۔

(۱) محسوسات ماہر (۲) مضمرات جنگ اور قائد ملت (۳) حیدرآباد کا مستقبل (۴) حالات حضرت یوسف صاحب شریف صاحب قبلہ (۵) تاریخ مجلس اتحاد المسلمین مملکت آصفیہ (۶) ہندوستان و پاکستان

کتب معطیہ مولوی سید تاج الدین صاحب منشی فاضل
سینئر دار دلیسکھی و نائب معتمد شعبۂ تقریر۔

(۱) خلافت اور ہندوستان (۲) شرح اسمائے حسنیٰ (۳) کلمۂ حق (۴) اصلاح کار (۵) اصلی حقیقت (۶) آداب النبیؐ (۷) دو وظیفے (۸) عطر الوردہ فی شرح بردہ (۹) پیغام رسولؐ

کتاب معطیہ مولوی میر مظہر علی صاحب متعلم منشی (۱) طوطا کہانی

مولوی خواجہ معین الدین صاحب فرزند غلام محی الدین صاحب	خطبہ صدارت اجلاس شعبۂ ترقی اردو آل انڈیا مسلم ایجوکیشنل۔ ایک جلد
مولوی محمد علی خاں صاحب ارد و عالم معتمد شعبۂ	(۱) پرانا خواب (۲) تاریخ ایران (۳) حسن انجلینا (۴) منصور موہنا (۵) بھارت سپوت (۶) تاریخ عرب و عراق و عمان

معتمد شاخ ہذا۔ ۲ کتب۔ (۱) کیا روح جسم سے علحدہ چیز ہے (۲) اظہار ک...
...لوی شیخ حسن صاحب چودھری ۳۱ کتب :۔

بیمار نبت (۲) مرثیہ میر انیس (۳) دفتر غم (۴) خریدار محبت (۵) سلسلۂ دینیات حصۂ چہارم (۶) آج کی رات (۷) ہمارا طوطا (۸) زہر عشق و خنجر عشق (۹) دفتر الم (۱۰) شریف بدمعاش (۱۱) جلوۂ محبوب (۱۲) خوبصورت بلا (۱۳) سلسلۂ دینیات حصہ اول و سوم (۱۴) میں جھینی گئی بیت لگائے (۱۵) مجموعہ وفات نامہ فاطمہ زہرؓ (۱۶) لاکھوں سلام (۱۷) دکن کی تاریخی کہانیاں (۱۸) آداب النبیؐ (۱۹) تعلیم الاسلام تیسرا حصہ (۲۰) حکایات لطیف (۲۱) جغرافیہ سلطنت ہند (۲۲) ایمان کے فضائل (۲۳) حبیب الاوراد (۲۴) اندر سبھا (۲۵) صمصام اسلام (۲۶) اردو کی پہلی کتاب (۲۷) سوانح عمری غازی انور پاشا حصہ اول (۲۸) سوانح عمری غازی انور پاشا حصہ دوم (۲۹) سوز دل (۳۰) کمال اتاترک (۳۱) قومی شیر۔

جناب مولوی محمد اکبر شمس الدین صاحب سب انسپکٹر کوتوالی کلیانی نے رسالہ اِرم مرحمت فرمایا ہے۔

ناظرین دارالمطالعہ کی تعداد (۴۰۰۱) رہی اور (۲۴) کتب گھر پہ مطالعہ کے لئے دی گئیں۔

کلیانی میں ایک شعبہ طلبہ بھی قائم ہے۔ چنانچہ ارکان شعبہ مذکور کو مصروف رکھنے کے لئے ان سے وقتاً فوقتاً مختلف موضوع پر تقاریر بھی کرائی جاتی ہیں۔ اب اس سلسلہ کو پھر منظم طور پر جاری کر دیا گیا ہے کارپردازان شعبۂ تقریر مولوی محمد امین الدین صاحب اور مولوی سید تاج الدین صاحب کی دلچسپی نے اس ہفتے یعنی بتاریخ ۱۹ امرداد ۱۳۵۲ف بمقام دارالمطالعہ شاخ کلیانی شہری و دیہی زندگی پر مباحثہ کا موقع پیدا کر دیا یہ مباحثہ مولوی مرزا محمد بیگ صاحب معتمد شعبۂ تقریر کی صدارت میں شروع ہوا۔ مولوی محمد عبدالکریم صاحب وکیل اور محمد تمین صاحب اور مظفر علی صاحب نے دیہی زندگی پر اور مولوی غلام معین الدین صاحب نے شہری زندگی کی برتری پر تقریر کی آخر میں جناب صدر نے اپنی تقریر میں ہر دو زندگیوں کے مختلف پہلوؤں پر روشنی ڈال کر واضح کیا کہ ہر زندگی بجائے خود اہم ہے اور کسی زندگی سے بھی اغماض نہیں کیا جاسکتا آئندہ مباحثہ ۲ شہریور ۱۳۵۲ف کو قرار پایا ہے اور اس کے لئے "جنگ انسانی زندگی کے لئے مضر ہے یا مفید" عنوان تجویز کیا گیا ہے۔

بتاریخ ۲ شہریور ۱۳۵۲ف دارالمطالعہ میں بہ عنوان "جنگ انسانی زندگی کے لئے مفید ہے یا مضر" تقاریر ہوئیں۔ آئندہ تقریر کا عنوان "سینما بینی مفید ہے یا مضر" تجویز کیا گیا ہے۔

... ۱۳۵۲ف کو بہ عنوان "سینما بینی انسانی زندگی کے لئے مفید ہے یا مضر" بمقام رحمت منزل تقاریر ہوئیں جن میں ... دو

پہلو پر مقررین نے کافی روشنی ڈالی اس جلسے کی روئداد اور مقررین کی تقریروں کا خلاصہ مولوی تاج الدین صاحب منشی فاضل نائب معتمد شعبۂ تقریر نے دلچسپ انداز میں قلمبند کرکے دفتر شاخ ہذا میں ارسال کیا ہے۔ آئندہ تقریر کے لئے عنوان "تجارت و ملازمت" مقرر کیا گیا ہے۔

شعبہ طلبہ پرلی معائنہ "مجھے اس بات سے بے انتہا مسرت ہوئی کہ ادارہ کی شاخ شعبہ طلبہ پرلی میں بھی ہے میری خوش قسمتی تھی کہ بسرراہ مولوی سعید الدین صاحب صدیقی معتمد سے ملاقات ہوئی ادارہ کے کتب خانہ کو دیکھ کر مسرت ہوئی کارکنوں کی بے لوث خدمت و اخلاق نے مجھے متاثر کیا یہ نوعمر بچے اس ادارے کو جس حسن و خوبی کے ساتھ چلا رہے ہیں وہ بڑوں کے لئے سبق آموز ہے۔"

مخدوم محی الدین صاحب ایم اے

شرح دستخط۔ مخدوم محی الدین ایم اے

شعبہ طلبہ ہنگولی دفتر شعبہ طلبہ ادارہ ادبیات اردو شاخ ہنگولی ندیم منزل میں قائم ہوا ہے۔ دفتر فرنیچر سے کچھ کچھ بھرا ہے۔ ہر ہفتہ بزم شاعرہ بزم مباحثہ، بزم تقاریر و تحریری ادبی مضامین کے جلسے منعقد ہوا کرتے ہیں۔ یہاں کا نوجوان طبقہ بڑی سرگرمی کے ساتھ تعاون عمل کر رہا ہے نیز زبان اردو سے دلچسپی بڑھتی جا رہی ہے۔ دفتر شاہراہ عام پر واقع ہونے کی باعث بلا لحاظ مذہب و ملت لوگ شرکت کرتے رہتے ہیں۔

مجلس انتظامی شعبہ

صدر دائمی مولوی عثمان خان صاحب کمالی معتمد ادارہ ادبیات اردو شاخ ہنگولی
صدر اعزازی۔ حبیب احمد عارف
معتمد۔ احمد خاں ندیم
شریک معتمد عبداللہ بیگ قمر
خازن۔ عبدالرؤف اختر
ارکان محمد یعقوب، اسمٰعیل خاں مشتاق، ابراہیم شارق

بزم مشاعرہ اس جلسہ کے انعقاد میں تمام طلبہ نے نمایاں حصہ لیا۔ احمد خاں ندیم کی تحریک صدارت اور جناب اختر صاحب کی تائید پر حبیب احمد عارف تالیوں کی گونج میں کرسی صدارت پر تشریف لائے اور جلسہ ۹½ بجے شب شروع ہوا۔ محمد مصطفےٰ خاں طالب نے پروفیسر وحید الدین سلیم کی نظم "دب کی طرح سے دب دب کے نکلنا سیکھو" سنا کر حاضرین جلسہ کو عبرت و عمل کا سبق دیا موقع بموقع صدائے تحسین بلند ہوتی تھی۔ محمد یعقوب صاحب کی غیر طرحی طبع زاد غزل بہت مقبول ہوئی اور جلسہ کو کامیاب بنایا۔ اسمٰعیل خاں مشتاق کے تغزلات سادہ بیانی قابل ذکر ہے (جلسہ کے انتظام میں آپ کا ہاتھ بھی ہے) احمد خاں ندیم کے پر درد اور جوشیلے تخیلات اور بلند پروازی پر واہ واہ کی صدائیں بلند ہوئیں۔

محمد ابراہیم شارق نے علامہ اقبال کی نظم سنا کر حاضرین کو درس عبرت دیا۔ جناب عبداللہ بیگ قمر کی غیر طرحی طبع زاد غزل با ترنم سنا کر سامعین کو محظوظ کیا اور خراج تحسین حاصل کی۔ عبدالرؤف اختر کی شیریں بیانی اور ریلے پن سے جلسہ کامیاب رہا۔

آخر میں جناب صدر نے موثر انداز میں اردو کی بقا و ترقی کے لئے حاضرین کو متوجہ کرتے ہوئے اردو شاعری سے دلچسپی رکھنے کا اظہار کیا اس طرح ۱۱½ بجے شب جلسہ برخاست ہوا۔

دوسرا جلسہ بروز جمعہ ۲۷ مہر ۵۲ف منعقد کیا گیا جس میں دی ہوئی طرحوں پر غزلیں اور نثری مضامین سنائے گئے۔

تیسرا جلسہ۔ بزم مباحثہ ۱۱ آبان ۵۳ف بہ تحریک محمد ابراہیم شارق بہ عنوان "دشمن بنتا ہے" منعقد کیا گیا جس کے مخالف محمد اسمٰعیل خاں مشتاق تھے۔ دلائل و لائق پر زور بحث ہوتی رہی صدر کے فیصلے کے بموجب محرک کی تحریک کامیاب رہی۔

چوتھا جلسہ، تحریری ادبی مضامین ۱۸ آبان ۵۳ف۔
زیر صدارت حبیب احمد عارف عمل میں آیا جس میں اسمٰعیل خاں مشتاق

آپ بیتی' 'پناہ' ابراہیم شارق نے 'خاموشی کا پتلا' آدم علی خاں کماؔلی نے 'غمگین دل' حبیب احمد عارف نے 'غریب کی موت' اپنے اپنے طبع زاد مضمون سنائے اور ہر ایک صاحب کا مضمون کامیاب رہا۔ خصوصاً اسمٰعیل خاں مشتاق کی 'آپ بیتی' ابراہیم شارق 'کا خاموشی کا پتلا' نہایت شاندار رہا۔

پانچواں جلسہ مباحثہ ۲۵ آبان ۱۳۵۳ف زیر صدارت جناب اظہار احمد صدیقی متعلم بی اے (عثمانیہ) محرک غلام احمد قریشی بہ عنوان "سائنس مضر ہے" عمل میں آیا جس کی مخالفت مصطفےٰ خاں طالب نے کی۔ مؤیدین' مخالفین نے اپنی دلیلوں کے ذریعہ اپنی اپنی تحریک کو کامیاب بنانے کی کوشش کی۔ آخر صدر صاحب کی تائید و بالاتفاق آراء محرک کی تحریک ناکام رہی ہے۔ صدر صاحب نے بتایا کہ اگر سائنس کا صحیح استعمال ہو تو مفید ہے۔ کوئی چیز بذات خود بری نہیں بلکہ اس کا استعمال اس کو اچھا برا بناتا ہے۔

۱۹۴۳ء کا دوسرا امتحان اُردو دانی مختلف شاخوں اور اضلاع کے اصحاب کی متعدد درخواستوں کی بناء پر مجلس انتظامی اردو امتحانات نے اس سال صرف اردو دانی کا دوسرا امتحان لینے کی اجازت دی ہے۔ چنانچہ یہ امتحان ۲۴ رڈسمبر ۱۹۴۳ء مطابق ۳۰ بہمن ۱۳۵۳ف کو حسب ذیل مراکز میں ہوگا۔

(۱) اودگیر (۲) اورنگ آباد (۳) بمبئی (۴) پرینڈہ (۵) داو واڑی (۶) مومن آباد (۷) نظام آباد (۸) بلدہ حیدرآباد۔

یہ امتحان صرف ایک دن ہوگا۔ صبح میں تحریری اور دوپہر میں زبانی امتحان لیا جائے گا۔ بلدہ کے امیدواران ذکور کی نشستوں کا انتظام مرکز فوج پولیس فتح میدان میں کیا گیا ہے امیدواران اناث کا امتحان حسب سابق مدرسہ فوقانیہ نسواں نامپلی میں ہوگا۔ ہال ٹکٹ ۱۰ رڈسمبر کو دفتر سے روانہ کر دیئے جائیں گے اگر کسی امیدوار کو ۱۵ رڈسمبر تک ہال ٹکٹ نہ ملے تو فوراً دفتر ادارہ کو مطلع کردے ورنہ بغیر ہال ٹکٹ کے امتحان گاہ میں شرکت کی اجازت نہ مل سکے گی۔ بلدہ کے امیدوار اپنے ہال ٹکٹ دفتر ادارہ سے بہ اوقات ۱۰ تا ۵ ساعت شام حاصل کرسکتے ہیں۔

ادارہ کی شاخوں کے معتمدین اور مراکز کے بانیوں کو امتحان گاہ' نشستوں اور سیاہی کا انتظام پہلے ہی سے کرلینا چاہئے۔ صدر نگران کار صاحب امتحان سے ایک روز قبل پہنچ جائیں گے۔ امیدواروں کو جوابی بیاضیں ادارہ کی طرف سے دی جائیں گی۔ ان کو اپنے ساتھ قلم لانا چاہئے۔

وقت نامہ امتحان

روز جمعہ ۲۴ رڈسمبر مطابق ۳۰ بہمن ۱۳۵۳ف

پہلا پرچہ۔ تحریری ۱۰ تا ۱۲½ ساعت صبح

دوسرا ”۔ زبانی ۳ ” ۶ ” شام

ہندستانی تمدن: یہ اردو تصنیف جامعہ عثمانیہ کے ایک ہونہار دماغ "اینسوراؤیا" کی تخلیق ہے۔ کتاب کا موضوع ایک اچھوتے رجحان اور ہندستانی ادب میں بڑھتے ہوئے جدید تحقیقاتی تقاضوں کا نتیجہ ہے۔ آج کے ہندستانی تمدن کی ترتیب و تزئین میں ماضی کے کتنے انقلابات اور تغیر پذیر افکار کو دخل رہا۔ ہندستانی سماج پر جماعتوں اور گروہوں کے عہد بہ عہد ارتقائی اثرات نے کتنی تہذیبی چھاپیں لگائیں۔ ان سب امور کے متعلق نہایت ٹھوس حقائق کی روشنی میں بحث کی گئی ہے۔

ہندستانی تمدن کا مصنف تاریخ کا ایک ایسا طالب علم ہے جس نے جماعتی مسائل کے مختلف عوامل کو نئے نئے فکری زاویوں سے ابھارا ہے وہ قدم قدم پر ہمارے استعجاب میں حقائق کی آمیزش کر کے تحقیقی دور کا ایک جدید باب کھولتا چلا جاتا ہے۔ پھر ہندستان کتنی ہی قومی' سیاسی اور معاشی تہذیبوں سے مرکب ہے۔ کتنی ہی اقوام اور کتنے ہی مذاہب اپنی مخصوص آبائی روایات کی بتدریج ملاوٹ سے ہندستانی تمدن کی شناخت میں حصہ لیتے رہے۔ فاضل مصنف نے ان سب تمدنوں کے عمل و ردعمل کو بالخصوص پیش نظر رکھا ہے۔

(ادب لطیف لاہور اکتوبر ۱۹۴۳ء)

دلچسپ تاریخی کتابیں

تاریخ گولکنڈہ حیدرآباد کے مشہور مورخ اور جامعہ عثمانیہ کے معلم تاریخ پروفیسر عبدالمجید صاحب صدیقی ایم اے۔ ایل ایل بی نے سلاطین قطب شاہیہ کی نہایت مستند اور مبسوط تاریخ قلمبند کی ہے جس میں گولکنڈہ اور اس کے آس پاس کی سلطنتوں کے تعلقات، دکن کا تمدنی ارتقاء، بادشاہوں اور امیروں کے حالات، لڑائیاں، علم وفضل کی سرپرستی غرض ہر پہلو پر قدیم نادر اور قلمی تاریخوں کی مدد سے روشنی ڈالی ہے۔

بڑی سائز ۳۲۵ سے زیادہ صفحات قیمت ہے

مقدمۂ تاریخ دکن پروفیسر عبدالمجید صاحب صدیقی نے نہایت تحقیق اور محنت سے مرتب کی ہے اس میں سرزمین دکن کے پچیس حکمران خاندانوں کے آغاز، ارتقاء عروج اور زوال کے متعلق تعارفی معلومات کے علاوہ حکمرانوں کا پورا شجرۂ نسب اور حکمرانوں کی تاریخیں بھی قلمبند کر دی گئی ہیں۔

متوسط تقطیع ۱۴۴ صفحات۔ قیمت عہ

میر محمد مومن عہد محمد قلی قطب شاہ و سلطان محمد قطب شاہ میں پیشوائے سلطنت اور وزیر مطلق تھے۔ دنیوی عروج کے علاوہ ان کی مذہبی سیادت وفضیلت بھی بہت مشہور ہے۔ انھوں نے ہزارہا روپے کے صرفے سے ایک دائرہ بنایا تھا جس میں خاک کربلائے معلیٰ بچھا دی تھی۔ اور یہ دائرہ اب تک "دائرہ میر مومن" کے نام سے حیدرآباد میں مشہور و معروف ہے۔ میر محمد مومن صاحب اعلیٰ پایہ کے فارسی شاعر بھی تھے اور حیدرآباد آنے سے قبل شاہ ایران کے استاد بھی رہ چکے تھے۔ ان کے نہایت تفصیلی اور تحقیقی حالات زندگی اس کتاب میں جناب ڈاکٹر سید محی الدین قادری صاحب زور نے اپنے دلچسپ اور مقبول عام اسلوب میں تحریر فرمائے ہیں۔ تقریباً تین سو صفحات مع تصاویر قیمت عاہر

ریاض مختاریہ حیدرآباد کے بیدار مغز مدارالمہام نواب مختار الملک سر سالار جنگ اول کے حالات زندگی اور کارناموں کو نہایت تفصیل کے ساتھ بیان کیا گیا ہے۔ خاندان، تعلیم و تربیت، دیوانی کا ذکر، مشہور واقعات، تعلیمی و سیاسی خدمات، نظم ونسق سلطنت، غرض حیدرآباد کے گزشتہ حالات پر تفصیلی روشنی ڈالی گئی ہے۔ اس کتاب کے مصنف مولوی میر دلاور علی دانش مرحوم ہیں۔ یہ کتاب اب تک قلمی مسودے کی صورت میں تھی لیکن اب ادارہ کی طرف سے شائع ہو چکی ہے۔ کتابت وطباعت دیدہ زیب صفحات (۴۰۲) قیمت للعہ

ہندوستانی تمدن از پروفیسر ڈاکٹر ایشوری ٹوپا ڈی فل ریڈر تاریخ تمدن ہند جامعہ عثمانیہ۔ یہ تقریباً پانچ سو صفحات کی ایک ضخیم کتاب ہے جس میں فاضل پروفیسر صاحب نے ہندوستان کے قدیم تمدن کو دس ابواب میں شرح وبسط اور تحقیق کے ساتھ بیان کیا ہے۔ اس موضوع پر اردو تو کیا کسی اور زبان میں بھی ایسی عالمانہ کتاب اب تک نہیں لکھی گئی تھی۔ جو لوگ قدیم ہندوستان سے واقف ہونا چاہتے ہیں اس کو ضرور پڑھیں صفحات (۴۴۰) قیمت ہے

مشاہیر قندھار دکن اس تذکرہ میں مولوی اکبر الدین صاحب صدیقی ایم اے نے دکن کے مشہور و معروف اور مردم خیز خطۂ قندھار شریف کے معزز خاندانوں اور ان کے باکمال و مایۂ ناز افراد کا اجمالی خاکہ کھینچا ہے۔ پروفیسر عبدالمجید صاحب صدیقی استاد تاریخ جامعۂ عثمانیہ کا بصیرت افروز مقدمہ اس کے ساتھ شائع ہوا ہے۔

قندھار شریف دکن کا بلگرام سمجھا جاتا ہے اور محمد تغلق کے زمانے سے آج تک وہاں کی سرزمین سے بڑے بڑے اولیاء، علماء، شعرا اور

مشاہیر پیدا ہوتے رہے ہیں۔ دکن کے مختلف شہروں اور قصبوں میں قاضیوں، خطیبوں، محتسبوں اور دیگر اہلِ خدمات شرعیہ کے جو خاندان آباد ہیں ان میں سے اکثروں کا تعلق قندھار شریف ہی کے بزرگوں سے ہے اس لئے یہ کتاب دکن کے شرفا اور بزرگوں کا ایک مستند اور مبسوط تذکرہ سمجھی جاسکتی ہے اور اس کے مطالعہ سے یہاں کی علمی و ادبی چہل پہل کا اندازہ ہوسکتا ہے۔
صفحات ۱۸۴۔ تعداد تصاویر ۹ قیمت عہ ۔

نذرِ دکن ادارے کے شعبۂ نسواں کی معتمد محترمہ سکینہ بیگم صاحبہ نے اس مجموعہ کو مرتب کرکے اپنی خوش مذاقی اور ادبی ذوق کا ثبوت دیاہے، اس مجموعے میں دکن سے متعلق صنف نازک کے مضامین اور نظمیں شائع کی گئی ہیں۔ اگرچہ اپنی نوعیت کی پہلی کوشش ہے لیکن بہت کامیاب رہی۔ خواتین دکن کا یہ گلدستۂ رنگ و بو تعلیم یافتہ گھرانوں کی زینت بننے کے لایق ہے (۱۰۴) صفحات قیمت ۱۲؍

تاریخ ادب و زبان کی کتابیں

تاریخ ادب اُردو اردو زبان اور ادب کی کوئی اچھی تاریخ اب تک نہیں لکھی گئی۔ یہ تاریخ صرف طلبہ اور عوام کے لئے لکھی گئی ہے۔ اردو صحافت اور ادب سے دلچسپی رکھنے والے جملہ اصحاب کے لئے تاریخی معلومات کا بہترین ذریعہ ثابت ہوگی۔ چھوٹی تقطیع ۱۷۶ صفحات۔ قیمت ۱۲؍

مدراس میں اُردو مولوی نصیر الدین صاحب ہاشمی نے مدراس میں اُردو کے نشو و نما اور اس کے ارتقاء کی تاریخ پیش کی ہے۔ ہر دور کے شاعروں اور نثر نگاروں کے سوانح حیات اور نمونۂ کلام تفصیل سے درج ہے۔ تاریخ ادب اُردو سے دلچسپی رکھنے والوں کے لئے اس کا مطالعہ بے حد ضروری ہے۔ صفحات ۲۰۰ قیمت مجلد ۱۲؍

اُردو مثنوی کا ارتقاء بڑی عالمانہ و محققانہ کتاب ہے جس کے افادہ اور معیار کے اظہار کے لئے صرف اس کے مصنف پروفیسر عبدالقادر صاحب سروری کا نام ہی کافی ہے اردو شاعری کی تاریخ سے دلچسپی رکھنے والوں کے لئے یہ کتاب ایک نعمت غیر مترقبہ ہے جو اپنے موضوع اور اہمیت کے لحاظ سے نہایت کامیاب کوشش ہے۔ یہ کتاب دس ابواب پر مشتمل ہے جن سے اس کی اہمیت اور تلاش و جستجو کا اندازہ ہوسکے گا۔
بڑی سائز (۲۳۲) صفحات قیمت ۱۲؍

مغربی تصانیف کے اُردو تراجم اس میں مولوی میر حسن صاحب ایم اے نے ان تمام انفرادی اور اجتماعی کوششوں کو ایک جگہ جمع کر دیا ہے جو صدیوں سے اردو زبان کو مالامال کرنے کے لئے دوسری زبانوں کی کتابوں کو اردو میں منتقل کرنے کے سلسلے میں کی جاتی رہی ہیں۔ یہ تذکرہ نہایت ہی محنت اور تحقیق سے لکھا گیا ہے اس لئے مستند بھی ہے اور مفید بھی نقد ادب اور تاریخی طریقۂ تنقید کے علاوہ ماخذوں کے متعلق معلومات حاصل کرنے میں ایسی کتابوں کی خاص اہمیت ہوتی ہے۔
چھوٹی تقطیع ۱۸۴ صفحات قیمت مجلد ۱۲؍

آریائی زبانیں یہ کتاب اردو کی ابتدائی تاریخ اور اس کے ماخذوں کا مستند تذکرہ ہے جس کو خاص ادارہ کے لئے ڈاکٹر سید محی الدین قادری زور صاحب ایم اے ڈی لٹ پروفیسر سنسکرت و لسانیات و صدر کل ہند انجمن لسانیات نے خاص طور پر مرتب کیا ہے۔ صفحات ۱۴۰ قیمت عہ ۔

بلاغت یہ کتاب فن شعر و انشاء کے محاسن سے متعلق ضروری معلومات پر مشتمل ہے جس کا پہلا حصہ معانی دوسرا بیان اور تیسرا علم بدیع سے بحث کرتا ہے۔ یہ کتاب اردو ادب سے دلچسپی رکھنے والوں اور خاص کر اردو کے طلبہ کے افادے کے لئے

مولوی سید کلیم اللہ حسینی صاحب، منشی فاضل، مولوی فاضل، اردو فاضل سے مرتب کرائی گئی ہے۔ صفحات (۵۶) قیمت صرف ۸ر

سرگزشت غالب اردو فارسی کے مشہور شاعر و ادیب مرزا اسد اللہ خاں غالب کی حیات، کارناموں اور اعزہ و احباب کا ایک مجمل تذکرہ ہے جس کو ڈاکٹر سید محی الدین صاحب قادری زور ایم اے۔ پی ایچ۔ ڈی (لندن) نے نہایت تحقیق اور محنت سے مرتب کیا ہے۔ طلبہ اور ادب کا مطالعہ کرنے والوں کے لئے بے حد مفید ہے۔ غالب کی تصویر اور خاندانی شجرے بھی شائع کئے گئے ہیں۔ بڑی سائز۔ صفحات ۹۲ کتابت و طباعت و کاغذ اعلیٰ۔ قیمت ۸ر۔

محمد حسین آزاد اردو کے اس بڑے شاعر اور انشا پرداز کے مکمل حالاتِ زندگی اب تک شائع نہیں ہوئے تھے۔ اس کتاب کو محترمہ جہاں بانو بیگم صاحبہ ایم اے لکچرار اردو کلیہ اناث جامعہ عثمانیہ نے نہایت شرح و بسط اور تحقیق کے ساتھ قلمبند کیا ہے یہ کتاب سات ابواب میں تقسیم کی گئی ہے جن میں آزاد کی زندگی، شاعری اور تصانیف سے متعلق مکمل معلومات شامل ہیں۔ مع تصویر آزاد (۲۰۰) صفحات قیمت عہ

یوسف ہندی قید فرنگ میں اس کتاب میں محسن بن شبیر صاحب بی اے۔ ایل ایل بی نے غالب کی قید کے واقعہ پر محققانہ نظر ڈالی ہے۔ اس کے مطالعہ سے اس زمانہ کے قیدیوں کی حالت آنکھوں کے سامنے پھر جاتی ہے۔ آخر میں غالب کا ترکیب بند اسیری بھی نقل کیا گیا ہے صفحات ۸۰ قیمت ۸ر

اردو نامہ اس میں اردو ادب سے متعلق ہندوستان کے بہترین انشا پردازوں اور تنقید نگاروں کے معلومات آفریں مضامین اور مقالے درج ہیں جو خاص طور پر لکھوائے گئے۔ اکثر و بیشتر مشہور شاعروں کی غیر مطبوعہ غزلیں اور نظمیں بطور خاص حاصل کرکے شائع کی گئیں۔ ان میں قدیم اور جدید شاعری کے جو نمونے ہیں ان سے اردو شاعری کے مختلف رجحانات کا پتہ لگایا جاسکتا ہے۔ ہندوستان کی مختلف جامعات کے اردو کے پروفیسروں کے حالات زندگی اور علمی خدمات سے اہلِ زبان کو روشناس کرایا گیا ہے، جن کی دماغی محنت اور ایثار سے نوخیز ادیبوں، انشا پردازوں اور شاعروں کی صحت بخش تربیت ہوتی ہے۔ مشاہیر اردو کے غیر مطبوعہ خطوط کو پہلی دفعہ منظر عام پر لایا گیا ہے۔ یہ خطوط اردو ادب میں قابلِ قدر اضافہ ہیں۔ اس میں کئی تصویریں بھی ہیں جو یا تو اردو کے شاعروں، ادیبوں اور محسنوں کی ہیں یا اردو سے تعلق رکھتی ہیں اردو ادب کی تاریخ اور ارتقا پر ایک جامع اور مفید کتاب ہے صفحات (۲۰۰) قیمت عہ

روح غالب اردو اور فارسی کے مشہور شاعر و ادیب مرزا اسد اللہ خاں غالب کی حیات اور کارناموں کی ایک مجمل سرگزشت اور ان کے اردو خطوط کے دلچسپ ادبی حصوں کا انتخاب جس کو جناب ڈاکٹر سید محی الدین صاحب قادری زور نے نہایت محنت اور جانفشانی سے مرتب کیا ہے۔ اس کتاب کا پیش لفظ نواب مہدی یار جنگ بہادر ایم اے (کیمبرج) صدر المہام تعلیمات و معین امیر جامعہ عثمانیہ نے تحریر فرمایا ہے

اس کتاب میں سب سے پہلی دفعہ غالب کے خاندان و اعزہ اور ان کے سسرالی اعزہ و اقارب کے دو تفصیلی شجرے بھی شائع کئے گئے ہیں۔

غالب کی فارسی اور اردو تصنیفات کی تفصیل، ان کی نوعیت زمانہ تصنیف ان کی اشاعت کی تاریخیں غرض تمام ضروری معلومات اس میں شامل ہیں۔ تاریخ ادب کا مطالعہ کرنے والوں کے لئے

یہ کتاب بہت مفید ثابت ہوگی۔

اس میں غالب کے خطوط کے ادبی حصوں کا نہایت نفیس انتخاب کیا گیا ہے تاکہ جو لوگ علمی بحثوں میں الجھنا نہیں چاہتے اور غالب کے شگفتہ اور پاکیزہ اسلوب سے لطف اندوز ہونا چاہتے ہیں وہ بے تکلف ان ادب پاروں سے محظوظ ہوسکیں۔ صفحات (۲۴۰) تعداد تصاویر (۳) کتابت و طباعت نفیس کاغذ اعلیٰ قیمت عار

مکتوبات شاد عظیم آبادی پٹنہ کے مشہور شاعر اور ادیب شاد عظیم آبادی کے غیر مطبوعہ خطوط کا مجموعہ ہے جس کو ڈاکٹر سید محی الدین قادری زور نے نہایت سلیقہ سے مرتب کیا ہے۔ شاد کا زمانہ اردو ادب میں اس لحاظ سے معرکۃ الآرا تھا کہ اس وقت حالی اور سرسید کی تحریکیں شروع ہوگئی تھیں۔ ان تحریکوں کا اندازہ تاریخ سے اس قدر واضح نہیں ہوتا جتنا کہ ادب اور خاص طور پر ایسے خطوط سے ہوسکتا ہے۔ اسی وجہ سے اس کتاب کو غیر معمولی اہمیت حاصل ہے۔ اردو ادب سے دلچسپی رکھنے والوں کے لئے یہ ایک بیش بہا تحفہ ہے چھوٹی تقطیع (۲۰۰) صفحات قیمت عار۔

شاد اقبال اقبال اور شاد دونوں کی ہستیاں محتاج تعارف نہیں البتہ اس خبر سے اردو دنیا میں مسرت کی ایک لہر دوڑ جائے گی کہ علامہ اقبال مرحوم اور مہاراجہ سر یمین السلطنۃ کے درمیان پچیس تیس سال تک جو مسلسل مراسلت ہوتی رہی ہے اس کو اہتمام سے مرتب کیا گیا اور یہ پوری مراسلت ادارۂ ادبیات اردو کی طرف سے شائع ہوچکی ہے۔ اس کے مطالعہ سے اقبال کی زندگی اور کردار کے ایسے پہلوؤں پر روشنی پڑتی ہے ان کے متعلق دوسرے ذرائع سے کوئی علم حاصل نہیں ہوسکتا۔ ان گراں مایہ خطوط کو جناب ڈاکٹر زور صاحب نے اپنے بسیط مقدمہ کے ساتھ مرتب کرکے شائع کیا ہے۔ شاد و اقبال کی نایاب تصاویر بھی شامل ہیں۔ صفحات ۱۷۰ قیمت عار

نذرِ ولی اس میں دکن کی چار ایم اے کامیاب خواتین انشاپرداز محترمہ جہاں بانو بیگم صاحبہ محترمہ لطیف النساء بیگم محترمہ نعیم النساء بیگم صاحبہ اور محترمہ نجم النساء بیگم صاحبہ کے دلچسپ مضامین ہیں جو بابائے ریختہ حضرت ولی اورنگ آبادی کے حالاتِ زندگی اور خصوصیاتِ کلام پر نہایت دلچسپ اسلوب میں اور جدید ترین نقطہ نگاہ سے لکھے گئے ہیں۔ ان مضامین میں ولی کی معلومات، ان کے تخیل، ان کے فن شعر اور ذوقِ عرفان کے علاوہ ان کے اسلوب، زبان اور انتخاب الفاظ کے متعلق بھی نہایت مفید اور دلچسپ بحث کی گئی ہے۔ ولی کے متعلق یہ پہلی مستقل اور جامع کتاب ہے۔ اس کا مطالعہ تشنگانِ ادب کی تسلی کا باعث ہوگا۔

صفحات ۲۴۸ طباعت و کتابت نفیس کاغذ اعلیٰ قسم جلد پر دو جگہ سنہری نام قیمت مجلد عار

گارساں دتاسی اردو کے پہلے پروفیسر، فرانس کے مشہور مستشرق اور ہندستانیوں کے سچے بہی خواہ کے علمی و ادبی کارناموں، طریقۂ تعلیم، تلامذہ، کتب خانہ، اردو کی حمایت اور تبلیغ کی کوششوں اور اس کے عہد کی یورپ کی درس گاہوں، اردو کے پروفیسروں اور بہی خواہوں کا ایک اجمالی تذکرہ ہے۔ اس کتاب کو جناب ڈاکٹر زور صاحب نے نہایت تحقیق اور جانفشانی سے تالیف کیا ہے۔ طباعت کتابت دیدہ زیب صفحات (۱۲۸) قیمت ۱۲

نقدِ سخن نواب عزیز یار جنگ بہادر عزیز نے حضرت فانی بدایونی کے کلام پر فنی نقطۂ نظر سے سخن ورانہ تنقید کی ہے تعداد صفحات (۱۰۶) قیمت ۸۔